مانوس اعتبار کرم کیوں کیا مجھے
اب ہر خطائے شوق اس کا جواب ہے
(اثر مرادآبادی)

عورتوں کے لیے خوش خبری
۳۲ لاکھ خواتین کی پُرزور فرمائش پر
جواب عرض کا
ماہ دسمبر ۱۹۸۳ء کا شمارہ
عورت نمبر
شائع کیا جارہا ہے
(جو سالنامے کی شکل میں ہوگا اور پورے ایک سال کی محنت کا نچوڑ ہوگا)
عورت نمبر صرف عورتوں کے لئے
شائع کیا جائے گا
جواب عرض کا
یہ پہلا نمبر ہوگا جو
جواب عرض کی تاریخ میں
پہلی بار شائع کیا جارہا ہے
عورت نمبر میں صرف خواتین کی سچی
آپ بیتیاں باتصویر شائع کی جائیں گی
(مرد حضرات کی اس نمبر میں کوئی کہانی شائع نہیں کی جائے گی)
عورت نمبر میں خواتین کی ایسی سچی کہانیاں شائع کی جارہی ہیں جن کو وہ خود
زبان پر نہیں لا سکتیں اس لئے ان کو قلم کا سہارا لینا پڑا
عورت نمبر کے ۶۰۰ صفحات ہوں گے اور اس میں خواتین کے نئے ڈیزائن اور خواتین کی لاتعداد تصاویر بھی شائع کی جارہی ہیں
قارئین جواب عرض اور نیوز ایجنٹ
حضرات فوری رابطہ قائم کریں
جو قارئین دو ماہ کے اندر جواب عرض
کے سالانہ خریدار بنیں گے انھیں عورت نمبر
مفت پیش کیا جائے گا
فوری رابطہ کے لئے: ماہنامہ جواب عرض ۷۷ نسبت روڈ لاہور
فون نمبر
۳۱۲۹۶۲
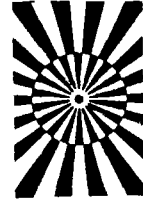
شائع ہو گیا
پاکستان کی انگلش صحافت میں تفریح اور حسن کا
ماسٹر پیس تحفہ جسے خوب و خوبصورتی سے سجایا گیا ہے
monthly
HONEY
Lahore
شہلا عالمگیر
انگلش ادیبوں کی صف میں ایک منفرد نام
ھنی
ماہنامہ "ھنی"
تمام انگلش رسائل کی صف میں اپنے انداز کا منفرد رسالہ
فیشن۔ ادب و علم کا اتنا حسین و رنگین امتزاج آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا
خوبصورت خواتین اور مردوں کا خوبصورت میگزین
صحافت کے قیمتی سرمائے کو اس طرح سمویا جا رہا ہے کہ
ماہنامہ ھنی زر و جواہر میں تولنے کے لائق ہوگا
اپنے شہر کے قریبی بک سٹال سے طلب فرمائیں
پاکستان بھر کے نیوز ایجنٹ فوری رابطہ قائم کریں
دفتر۔ ماہنامہ "ھنی"۔ ۳۲۔ اسلامیہ پارک لاہور

ایڈیٹر
شہزادہ عالمگیر

خوشبو نمبر

قیمت ۱۵ روپے

جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۱۰ قیمت پندرہ روپے

اپریل ۸۳ء
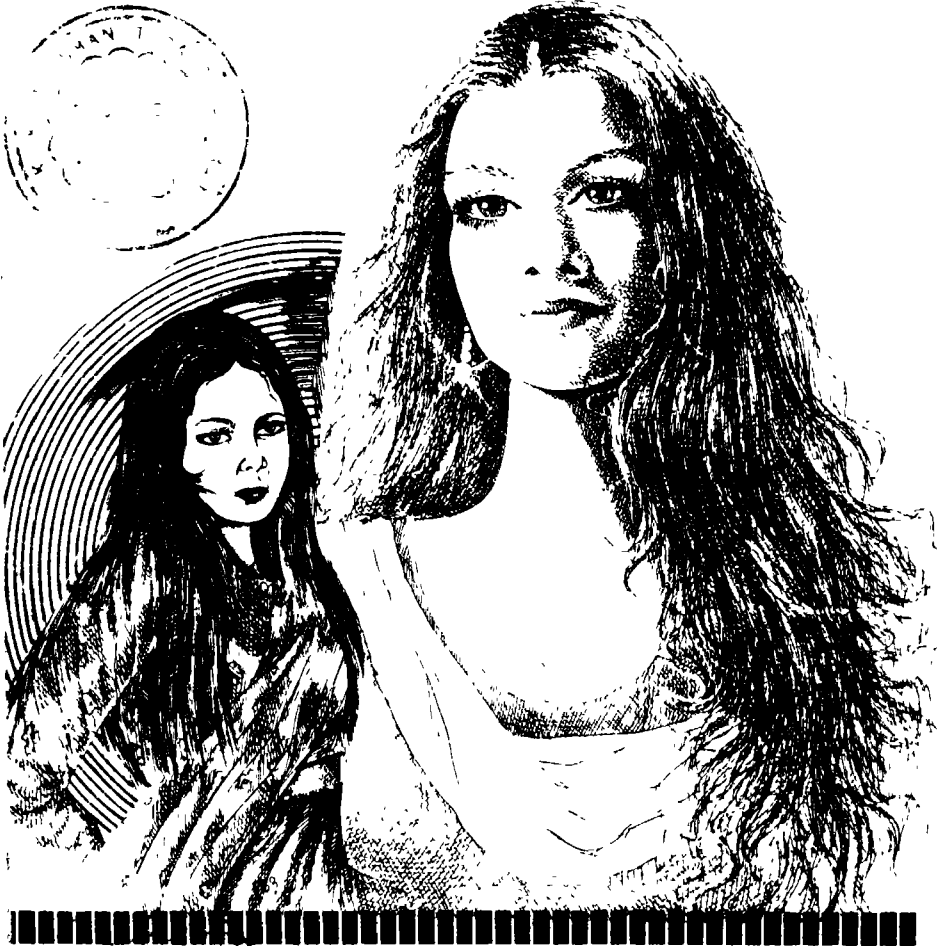
خوشبو نمبر

شہزادہ عالمگیر
شہزادہ التمش
سائرہ بانو
شہزادہ فیصل

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

ماہنامہ جواب عرض ،، نسبت روڈ۔ لاہور

ایڈیٹر پبلشر شہزادہ عالمگیر نے پرنٹر لیاقت علی ابوالمعانی پرنٹرز چوک لکشمی میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر ،، نسبت روڈ لاہور سے شائع کیا

ذاتی صفحہ — خوشبو نمبر

کسی دل جلے نے عورت کے متعلق کیا خوب کہا ہے کہ دنیا بھر کی مظلوم ترین مخلوق حقیقت میں نہایت ہی عمدہ قسم کی اداکارہ ہے۔ اسانی اس خوبی کو بروئے کار لا کر اپنے مقصد کو پا لیتی ہے۔ اور وہ مقصد کیا ہے؟ مرد کو ہر قدم پر اپنے قابو میں رکھنا ہوتا ہے۔ جب ابھی بچپن کی پھلواری کی ایک ادھ کھلی کلی ہوتی ہے تو اپنے بھولپن، اپنی معصومیت، اپنی میٹھی میٹھی باتوں اور اپنی چمکدار آنکھوں کی بے پایاں گہرائیوں سے جابر سے جابر اور ظالم سے ظالم باپ کا دل بھی اپنی چھوٹی سی مٹھی میں دبائے رکھتی ہے اور یوں اپنے لڑکپن کی ساری معصوم آرزوؤں کی تکمیل بڑی آسانی سے کر لیتی ہے۔ اور یہی کومل سی کلی جب کھل کر پھول بنتی ہے تو اپنی پلکوں کی حیا آلود جنبشوں سے اپنی دلفریب مسکراہٹوں، اپنے نینوں کے تیکھے تیکھے واروں سے اور اپنے قیامت خیز حسن و شباب کی ضیاء پاشیوں سے ایک ایسا آہنی جال بنتی ہے کہ مرد ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ جاتا ہے، لیکن فرار کا ذرا سا بھی روزن نہیں ملتا اور جب اس پھول کی پنکھڑیاں، اس کا دلآویز رنگ و روپ خزاں آلود ہواؤں سے اڑتی ہیں اور جب اس کے سیاہ گھنیرے بالوں میں چاندی کے تار جھلملانے لگتے ہیں تو وہ اپنی آنکھوں کے دھواں دھواں آئینوں سے، ڈھلتی عمر کی توانائی سے جھکے جھکے شانوں سے اور سڈول ہاتھ پیروں کے پگھلتے ہوئے جوڑوں کی روداد دل گداز سے بچوں اور نادیدہ بیماریوں کی آڑ سے ایک خفیف سا ہاتھ بڑھا کر بوڑھے بیٹوں کی گردنیں تھامے رہتی ہے اور مرد... کبھی اس کی فرشتوں جیسی معصومیت کبھی اس کے چڑھتے سورج جیسے جلوؤں اور کبھی ڈوبتی خزاں جیسی نیرنگی پر ترس کھاتا سدا اس کے دام کا شکار رہتا ہے.. اور زمانے بھر کے دھوکے کھاتا رہتا ہے۔

قارئین! اپنے وعدہ کے مطابق شب و روز کی ان تھک محنت کے بعد جواب عرض کا "خوشبو نمبر" آپ کی نذر ہے۔ آپ میں سے اکثر سوچیں گے کہ یہ کیا تماشہ ہے کہ ہر مہینے کوئی نہ کوئی نمبر نکال مارتا ہوں، تو اس کے لیے بھی میں مجبور ہوں اگر ایک طرف کچھ لوگوں کی خواہش ہے (جن میں میرے چند ایک معزز ایجنٹ حضرات بھی شامل ہیں) کہ جواب عرض کے نمبر نہ نکالے جائیں، تو دوسری جانب اکثریت میرے ایسے قارئین کی ہے جو چاہتے ہیں کہ جواب عرض کو باقاعدہ نمبر کی شکل دے کر اس کی ضخامت ہی بڑھا دی جائے اور قیمت اگر چہ بے شک سہ گنا کر دی جائے لیکن مجھے اپنے ہر قاری کا خیال رکھتے ہوئے میں نے جو دکھی دلوں کی بستی بسا رکھی ہے، اس کے باسیوں کی خواہش کو بھی مقدم رکھنا پڑتا ہے تاکہ اس میں زیادہ سے زیادہ دکھی لوگ شریک ہو سکیں۔ ان نمبروں کو دیکھتے ہوئے خواتین کی طرف سے بے شمار خطوط ملتے رہے۔ جواب عرض کا ہر سال دسمبر کا شمارہ "عورت نمبر" شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا، جس کے بارے میں یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ جو خواتین اپنی دکھ بھری اور درد بھری داستانیں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتیں، وہ قلم کا سہارا لے کر اپنی سبق آموز تحریریں ابھی سے ہمیں ارسال کرنا شروع کر دیں۔ ان میں ناقابل فراموش واقعات، غزلیں، شعر اور دکھ درد ہمارے سبھی کچھ شامل ہے تاکہ ہم اچھی اچھی تحریریں منتخب کر کے آپ کے "عورت نمبر" کو خوب سے خوب تر بنا سکیں، مگر واضح رہے کہ آپ کی تحریریں چربہ سازی اور عریانیت سے پاک ہونی چاہئیں۔

"خوشبو نمبر" یقیناً آپ کے معیار پر پورا اترے گا۔ اس کی خامیوں سے ہمیں ضرور آگاہ کریں تاکہ اس کے بعد جو "ٹوٹے ناطے" نمبر آ رہا ہے اس میں ان خامیوں کی تلافی کی جا سکے....

شہزادہ عالمگیر

نیزہ و تلوار

گھبرا کیوں رہے ہو بیمار دیکھ کر
جی خوش ہوا ہے راہِ پُرخار دیکھ کر
تھکن کا ہمیں کوئی بھی احساس نہ رہا
جانم کو اپنے محوِ انتظار دیکھ کر
ہاتھوں سے اختیار کے دل ہی نکل گیا
چہرے پہ ان کی زلفِ گرہ گیر دیکھ کر
عالم کٹ رہا ہے میرا ہی نخلِ جاں
تیری نظر کے نیزہ و تلوار دیکھ کر
ہوشِ حساب رہ گیا نہ منکر نکیر کو
دنیا میں تیرے جیسا شاہکار دیکھ کر
ہوا تو کچھ بھی نہیں دیکھے پہ طبیعت ذرا
مائل سی ہو گئی ہے تیرا پیار دیکھ کر
مدہوش کر دیا ہے دلبری کی بات نے
بے ضبط ہو گیا ہے دل انکار دیکھ کر
بے ربط سے ہوتے ہیں میرے شعر دو کے زاویے
اس مہ جبیں کو یوں سرِ بازار دیکھ کر
شعر میں کہتے تھے ہیں عشق قریب ہوا
عشق عشق کرتا ہوا تیرے اشعار دیکھ کر
شاہد ہے محوِ حیرت اپنے صبر پہ آج
حسن کو یوں بنتے اغیار دیکھ کر

(غلام یٰسین شاہد۔ بہاولپور)

غمِ حیات

سوچے بنا خانۂ دل میں بسا دیا!
اپنے گلے پہ آپ ہی خنجر چلا دیا
ہیرا اگر تراشا نہ جائے تو سنگ ہے
میں نے تجھے تراش کے ہیرا بنا دیا
اب تم ہی دیکھتے ہو نگاہِ حریف سے
تجھ کو میرے خلوص کا اچھا صلہ دیا!
شاہد تھا وہ درخت جو کنارے تھا سڑک کے
ظالم جہاں نے کاٹ کر اس کو جلا دیا
اب کیا تمہیں دلیل دوں، وعدے کیا ہوئے!
مجھ کو تو غمِ حیات نے پاگل بنا دیا
میں نے کب کہا، بے وفا ہے تو،
وہ کہتے ہیں تم نے ہے مجھ کو بھلا دیا
تصور میں تم جب بھی چلے آتے ہو!
ہم نے بھی احتراماً سر کو جھکا دیا
یہ اور بات ہے کہ طبقاتِ ارض میں!
دنیا نے ہے امتیاز کا چکر چلا دیا
شاہین یہ تو نے پیار و محبت کی بحث میں
کیوں بے وفا کی بزم میں سب کچھ لٹا دیا

(ایم اکرم شاہین، سلیم)

ہنگامۂ عید!

عید آنگن میں تیرے اب کے بھی آئی ہو گی، اور تو نے ہنگامِ مسرت میں منائی ہو گی
سرخ چاہت سے نئی چوڑیاں پہنی ہوں گی اور مسرت سے ہاتھوں پہ مہندی رچائی ہو گی
لال آنچل میں ستارے بھی ٹانکے ہوں گے اور مانگ بھی بڑی چاہت سے سجائی ہو گی
نرگسی آنکھوں میں کاجل بھی لگایا ہو گا، اور ہلکی سی لالی بھی گالوں پہ لگائی ہو گی
منتظر جس کی تیری چشم پریشاں ہوں گی آخر اس چاند نے بھی صورت دکھائی ہو گی
کھل اٹھے ہوں گے اسے پا کے تیرے دل میں [illegible]
اور دیر تک سانس بھی قابو میں نہ آئی ہو گی!!

(ایم اجمل خان انجم، بڑہ اگراں)

جناب برحمن لاہور

گیت

تجھ بن جیا نہ جائے
ساجن من ترپائے
تو ہی من میں سمائے
ساجن من ترپائے!

تو نے کیسی تان سنائی
پیت کی من میں جوت جگائی
کوئی نہ من کو بھائے
ساجن من ترپائے!

جیون بھر میں پیت نبھاؤں
پیا جی کا دل نہ دکھاؤں
دیوتا وہ کہلائے!
ساجن من ترپائے

بے کل ہو کر رین بتائی!
بیری جگ کو پیت نہ بھائی
ریت کو وہ دہرائے
ساجن من ترپائے

تیری سندرتا میں کھو کر
بنتی کروں میں توری جوہر
تو ہی پیا کہلائے
ساجن من ترپائے

(سید سخاوت علی جوہر)

میری میراث

پھولوں کے شوقین ہو اور چاہتے ہو تم سکون
میرے دامن میں تو کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں
عیش کے طالب ہو تم اور خوشیوں سے ہو سرفراز
میری قسمت میں تو زخموں کے سوا کچھ بھی نہیں
میں وہ غنچہ ہوں کہ جس کے بھاگ میں ہوئی نہ بہار
میں وہ صورت ہوں میسر بھی نہیں جس کو سنگھار
میں اکیلا جس کا دنیا میں نہیں ہے کوئی یار
میرے ہونٹوں پہ تو آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
پیار مجھ سے دور ہے اور سب مصائب ساتھ ہیں
ہر خوشی اور ہر ہنسی سے خالی میرے ہاتھ ہیں
غم عبارت زندگی کی اور دکھ دن رات ہیں!
میرے چہرے پر خزاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
میری اک خواہش کے بدلے دکھ مجھے لاکھوں ملے
اے زمانے کیا وفا کے لئے یہاں ہیں یہ صلے!
خوب اے تقدیر کے کاتب کردئیے کیا گلے
درد میں ڈوبی ہوئی راہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میرا جیون کیسا جیون بن گیا ہے ایک راز
میرے غم ہیں زندگی میری مجھے ہے ان پہ ناز
خوب رو جی بھر کے رونا لکھا ہے امتیاز
اب نصیبوں میں تو اشکوں کے سوا کچھ بھی نہیں

(امتیاز حسین شاہ، بارہ سادات)

غزل

تیرے سپنوں میں کھو جانا اچھا لگتا ہے — پیار میں اپنا دل تڑپانا اچھا لگتا ہے
میرا جیون ساتھی مجھ سے کہتا ہے یہ بات — قدم ملا کر ساتھ میں چلنا اچھا لگتا ہے
تارے گن گن کر کاٹی ہے میں نے ساری رات — دل میں دھیمی آگ کا جلنا اچھا لگتا ہے
یوں تو مجھ سے سب ملتے ہیں لیکن مرے صنم — میرے دل کو تجھ سے ملنا اچھا لگتا ہے
بندھن میں ہم جب سے بندھے ہیں تیری چاہت کے — ہنس ہنس کر سب غم کو سہنا اچھا لگتا ہے
اک سہیلی کہتی تھی کہ تیرے شوہر کو — ٹھمک ٹھمک کر تیرا چلنا اچھا لگتا ہے
میرا جوہر مجھ سے اکثر کہتا ہے یہ نور — دل میں تیرے بس کر رہنا اچھا لگتا ہے

(سیدہ نور جہاں نور)

تیری یاد

تیری یاد سہانی یاد
یادوں کی مہارانی یاد
تیری سوچوں میں گم سم
دنیا سے بیگانی یاد
فرقت کا عنوانِ رنگیں
لوگوں نے گردانی یاد
ڈستی ہے کیوں رات ڈھلے
البیلی مست دیوانی یاد
ڈھل گئے جتنے منظر تھے
ہو گئی آخر پانی یاد
من مندر میں بیٹھ گئی
وہ جانی پہچانی یاد
زخموں کی تصویر بنی
انجم ایک پرانی یاد

(انجم بلوچ، گجرات)

بھول جا

بڑا ہی پیار مجھے اس کی ذات سے تھا
رنج اس کو نہ جانے میری کس بات سے تھا
کرکے عہد و پیماں، بھول گئے مجھ کو
جھوٹ ظاہر اس کے ہر بیانات سے تھا
اہلِ دنیا ہی بدلتے تو شکایت نہ کرنا
اپنے حالات کا شکوہ ان کے خیالات سے تھا
وہ مجھے چھوڑ گیا، منزلِ عشق پہ تنہا
جو اچھی طرح واقف میرے جذبات سے تھا
اب تو ٹوٹ چکی ہے امید کی آخری کرن نسرین
جس کا تعلق میری ہر مناجات سے تھا
اب کبھی نہ مل سکیں گے اس دنیا میں ہم
بھول جا بھول جا وہ تعلق جو گزرے لمحات سے تھا

(الف ایچ زیدی، مردان)

مُقدر کے کھیل

تم نے ساتھ چھوڑ دیا اس بات کا کوئی غم نہیں
خیالوں میں ہی آ جاتے ہو یہ بھی کچھ کم نہیں
ملنا نہ ملنا، یہ تو مقدر کے کھیل ہیں،
زمانے سے کیسی شکایت جب تیری قسمت میں ہی ہم نہیں
آئینے میں اپنا عکس جو دیکھا تو یہ جانا
روتی تھیں تیری یاد میں جو اب وہ آنکھیں پُرنم نہیں
تیری چاہت میں ہم نے بہت ہی دکھ اٹھائے ہیں،
اس دل پہ اور زخم سہہ سکوں اتنا مجھ میں دم نہیں
تجھ کو نئی خوشیاں مبارک، مجھ کو یہ تنہائیاں
ناز تھا جس کی محبت پہ اب وہ میرا صنم نہیں

(بشریٰ وقار، لاہور)

والد مرحوم کی یاد میں

بے کیف ہو کے رہ گئی محفل تیرے بغیر
لگتا نہیں جہاں میں کہیں دل تیرے بغیر
تُو جو بچھڑ گیا تو زمانہ بچھڑ گیا،
ہم رہ گئے اکیلے، بسمل تیرے بغیر
دنیا کی وسعتوں میں اے کاش کھو نہ جاؤں
پہچانتا نہیں کوئی ساحل تیرے بغیر
تُو ساتھ تھا تو بحرِ خدا وہ بھی ساتھ تھا،
اب ہو گیا اغیار میں شامل تیرے بغیر
تیرے بغیر لوگ بھی نامہرباں سے ہیں،
دنیا سے دل ہے آج بے دل تیرے بغیر
ہے کون میرے درد کا درماں کرے مجھے!
یہ زندگی ہے کیفی گھائل، تیرے بغیر

(ایم اشرف کیفی، جدہ)

جواد الرحمٰن لاہور

دل بھر گیا وفا سے
دنیا تیری جفا سے
آخر میں تشنہ ہی چلا
ساقی تیرے میکدا سے
یک دم آندھی ایسی چلی
جو کم نہ تھی طوفاں سے
پرستش کی جس کی مدتوں
بنے وہ صنم اک دیوتا سے
قسمت میں لکھا تھا ڈوبنا
شکوہ نہیں سوز ملاح سے

(ذوالفقار مرزا سوز، قصور)

اے کاش:

قسمت کے روٹھتے تو شاید ملال نہ ہوتا!
اس دلِ ناداں کا آج یہ حال نہ ہوتا
اپنا بھی کیا اور چھوڑ بھی گئے!
اچھا ہوتا جو تیرا وصال نہ ہوتا
بادلِ غم ہوتے نہ اشکوں کی برسات ہوتی
اے کاش کبھی تیرا مجھے اتنا خیال نہ ہوتا
میری ویراں نظریں پکار پکار کر
کہتی ہیں تم سے رشتۂ الفت بحال نہ ہوتا
میں تو ہوں پریشاں سو ہوں، اور!
تم بھی مجھ سے ہوتے تو ملال نہ ہوتا
نہ آتیں میسر تیری قربتیں، اگر
دردِ الفت نہ ہوتا میں محرومِ وصال نہ ہوتا
تیرے ناز، تیری ادائیں اور یہ تیرا غرور پن
کچھ نہ ہوتا اگر میری نظرِ شوق کا کمال نہ ہوتا
فسانۂ محبت کبھی زبانِ زدِ عام نہ ہوتا سلیم
تیرے دل میں اک تصورِ پیکرِ جمال نہ ہوتا

(ایچ ایف بی سلیم، حلیہ جیم)

*

بہار

جانے کیسے بہار آئی ہے
گلشنِ دل پہ تو بہار نہیں
عمر بھر تیرا انتظار کیا
اب بھی تیرا انتظار نہیں
دوست مشکل میں ساتھ چھوڑ جاتے ہیں
دوستوں کا بھی اعتبار نہیں
زخم بھی وہ دے گئے یارو،
میرے دامن میں صرف خار نہیں
سجدۂ حسن اگر ہے گناہ
کون ہے جو گنہگار نہیں
اب مجھے زندگی سے کیا حاصل
اب مجھے زندگی سے پیار نہیں
دوستوں نے دیئے ہیں زخم اتنے
اب تو خود پہ بھی اعتبار نہیں
وہ میری زندگی کا سرمایہ
جس کو حسرت پہ اعتبار نہیں

(عبدالستار خان نیازی حسرت)

پری زاد

بے ساختہ وہ جو مسکرائے جا رہا ہے
ہمارے حوصلے بڑھائے جا رہا ہے
مجھے تو پری زاد لگتا ہے وہ
نظر سے دل میں سمائے جا رہا ہے
دل کی بے تابیاں بڑھتی جا رہی ہیں
اپنے سے کوئی شرمائے جا رہا ہے
آنکھیں ہماری جھکی حیائے جا رہی ہیں!
وہ رخ سے نقاب ہٹائے جا رہا ہے
قیصر وہ تجھے فراموش کر دے گا اک دن
زباں پہ جس کا ذکر لائے جا رہا ہے

(سید قیصر نسیم ترمذی، لاہور)

یہ حال ہے ہمارا

اللہ تیری شان کیا فیشن کا ستارا ہے
سر سے گرا آنچل نہ کوئی شرم و حیا ہے
پہن کے برقعہ یوں اُٹھایا ہے نقاب
مذاق بھی پردے کا یوں خوب اڑا ہے
پردے سے ہوئی باہر، جب پردے کا تقاضا
علم اتنا نہیں اس کو کیا میری انا ہے
ہر بات بزرگوں کی یوں ٹھکرا کے گزرنا،
سمجھا ہے انہوں نے یہ ان کی ادا ہے
احترام بھلایا ہے فیشن نے بزرگوں کا
سمجھ مجھ کو نہیں آتی، چلی کیسی یہ ہوا ہے
نصیحت سے اگر کچھ ان کو کہے کوئی
سمجھتی ہیں اسے اتنا کہ پاگل کی صدا ہے
جذبۂ مسلمانی کو مٹایا ہے انہوں نے
محروم ہیں اس نعمت سے جو خدا کی ملا ہے
احساس انہیں ہوتا تو جیسے نظر نہ آئے؟
لہو ایک ہے اپنا مگر پھر بھی جدا ہے
اس راہ پہ چل کر بھٹکے ہیں بہت ہم،
ملے ہم کو ہدایت یہ ساجدہ کی دعا ہے!

(ساجدہ کاسی، کالیہ)

عورت

وہی ہے قادرِ مطلق نرالا کام ہے اس کا
یہ عورت بھی تو دیکھو آپ کو انعام ہے اس کا
بنا تو دی مرے اللہ نے ہر حال میں عورت!
مگر اے کاش کہ اپنی سمجھ لیتی یہ بھی عظمت!
یہی ہے مرد کی غیرت ہے آدم زاد کی زینت
یہی تو لازم ہے اس کی یہی ہے مرد کی عظمت!
یہی اولاد کی شفقت یہی ماں باپ کی چاہت!
یہی بھائی کا ارماں ہے شوہر کی یہی الفت!
ہے عورت پیار کی دیوی اس کے دم سے ہے جنت
زمین والو سنو تم یہ یہی ہے رحمتِ قدرت
عداوت کا یہی پیکر، یہی ہے پیکرِ نفرت
نگاہوں میں چھپا لے ہے یہی لونا کی صورت
یہی ہے عزم کا منبع یہی ہے کانچ کی گڑیا
اسی کے دم سے ہے جینا یہی ہے زہر کی پڑیا
یہ عورت ہے وہی عورت سمجھنا ہے جسے مشکل
گھروں کی ہے یہی رونق کبھی ہے زینتِ محفل
یہ عورت اک پہیلی ہے سمجھ میں آ نہیں سکتی
ہے وہ منزل جسے حدِ نظر بھی پا نہیں سکتی

(مرزا عدیل بیگ، مغل)

جامِ سفّال

تیری یاد میں اے جانِ جاں میں کہاں کہاں سے گزر گیا — تیری یاد میرے ساتھ تھی میں جہاں گیا، میں جدھر گیا
تیری یہ کج ادائیاں میری جان لیں گی ایک دن — پہلے تو مسکرا کے دل لیا پھر نظر چرا کے مُکر گیا
نہیں چاہیے اک بوند بھی تیرے میکدے سے اب مجھے — مرا جامِ سفال ساقیا میرے آنسوؤں سے ہی بھر گیا
میں تباہ ہوا تو کیا ہوا اے صنم مگر میرے خون سے — تیرا جہاں تو سنور گیا، تیرا چمن تو نکھر گیا
نہ اب صدائیں دے مجھے نہ اب میری تلاش کر — میں تو راکھ کا اک ڈھیر تھا جو ہوا چلی تو بکھر گیا!

کوئی جا کے ان کو دے خبر کہ وہ نہ آئیں اب ادھر
جو تیری راہ تکتا تھا رات دن وہ انجم کبھی کا مر گیا

(عبدالرزاق کالونی)
جو اب عرض لاہور

"دکھ درد"

زندگی کا طویل سفر کاٹے نہیں کٹتا
پر، جا رہا ہوں میں!
راہی ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں
زیست سفر ہے تو نہ راہبر نہ منزل
میں ایک برگِ خزاں کی طرح
ہواؤں کے دوش پر
بہکتا، بھٹکتا، بنتا، سنورتا
ملتی نہ جو دکھوں میں چھپاتا
خوب صورت یادوں کے چراغ جلائے
جا رہا ہوں، سوئے منزل، سوئے منزل
زندگی دکھ درد کا دریا ہے
اس میں بہے جا رہا ہوں۔
کتابوں کو سمیٹتا، خواہشیں کھاتا
حوصلہ تیری طاقت پرواز ہے مجھ میں
ہر لکیر شہرِ دل میں
اجڑا، اجڑا، ویران سا اک گھر
کوئی چراغِ سحر
کسی فسوں گر کے کیف سے کیف
دیتی ہے ... ظفر
میرا سوتا، میری چاندی، میری منزل

(ظفر عباس ظفر، جدہ)

کچھ خواہشیں کچھ حسرتیں

ایک حسرت میں یہ دل کی مٹانا چاہوں
چاند تاروں سے تیری مانگ سجانا چاہوں
یہ کہ دن رات صنم پوجوں خیالوں میں تجھے
دل کا مندر تیری ہستی سے سجانا چاہوں

ایک حسرت یہ بھی ہے پیار سے
میں خود کو ڈبو کر تجھے پہنچاؤں کنارے
میں خود تو بھٹک جاؤں اندھیروں میں مگر دوست
راہوں میں سجا دوں تیری میں چاند ستارے

حسرت ایک اور بھی ہے دل بیقرار کی!
گھڑیاں تجھے نصیب ہوں ہر دم بہار کی
ہاں فقط تیرے لیے ہو یہ زندگی میری
شمع جلتی رہے یونہی سدا میرے پیار کی

ایک حسرت یہ بھی ہے میری!!
زندگی مسکرائے یونہی سدا تیری!
تیرے غم سارے بھر لوں اپنی جھولی میں
عمر لگ جائے تجھے جاناں میری

.. دل کی حسرت یہ بھی ہو پوری
ختم ہو جائے جو ہے مجبوری
فاصلے درمیاں کے مٹ جائیں
دو دلوں میں نہ رہے کوئی دوری

چاہتا ہوں دن رات میرے سامنے تو ہے
تو رہے اور صرف تو ہی تو رہے
حسرتوں کے پھول کھلتے رہیں یونہی سدا
میرے گلشن میں فقط تیری ہی خوشبو رہے

حسرت صنم کی اور نہیں ان حسرتوں کے بعد
لب پہ کوئی دعا نہیں ان حسرتوں کے بعد
ہو جائیں میرے دل کی پوری یہ حسرتیں
مانگوں گا اور کچھ نہ میں ان حسرتوں کے بعد

(قاضی محبوب علی صنم، ڈی جی خان)

حجاب عرفی لاہور

یادیں

آج بھی اس کو نظر کے سامنے پاتا ہوں میں
پیار کی بھولی ہوئی یادیں ٹھکراتا ہوں میں !
کیا تمہیں وہ چاندنی راتیں بھی یاد آتی نہیں
تم تو کہتے تھے کہ ستاروں کی قسم کھاتا ہوں میں
آہ! ان ٹوٹی ہوئی یادوں کو آ کر جوڑ دو
اب بھی یاد آتی ہے تیری بے چین ہو جاتا ہوں میں

(عارف ضیا خان . . .)

سوزِ محبت !

ملے کس کو یہ دردِ جہاں نہیں معلوم
گرے یہ برق کہاں آشیاں نہیں معلوم
قفس میں چین سے کٹتی ہے زندگی اپنی
بہار ہے کہ چمن میں خزاں نہیں معلوم
بہار آئی کہ بجلی گری گلستاں پہ !
غبارِ نور ہے یا ہے دھواں نہیں معلوم
جنونِ عشق میں پہنچا ہوں اس مقام پہ میں
کہ جس کا اہلِ خرد کو مکاں نہیں معلوم
جبینِ عشق ہے محوِ سجودِ شوق ہنوز !
حرم ہے یا کہ تیرا آستاں نہیں معلوم
مری تلاش میں خود گم ہے کاروانِ حیات
اسے بھی میرا مقام و نشاں نہیں معلوم
فلک بھی پوچھ رہا ہے یہ لے کے انگڑائی
شبیہ کس کی ہے یہ کہکشاں نہیں معلوم
ازل سے سن تو رہا ہوں فسانۂ الفت !
یہ ختم ہوگی کہاں داستاں نہیں معلوم
نمودِ سوزِ محبت میں کیا کہوں بیدلؔ !
کدھر چمن ہے کہاں آشیاں نہیں معلوم

(امداد بیدلؔ الہ آبادی، نواب شاہ)

*

سودائی

تو جسے چھوڑ کے راہوں میں پلٹ آئی ہے !
ہاں وہ ستار تیرا آج بھی سودائی ہے
زندگی روز کے ہنگاموں سے گھبرائی ہے
اس میں میری ہی نہیں تیری بھی رسوائی ہے
حسرتِ دید کہاں کھینچ کے لے آئی ہے
ساری دنیا یہاں اب میری تماشائی ہے
تیری الفت تو مقدر تھی ملی یا نہ ملی
اک تیری یاد ہی سرمایۂ تنہائی ہے
بھول جاؤ گے کبھی ہم نے یہ سوچا بھی نہ تھا
ساری دنیا کی طرح تو بھی تو ہرجائی ہے
تیری نظروں میں میرے پیار کی وقعت نہ سہی
دل میرا پھر بھی تیرے پیار کا شیدائی ہے

(عبدالستار خان نیازی، داؤدخیل)

منتشر سوچیں

اپنی قسمت میں ہی شفا نہ تھی
کون کہتا ہے کہ دوا نہ تھی
ایک صورت تھی زندہ رہنے کی
وہ بھی سنگدل کی منشا نہ تھی
وہ لوٹ کر آ جاتا بھلا کس طرح
اس کی فطرت میں ہی وفا نہ تھی !
وہ پاس رہ کر بھی دور رہا
کیا یہ جور و ستم کی انتہا نہ تھی !
میں اپنے ہی شہر میں رہتا کچھ دیر
یہ بھی دوستوں کی رضا نہ تھی !
کیوں دیکھتے ہی منہ اپنا پھیر لیا
اگر وہ مجھ سے خفا نہ تھی !
کس گناہ کی ملی ہے سزا مجھ کو
اختر نے کی کوئی خطا نہ تھی !

(اختر حیات بھٹہ کانسٹیبل اسلام آباد)

حمد ابدالرحمٰن لاہور

عہدِ شوق

ٹوٹے تعلقات کا اب واسطہ نہ دے!
تم ہو چکی کتاب جو اس کا پتہ نہ دے
اب تذکرے نہ چھیڑ مرے عہدِ شوق کے
جو بجھ گئی ہے آگ اسے پھر ہوا نہ دے
کچھ اس قدر فریب سہاروں سے کھا چکے ہیں
میں گر پڑوں گا خوف سے تو آسرا نہ دے
اب تک گزری عذاب کی گزری ہے یا رب!
کافی ہے زندگی مجھے دیگر سزا نہ دے
جس کی جبینِ شوق پہ لکھا تھا میرا نام
اب دور جا بسا ہے تو شاید بھلا نہ دے
شعلہ جو موجزن ہے محبت کا دل میں آج!
ڈر ہے کہ عمرِ غمِ دوراں بجھا نہ دے
گو چل پڑا ہوں دل سے مگر چاہتا ہوں یہ
اٹھ کر مجھے وہ روک لے اور راستہ نہ دے
کہنے کو کہہ تو دوں اسے مدعا ہے دل
وہ زود رنج ہے کہیں سن کر اٹھا نہ دے
جو کہہ رہا ہے آج سفینہ کو ناخدا،
یہ دیکھنا کہ عین بھنور میں دغا نہ دے
خالی نہ کوئی دولتِ اخلاص سے رہے!
نشتر کسی کو بھول کر بد دعا نہ دے

(عبدالرب نشتر حیاؔ بیلوی)

اندازِ ستم

وہ ساتھ رقیبوں آتے ہیں
اور دل میرا جلاتے ہیں
دیکھ کر مجھ کو اکثر وہ
نفرت سے آنکھیں جھکاتے ہیں
وہ ساتھ رقیبوں آتے ہیں
ڈال کے ایک نظر مجھ پر
بیتے مجھے یاد دلاتے ہیں
بے رخی کی تند ہواؤں سے
میرا آس چراغ بجھاتے ہیں
وہ ساتھ رقیبوں آتے ہیں
جو کل تھے میرے ہم سفر،
بُرا بھلا وہ آج سناتے ہیں
خبر نہیں اس سنگدل کو،
کیا مقدس پیار کے ناطے ہیں
وہ ساتھ رقیبوں آتے ہیں
ہر روز ان میں اک نیا
اندازِ ستم ہم پاتے ہیں
چلو تبسم موت سے کھیلیں،
ہم دل ایسے بہلاتے ہیں!
وہ ساتھ رقیبوں آتے ہیں
اور دل میرا جلاتے ہیں

(اعجاز احمد تبسم۔ کگرالی)

*

پھولوں کی سیج

کہتے ہو کب اثر ہوتا ہے دیوانے چاٹ پہ — تم بھی تو مکھی بیٹھنے دو اپنی ناک پہ
پھول ہمارا نہ نازک ٹہنی پہ موجود ہے — سوکھ کر گرے ہیں کئی اس خاک پہ
تم نے آوارہ سمجھ لیا ہمیں تو کیا ہے — مان لیا کہ تیرے ہیں ہم گھر پہ نہ گھاٹ پہ
تعریف تیری نہیں آتی مجھے پھولوں کی سیج پہ — آتی ہے تعریف تیری دیوانے میں ٹاٹ پہ
بیتی پھول کی گری ہم سمجھے کہ تم آئے ہو،
حیا نکلا گلی میں بار بار خالد نے ہر آہٹ پہ

*

(خالد حسین فاسیؔ)

جناب عرفان راہو۔

حوصلے

(یہ غزل میری نہیں، بلکہ مجھے پسند بہت ہے)

راتیں اداس، دن کڑے ہیں
اے دل تیرے حوصلے بڑے ہیں
اے یادِ حبیب ذرا ساتھ دینا
کچھ مرحلے سخت آن پڑے ہیں
رکنا ہو اگر تو سَو بہانے
جانا ہو تو راستے پڑے ہیں
اب کیسے بتائیں وجۂ گریہ
جب آپ ہی ساتھ رو پڑے ہیں
اب جانے کہاں نصیب لے جائیں
گھر سے مستانہ چل پڑے ہیں

(روبینہ محمد خان، چکوال)

غزل

زندگی کے گہرے اندھیروں میں!!
یوں دل نے داغ جلاتے رہے ہم!
زخم تو بہت گہرے آئے اس دل پہ لیکن
جینا تو ہر منزل پہ ساتھ نبھاتے رہے ہم
پردہ خوشی کا ڈال کے چہرے پہ
دردِ جگر ہر کسی سے چھپاتے رہے ہم
زندگی کی تپش نے جب بہت سلگا دیا مجھے
تم سے بھی اپنا درد چھپاتے رہے ہم
لُٹ ہی گیا میری خوشیوں کا قافلہ
دامن تو اپنا بہت بچاتے رہے ہم
میرے سامنے ہی جل گیا میرے پیار کا آشیاں
سب حسرتیں امیدیں اپنی خاک میں ملاتے رہے ہم
حالات کی زنجیروں نے کچھ اس طرح جکڑا
ساری عمر گردشِ دوراں میں سنبھلتے رہے ہم
کبھی نہ آئی کوئی بہار راس مجھے عباس
ہمیشہ خزاں کا در سجاتے رہے ہم

(ناہید بٹ، لاہور)

دو آنسو

(مرحوم کی یاد میں)

دو آنسو میری آنکھوں میں آ جانے سے پہلے
اکثر مجھے یاد آیا وہ تڑپانے سے پہلے
وہ شخص جو آج اس بھری دنیا میں نہیں ہے
تکتے ہیں یہ سب لوگ بھلائے جانے سے پہلے
وہ پیرِ مثال، پیکرِ ایثار و وفادار
کہتے ہیں بڑی چیز تھا مر جانے سے پہلے
رہتا ہے میرے شیشۂ احساس میں ہر دم!
اک دردِ ہجر دل کو قرار آنے سے پہلے
دو شیشے کے گھر ٹوٹ نہ جائیں میری آنکھو!
ان میں کوئی رہتا ہے ٹپک جانے سے پہلے
دیتے ہیں دعائیں تجھے اے شمعِ فروزاں
جلتے ہیں ترے غم میں جو پروانے سے پہلے
غیروں نے بھرم رکھ لیا ایفائے وفا کا
میں شکر ادا کرتا ہوں غم کھانے سے پہلے
واحد مجھے یاد آتے ہیں اب وہ مرے اپنے
جو بھول گئے، بن گئے بیگانے سے پہلے

(واحد کھیوڑوی، جدہ)

یادیں

معصوم سا چہرہ تھا حسین پہ ہنستے تھے ہم فدا
نہ ہوں گی ان کی یادیں دل سے کبھی جدا
کیسے سہارے دن گزر رہے تھے اپنے
اک دم کیسے ہوگئی ہے یہ دوری اے خدا
کہاں ہو، کدھر ہو، کچھ تو آکے بتا!
دل کی دھڑکنیں تجھ کو دیتی ہیں یہی صدا
رہیں وہ سدا خوش مری جاں کے مالک
ہر وقت دیتا رہوں گا ان کو یہی دعا
رب دید کے آ گئے ہیں دیارِ غیر میں ناصر
شاید خدا کو پسند نہ تھی اپنی یہ ادا

(ناصر محمود کیانی، شارجہ)

جوابیلر حق لاہور

وفاؤں کے جنازے

چند لمحوں کے لیے پیار بھی ہوتے دیکھا
پھر سدا دامنِ بے خواب بھگوتے دیکھا
دوستی میں بھی عداوت کی مثالیں دیکھیں
نفرتوں کو سرِ عام خوار ہوتے دیکھا
کیا سفر تھا کہ وفاؤں کے جنازے نکلے!
راہبر جاگ اٹھے، رہنما سوتے دیکھے
وہ حسیں لوگ بھی کیا لوگ تھے، جن کی خاطر
ہم نے پتھر کے خداؤں کو بھی روتے دیکھا
وہ کہ جو مجھ سے بہت پیار کیا کرتے تھے!
ان کو بھی گردشِ افلاک میں کھوتے دیکھا
زندگی بھر کی وفا پل میں ہوئی خاک تبسم
جو کبھی ہم نے سنا بھی نہ تھا ہوتے دیکھا

(پرنس تبسم جاوید خان، شیخوپورہ)

آبلہ پا

سینہ پہ سنگ رکھ کر ناکام آرزوؤں کو
سوختہ دل کی اتھاہ گہرائی میں دبا چلے
برگشتگیٔ قسمت کے سبب کھو دیا جسے
اسی منزل کو پانے، سوئے صحرا چلے
بھر بھر کر ملے اغیار کو جام ہائے صہبائی
تشنہ لب تری محفل سے ہمی ساقیا چلے
زندگی کی راحتوں کو تیاگ دیا تیرے لیے
بے تابیاں سمیٹ کر دامن میں، آبلہ پا چلے
نذر کیں عمر بھر چاہ کی تیری ہی حسرتیں.
کیا تھا عہد ہم نے جو آج وہ نبھا چلے
بس اک بات کافی ہے ناجی مرے شرف کو
ان کے آستاں پہ آئے، یہ انداز گنوا چلے

(ذاالاثر ناجی، راولپنڈی)

دیوار

حقیقت میں تمہیں مجھ سے نفرت ہے اگر
صاف کہہ دو زباں سے مجھے اعتبار آجائے
اگر ہے محبت تو جب بھی بتا دو
تب ٹوٹے دل کو تم پہ پیار آجائے
سمجھ نہ سکا اب تک تیری یہ چال ظالم
کبھی نفرت کرو مجھ سے کبھی پیار آجائے
تیری نفرت سے میری محبت کم نہ ہو گی!
وہ دل نکو نہیں جب خزاں میں بہار آجائے
آہ بھروں جو ٹوٹے دل سے صنم!
تو کیا ہے سوز پار در و دیوار آجائے

(ایم سلیم سوز، نوابشاہ)

اپنا درد

سرگوشیوں پہ اٹھ گئی دیوار دوستو
بنتا ہے سخن پوش میرا یار دوستو
کچھ اور بے نیاز وہ ہوتے چلے گئے!
چاہت میں جان کی گیا گھر بار دوستو
ہم روز جیے اور مرے چاہ میں اس کی
آیا نہ بن کے وہ کبھی غم خوار دوستو
میرے سخن کو غیب کا مضمون نہ جانیے
اپنے ہی درد کا ہے یہ اظہار دوستو
وہ کیا گئے کہ چشمِ طارق خون فشاں ہے
چلنے لگی ہے ہجر کی تلوار دوستو

(طارق دکھی، دھمہ شریف)

نعت شریف

بڑی شان والے ہمارے محمد صلی اللہ علیہ وسلم
ہمارے دلوں کے سہارے محمدؐ

ہے شیریں سخن ہی صدائے محمدؐ
وہ خیرالوریٰ نام پائے محمدؐ

وہ سارے ہی نبیوں سے اعلیٰ و ارفع
رحمۃ اللعالمین کہلائے محمدؐ

ہیں جبرائیلؑ جا کے جہاں ٹھہر جاتے
ہے اس سے بھی آگے مقامِ محمدؐ

میرے دل سے پوچھو جو حالت ہے میری
مجھے طلب ہے بس دیدارِ محمدؐ

مجاہد جا کے بابِ حرم چوم لینا
اگر تجھ کو مدینہ بلائے محمدؐ

(محمد احمد مجاہد، جدہ)

ساجن

لکھے گئے ہیں یوں میری قسمت میں اندھیرے
نہ خواب ہے نہ خیال کہ دیکھیں گے سویرے

تو نے کیوں چھوڑ دیا سنگ میرا، میرے ساجن
سانسیں ہیں اٹکتی جیا نہ جائے بن تیرے

روتے ہیں ستارے، چاند بھی تیرے بہانے
آج کیوں ہو پرائے کل تک تو تم تھے میرے

زندگی گامزن ہے اداس راہوں پہ بہاروں میں
چبھے کانٹے مرے دل میں، ہر سُو پھولوں کے ڈھیرے

کون کہتا ہے کہ اب ہم نہ رہیں گے تمہارے
یک جاں تھے ازل سے ابد تک رہیں گے تیرے

میں نے جب چمن سے اک مہکتا پھول مانگا
رو رہا ہے ان سے زخمی باغباں نے جو خار بکھیرے

(رکیہ رانی)

گلشن کی قضا

پیار کی نظروں سے دیکھا جب کسی نے بار بار
سامنے میرے مگر تیری وفا آتی رہی

وقتِ رخصت پلٹ کر دیکھا جو میں نے دُور سے
شور و شین میں کسی کی اک صدا آتی رہی

دوستوں نے خوب میرا بوجھِ غم ہلکا کیا
جن پہ تکیہ تھا مجھے، ان سے جفا آتی رہی

تم بتانے کے لیے چند راز داں ایسے ملے
جن کے ہاتھوں میرے گلشن کی قضا آتی رہی

سوچتا ہوں آسماں سے دل لگا کر کیا ملا،
نکلی جو آہ! تو ردِ میری دعا آتی رہی

ہائے ان کی سادگی حیدرؔ کہ میت پہ مری!
دیکھنے سے منہ میرا، جن کو حیا آتی رہی

(ایم اے حیدر کاظمی، آزاد کشمیر)

دلِ مضطرب

دیارِ غیر میں رہ کے کیا کیا بتیں سناؤں
جی رہا ہوں کس حال میں، کیا تمہیں بتاؤں

بدنصیب ہوں ایسا کہ ترس رہا ہوں تمہیں ملنے کو
یہاں پہ ہوں اکیلا، کیسے جی کو بہلاؤں

نہ ہمدم، نہ ہمراز، نہ اپنا ہے کوئی!
بجھ چکے ہیں جو دیے کیسے انہیں جلاؤں

اپنے بھی رخ بدل کر ملتے ہیں جہاں میں!
دلِ مضطرب کو آج میں کیا کیا سمجھاؤں

تمہیں چھوڑ کر اکیلا آ گیا ہوں یہاں پر!
مجرم جو بن چکا ہوں کیسے سکوں میں پاؤں

یہی سوچ کر التجا کرتا ہے تجھ سے ندیمؔ!
خطا معاف کر دے زاہدہ کہ دم گھٹ کر نہ مر جاؤں

(ظفر اقبال ندیم، جدہ)

غم کے بادل

چاروں طرف غم کے بادل چھا رہے ہیں
نشیمنِ دل میں آرزوؤں کے گھٹتے سے رہے ہیں
غم کا نام تو سنتے چلے آتے تھے
آشنائی ہوئی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں
اپنی بربادیوں کی داستاں چھوڑ گئے
کہ تیری زندگی سے بہت دور چلے آتے ہیں
بار بار پھر قسمت آزمانے کو یہ ہم
تیری محفل میں دوبارہ چلے آتے ہیں
خود برباد ہو کے بھی تیری دنیا بسا گئے
تیری یاد میں آج بھی آنسو نکل آتے ہیں

(ایم ایس تاشاد، جدہ)

باتیں!

چھوڑو بھی یارو یہ رشتوں کی باتیں
یہ اپنوں کے قصے یہ غیروں کی باتیں
حقیقت کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے
محبت کی باتیں ہیں سپنوں کی باتیں
کوئی بھی نہیں کرتا روحوں کا سودا
ہر کوئی کرتا ہے جسموں کی باتیں
ان کو سمجھنے کے لیے ہے "ڈکشنری" ضروری
انوکھی نرالی ہیں سب مردوں کی باتیں
دو بول پیار کے سننے کو ترستے ہیں ہم تو
ریڈیو ہمیں سناتا ہے جنگوں کی باتیں
غریب بے چارہ کیسے کرے لڑکی کی شادی
لڑکے والے کرتے ہیں محلوں کی باتیں
ہمیں تلاشِ آب و دانہ سے فرصت نہیں
مورکھ ہو گے آصف "پیسوں" کی باتیں

(سید منظور آصف، حاصلپور)

غزل

اپنے کو پرکھنا تو بڑی بات نہیں ہے
اوروں کو پرکھنے کی تو ہمت ہی نہیں ہے
جو ہم پہ گزرتی ہے جدائی میں ستمگر
معلوم نہیں ان کو خبر ہے کہ نہیں ہے
کہتے ہیں محبت ہے ہمیں صبح کا تارا
جو درد اِدھر ہے وہ اُدھر ہے کہ نہیں ہے
بیٹھے گے تمہیں مانگ کے قدرت سے اپنے
کچھ اپنی دعا میں بھی اثر ہے کہ نہیں ہے
معلوم ہے جانا ہے کسی روز جہاں سے
کچھ پاس مگر زادِ سفر ہے کہ نہیں ہے
تیرا ہی خیال اور تصور ہے شب و روز
اب اور کوئی راہ گزر ہے کہ نہیں ہے
اتنا بھی ظلم کوئی کسی پر نہیں کرتا
ظالم تمہیں خدا کا بھی ڈر ہے کہ نہیں ہے

(سردار محمد طاہر تبسم، راولپنڈی)

دُور کا تارا

طوفانِ زندگی میں کوئی نہیں سہارا
میں موجِ دریا میں اور دور کنارا
اس دن کو بہت رویا ہوں یارو!
قسمت نے جب بگاڑا کھیل ہمارا
یہاں تو کوئی اور نہ تھا ہم سخن
ہوئے مضطرب جب چھوٹا ساتھ تمہارا
ہم تو آئے تیری انجمن میں بار بار
افسوس کہ دیکھ کر بھی تو نے نہیں پکارا
تیرے بعد پھر یہ زمانہ کہے گا آزاد
زندگی کی حسرت میں مر گیا بے چارا

(ایم فاروق صدیقی آزاد)

تشنہ تشنہ

تپتے ہوئے موسم سے اکثر میں نے انعام لیا ہے
مجبوریاں تنظیم کی خاطر کانٹوں سے الزام لیا ہے
تیری برہم نظروں سے تو میری قسمت کھیل رہی ہے
جو کچھ ہے اب کچھ بھی میں نے بھی دل تھام لیا ہے
تشنہ تشنہ میری قسمت، خالی خالی میرا شیشہ
روٹھے ہوئے ساقی سے میں نے ٹوٹا سا اک جام لیا ہے
بکھرے قصے میری باتیں، میرے افسانے ہیں ہر سُو
آنسو کی اک بوند سے دیکھو میں نے کتنا کام لیا ہے
گردوں سے جب بجلی ٹپکی، گلشن سے جب شعلے اٹھے
ایسے میں گھبرا کر میں نے ان کا دامن تھام لیا ہے
دل کی بیتابی میں آزاد فرق نہ آیا کوئی اب تک
ورنہ میں نے تنہائی میں نام کسی کا عام لیا ہے

(ازہر احمد آزاد، کویت)

تجھ بن

تجھ بن محفل سُونی سُونی کس کو گیت سناؤں
دنیا ساری غیر ہے کس کو حال سناؤں
لاکھ جتن کر ڈالے لیکن کوئی راہ نہ نکلے !
روٹھ گیا ہے میرا دلبر کیسے اسے مناؤں
پیارے سُندر سُندر سپنے دکھلانے والے
مجھ کو یہ بتا کہ کیسے اپنا دل بہلاؤں
بھٹک رہا ہوں چاک گریباں لیے صحرا صحرا
لیکن تیرے نقشِ پا کا کوئی نشاں نہ پاؤں
لفظوں سے جاوید ہمارے چیخیں اٹھ رہی ہیں
درد کا عرفاں پڑھنے کو ہے کیسے گیت میں گاؤں

(جاوید انور خان، جیلو موڑ)

نفرت یا محبت

میری زندگی کو اگر اپنے نام لگا لیا ہوتا،
مرتے ہم دونوں اکٹھے اگر ہم سے دل لگا لیا ہوتا
بہ ہر قسم بہار خدا سے مانگا تھا میں نے !
کیا ہوتا اگر ایک بار مسکرا دیا ہوتا
تمہیں ہم سے نفرت تھی اور ہمیں تم سے محبت
کیا جاتا اگر ہمیں پیار سے اک بار بلا لیا ہوتا
اچھا ہی ہوا جو تم نے دل نہیں لگایا ہم سے
بے وفائی خود کرتے اور الزام ہم پہ لگا دیا ہوتا
دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں میں نازؔ
اچھا ہوتا اگر جان تم پہ قربان کر گیا ہوتا

(اصغر علی نازؔ، الوطھبی)

یہ راز

جتنا بھلاؤ گے تم بھلایا نہ جائے گا
پکڑا جو آنچل تو چھڑایا نہ جائے گا
کب تک چھپاتے پھرو گے محبت کو صنم !
یہ راز ہرگز تم سے چھپایا نہ جائے گا
ناصح نہ چھیڑ قصۂ غم اپنی راہ چل
پھر آنسوؤں کو تم سے دبایا نہ جائے گا
ہنستے ہو دیکھ دیکھ کے تم حالِ غم میرا
تیر نظر سے دل کو بچایا نہ جائے گا
پیاری پیاری آنکھوں سے مت دیکھو دلربا
الفت کا بار تم سے اٹھایا نہ جائے گا
شاہد ہے ذرا ذرا تیری کج ادائی کا
پرنس کی طرح کسی کو رُلایا نہ جائے گا

(ایم اسلم پرنس، علی پور)

*

دامنِ اشک

زخم دل کے جب کبھی مسکراتے ہیں
قہقہے ٹوٹ کر اشکوں میں بدل جاتے ہیں
قربتوں کے فاصلے طویل ہو گئے جدائی میں
ستارے گردش سے اب دکھائی دیتے ہیں
ہوئے دنیا سے فارغ، گھر گئے سب لوگ
دامنِ اشک لیے وہ اب چلے آتے ہیں
کوئی ہو قدرداں تو دیکھے شکستہ دل کو
مسرت کے قصے دل کو ہی سناتے ہیں
نہ ملا کوئی ہمدم زمانے بھر میں تنہا
دوست دشمن، سب کو ہی دعا دیتے ہیں

(ایم صدیق چوہدری، راولپنڈی)

لگاؤ

روپ کی دولت رکھنے والے کریں گے جب بھاؤ
سونے جیسے زخم ملیں گے، چاندی جیسے گھاؤ
جھوٹی گواہی دینے والا اکثر بیٹھا کانپے،
بات وہ موڑ کر کرتا جیتی، بڑھتا تھا الجھاؤ
سنتا ہے اسے آج لپیٹا ہے اک زہریلا ناگ،
جس صندل کے پیڑ سے مجھ کو برسوں رہا لگاؤ
بیچ سڑک پر کل یہ دیکھا پاگل سا اک شخص
ہاتھ اٹھا کے چیخ رہا تھا مجھ سے مجھے بچاؤ
نئے پرانے قصے لیکر ہوتے ہیں اک جا لوگ
مدت سے چوپال سے شوقی دہکا نہیں الاؤ
جتنے داتا دانشور ہیں بیٹھے ہیں سب گھات لگائے
نہ جانے کس پل میں ان کا لگ جائے کوئی داؤ
سارے مانجھی گھروں کو لوٹے بیکل ہوئی ہے شام
لے جا کر اب تم بھی باندھو کسی کنارے ناؤ

(امداد بیدل، نوابشاہ)

*

اگلے سال

جب اگلے سال یہی وقت آ رہا ہوگا
کسے خبر ہے بھلا کون کس جگہ ہوگا
[illegible] تمہیں دیکھ دیکھ سوچتا ہوں
تو عمر سے یا تو عقل بدل چکا ہوگا
ہم اپنے اپنے گھروں میں بھٹک چکے ہونگے
[illegible] نہ مجھ کو تیرا پتا ہوگا

(رحمت اللہ خان، موچھ)

پرانی محبت

یاد آ کے رہ گئیں وہ پرانی محبتیں!
گزرے ہوئے دنوں کی سہانی محبتیں
دیوارِ اعتماد بھی کس وقت آ گری!
ہم نے تھیں جب خوشی سے لٹائی محبتیں
ہر شخص اعتبار کی حد سے گزر گیا،
پھر کیا کسی سے اتنی بڑھائی محبتیں
مصروفیتیں ہوس کی ہیں ہر گام پہ کھڑی،
اس دور میں محال ہیں نبھانی محبتیں!
یہ میں ہی جانتا ہوں کسی کو ہے کیا خبر،
مشکل ہیں کتنی کر کے نبھانی محبتیں!
کیوں یاد کر کے اپنے جگر کو لہو کریں،
جب خواب بن چکی ہیں پرانی محبتیں،
مجھ سے محبتوں کی نہ تفسیر پوچھیے!
دل کی تپش ہیں آنکھ کا پانی محبتیں
وہ شخص اپنی سوچ کے محور سے ہٹ گیا
جو دے گیا تھا ہم کو نشانی محبتیں
ایماں محبتوں سے اٹھا لوں کہ اب نذیر
لگتی ہیں ایک جھوٹی کہانی محبتیں!

(نذیر احمد خان، سنجوال)

تحریر۔ مختار احمد صدیقی ہری پور ہزارہ

شمارہ! ذرا جلدی سے میرے بیڈ کی چادریں وغیرہ درست کر دو اور یہ سیب کے چھلکے بھی ادھر ہٹا دو۔

کیوں باجی! خیریت تو ہے..؟ میں ان کی گھبراہٹ پر پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

وہ آج... آ رہے ہیں... باجی کھڑکیوں کی اوٹ سے باہر دیکھتے ہوئے بولیں۔

میں نے باجی کی نگاہوں سے نگاہیں ملا کر باہر دیکھا اور پھر شہادت کی انگلی کا اشارہ کر کے پوچھا۔

باجی! کہیں وہ سرخ شرٹ والے تو نہیں انور..؟

ہاں ہاں.. وہی ہیں مگر تم سے جو کہا ہے! وہ ذرا غصہ دکھا کر بولیں۔

جی... جی باجی! یہ لیں... میں نے چادریں وغیرہ درست کر دیں اور سیبوں کے چھلکے اٹھاتے ہوئے کہا۔

چند لمحے بعد انور وارڈ میں داخل ہوئے۔ ایک سرسری نگاہ پورے وارڈ میں دوڑائی۔ اور باجی پر نگاہ پڑتے ہی ادھر کو چل دیئے۔

قریب آئے تو باجی نے انور کو بڑے چاؤ سے آداب کہا۔ پھر میں نے بھی انہیں سلام کیا۔ اور اٹھ کر کرسی ان کی جانب بڑھا دی۔ انہوں نے بیٹھتے ہوئے جب میرا نام لے کر حال پوچھا تو میں کچھ جھینپ سی گئی۔ اور بڑی لجاجت سے "ٹھیک ہوں" کہا اور باجی کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔

باجی اور انور باتیں کرنے لگ گئے۔ نور کی مدھم سی آواز... چھوٹے چھوٹے فقرے... اس پہ رک رک کر بات کرنے کا سٹائل، معصوم صورت... میرے دل کو یہ سب کچھ بھا گیا۔ میں کن انکھیوں سے ان دونوں کو باتیں کرتا دیکھ رہی تھی کہ باجی کا ٹہوکا لگا...

شمارہ... انور صاحب کو چائے نہیں پلاؤ گی کیا..

اس سے پہلے کہ انور کوئی معذرت کرتے.. کیوں نہیں باجی! کہہ کر وارڈ اٹینڈنٹ کو چائے لانے کا کہنے کے لیے باہر نکل آئی.. ادھر ادھر دیکھا مگر اٹینڈنٹ نظر نہ آیا۔ تو کینٹین کی جانب میں خود چل پڑی... اس لیے غیر دانستہ طور پر قدم تو کینٹین کی جانب اٹھ رہے تھے مگر ذہن انور کے تصور میں گم تھا...

یہ انور کو میرا نام کیسے معلوم ہو گیا۔ اور پھر انہوں نے مجھے بغیر دیکھے پہچان [illegible]...! [illegible] پھر۔

یقیناً باجی نے ان کو میری تصویر دکھائی ہو گی۔ میرا تعارف کرایا ہو گا۔ کیونکہ باجی انور کی باتیں میرے سامنے بھی کر کر تھکتی نہ تھیں۔

باجی سے انور کی [illegible] بڑی [illegible] پھر جب انور کو میں نے خود [illegible]... جانے کیوں جی چاہتا [illegible] باجی سے [illegible] اگر باجی ادھر ادھر ہو جاتیں تو انور [illegible] نگاہوں سے [illegible]...

میں نے اپنی زندگی میں بھی ایک ایسی تمنا کی تھی جس کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا [illegible] پر ہنسی بھی کہ بیگل کبھی ایسا کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص بیٹھ کر ہمیشہ یونہی میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہے.. کسی کا دل بہلاتا رہے اور اکتا نہ جائے

جب میں چائے کا کہہ کر واپس آئی تو باجی بہت ہنس رہی تھیں... چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے کہ انور صاحب! خدا کے لیے [illegible] تاکہ اب میں تھک ہی جاؤں...

نعیمہ..! تمہیں کون کہہ رہا ہے کہ اتنا ہنسو کہ ہنس ہنس کے تھک جاؤ۔ انور صاحب نے مسکرا کر کہا تو باجی پھر سے کھلکھلا اٹھیں...

پوچھنے پر پتہ چلا کہ انور نے اوپر تلے دو لطیفے سنا دیئے ہیں۔ جس وجہ سے باجی کھلکھلاتی جا رہی ہیں۔

کچھ دیر بعد انور چلے گئے تو میں نے ذرا لاپرواہی سے باجی سے دریافت کیا۔

باجی یہ صاحب... یعنی انور صاحب ہیں کیا بلا.. ذرا تعارف تو صحیح ہو جائے۔

ارے...! اتنی بڑی کوئی بلا نہیں۔ صرف سٹینو گرافر ہیں لیکن اچھے آدمی ہیں... باجی نے مختصر جواب دیا۔

اچھے آدمی ہیں... یہ ان کی باتوں سے ہی ظاہر ہوتا

ہے... میں نے گھڑی دیکھ کر اپنا پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔

کیا تم گھر جا رہی ہو..؟ باجی کو میرے انداز سے صحیح اندازہ ہوا تھا۔

ہاں نا... باجی.. ایک تو ڈیوٹی ٹائم ختم ہو چکا ہے اور دوسرے امی بھی آپ کی خیریت پتہ کرنے کی منتظر ہوں گی... میں نے کہا۔

اچھا... ٹھیک ہے جاؤ۔ اور امی کو میری خیریت بتا دینا۔ اور تسلی بھی دینا.. باجی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

بہتر تو... خدا حافظ۔

خدا حافظ.. باجی نے کہا... اور میں ہاتھ اٹھا کر ہراتی ہوئی وارڈ سے نکل آئی"...

صرف میں اور باجی اپنے والدین کی کل کائنات تھیں ابو ایک قومی ادارے کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھے۔ محدود سی آمدنی تھی۔ لیکن اخراجات بھی اتنے لمبے چوڑے نہ تھے۔ اس لیے ہماری تعلیم پہ بھرپور توجہ تھی... باجی نے بی۔ اے پاس کر لیا تھا اور میں نے ابھی فرسٹ ایئر کا امتحان دیا تھا۔

باجی کافی دنوں سے سروس کرنا چاہتی تھیں۔ مگر امی ابو اجازت نہیں دے رہے تھے۔ باجی اس مخالفت کے باوجود اندر ہی اندر اپنی سروس کے لیے کوشاں رہیں۔ اور ایک دن یہ خبر سنائی کہ انہیں ایک ٹریولنگ ایجنسی میں سینئر کلرک کی نوکری مل گئی ہے۔

بڑی مشکل سے پہلے امی کو منایا پھر ابو بھی مان گئے... باجی ڈیوٹی پہ جانے لگیں۔ پھر پہلی تنخواہ ملی تو باجی کی خواہش پہ مٹھائی تقسیم ہوئی... خوشی منائی گئی...

باجی کی تنخواہ سے آمدنی بڑھی تو رہن سہن اور بہتر ہو گیا۔ باجی پہلے بھی نفیس طبیعت کی مالک تھیں۔ اور اب تو اپنی ذات سے بڑھ کر گھر کی سجاوٹ تک چلی آئیں۔ اور ان کی تنخواہ کا زیادہ حصہ گھر کی آرائش کی نذر ہو جاتا۔ مگر خوشی اس بات کی تھی کہ گھر کا کونہ کونہ خوبصورت ہوتا جا رہا تھا۔

اس بات کے تذکرے یہ عموماً کہا کرتیں کہ ہمارے دفتر کا ایک لڑکا ہے انور... بالکل میری طرح کی طبیعت کا مالک.. حساس اور نفیس...

باجی کی یہ دو عادتیں بڑی ہی اچھی تھیں۔ اور وہ انہیں عادتوں کی بدولت بہت جلد اپنے دفتر کی ہر دلعزیز شخصیت بن گئیں...

جہاں تک تعلق تھا گھر کی سجاوٹ کا تو ایک دفعہ باجی انور کے ہاں برتھ ڈے پارٹی پہ گئیں اور جب وہاں سے واپس آئیں تو بس ان پہ گھر کو خوبصورت بنانے کا جنون سوار ہو گیا عموماً کہتیں...

انور کے ڈرائنگ روم کی بناوٹ ایسی ہے انور کے مکان کی راہداری میں ایسے ایسے گملے رکھے ہیں.. ان کا گھر بڑا صاف ہے۔ وغیرہ وغیرہ

ایک دن باجی مجھ سے کہنے لگیں۔ سوچتی ہوں کہ انور دفتر کے سارے اسٹاف سے کتنا مختلف ہے... کتنا ہی اچھا ہے۔ اس نے ہر کام میں میری مدد کی... ہر دفعہ یہ میرے کام آیا... سوچتی ہوں کیوں نہ کسی دن اسے کسی بہانے چائے پہ بلا لوں... مگر اپنا گھر بھی اس قابل ہو جائے نا۔

باجی کی یہ سب باتیں سن کر نہ جانے کیوں میرے دل میں انور کو دیکھنے کی بے چینیاں کروٹیں لینے لگیں۔ آخر ایک دن میں نے کہہ دیا کہ باجی! انور اگر اتنے اچھے آدمی ہیں تو ایک دن انہیں بلا لیں... گھر کی کیا بات ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی دیکھیں گے نا کہ ہم غریب ہیں..

چلو ٹھیک ہے اشارہ! تمہاری بات مان لی انہیں کسی دن انوائیٹ کر ہی لیتی ہوں... اتفاق کی بات ہے کہ انور کو بلانے کا دن تعین کرنے سے پہلے ہی اچانک باجی بیمار پڑ گئیں۔ انہیں ٹائیفائڈ ہو گیا۔

گھر علاج کرنے سے افاقہ نہ ہوا تو ہسپتال داخل کرا دیا۔ اور آج جب انہیں باجی کی علالت کا پتہ چلا تو خود ہی ملنے چلے آئے۔

میں نے جب انور کو دیکھا تو وہ واقعی مجھے باجی کی تعریف کا عکس نظر آئے۔ ان کی باتیں اور طور اطوار دیکھ کر میرا جی چاہا کہ ان سے کہہ دوں۔

انور صاحب: باجی نے تو آپ کی تعریفوں کے پل باندھ کر مجھے آپ کا دیوانہ بنا دیا تھا۔ اور میں تو آپ کو دیکھنے کی... ملنے کی تمنائی ہو چکی تھی... مگر جب انہیں دیکھا تو سوائے سلام کے اور کچھ نہ کہہ سکی۔

اس دن کے بعد انور کا ہسپتال میں آنا روز کا معمول بن گیا۔ جب تک باجی وہاں رہیں۔ وہ باقاعدگی سے روزانہ انہیں دیکھنے کے لیے آتے رہے۔ عموماً میں باجی کے پاس دوسرے دن جایا کرتی تھی۔ مگر اب انور کے آنے کی وجہ سے باجی کو دیکھنے کے بہانے ان سے ملنے میں بھی روزانہ ہسپتال جانے لگی تھی۔

انور کی عادتیں، ان کا رکھ رکھاؤ تو جیسے میرے دل میں گھر کر گیا ... وہ تو میری کمزوری بن کر رہ گئے۔ میں انہیں دل و جان سے چاہنے لگی۔ پھر میرا جی چاہتا کہ یہ شخص مجھے مل جائے ... ہمیشہ میرے ساتھ رہے ... محبت بھری باتیں ... صرف اور صرف میرے لیے ... میں انہیں سنتی رہوں اور اسے ... ہوں ...

کتنی معصوم سی آرزو تھی ... کتنا پاکیزہ جذبہ تھا اس احساس کے پس پردہ ... جسے صرف میں محسوس کر رہی تھی۔ مگر اپنے اس جذبے کا اظہار انور کے سامنے ہمت کرنے کے باوجود نہ کر سکی۔ اور میں یہ سوچ کر کہ اگر انور نے باجی سے میری شکایت کر دی تو باجی .... میری وہ باجی جو مجھ سے انتہا پیار کرتی ہے۔ محض میری بے باکی پر مجھ سے ناراض ہو جائے گی۔ اور باجی کی ناراضگی مجھے کسی صورت منظور نہ تھی۔

تین ہفتے ہسپتال رہنے کے بعد باجی گھر آ گئی تھیں۔ باجی گھر آئیں تو انور بھی ہمارے گھر آنے لگ گئے۔ ان کے آنے سے ہمارے گھر میں رونقیں کچھ اور بڑھ گئیں ... پھر میرے لیے تو ویسے بھی خوشی کی بات تھی ...

جب وہ آتے تو ان سے شرارتیں .. مذاق .. میں انہیں طرح طرح سے ستاتی ... کبھی کبھی تو میں ان کے گلے میں بچوں کی طرح جھول جاتی ... ایسے میں مجھے بے پناہ سکون سا مل جاتا ... مجھے اپنی محبت قریب تر ملتی تو مجھ میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ جاتی ... ہر وہ میری پسند جو تھے۔

کبھی نہ تھمنے والا وقت کا دھارا بہتا رہا۔ باجی کی سرجری کو دو سال ہو چلے تھے۔ اب تک انور کی حیثیت ہمارے گھر میں ایک فرد کی سی ہو گئی تھی۔ وہ ہم سب کی سر آنکھوں پر رہنے لگے تھے ... ہر بات سے قطع نظر ان کے لیے میرے احساسات وجہ بات کیسے تھے ... وہ میں نے لیے کیا تھے ... یہ تو میرا دل تھے ... یہ میرا دل ہی جانتا تھا ... بس میں منتظر تھی ان کے کسی ہلکے سے اقرار کی۔

انور کے کسی اقرار کا نشان تو نہ ملا ... مگر ان کی محبت بدستور بڑھتی رہی۔ میں نے بھی اپنی چاہت میں کمی نہ آنے دی۔ اپنی محبتوں کے کھل ... دم ان کے قدموں میں بکھیر کرتی رہی۔ اور اپنے دل میں ان کی محبت کا دیا جلائے ایک خاموش طوفان میں اپنی منزل کا نشان تلاش کرنے کی جستجو میں آگے بڑھتی رہی۔ مگر ابھی رہگذر ہی تھی کہ اچانک ایک ایسا زلزلہ آیا۔ جس نے میرے خوابوں کا تاج محل زمین بوس کر کے رکھ دیا۔

انور کی باجی سے منگنی ہو گئی!!!

میری اولیں محبت کے دوش پر میری زندگی میں داخل ہونے والا یہ ایک ایسا المیہ تھا جس نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا میں کوئی شکوہ کیے بغیر پاش پاش ہو گئی ... میری ہر کیفیت میری شوخیاں مدھم پڑ گئیں ... پہننے اوڑھنے کے اطوار بدل گئے ... میں کسی کھلونے کی طرح ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔

مجھے باجی سے اچانک نفرت سی ہو گئی ... میرا رویہ ان سے کچھ کھردرا ہو گیا ... لاپرواہ ہو گئی ... وہ اکثر میرے اس رویے پر مجھ سے کہتیں۔

ثمارہ! آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے ...؟

ان کے سوال کا میرے پاس صرف ایک جواب ہوتا۔

آپ کو یہ غم کیوں ہے کہ مجھے ہو کیا گیا ہے ... آپ خوشیاں منائیے ... اور وہ بے چاری میرے اس جواب پر میرا منہ تکتی رہ جاتیں۔

ایک بار امی نے ختم پڑھوانے کا پروگرام بنایا ... تو باجی نے دفتر سے چھٹی لے لی ... گھر کو درست کرنا تھا۔ اور امی کا ہاتھ بھی بٹانا تھا ...

میں حسب معمول کالج سے لوٹی تو دیکھا کہ گھر کا ہر کونہ سجا ہوا ہے۔ پھر جب اپنے کمرے میں گئی تو میرا کمرہ بالکل نئے انداز سے ترتیب پا چکا تھا ..

اس سے میں سوچنے لگی۔

میرا رویہ باجی سے کیسا ہے اور باجی میرے ساتھ کیسی؟

مجھے ان سے یوں بے رخی سے پیش نہیں آنا چاہیئے۔۔ آخر وہ میری نوکرانی تو نہیں ہیں.... بہن ہیں۔۔ ایک ایسی بہن جو میری تیخ ترش باتیں سن کر بھی مسکرا دیتی کہ میرے جوتوں تک صاف کر گئی ہیں.... مجھے اپنے رویے پر ندامت آنے لگی...

پھر سے باجی پر پیار آنے لگا۔ ۔ میں سوچنے لگی کہ انور ایک خوب صورت، دل و جان کا مالک ہے اگر باجی کے مقدر کا ستارہ روشن کر رہا ہے تو مجھے ان کی خوش قسمتی پر رشک کرنا چاہیئے نہ کہ ان سے جلیس ہونا چاہیے... پھر انور... بے بھی تو باجی کی دریافت۔۔ انہوں نے اسے اپنا لیا ہے تو میرا حق تو نہیں مارا... اس میں ان کا کوئی قصور بھی تو نہیں ہے نا...

مجھے باجی سے اپنا رویہ نارمل کر لینا چاہیئے۔۔ ہاں نارمل۔۔ بالکل پہلے جیسا۔۔

دوپہر ڈھل رہی تھی۔ مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ میں نے بھی سلیقے سے کپڑے پہن رکھے تھے... باجی سے حتی الوسع خوش ہو کر باتیں کرنا چاہتی تھی مگر باجی کچھ کترا رہی تھیں۔۔ یہ الٹ معاملہ میری سمجھ سے بالا تر تھا۔ بہر حال میں نے مہمانوں کی موجودگی کے پیش نظر اس بات پہ زیادہ توجہ نہ دی اور نہ ہی باجی کو زیادہ بلایا۔

مہمانوں کا جمگھٹا جب زیادہ بڑھا تو چہل پہل سے سب ہی خوش تھے۔ مگر باجی کچھ سنجیدہ لگ رہی تھیں... شاید ذمہ داری کا احساس تھا... بہر حال شام بڑی گہما گہمی کی رہی۔ پھر جب کائنات کا سناٹا ذرا بڑھنے لگا تو مہمان آہستہ آہستہ الوداع ہوتے گئے۔ اور ہم گھر کے باسی اپنی حدود میں سمٹتے نظر آنے لگے۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا جب ہم برتن سمیٹ رہے تھے۔ انور بھی ہمارے ساتھ تھے... باجی بھی قریب ہی تھیں... انہوں نے اس وقت شرارتاً مجھے مخاطب کر کے کہا۔

اے میرے آدھے گھر والی... ارے یہاں سے آج اس گلابی سوٹ میں لال پری لگ رہی ہو۔۔ کام بھی کرو۔ مگر پریوں کی کوئی کہانی بھی تو سناتی جاؤ...

انور صاحب! یہ آدھے نہیں... پورے گھر والی ہے... باجی نے ذرا کھینچ کر کہا۔

ہاں۔۔ ہاں کیوں نہیں۔ جو کچھ بھی ہے اسی کا ہی تو ہے۔ انور نے جواب دیا۔

بس اتنی سی بات ہوئی اور باجی سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ہم کام میں مصروف تھے کہ تھوڑی دیر بعد اچانک امی کی آواز آئی... وہ انور کو بلا رہی تھیں۔

انور...! جلدی آؤ دیکھو نعیمہ کا نہ جانے کیوں ایسا حال اچانک ہو گیا ہے۔ جیسے اس کا سانس گھٹ رہا ہو منہ سے ہلکی ہلکی جھاگ بھی نکل رہی ہے۔ شاید کام زیادہ کرنے سے تھک گئی ہے۔ بلاتی ہوں تو بولتی بھی نہیں۔۔ امی نہ جانے کیا کیا بولے جا رہی تھیں۔

میں اور انور یکدم دوڑ کر باجی کے کمرے میں پہنچے... تو دیکھا کہ واقعی نعیمہ باجی کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ وہ بے تحاشا ہانپ رہی تھی... انور نے جب یہ حالت دیکھی تو ذرا دیر کیے بغیر باجی کو اپنی بانہوں پہ اٹھا لیا۔ اور گاڑی میں ڈال کر سیدھے ہسپتال جا پہنچے۔ میں اور امی بھی ساتھ تھے۔ گو کہ رات کا وقت تھا مگر ڈاکٹر موجود تھا...

اس نے حالت دیکھی تو فوراً معائنہ کیا۔ اور تھوڑی دیر بعد ہمیں بتایا کہ خوراک میں زہر شامل ہو جانے کی علامت ملتی ہے۔

میری بچی۔۔! ہائے تجھ سے کس نے دشمنی کی ہے۔۔ امی بلک اٹھیں۔

ڈاکٹر صاحب! خدارا میری نعیمہ کو بچانے کی کوشش کریں۔ انور بچوں کی طرح التجا کرتے ہوئے بولے۔

آپ لوگ دعا کریں... ہم دوا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے... انور کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے امی کی طرف دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا۔

ساری رات ہم نے ہسپتال کے برآمدے میں بیٹھ کر نعیمہ باجی کی زندگی کی دعائیں مانگتے گزار دی۔ صبح تک باجی بے ہوش پڑی تھیں۔ ان کا معدہ صاف کر کے گلوکوز لگا دیا گیا تھا۔ آکسیجن دی جا رہی تھی۔ معدے سے نکلی خوراک اور خون لیبارٹری میں تجزیہ کے لیے روانہ کر دیئے گئے تھے۔

جواب عرض لاہور

مجبوری اس بات کی ہے کہ میں جیتے جی تمہیں کچھ نہیں دے سکتی۔ اس لیے کہ لوگ باتیں کریں گے... مجھے بدنام کریں گے... تمہیں برا کہیں گے۔ اور جب یہ ہوگا تو ہمارے شریف ماں باپ کی گردنیں جھک جائیں گی۔ اور ہم لوگوں کے منہ قطعاً نہیں بند کر سکیں گے۔
بقول شاعر ؎

یہ سینہ نہیں بنے سے ، میرے سے تراشو گے تم
خام ہیں یہ لوگ پتھر کے دل رکھتے ہیں

تمہاری خواہشوں کی تکمیل کے لیے جان کا نذرانہ چاہیئے تارہ! جان کا نذرانہ... اور بہن کی خوشی کی خاطر جان کا نذرانہ کوئی بڑی بات نہیں..!

اور اس لحاظ سے خصوصاً میں یہ سمجھتی ہوں کہ اگر میری خودغرضی آڑے آگئی تو تمہارہ کی راہیں بدل جائیں گی... وہ پیار کی تلاش میں بھٹک جائے گی۔ پھر سچ تو یہ ہے کہ جب مجھے تمام باتوں کا علم ہو ہی گیا ہے تو اپنے وجود پہ اپنے ضمیر کا گراں بار کیوں لادوں... تمہیں کیوں اپنی خودغرضی کی بھینٹ چڑھادوں...

آخر میں بس میری اتنی سی التجا ہے کہ اگر یہ بات راز رہے ... اور مجھے معاف کرتے ہوئے انور ... نا لینا

فقط تمہاری بہن نعیمہ

میں نے جب ڈائری میں باجی نعیمہ کی تحریر پڑھی تو ذہن تھک سے اڑ گیا۔ میں ماؤف سی ہو کر رہ گئی۔ اس ڈائری کو دیکھ کر خوف آنے لگا۔ اس کے سینے میں اتنا بڑا راز دفن ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میں نے باجی کا خون کیا ہے۔ وہ میری خاطر جان پہ کھیل گئیں... اور یہ ڈائری... یہ تو جب بھی کسی اور کے ہاتھ لگی... بربادی ہی کرے گی۔
یہ سوچ کر میں اٹھی اور آنسو بھری آنکھوں کے اوٹ سے دیکھتے ہوئے ماچس جلائی اور ڈائری نذر آتش کر دی۔
میری سوگواری میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا تھا... انور کبھی کبھی آتے تھے تو وہ بھی اداس اداس سے، گھر میں وہ کیف رہا تھا نہ وہ سرور... باجی کا ایثار میری آنکھوں کے آنسو نہیں تھمنے دیتا تھا۔ مجھے اس قدر سوگوار دیکھ کر انور بہلانے کی کوشش کرتے۔ میں وقتی طور پہ بہل تو جاتی مگر پھر

جب پرانا خیال آتا تو وہی پرد... جاتی کیونکہ اپنی جیسے حساس تھی۔ اور کچھ زخم نیا نیا... اب بات کچھ اس طرح تھی کہ امی بھی انور کو چاہتی تھیں۔ امی نے انہیں مجبور کیا کہ وہ روزانہ ہم سے ملنے آئیں گے۔ ان کے آنے اور بیٹھنے سے ہمیں اتنا سہارا ضرور رہتا تھا کہ اس وقت کائنات میں ہمارا کوئی اور غمگسار بھی ہمارے ساتھ ہے۔ ویسے بھی ان کی باتیں ہمارے لیے بڑی حوصلہ افزا ہوا کرتی تھیں۔ اور کئی طرح سے وہ ہمارے محسن بھی تھے۔

باجی کی جدائی کے داغ کچھ مندمل ہوتے تو گھر میں انور اور میرے سنجوگ کی بات سنائی دی۔ اس بات پہ اب کیا خوشی تھی مگر انکار بھی ناممکن تھا... مجھ سے پوچھا گیا تو میں بالکل خاموش رہی۔ نادانی کی محبت اور باجی کی جدائی میرے لیے روح فرسا لمحے تو تھے ہی... مگر انور کو کھو دینا بھی تو کوئی عقلمندی کی بات نہ تھی...

شادی ہو گئی۔ میں انور کی دلہن بن کر ان کے گھر اتری... انہوں نے مجھے میرے تصور سے بڑھ کر پیار دیا۔ میں تو جیت کر ہاری تھی مگر وہ تو حقیقت میں جیتے تھے۔ وہ نعیمہ باجی کی موت کو ایک حادثاتی موت سمجھ کر سب کچھ بھول گئے۔ مگر میں... میں کیسے بھول سکتی تھی۔ اس اصل حقیقت کو جس سے صرف اور صرف میں آشنا ہوں۔

آج میرے دلکش گھر کے آنگن میں دو پھول جیسے بچے ہنستے مسکراتے پھر رہے ہیں۔ گھر کا ماحول نہایت پُرآسائش ہے ہر سہولت مجھے میسر ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود سکونِ قلب سے عاری ہوں۔
سکون قلب مجھے ملے بھی کیسے کہ ذرا سی تنہائی ہوئی اور اداسی نے آگھیرا... باجی کی یاد آئی... اور آنکھیں ساون بھادوں کی برسات بن گئیں۔ یہ رونا تو کبھی کبھی اس درجہ شدید ہوتا ہے کہ آنکھیں کسی رت جگے کی طرح پُرشکوہ ہو جاتی ہیں۔
کبھی کبھی انور میری اس وجہ کو پوچھتے ہیں تو میں ٹال جاتی ہوں وہ بس یہ جانتے ہیں کہ میں تنہائی سے اداس ہوں۔ اس کا سدباب انہوں نے یہ کیا ہے کہ بچوں کے نام پہ ایک چھوٹی نگی آیا رکھ لی ہے۔ جو بچوں کو کم اور مجھے زیادہ بہلاتی ہے مگر کہاں... آنسو پھر بھی ہیں کہ باجی نے مجھ پگلی سے ایسا ایثار کیوں کیا جس میں انہوں نے اپنی جان کی بازی لگا دی۔ اور مجھے تا زیست پلکوں پہ سلگتے آنسوؤں کے تارے سجانے کی سزا دے دی۔ حجاب عرفی لاہور

اپریل ۱۹۸۲ء

ٹھنڈی آگ
تحریر۔ عذرا سلطانہ لاہور

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

تسلیمات ... اپنی ایک افسانوی اور انوکھی کاوش لے کر ایک مرتبہ پھر جواب عرض کی دکھی بزم میں شریک ہو رہی ہوں۔ میں نے اپنی اس تحریر کو ... "ٹھنڈی آگ"!! کا عنوان دیا ہے۔ یوں تو ہمارے ارد گرد معاشرے میں بے شمار ناسور بکھرے پڑے ہیں، اور جن کی نقاب کشائی بھی بے حد ضروری ہے۔ مگر میری یہ تحریر ان سے ذرا الگ ہٹ کر ہے۔ اگر یہ آپ کی پالیسی کو ذرا سا بھی اپیل کرے تو اسے ایک نظر دیکھ کر جواب عرض کی کسی قریب ترین اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمائیں۔

شہزادہ بھیا! میری اس سے پہلے جو کہانی آپ نے شائع کی ہے اس کے لیے بھی آپ کی بہت ہی مشکور ہوں۔ جواب عرض کی عین پالیسی کے مطابق میں نے تمام کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کر دیئے ہیں۔ آخر میں میری دلی دعا ہے کہ جواب عرض ہر دم ترقی کرتا رہے ...

فقط .... آپ کی نیاز مند!

عذرا سلطانہ، معرفت

جواب عرض ،، لیسبیت روڈ۔ لاہور

"امی جان! ہماری مس کہہ رہی تھیں، تمہیں جو چیز پسند ہو، اس کی تصویر اپنی ڈرائنگ بک پر بنا کر لانا... صائمہ رشید کہہ رہی تھی، میں اپنے کتے جامی کی تصویر بناؤں گی... اور وہ ہے نا جواد... وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے تو سب سے اچھا بتا تین پہیوں والا سائیکل لگتا ہے اور میں اسی کی تصویر اپنی بک پر بناؤں گا"۔

"بیٹے! آپ کیا بنائیں گے...؟ آپ کو کیا اچھا لگتا ہے"...؟

"امی جان... مجھے تو... سب سے اچھی آپ لگتی ہیں... میں آپ ہی کی تصویر بناؤں گا... دیکھئے میں ابھی ایک منٹ میں آپ کو بنا کر دکھاتا ہوں"۔ ننھا فراز جلدی سے کاپی کھولتے ہوئے بولا۔

میں اپنے معصوم بیٹے کی یہ بات سن کر ہنس دی.. اور وہ بڑے انہماک سے پنسل چلانے لگا۔ میں نے ذرا جھک کر دیکھنے کی کوشش کی تو اس نے اپنے گول مٹول ننھے ننھے ہاتھ کاپی پر پھیلا دیئے...

"نہیں نہیں امی جان، پوری بن جائے، پھر میں آپ کو دکھاؤں گا"!!

تب میں پیچھے ہٹ گئی اور وہ بڑی سنجیدگی اور مہارت سے تصویر بنانے لگا...

"فراز کیا کر رہے ہو"...؟ عظمیٰ گیند اچھالتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی... "آؤ نا... گڈی بھی آیا ہوا ہے، چل کر کھیلیں"...

"تم چلو... میں ابھی آیا" امی کی تصویر بنا کر"۔

"کیا کہا امی کی تصویر...؟ تم بنا رہے ہو"...؟ عظمیٰ نے اپنی گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں... ہاں بس بن گئی، آؤ تمہیں بھی دکھاؤں"۔

عظمیٰ بڑے اشتیاق سے آگے بڑھی... "ہنہ... امی کوئی ایسی ہیں"۔ اس نے تصویر دیکھ کر کہا۔

"ٹھہرو... ٹھہرو، ایک چیز تو میں بھول ہی گیا"۔ فراز نے میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کاپی لی، اور اس پر جو بھدی سی شکل بنی ہوئی تھی، اس کے گال پر پنسل سے ایک موٹا سا نشان لگاتے ہوئے بولا: "امی کے گال پر تل بھی ہے"...

وہ اب بڑے فخر سے میری طرف دیکھ رہا تھا: "امی جان دیکھئے نا... بالکل آپ جیسی ہی ہے نا"۔ تب وہ بڑے معصومانہ انداز میں بولا...

ہنہ۔ ناک تو دیکھو جیسے پان کا پتہ ہے۔ عظمیٰ اپنی منی سی ناک چڑھاتے ہوئے بولی۔ مدات ابو آئیں گے انہیں دکھانا۔ دیکھنا تو کیسی پٹائی ہوگی۔ ہماری اتنی پیاری امی کی تصویر ایسی بنائی جیسے کوئی چڑیل ہو۔

چڑیل ہوگی تو خود

اوہو۔۔۔۔ لڑو نہیں۔ جاؤ بیٹے لڑکی باہر انتظار کر رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر اس کے ساتھ کھیل لو۔ وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے اور میرے خیالوں کے آنگن میں تم دھم سے آن کودے۔ وہی الجھے الجھے بال غبار آلود بوجھل بوجھل سی آنکھیں۔

پڑوس والے شاہ صاحب کی ٹرانسفر کے بعد ہم لوگ دعا کیا کرتے کہ جلدی سے ساتھ والی کوٹھی آباد ہو۔ ان لوگوں سے ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ پھر ایک روز یہ کوٹھی آباد ہوگئی۔

جنت بی بی جو ہمارے برتن مانجھنے آیا کرتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ساتھ والی کوٹھی میں کوئی صاحب آگئے ہیں بیوی بچے ساتھ نہیں بالکل اکیلے ہیں۔ امی نے سبزی بناتے بناتے ہاتھ روکا اور بولیں۔

اگر کوئی بال بچے والا ہوتا تو اچھا تھا۔ رونق ہو جاتی۔ میرا تو اکیلے دل گھبراتا ہے۔ بیگم شاہ کتنی اچھی عورت تھی بچے بھی تھے۔ پر سارا دن چہل پہل لگی رہتی تھی۔ اکیلے آدمی کا کیا۔ صبح کا گیا پنچھی کی طرح شام کو لوٹا۔

ہاں بی بی جی۔ اچھا ہی ہوتا اگر کوئی بال بچوں والا آجاتا۔" جنت تنکے سے دانت کریدتے ہوئے بولی۔ یہ تو بھلی عمر کا لگے۔ ہے یوں جان پہرے ہے ابھی کنوارا ہے شاید پیچھے کوئی ہو۔

کئی دن گزر گئے۔ ہم نے کبھی تمہیں نہیں دیکھا، ہاں سکوٹر کی آواز تمہارے آنے جانے کا پتہ دیتی تھی۔ ایک دن خالد اور شاہد دونوں بھائی لان میں ہاکی کھیل رہے تھے شاہد نے زور سے ہٹ لگائی، گیند اچھلتی ہوئی تمہاری طرف جا گری خالد مہندی کی وہ باڑ جو حد بندی کا کام دیتی تھی اسے پھلانگ کر تمہاری طرف جا گودا۔

تم غالباً باہر ہی بیٹھے ہوئے تھے اس طرح خالد اور شاہد کا تم سے تعارف ہوگیا۔ پھر تو وہ تمہارے گیت گانے لگے۔ جنت بی بی بھی جس وقت آتی تمہارے قصیدے سناتی رہتی۔ ہائے بی بی کیا کہوں۔ کتنے اچھے ہیں پڑوس والے صاحب۔ مجھے ہمیشہ ماں جی کہتے ہیں

تم سہ پہر کو لان میں بیٹھتے۔ خالد اور شاہد بھی ادھر جا نکلتے کبھی کبھار ننھی صوفیہ بھی ان کے ساتھ چلی جاتی۔ واپسی پہ ان سب کی جیبیں ٹافیوں سے بھری ہوتیں۔

بجیا احسن بھائی نے ہماری دوڑ لگوائی۔ میں نے شاہد کو ہرا دیا۔

اور بجیا میری اور احسن بھائی کی دوڑ لگی۔ میں احسن بھائی سے آگے نکل گئی"

صوفیہ ٹافی چباتے ہوئے چہکتی، ابھی تک میں نے تمہیں نہیں دیکھا تھا لیکن دیکھنے کی لگن فزوں تر ہوتی گئی۔

شاہد اور خالد نے اباجان سے ضد کر کے اپنے لان میں جھولا لگوایا ہوا تھا۔۔۔ وہ دونوں تو کبھی کبھار ہی جھولے کا رخ کرتے البتہ میں اکثر صوفیہ کو جھولے میں بٹھا کر جھلاتی رہتی ہاں کسی دن خالد اور شاہد کے سکول سے دوست آجاتے تو خاصا اودھم مچاتے۔ ان کی چیخ و پکار سن کر امی باورچی خانے سے دوڑتی آتیں اور اتنا اونچا جھولا دیکھ کر سینے پہ ہاتھ رکھ کر شور مچاتیں۔

خدا کے لئے بس کرو۔ کمبخت شاہد کیوں گر کر ہڈی پسلی ایک کرو گے۔

مگر ان لڑکوں پہ رتی بھر بھی اثر نہ ہوتا۔ وہ جامن کے پیڑ پر لگی کچی پکی جامنیں جھولے پر سے توڑنے کی کوشش میں اور بھی اونچا کرتے۔ جامن تو کبھی قسمت سے ہاتھ آتی، البتہ پتوں کے انبار لگ جاتے۔

ایک دن صوفیہ کو جھولے میں بٹھا کر جھلاتے جھلاتے جانے میرے من میں کیا سمائی کہ میں نے جھولے کو اونچا کرنا شروع کر دیا۔ صوفیہ چلانے لگی۔ خالد اور شاہد صوفیہ کے چلانے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے۔ بجیا اور اونچی بجیا اور اونچی کی رٹ لگانے لگے۔

جھولا اتنا اونچا ہو چکا تھا کہ تمہارا لان صاف دکھائی دینے لگا۔ تم ایزل پہ جھکے کچھ بنا رہے تھے۔ ماہنامہ پاکیزہ

جواب عرض لاہور

پریشان لٹیں سفید بے داغ کرتا پاجامہ، صوفیہ کی چیخوں کا تم پر بھی خاصا اثر ہوا تم پلٹ کر ادھر دیکھنے لگے۔ میں جلدی سے بیٹھ گئی۔ جھولا آہستہ آہستہ نیچے ہونے لگا۔ تمہیں دیکھنے کا آعوان نشو میرے ہاتھ لگ چکا تھا۔ اب میں ہر دوسرے روز صوفیہ کو جھولے میں بیٹھا کر جھولنے لگتی۔ صوفیہ کے چلانے پر تم ضرور مڑ کر دیکھتے۔ تمہاری آنکھوں میں اس وقت ایک تنبیہ ہوتی جیسے تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہوں آگ سے مت کھیلو جل جاؤ گی۔

اس روز ہم لوگ گھر میں اکیلے تھے۔ امی صوفیہ کو ساتھ لے کر خالہ رضیہ کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ خالد اور شاہد معمول کے مطابق ہاکی کھیلنے لگے اور میں نے جھولا جھولنا شروع کیا۔ وہ آہستہ آہستہ اونچا ہونے لگا۔ مگر تم نظر نہ آئے۔ ایک بار جو میں پنجوں کے بل اچک کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگی تو تار میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور میں ایک زور دار آواز کے ساتھ نیچے آگری۔ میرے کانوں میں خالد اور شاہد کی چیخ کی آواز آئی اور پھر کوئی ہوش نہ رہا۔ جب ہوش آیا تو امی تمام تر شفقت کے ساتھ مجھ پہ جھکی ہوئی تھیں اور میرا جسم بری طرح دکھ رہا تھا۔ ٹانگ تو ہلتی ہی نہ تھی اور میری نگاہ تم پر پڑی امی کے بائیں ہاتھ پر تم بھی کھڑے تھے۔ وہی الجھے الجھے بال خمار آلود بوجھل نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میرے دیکھنے پر تم گھبرا گئے۔ جلدی سے آنکھیں جھکا لیں اور دھیمی سی آواز میں پوچھا کیسی طبیعت ہے۔

جی چاہا کہہ دوں، یہ سب آپ کے ہی طفیل ہوا ہے آپ ہی کے درشن کی آرزو میں ہم عرشِ معلےٰ سے فرش پر گرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ مگر صرف سر کے اشارے سے کہا ٹھیک ہوں۔

خدا کا شکر کرو عروسہ جو احسن نے تمہیں گرتے ہوئے دیکھ لیا ورنہ ان خالد، شاہد سے تم کیسے سنبھلتیں۔ یہ تو بھلا ہوا حسن جو فوراً ڈاکٹر کو بلا لایا۔ شکر ہے ہڈی وغیرہ نہیں ٹوٹی۔ اس موئے جھولے کو اکھاڑنا ہی پڑے گا۔ ہزار منع کیا مگر تم لوگ ذرا بھی نہیں ڈرتے۔

میں جھینپی جھینپی سی کمبل کی لٹکتی ہوئی لمبی لمبی جھالروں کو مسلتی رہی۔

اچھا جی میں اب چلتا ہوں۔

نہیں بیٹے میں تو ایسی گھبراہٹ میں چائے کا بھی نہ پوچھ سکی۔ بیٹھو چائے پی کر جانا۔

جی نہیں۔ پھر حاضر ہوں گا۔ اب اجازت دیں۔

امی تو بچھی جا رہی تھی۔ بیٹا کیا کرو گے گھر جا کر بس ایک منٹ میں چائے بن جاتی ہے تم بیٹھو۔

مجھے اس لمحے امی پہ غصہ آ رہا تھا۔ تمہیں میرے پاس بیٹھا گئیں۔ اب میں بھی بھلا بات کیا کروں گی۔ میں نے کنکھیوں سے تمہاری طرف دیکھا۔ تم ناسپہ وار ہی سے بیٹھے الجھے الجھے بالوں میں اپنی انگلیوں کی کنگھی کر رہے تھے۔ تم نے میری اس چوری کو پکڑ لیا۔ تمہارے ہونٹوں پہ ایک خفیف سی مسکراہٹ ابھری اچانک تم نے سوال کر دیا۔

آپ کو جھولا جھولنا بہت اچھا لگتا ہے کیا۔

اس سوال پر میں سٹپٹا سی گئی۔ جی ...... جی نہیں۔ ...... جی ہاں۔

تم میری بوکھلاہٹ پہ زیر لب مسکرا دیئے۔ اتنے میں امی چائے لے آئیں تم خاموشی سے چائے پینے لگے۔

بیٹے احسن۔ اکیلے ہوتے ہو۔ دل گھبرا جاتا ہوگا۔ ادھر آ جایا کرو۔

جی بہت اچھا۔ تم نہایت سعادت مندی سے جی ... جی کی گردان کر رہے تھے۔ پھر تم میری خیریت پوچھتے آتے رہے۔

وہ سردیوں کی نرم نرم دھوپ والی دوپہر تھی۔ خالد، شاہد صوفیہ تینوں فرد تمہاری طرف گئے ہوئے تھے۔ تم لوگ باہر دھوپ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تینوں کی شوخ ہنسی کی آواز آ رہی تھی اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایسی سوچیں جن سے لاکھ دامن چھڑانا چاہو کسی شریر بالک کی طرح لپٹتی چلی جاتی ہیں تم جانے کس منزل کے راہی تھے۔ پل بھر کے مہمان رکے تھے۔ میری بے چینیوں سے بے خبر تم اپنی دنیا میں مگن تھے۔ تمہاری اس بے خبری نے میرے دل کی دنیا اتھل پتھل کر دی تھی۔ تم کبھی کبھار ہماری طرف آتے بھی تو امی یا ابو جان کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں میں لگے رہتے۔ ہاں کبھی کبھی ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر بھی ڈال لیتے

اور ایک آدھ سوال میری پڑھائی کے متعلق کر دیتے۔ میں اس پر بھی نہال ہو جاتی میں سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ امی نے آواز دی۔

عروسہ جاؤ۔ صوفیہ کو بلاؤ ...... یہ فراک پہن کر دکھائے۔ مجھے تو لمبی لگ رہی ہے۔

میری مراد بر آئی۔ تم لوگ برآمدے میں نہیں تھے۔ میز پر کیرم بورڈ ترچھا پڑا تھا اور اس پر گوٹیں بکھری ہوئی تھیں شاید ابھی ابھی تم لوگ یہاں سے اٹھ کر لان میں گئے تھے۔ ایک کرسی پر سرخ رنگ کا البم پڑا ہوا تھا۔ جس کا ذکر میں نے خالد اور شاہد سے سنا تھا۔ بجیا احسن بھیا کے پاس ایک سرخ رنگ کا البم ہے اسے ہاتھ نہیں لگانے دیتے۔ اپنے ساتھ ساتھ رکھتے ہیں مجھے تعجب ہوا کہ آج تم یہ البم یہاں کیسے بھول گئے۔ میں نے وہ البم اٹھائی اور ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جلدی سے صفحہ الٹا کسی لڑکی کی تصویر تھی۔ نیچے یہ شعر درج تھا اور ساتھ تاریخ بھی لکھی ہوئی تھی۔

یوں بے سبب تو کوئی ہمیں پوچھتا نہیں
کچھ تو ہے ہم میں بھی خدوخال کی طرح

چند ہی صفحے الٹتی رہی۔ ہر صفحے پر اس لڑکی کی تصویریں تھیں۔ تاریخیں علیحدہ علیحدہ اور پوز بھی مختلف، آخری صفحے پر بھی اسی لڑکی کی تصویر تھی مگر دلہن کے روپ میں۔ وہ اپنے دولہا کے ساتھ کھڑی تھی۔

ہم ...... تو یہ سبب ہے تمہارے اکھڑپنے کا۔ میں نے سوچا وہ لڑکی جسے خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ بس معمولی شکل کی تھی۔ دلہن کے روپ میں قدرے بھلی لگ رہی تھی۔ آنکھیں بے انتہا بڑی بڑی اس کے بال یقیناً بے حد لمبے ہوں گے اسی لئے تو اکثر تصویروں میں اس نے چوٹی آگے کر رکھی تھی جو بہت نیچے تک گئی ہوئی تھی۔

میں نے بجھے دل کے ساتھ البم وہیں رکھ دی اور مردہ سے قدم اٹھاتی لان کی طرف بڑھی۔ تم گھاس پر بیٹھے تھے اور خالد، شاہد صوفیہ تینوں گرد بیٹھے تھے۔ میں نے دور ہی سے صوفیہ کو آواز دی ...... صوفیہ وہیں بیٹھے بیٹھے چلائی بجیا آپ بھی ادھر آجائیے۔ احسن بھائی بڑی مزیدار کہانی سنا رہے ہیں اور پھر ہتھیلیوں کی کٹوری میں چہرہ ٹکا کر بڑے غور سے کہانی سننے میں محو ہو گئی۔ اس وقت مجھے ان تینوں سامعین پہ رشک آ رہا تھا۔ جنہیں تمہاری اتنی قربت میسر تھی۔ نادان دل بار بار آگے بڑھنے پہ اکسا رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ ضرور بیرہ سری میرے لئے شرمندگی کا موجب بنے گا۔ لیکن یہ مردہ دل کب مانتا۔ میں آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ مجھے دیکھ کر تمہارے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر آئے۔ جیسے میرا آنا ناگوار گزرا ہو۔ میں ڈھیٹوں کی طرح کھڑی رہی۔ تم نے رسماً بھی مجھے بیٹھنے کو نہ کہا میرے جانے پہ تمہارا بس کا طرح سرد رویہ میرے لئے سوہان روح تھا۔ اب بار بار ہوا۔ مائی جنت جو تمہارا کام کرتی تھی میرے جانے سے وہ تو بہت خوش ہوتی لیکن تم اکھڑے سے رہا کرتے۔

دسمبر کی چھٹیاں تھیں خالد اور شاہد ماموں کے پاس چھٹیاں گزارنے چلے گئے اور صوفیہ اور میں تھے۔ میں ان کے ساتھ تھوڑا بہت گھر کا کام کروانی۔ عجب طرح کا اجڑا اجڑا موسم تھا۔ میں خالی ذہن سے برستی بارش بے مقصد کھڑکی کی سلاخوں سے سر ٹکائے کھڑی ان کھڑکھڑاتے پتوں کو دیکھ رہی تھی کہ امی نے مجھے آواز دی۔

عروسہ بند کر دو یہ کھڑکی۔

امی صوفیہ کو لئے ہوئی تھیں اسے دو تین دن سے بخار آ رہا تھا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ اور رسالہ پڑھنے لگی کہ مائی جنت آئی

جنت دو دن سے کیوں نہیں آئی۔ صوفیہ کو بخار ہے اور مجھے ایک منٹ کے لئے بھی ادھر سے ادھر ہونے نہیں دیتی اکیلی عروسہ کیا کرے۔

بی بی جی کیا کروں احسن کو آسا بخار ہے کہ بس کیا بتاؤں۔ دکھیا جانے کس ماں کا لال ہے یوں پردیس میں اکیلا بیمار پڑا ہے۔ کوئی خبر لینے والا بھی نہیں۔

ہائے ہائے کیا ہوا احسن کو۔ وہ خالد شاہد تھے تو جانتے رہتے تھے۔ عروسہ بھی ساتھ چلی جاتی تھی۔ اب کیا ہے۔

آج تو کچھ بی بی طبیعت سنبھلی تو میں نے کہا ادھر خبر کر دوں۔

صوفیہ تو مجھے اٹھنے نہیں دیتی جاؤ عروسہ مائی جنت کے ساتھ احسن کی طبیعت پوچھ آؤ۔ کیا سوچتا ہوگا کہ کیسے ہیں

میں اٹھی اور جنت کے ساتھ تمہاری طرف چلی۔
عروسہ بی بی۔ تم اندر جاؤ میں باورچی خانے میں جا رہی ہوں یخنی گرم کر لاؤں۔ میں اندر داخل ہوئی تو تمہارا چہرہ بخار کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس سمے تم مجھے بے حد اچھے لگے کسی معصوم بچے کی طرح۔
تمہارے تکیے کے نیچے سے آج البم کا ایک کونا جھانک کر میری دیوانگی کا تمسخر اڑا رہا تھا۔ میرے جنوں کا حاصل پر خندہ زن یہ البم اپنی موجودگی کا احساس مجھے دلا رہا تھا۔ اور کتنی دیر کھڑی نہیں تکتی رہی۔ کہ مائی جنت نے آکر مجھے اس محویت سے چونکا دیا۔
ہائے عروسہ بی بی ابھی تک کھڑی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ میں احسن بابو کو جگا دیتی ہوں۔
نہیں .... نہیں جنت رہنے دو انہیں مت جگاؤ۔ میں نے جنت کو روکا مگر وہ آگے بڑھ چکی تھی۔
احسن بابو۔ دیکھو تو کون آیا ہے۔ احسن بابو عروسہ بی بی تمہیں پوچھنے کو آئی ہیں۔ تم نے آنکھیں کھولیں اور پھر بڑی شان سے فرمایا۔
آئی ہو تو بیٹھو اب کھڑی کیوں ہو۔
اتنی سرد مہری پر میں بدگمان سی ہو گئی رندھی رندھی سی آواز میں کہا کہ۔
میں جانتی ہوں۔ میرا آنا آپ کو ناگوار گزرتا ہے۔ صوفیہ بیمار ہے امی جی اس کے پاس لیٹی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ آپ کی خیریت پوچھ آؤں۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔
مائی جنت نے سلاخ سے آتشدان سے آگ کو کریدتے ہوئے کہا کہ۔
عروسہ بی بی بیٹھ جاؤ۔ دو گھڑی اور احسن بابو کو یہ یخنی بھی پلا دو۔ شاید تمہارے کہنے سے پی لیں۔
میں نے بے بسی سے جنت کی طرف دیکھا۔ پھر میز سے یخنی کا پیالہ اٹھایا۔ میں دونوں ہاتھوں میں پیالہ تھامے ہوئے تھی جیسے کوئی پجارن اپنے دیوتا کے حضور اپنا سب کچھ نذر کر رہی ہو۔ یہ پی لیجئے نا میرا انداز رو دینے والا تھا شاید میرے لہجے کا اثر تھا یا تم نے یونہی اٹھ کر پیالہ میرے ہاتھوں سے لے لیا۔
اماں جنت۔ عروسہ کے لئے چائے بنا لاؤ۔
نہیں رہنے دیجئے۔ اب میں چلتی ہوں۔ امی اکیلی ہیں۔
بھئی بیٹھو، ابھی تو آئی ہو۔
مائی جنت اتنے میں چائے لے کر آ گئی اور میں نے کچھ سوچنا شروع کیا۔ جانے کون ہے۔ کس شہر [illegible]۔
کیا سوچ رہی ہو عروسہ
جی کچھ بھی تو نہیں
نہیں بھئی کچھ تو سوچ رہی ہو۔
میں نے دوپٹے کا کونا انگلیوں پہ لپیٹتے ہوئے دھیمی سی آواز میں کہا
میں سوچ رہی تھی۔ یہ خوش نصیب ہستی کون ہے جس کی تصویر کی آپ پرستش کرتے ہیں۔ تم شرارت سے تھوڑا میری طرف جھکے اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولے

ہر آشنا میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
کرے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ

پھر جیسے تم چونک اٹھے۔ سنبھل کر بیٹھ گئے اور چبھتی ہوئی آواز میں بولے
عروسہ۔ میں اپنے ذاتی معاملات میں کسی کی دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔ تم جاؤ اور آئندہ اگر یہاں آنا ہو تو ان تصویروں کا ذکر مت کرنا۔
اس بے عزتی پر میرا چہرہ آگ کی طرح گرم ہو گیا۔ میں تیزی سے تمہارے کمرے سے نکل کر بھاگی۔ اپنے صحن میں آکر ان آنسوؤں کو صاف کیا جو رخساروں پر بہہ رہے تھے
کیسی طبیعت ہے اب احسن کی تم نے تو بڑی دیر لگادی۔
جی امی وہ جنت نے چائے بنا دی تھی۔ اس لئے دیر ہو گئی۔ احسن کی طبیعت اب کچھ ٹھیک ہے۔
تیسرے دن میں ضبط نہ کر سکی۔ دوپہر کو امی باورچی خانے میں تھی۔ میں نے امی سے کہا
اگر آپ کہیں تو احسن کی طبیعت پوچھ آؤں
چلی جاؤ لیکن صوفیہ کو ساتھ لے جاؤ۔ ہاں اسے کوٹ پہنا لو آج سردی بھی تو بہت ہے،

تمہارے برآمدے میں قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے جنت دکھائی دی سخت گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

میں تمہاری طرف ہی جا رہی تھی عروسہ بی بی اچھا ہوا جو آپ خود ہی آگئیں۔ احسن بابو آج رات پھر اتنی سردی میں بیٹھے اس چڑیل کی تصویر بناتے رہے۔ جانے کیا ہوا۔ ٹھنڈ لگ گئی شاید۔ پھر بخار بہت تیز ہوگیا ہے آپ ہی آپ بولے جارہے۔ خبر نہیں کون ہے یہ چھوکری جس کے پیچھے اپنی جان یوں ہلکان کر رہے ہیں۔

میں تیزی سے آگے بڑھی۔ کمرے میں تمہارا سامان بکھرا پڑا تھا۔ تم اوندھے منہ لیٹے ہوئے تھے میں نے آگے بڑھ کر تمہاری تپتی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا۔ تم نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں چند لمحے میں تمہاری طرف دیکھتی رہی۔ کیسی طبیعت ہے

ٹھیک ہوں۔

میں سر دبادوں آپ کا۔

ہاں اگر تکلیف نہ ہو تو۔ میں ہولے ہولے تمہارا سر دبانے لگی۔

عروسہ۔

جی۔

تمہیں یاد ہے ایک دن تم نے مجھ سے فرمائش کی تھی کہ تمہاری تصویر بنادوں۔

جی ہاں۔ مجھے یاد ہے میں نے کرب سے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ اس پر تم ہنس پڑے۔ میں خاموشی سے سر جھکائے تمہاری بات سنتی رہی۔ جانے کتنی گھڑیاں بیت گئیں کہ ائی جنت آئی۔ میں سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔ تم بھی کچھ شرمندہ سے لگ رہے تھے۔

عروسہ بی بی یہ صوفیہ باہر بارش میں گھوم رہی تھی۔

چلئے نا بجیا۔ ابو بھی آگئے ہوں گے۔ صوفیہ مچلنے لگی۔

جاؤ عروسہ۔ تمہاری آواز یوں لگا جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آرہی ہو۔

تین چار دن بعد خالد اور شاہد بھی آگئے۔ اور میں نے تمہاری بیماری کا ذکر کیا تو وہ تمہاری طرف جانے لگے تو میں بھی آگئی ہم اندر آئے تو تم نے پلٹ کر دیکھا تو تمہاری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

احسن بھائی۔ کیا آپ رو رہے ہیں

اوہو۔ تم کب آئے خالد شاہد۔

ہم ابھی آئے ہیں بجیا کہہ رہی تھیں کہ آپ کی طبیعت خراب تھی۔

ہاں بس معمولی سی حرارت ہوگئی تھی۔

تم برسوں کے مریض لگ رہے تھے اور تمہارے چہرے پر پھیلی ہوئی سوگواری دیکھ کر جانے میرا دل کیوں بھر آیا۔ وہ بشاشت، وہ رنگ، جو اس دن تمہارے چہرے پر تھا۔ عہد پارینہ کی یادگار بن چکا تھا۔ ہم کچھ دیر بیٹھ کر واپس آگئے۔

تیسرے دن شام کو جنت آئی۔ امی سے آکر کہنے لگی بی بی جی آپ کو معلوم ہے احسن بابو کہاں گئے

نہیں۔ ہمیں تو کچھ نہیں کہہ کر گئے۔ کیوں۔ کیا وہ گھر پر نہیں!

نہیں بی بی۔ پرسوں شام مجھ سے کہنے لگے۔ میں نے دو تین دن کہیں جانا ہے۔

پھر ایک دن گزرا، دو دن گزرے ہفتے گزر گئے وقت گزرتا رہا۔ پھر میری شادی ہوگئی۔ اور جب پہلی رات میرے شوہر نے میرا گھونگھٹ اٹھا تو بے اختیار میں نے اپنا ہاتھ اپنے اس تل پر رکھ لیا جیسے مجھے خدشہ ہو کہ میرے شوہر اس تل پر تمہارے ہونٹوں کے نشان بھانپ نہ لیں۔

ماضی کی یادوں کا عذاب لعیں بن کر روح میں گھلتا رہا اور میں بے چین ہو ہو کر حافظہ چھن جانے کی دعا مانگتی رہی میں نے خود کو گھر کے بکھیڑوں میں الجھا لیا۔ برسوں بیت گئے۔ دو بچے ہوگئے۔ میں کئی بار لاہور اپنے میکے گئی لیکن کسی سے تمہارا نام نہ سنا۔

میں نے خالد اور شاہد سے بھی تمہارے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا۔

بجیا ہم خود اداس ہیں لیکن ان کا پتہ نہیں چلا

میں تمہیں تقریباً فراموش کر چکی تھی کہ آج ننھے فراز نے تصویر اور اس پر پنسل سے تل بنا کر اس آگ کو کرید دیا جو ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

جواب عرض لاہور

دل کے بچھڑے

تحریر۔ ڈاکٹر محمود سلطان پرویز بھٹی کراچی

6-11-62

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب ۔

سدا سلامت رہو ، دو گنا ترقی کرو ، عالمی شہرت سے سرفراز ہو !

آداب ! میں جواب عرض کا ایک پرانا قاری ہوں ۔ ایک بہت ہی پرانی یاد کو آپ بیتی کی شکل دے کر اس کی بزم میں حاضر ہو رہا ہوں ۔ امید ہے کہ آپ اپنی پالیسی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میری بھی ضرور حوصلہ افزائی فرمائیں گے ۔

کہانی میں ایک بچھڑے ہوئے بھائی کی تلاش ہے ۔ اگر وہ کسی کو اس دکھی جریدے جواب عرض کے توسط سے مل جائے تو یہ سونے پہ سہاگہ کا کام ہو گا ۔ اگر بھائی خود " سرور حسین بھٹی " جو کسی زمانے میں سیٹھ سرور حسین بھٹی مشہور رہتے ، اس کہانی کو پڑھ لیں یا سنیں تو ہمیں ضرور جواب عرض کے توسط سے ہی خیریت سے مطلع کر دیں ۔ ۔ ۔ یا ان کے صاحبزادے مسٹر ظفر اقبال جو ایئر فورس میں پائیلٹ کی پوسٹ پر ہیں ، وہ خود پڑھیں یا ان کے دوست احباب پڑھیں تو ان کو ضرور اس کہانی کے بارے میں بتائیں تاکہ وہ اپنے والد کو مجبور کریں کہ وہ اپنے خاندان قوم قبیلے کی خبر لیں ۔ ۔ ۔ ۔ ان سے میل ملاپ پیدا کریں یا پھر اپنی خیریت ہی بتا دیں ۔ کیونکہ ان کی والدہ ماجدہ پیٹ کی رسولی میں مبتلا ہیں ۔ چار آپریشن کامیاب ہوئے ۔ بیٹے کی ملاقات کے لیے کمزور کانی حالت میں زندہ ہیں ۔ بڑا بیٹا چودہ سال کا بچھڑا ملا ، پھر بچھڑ گیا ، شاید ہی ملے ، اوپر سے ستم یہ کہ چھوٹا بیٹا صابر حسین بھٹی ولایت چلا گیا ۔ اور داغ جدائی سہنے کے لیے بڑھیا رہ گئیں ۔ ۔ ۔ دونوں بیٹوں کی جدائی نے اسے بے حد کمزور و نحیف کر دیا ۔ ۔ ۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی ۔ ۔ ۔ مصنوعی چشموں کے سہارے چلنے پھرنے لگیں ۔ ۔ ۔ آخر ناامیدی آڑے آئی ۔ ایک ایکسیڈنٹ کی معمولی سی چوٹ نے ان کی انتظاری کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا ۔ انہوں نے آنکھیں موند لیں ۔ ۔ ۔

شہزادہ صاحب ! میں نے اپنی اس کاوش کا نام " مل کے بچھڑے " ۔ ۔ ۔ رکھا ہے ۔ کہانی میں یقیناً بہت سی خامیاں اور جھول ہو گا ۔ ۔ اسے آپ اپنے قلم سے سنوار دیں اور پھر کسی قریبی اشاعت کے ذریعے قارئین کی نذر کر دیں ۔ ۔ امید ہے یہ قارئین کے ذوق پر پوری اترے گی ۔

آخر میں جواب عرض کی گوناگوں ترقی و کامرانی کے لیے دعاگو ہوں ۔ قارئین کرام سے بھی استدعا کرتا ہوں کہ وہ بھی ایسے لوگوں کے لیے دعا مانگیں ، جو اپنے خاندانوں سے بچھڑے ہوئے ہیں کہ ان کی جلد آپس میں ملاقاتیں ہو جائیں ۔ ۔ ۔

فقط دعاؤں کا طالب ۔ ۔ ۔ ۔

ڈاکٹر محمود سلطان پرویز بھٹی
خالد کلینک ، بکرا پیڑھی ۔ کراچی نمبر ا

۔۔ مل کے بچھڑ گئی اکھیاں
ہائے رام مل کے بچھڑ گئی اکھیاں

یہ گانا جب بھی میں آل انڈیا ریڈیو سے سنتا ہوں تو مجھے ۳۵ سال گزرے ہوئے حسین لمحات یاد آ جاتے ہیں جب چودہ سال کی طویل گمشدگی کے بعد میرے تایا زاد بھائی سیٹھ سرور حسین بھٹی اچانک ہی بڑے ڈرامائی انداز میں اپنے گاؤں میں آن وارد ہوئے تھے ۔ ۔ ۔

ہماری حویلی بندا بھٹی راجپوت میں مبارک باد دینے والوں اور دینے والیوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ گویا عید ملن پارٹیوں کا انتظام ہو رہا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب پاکستان معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو انگریزوں نے غدار کا نام دے کر مغلوں کا قتل عام کرنے لگے اور ہندوستان کے تخت پر قابض ہو گئے تو انہوں نے مغلوں کا ساتھ دینے والی راجپوت برادری کا جینا دوبھر کر دیا۔ اور خوب خبر لی۔ راجپوتوں کی اراضیاں اونے پونے نیلام کرائیں کچھ کی اراضی کو قرق کیا۔ انگریزوں کا ساتھ دینے والی قوموں کے ساہوکاروں نے خوب فائدہ اٹھایا۔

راجپوت برادری جب بالکل نادار ہو گئی تب انہوں نے سپہ گری کی بجائے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھا اور کھیتی باڑی کرنے لگے۔ راجپوت بات بات پر لڑ پڑتے تھے۔ گ[illegible]ت دفن کر دیتے تھے اس لئے دوسری قومیں ان کو جھگڑالو یا جٹ جاٹ رانگڑ کہنے لگے۔ ہندوستان پر انگریزوں کی جب پوری عملداری ہو گئی تو انہوں نے اپنی عسکری ضرورت پوری کرنے کے لئے اس سپاہ گر قوم راجپوت برادری کو چنا اور انہیں طرح طرح کے لالچ دیئے کہ تم کو انعام و اکرام سے نوازیں گے۔ اراضیات کو بھی انعام میں دیا جائے گا۔ پھر تم خوشحالی کی زندگی گزارنا شروع کر دو گے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اول کا آغاز ہوا انگریزوں کو ہر محاذ پر جاپان اور جرمنی سے شکست اٹھانی پڑی تو انہوں نے اپنا نقصان پورا کرنے کے لئے انہیں ہندوستان کی جنگجو قوموں کی ضرورت پڑی۔ جاپانیوں جرمنیوں کے خلاف لڑنے اور ہندوستان بچانے کے لئے حکومت نے جنگجو راجپوت قوم کو بھرتی ہونے پر مجبور کیا کچھ مالی اعتبار سے بھی راجپوت برادری کمزور ہو گئی تھی

چونکہ راجپوت تلوار کے دھنی قول کے پکے ہوتے ہیں جان جائے مگر قول نہ جائے کے مصداق

'جنہیں وطن کی آن پر مریں اتنا یہ ہے ستم
یہ راجپوت چھاؤں میں تلواروں کے پلے ہیں۔

راجپوت برادری نے اپنا جدی پشتی جنگجویانہ ریت کو نہیں چھوڑا بلکہ سپاہ گری کا پیشہ ہی اپنایا۔ اور انگریزی فوج میں دھڑا دھڑ بھرتی ہوتے گئے راجپوت برادری کے نوجوان اپنے نام کے ساتھ اپنے قبیلے کا نام بھی لکھواتے تھے۔ انگریزوں نے قبائل کے نام کے ساتھ لکھنے پر پابندی عائد کر دی کہ اپنے قبائل چوہان راجپوت، پرتہار راجپوت، چندیل راجپوت، جنجوعہ راجپوت اور بھٹی راجپوت کے بجائے صرف راجپوت، ہی لکھوائیں مجبوراً راجپوت برادری کو اپنے کرالٹس پہ کراتے ہر کوفت ہوتی تھی

میرے دادا جان سردار کالا خان بندا بھٹی راجپوت کے دو بڑے بیٹے یعنی میرے تائے جناب فضل الٰہی بھٹی اور کرم الٰہی بھٹی انگریزی فوج میں بھرتی ہو چکے تھے اور نارلوں۔ ساتھیوں کے خلاف مختلف محاذوں پر لڑتے لڑتے کارہائے نمایاں بھی ادا کئے تھے۔ جس کی وجہ سے انگریز سرکار نے تمغہ جات اور میڈل سے نوازا بھی تھا۔ اور ۱۸۵۷ء کے دوران بندا کا بندہ اراضی قرق کر لی گئی تھی واپس انعام میں دے دی تھی۔

۱۹۱۸ء کو تایا کرم الٰہی بھٹی کے گھر سرور حسین بھٹی پیدا ہوا تھا چونکہ بندا بھٹی راجپوت حویلی میں یہ پہلی اولاد تھی اس لئے بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ یہاں دوہری خوشی ہو گئی کیوں کہ جنگ عظیم اول کی لام بندی ہو گئی سپاہی اپنے اپنے گھروں اور خاندانوں میں سکون و چین سے رہنے لگے تھے۔ گمشدہ سپاہیوں کے پیغامات بھی آنے شروع ہو گئے تھے۔

ہمارا گاؤں بکڑالہ جو کوہ گنجی (پہاڑ) کے بالکل دامن میں ہے یہاں کے ۳۲ فوجی جوانوں نے جنگ عظیم اول میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ ان کو میڈل تمغہ جات سے نوازا گیا۔ جس میں ہمارے دادا اور دونوں تایا صاحب بھی شامل تھے۔

گورنمنٹ آف برطانیہ کی سرکار نے ان کامیابیوں اور سرکار کا [illegible] دینے کے صلے میں ہمارے گاؤں کو مزید سہولتیں دے دی گئیں۔ ایک گورنمنٹ برطانیہ پرائمری سکول ۱۹۱۶ء کو قائم کیا گیا۔ دوسرا اسکول کے اندر ہی ایک پوسٹ آفس کا اجرا بھی ہو گیا۔ تیسرا سوا میل دور ہمارے گاؤں کے نام سے بکڑالہ ریلوے سٹیشن بھی بنایا۔ چوتھا ہمارے گاؤں کے نام سے جرنیلی سڑک اور ریلوے

تراب عرض لاہور

ڈیٹن کے دو پل ندی پر بنائے گئے پلوں کا نام یکڑا اپل رکھا گیا۔ سفری سہولتیں فوجیوں کے لئے قائم کی گئی تھیں

۱۹۲۴ء کو تایا زاد بھائی جب گل کو جیوں میں بھا۔لئے۔ دوڑنے لگے تو ان کو گاؤں کے سکول میں داخل کرایا گیا۔ اس وقت تعلیم کی طرف مسلمانوں کا دھیان کم تھا۔ مسلمان ٹیچر آٹے میں نمک کے مانند تھے۔ ہندو۔ سکھ۔ عیسائی ہی زیادہ پڑھائی کراتے تھے۔ چونکہ ماں باپ دادا دادی تایا چاچیوں کے لاڈلے اور اکلوتی اولاد تھے۔ اس لئے کھلنڈرے ہو گئے رہتے۔ پہلی جماعت کے ماسٹر ہرنام سنگھ نے گنتی نہ پر بھائی کو تھپڑ رسید کر دیا۔ سرور حسین روتا روتا گھر گئی۔ دادی سے پوچھا اور غصے میں ماسٹر ہرنام سنگھ کے گھر چلی گئیں کہ تم نے میرے پوتے کو کیوں مارا ہے

سکھ خان۔ سردارنی جی۔ چودھرانی جی۔ سرور سالے کو گنتی نہ آتی تھی۔ ماسٹر صاحب نے فرمایا۔

دوسرے دن والد صاحب معہ بال بچوں کے فیروزپور چھاؤنی چلے گئے۔ اب بھائی کو اور آزادی مل گئی والد صاحب تو ٹریننگ سنٹر میں نئی پود کو بھرتی کر کے ٹریننگ دیتے تھے تو صاحبزادے سرور حسین پوری سول لائن میں گھومتے پھرتے تھے۔ اس طرح پڑھائی سے ان کا جی اچاٹ ہو گیا۔

۱۹۳۰ء کو تایا صاحب کرم الٰہی بال بچوں کو لے کر گھر واپس آئے۔ ایک بھائی کرامت حسین کا اور بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ دو بڑی بہنیں اور دو یہ بھائی تھے۔

۱۹۳۲ء کو کرم الٰہی نے دونوں بڑی بیٹیوں کی شادی کر دی اب بھائی سرور اور کرامت والدین کے ساتھ خوب گھومتے پھرتے تھے کبھی ڈیرہ دون ٹرانسفر ہو گئی۔ سال وہاں رہے۔ وہاں سے شملہ چھاؤنی چلے گئے آدھا سال وہاں گزارہ تو کوئٹہ کا رخت سفر باندھا پھر سال چھ ماہ یعنی کوئٹہ کے زلزلے ۱۹۳۵ء میں کرم الٰہی اپنے بچوں کے ساتھ چھاؤنی میں مقیم تھے۔

۱۹۳۶ء کو ایک اور بھائی صابر حسین کا اضافہ ہو گیا۔ جو آج کل ولایت میں تارک وطن بیٹھا ہے۔ وہاں سے تایا صاحب کی بدلی ڈیرہ نواب صاحب بہاولپور میں ہو گئی۔

میرے والد صاحب جناب ہیبت علی بھٹی چونکہ سب بھائیوں سے چھوٹے تھے اس لئے بڑے بھائی کرم الٰہی کے بال بچوں کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ جہاں بھی ٹرانسفر ہوئی والد نے ان کے بچوں کو پہنچایا۔ پھر ایک دو ماہ بعد گاؤں واپس آ گئے۔

جنگ عظیم دوم ۱۹۴۵ء کو شروع ہو گئی سنٹرول چھاؤنی کو خالی کر دیا گیا۔ سپاہیوں کے بال بچوں کو واپس گھروں میں بھیجا گیا تو تائی صاحب دونوں بچوں کو ساتھ لے کر گاؤں واپس آ گئی۔ اب میرے تایا زاد بھائی سرور حسین آزاد ہو گئے کسی کا کوئی کنٹرول نہ رہا۔ صبح ناشتہ کر کے سامنے پہاڑی گزرگاہ پر ریلوے پھاٹک ہے وہاں چلے جاتے۔ ریل گاڑی چڑھائی کی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ ایک انجن جو کوئلے سے چلتا تھا۔ آگے ایک پیچھے ٹرین کے لگا ہوتا تھا۔ یہ گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ ٹرین کے ڈبوں میں چڑھ جاتے۔ آگے سوہاوہ سٹیشن میں اتر پڑتے انگریز حکومت تھی۔ انگریز ڈرائیور بچوں کو منع نہیں کرتے تھے ویسے پیار سے سمجھاتے ضرور تھے۔

سوہاوہ سے واپسی پر کسی ٹرین میں بیٹھ کر پھاٹک کے پاس آ کر اتر جاتے تھے۔ کیونکہ اکثر گاڑیاں پھاٹک کے چوکیدار کے لئے پانی کی ٹینکی لاتے تھے۔ دس پندرہ منٹ وہاں ٹھہر کر پانی ٹینکی میں ڈال کر جہلم کی طرف ٹرین کو چلاتے تھے یہ بچے ٹینکی پہ سے اتر کر گاؤں آ جاتے تھے۔ بھائی سرور حسین اتنے آزاد خیال اور فری ہو گئے تھے۔ حاضر جواب ایسے کہ ادھر کسی نے منہ سے لفظ نکالا ان کے پاس جواب پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ اس لئے گارڈن کے انجن ڈرائیور اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ کبھی کبھی تو ریل گاڑی پر بیٹھ کر نانا نانی ماموں کے پاس مندرہ چلے جاتے پہلے تو گھر والوں کو بڑی فکر ہوتی بہنوں کے پاس آدمیوں کو بھیج کر پتہ کروا لیتے جب اس کا یہ پتہ چلا کہ ڈرائیوروں سے دوستی گانٹھی ہوئی ہے۔ مطمئن ہو جاتے تھے۔ کہ کہیں نہ کہیں سے گھوم کر واپس آ جائے گا۔

۱۹۴۲ء کو ایمرجنسی کے آثار شروع ہو گئے جن

لوگوں کو دو ماہ کی چھٹیاں گزارنے گاؤں آئے ایک ماہ ہی گزرا تھا کہ کال اپ لیٹر آ گئے فوراً اپنی اپنی ڈیوٹی پہ پہنچیں جناب تایا صاحب کرم الہٰی کو بھی اپنی چھاؤنی میں جانا تھا۔

صبح سب برادری خویش قبیلے سے الوداعی ملاقات کر کے سیدھے ترکی ریلوے سٹیشن پر پہنچے اپنے قریبی رشتہ دار میرے والد صاحب چچا جان۔ تائی صاحبہ۔ والدہ صاحبہ اور چچی جان اور سرور اور کرامت بھی ساتھ ہی تھے۔

گاڑی سٹیشن پر کھڑی ہوئی تو زیادہ مسافر ملٹری میں ہی تھے سرور حسین ضد کرنے لگا کہ میں بھی والد صاحب کے ساتھ جاؤں گا۔ سب نے سمجھایا بجھایا مگر وہ نہ مانا۔ والد نے غصے ہو کر گالی دے دی یہ بھاگ کر راولپنڈی جانے والی گاڑی جو دوسری لائن میں کھڑی تھی وہاں چلا گیا۔ سب سمجھے شیطان ہے نانا نانی کے پاس غصے میں چلا جائے گا۔

گارڈ نے سیٹی بجائی الوداعی ہاتھ اٹھے اور ترکی سٹیشن کو گاڑی جہلم کی طرف رینگنے لگی جب پلیٹ فارم خالی ہوا تو سرور حسین کو گھر والوں نے خوب ڈھونڈا دوسری کھڑی گاڑی کے ڈبوں میں جھانک کر دیکھا مگر وہ نہیں آئے۔ اتنی دیر میں راولپنڈی جانے والی گاڑی بھی چل پڑی۔ اب گھر والے نا امید گھر لوٹ آئے۔ ان کے نانا۔ ماموں اور بہنوں کو خطوط لکھے مگر سب نے لاعلمی ظاہر کی پھر ان کے والد صاحب کو خط لکھا۔ انہوں نے بھی بڑا افسوس کیا۔ اور لاعلمی کا ظاہر کیا۔ تب گھر والوں کو بہت ہی افسوس کیا کہ جوان بیٹا ہاتھ سے گنوا بیٹھے۔

۱۹۴۴ء کو جب ذرا جنگ کا سکون ہوا تو تایا صاحب گھر واپس آئے لوگ افسوس کے لئے آنے لگے۔ بیٹے کے بچھڑنے کا ان کو بہت قلق تھا۔ یہ غم لے کر دوبارہ محاذِ جنگ میں چلے گئے اور دشمن سے نبرد آزما ہوتے رہے

۱۹۴۵ء کو جب جنگ بند ہوئی تو فوجی جوانوں کو تین تین ماہ کی رخصت دے کر گورنمنٹ نے گاؤں گوٹھوں میں ریسٹ کے لئے بھیج دیا۔ تایا صاحب کو ریٹائرڈ کر کے بھیجا گیا۔ کیونکہ وہ اندرونی طور پر ٹی بی کی بیماری میں گھر چکے تھے۔

تایا صاحب کو اپنے بیٹے کی جدائی قبر تک لے گئی۔

اناللہ وانا الیہ راجعون ؁

اب تایا صاحب کے چھوٹے بیٹے کرامت حسین بھی ملٹری فوج ایمبیلینس سروس میں بھرتی ہو چکے تھے۔ تائی صاحبہ بیٹے کی جدائی کا غم نہ بھولی تھی کہ خاوند کی بے وقت موت نے ان پر کاری ضرب لگائی اس کے بعد دوسرے بیٹے کی جدائی تو تھی ہی مگر اس کی خیر خبر آتی تھی۔ ملٹری سروس میں چھٹیاں مل جاتی ہیں وہ گھر آ کر والدہ اور چھوٹے بھائی صابر کے ساتھ گزارتے تھے

ماں کی ممتا کا بڑا نازک دل ہوتا ہے۔ وہ اپنی اولاد کے دکھ کی خاطر اپنی جان تک کو داؤ پر لگا دیتی ہے مگر بچے کو کوئی گرم سرد ہوا نہ لگنے دیتی ہے۔ تو ماں اپنے بچھڑے ہوئے جگر گوشے کے لئے دعائیں مانگتی۔ پانچوں وقت کی نماز کے ساتھ نفل گزارتی مزاروں پر خانقاہوں پر چڑھاوے چڑھاتی۔ چادریں چڑھانے کی منتیں مانتی نذر نیاز دلواتی تھیں کہ شاید ان بزرگوں کے طفیل سے میرا بچھڑا ہوا جگر کا ٹکڑا مل جائے۔

بڑھی جان چھوٹے بیٹے کو ساتھ لئے بزرگ ہستیوں کے مزاروں پر جاتی مسافتیں طے کرتی مزار مقدس پر نفل گزارتی ساتھ فقیر دیور نور ماہی بیٹی بھی ساتھ ہوتے وہ بھی اپنے بچھڑے ہوئے بھتیجے کے لئے دیگیں نذر نیاز مانتے تو چندی جمعرات کا روزہ رکھتے مزاروں پہ حاضری دیتے اور بھتیجے کے ملنے کی التجا کرتے تھے۔

آخر ماں کی دعا رب اکبر کے دربار میں قبول ہوئی۔ نفل۔ نذر نیاز اور بزرگوں کی نیک کمائی نے بچھڑوں کو لانے کا وسیلہ کیا اور ۳ سالہ بچھڑا ہوا سرور حسین یعنی ۱۳ جون ۱۹۴۶ء کو نانا نانی کے گاؤں مندرہ میں پہنچا کیونکہ والدہ وہاں ہی رہ رہی تھیں۔ نانی نانا فوت ہو چکے تھے۔ ایک ماموں زندہ سلامت تھے۔ ماموں صاحب اور ممانی صاحبہ نے بے حد خوشیاں منائیں۔

۲۰ جون ۱۹۴۶ء کو ایک ہفتہ بعد اپنی دونوں بہنوں، ان کے بچوں، ماموں ممانی کو ساتھ لے کر اپنے آبائی

گاؤں بکشالہ میں وارد ہوئے ۔ گاؤں بھر میں عید کا سا سماں ہوگیا ۔

تائی صاحب ۔ والد صاحب چچا صاحب کو مبارکباد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا مبارک دینے والوں کا منہ میٹھا شکر اور گڑ اور چینی بتاشوں سے کرایا جاتا تھا ۔ اور شیرینی بھی بانٹی گئی ۔

دوسرے ہفتے بھائی سرور حسین نے والد صاحب کی قبر کو پکا کروایا اور ان کی روحوں کو ثواب پہنچانے کے لئے ختم کروایا گیا ۔ قرآن خوانی ہوئی ۔ ایک بار پھر پوری برادری اور پورے گاؤں کو دعوت طعام دی گئی ۔ پھر خوشی کا سماں پیدا ہوگیا

تیسرے ہفتے اپنے دونوں چچاؤں کے مشورے پر پرانی حویلی میں مکانات کی تعمیر کی اجازت چاہی چچا جان نے خوشی اپنے حصوں کی زمین بھی بھتیجے کو مکانات کے لئے دے دی اور خود دوسرے کے مکانوں میں رہنے لگے ۔

اتفاق جس قوم میں ہوتا ہے ۔ وہ قوم ایک مضبوط معاشرہ قائم کرتی ہے اس قوم کو کوئی شکست نہیں دے سکتا نہ ہی تفرقہ ڈال سکتا ہے ۔ بھائی نے تعمیرات کے لئے ضروری اشیاء کی خریداری شروع کی لکڑی جہلم سے خرید لائے ۔ پتھر نکالنے اپنے پہاڑ کوہ کنٹی سے نکلوانے کا ٹھیکہ دے دیا گرمیوں کے دن تھے ۔ پانی ناپید تھا ۔ چار آنے ٹین بالٹی کے حساب سے کنواں پر سے ڈلوا کر مکانات کی تعمیر کا کام شروع ہوا ۔

غرضیکہ روپے کو پانی کی طرح بہانے لگے ۔ اس لئے کہ اپنے خاندان باپ دادا پردادا کی راجپوت کی حویلی قائم دائم رہے ۔

مکانات کی تعمیرات مکمل ہونے کے بعد پھر پوری برادری کو مدعو کیا گیا ہفتہ بھر جشن منایا گیا ۔ اب مکانات کی تعمیر کی مکمل ہونے کی لوگ مبارک باد دینے آتے ان کا منہ میٹھا کرایا جاتا ۔

اتنے میں رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہوگیا بھائی نے مکمل روزے رکھے نمازیں اور نماز تراویح میں ذکر اذکار بھی کرتے تھے ۔ عید الفطر پہ پھر گاؤں میں میلے کا سا سماں ہوگیا ۔ لوگ بھائی کو ملنے آنے لگے ۔

میری عمر اس وقت دس سال تھی اور میں تیسری کلاس میں پڑھتا تھا ۔ تمہیں اردو ۔ ہندی اور گورمکھی پڑھائی جاتی تھی ۔ ہندو سکھ عیسائی اور مسلمان بالکل امن و سکون سے رہ رہے تھے ۔

بھائی سرور حسین کے بڑے بہنوئی مسٹر بوستان خان جھلی جو ملٹری میں انگریز کمشنر کے دست راست تھے ۔ وہ مکانات کی تعمیر میں منیجر کا کام انجام دے رہے تھے ۔ انتظامی معاملات ان کے ہاتھ میں تھا ۔ بھائی سرور اپنے ساتھ ہز ماسٹر وائس گراموفون اور ریکارڈز بھی لائے تھے ۔ دن کو کمروں کے اندر چلاتے تھے ۔ رات کو مکانوں کی چھت پر گراموفون بجاتے تھے ۔ ہم بچے آگے پیچھے ہو کر دیکھتے تھے کہ ایک پلیٹ سے آواز کیسے نکلتی ہے کبھی گراموفون کے آگے کبھی پیچھے چلے جاتے تھے ۔ اور بڑے تجسس سے یہ سوچتے تھے کہ آیا یہ عورتوں مردوں نے ان کے اندر بیٹھ کر کیسے گانا گایا ہے ۔ ساز ندے کہاں بیٹھے ہوں گے ۔ پھر ہارن (لاؤڈ سپیکر) کو جھک کر اندر دیکھتے جہاں صرف اندھیرا گھپ ہوتا تھا ۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ ان کے اندر ہی یہ عورتیں مرد بیٹھ کر گاتے ہیں وغیرہ وغیرہ

فلم رتن کا یہ گانا

مل کے بچھڑ گئی اکھیاں

ہائے راما ۔ مل کے بچھڑ گئی اکھیاں

والا ریکارڈ بھائی سرور حسین بار بار لگاتے تھے اور سر دھنتے بھی تھے اس کے بعد اس فلم رتن کا دوسرا ریکارڈ چڑھا دیتے تھے ۔

جب تم ہی چلے پر دیس لگا کر ٹھیس

او پریتم پیارا دنیا میں کون ہمارا

یہ گانا سنتے سنتے وہ کچھ اداس اور مغموم سے نظر آتے تھے کہ ۔

ایک دن مجھ کو اور بھائی صابر حسین کو جو مجھ سے چھ ماہ بڑے تھے بہنوئی بوستان خان پڑھا رہے تھے ۔ اردو کے بعد حساب زبانی کی باری آئی انہوں نے پہلے پہاڑے پوچھے پھر زبانی سوال کئے جن کے جوابات میں نے فوراً ہی دے دیئے تھے ۔

جواب عرض قاصد

پھر را ملا گھرائی گئی۔ میری دو غلطیاں تھیں اور صابر حسین کی دس بارہ غلطیاں ادا میں نکلیں۔ بھائی سرور حسین نے اپنے بھائی صابر حسین کو چھڑی سے خوب پیٹا اور مجھے شاباش دینے لگے اس کو حساب تو بالکل ہی نہ آتا تھا۔ اس وجہ سے وہ چار کلاسیں پڑھ کر سکول سے بھاگ نکلے اور فوج میں بھرتی ہوگئے تھے وہ بیں فوج سے بھی بھاگ کر بحری جہاز کے ذریعے انگلستان چلے گئے۔

دوسرے دن سکول سے پڑھ کر دوپہر واپس آئے کھانا کھایا نماز کو چلے گئے واپسی پر سکول کا ہوم ورک کرنے لگے تو بیٹھک کے اندر سے گراموفون کی آواز آئی۔ جلدی جلدی کام کیا۔ بستہ بند کیا۔ اور بھائی سرور حسین کے پاس آگئے۔ بھائی نے بڑے پیار سے مجھے اپنے پاس والی کرسی پر بٹھا لیا۔ اس وقت بھی یہی گانا۔

مل کے بچھڑ گئی اکھیاں

او راما مل کے بچھڑ گئی اکھیاں

چل رہا تھا۔ میں نے سکون دیکھا کوئی بھی آدمی ان کے پاس نہ تھا موقع جانا اور میں بھائی جان سے گزرے حالات پوچھ بیٹھا۔

بھاپا (یہ پوٹھوہاری (بھٹی داری) زبان میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں)

آپ بار بار اسی ریکارڈ کو کیوں بجاتے ہیں۔

پھر آپ اتنے عرصے کہاں غائب رہے۔

ہم سب چھوٹے چھوٹے بچوں کو تائی صاحبہ کہتی تھی کہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگو کہ تم لوگوں کا گمشدہ بھائی مل جائے ..... یہ سب سوال اور باتیں ایک ہی سانس میں۔ میں کہہ گیا۔

بھائی سرور حسین نے کرسی پر پینترا بدلا اور مجھ سے مخاطب ہوا۔ اور اپنی سر پہ گذری ہوئی سنانی شروع کر دیں ......

برادر عزیزم

میرے بچھڑنے کے واقعات تو سب کو معلوم ہیں مگر میں وہاں سے سر پہ گزرنے والے واقعات سناؤں گا۔ جہاں سے میں اپنے والدین بہن بھائیوں اور رشتہ دار وغیرہ سے بالکل بچھڑ گیا۔

گاڑی جب جہلم سٹیشن پر رکی فوجی جوان چڑھنے لگے۔ میں ڈبوں میں بوگیوں میں والد صاحب کو ڈھونڈنے لگا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی گاڑی چل پڑی کی لاہور میں آکر رکی جہاں پر والد صاحب کو گاڑی بدلنی تھی سب فوجی اپنے اپنے بستر لئے تیسرے پلیٹ فارم پہ کھڑی گاڑی میں چڑھنے لگے۔ میں بھی اتر کر ادھر کو دوڑا اور ایک ڈبے میں چڑھ گیا جب گاڑی جودھ پور پہنچی تو ہمارا ڈبہ کٹ گیا۔ مجھے کچھ خبر نہ ہوئی۔

دوسری ٹرین طوفان میل یہ ڈبہ لے کر سیدھی بمبئی چلی آئی۔ آخری سٹیشن تھا۔ سب مسافر اتر گئے میں بھی ڈرتے ڈرتے نکلا بھوک پیاس سے برا حال ہو رہا تھا۔ تین دن کا پیاسا پھر اجنبی شہر اتنے میں ٹکٹ کلکٹر آ نکلا اور ٹکٹ کا پوچھنے لگا۔ میں نے رونا شروع کر دیا۔ وہ پکڑ کر سٹیشن ماسٹر کے پاس لے آیا۔ سٹیشن ماسٹر بڑے مشفق انسان تھے۔ انہوں نے شفقت کا ہاتھ میرے سر پہ پھیرا پیار کیا۔ رہائش کا اتہ پتہ پوچھا میں بچہ تھا۔ کچھ نہ بتا سکا۔ کچھ ڈر غالب تھا۔ انہوں نے مجھے تسلی دی۔ مسلمان ہونے کے ناطے میں وہ مجھے بچہ سمجھ کر اپنے بنگلے میں ہی لے آئے۔

غسل کروایا۔ بڑے لڑکے کے کپڑے پہننے کے لئے دیئے پھر کھانا ڈائننگ روم میں کھلوانا چاہا۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔ پھر ان کے مجبور کرنے پر کھانا کھا لیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد مجھے فوراً ہی نیند آنے لگی۔ تین دن کا جاگا ہوا تھا۔ سونے پر فوراً نیند آگئی اور میں سو گیا

شام سو کر اٹھا تو اپنے آپ کو ایک اجنبی جگہ میں پایا سب لوگ چائے کی میز کے پاس بیٹھے چائے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک نوکرانی نے مجھے کہا کہ سٹیشن ماسٹر صاحب باہر بلا رہے ہیں۔ میں وہاں پہنچا تو آگے ایک کرسی خالی تھی۔ میں بیٹھ گیا۔ سٹیشن ماسٹر صاحب ان کی بیوی بڑا لڑکا ظفر اقبال سیما لڑکی جو مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی۔ اور ناصر اقبال لڑکا بیٹھے تھے۔ سب نے مل کر چائے پی۔ چائے پی چکنے کے بعد سٹیشن ماسٹر صاحب نے مجھ سے حالات

جواب عرض لاہور

دریافت کیا میں نے بھی پورے حالات بیان کر دیئے وہ بھی والدین سے بچھڑنے پر افسوس کرنے لگے بچے بھی مجھے تسلی دینے لگے۔ میں ان کے اندر گھل مل گیا تھا

سٹیشن ماسٹر کی بیوی اور سٹیشن ماسٹر صاحب کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا کیونکہ کلکتہ پر جاپانی بمباری سے ان کے خاندان والے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنا بچہ بنا لیا۔ میں بھی ان کا فرمانبردار بچہ بن کر دعائیں لینے لگا۔

جب کافی دن گزر گئے تو میں اکتا گیا۔ سدھرا سٹیشن پر پہنچا

حسین تم ادھر کیوں آئے ہو۔ بابا نے پوچھا

میں نے صاف گوئی سے کام لیا اور کہا۔

بابا! میرا جی گھر میں نہ لگ رہا تھا میں آپ کی طرف آ نکلا۔

باباجی۔ میں آپ سے مشورے کا طلب گار ہوں۔

کہو کہو بیٹے۔ کیا بات ہے۔

تب میں نے بابا سے کہا کہ بابا میرا دل کہتا ہے۔ کہ پردیس میں بے کار بیٹھنا نادانوں کا کام ہے۔ عقلمند اپنی روزی خود کماتے ہیں۔ اور جو بچے بڑوں کے سہارے بیٹھتے ہیں بزرگوں کی عزت کرتے ہیں۔ خدا بھی ان پر مہربان ہوتا ہے۔

بابا بہت خوش ہوئے میری پیٹھ تھپکی شاباش دی۔ پھر ایک کلرک کو بلا کر مارکیٹ مجھے بھیج دیا۔ کلرک مجھے ایک مارکیٹ ایجنٹ کے پاس لے گئے بابا کا رقعہ دکھایا۔ ایجنٹ نے رقعہ پڑھا۔ مجھے پاس بلایا اور بیٹھ کر بات چیت کرنے لگا۔

بیٹا دیکھو! جو بھی آدمی چھوٹے کاروبار کرتے کرتے بڑے کاروبار کر اپناتا ہے۔ وہ آدمی ایک دن بڑا ساہوکار کہلاتا ہے اس لئے میں تم کو ایک چھوٹا کاروبار کرنے کے گر بتا دیتا ہوں۔ کل سے تم اس گر کو یاد کر کے کاروبار شروع کر دو۔

دوسری صبح میں ایجنٹ کے پاس مارکیٹ میں ایجنٹ صاحب نے مجھے لیموں چار درجن دیئے اور کہا کر۔

ان کو بیٹے اس بھاؤ سے فروخت کرنا اگر یہ سب بیچ ڈالے تو کل چھ درجن لے کر جانا۔

میں لیموں لے کر سدھارا ریلوے سٹیشن آیا اور پلیٹ فارم پر چل پھر کر میں نے دو گھنٹے میں ہی بیچ ڈالے پیسے لا کر بابا کو دیئے دوسرے دن چھ درجن تیسرے دن گیارہ لیموں بیچ ڈالے اب تجارت کی لپ سے مجھے کچھ واقفیت ہونی شروع ہو گئی تھی۔

ایک ماہ میں میں نے کافی رقم اکٹھی کر لی پھر لیموں کا موسم بھی ختم ہو رہا تھا۔ میں پان بیڑی سے بھی شفقت کرنے لگا مگر بابا سے چوری چوری۔ بابا سے بولا کہ بابا مجھے کوئی پان کی دکان دلوا دیں۔ ایک چھوٹا سا دکان کرایہ پہ بابا نے دلوا دی۔

میں بابا کے ساتھ نماز سحر پڑھ کر دکان کھولتا صاف کرتا اور سامان سیٹ کرتا پھر گاہک آنے لگتے۔ سات بجے صبح ناشتہ کرنے گھر آتا ناشتہ کر کے فوراً دوکان کھولتا پھر ڈیڑھ بجے کھانا کھانے نماز ادا کرنے کے بعد تھوڑا سا گھنٹہ آدھ گھنٹہ مسجد میں ہی سستا لیتا تھا۔ رات گئے گھر آتا اسٹو گرم کر کے کتھا۔ چونا تیار کر کے ڈولیوں میں رکھ دیتا تھا۔ جو صبح سویرے تک ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔

گھر کے سب ہی افراد پان کھاتے تھے۔ ابا صرف سگریٹ پیتے تھے۔ میں جب رات ۱۰ بجے دکان بند کرنے لگتا تو پہلے سب گھر والوں کے لئے فرداً فرداً ایک ایک، پان بنا کر کاغذ میں باندھتا جاتا تھا۔ دکان بند کر کے گھر واپس لوٹتا سب مل کر ساڑھے دس بجے کھانا کھاتے پھر میں سب کو باری باری پان کی گلوری دیتا جاتا اور بابا کو سگریٹ پیش کرتا تھا۔

گھنٹہ آدھ گھنٹہ ملکی غیر ملکی حالات پر بحث ہوتی کچھ جنگ کی تباہی و بربادی پر روشنی ڈالی جاتی پھر سب اپنے اپنے بستر پہ سونے کے لئے اٹھ جاتے اور جا کر سو جاتے تھے۔

چار سال بعد میں نے پان بیڑی سگریٹ دکان سے خاصی رقم جمع کر لی اور ایک کافی ہاؤس کا ارادہ

ظاہر کیا۔ بابا نے خوشی کا اظہار کیا میں نے بازار میں چھوٹا سا کافی ہاؤس "سرور ہوٹل" سیٹھ سرور حسین باندرہ بمبئی انڈیا میں کھول لیا میں اور بابا کا چھوٹا لڑکا ناصر اقبال میرا ساتھ دیتا تھا۔ بڑا ظفر اقبال مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت چلا گیا تھا۔

یہاں کی دوکان کرائے پر دے دی تھی۔ اب ساری توجہ ہوٹل کے کام کاج پر لگا دی کاروبار چمک اٹھا پھر بمبئی جیسے انٹرنیشنل شہر میں تو اور زیادہ کاروباری حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔

بابا نے میرا نکاح سیما سے پڑھوا دیا۔ میری قسمت اور چمک اٹھی مجھے ایک سگھڑ سیانی بیوی مل گئی تھی ازدواجی زندگی اور پرسکون گزرنے لگی۔ میرے سسر سٹیشن ماسٹر ریٹائر ہو گئے انہوں نے پہلے ہی اپنے لئے ایک، دو سو گز مربع زمین پر عالیشان کوٹھی تعمیر کرالی تھی ایک حصہ ہمیں بھی بابا نے دے دیا تھا۔

اب ایک دوست نے مجھے کپڑے کی تجارت کی طرف راغب کیا۔ پہلے میں نے ایک چھوٹی سی دکان کپڑے کی بنائی۔ کاروبار اچھا چل نکلا اسی دوکان کو بڑا کر دیا۔ ہوٹل پر ناصر اقبال اور نوکر کام کرتے تھے۔

جب میرا کپڑے کا کاروبار اچھا چلنے لگا تو چوپاٹی بازار میں کلاتھ مرکز کھولا جس کا نام سرور کلاتھ مرکز رکھا کچھ نوکر اور رکھ لئے۔

مجھے چونکہ بچپن سے ہی سیر و تفریح کا شوق تھا۔ پھر والد صاحب چونکہ ملٹری سروس میں تھے۔ لنگر کمانڈر تھے۔ ان کی جہاں بھی ٹرانسفر ہوئی ہم بھی ساتھ ہی جاتے تھے کبھی انبالہ چھاؤنی۔ کبھی ڈیرہ دون کبھی فیروز پور چھاؤنی میں رہ رہے تھے۔

اب میں کپڑے کے کاروباری سلسلے میں ہندوستان کے بڑے شہروں کے تھوک بیوپاریوں سے مراسم پیدا کئے اور شہروں کے سفر کے لئے جانا پڑتا تھا۔ مہینے میں پندرہ بیس دن میرا سفر میں گزر جاتا تھا مگر تمہاری بھابی سیما نے کبھی شکایت نہ کی۔

مدراس میں ایک دوست میرا بن گیا۔ بہت ہی مخلص انسان تھا۔ جان محمد پہلے تو وہ آرٹ کا کام کرتا تھا پاکیٹی پر چلتا تھا میں نے اس کی ایمانداری اور دوستی میں یکتائی دیکھی تو مجھے احساس ہوا۔ میں نے ایک دکان جان محمد کو مدراس میں بھی .... سرور سلکو کلاتھ ہاؤس دیوالی دبا بازار مدراس نمبر ۵ میں کھول دی۔ وہ دیانتداری سے کام کرنے لگا اور میرا ساتھ دیتا تھا۔

کلکتہ میں بھی کپڑے کے بیوپاریوں میں چند میرے مخلص یار تھے۔ ایک میرا دوست چوہدری فضل حق بڑا مخلص طبیعت کا مالک تھا اسے کئی دفعہ کاروبار میں نقصان ہوا مجھے دعائیں دینے لگا۔

میں مہینے دو مہینے بعد ایک یا دو ہفتے کے دورے پر بمبئی سے اجمیر۔ دہلی۔ آگرہ۔ مدراس اور کلکتہ جاتا تھا۔ اور وہاں کی کاروباری مارکیٹ پوزیشن اور اپنے کاروبار کی مکمل رپورٹ اور مال کی ڈیمانڈ لے کر آتا ان کو وقت پر ڈیمانڈ پہنچاتا تھا۔ جب دوستوں میں پہنچتا تو خوب محفلیں گرم ہوتی تھیں اور سیر و تفریح کے لئے بھی خوب بالخصوص سیر شملہ کی سیر نینی تال کی سیر اور پہاڑوں کے سفر کی بھی سیر سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

جنگ عظیم دو ختم ہوئی ملکی حالات سنبھلے کاروباری واقتصادی ابتری ختم ہوئی تو میرا کپڑے کا کاروبار بام عروج پر تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی۔

بابا کو حضرت خواجہ خواجگان خواجہ غریب نواز معین الدین چشتی اجمیری رحمہ سلطان دلی ہند سے عقیدت تھی وہ ہر سال اجمیر شریف میں خواجہ کے عرس مبارک پر حاضری دیتے تھے۔ ہماری شادی ہوئی چھ ماہ گزر گئے تھے مجھے سیما۔ ناصر اقبال اور سیما کی ماں کو لے کر اجمیر شریف عرس مبارک پر لے گئے۔ ہم دونوں یعنی میں اور میری بیوی سیما اجمیر شریف کی گدی نشین کے دست بیعت مرید ہو گئے۔

بابا خواجہ غریب نواز سلطان دلی ہند کی چھٹی کا دن تھا قوال اپنی اپنی دھن میں خواجہ غریب نواز اجمیری کی منقبت گا رہے تھے۔

جناب عرض لاہور

اجمیر گیا تو تو ـــ اے خواجہ
پیارے پیارے
ہر ساعت تڑپتا ھـــوں
ســے خواجہ
پیارے پیارے

قوالی کی دھن پر میری حالت غیر ہونے لگی یعنی وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں دھمال کرنے لگا اور بھی کئی لوگ دھمال ڈال رہے تھے۔ دھمال کرتے کرتے مجھ پر بےہوشی طاری ہو گئی اور غشی کے عالم میں گر پڑا فوراً مجھے چند لوگوں نے مجھے اٹھایا اور گدی نشین یعنی میرے پیر و مرشد کے پاس لے گئے انہوں نے مجھ پر دم کیا اور پھونک ماری۔

غشی کے عالم میں ہی مجھے خواجہ خواجگان سلطان الہند حضرت خواجہ معین الدین چشتی ؒ کا دیدار مبارک ہو گیا۔ میں نے ان کے دست مبارک کو عقیدت کے تحت چوم لیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میرے پیر و مرشد کا ہاتھ میں چوم رہا تھا۔

صبح سویرے ہمیں رخصت کی اجازت ملی ہم سب بمبئی آ گئے۔ ایک ہفتہ بیت گیا۔ کیف و سرور کا عالم مجھ پر طاری تھا کہ ایک رات خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ سلطان الہند کا میلہ لگا ہوا ہے لوگ جوق در جوق عرس مبارک میں نذر نیاز کے چڑھاوے چڑھا رہے ہیں خواجہ غریب نواز کا لنگر جاری ہے لوگ جھولیوں میں لنگر لے کر جا رہے ہیں اور ٹولیوں کی صورت میں لنگر کھا رہے ہیں میں ساگر کے تالاب میں وضو کر رہا ہوں۔ کہ پہاڑ پر سے سرور، سرور کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی آواز جانی پہچانی سنائی دی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا کہ دیکھوں۔ کون مجھے پکار رہا ہے۔ آواز میری پیٹھ کے پیچھے سے آ رہی تھی تالاب کے کنارے ہجوم میں والد صاحب کا چہرہ مبارک نظر آیا میں ان تک پہنچنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھاتا جا رہا ہوں۔ جوں جوں قدم تیز اٹھاتا جاتا تھا۔ ہجوم توں توں زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ میں ہجوم کو چیرتا ہوا جا رہا تھا کہ جلد والد صاحب کو ملوں مگر ہجوم میں سے نکلنا میرا مشکل ہوتا چلا گیا۔ جب خواجہ خواجگان سلطان الہند کے مزار مبارک کی جالی کے پاس پہنچا تو والد صاحب نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

میں مزار مبارک کی جالی پکڑ کر وہیں جھک گیا اور والد صاحب کی مغفرت کی دعا مانگنے لگا۔ کہ کسی نے اچانک میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہاتھ کے لمس سے میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے سیا جہان کھڑی تھی اور اس کا ایک ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔

سرتاج! خیر تو ہے۔ نا ـــ وہ پوچھنے لگی

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر رفع حاجت کو چلا گیا اتنے میں موذن نے اذان سحر دے دی میں غسل کر کے سیدھا مسجد پہنچا۔ نماز ادا کی اور گھر واپس آ گیا۔

ناشتے کے دوران خواب کا پس منظر گھر والوں کو سنایا اور ان سے اجازت چاہی کہ میں اپنے وطن جانا چاہتا ہوں۔ ایک ماہ بعد واپس آ جاؤں گا۔ سب نے بخوشی اجازت دے دی مگر سیا اداس ہو گئی۔ کمرے میں جا کر میں نے اسے بھی راضی کر لیا کہ میں واپس آ کر تمہیں بھی اپنے وطن لے جاؤں گا۔ تب اس نے ہاں کی۔

ایک ہفتہ تیاری کو لگ گیا۔ ضرورت کی چیزیں بہن بھائیوں بزرگوں کے لئے جوڑے۔ رشتہ برادری کے بچوں کے لئے تحفے اور دیگر ضروریات زندگی کی چیزیں اپنے پیارے دوست جان محمد کے ساتھ خریدیں اور مکمل تیاری کے بعد میں طوفان میل سے گھر روانہ ہوا یہ طوفان میل بمبئی سے چلتی تھی اور پشاور تک جاتی تھی۔ راستے میں ہی میں ہمارا گاؤں پڑتا تھا۔ میں سیدھا مندرہ ریلوے سٹیشن پر اتر کر نانی نانا کے گاؤں پہنچا اچانک میری ملاقات سے والدہ اور ماموں بہت خوش ہوئے وہاں سے ایک ہفتہ بعد اپنے آبائی گاؤں بکڑالہ میں واپس آیا۔ سب برادری اکٹھی ہوئی اور مبارک دینے لگی۔

دو ماہ بعد بھائی سرور حسین واپس بمبئی چلے گئے۔ بچوں سے ملاقات کی پندرہ دن بعد اپنے دوست جان محمد مدراسی کے ساتھ گاؤں آئے اب عید بقر (عید الضحیٰ) آ گئی دل کھول کر خوشیاں منائی گئیں۔ پھر والدین برادری سے آخری ملاقات کر کے بھائی سرور حسین اپنے دوست اور بھائی کرامت کے ساتھ لاہور آیا وہاں سے اطلس و کمخواب ریشمی

جیب خرچ۔

کپڑے خرید ے ان کو ایک گدا اور دو رضائیوں کی صورت میں بنا کر رخت سفر بمبئی کا باندھا۔ بھائی اور دوست بے طوفان میل پر بخیر و عافیت بٹھایا اور گاؤں چلے آئے۔

اب بقیہ حالات بھائی کرامت حسین جبٹی کی زبانی سنیں جو حالات بھائی سرور حسین کے لاہور سے روانہ ہونے کے بعد راستے میں گزرے تھے۔

ہوا یوں کہ جب گاڑی جودھپور ریلوے سٹیشن پر پہنچی تو پولیس نے چھاپہ مارا اور تلاشی لینے لگی تو بھائی سرور حسین نے دوست جان محمد کو بریف کیس نقدی کا دے دیا اور کہا کہ کسی مخبر نے مخبری کردی ہے کیونکہ ریشمی کپڑے پر کنٹرول تھا تم نیچے اتر کر سیدھے دہلی میرے بہنوئی بوستان خاں جبٹی کے پاس چلے جاؤ وہ کمشنر کا دست راست ہے۔ ضرور چارہ جوئی کرے گا۔ اتنے میں پولیس جامہ تلاشی اور گدے۔ رضائی کو دیکھنے لگی اور تحویل میں لے لیا اور بھائی کو گرفتار کرلیا۔ جان محمد نیچے اتر چکا تھا۔ ٹہلتا ٹہلتا دوسرے پلیٹ فارم پہ ہوڑا بمبئی ٹرین پر سوار ہو کر دہلی پہنچا بہنوئی کو بھائی سرور حسین کی گرفتاری کا واقعہ سنایا اور ضمانت کے لئے کہا اور خود بھر مدراس چلا گیا۔

بہنوئی بوستان خان جبٹی جو دہلی کے ہائی کمشنر انگریز کے دست راست تھے انہوں نے اپنی ساس اور سالے کی طرف سرور حسین کی گرفتاری کی اطلاع دے دی اور یہ بھی خط میں لکھا کہ پانچ ہزار روپے میں ضمانت ہوگی۔ رقم کا بندوبست کر کے کرامت حسین میرے پاس آجائے۔ سرور حسین کی ضمانت ہم کرا دیں گے۔ جتنی جلدی ہوسکے آئیں ....

بھائی کے گرفتار ہونے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی لوگ بھی افسوس کرنے کے لئے بندا جبٹی راجپوت حویلی میں جوق در جوق آنے لگے۔ انہی دنوں بھائی کرامت حسین بھی ملٹری کی دو ماہ کی چھٹی پر تھے ادھار سدھار سے کر کچھ گھر کا سامان اونے پونے بیچا کچھ چیزیں رہن رکھیں اور ساڑھے چار ہزار روپے پورے کئے۔

۱۵۰ روپے میں گراموفون ساتھ ریکارڈ رہن رکھے اور بھائی صاحب کرامت حسین بھائی سرور حسین کی ضمانت کے لئے بہنوئی بوستان خاں کے پاس دہلی روانہ ہوگئے۔ پیسے جاتے ساتھ ہی بہنوئی کو دے دیئے اور کہا کہ جلد بھائی سے ملاقات کراؤ دوسرے دن وہاں سے جودھپور پہنچے بھائی سے ملاقات ہوئی بھائی نے بہنوئی سے کہا کہ کیس کوئی خطرناک نہیں ہے آپ دہلی میں کیس ٹرانسفر کرا کر کمشنر صاحب سے رہائی دلا سکتے ہو۔ جیل میں ملاقات کے بعد واپس دہلی آگئے۔

دوسرے دن کمشنر صاحب سے ملاقات کر کے بہنوئی بوستان خاں نے بھائی سرور حسین کی ٹرانسفر دہلی جیل میں کرال آرڈر ہوگیا۔ ادھر رات کو بہنوئی نے کمشنر صاحب کے بنگلے میں شراب و کباب اور جوئے کی محفل سجائی۔ صبح تک بہنوئی نے جو رقم بھائی سرور حسین کی ضمانت کے لئے کرامت گاؤں سے ادھار سدھار کر کے چیزیں رہن رکھ کر لائے تھے۔ وہ جوئے میں ہار دی۔

اس طرح بھائی سرور حسین کی ضمانت کھٹائی میں پڑ گئی۔ ٹرانسفر کے بعد بھائی کرامت حسین بہنوئی بوستان خاں نے دوبارہ جیل میں ملاقات کی پھر ضمانت کرانے کا وعدہ کر کے واپس آئے تو کرامت حسین سے کہنے لگے بھائی رقم تو میں جوئے میں ہار گیا ہوں اب کیا کیا جائے۔

دس پندرہ دن بعد فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوگئے اور پاکستان کی علیحدہ مملکت بنانے پر مسلمانوں کا قتل عام ہونے لگا۔ ہندو غنڈوں اور سکھ جتھوں کی یلغار مسلمان آبادیوں پر ہونے لگی۔ مسلمان آبادیوں کو نذر آتش کرنے لگے جتنے مسلمان بے یار و مددگار اپنی جان عزیز عصمت پاک پاک وطن کی نذر کرتے پاکستان کی طرف ہجرت کرنے لگے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء بروز جمعۃ الوداع رمضان المبارک کو پاکستان دنیا کے نقشے میں ظاہر ہوگیا اور ہلالی سبز پرچم کے سائے تلے مسلم قوم نے سانس لیا۔

مسلمان اپنے پاک وطن کے لئے جان کے نذرانے پیش کرتے ہجرت کرنے لگے دہلی سے بھائی کرامت حسین اور بہنوئی بوستان خاں بھی مہاجرین کے ساتھ وطن پاک کی سرحد

جناب عرش لاہور

پار لاہور میں پہنچ گئے۔ وہاں سے اپنے گاؤں میں چلے آئے۔

پارٹیشن برصغیر کے بعد بھائی سرور حسین کا کوئی پتہ نشان نہ تھا کہ آیا وہ جیل میں ہیں یا فرار ہو گئے ہیں یا ہندو غنڈوں اور سکھ جتھوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔

واللہ عالم

۱۹۵۵ء کو دس سال کے بعد ہمیں گاؤں کے ایک صاحب صفدر حسین نے جو راجشاہی مشرقی پاکستان میں بنگال پولیس میں تعینات تھے۔ تین ماہ کی رخصت گاؤں آئے انہوں نے بتایا کہ۔

میری ملاقات سرور حسین سے ایک بازار میں ہوئی جب میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہ رہا ہے۔ وہ دہلی سے آزاد ہو کر ڈھاکہ چلا آیا تھا۔ اس نے مجھے اپنا پتہ نہیں بتایا البتہ وہ خوش ہے واپس جاؤں گا تو پھر اسے ضرور ملوں گا۔ میں بھی جلدی میں مغربی پاکستان چلا آیا تھا۔

۱۹۵۸ء کو ہمارے برادری کے بزرگ نور الہٰی صاحب راولپنڈی کسی کام کے سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ راجہ بازار سے ان کا گزر ہوا ایک کونے پر گھڑیوں کی دکان کے پاس کھڑے تھے کہ گاڑی ان کے پاس آ کر رکی اور کار میں سے ایک لمبا تڑنگا چشمہ لگائے نوجوان باہر نکلا اندر دوکان میں چلا گیا وہ کہنے لگے میں نے بغور دیکھا اس کے ماتھے پر چاند اور ستارہ کندہ تھا۔ میں ایک نظر میں پہچان گیا۔ اور کھڑا رہا پندرہ منٹ کے بعد وہ اپنے منیجر کے ساتھ باہر آیا اور کار میں بیٹھ کر چلا گیا۔ بعد میں میں نے کاونٹر پہ جا کر معلوم کیا کہ یہ جو کار میں آیا تھا کون ہے۔

آپ کون ہوتے ہیں پوچھنے والے اس نے فوراً یہ کہہ دیا۔ کیونکہ وہ دیہاتی لباس میں ملبوس تھا۔ نور الہٰی کہنے لگے میں نے اسے بتایا کہ ہمارا بھی ایسا ہی نوجوان رشتہ دار ہو بہو شکل کا ہے۔ بمبئی میں رہتا تھا اس کا نام سیٹھ سرور حسین تھا۔

یہ ہمارا سیٹھ ہے سیٹھ برکت حسین بابا۔ کاؤنٹر مین کہنے لگا۔

میرے تایا نور الہٰی بھی سنے وہ ایک آدمیوں کو راولپنڈی

جھجا تو پتہ چلا کہ وہ لاہور منتقل ہو گئے ہیں کبھی کبھار راولپنڈی آتے ہیں عرصہ دو سال اس بات کو گزر گیا۔ کیونکہ تلاش کیلئے تنگ آ کر جستجو چھوڑ دی گئی۔ کام کاج کی مصروفیتوں میں انسان جب کھو جاتا ہے تو اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے۔

ہمارے گاؤں کے پاس ہی جرنیلی سڑک گذرتی ہے۔ جو پنڈی سے جہلم لاہور کی طرف جاتی ہے۔ جہاں دن رات ٹریفک کی آمد و رفت شروع رہتی ہے۔ اب تو ہمارے گاؤں میں فلمی دنیا والے اپنی فلم میں ایک دو شاٹ ضرور فلمبند کر لیتے ہیں فلم آپ کی خاطر میں تین چوتھائی سین ہمارے گاؤں کے پاس کے مناظر پر مشتمل ہے۔ ابھی ابھی لاہور ٹیلی ویژن نے ایک ڈرامہ نشیمن فلمبند کیا تھا۔ وہ سارے کا سارا ہمارے گاؤں کی ہی عکاسی کی گئی ہے۔ مسجد نورانی قبرستان بجلی کے کھمبے گاؤں کی پولی گاؤں کا ہی کہانی تھی اس لئے اب ہمارے گاؤں کی پہچان آسانی سے ہو جاتی ہے۔ یہ لب سڑک مشہور گاؤں ہے۔

۱۹۶۱ء کو ہمارے گاؤں کے ایک بزرگ محمد خاں مرحوم جن کو ہم بھاجی کہہ کر پکارتے تھے اپنی زمینوں پر جو لب سڑک پڑاکہ کے نام سے اونچی ٹیکری پر ہے۔ وہاں اپنے مال مویشی چرا رہے تھے کہ گاؤں کی طرف جانے والے راستے کے پاس ایک گہرے رنگ کی کار آ کر رکی ایک لمبا تڑنگا خوبرو جوان اپنی بیگم اور دو بچوں کے ساتھ نیچے اترا بچے تو کار کے پاس کھڑے رہے مگر نوجوان اور اس کی بیگم چلتے چلتے پولی طرف ہاتھ کے اشاروں سے گاؤں کی طرف اشارے کرتے جا رہے تھے۔ پھر سکول کی طرف اشارہ کر کے واپس آئے اور کار پر بیٹھ کر لاہور کی طرف روانہ ہو گئے۔

چونکہ محمد خاں ہمارے پڑوسی تھے انہوں نے شام کو آ کر والدین کو بتایا کہ ضرور سیٹھ سرور حسین ہی ہو گا۔ وہ ویسا ہی لگتا تھا۔

۱۹۶۲ء کو شام پانچ بجے ایک شخص عوامی لباس میں ملبوس سر پہ بڑا سا رومال ڈالے منہ کو چھپائے گاؤں میں آیا اور سیدھا ہماری حویلی بنام جبشی راجپوت کے دروازے کو کھٹکھٹایا میری

بیگم صاحب نے دروازہ کھول پوچھا کون ۔ نو وارد آدمی کہنے لگا میں کراچی سے سرور حسین کے پاس سے آیا ہوں ۔ اسے فوراً بیٹھک میں بٹھایا گیا ۔ بیگم چچی ساس سوچ میں پڑ گئیں ۔ کیونکہ میرے چھوٹے بھائی کا نام بھی سرور حسین ہے ۔

وہ بھی اس وقت میرے پاس کراچی میں [illegible] بانداد بھائی کرامت حسین بھی کراچی میں مقیم تھے ۔ انہوں نے سمجھا شاید میرا دوست ہوگا ۔

وہ جلدی نماز پڑھنے چلا گیا ۔ پھر آیا تو کھانے کا وقت ہوگیا تھا ۔ کھانا کھا کر مغرب کی نماز پڑھنے مسجد نورانی میں چلا گیا ۔ واپس آیا تو میرے والد صاحب ہیبت خان بھی گھر آ چکے تھے ۔ ان سے علیک سلیک ہوئی ۔ ان کو اس نے کہا ۔

چچا کیا حال ہے ۔ والد صاحب سے کہنے لگا ۔ چچا میں سرور حسین کا دوست ہوں ۔ اس نے مجھے بھیجا ہے کہ گھر بار کی خبر لے آ ۔ باتیں بھی کرتا جاتا تھا ۔ اس نے مجھے بھیجا ہے کہ گھر باہر کے آ کر حالات بتانا ۔ اس نے گھونگھٹ نکالا ہوا تھا کہ مجھے کوئی پہچان نہ لے ۔ مگر بار بار بیٹھک کا جائزہ لیتا اور سرور حسین سیٹھ کی تصویروں سامان کے بارے میں پوچھتا جاتا تھا ۔ پھر کہنے لگا ۔ سرور حسین نے کہا تھا شہد اور گھی بھی لیتے آنا ۔

پھر کہنے لگا بڑے چچا کہاں ہیں ۔ میری کزن کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا ۔ یہ تو بہت چھوٹی سی تھی ۔ میری چچی ساس کہنے لگی اس کے والد فقیر تو پہلے ہی تھے ۔ مگر بھتیجے کی جدائی میں اور زیادہ باہر مقدس مزارات پر نفل گزارتے منتیں مانتے اور چلے کاٹتے ہیں کہ سرور حسین ایک بار اور دوبارہ مل جائے ۔

پھر کہنے لگا ۔ سرور حسین کے فوٹو کہاں ہیں ۔ بیٹھک خالی پڑی ہے ۔ بہت سا سامان تھا ۔ میری چچی ساس کہنے لگی بیٹے اگر ....

سرور حسین خود آ جائے تو پھر اسے اس کے بنائے ہوئے مکانوں کی بربادی اور سامان کے واقعات بتائیں ۔

رات کافی دیر بیٹھنے کے بعد سب سو گئے والد صاحب بیٹھک کی حویلی میں دوسری چارپائی پر اس کے پاس سو گئے مگر وہ سحری کی اذان کے وقت اٹھا اور اٹھ کر چلا گیا ۔

والد صاحب نے کافی ناشتہ پر انتظار کیا کہ شاید رفع حاجت کو گیا ہوگا ۔ مگر سورج نکلنے کے بعد گھر والوں کو تشویش ہوئی ۔ تب چچی نے میرے والد صاحب کو کہا

یہ بہلا پھسلا راجنبی ، اصل میں خود سیٹھ سرور حسین ہی تھا جو اپنے گھر کے حالات اور اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے مکانات کی حالت زار دیکھنے آیا تھا ۔ میرے والد صاحب اس بات کو نہ مانتے تھے ۔

چچی ساس کہنے لگی جتنی گھریلو باتیں اس نے کی ہیں ۔ اجنبی کو کیا پتہ ہو سکتا ہے یہ ضرور گھڑیوں کی دکان کرنے والا سیٹھ برکت حسین اور سڑک پہ کار سے اتر کر بات کرنے والا بیگم کو اشارے سے بتانے والا سرور حسین ہی ہے ۔ جو گھر کے حالات معلوم کرنے اجنبی بن کر آیا تھا ۔

میرے تایا زاد بھائی بوستان خان جو کہ آرمی سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اپنے سسرال سرگودھا کے چک ۹۹ میں رہائش پذیر ہو گئے اور اپنے سسر مرحوم کی اراضی کو کاشت بنانے لگے ۔ اکثر فصل کی کٹائی کے بعد گھر میں بے کار ہو جاتے تو شہر کا رخ کرتے اور جو بھی مزدوری ان کو ملتی اور پیر کا خرچہ تیل تمباکو نمک مرچ صابن وغیرہ کا نکال لیتے تھے ۔

سرگودھا ائیر فورس کے سیکٹر کے علاقے میں فضائیہ کے آفیسروں کے چھوٹے چھوٹے بنگلے نما مکانات تیار ہو رہے تھے ۔ بھائی بوستان خان نے راج گیری کا کام شروع کر لیا ۔ اچھے بھلے مستری بن گئے تھے ۔ کیونکہ ملٹری میں بھی کام کیا کرتے تھے ۔ اب ان کی زبانی بھائی سیٹھ سرور حسین کے بارے میں معلومات سنئے ۔

یہ ۱۹۷۳ء کی بات ہے وہ فضائیہ کی حدود میں تعمیرات کا کام کر رہے تھے ۔ ایک پائلٹ آفیسر جو اس وقت زیر تربیت تھا اس کے بنگلے میں رنگ و روغن پلاسٹر کا کام بھائی بوستان کر رہا تھا ۔ بڑی نفاست سے کمروں پہ پلاسٹر کر رہے تھے ۔ پلاسٹر سوکھنے کے بعد ڈسٹمپر روغن رنگ کرنے لگے ۔ کمرے روشن ہوتے جا رہے تھے ۔

کمرے جو رنگ و روغن ہوتے جا رہے تھے ۔ ان کو گھر کی مالکن سجاوٹ کرتی جاتی تھی ۔ ایک کمرے کو پار کر کے ڈرائنگ روم میں بھائی بوستان گیا ۔ وہاں سے اسے دالان کے باہر

جناب عرفان واحد

مصلحت یا پیچھے کی طرف کا پلاسٹر کرتا تھا۔ تو ڈرائنگ روم میں سیٹھ سرور حسین کے بچپن کے زمانے کے فوٹو دیواروں پر آویزاں تھے۔

بوستان خان کی جیسے ہی نگاہ پڑی وہ رک گئے اور پاس جا کر غور کر پہچاننے کی کوشش کی اور پہلی ہی نظر میں اپنے تایا زاد بھائی سیٹھ سرور حسین کو پہچان لیا۔

دوسرے دن کوٹھی کا مالک اور پائلٹ بیٹا دونوں کمروں کے معائنے کرتے کرتے پلاسٹر میں اور رنگ روغن کرنے والے کی تعریف کرتے کرتے باہر آئے بوستان خان نے آنکھیں نیچی کر لیں۔ انہوں نے پہچان لیا۔ یا تھا تایا۔ پلاسٹر کی تعریف کی لڑکا تو باہر چلا گیا۔ تب دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے سے برادری کے حالات معلوم کئے پھر کھانا بھی ایک ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ پھر بازار کا بہانہ بنا کر دونوں باہر آئے سامنے میں برادری کے سب افراد کی فرداً فرداً انہوں نے خیریت معلوم کی۔ پھر بوستان خان کو قسم دی کہ میرے متعلق کسی شخص کو نہ بتانا کہ میں پاکستان میں موجود ہوں۔ ویسے تم آتے جاتے رہا کرنا بہر حال وہ لاہور چلے گئے۔

اتفاقاً چچا دریا ہی بھٹی کا ۹ محرم الحرام ۱۹۷۳ء کو انتقال ہو گیا۔ ان کی فوتگی پر ہم سب چالیسواں کی رسم منانے گاؤں پہنچے تو بوستان خان بھٹی بھی آ گئے۔ بھائی کرامت حسین جو کراچی میں یونائیٹڈ بینک ہیڈ آفس میں ملازم ہیں اپنی والدہ اور میری دونوں ہمشیرگان کو بھی ساتھ لائے۔ وہاں مسٹر بوستان خان بھٹی نے سیٹھ سرور حسین کے بارے میں سب حالات من و عن سنائے تھے۔

ان کی ماں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کراچی جاتے ہوئے راستے میں فیصل آباد اپنے رشتہ داروں کے پاس رکی۔ وہاں سے سرگودھا بھتیجا بوستان خان بھٹی کو ساتھ لیا۔ سیٹھ سرور حسین بیٹے سے ملنے ان کی کوٹھی پر پہنچیں۔ بوستان خان نے دور سے ہی دروازہ بتا دیا تھا۔ خود سڑک کے کنارے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔

ماں نے بچھڑے بیٹے کے دروازے پر دستک دی ایک بوڑھی عورت باہر آئی۔ اسے کہا کہ

یہ میرے بیٹے سرور حسین کی کوٹھی ہے اس نے لاعلمی ظاہر کی ماں بضد ہوئی تو نوکرانی اپنی مالکن کو بلا لائی۔ ماں نے اپنی بہو کو دیکھا تو گلے ملنے کی کوشش کی مالکن نے کہا یہ کوئی پاگل مائی نظر آتی ہے یہاں کوئی سرور حسین نہیں مائی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

بیٹے کے دروازے سے ٹھکرائے جانے کے بعد بیٹے کے دیدار کی حسرت دل میں لئے ماں واپس کراچی چلی آئی۔

یہاں مجھے یہ بات کھٹکنے لگتی ہے کہ یا تو بھائی سیٹھ سرور حسین کسی مصلحت کی وجہ سے اپنے آپ کو چھپا رہے ہیں یا ان کے خیال میں یہ بات ہو گی کہ میرا خاندان نہ جانے کس حال میں ہو گا۔ میری بیوی بچے شاید ان کی زبوں حالی پسند نہ کریں۔ میری عزت میں فرق آ جائے۔

میرے بھائی سیٹھ سرور حسین صاحب میں آپ سے استدعا کرتا ہوں آپ جس حال میں بھی ہوں جس نام سے بھی پہچانے جاتے ہوں آپ ......

آپ اپنے خون سے خوفزدہ نہ ہوں۔ آپ کا خون بھٹی راجپوتی خون ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ کرامت حسین بینک ملازم ہیں کراچی میں اپنی کوٹھی بنا رکھی ہے۔

ہم نے سنا ہے کہ آپ کا بڑا لڑکا ظفر اقبال پاک ائیر فورس میں پائلٹ ہے۔ اگر آپ کا لڑکا کراچی آئے تو ہم سے ضرور ملاقات کرے انشاء اللہ بچے کو خوش ہی کریں گے۔

ایک بات اور عرض طلب ہے کہ ..... آپ کی والدہ محترمہ آپ کی جدائی کا روگ ساتھ لئے ملک عدم کو سدھار بیٹھی ہیں۔ شاید اب روز محشر ہی ماں بیٹے کی ملاقات میدان حشر میں ہو۔

اگر آپ کے دل میں کچھ کھٹک باقی ہو تو ضرور اپنے بھائیوں سے ملیں۔ اگر آپ کا صاحبزادہ یہ کہانی پڑھے تو ضرور اپنے باپ سے اجازت نامہ لے کر اپنے ددھیال کی خبر لے اور آ کر ددھیال کے رہن سہن کا مشاہدہ کرے۔

....

میں قارئین کرام سے التماس کرتا ہوں کہ اگر کسی شخص کے قریبی تعلقات میرے برادر سیٹھ سرور حسین سے ہوں۔ تو وہ ضرور ان کو یہ کہانی پڑھ کر سنائیں۔ تاکہ وہ اپنے خاندان سے ملاقات کر سکے۔ آپ کو ثواب دارین ہو گا۔ ....

* * * * *

تحریر۔ میاں منیر احمد شاہین

محترم بھیا شہزادہ عالمگیر صاحب!

آداب... یوں تو اس پیارے جریدے جواب عرض کا پرانا پرستار ہوں... لیکن آج پہلی مرتبہ ایک چھوٹی سی حقیقت لے کر جواب عرض کی اس پسندیدہ بزم میں شریک ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ میری اس ٹوٹی پھوٹی پہلی کاوش کی خامیوں کی اصلاح فرماتے ہوئے میری حوصلہ افزائی فرمائیں گے.... اور اسے جواب عرض کی کسی قریب ترین اشاعت میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں گے...

بھیا! زیر نظر کہانی... "قسمت کے کھیل نرالے" مجھے میرے ایک عزیز ترین دوست، جسے میں اپنا بھائی بھی سمجھتا ہوں، قیصر محمود نے سنائی تھی۔ عدنان ان کا قریبی ہمسایہ تھا۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا بھی تھا۔ اسی لیے قیصر محمود کو ان کے گھریلو حالات کا بھی علم تھا... وہی واقعات ترتیب سے لکھ کر آپ کی خدمت میں اشاعت کے لیے پیش ہیں...

یہاں پر تھوڑا سا ذکر کہانی کے کرداروں کے متعلق بھی کرتا چلوں۔ تو بہتر رہے گا۔ عدنان اور نبیلا اب بھی زندہ ہیں اور خوشگوار ازدواجی زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن عاصمہ اپنا ماضی نہیں بھول سکی... عدنان کی چچی اب دربدر کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ وہ شاید اپنے کیے کی سزا بھگت رہی ہے۔ جواب عرض کی عین پالیسی کے مطابق میں نے کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کر دیئے ہیں۔ میں قارئین کی ہر طرح کی رائے کا خلوص دل سے استقبال کروں گا...

آخر میں جواب عرض کی مزید ترقی کے لیے دن رات دعا گو ہوں...

والسلام... آپ کا بھائی!

میاں منیر احمد شاہین معرفت زاہد مصطفےٰ خان
زاہد ٹریڈرز اسٹیڈیم ہوٹل بستی یزمان روڈ۔ بہاولپور۔

*

ہ ماضی کی بیتی یادوں کو اب چھیڑ دیا ان یادوں نے
یوں مچائے دل کے ہنگامے کہ چیخ اٹھی تنہائی بھی

آج میں اپنے ماضی کو یاد کرتا ہوں تو سینے میں ایک درد سا ہونے لگتا ہے کہ اے کاش!.. گزرا ہوا ماضی پھر سے لوٹ آئے جب ہم خوشیوں سے کھیلا کرتے تھے۔ جب چاروں طرف بہاریں ہی بہاریں تھیں۔ ہم سب گھر والے خوش و خرم دلکش زندگی گزار رہے تھے۔ ہمارا گھر جنت کا ایک ٹکڑا محسوس ہوتا تھا غم کا نام تو ضرور سنا تھا لیکن غم دیکھنے کو بھی نہ ملے تھے۔ گلبرگ جیسے ماڈرن اور خوب صورت علاقے میں ایک عالی شان کوٹھی تھی جہاں ہم رہائش پذیر تھے۔ ابو جان کی سرکاری ملازمت تھی اور وہ بہت اچھے عہدے پر فائز تھے۔ میں ان دنوں بی ایس سی میں پڑھ رہا تھا۔ اور میری چھوٹی بہن شازیہ فرسٹ ایئر میں تھی۔ میری منگنی اپنے چچا فاروق کی بڑی بیٹی عاصمہ سے طے پا چکی تھی۔ عاصمہ میرے ساتھ کالج میں ہی پڑھتی تھی۔ ہم روزانہ اکٹھے ہی کالج جاتے اور ایک ساتھ واپس آتے۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ایک پل کے لیے بھی ایک دوسرے کی جدائی برداشت نہ کر پاتے تھے اور جدا ہوتے بھی تو ایک دوسرے کو ڈھونڈ ہی نکالتے۔ ہمارے سامنے والی کوٹھی ہی چچا فاروق کی تھی۔ وہ اپنا ذاتی کاروبار کرتے تھے اور خاصے مالدار آدمی تھے۔ عاصمہ کے چھوٹے بھائی طارق کی منگنی میری بہن شازیہ سے ہو گئی

یہ منگنی فارق کی اپنی مرضی سے ہوئی تھی۔ وہ شازیہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ یہ باتیں مجھے آسیہ نے بتائی تھیں کہ فارق بھائی نے امی جان سے کہا تھا کہ میں شازیہ کے علاوہ کسی دوسری لڑکی کا تصور بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ شازیہ بھی خوش تھی شاید وہ بھی فارق کو پسند کرتی تھی ہم دونوں بہن بھائی کے رشتے چچا کے گھر ہو گئے۔ امی جان ان رشتوں پہ خوش نہیں کہ چلو اچھا ہوا کہ دو بھائی آپس میں رل بیٹھے ہیں۔

میں نے اور عاصمہ نے بی۔ایس۔سی اچھے نمبروں میں پاس کی۔ اور دوبارہ داخلہ اکٹھے ہی لے لیا۔ ہم نے عہد کیا کہ ایم ایس سی ضرور کریں گے۔ اور ایم ایس سی کرنے کے بعد ہم شادی کریں گے۔ میں نے امی جان کو بھی بتا دیا کہ میں ایم ایس سی کرنے کے بعد شادی کروں گا۔ اس طرح ہم اپنی پڑھائی کی منزلیں طے کرتے رہے۔ اور خوشی خوشی پیار کی منزل کی طرف بڑھتے رہے...

عاصمہ مجھے اپنی گاڑی لے جاتی... کیونکہ ابو جان کے پاس جو گاڑی تھی اسے وہ اپنے استعمال میں رکھتے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے سواری کی سخت مشکل ہے تو میرے اصرار پر انہوں نے مجھے بھی نئی ڈاٹسن خرید دی۔ اب میں عاصمہ کو اپنے ساتھ لے جاتا۔ پہلے پہل تو وہ میری گاڑی میں نہ بیٹھتی۔ لیکن میں نے عاصمہ سے کہا کہ کیا تم مجھے اپنا نہیں سمجھتی..

نہیں جاوید.. ! ایسی تو کوئی بات نہیں؟ اس طرح وہ میرے ہمراہ جانے لگی۔ ایک دن میں کالج سے جلدی واپس آ گیا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ عاصمہ کی طبیعت خراب تھی۔ وہ کالج بھی نہیں آئی۔ میں اس کے لیے بہت زیادہ پریشان تھا۔ مجھ سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں شام کو ان کے گھر گیا۔

آداب چچی جان.. ! میں نے سلام کیا۔

آؤ بیٹا جاوید.. تم ہمارے گھر بہت کم آتے ہو کیا وجہ ہے کوئی ناراضگی ہے..

نہیں چچی.. ! اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ عاصمہ کی طبیعت کیسی ہے آج تو وہ کالج بھی نہیں آئی۔ اب اس کا کیا حال ہے۔

اب تو ٹھیک ہے بیٹا.. ! اپنے کمرہ میں ہے جاؤ جا کر دیکھ لو...

میں عاصمہ کے کمرے تک آیا۔

ہیلو جاوید.. ! تم آج کیسے یہاں کا رستہ بھول گئے؟...

جناب کو دیکھنے آیا تھا۔ سنا ہے شہزادی صاحبہ کی طبیعت ناساز تھی۔ سنے...

ہاں جاوید.. ! میری طبیعت خراب تھی لیکن اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔ تم اپنا حال سناؤ کیسے ہو...

میرا حال تمہارے بغیر بہت برا ہے عاصمہ... تمہارے بغیر تو کالج بھی ویران ویران سا لگتا ہے۔ بس پہلا پیریڈ اٹینڈ کیا اور بھاگ آیا... اچھا طبیعت کچھ ٹھیک ہوتی ہے تو آج چلو تھوڑا گھوم پھر آئیں۔

ہاں چلو.. میں بھی صبح سے بور ہو رہی تھی

لیکن کہاں چلیں عاصمہ.. ؟

جہاں تم لے چلو.. ہم تو سرکار کے پیچھے ہیں...

شاباش بڑی فرمانبردار ہو۔ اچھا ہے ابھی سے حکم ماننے کی عادت پڑ جائے ورنہ مار ہی کھاؤ گی۔

میں مار کھاؤں گی... اپنی شکل دیکھی ہے.. آئے ہیں مجھے مارنے والے...

ہم سیر پر روانہ ہو گئے۔ گاڑی میں نے جناح گارڈن کی طرف موڑ دی۔

یہی جگہ تمہیں پسند آئی ہے سیر کرنے کے لیے.. عاصمہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

کیوں عاصمہ.. ! یہ جگہ بور ہے ؟ اتنی خوبصورت جگہ بھی تمہیں پسند نہیں آئی۔ ہم یہاں بیٹھ کر چند باتیں کریں گے۔

ہم دونوں سبز گھاس پہ بیٹھ گئے۔

ہاں.. اب بتاؤ وہ کون سی باتیں ہیں... عاصمہ نے پوچھا۔

ارے بابا تھوڑا صبر سے کام لو ابھی بتاتا ہوں۔ ذرا سستا تو لینے دو...

لو سستا لیا.. اب جلدی سے بتاؤ... عاصمہ نے چند لمحوں کے بعد پھر پوچھا۔

بات یہ ہے عاصمہ.. کہ اب میں نے ایم ایس سی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے...

کیوں.. ؟ عاصمہ نے حیرانی سے پوچھا۔

اس لیے کہ میں باہر جا رہا ہوں... میں نے جلدی سے کہا۔
جاوید...! یہ تم کیا کہہ رہے ہو... یہ جھوٹ ہے...
بتاؤ تمہارا ارادہ کیسے بدل گیا ہے.. اور مجھے چھوڑ کر
باہر جانے کا خیال کیوں آیا..؟ اس نے ایک ہی دفعہ کئی
سوال کر ڈالے۔
ڈیئر عاصمہ..! تم تو کہتی تھی کہ ایم ایس سی کر لوں گی
پھر شادی..!
لیکن جاوید تم بھی تو یہی کہتے تھے... عاصمہ نے سسکتے
ہوئے یہ الفاظ کہے۔
عاصمہ..! میں نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا ہے.. میں کچھ
عرصہ باہر رہوں گا اور اتنی دیر میں تم ایم ایس سی کر لینا۔
اور عاصمہ نے رونا شروع کر دیا۔
نہیں جاوید..! میں تمہارے بغیر ایک منٹ بھی نہیں رہ
سکتی... عاصمہ نے کرب آمیز لہجے میں کہا۔
تو پھر کرو شادی.. میں باہر نہیں جاؤں گا... یہ کہہ کر
میں ہنسنے لگا۔ عاصمہ کا سر شرم سے جھک گیا۔ لیکن وہ بہت
پریشان تھی... میں نے اس سے کہا کہ میں تو تم سے مذاق کر
رہا تھا... اور تم سچ مان گئیں۔
بہت شریر ہو گئے ہو.. یہ کہتے ہوئے اس نے مسکرا کر
کہا.. ڈیئر جاوید..! میں تو تمہاری خاطر جان دے سکتی
ہوں لیکن تم مجھے اپنے سے جدا مت کرنا ورنہ میں... اس
سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی... میں نے روک لیا۔ لیکن پھر اس
نے بولنا شروع کیا.. جاوید تمہارے مذاق نے تو مجھے ڈرا
ہی دیا تھا... اچھا اب چلو گھر چلیں امی ابو انتظار کر
رہے ہوں گے...
ٹھہرو ایک ایک کوک پی لیں پھر چلتے ہیں... جب ہم
گھر پہنچے تو عاصمہ اتر کر جانے لگی لیکن میں گاڑی میں بیٹھا رہا۔
تم گھر نہیں چلو گے... عاصمہ نے کہا۔
سوری.. بہت دیر ہو گئی ہے میں ایک گھنٹے کا کہہ
کر آیا تھا۔ میری بہن میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ لیکن آج
کا کھانا تمہیں میرے ساتھ کھانا پڑے گا... آخر مجھے ہار ماننا
پڑی... اچھا جناب جیسے کہو گی ویسے ہی کر لیں گے۔ عاصمہ
ہنسے بغیر نہ رہ سکی۔ ہم گھر میں داخل نہ ہوتے۔

سامنے چچا جان بیٹھے تھے دیکھ کر کہنے لگے۔ آؤ جاوید
بیٹے..! کبھی کبھی نظر آتے ہو.. کیسے ہو تم.. کہیں ابو کے
ساتھ تم نے بھی بزنس تو نہیں شروع کر دیا۔
نہیں چچا جان..! ایسا نہیں ہے... عاصمہ بولی.. ابا جان
جاوید تو اب بھی مجھے چھوڑ کر باہر جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔
زبردستی ان کو گھر لے آئی ہوں۔ نہیں تو یہ بھاگ جاتے۔
نہیں چچا جان..! یہ جھوٹ بولتی ہے۔ میں خود یہاں آیا ہوں..
ابا جان سے پوچھ لیں کہ میں نے کہا تھا عاصمہ خود جھوٹ بولتی ہے
ہی... اچھا بھائی تو معاف.. عاصمہ نے مسکراتے ہوئے آواز
دی۔ بھائی جان آج آپ میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھائیں گے...
اچھا تو آج تم کھانا پکا رہی ہو۔ اس کا مطلب ہوا کہ آج کھانے
سے پرہیز کرنا چاہیے۔
ہوں.. کہ تم کھانا اچھی طرح سے تیار نہیں کر سکتی۔ تم تو صرف
چائے ہی بہتر بنا سکتی ہو۔
نہیں جاوید بھائی..! آپ کھانا کھا کر تو دیکھیں خود پتہ
چل جائے گا کہ میں اچھا کھانا پکا سکتی ہوں یا عاصمہ آپی...
کیوں عاصمہ... کھانا ٹھیک نہیں پکا سکتی.. میں نے کہا۔
یہ تو ہر وقت بکواس کرتی رہتی ہے۔ عاصمہ نے جواب دیا..
تم اس کی باتوں میں نہ آؤ... ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کرتے
رہے... تھوڑی دیر بعد آسیہ آئی...
حضرات کھانا تیار ہے... فوراً ہاتھ دھو لیے جائیں۔ اور
میز پر حاضر ہوں... اچھا بھئی چلو پہلے کھانا کھا لیں عاصمہ نے
کہا۔ چلو میں تیار ہوں۔
کھانا کھانے کے بعد میں نے چچا اور چچی سے اجازت مانگی۔
اور عاصمہ سے کہا کہ صبح وقت پر تیار رہے کہ کالج کو دیر نہ
ہو۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا...
گھر پہنچا تو امی ابو اور شازیہ میرا انتظار کر رہے تھے۔
اتنی دیر لگا دی بیٹا تم نے...
ہاں امی جان دراصل چچا جان نے مجھے کھانے کے لیے روک
لیا تھا۔ آپ نے تو کھانا کھا لیا۔ ہاں میں نے اور تمہاری امی
نے کھا لیا کیونکہ ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ اور شازیہ نے
تمہارے انتظار میں نہیں کھایا...
اوہو..! میری اچھی بہن مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میں نے

انکار کر دیا۔ اور تم نے ابھی تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ بس بھیا! میں آپ سے نہیں بولتی۔ بھوک سے مری جا رہی ہوں۔ اور آپ کو احساس تک نہیں ہے۔

ارے ارے تم تو مجھ سے ناراض ہو گئی ہو۔ اچھا بابا تم سے معافی چاہتا ہوں اب تو کھانا کھا لو۔ میری اچھی بہن۔۔۔ آئندہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔۔۔ نہیں کھانی اب مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔ کیا ابھی تک تم مجھ سے ناراض ہو۔۔۔ نہیں مجھے کیا حق ہے کہ میں ناراض ہوؤں۔۔۔ جب تمہاری شادی ہو جائے گی تب بھی تم میرا انتظار کرو گی۔۔؟ تب تو تم مجھے بھول جاؤ گی۔ اور طارق کا انتظار کیا کرو گی۔۔۔ کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں میں۔ شازیہ شرما کر اٹھی اور یہ کہتے ہوئے کمرے سے چلی گئی کہ بھیا آپ بھی کیسے چھیڑنے لگے۔ میں سوچنے لگا کہ میری بہن کو مجھ سے کتنا پیار ہے۔ کیا ہر بہن کو اپنے بھائی سے پیار ہوتا ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا۔۔ کہ شازیہ چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔ میں نے مذاقاً اس سے کہا کہ تم سے کس نے کہا کہ چائے لے آؤ۔

بھیا۔۔! مجھے کسی نے نہیں کہا میں خود ہی چائے لے کر آئی ہوں۔۔۔ میں نہیں پینا چائے۔۔۔ میرے کمرے سے چلی جاؤ۔ میں ذرا غصہ ہوا تو وہ گھبرا گئی۔ چہرہ لال سرخ ہو گیا اس بیچاری کا۔ چلی جاتی ہوں بھیا۔۔! ایک تو آپ کے کام کروں۔ اوپر سے آپ باتیں بناتے ہیں۔ میں نہیں کروں گی آئندہ آپ کا کوئی کام۔۔۔ وہ روتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد میں شازیہ کے کمرے میں گیا وہ وہاں نہیں تھی۔ میں نے سارے گھر میں تلاش کیا۔ آوازیں دیں مگر کوئی پتہ نہ چلا۔۔۔ میری آواز سن کر امی جلدی آئیں کیا بات ہے بیٹا دید۔۔! کیوں شور مچا رکھا ہے۔

امی جان۔۔! شازیہ کہاں ہے۔۔؟

بیٹا۔۔! وہ یہاں ہی کہیں ہوگی۔۔۔

میں بات کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا کہ کہیں امی پریشان نہ ہو جائیں۔ میں لان میں دیکھنے گیا۔ وہاں شازیہ بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ آنکھیں لال سرخ ہو گئی تھیں۔۔۔ شازیہ یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ ابھی سوئی نہیں اس نے ابھی روتی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ بیچاری کا رو رو کر برا حال ہو گیا تھا۔۔۔ بس میں نہیں سوئی۔ آپ کو کیا۔ آپ جائیں آرام کریں۔ جب مجھے نیند آئے گی۔ میں سو جاؤں گی۔ میں نے آگے بڑھ کر پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

دیکھو شازیہ۔۔! میری طرف دیکھو میری اچھی بہن۔۔ میں تو تم سے مذاق کر رہا تھا۔ اور تم بیچاری رونے بیٹھ گئی۔ بہرحال میں تم سے شرمندہ ہوں۔ چلو اٹھو برا مت مانو۔ میں کس بات کا برا مانوں گی۔ پلیز آپ چلے جائیں۔۔۔ وہ اور زیادہ رونے لگی۔ میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور پیار سے اسے ہلکی سی چپت لگائی۔

شازیہ۔۔! مجھے تمہاری قسم، میں تم سے محض مذاق کر رہا تھا۔۔۔ تم کو ستانے کے موڈ میں تھا۔ اور تم ہو کہ سیریس ہوتی جا رہی ہو۔

بھائی جان۔۔! آپ ایسا مذاق نہ کیا کریں میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی دن یہ نہ ہو کہ آپ مذاق کے موڈ میں ہوں اور میرا ہارٹ فیل ہو جائے۔

پگلی کہیں کی۔۔۔ تم تو میری بہت اچھی بہن ہو۔ بھلا کوئی بھائی اپنی بہن سے بھی ناراض ہو سکتا ہے۔ چلو اٹھو اور ہاتھ منہ دھو لو۔۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔

بھیا۔۔! میں کب آپ سے ناراض ہوئی تھی چلتی ہوں شازیہ نے کہا۔

اچھا شازیہ۔۔! تمہیں طارق کی قسم ہے ایک کپ چائے پلا دو۔ وہ شرماتی ہوئی بھاگ گئی۔

وقت بڑے خوبصورت انداز میں گزرتا رہا۔۔ لیکن میں نے نوٹ کیا کہ ابا جان کچھ پریشان سے رہنے لگے ہیں۔۔۔ ایک دن میں نے ان سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو بتانے لگے کہ بزنس میں بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ ابو جان آپ پریشان نہ ہوا کریں۔ نفع نقصان تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔۔۔

ابو خاموش ہو گئے وہ دن یوم بعد ابو نے مجھے بلا بھیجا۔ جی ابا جان۔۔! آپ نے مجھے یاد فرمایا۔ انہوں نے کہا بیٹا بیٹھ جاؤ۔۔۔ میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ تو کہنے لگے کہ بیٹا میں اپنی اور تمہاری گاڑیاں فروخت کر رہا ہوں۔ چونکہ بزنس ڈاؤن ہے۔ یہ پیسہ میں بزنس میں لگاؤں گا۔ پھر کچھ دنوں بعد تمہیں نئی گاڑی خرید دوں گا۔۔۔ یہ سنتے ہی جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ میں چپ

جواب عرض لاہور

بیٹھا رہا۔ انہوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا۔ میں نے کہا کہ اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہے۔ آپ بے شک گاڑیاں فروخت کر دیں

بیٹا میں سوچ رہا تھا کہ کہیں تم انکار نہ کر دو۔۔۔ ابو جان نے پیار سے کہا۔

نہیں ابو جان۔۔! ایسی گستاخی میں نہیں کر سکتا۔۔۔

جیتے رہو بیٹا۔۔! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب تم جا سکتے ہو۔۔ میں اپنے کمرے میں واپس چلا آیا۔ کافی دن بیت گئے۔ گاڑی فروخت ہو گئی۔۔۔

میں اب عاصمہ کے ہمراہ کالج جانے لگا۔ ایم ایس سی کے امتحان بھی سر پہ تھے۔ میں ان دنوں خوب محنت سے پڑھ رہا تھا۔ ایک رات میں ٹیوشن پڑھ کر آ رہا تھا۔ جب میں گھر آیا تو صحن میں کوئی نظر نہ آیا۔ امی جان کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے امی جان کی اونچی اونچی آواز سنائی دی۔

شوکت تم سنبھل جاؤ اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے ذلیل مت کرو۔ اور حالات سے سمجھوتہ کر لو (شوکت میرے ابو جان کا نام ہے) اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔۔۔ خدارا میری باتوں پر غور کرو۔

ابو جان بولے۔۔۔ میں جانتا ہوں کیا ٹھیک ہے کیا غلط ہے۔۔۔ تم اپنی فالتو باتوں کے ساتھ کمرے سے نکل جاؤ۔۔۔ میں گھبرا گیا۔ کیونکہ آج تک امی اور ابو کے درمیان اس طرح کی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ آج ابو جان کو کیا ہو گیا ہے۔۔۔ میں ڈرتے ڈرتے کمرے میں داخل ہو گیا۔۔۔

آداب امی جان۔۔ آداب ابو جان۔۔! میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

آؤ جاوید بیٹا۔۔ پڑھ آئے ہو۔۔؟

جی ابو۔۔۔ یہ امی جان کو کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہیں۔

کچھ نہیں بیٹا۔۔۔ ان کی کچھ طبیعت خراب ہے۔ اتنی دیر میں شازیہ کی آواز آئی

جاوید بھائی ادھر آئیں۔۔ میں کمرے سے باہر آ گیا۔

بھائی جان۔۔! امی اور ابو کی خوب لڑائی ہوئی ہے۔

کیوں کس بات پر۔۔۔ میں نے حیرانگی سے جذبات کے لہجے میں پوچھا۔

یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔۔ شازیہ نے کہا۔

اچھا امی جان سے میں خود پوچھ لیتا ہوں۔۔۔ بھائی جان آپ کھانا کس وقت کھائیں گے۔ تھوڑی دیر تک۔۔۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔۔۔ ابھی مجھے بھوک نہیں ہے۔ شازیہ چلی گئی۔۔ میں سوچنے لگا کہ پہلے تو کبھی اس طرح کا سلسلہ گھر میں نہیں چلا تھا یہ آج کیا بات ہو گئی ہے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ پچھلی کئی دنوں سے ابو بھی پریشان رہتے تھے۔ اس کی کیا وجہ ہو گی۔۔ ابو اکثر رات کو دیر سے آتے تھے ابھی میں انہیں خیالوں میں تھا کہ امی جان آ گئیں۔۔۔

جاوید بیٹے۔۔ تم نے کھانا کیوں نہیں کھایا۔۔؟

امی جان۔۔! مجھے بھوک ہی نہیں ہے۔۔۔ امی جان میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ تم کیا بات کرنا چاہتے ہو۔ پہلے چلو کھانا کھاؤ پھر بات کرنا چلو میرے ساتھ۔۔۔

میری بھوک اڑ گئی تھی لیکن امی جان کے اصرار پر میں نے تھوڑا سا کھانا کھایا۔۔۔

اچھا اب آرام سے سو جاؤ۔۔۔ تم نے صبح یونیورسٹی بھی جانا ہے۔۔۔ لیکن امی جان پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔۔۔ میں نے پھر کہا

کس سوال کا بیٹا۔۔؟ امی جان ابھی تو آپ نے کہا تھا کہ میں سمجھ گئی ہوں۔۔۔ اب کہتی ہیں کہ کون سا سوال۔۔

امی جان بولیں بیٹا۔۔! میں تو نہیں چاہتی تھی کہ تم کو بتاؤں لیکن تم بار بار پوچھ رہے ہو تو پھر غور سے سنو۔۔۔ ایک ماہ ہو گیا ہے تمہارے ابو کو غلط راستوں پر چلتے ہوئے۔ لیکن میں نے جب بھی ان کو سمجھانے کی کوشش کی وہ مجھ سے ناراض ہو جاتے ہیں۔۔۔

امی جان! ابو نے کون سے غلط راستے اختیار کر لیے ہیں۔ مجھے صاف صاف بتا دو۔

جاوید بیٹا۔۔! وہ کلب جاتے ہیں۔۔۔ وہاں جا کر شراب پیتے ہیں۔ اور جوا کھیلتے ہیں یہ گاڑیاں جو بیچی ہیں یہ سب جوئے میں ہار گئے ہیں۔

امی جان یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ابو جان پہلے تو ایسے نہیں تھے۔ جانے کیوں ایسا کرنے لگے ہیں۔

اچھا بیٹا..! اب تم آرام کرو بہت رات بیت چکی ہے۔
یہ کہہ کر امی جان چلی گئیں... میں نے فیصلہ کیا کہ صبح میں خود کلب جاؤں گا کہ ابو کیا کرتے ہیں... کیا واقعی ابو ان راستوں پر چل پڑے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں صبح اٹھا تو میری طبیعت کچھ خراب تھی۔ ہلکا ہلکا بخار معلوم ہو رہا تھا۔ عاصمہ حسب معمول مجھے لینے آئی۔

ہیلو جیدی! کیا آج تم نہیں جا رہے۔ ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئے۔

عاصمہ..! آج میں یونیورسٹی نہیں جا سکوں گا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے... تم جاؤ دیر ہو رہی ہے..

نہیں جاوید! تمہارے بغیر جانے کو میرا دل بھی نہیں چاہتا... میں تمہارے پاس ہی بیٹھی رہوں گی۔

عاصمہ باجی..! آپ آج یونیورسٹی نہیں گئیں... شازیہ نے پوچھا...

نہیں.. میں بھی آج نہیں جاؤں گی.. آپ تو بس ہر وقت تنگ ہی کرتی رہتی ہیں... بڑی بات ہے نا... میں جا رہی ہوں آپ اپنی باتیں جاری رکھیں۔

شریر بھائی کی شریر بہن ہے۔ عاصمہ بولی... ارے... ارے! میرا نام مت لو.. میں نے تمہیں کچھ نہیں کہا.. میں نے لقمہ دیا۔

عاصمہ باجی.. آپ کے لیے چائے بناؤں

کیوں نہیں بھائی یہ کوئی پوچھنے والی بات ہے... شازیہ چائے بنانے کے لیے چلی گئی تو میں نے عاصمہ سے کہا کوئی ایسی بات سناؤ جس سے میری طبیعت ٹھیک ہو جائے۔

کیا بات ہے جاوید..! اداس کیوں ہو..؟

کچھ نہیں عاصمہ میں اداس نہیں ہوں.. تمہارے پاس ہوتے ہوئے میں اداس کیسے ہو سکتا ہوں... میں نے چہرے کے تاثرات چھپاتے ہوئے کہا۔

جاوید..! کوئی بات ضرور ہے جو تم مجھ سے بھی چھپا رہے ہو... عاصمہ نے بضد ہوتے ہوئے کہا۔

نہیں جانم..! ایسی تو کوئی بات نہیں جو میں تم سے چھپاؤں... عاصمہ کے اصرار کے باوجود میں ٹال گیا۔

شازیہ چائے لے آئی.. ہم سب نے مل کر چائے پی اور پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد عاصمہ چلی گئی... میں شام کو تیار ہو کر کلب چلا گیا کہ دیکھ آؤں کہ واقعی بات درست ہے یا نہیں.. جب میں کلب پہنچا تو وہاں لوگوں کا بہت رش تھا کوئی شراب پی رہا تھا.. تو کوئی جوا کھیل رہا ہے.. کوئی ڈانس کر رہا ہے۔ ابو پر میری نظر پڑی تو وہ ایک میز پر بیٹھے لوگوں کے ہمراہ جوا کھیلنے میں مصروف تھے۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے ضرور شراب بھی پی ہو گی... اور واقعی انہوں نے شراب بھی پی رکھی تھی... کیوں کہ وہ جب دوسروں سے بات کرتے تو ان کی زبان لڑکھڑا جاتی تھی... میں ابو کو کلب میں دیکھ کر واپس آ گیا۔ لیکن گھر جانے کی بجائے ادھر ادھر گشت کرنے لگا۔ جب میں گھر واپس آیا تو اس وقت ابو جان گھر آ چکے تھے۔ گھر میں ایک طوفان برپا تھا۔ شاید لڑائی ہو رہی تھی۔ ابو جان نے مجھے دیکھتے ہی غصہ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

جاوید..! تم کلب کیوں آئے تھے۔ شاید ابو نے مجھے دیکھ لیا ہو۔ ابو.. میں آپ کو دیکھنے آیا تھا کہ کیا واقعی... ابھی میں اپنی بات بھی مکمل نہ کر پایا تھا کہ ایک زوردار تھپڑ کو اپنے گوا اپنا رخسار کی زینت بنتا دیکھا۔ جس سے میرا سر چکرا کر رہ گیا اس دن ابو جان نے میری خوب پٹائی کی۔ اور نہ سننے والے کلمات کہے۔ اس سے پہلے کبھی ابو میرے ساتھ ایسے نہ برہم ہوئے تھے۔

اسی دوران امی بولیں... ہوش میں تو ہیں آپ، پہلے کبھی بیٹے پر ہاتھ نہ اٹھایا، آج کیا آفت آن پڑی ہے کیوں اتنا مار رہے ہیں۔ اور گالیاں دیے جا رہے ہیں۔.

ابو جان گرجدار آواز میں بولے تم اپنی قینچی والی زبان بند رکھو... میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میں اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے جی میں جو کچھ آئے گا میں وہی کروں گا... دفعہ ہو جاؤ تم سب میرے کمرے سے.. جاوید تم بھی دفعہ ہو جاؤ

امی بولیں... بیٹا آ جاؤ۔ لگتا ہے کہ تمہارے ابو آج ضرورت سے زیادہ ہی پی گئے ہیں۔ ابھی ہم چلنے ہی لگے تھے کہ ایک دفعہ پھر زوردار تھپڑ پڑنے کی آواز آئی۔ یہ تھپڑ شازیہ کو لگا تھا.. جونہی ہم کمرے میں کھڑے ہمارے ماتھے

جواب عرض دا ہے

سن رہی تھی۔ تم بھی جاؤ سب دفعہ ہو جاؤ میرے کمرے میں سے .. بمشکل کہتے ہی شازیہ کی چیخ نکل گئی... اسے تھپڑ بڑی زور سے لگا تھا... نکل جاؤ حرام زادے میرے کمرے سے۔ مجھے تنہا چھوڑ دو ..

شازیہ رونے لگی .. امی جان سے برداشت نہ ... پھر وہ واپس آکر ابو کے کمرے میں چلی گئیں۔

شوکت ... میں کہتی ہوں ہوش میں آؤ۔ کتنے ظالم بن گئے ہو .. نشے نے تمہیں ظالم بنا دیا ہے .. تمہیں برباد کر دیا ہے ... اپنے معصوم بچوں کو مار رہے ہو۔ ابھی ہی ان پر مظالم ڈھا رہے ہو ... عقل سے کام لو .. اگر تم نہ مانے تو میں اور بچے یہاں سے چلے جائیں گے .. دفعہ ہو جاؤ .. مجھے تم لوگوں کی ضرورت نہیں .. ابو جان زور زور سے بول رہے تھے۔ سمجھو اپنا گھر ہم جا رہے ہیں۔ امی جان نے مجھے اور شازیہ کو ساتھ لیا۔ اور رات کے تقریباً بارہ بجے چچا فاروق کے گھر پہنچ گئے۔ آدھی رات گئے ہماری آمد پر چچا پریشان ہو گئے۔

کیا بات ہے بھابی ... اس وقت رات کو آپ تینوں آئے ہیں ... خیر تو ہے، شوکت بھائی تو ٹھیک ہیں۔

بجائے کچھ کہنے کے وہ اور شازیہ زور زور سے رونے لگی۔ چچا جان مزید گھبرا گئے۔ امی جان نے شازیہ کو خاموش رہنے کا کہا کہ سب گھر والے شور سے بیدار نہ ہو جائیں ... چچا جان نے امی جان سے پوچھا

بھابی آخر بات کیا ہے .. کیوں نہیں بتا رہیں ... شازیہ رو رہی ہے .. آپ دونوں علیحدہ پریشان ہیں۔ جاوید کا کیا حال ہوا ہے ...

ان کے اصرار پر امی جان نے ساری بات سے آگاہ کر دیا اتنی دیر میں چچی بھی کمرے میں داخل ہو چکی تھیں۔ تمام تفصیل سن کر چچی کہنے لگیں کہ یہ تو بھائی جان کی زیادتی ہے چچا جان نے کہا کہ بھابی آپ نے بھائی جان کو ایسی باتوں سے روکا کیوں نہ میں نے تو شوکت بھائی کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن میری باتوں کی پرواہ کیے بغیر وہ اپنے غلط کاموں میں مصروف رہے ہیں بلکہ مجھ سے ناراض ہو جاتے۔ اور لڑائی فساد کرنا شروع کر دیتے تھے۔ آخر صبر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اور آج میں آخر انہیں چھوڑنے پر مجبور ہو گئی

اچھا بھابی ... آپ ہمارے ساتھ رہیں یہ بھی آپ کا اپنا گھر ہے۔ میں خود ہی بھائی شوکت سے جا کر بات کر دوں گا۔ انہوں نے یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے۔ باتیں کرتے کرتے رات کے دو بج گئے۔ ہم سب کو اب نیند ستانے لگی تھی۔ اس لیے تمام اپنے کمروں میں چلے گئے۔ مجھے جو کمرہ ملا۔ اس کے ساتھ والا کمرہ عاصمہ کا تھا اپنے کمرے میں ابھی آکر میں لیٹا ہی تھا کہ آہستہ سے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ دستک دینے والی کون ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور عاصمہ ہی ہوگی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا .. تو وہی سامنے عاصمہ کھڑی تھی آتے ہی رونے لگی اور کہنے لگی .. جیدی ... تمہارے ساتھ بہت برا ہوا ہے .. مجھے بہت صدمہ ہوا ہے ... چچی جان پہلے تو ایسے نہ تھے۔ تم پر آج تک ہاتھ بھی نہیں اٹھایا تھا ... لیکن آج تو حد ہی ہو گئی ...

بس کرو ورنہ ... رہنے دو ان باتوں کو ... بہت رات ہو گئی ہے۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں ... آرام کرو۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا ... دیکھے گا تو کیا ہو گا۔

جاوید ... تم پہلے ہی تھوڑے سے بیمار ہو ... میرا خیال ہے تم لیٹ جاؤ تمہاری واقعی طبیعت زیادہ ہی خراب تھی۔ سر میں سخت درد اور بازو بھی دکھ رہا تھا ... تم لیٹے رہو میں ابھی تمہارے لیے گرم پانی کی بوتل لاتی ہوں۔ اور گرم گرم چائے بھی پلاتی ہوں۔ اس سے تمہاری طبیعت سنبھل جائے گی۔

عاصمہ رہنے دو .. اس وقت تکلیف نہ کرو ... رہنے دو صبح دیکھی جائے گی۔ لیکن عاصمہ بہت ضدی تھی اپنی بات منوا کر ہی دم لیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ میرے لیے چائے اور گرم پانی لے آئی ... یہ چائے پی لو ... مکمل آرام کرو۔ اس نے گرم پانی کی بوتل میرے بازو کے نیچے رکھتے ہوئے تاکید کی ...

عاصمہ تم کتنی اچھی ہو ... میرا کتنا خیال رکھتی ہو۔ اب میں قدرے ٹھیک ہوں اب تم بھی جا کر آرام کرو میں سو جاؤں گا۔

چائے پینے کے بعد جب میں لیٹا تو وہ میرا سر دبانے لگی۔

عاصمہ میری خاطر تمہیں کتنی تکلیف اٹھانا پڑ رہی ہے۔

ایسا نہ کہو جاوید .. یہ تو میرا فرض ہے .. وہ مجھے حوصلہ دینے لگی ... مجھ سے پیار بھری باتیں کرتی رہی۔ اس کی باتوں سے میرا سر درد ختم ہو گیا ... اور مجھے نیند آنے لگی ... وہ متواتر میرا سر دبائے جا رہی تھی .. پھر مجھے نیند نے آن دبوچا۔ وہ

وہ ساری رات جاگتی رہی۔ ایک گھنٹہ کے لیے میری آنکھ لگی تھی۔ دن چڑھ آیا تھا... عاصمہ جا چکی تھی... امی جان نے مجھے آ کر اٹھایا تو میری آنکھ کھلی...

بیٹا..! تمہاری آنکھیں کیوں سرخ ہیں۔ امی نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ تمہیں تو حرارت بھی ہے جاوید.. میں نے کہا امی جان فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گا...

میں بستر سے اٹھا اور غسل کرنے چلا گیا... میں اور عاصمہ تیار ہو کر یونیورسٹی چلے گئے۔ میرے پاس نوٹ بک تو نہ تھی۔ لیکن عاصمہ نے کہا کہ ہم ایک ہی نوٹ بک پر کام کر لیں گے...

ہم واپس آئے تو کوئی پانچ منٹ بعد ابو جان آ گئے.. انہوں نے امی جان سے اپنی غلطی کی معافی مانگی... مجھے اور شازیہ کو گلے لگا لیا... اور ہمیں پیار کرتے ہوئے خود رونے لگ گئے۔

میرے بچو..! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو نا... ہم سے ابو جان کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔

نہیں ابو جان..! ایسا نہ کہیں.. میں نے کہا ابو بولے، میں نے اپنے رب تعالیٰ سے توبہ کی ہے کہ پھر کبھی برے کام نہیں کروں گا.. شراب نہیں پیئوں گا... اور تم سب سے بھی معافی چاہتا ہوں۔ میں واقعی شراب میں اندھا ہو گیا تھا...

بیگم.. گھر جانے کا کیا پروگرام ہے۔ امی جان نے کہا کہ اب جب کہ آپ نے توبہ کر لی ہے تو میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔ اتنی دیر میں چچا جان بھی واپس آ گئے۔ انہوں نے ہمیں رات کے کھانے تک ٹھہرا لیا۔

شام کو ہم سیر کے لیے چلے گئے جب واپس آئے تو کافی تھک چکے تھے۔ رات کا کھانا کھایا اور امی ابو نے چچا اور چچی سے واپسی کی اجازت لی۔ اور ہم سب اپنے گھر کو روانہ ہو گئے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ ابو جان اب بھی پریشان رہتے ہیں۔ شاید کہ جوئے میں رقم ہار گئے تھے اس کا غم تھا۔ ابو جان اپنا تمام پیسہ جو بنک میں جمع تھا وہ ہار گئے تھے۔ ادھر چچا جان میں بھی کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ شاید اس لیے کہ اب ہمارے پاس نہ تو پیسے تھے اور نہ ہی بزنس چل رہا تھا۔

چچا چچی نے ہمارے ساتھ ٹھیک برتاؤ کرنا چھوڑ دیا...

زندگی میں ایسے مقام ضرور آتے ہیں کہ انسان نہ تو مر سکتا ہے اور نہ ہی جی سکتا ہے۔ اگر وہ جینے کی تمنا رکھتا ہے تو اسے ظالم سماج جینے نہیں دیتا۔ اس کو آخر دم تک ذلیل و خوار کرتا رہتا ہے۔ آج کے معاشرے میں دولت کا ہونا بہت ضروری ہے.. مفلس آدمی کی نہ عزت ہوتی ہے نہ وقار.. لوگ طعنے دیتے رہتے ہیں... طعنوں سے انسان کو زندہ رہنے کی خواہش سے محروم کر دیتے ہیں۔ زندگی میں دو چیزیں ہوتی ہیں.. خوشی اور غم... زندگی میں غم کو کچھ لوگ تو برداشت کر لیتے ہیں... اور بعض برداشت نہیں کر سکتے۔ اور اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں... لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ مجھے بھی غم اٹھانے پڑے۔ وقت ایک دم بدل گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ دنیا والے بھی بدل گئے۔ ایک رات ابو جان کی طبیعت بہت خراب تھی... ہم پریشان ہو گئے۔ میں نے ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا... لیکن گھر پر نہ ملا میں نے ٹیکسی لی۔ اور ابو جان کو لے کر بھاگ گیا... لیکن ہسپتال تک پہنچنے سے پہلے ہی ہماری دنیا اجڑ گئی... باپ کا شفیق سایہ سر سے اٹھ گیا.. چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دینے لگا۔ ابو جان ہمیں روتا ہوا چھوڑ کر ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اتنی دور چلے گئے جہاں سے واپسی ناممکن ہو... ہم سب دیکھ کر ابو کو دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔

شازیہ کا مارے غم کے برا حال تھا... اس پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ امی جان نے رو رو کر آنکھیں سرخ کر لی تھیں۔ خود میرا حال بھی قابل رحم تھا۔ میں زور زور سے دھاڑیں مار رہا تھا.. بلک بلک کر سسک رہا تھا...

ابو جان..! آپ ہمیں کس کے سہارے چھوڑ کر جا رہے ہو۔ کچھ ہمارا بھی خیال کر لیتے۔ آپ کے بغیر ہم کیسے جئیں گے.. لیکن ابو کب سنتے.. وہ تو ابدی نیند سو رہے تھے۔

چچا چچی بھی آئے ہوئے تھے.. ہمیں تسلیاں اور دلاسے دیتے۔ یہ سب کچھ وہ دکھاوے کے لئے کر رہے تھے۔ ابو جان کے مرنے کے بعد ان کے رویہ میں کچھ زیادہ ہی تبدیلی رونما ہو چکی تھی... ہم نے بھی ان کی زیادہ پرواہ نہ کی۔ اب ہم گھر میں ابو کے بغیر رہ رہے تھے۔ ابو کی یاد ہر وقت تڑپاتی رہتی تھی۔ میری بہن شازیہ بہت زیادہ غم زدہ تھی۔ میں نے اس کا زیادہ خیال

جواب عرض لاہور

رکھنا شروع کر دیا۔ ۔ ۔ اسے کسی بات کی تکلیف نہ ہونے دیتے اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتا۔

جس دن میں شازیہ کو چپ اور اداس دیکھتا۔ ۔ ۔ میں بہت پریشان ہو جاتا۔ امی جان سے بھی ہمیں باپ کی کمی محسوس ہونے دی۔ دن گزرتے رہے۔ اب میں نے دوبارہ یونیورسٹی جانے کے لیے سوچا لیکن قسمت نے تو ابھی اور کئی کھیل دکھلانے تھے۔ جس نے مجھے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ ۔ ۔

دروازے کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ آج صبح صبح کون ہوگا۔ دروازہ کھولا تو سامنے تین اجنبی آدمی کھڑے تھے۔ وہ ابو کے دوست تھے۔ ان کے ہمراہ پولیس کے دو سپاہی تھے۔ ۔ میں پریشان ہو گیا۔ کہ یا اللہ خیر ہو۔

ایک آدمی بولا۔ ۔ ۔

جاوید آپ ہی کا نام ہے

جی ہاں۔ ۔ ۔ میں نے جواب دیا۔ فرمایئے کام کیا ہے۔

جاوید صاحب: بات یہ ہے کہ آپ کے ابو نے مجھ سے چالیس ہزار روپے قرض لیا تھا۔ کلب میں ان کو ضرورت پڑ گئی تھی۔ اور مجھے یہ تحریر دی تھی کہ اگر میں زندگی میں یہ قرض نہ دے سکا تو یہ مکان گروی رکھ لینا۔

جب میں نے تحریر پڑھی تو واقعی میرے ابو کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ ۔ ۔ میں نے ان کو شام کے وقت آنے کا کہا۔ وہ میری بات مان گئے اور وہاں سے رخصت ہو گئے۔ امی جان نے مجھ سے پوچھ لیا کہ کون تھے جو آئے تھے۔ ۔ تو میں نے ساری بات ان کو بتا دی۔ امی جان کہنے لگیں

بیٹا پریشان کیوں ہو رہے ہو اپنے چچا کے پاس جاؤ۔ اور ان سے بات کرو۔ جب میں چچا کے پاس گیا اور بات سنائی اور کہا آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ مگر چچا جان نے صاف صاف کہہ دیا کہ۔ ۔

میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ میں تم لوگوں کی کوئی مدد کر سکوں۔ ۔ ۔ میں یہ الفاظ سن کر مایوسی لیے واپس آ گیا۔ شام کو جب وہ آدمی آئے تو میں نے ان سے کہا کہ آپ ایک دو دن ٹھہر جائیں میں کہیں سے پیسے اکٹھے کر لوں نہیں تو دوسرا مکان تلاش کر لوں۔ اس کے بعد میں آپ کو اس کوٹھی کی چابیاں دے دوں گا یا پیسے دے دوں گا۔ ۔ ۔ انہوں نے کہا جاوید صاحب ایک دو دن کیا ہم پورا ہفتہ انتظار کر لیں گے۔ آپ اپنا بندوبست کر لیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اب میں نے مکان کی تلاش شروع کر دی۔ ہمیں اچھرہ میں دو کمروں کا فلیٹ مل گیا۔ اب تو ہم نے گزارہ کرنا تھا۔ جائیداد تو تھی ہی نہیں۔ جب سے میں کوئی کاروبار کرتا یا چھوٹا موٹا کام کرتا۔ امی جان کے اکاؤنٹ میں تو کل دس ہزار روپے جمع تھے۔ جو ہم نے گھر کے خرچ کے لیے رکھ لیے۔ ۔ ۔ کیونکہ میں نے اب نوکری بھی تلاش کرنی تھی۔ جب ہم اپنی کوٹھی چھوڑ کر جا رہے تھے تو اس وقت میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس گھر میں ہمارا بچپن گزرا تھا۔ اسی میں جوان ہوئے اور آج ہمیشہ کے لیے اس گھر کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔

جاتے وقت میں نے ارادہ کیا کہ اگر زندگی رہی تو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن میں اس گھر کو دوبارہ خرید لوں گا چاہے مجھے اس کے دوگنے کیوں نہ دینے پڑیں۔ ۔ ۔ جب ہم کرائے کے مکان میں آ گئے تو جب میں عاصمہ کو پتہ چلا وہ ہمارے گھر کرائے کے مکان میں آئی۔ وہ بہت اداس تھی۔ ۔ ۔

ہمیں یہاں آتے ہوئے ایک ماہ ہو گیا۔ مگر چچا جی نے ہمارا حال نہ پوچھا۔ ان کا رویہ شروع سے ہی بدل گیا تھا۔ ۔ وہ ہمیں حقیر سمجھنے لگے تھے۔ واقعی آج کے دور میں انسان کی قدر صرف دولت سے ہی ہوتی ہے۔ طارق اور عاصمہ نے کافی زور لگایا کہ اپنے گھر لے جائیں۔ لیکن چچا جان نے ہم سے کوئی بات نہ کی۔ بلکہ اب وہ اپنے بچوں کو ہم سے دور رکھنے لگے۔ لیکن طارق اور عاصمہ کب ان کی بات ماننے والے تھے۔ وہ آتے جاتے رہے۔ امی کی جمع شدہ پونجی سے گھر کا خرچ چلتا رہا۔ لیکن کب تک چلتا۔ ایک نہ ایک دن تو وہ پیسے ختم ہونے ہی تھے۔ سو میں نے نوکری کی کوشش شروع کر دی۔ اب عاصمہ مجھے لینے آتی تو میں اسے کہتا۔ ۔

عاصمہ۔ ۔ اب تم تکلیف مت کیا کرو میں پیدل ہی چلا جایا کروں گا۔ لیکن وہ کہتی۔ ۔

جاوید۔ ۔ ! آئندہ ایسے الفاظ کبھی بھی اپنی زبان پر مت لانا۔ یہ میرا فرض ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں اسی طرح ہوتا رہے گا۔ میں جانتی ہوں کہ امی اور ابو آپ سب سے بدل گئے ہیں۔ لیکن ہماری محبت قائم و دائم رہے گی۔ ہم ایک دوسرے جدا نہ ہوں گے…

سکھ کی جدا نہیں کر سکتا۔۔۔ ایک دن ہم دونوں یونیورسٹی کے لان میں بیٹھے تھے۔

میں نے عاصمہ سے پوچھا۔

ڈیر۔ ! مجھے خدشہ ہے کہ جس طرح چچا چچی بدل گئے ہیں۔ اسی طرح وہ ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر دیں۔۔۔ اور ہمارا یہ ملنا بھی جاتا رہے۔۔

نہیں جاوید۔۔! ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہم جس طرح پہلے ملتے آئے ہیں۔ اسی طرح اب بھی ملتے رہیں گے۔ میرے آنے جانے میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔۔۔

ایک دن میں نے امی جان سے نوکری کرنے کی اجازت چاہی لیکن انہوں نے کہا کہ بیٹا ابھی تمہیں پڑھنا ہے۔ پہلے اپنی پڑھائی مکمل کر لو۔ پھر کوئی اور کام کرنا۔۔۔ پیسے ختم ہو رہے ہیں تو کیا ہوا۔۔۔ میرا زیور کس کام آئے گا۔

عاصمہ کو اس بات کا پتہ چلا کہ میں نوکری کا خواہش مند ہوں تو اس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

ہاں عاصمہ۔۔! میں نوکری کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن امی اجازت نہیں دے رہیں۔ آخر دیکھو نا یہ تھوڑے سے پیسے ساری عمر تو چل نہیں سکتے۔ مجھے نوکری گھر کے خرچ کے لیے کرنا ہی پڑے گی۔۔۔

نہیں جاوید۔ ! تم نوکری نہیں کرو گے گویا عاصمہ نے اپنا حکم صادر کر دیا۔

عاصمہ کیا یہ میرے لیے حکم ہے۔۔؟

نہیں۔۔ یہ میری درخواست ہے۔۔۔ میں تم کو حکم نہیں دے سکتی۔۔۔

میں نے عاصمہ کی بات مان لی۔۔۔ طارق بھی کبھی کبھی چکر لگا جاتا۔۔۔ ہماری زندگی تو اجڑ چکی تھی۔ لیکن اس اجڑی ہوئی زندگی کو ہم کسی نہ کسی طور کھینچ رہے تھے۔ دل آخر دل ہوتا ہے۔ میرے دل پر بے شمار زخم تھے۔

آہستہ آہستہ وقت گزر گیا اور وقت کے مرہم نے میرے دل کے زخموں کو بھر دیا۔ میں دوبارہ یونیورسٹی جانے لگا۔ یونیورسٹی میں عاصمہ نے مجھے بتایا کہ طارق کی نوکری کراچی میں ہو گئی ہے۔ وہ آج رات کو ہی یہاں سے گیا ہے۔

شام کو جب میں گھر پہنچا تو امی جان کو بے حد اداس اور غمگین پایا۔ میں نے اداسی کی وجہ پوچھی تو وہ رونے لگیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن شازیہ کہیں نظر نہ آئی۔۔۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے امی جان۔۔۔ آپ کیوں رو رہی ہیں۔ مجھے بھی کچھ پتہ چلے۔۔۔ امی جان بتانے لگیں۔

آج تمہارے چچا اور چچی آئے تھے اور کہنے لگے کہ طارق کا کہنا ہے کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔۔۔ میں شازیہ سے شادی نہیں کروں گا۔ آپ جا کر یہ انگوٹھی دے آئیں۔ میری طرف سے صاف جواب ہے۔ اور ہمیں بھی طارق کی طرح یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔

امی جان سے یہ سنتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میرا سر چکرانے لگا۔۔۔ میرے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا پھیل گیا۔ آج شازیہ کے دل پر کیا گزری ہو گی۔ میری زندگی میں پہلے کیا کچھ کم غم آئے تھے۔ جو آج یہ صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔۔۔ میں لڑکھڑاتا ہوا شازیہ کے کمرے میں پہنچا۔ وہ پلنگ پر لیٹی زار و قطار رو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے گلے سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ بہت ہی چیخیں مارتی رہی۔ اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی۔ مگر بے سود ثابت ہوئی۔ میری پیاری بہن ہمت سے کام لو۔۔۔ زندگی کے سفر میں بہت سے دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔۔۔ صعوبتیں اور مصیبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ تم بھی یہ سب برداشت کر لو۔ اور بھول جاؤ کہ طارق سے تمہاری منگنی ہوئی تھی۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔ میں تمہاری شادی اس سے اچھی جگہ کروں گا۔۔۔ یہ اچھا ہوا کہ اس نے پہلے ہی جواب دے دیا۔ پتہ نہیں بعد میں یہ ظالم دلسان کیا سلوک کرتے۔ میں اپنی بہن کا بدلہ طارق سے ضرور لوں گا۔ اسے اس طرح ذلیل کروں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ میں پیار سے شازیہ کو سمجھاتا رہا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے دوپہر کو کھانا بھی نہیں کھایا۔ سارا دن چپ چاپ لیٹی رہی۔۔۔ شام کو عاصمہ آئی اور آتے ہی میری امی کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا

تائی جان۔۔! آپ اس بات کی سزا کہیں مجھے تو نہیں دیں گے۔۔۔ خدارا اس کی سزا مجھے نہ دیجئے گا۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔۔۔ میں مانتی ہوں کہ ابو امی نے یہ ٹھیک نہیں

جواب عرض لاہور

فیصلہ کیا ... بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اس میں بھی کوئی سازش ہے۔ طارق نے ایسا ہرگز نہیں کہا ہوگا۔ نہ ہی وہ ایسا کر سکتا ہے۔ وہ تو شازیہ کو دل و جان سے چاہتا ہے۔ امی جان نے طارق کی غیر موجودگی میں اس کی مرضی کے خلاف اپنے خیال کے مطابق ایسا قدم اٹھایا ہے ... انہوں نے سوچا ہوگا کہ جب طارق واپس آئے گا تو اسے ہم شازیہ کے خلاف کر دیں گے۔ امی جان کو عاصمہ اپنے دل کی آواز سناتی رہی ...

عاصمہ نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ خدا کے لیے اپنی بہن کا گھر بسنے کے لیے مجھے نہ ٹھکرا دینا ... میں اس کرب کو برداشت نہ کر سکوں گی ... مر جاؤں گی۔ تم مجھے آزما کر دیکھو۔ میں ہر آزمائش میں پوری اتر دوں گی ... تمہاری ہر بات مانوں گی۔ تمہارے ہمراہ قدم بہ قدم چلوں گی ... مگر مجھے نہ ٹھکرا دینا ...

میں خاموش کھڑا رہا ... کوئی جواب نہ دیا تو شازیہ کے قدموں میں گر گئی۔ میری بہن ... میں ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی چاہتی ہوں تم اپنے بھائی کو کہہ دو کہ مجھے نہ چھوڑے ... ورنہ میں ....

عاصمہ نے فقرہ مکمل کرنے سے پہلے ہی شازیہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایسا مت کہیں باجی ... میں آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی ... میری زندگی تو تباہ ہوگئی لیکن میں آپ کو اس کی سزا ہرگز نہیں ملنے دوں گی۔ اور شازیہ نے عاصمہ کو گلے لگا لیا۔ اسے تسلیاں دینے لگی۔ لیکن میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میں خود عاصمہ کو بے حد چاہتا تھا۔ لیکن اب اس کا اور میرا میل نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے والدین رکاوٹ بن گئے تھے ... میں نے سوچا کہ عاصمہ کو اپنے سے جدا کر دونگا ...

عاصمہ شازیہ کی تسلیوں سے مطمئن ہو کر واپس جا چکی تھی۔ رات کو میں نے زبردستی شازیہ کو کھانا کھلایا۔ شازیہ نے رات کو جلد ہی سونے کی خواہش کی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جاتے وقت مجھے کہنے لگی اچھا بھیا ... خدا حافظ ... زندگی رہی تو صبح پھر ملاقات ہوگی ... میں نے مذاقاً اس سے کہا کہ تم کوئی سفر پر تو نہیں جا رہی ہو کہ اس طرح خدا حافظ کہہ رہی ہو لیکن شازیہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ وہ رات مجھے کبھی نہیں بھولے گی ... وہ رات بہت لمبی تھی۔ اسی رات میری زندگی میں زبردست طوفان آیا۔ اور اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا ...

صبح اٹھا تو شازیہ ابھی تک سو رہی تھی۔ میں یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ لیکن شازیہ کے کمرے کا دروازہ بدستور بند تھا ... میں نے دروازے پر دستک دی۔

شازیہ ... شازیہ ... دروازہ کھولو ... کیا بات ہے رات کو جلدی سوئی تھیں اور ابھی تک اٹھنے کا نام نہیں لے رہی ہو ... لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے دروازہ زور زور سے آوازیں دیں پھر بھی کوئی جواب نہ آیا ... میں پریشان ہو گیا کہ جانے کیا بات ہے ... فوراً میں نے امی جان کو بلایا۔ اور بتایا کہ کافی دروازے پر دستک دی لیکن شازیہ کوئی جواب نہیں دے رہی۔

امی نے بھی زور زور سے آوازیں دیں اور دروازہ کھٹکھٹایا ... لیکن جواب نہ مل سکا۔

مجھ سے مزید صبر نہ ہو سکا تو میں کمرے کی کھڑکی توڑ کر اندر داخل ہو گیا۔ جونہی میری نظر شازیہ پر پڑی تو میرا دل اچھل کر حلق میں پھنس گیا ... شازیہ کا آدھا جسم پلنگ پر تھا اور آدھا پلنگ سے نیچے جھول رہا تھا ... ساتھ ہی میز پر نشہ آور گولیوں کی خالی شیشی پڑی تھی ..

میں نے فوراً دروازہ کھولا ... امی جان نے بھی شازیہ کو دیکھا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ میرے بھی آنسو نکل آئے ...

شازیہ ... میری بچی ... یہ تم نے کیا کیا ہے ... تم نے اپنے ہاتھوں اپنی جان لے لی۔ ایک معمولی سی بات بھی برداشت نہ کر سکی۔ شازیہ تم نے ایسا کیوں کیا ... کیوں کیا میری آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی یلغار تھی۔

شازیہ تم طارق کی خاطر اپنی زندگی پر کھیل گئی ہو ... میں بہت رویا ... اب تو رونا میری قسمت میں لکھا ہی تھا۔ گھر میں کئی لوگ سوگ کرنے اور دلاسے دینے آتے۔ امی جان اس دن بہت روئیں ... میری بیٹی ... تمہارے بدلے میں مر جاتی۔ تم کیوں اتنی جلدی ہمت ہار گئی ... میری بچی ... تم تو بہت

صابر تھی۔ ہر غم کو صبر سے برداشت کرتی تھی۔ ہر دکھ اپنے سینے میں چھپائے مسکراتی رہتی تھی۔۔۔ کوئی نہیں دیکھ کر یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ غم زدہ ہے۔۔۔ آج کیوں ہار گئی۔۔ بیٹی ہمیں کیوں روتا ہوا چھوڑ کر جا رہی ہو۔۔۔ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔۔۔ امی جان روتی رہیں۔

میں نے سوچا کیا شازیہ کی میز پر شیشی کے ساتھ ایک خط پڑا تھا۔ جو اس نے میرے نام اپنا آخری پیغام لکھا تھا۔ وہ یہ خط مجھے آخری نشانی دے گئی۔

پیارے بھائی۔۔!

آداب: بھیا آپ کو یقیناً میری موت پر دکھ ہو گا لیکن میں مجبور ہو گئی تھی۔۔۔ طارق نے میرے ساتھ بے وفائی کی ہے۔۔۔ میں ہمت ہار گئی۔ میں مانتی ہوں کہ صبر کرنے والے بھیا کو بھی صابر ہونا چاہیئے۔ لیکن میں تو اب اس بے وفا دنیا سے۔۔۔ بے وفا لوگوں سے دور جانا چاہتی ہوں۔۔۔ بھیا۔۔! آپ میری شادی کسی اور سے کرتے۔۔۔ اس سے دردناک لمحہ کوئی اور نہ ہو سکتا۔۔۔ اس سے پہلے ہی میں اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر رہی ہوں۔ کوئی بھی شریف لڑکی اپنے پہلے دولہا کو یا منگیتر کو دل و جان سے پسند کرتی ہے۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔۔۔ میں نے طارق کو اپنے من کی دنیا میں بسا لیا تھا۔ میں اس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ میں اسی بے وفا طارق سے محبت کرتی تھی۔ میں اس کے بغیر کسی اور کا تصور بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اس سے پہلے کہ میری شادی کسی اور سے ہوتی میں اس دنیا سے چلے جانا ہی بہتر سمجھتی ہوں۔۔۔

بھیا۔۔! آپ کو میری قسم ہے کہ اگر آپ کو مجھ سے واقعی پیار ہے تو عاصمہ باجی سے ضرور شادی کر لینا۔۔۔ یہ میری آپ سے آخری التجا ہے۔ امید ہے کہ آپ میری آخری خواہش کو ضرور پورا کریں گے۔ امی جان کو میرا آخری سلام کہہ دیں۔۔۔ ان کا بہت خیال رکھا کریں۔

بھیا۔۔! آپ ہمت نہ ہاریں۔۔ اگر طارق میرا آخری دیدار کرنے آئے تو اسے مت روکیں۔ باجی عاصمہ سے آپ ضرور شادی کر لیں ان کو میری جانب سے سلام آخر کہہ دیں۔ اچھا بھیا۔۔! اب آپ سے اجازت چاہتی ہوں۔ میرا سانس اکھڑ رہا ہے۔ شاید فرشتے بھی آ گئے ہیں۔ خدا حافظ

فقط آپ کی لاڈلی بہن

شازیہ

خط پڑھتے ہی میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ خط میرے لیے کسی بم سے کم نہ تھا۔ ہر طرف مجھے دھماکے سنائی دینے لگے۔ میری پیاری بہن تم نے اپنی پاکیزہ محبت طارق جیسے بے وفا شخص پر قربان کر دی۔ مجھے بہت دکھ ہوا ہے۔ طارق اب کیا لینے آئے گا یہاں۔۔۔ اب اس کے لیے یہاں کچھ نہیں رکھا۔۔۔ اس نے تمہاری جان لے لی ہے۔ اب کیا اور لینے آئے گا۔ میری بہن کے قاتل اگر آج شازیہ خط نہ لکھتی تو میں شاید تمہاری زندگی بھی ختم کر دیتا۔۔۔

آخر شازیہ کا جنازہ اٹھا۔۔۔ ایک ماں۔۔۔ ایک بھائی روتے رہے۔۔ چیخ و پکار کرتے رہے۔۔ لیکن دنیا والوں نے نہ سنا۔ خود شازیہ بھی خاموش رہی۔ اور ہم سب کو روتا ہوا چھوڑ کر اس دنیا سے منوں مٹی تلے جا بسی۔۔۔

میری آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ کچھ دن تو شازیہ کے سوگ میں ہی گزر گئے۔ عاصمہ آئی اور اس نے مجھے اور امی کو بہت تسلی دی۔ افسوس کیا۔ وہ اب اپنے والدین کے خلاف تھی۔ دوسرے دن طارق کراچی سے واپس آیا۔ اس دوران چچا اور چچی بھی افسوس کے لیے نہ آئے۔۔۔

کتنے سنگدل تھے۔ انہوں نے طارق کو شازیہ کے متعلق بھی نہ بتایا کہ وہ تمہاری جدائی میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔ وہ ہمارے گھر آیا۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ پہلے طارق نے امی کو بڑے انداز سے سلوٹ کیا۔ اور ان کے آگے چیزیں بکھیر دیں۔۔

یہ دیکھیں چچی جان میں نے شازیہ کے لیے شاپنگ کی ہے۔۔۔ یہ ساڑھی دیکھ رہی ہیں۔ یہ لالہ رخ کی ساڑھی شازیہ کو بہت پسند ہے۔۔۔

میں حیران ہو گیا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے۔۔ امی جان بھی حیرانی سے اس کا منہ تکے جا رہی تھیں۔ میں منہ سے کچھ نہ بولی۔ طارق اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔

چچی جان۔۔! شازیہ کہاں ہے۔۔۔ نظر نہیں آ رہی میں سوچنے لگا کہ اس نے تو شازیہ کو ٹھکرا دیا تھا۔ اب یہ اس کے لیے چیزیں لے آیا ہے نہ اس کو یہ پتہ ہے کہ شازیہ مر گئی یا زندہ ہے۔ شاید

ماموں نے تمہیں طارق کے متعلق ٹھیک ہی بتایا ہوگا۔

چچی جان۔۔! آپ خاموش کیوں ہیں۔ بولتی کیوں نہیں۔۔۔ کیا مجھ سے ناراض ہیں؟ پلیز بتائیں نا۔ شازیہ کہاں ہے۔ جلدی بتاؤ۔

امی جان پہلے تو ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حسرت اور رنج کی ملی جلی کیفیت سے طارق کو دیکھا۔ اور آہستہ سے بولیں۔۔۔

کیوں یہ ڈرامہ دکھانے آئے ہو طارق۔۔؟ تمہیں سب کچھ تو معلوم ہی ہے۔ پھر یہ انجان بنے کیوں پھر رہے ہو۔ اب یہ ڈرامہ نہیں چلے گا۔۔

کون سا ڈرامہ چچی جان۔۔۔؟ وہ حیرانی سے بولا۔

میں بھی اس دوران کمرے سے باہر آ گیا اور طارق سے پوچھا۔ کیا تمہیں کچھ معلوم نہیں۔۔

جاوید بھائی۔ خدا کی قسم مجھے معلوم نہیں آخر آپ بتلاتے کیوں نہیں کہ بات کیا ہے جو مجھے معلوم نہیں۔۔۔

طارق! میں نے کہا۔

جی۔۔! اس نے جواب دیا

اتنے دنوں سے۔۔۔ تم اپنے ماں باپ کو کراچی ساتھ ... کہہ کر چلے گئے تھے اور امی جان ہماری باتوں کو توجہ سے سن رہی تھیں۔

جاوید بھائی۔۔! میں نے امی ابو سے جاتے وقت یہ کہا تھا کہ میں کچھ دنوں تک واپس آ جاؤں گا ایک دوست کی شادی تھی، اس میں شرکت کے لیے کراچی گیا تھا جاتے وقت میں نے امی ابو سے کچھ پیسے یہ کہہ کر مانگے تھے کہ ایسے ہی شازیہ کے لیے کچھ چیزیں خریدنی ہیں۔ انہوں نے مجھے پیسے دے دیے۔ خالی ہاتھ آنا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔

لیکن جاوید بھائی۔۔! آپ مجھ سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں۔۔ اس نے حیرانی سے کہا۔۔۔ میں طارق کی باتیں سنتا رہا میرا سر چکرانے لگا۔ اور میں سوچنے لگا کہ چچا اور چچی اتنا سنگین جھوٹ بھی بول سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے یہاں شادی نہیں کرنی تھی تو صاف صاف کہہ دیتے۔ طارق کا نام ضرور لینا تھا۔۔ طارق بولا۔

چچی جان آپ کیوں نہیں بولتیں۔۔۔ بتاؤ تو سہی اور شازیہ کہاں ہے وہ خیریت سے تو ہے۔ امی جان رونے لگیں۔

میں کیا بتاؤں طارق۔۔! میری دنیا اندھیر ہو گئی ہے۔۔ میری دنیا اجڑ گئی ہے

کیا مطلب ہے آپ کا چچی جان۔ طارق کے ہوش و حواس کھو گئے۔۔ وہ غم سے نڈھال ہو۔۔۔

امی بتانے لگیں۔ تمہارے ابو آئے تھے اور کہنے لگے کہ طارق نے شازیہ سے شادی سے انکار کر دیا ہے ... سنا تھا کہ طارق نے زور سے چیخ ماری۔۔۔ اور نہیں۔ نہیں کہتا ہوا ... گر پڑا ... اسے کمرے میں بٹھا کر پھر لٹا دیا۔ کافی دیر بعد اسے کچھ ہوش آیا اور بولا۔

چچی جان! ابو نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا کہ وہ ایسا کر دیں گے۔ شازیہ تو مجھ سے ... کیا حاصل ہوا۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر امی یہ سوچ رہی ہیں کہ میں شادی کروں گا تو یہ ان کی بھول ہے۔ میں جان گیا ہوں کہ ان کے کیا ارادے ہیں۔ میں ان کا خواب کبھی پورا نہ ہونے دوں گا۔۔ نہیں ہونے دوں گا۔ پھر میں نے شازیہ کا خط طارق کو دیا۔ طارق نے مجھ سے خط لیا اور پڑھنے لگا۔

خط پڑھنے کے بعد وہ دوبارہ رونے لگا۔۔۔ اپنی محبت پر قربان ہو گئی جاوید بھائی۔۔۔ شازیہ کتنی وفادار اور مخلص تھی۔ اپنی محبت کو پروان چڑھا گئی۔۔ مجھے ... چھوڑ کر چلی گئی۔ لیکن شازیہ میں تمہارے بغیر ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ تم اس دنیا سے چلی گئی۔ میں یہاں رہ کر کیا کروں گا۔ اس دنیا میں واقعی میرے والدین جیسے مطلب پرست اور ظالم انسانوں کی بھرمار ہے۔

طارق بولا۔۔۔ چچی جان۔۔۔ مجھے معاف کر دیں۔ جاوید بھائی آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔۔۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میرے والدین نے سراسر آپ سے میرے متعلق جھوٹ بولا ہے۔ میں آپ سے پھر بھی معافی چاہتا ہوں۔۔ اب میں کبھی گھر کا رخ نہیں کروں گا۔ میں ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا۔۔۔ میں گھر چھوڑ دوں گا۔

جاوید بھائی۔۔! امی کی خواہش تھی کہ میں ان کی بھانجی راحیلہ سے شادی کر لوں۔ لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔۔۔ اور اسی روز کراچی چلا گیا۔۔۔

میں نے آگے بڑھ کر طارق کو گلے لگا لیا۔ بے شک طارق اب

مجھے یقین آگیا ہے کہ واقعی تم بے گناہ ہو اور تمہارے امی ابو ہی اصل مجرم ہیں۔

طارق بولا۔ نہ صرف شازیہ کے قاتل ہی نہیں میرے قاتل بھی ہیں۔ یہ کہہ کر طارق نے اپنی جیب میں سے پستول نکالا۔۔ اپنی کنپٹی پر اس کی نالی رکھ دی۔۔۔ میں نے جھپٹ کر اسے روکنا چاہا۔۔ طارق ایسا نہ کرو۔ شازیہ تو چلی گئی ہے۔۔ اب تم کیوں اپنی زندگی تباہ کرنے پر تلے ہو۔۔۔

نہیں جاوید۔۔! میں مزید اس دنیا میں شازیہ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں جلد سے جلد اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں۔۔ یہ کہتے ہوئے طارق نے مجھے زور سے دھکا دیا میں لڑکھڑاتا ہوا صوفے پر جا گرا۔۔۔ ابھی میں سنبھل بھی نہیں پایا تھا کہ طارق نے اپنے آپ کو گولی مار لی۔ اور فرش پر آن گرا۔۔۔

تھوڑی دیر بعد وہ بھی شازیہ سے جا ملا۔ میں اس کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔۔ مجھے چچی اور چچا پر غصہ آرہا تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ جا کر ان کا گلا گھونٹ دوں۔۔۔ وہ بھی اس دنیا سے رخصت ہو جائیں۔۔۔

میں اٹھا اور سیدھا چچا کے گھر گیا چچا چچی نے مجھے آتے دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئے۔ شاید ان کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اب ان کی سازش بے نقاب ہو گئی ہے۔ میں چچا کے سامنے پہنچا۔۔۔ اور سخت غصہ سے بولا

اے ظالم انسان۔۔! تمہاری بے تکی چال نے تو میری بہن شازیہ کی جان لے لی۔۔۔ طارق جب ہمارے گھر آیا تو اسے بعد میں آپ کی چال کا پتہ چلا۔ اب اس نے بھی اپنے آپ کو گولی مار لی ہے۔۔۔ یہ سب کچھ صرف اور صرف آپ دونوں کی وجہ سے ہوا ہے۔۔۔ میری بات سنتے ہی دونوں اپنی اپنی جگہ سے اچھل کھڑے ہوئے۔۔۔ کیا طارق نے واقعی خودکشی کر لی ہے۔۔۔

چچا! اب آپ طارق کو بیٹا کہہ رہے ہیں۔۔۔ نہ کہیں۔۔ اگر آپ باپ ہوتے یا چچی ماں ہوتی تو اپنے ہاتھوں سے ان کی اور شازیہ کی زندگی خراب نہ کرتے۔ آپ دونوں ان کے قاتل ہیں۔۔۔ اللہ تعالیٰ کبھی بھی آپ کو معاف نہیں کرے گا۔۔۔ اگر میری بہن نے مرتے وقت اپنے خط میں مجھ سے وعدہ نہ لیا ہوتا تو میں آپ سے پوچھ لیتا کہ کس طرح دوسروں کی زندگیوں سے کھیلا جاتا ہے۔۔۔

مکار انسانو۔۔! میں نہ جانے کیا کچھ ان کو کہتا رہا۔۔۔ لیکن چچی چچا نے کوئی جواب نہ دیا۔

چچی۔۔! طارق نے مرتے وقت مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ آپ نے راحیلہ کی خاطر یہ سب کچھ کیا۔۔۔ جس کا نتیجہ آپ دونوں کے سامنے ہے۔۔ کیا ملا ہے آپ کو ایسا کرنے سے۔۔ اب کر لیں گی آپ راحیلہ سے طارق کی شادی۔۔۔

خاموش کیوں ہیں۔۔ مجھے جواب دو۔۔۔ میں تیروں کے نشتر خالی کرتا رہا۔ وہ دونوں پھٹی پھٹی خاموشی سے مجھے دیکھتے رہے۔۔۔ میں جانے کے لیے مڑا تو ایک دم چچی دھاڑیں مار مار کر زار و قطار رونے لگیں۔ اب آپ کے رونے سے کیا فائدہ۔ آپ کے رونے سے طارق یا شازیہ واپس نہیں آسکتے۔۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا۔ میں نے چچا کے گھر اب کبھی نہ جانے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔ اس دوران عاصمہ آتی رہی۔ لیکن کچھ دنوں بعد انہوں نے عاصمہ کو بھی ہمارے یہاں آنے سے روکنا شروع کر دیا۔ لیکن عاصمہ نے آنا جانا بند نہ کیا۔ اور مجھے اپنے امی ابو کی ساری بات چیت سناتی رہی۔

اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔۔۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔۔۔ جو لوگ دوسروں کی برائی کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ انہیں ذلیل و خوار کرتا ہے جو دوسروں کے نام کو برے الفاظ میں اچھالتا ہے۔ خود اس کا نام ہی بدنام ہوتا ہے۔ ایک دن عاصمہ پریشان سی ہمارے گھر آئی۔ اس کے چہرے پر اداسی نظر آرہی تھی۔۔۔ میں نے عاصمہ سے پریشانی کی وجہ پوچھی۔۔۔ پہلے تو خاموش رہی پھر بولی۔

جاوید۔۔! دراصل بات یہ ہے کہ میری چھوٹی بہن آسیہ رات کو اپنے دوست کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ امی اور ابو یہ صدمہ کیسے برداشت کریں گے۔ اب تو وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے۔ ان کی گردن مارے شرم کے جھک گئی ہے۔ ہم نے آسیہ کو ادھر ادھر بہت تلاش کیا۔ لیکن اس کا کہیں کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ خدا جانے کہاں کا رخ کر گئی ہے۔۔۔ میں نے عاصمہ کو تسلی تشفی دے کر واپس گھر روانہ ہو گیا۔

دن گزرتے رہے۔۔ اب میں نے پھر یونیورسٹی جانا شروع کر دیا۔ اب میں اور عاصمہ دکھ جھیلنے کے عادی ہوتے جا رہے تھے۔ عاصمہ مجھے ملنے آتی رہی۔ اس کے ماں باپ اسے لاکھ

منع کرتے ہے لیکن میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ وہ اپنے ماں باپ سے باغی ہو چکی تھی...

ایک دن امی جان نے مجھے کہا بیٹا اب تم شادی کر لو... میں بوڑھی ہو گئی ہوں... ہو کہ اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اور میری آرزو ہے کہ اپنی زندگی میں تمہارا سہرا دیکھوں... زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں...

ایسا نہ کہیں امی جان۔ آپ کے ہوتے ہوتے ہی مجھے کچھ حوصلہ ہے آپ کی زندگی تو میری زندگی ہے۔ شادی بھی ہو جائے گی آپ گھبرائیں نہیں... صبح میں یونیورسٹی گیا۔ ایک پیریڈ خالی تھا۔ میں لان میں جا بیٹھا۔ عاصمہ بھی مجھے ہی ڈھونڈتی ہوئی آن پہنچی۔ مجھے اداس دیکھ کر بولی کیا ہوا ہوئی۔

جاوید... ہمیں اگر کوئی دکھ ہو تو اسے دوسروں کو سنا کر اپنا غم ہلکا کرنا چاہیئے۔ تم مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ بتاؤ کیا بات ہے۔ تمہیں میری قسم ہے

عاصمہ... امی جان کی خواہش ہے کہ اب شادی کر لوں میں سوچتا ہوں کہ تمہیں پہلے ہی نہیں کہ شادی کر سکوں۔ میں اپنی شادی دھوم دھام سے کرنا چاہتا ہوں تاکہ میرے سارے غم اس خوشی میں بدل جائیں... میں تمہیں دلہن بنا کر اپنے گھر لے آؤں گا... عاصمہ شرم سے لال و سرخ ہو رہی تھی۔ آہستہ سے بولی۔

دھوم دھام کی کوئی ضرورت نہیں... اپنی امی کو ہمارے گھر بھیج کر بات پکی کر لو... وہ تاریخ وغیرہ مقرر کریں گے۔ بس سادگی سے تمام کاروائی ہو جاتے۔

عاصمہ... میں سوچتا ہوں کہ تمہارے امی ابو اس رشتہ سے انکار نہ کر دیں...

جاوید... تم کیوں فکر کرتے ہو۔ تم ایک دفعہ اپنی امی کو ادھر بھیج دو... میں اپنی امی سے خود بات کر لوں گی۔ میں یونیورسٹی سے واپس آیا۔ تو امی جان کو اپنی اور عاصمہ کے بیچ ہونے والی باتیں سنائیں... اور ان کو ان کے گھر جانے کے لیے آمادہ کریں۔ صبح میں امی جان کو ان کے گھر چھوڑ آیا۔ اور خود واپس گھر آ کر امی کا انتظار کرنے لگا... میں سوچتا رہا اگر چچی نے انکار کر دیا تو کیا ہوگا... کیا عاصمہ کسی اور جگہ شادی پر آمادہ ہو جائے گی۔ میں انہی سوچوں کے سمندر میں غرق تھا کہ امی جان واپس آ گئیں۔ میں نے ان کے چہرے کو دیکھا تو ان کا چہرہ اترا ہوا تھا... آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی۔ میں ان کو دیکھتے ہی اٹھ بیٹھا... امی جان کہنے لگیں۔

میں پہلے ہی جانتی تھی کہ ایسا ہی ہوگا۔ کیا تھا تو بیٹی کیسے دے دیں گے۔ امی جان آپ نے ان سے کیا بات کی تھی...

بیٹا... میں نے تمہارے چچا کو اپنے آنے کا مقصد بتایا تو انہوں نے جیسے میری بات ہی نہ سنی ہو... تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے جواب دیا

عاصمہ کا رشتہ تو کسی اچھی جگہ کریں گے... آپ کے تو حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ آپ پیٹ بھی نہیں بھر سکتے... میری بیٹی کیسے اپنے گھر میں رکھیں گے...

ہوں... تو اس کا مطلب ہے صاف جواب مل گیا... میں نے کہا...

ہاں بیٹے... بالکل صاف جواب ہے...

میرے سارے خواب چکنا چور ہو گئے... میں تو عاصمہ کے بغیر کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ کیا عاصمہ ان وعدوں اور قسموں کو بھول جائے گی... شام ہو چلی تھی... عاصمہ آئی اور امی کے قدموں میں گر پڑی...

تائی جی... مجھے معاف کر دیں... کیونکہ میرے ہوتے ہوئے آپ کی بے عزتی ہوئی۔

جاوید... عاصمہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا... یقین کرو میں نے بہت کوشش کی کہ اس رشتے سے انکار نہ ہو۔ لیکن امی ابو نے کسی کی نہیں سنی... تائی جان کو ہمارے گھر سے خالی ہاتھ آنا پڑا۔ اب وہ میری شادی میری خالہ کے لڑکے اختر سے کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جاوید ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم دونوں ایک ہو سکتے ہیں...

عاصمہ تم میرا ساتھ مانگ رہی ہو... بتاؤ تمہارا ساتھ کس طرح سے دوں

جاوید... ہم دونوں کورٹ جائیں گے وہاں جا کر جج کے سامنے اپنے بیان دیں گے کہ ہم دونوں اپنی مرضی اور جواب بغرض لاہور

پسند کی شادی کر رہے ہیں . . .

نہیں عاصمہ . . ! میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا . . .

جاوید . . ! اگر تم ایسا نہیں کر سکتے تو میں زبردستی کسی اور سے ساتھ رخصت کر دی جاؤں گی . . . میں نہیں چاہتی کہ کسی اور کی دلہن بنوں . . . جاوید . . میں فقط تمہاری ہوں . . . تمہاری رہوں گی . . . نہیں تو مر جاؤں گی . .

عاصمہ رونے لگی . . .

پگلی . . رو کیوں رہی ہو . . . محبت کرنے والے کبھی نہیں سوچا کرتے . . . اگر ہماری قسمت میں ہی یہی کچھ لکھا ہے تو ہم مجبور ہیں . . میں نے بے بسی سے کہا . . . جاوید . . ہمت سے کام لو . . . ہمارے لیے یہی مناسب ہے . . . مجھے صرف تمہارے سہارے کی ضرورت ہے . تم کنارہ کشی کیوں اختیار کر رہے ہو . اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو میں سچ مچ مر جاؤں گی . . .

عاصمہ . . ! جذبات سے نہیں عقل سے کام لو . . . ہمارے لیے یہی مناسب ہے کہ حقیقت کو تسلیم کر لیں . . . لیکن وہ نہ مانی . . . وہ اپنی بات پر بضد رہی . وہ میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی . . .

جاوید . . ! اتنے سنگدل نہ بنو . . . خدا کے لیے مجھے اپنا لو . . . نہیں تو میں برباد ہو جاؤں گی . مجھے کھو کر تم بہت پچھتاؤ گے . . میں تمہیں ہمیشہ یاد آتی رہوں گی . . . وہ زار و قطار رونے لگی . . . مجھ سے عاصمہ کے آنسو نہ دیکھے گئے . میں نے بڑھ کر پیار سے کہا . . . میری جان . . ! مت رو . میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تم ہر صورت کسی نہ کسی طریقہ سے اپنا بنا لوں گا . . . ہمیشہ کے لیے . . . اب تو خوش ہو جاؤ . . . پگلی کہیں کی . . ہم دو تین دن بعد شادی کر لیں گے . . .

عاصمہ یکدم خوش ہو گئی اور اس سے بھی مجھے مزید خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا . . . جاوید . . تم کتنے اچھے ہو . . . میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی . . .

نہیں عاصمہ . . ! ایسا مت کہو . . . میں بھی تمہاری طرح تم سے پیار کرتا ہوں . . . اپنی محبت پر کوئی احسان نہیں کرتا . . . اور عاصمہ خوشی خوشی واپس گھر چلی گئی .

عاصمہ کے امی ابو نے اس پر سختی سے پابندی عائد کر دی کہ خبردار اگر تم جاوید سے ملی . . . لیکن وہ کب ماننے والی تھی

وہ متواتر مجھ سے ملتی رہی . . . جس دن ہمارا عدالت میں بیان دینے کا پروگرام بنا اس دن ایک دفعہ پھر قسمت نے میرے ساتھ دھوکہ کیا . . . یکدم میری دنیا میں طوفان آ گیا . . اور میری زندگی کو برباد و ویران کر کے چلا گیا . . .

پروگرام کے تحت میں ٹھیک وقت پر عدالت پہنچا . . اور عاصمہ کا انتظار کرنے لگا . . . تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ چچا بھی ادھر ادھر گھوم رہے ہیں . . . شاید ان کو ہمارے پروگرام کا پتہ چل گیا ہوگا . . .

پانچ منٹ بعد عاصمہ بھی عدالت میں نظر آئی . چچا جان کی نظر جونہی عاصمہ پر پڑی تو وہ غصے سے لال پیلے ہو گئے . انہوں نے عاصمہ کو بازو سے پکڑا اور زبردستی وہاں سے لے گئے . . . میں دیکھتا ہی رہ گیا . . . مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ آگے بڑھ کر عاصمہ کو روک سکوں . . .

انہوں نے عاصمہ کی خوب پٹائی کی اور میرے نام ایک خط لکھ بھیجا . جاوید . ! تم عاصمہ سے دور رہو تو بہتر ہے ورنہ . . . ورنہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے . . یہ شادی ہرگز نہیں ہونے دوں گا . اگر تم اپنی زندگی چاہتے ہو تو عاصمہ کو جواب دے دو . . اور ہاں اسے میرے خط کے بارے میں پتہ نہ چلے . . . نہیں تو تمہاری خیر نہیں . . .

اب میں ایک نئی مصیبت میں پھنس گیا تھا . . امی بھی بیمار تھیں . . . میں عاصمہ کے متعلق سوچنے لگا . اسے تو کوئی نہ کوئی ہمسفر مل جائے گا . اس کی زندگی پھر سے سنور جائے گی . اور وہ اپنی نئی دنیا میں جا کر مجھے بھول جائے گی . . لیکن مجھے میری عاصمہ پھر کبھی نہیں مل سکے . . . میرے دل کا قرار کھو کر رہ جائے گا . میں تو اس کے بغیر ساری یونہی تڑپتا سسکتا اور آہیں بھرتا رہ جاؤں گا . . میرے دل میں بسنے والی عاصمہ کی یاد ہر وقت مجھے ستاتی رہے گی . . میرا دم گھٹتا رہے گا . اور میں یونہی گھٹ گھٹ کر بلکتا رہوں گا . مجھے موت بھی نہیں آئے گی . میں بس اس کے متعلق ہی سوچتا چلا گیا . . . دن بدن گزرتے رہے . اب یونیورسٹی میں بھی میرا دل نہیں لگتا تھا . سارا دن عاصمہ کے انتظار میں ہی گزر جاتا کہ جانے کس وقت وہ آ جائے اور میں اسے دیکھ سکوں . مگر وہ نہ آئی . اس کا یونیورسٹی میں آنا جانا بھی بند کر دیا گیا تھا . . . اب وہ جواب عرض ابو

انہوں نے میری بات مان لی۔ میں عاصمہ کو دیکھنے گیا تو وہ واقعی کسی حور سے کم نہ تھی۔ میں حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا... جب عاصمہ نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں سے موتی آنسو بہہ نکلے۔ میں اسے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا... میں کوئی بات کیے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ اور خدا حافظ کہہ کر واپس آ گیا...

آدھ گھنٹہ بعد بارات چلی گئی... میں اپنے زخمی دل کو تھامے گھر واپس آ گیا... میری طبیعت سخت خراب ہوتی چلی گئی۔ شام تک مجھے بخار تیز ہو گیا۔ عاصمہ کی شادی میرے لیے کسی صدمے سے کم نہ تھی۔ میں اس صدمے کو برداشت نہ کر سکا۔ اس کا مجھ پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔ میں ہر وقت عاصمہ کی یاد میں کھویا رہتا... خیالوں ہی خیالوں میں اس سے باتیں کرتا رہتا دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ کب ہوتی رات... کب دن چڑھتا... میں نہیں جانتا تھا اس طرح ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ ایک دن میں عاصمہ کی یادوں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک میرے دماغ میں یہ خیال آیا..

جاوید... تم کہاں ہو... عاصمہ تمہیں چھوڑ کر کسی اور کی ہو چکی ہے... اب وہ تمہاری نہیں ہو سکتی... تم اس کے بغیر کیسے زندہ ہو... تمہیں کوئی حق نہیں کہ اس کے بغیر زندہ رہو... تمہیں مر جانا چاہیے۔ تاکہ تمام دکھوں سے نجات پا لو...

میں نے اپنی زندگی ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے زہر کھا کر اپنی جان دینے کی کوشش کی لیکن افسوس کہ موت نے بھی مجھے قبول نہ کیا۔ میرے اس اقدام کا امی جان کو بروقت پتہ چل گیا تھا۔ انہوں نے فوراً ڈاکٹر کو بلا کر مجھے دوبارہ دکھ جھیلنے کے لیے مرنے سے بچا لیا...

جب مجھے ہوش آیا تو امی جان خوش ہو گئیں اور مجھے بے تحاشہ پیار کرنے لگیں۔ تم نے ایسا کیوں کیا... تم مجھ دکھیا کو تنہا چھوڑ کر کیوں جا رہے تھے۔ کم از کم اپنی بوڑھی ماں کا تو خیال کر لیا ہوتا۔ بیٹا مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم ایسا کوئی غلط کام ہرگز نہیں کرو گے... بیٹا..! میں تمہارے بغیر کیسے جیئوں گی۔ وعدہ کرو، مجھ سے وعدہ کرو اور میں نے امی جان سے وعدہ کر لیا کہ آئندہ ایسی بات نہیں ہو گی...

امی جان خوش ہو گئیں.. خود ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر میرا حال پوچھا... میں ان کو پہچان گیا۔ وہ میرے ابو کے پرانے دوست تھے۔ ان کا نام ظفر اقبال تھا۔ انہوں نے بھی امی جان کو پہچان لیا۔ وہ عرصہ دس سال بعد امریکہ سے واپس آئے تھے... ڈاکٹر صاحب نے میری خودکشی کرنے کی وجہ پوچھی تو امی نے ساری بات ظفر صاحب کو بتا دی۔ ظفر صاحب بولے...

بھابی..! مجھے بہت دکھ ہوا کہ آپ کے ساتھ ایسا سلوک ہوا... آپ فکر نہ کریں میں آپ کا بھائی ہوں۔ اور بھائی بن کر دکھاؤں گا۔ جب تک میں زندہ ہوں آپ کی خدمت کرتا رہوں گا... اس کے بعد انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور بولے بیٹا.. گھبراؤ نہیں... اب میں یہاں آ گیا ہوں... جہاں تک ہو سکا.. میں تمہارا ساتھ دوں گا۔

ظفر صاحب جانے لگے تو امی جان سے بولے کہ بھابی.. آج کے بعد آپ میرے ہاں رہیں گی۔ میری ایک بیٹی ہے.. نیلا وہ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہو گی اور آپ کے آنے سے ہمارے گھر میں بھی رونق ہو جائے گی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ نیلا کی والدہ وفات پا چکی ہے آپ کے آنے سے اس کا دل بہل جائے گا امید ہے کہ آپ میری بات ضرور مان لیں گے...

امی نے ان کی باتیں سنیں اور اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ اس طرح ہم دوسرے دن ظفر صاحب کے ہاں منتقل ہو گئے۔ میں یہاں آ کر اپنے آپ کو کافی خوش محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ یہاں کا ماحول بہت خوبصورت تھا... میں قسمت کے چکروں کو نہ سمجھ سکا۔ کبھی خوشی... کبھی غم.. ظفر ماموں (اب میں ان کو ماموں کہتا تھا اس لیے کہ انہوں نے خود ہی مجھ سے کہا تھا۔ کہ میں نے بھابی کو بہن بنا لیا ہے۔ لہٰذا میں تمہارا ماموں ہوں۔ مجھے ماموں کہا کرو) مجھے اداس نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہر وقت میری دلجوئی کرتے... میں ان کا احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا... یہ تو خیر ہو کر آتی مہربانی سے پیش آ رہے تھے۔ جب کہ اپنوں نے ہم پر بہت ظلم ڈھائے اور پھر بھی مسکراتے رہے۔ اس دنیا میں ابھی کچھ ہمدرد اور حساس دل والے لوگ بھی ہیں۔ یہ مجھے یہاں آ کر معلوم ہوا۔ میں نے اس ماحول میں آ کر آہستہ آہستہ اپنے آپ کو تبدیل کر لیا... اور حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ اب میں دنیا کی رنگینیوں میں دلچسپی لینے لگا۔ میں ایک نئے دور میں داخل ہو چکا تھا...

دن گزرتے رہے میرا دل اس گھر میں اب لگ رہی طرح لگ چکا تھا میں نے دوبارہ یونیورسٹی جانا شروع کر دیا اس دوران میری انیلا سے بھی ملاقات ہو چکی تھی۔ بعد ہم اکثر ایک دوسرے سے سلام دعا کر لیتے تھے...

انیلا میرے دل کو اچھی لگی... وہ تھی بھی بہت خوب صورت میرا دل اندر سے بہت چاہتا کہ اس سے بات کروں۔ لیکن ماموں جان کی مہربانیاں اور خلوص آڑے آ جاتا تھا۔ اور میں اپنے ارادے سے باز رہتا لیکن میں نے محسوس کیا کہ انیلا بھی کسی طرح مجھ سے بات کرنے کے بہانے تلاش کرتی رہتی ہے۔ کبھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی اور مجھ سے ایک دو باتیں کر لیتی۔

ایک دن میں یونیورسٹی سے واپس آیا۔ تو انیلا میرے کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس سے پوچھا..

انیلا... نازی جان کہاں گئی ہیں...

وہ ذرا بازار تک گئی ہیں۔ انیلا نے جواب دیا اور کہا، آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی میں آپ کے لیے کھانا گرم کرتی ہوں اتنی دیر میں آپ کپڑے تبدیل کر لیں ایک بات اور جاوید اس نے ڈرتے ہوئے کہا... آپ یہاں کمرے سے باہر جائیں نہ کہیں.. یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

میں اس کی بات پر غور کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ کھانا لے آئی... میں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ وہ میرے کھانے کے دوران اپنے کمرے میں جا چکی تھی... کھانا کھا کر میں اس کے کمرے میں چلا گیا۔

آپ خود آ گئے... انیلا نے کہا۔

ہاں... میں نے محسوس کیا کہ تم مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی ہو۔ کرو.. میں اسی لیے حاضر ہوں

ہاں جاوید.. آپ سے بہت اہم کام ہے۔ سوچتی ہوں کہیں آپ انکار نہ کر دیں..

انیلا تم کہو.. کیا کہنا چاہتی ہو... تم بلا تکلف کہو..

جاوید..! میں صاف صاف بات کرنے کی عادی ہوں۔ آپ نہ جانے میرے بارے میں کیا کیا سوچ رہے ہوں گے... لیکن میں اب بے دھڑک ہو کر کہتی ہوں.. کہ آپ جب سے آئے ہیں... اسی دن سے مجھے بہت اچھے لگنے لگے ہیں۔

... میں... آپ سے... ہم... محبت کرتی ہوں اس نے گھبراتے اور شرماتے ہوئے آخر اپنے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔

میں آئیڈیل کی تلاش میں تھی... وہ مجھے آپ کی صورت میں مل گیا ہے... جاوید صاحب۔ اب آپ ہی میرا آئیڈیل ہیں... میری قسمت ہیں۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی... وہ میرے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ میں خاموش کھڑا رہا۔

جاوید صاحب... آپ خاموش کیوں ہیں۔ کچھ تو بولیں کچھ تو جواب دو...

انیلا..! میں نے ٹھہر کر کہا... میں تمہیں کیا جواب دوں.. مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آ رہیں... میں نے بہانے کے انداز میں کہا۔

آپ صرف اتنا کہہ دیں کہ میں بھی آپ سے محبت کرتا ہوں... میرے لیے یہی کافی ہے۔

نہیں انیلا.. یہ کیسے ہو سکتا ہے... مجھے تم سے محبت نہیں ہے... میں نے ایک بار صرف اور صرف عاصمہ سے محبت کی تھی.. اور زندگی بھر کرتا رہوں گا... میں نے لیکن اسے صاف کوئی سے جواب دے دیا۔

جاوید..! ایسا مت کہیں... آپ کو میری محبت کا اقرار کرنا ہوگا... ورنہ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں گی... میری التجا ہے کہ مجھے آپ اپنا بنا لیں... دیکھیں میں آپ کی منت کرتی ہوں... میرا دل نہ توڑیں... نہیں تو میں مر جاؤں گی...

جاوید صاحب.. آپ مجھے ہاں میں جواب دیں.. انیلا نے سسکی بھری۔

انیلا کی باتیں سن کر میں عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا جواب دوں.. کافی سوچ بچار کے بعد میں اس فیصلے پر پہنچا کہ میں انیلا کو اپنی شریک حیات بنا لوں... نہیں تو کوئی اور طوفان نہ اٹھ کھڑا ہو۔ میں نے کہا۔

انیلا..! میں نے آواز دی

جی..! اس نے دھیرے سے کہا۔

اگر میں ہاں کر دوں تو تمہارے ابو جان نے انکار کر دیا

آپ ابو کا فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیں۔۔۔ وہ میرے اچھے ڈیڈی ہیں۔ میری ہر بات مانتے ہیں۔۔ اور یہ بات بھی مان جائیں گے۔۔ صرف آپ ہاں کہہ دیں۔۔ میں آپ کے ساتھ قدم ملا کر چلنا چاہتی ہوں۔۔۔

اچھا انیلا۔۔۔ اگر یہ بات ہے تو پھر میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے۔۔۔ میں بھی تم کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ انیلا خوشی سے جھوم اٹھی۔

آپ کتنے اچھے ہیں جاوید صاحب۔۔ میں آپ کی احسان مند رہوں گی۔۔۔

اچھا انیلا۔۔۔ اب میں چلتا ہوں۔ میں کھڑے ہو کر یہ الفاظ کہے۔۔

جاوید صاحب۔۔! میں آج ہی ابو سے بات کروں گی۔۔ اور وہ میری بات ضرور بر ضرور مان جائیں گے۔ اس نے یقین ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر سوچ لو۔۔۔ میں نے کہا۔

میں نے سوچ لیا ہے۔۔۔ لیکن آپ وعدہ کرتے جائیں آپ ٹھکرا تو نہیں دیں گے۔

میرے ہاں کرنے پر وہ بہت خوش ہوگئی جیسے کوئی بہت بڑا خزانہ اسے مل گیا ہو۔۔۔ میں نے اس سے وعدہ لیا اور مسکراتا ہوا وہاں سے رخصت ہوگیا۔

دوسرے دن ظفر ماموں نے امی جان سے بات کی کہ میں جاوید کو اپنا بیٹا بنانا چاہتا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض اعتراض تو نہیں ہے

امی جان کا مارے خوشی سے برا حال تھا۔۔ ہنستی ہوئی بولیں بھائی صاحب۔۔! مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔۔۔ انیلا مجھے بہت پسند ہے۔ اور وہ میرے جاوید بیٹے کو بھی بہت پسند ہے۔۔۔ مجھے اس سے اچھا رشتہ بھلا اور کہاں سے ملے گا۔۔ میں انیلا کو اپنی بیٹی بنا کر بہت خوشی محسوس کروں گی۔۔۔

ہم ان کے مزید احسان مند ہو گئے۔۔۔ خوشیاں ایک بار پھر لوٹ آئیں۔۔۔ اور میری شادی انیلا سے ہو گئی۔ ظفر ماموں نے ساری جائیداد میرے نام کر دی۔ اور بزنس کا سارا نام مجھے سونپ دیا۔۔۔ امی جان بھی بہت خوش تھیں۔۔۔

انیلا بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی۔۔۔ وہ میرا بہت خیال رکھتی۔۔۔ میری ذرا سی پریشانی اس سے نہ دیکھی جاتی تھی۔۔۔ اسی طرح میں بھی انیلا کو دل و جان سے پیار کرتا۔ عزیز جانتا۔۔۔ اور ٹوٹ کر چاہتا تھا۔

ہماری زندگی ایک نئی ڈگر پر چل نکلی۔۔۔ میں اللہ تعالیٰ کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایک بار پھر عزت۔۔ دولت۔ شہرت۔ اور بہت اچھی بیوی عنایت کر دی۔۔۔ میرے ویرانے بہاروں میں بدل دیے۔۔۔ میرے اجڑے چمن کو سرسبز و شاداب بنا دیا میرے دل کی مرجھائی بند کلی کو ایک دلکش پھول بنا دیا ہے میرے ہر طرف بہاریں ہی بہاریں رقصاں کر دیں۔۔

اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والے لوگوں سے ضرور انتقام لیتا ہے۔۔۔ آج چچا۔۔ اور چچی بھی در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔۔۔ کوئی ان کی سنتا نہیں۔۔۔ اور اپنے کیے کی سزا پا رہے ہیں۔

چچا پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور جس سے ان کا ایک بازو بے کار ہو گیا ہے۔۔۔ عاصمہ ایک خوبصورت بچے کی ماں بن چکی ہے۔۔۔ اس نے اپنے بچے کا نام بھی ضرور ہی رکھا ہے۔۔۔ میرے محسن کا نام۔۔ اس کا ایک خط میرے پاس آیا تھا جس میں لکھا تھا۔

ڈیئر جاوید۔۔۔!

میں اب بھی تمہاری ہوں۔۔۔ میں یہاں سکون کی زندگی بسر نہیں کر رہی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کسی اور کی ہوں۔ لیکن میرا دل۔ اب بھی تمہارے ہی نام پر دھڑکتا ہے۔۔ میری کامنا ہے کہ جیسے ہر اچھا شوہر اپنی بیوی کا خیال رکھتا ہے۔۔۔ ایسے ہی اس کا خیال رکھنا۔۔۔

میں انیلا کو بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اس کا خیال رکھتا ہوں۔ ہم دونوں اور ماموں جان، امی جان نہایت خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔

***

ہائے افسوس وہی ہیں دشمن، جاں جن پہ فدا کرتا ہوں
نہ جانے کیوں تبدیلی ہے، وفا کس سے پیار کرتا ہوں!

(ڈاکٹر نذر محمد ضیا مرزا، رضا ٹاؤن)

تحریر: میاں سعید شاہد موروثی ٹوبہ ٹیک سنگھ

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

تسلیمات... شہزادہ بھائی ایک زمانہ کھوجتا ہوا آپ تک پہنچا ہوں۔ یہ آس دل میں لیے کہ شاید آپ کی دست شفقت میں اپنے آپ کو پا سکوں کہ ایک عرصہ سے زمانے کے حوادث کا شکار ہوں۔ شاید آپ کی نظر عنایت اور شفقت سے میں اپنے مجسمہ کو مجتمع کر لوں کہ دنیا کے ظالم رسم و رواج کو سہتے سہتے بکھر چکا ہوں۔ ہاں شہزادہ بھائی، میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں... میں خود سے بچھڑ گیا ہوں.. مجھ سے میرا اختیار چھین گیا ہے مجھے کسی نے انگلی پکڑ کر بہکا دیا ہے۔ میرے اس درد کا تاثر آپ کو کہانی کے شروع میں ملے گا۔ مجھ ہر سطر نہیں بلکہ ہر ہر لفظ میں مستور ہے۔ زخم ابھی کچا ہے، رستے رہے گا تو انشاءاللہ تعالیٰ قطرہ قطرہ صفحۂ قرطاس پر ٹپکا دوں گا۔ فی الحال تو میں ہی مجرم ہوں... اس ظالم دنیا والوں کے سامنے بھی مجھے ہی سزاوار ٹھہرایا گیا ہے مگر... مگر... سب کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پر گزر گئی

دنیا تو لطف لے گی میرے واقعات میں
میرا تو جرم تذکرۂ عام ہے، مگر
کچھ دھجیاں ہیں میری زلیخا کے ہات میں

اور شہزادہ صاحب! یہ دھجیاں میری ڈائری کے ایک ایک ورق پر لفظوں کے روپ میں بکھری پڑی ہیں۔ جب منظر عام پر آئیں تو یہ نہ صرف مجھے بے گناہ ہی ثابت کریں گی، بلکہ میری معصومیت اور میری وفا کی بھی قدر ہوگی۔ اور یہی وقت ہوگا جب میں اپنے آپ کو سمیٹ لوں گا... اپنے آپ کو پانے میں کامیاب ہو سکوں گا.. میری انا کو تسکین ملے گی...

شہزادہ صاحب! میری زیر نظر کاوش... "صلیب زیست"... کا تسلسل ہی اس کی جان ہے... جو واقعہ یا کڑی جہاں بھی ملی وہیں پیوستہ کر دی۔ شاید کوئی دوست مرقانا کے المیے کو ادھورہ ہونے کا گلہ کرے۔ تو عرض کر دوں کہ مرقانا شاقب کو آپ بیتی سن کر واپس گوجرانوالہ گیا تھا۔ اپنے پیارے اور محترم قارئین کی ہر طرح کی آراء کا فراخدلی سے استقبال کروں گا... اس کے ساتھ ہی ساتھ میں اپنے پیارے جواب عرض کی مزید ترقی کے لیے دعا کرتا ہوں...

آپ سب کا اپنا... میاں سعید شہزاد مورو ڈی پوری چک نمبر ۲۷۸ / ر ب مورو ڈی پوری براستہ مرید والا تحصیل وضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ۔

---

۶ جون ۱۹۷۹ء گرمی کی شدت کا پہلا دن تھا۔ میں سارا دن کمرے میں بند خود کو پنکھے کی گرم لو سے جلاتا رہا اور جب سورج خود کو افق کی لکیر دن کے قریب کھینچ کر لے گیا تو میں کمرے سے باہر آیا اور اپنے کھیتوں کی جانب نکل گیا۔ اگرچہ اب گرمی میں دوپہر کی سی شدت تو نہیں تھی مگر ہوا بند ہونے کی وجہ سے حبس اور گھٹن کا احساس اب بھی شدید تھا... رات کے سایے ذرا گہرے ہوئے تو مدہم ہوا کے جھونکے ہلکورے لینے لگے۔ جس سے فضا میں ہلکی ہلکی خنکی کا احساس جاگنے لگا۔ نیلے سے چاند نے اپنی نورانی کرنیں رنگ دے زمین پر پھیلائیں تو ننھے منے پرندے درختوں کی شاخوں میں دبکنے لگے۔ میں نے ڈیرے پر لگے نلکے پر جسم کو ٹھنڈا کیا اور بالوں سے پانی جھٹکتا ہوا آموں کے باغ میں آ گیا۔ ہوا پہلے سے تیز ہو چکی تھی۔ جسم پر چمکی پانی کی بوندوں سے ہوا ٹکراتی تو سارے دن کی گرمی سے جھلسا ہوا بدن سرشاری میں بدل گیا...

جیسے تھی۔ وہ اب بھی مجھے پیار سے دیکھا کرتی تھی۔۔۔ مگر میری مسکراہٹ نہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔

شاید تم یہاں محو استراحت ہو۔ ادھر آپ کا دوست دو گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہا ہے

میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو میرا دوست مجھ سے بالکل قریب کھڑا مجھ سے مخاطب تھا میری جاگتی آنکھوں کے المناک خواب کا شیرازہ بکھر گیا۔ میں نے چارپائی پر اٹھ کر بیٹھے ہوئے تحمل   سے پوچھا۔۔

کون آیا ہے شاکر۔۔؟۔۔

میں نے اسے پہلے دیکھا تو نہیں۔ البتہ اپنا نام عرفان بتایا ہے۔ اور چشتیاں سے آیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ اور میں سر جھٹک کر شاد کے ساتھ گھر چلا آیا۔

عرفان سے میری پہچان ۱۹۷۵ء کے وسط میں چشتیاں میں ہوئی تھی۔ بعد میں ہم دونوں ایک دوسرے کے اتنا قریب آگئے کہ چند لمحوں کی دوری بھی گراں گزرتی تھی۔ ان دنوں میں خود چشتیاں قیام پذیر تھا۔ جولائی ۱۹۷۰ء میں واپس اپنے آبائی گاؤں آگیا۔ آئندہ دس ماہ میں میں چشتیاں کے تین چکر لگا آیا تھا۔ مگر عرفان پہلی دفعہ آیا تھا۔ رات کھانے کے بعد ہم دیر گئے۔ یاد رفتہ کے تعاقب میں بھاگتے رہے۔ اور پھر جب مجھے نیند آنے لگی۔ تو میں نے مسکرا کر عرفان سے معذرت کی۔۔ اور پہلو بدل لیا۔ مگر عرفان نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

شاہد۔۔! میں یہاں سونے نہیں بلکہ اپنے انتہائی پیچیدہ مسئلے کا حل ڈھونڈنے آیا ہوں۔ اپنے مقدر کی نیند تو شاید میں سو چکا۔ ایک دوست ہونے کے ناطے کیا تم آج کی رات میرا ساتھ نہیں دو گے۔۔؟

میں نے پہلو بدل کر حیرت سے عرفان کی طرف دیکھا وہ سنجیدہ تھا۔ اور اس کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

عرفان یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔۔؟ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔ عرفان کا کھنڈر کی طرح چہرہ دیکھ کر میرے شعور کی دنیا بھی مرقع الم بن گئی تھی۔ میں نے آج تک اس کے منہ سے ایسی باتیں نہیں سنی تھیں۔

وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا والد معاشرے کا ایک اعلیٰ شخص تھا۔ دو مربع سے زائد قابل کاشت اراضی تھی۔ ڈیکٹر تھا۔۔ نوکر تھے۔۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز عرفان کے تصرف میں تھی۔ پھر یہ بہکی بہکی باتیں کیسی۔۔ اس نے شاید میری پکار نہیں سنی تھی۔ وہ لاشعور کو مل رہا تھا۔ اور اندھیرے میں خلاؤں کو گھور رہا تھا۔ میں اپنی چارپائی سے اٹھ کر اسی کی چارپائی پر آگیا۔ میں نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے اپنے سوال کو دہرایا تو اس کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں تیرنے لگیں۔ جو چاند کی مدہم روشنی میں چمک رہی تھیں۔ اس کے جسم میں رعشہ طاری تھا۔ اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔

اس نے بمشکل مجھ سے پانی مانگا۔ قریب پڑے واٹر کولر سے میں نے اسے گلاس بھر کر پانی دیا۔ جسے پی کر وہ پہلے کی طرح پرسکون نظر آنے لگا۔ اور چند لمحوں کے توقف کے بعد خود ہی بولا۔

شاہد۔۔! ابا جان میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔

عرفان۔۔! وہ کہو جس کے لیے اتنے پریشان ہو۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ پریشانی شادی کا سبب نہیں ہو سکتی۔۔

کاش یہ پریشانی شادی کا سبب نہ ہوتی۔۔۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے شاہد۔۔۔

مگر تم تو اپنی محبت اور منگیتر کے گیت گایا کرتے تھے۔ ہر صبح اس کے خواب سنایا کرتے تھے۔ تم تو کہا کرتے تھے کہ تمینہ میری نیند ہے۔۔ آرام ہے۔۔ سوچ ہے۔۔ جان ہے پھر۔۔۔ پھر بے قراری کیوں۔۔؟ میں نے اضطراب سے پوچھا۔

شاہد۔۔! دکھ تو اسی بات کا ہے کہ میرے خوابوں کی تعبیر بہت بھیانک نکلی۔ میرا سب کچھ لٹ گیا۔ اور میں خود ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں میں بکھرنے کو ہوں۔ آج اگر آپ نے سہارا نہ دیا تو شاید آپ کا عرفان واقعی بکھر جائے۔

عرفان کا ہاتھ میرے شانے پر پڑا کانپ رہا تھا وہ میری طرف یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی ستم رسیدہ فقط ہمدردی کے چند بول سننے کے لیے بیقرار ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہہ کر تسلی دوں۔ اور کیا کہہ کر تسلی دوں کہ میں تیرا دوست ہوں۔ اب تو عرفان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی واضح تھی۔

عرفان۔۔! یقین کرو میں وہی ہوں۔ وہی جسے تم ہر موقع پر آزما چکے ہو۔ اس وقت تمہیں میری ضرورت ہے تو پہلے سے بھی زیادہ مجھ پر اعتماد کرو۔۔۔

مجھے بتاؤ عرفان : تم شادی سے اتنے ہراساں کیوں ہو..؟ کیا تمینہ سے تمہیں پیار نہیں رہا..؟ کیا تم اس سے شادی نہیں کرنا چاہتے..؟ کیا اس نے تم سے بے وفائی کی ہے.. تم سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیا اس کے دل میں میل..؟.

نہیں شاہد نہیں . . وہ پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجا کر بولا ..

تمینہ تو میری زندگی ہے .. میری جان ہے خدا کرے وہ جہاں کہیں رہے، خوش رہے۔ میری تو ہر دعا اس کی خوشی کے لیے ہے۔ اور ہر آہ اس کے درد کے لیے..

جہاں رہے خوش رہے .. میں نے بے اختیار زیرِ لب دہرایا وہ حسرت بھری آہ اور پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

شاہد.. تمینہ کی تین ماہ قبل شادی ہو گئی تھی۔ وہ تلخ سی ہنسی ہنسا۔ اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کی آہ اور مسکراہٹ کا امتزاج میرے دل پر آرا چلا گیا... میں نے شدتِ کرب سے چلا کر کہا۔

تو تمینہ نے آپ سے بے وفائی کی ہے..؟

وہ پھر مسکرا دیا۔ مگر اس کی مسکراہٹ مرغِ بسمل سے کہیں زیادہ کرب انگیز تھی۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا۔

نہیں شاہد تمینہ کی وفاؤں کے سہارے تو زندہ ہوں بے وفائی اس نے مجھ سے نہیں .. میں نے اس سے کی تھی۔ میں نے اسے ٹھکرایا تھا شاہد..!

یہ تم کیا کہہ رہے ہو عرفان۔ ؟ میں نے بوکھلا کر اس سے کہا۔

میں سچ کہہ رہا ہوں شاہد! میں نے اس سے بے وفائی کی تھی۔ وہ چیختی رہی.. چلاتی رہی۔ اس نے اپنی وفاؤں کی مجھے قسمیں دیں . . مجھے میرے وعدے یاد دلائے۔ ان جگہوں کے تقدس کا احساس دلایا.. جہاں ہم ملا کرتے تھے۔ مگر میرے عزم میں جھول نہ آیا۔ تمینہ نے مجھ سے رو رو کر التجائیں کیں اور کہا۔

عرفان مجھے اس لڑکی کا نام بتا دو۔ میں اس کے پاؤں پکڑ لوں گی اپنی ساری خوشیاں اس کے دامن میں بکھیر دوں گی۔ میں کائنات کی ہر نعمت اس کے قدموں پر نچھاور کر دوں گی۔ اور اس کے بدلے صرف اور آپ کو مانگوں گی۔ اگر وہ یہ سب لے کر بھی مانی تو میں اسے آخری التجا یہ کر دوں گی کہ مجھے اپنی کنیز بنا کر ساتھ لے چلے۔ مگر مجھے میرے محبوب کے در سے نہ اٹھائے۔

عرفان خاموش ہو کر سسکنے لگا۔ تو میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

پھر.. پھر کیا ہوا عرفان . ؟ میرے حلق سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلیں

پھر کیا ہونا تھا شاہد.. وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بولا . میں نے اپنے ماں باپ کے ملکے پیشِ نظر تمینہ کی ہر خواہش کو ٹھکرا دیا۔ اور اس کی ہر آہ کو نظر انداز کر دیا ماں باپ کے حکم کے پیشِ نظر بس.. اور اب کیا بتاؤں میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔

شاہد تمہیں علم ہے کہ تمینہ میری ماں کی بھتیجی اور میری خالہ کی لڑکی تھی۔ سو میری والدہ نے بہت پہلے.. جب ہم چھوٹے چھوٹے تھے۔ ہماری منگنی کا اعلان کر دیا تھا۔ جب میں نے شعور کی دنیا میں قدم رکھا تو اس موہنی گڑیا کو دیکھ کر خود پہ رشک کرنے لگا اور جب میں جوان ہوا تو گھر کے افراد ہمیں ایک دوسرے کا نام لے کر چھیڑنے لگے اس چھیڑ چھاڑ پہ بظاہر ہم چڑ جاتے.. مگر جی چاہتا کہ اہلِ خانہ ہمیں یونہی تنگ کرتے رہیں . کتنی لذت تھی اس احساسِ ندامت میں...

عرفان ایک دفعہ پھر خاموش ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ شاید وہ ہچکی دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ پھر بولا۔

بات پکی ہو چکی تھی . . . مگر پھر بھی وعدے ہوتے رہے فضاؤں میں وصل کے تقدس کے پھول کھلتے رہے اور ہر سو رنگ ہی رنگ بکھرتے رہے۔ مگر اچانک سحر انگیز بہار بعد پر خزاں مسلط ہو گئی۔ ابو کے اس فرمان پر سارے خاندان کو سانپ سونگھ گیا۔ کہ میں عرفان کی شادی خاندان سے باہر کروں گا۔ ابو نے مجھ سے پوچھا۔ مگر ان کا تیور دیکھ کر میں چاہنے کے باوجود ان کی بات رد نہ کر سکا۔ شاید اس لیے کہ آج تک میں ابو سے مانگتا آیا تھا۔ اور آج انہوں نے مجھ سے اپنے اعتماد اور وقار کی سند مانگی تھی۔ امی ابو کے اس رویے پہ سکتہ زدہ ہو گئیں۔ اور خالہ اپنی عزت کی بنا پر اپنے تہی دامن میں آنسو تو بھر سکتی تھیں مگر مجھ جیسی قیمتی چیز کی بھیک مانگنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھیں۔ ابو کے خیال میں ایک ہیرا تھا جس کا اصل مقام کوئی قیمتی ہار تھا۔ اور اس ہار کا مقام کوئی مرمری گردن، ایسی گردن جس پہ بیج اطلس، کمخواب کا جسم ہو۔ کسی ایسے پودے کے خواہاں تھے۔ جو بھری بہار میں پھولوں سے

. .

بیں مادہ خوش تھا اور پورا خاندان حیرت افزا . . گو احباب میرے ضمیر کی آواز تھے مگر ابو سامنے سب میری طرح بے زبان تھے.

میں ہر روز عزم نو کے ساتھ ابو کے سامنے جاتا اور ان کی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ یہ الفاظ میرے عزم کے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتے کہ بیٹا تو نے میرا بھرم رکھا ہے . دیکھو میں تیرے لیے کیسی چاند سی دلہن لاتا ہوں .

اور پھر چند روز بعد پتہ چلا کہ تمینہ کی شادی ہوگئی ہے. میرے اردگرد آندھیاں چلیں . جنہوں نے کائنات کا ہر حسن مسخ کر دیا. سورج سے اس کی جلالت . . چاند سے اس کا نور . . تاروں سے اس کی روشنی . . پھولوں سے مہکار اور طائرانِ خوش نوا سے ان کی چہکیں چھین لی . اس کے گلستان یاس کے صحرا میں بدل گئے . اور میرے دل کی کائنات کا سب سے بڑا اور روشن ستارہ مجھے دھندلکوں میں چھوڑ کر اپنے پیچھے ناامیدی کی لمبی اور گہری لکیر چھوڑتا ہوا کسی اور کے دامن میں جا گرا.

موسم بدلتے رہے . . . سردی گرمی خزاں بہار . . . مگر میرے دل کے چمن پر ہمیشہ خزاں ہی مسلط رہی . کوئل کوکتی تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے کسی انسان کی یاد میں نوحہ گا رہی ہو . بادل گرجتے اور برستے تو یہ احساس ہوتا کہ اپنی بدنصیبی پر دھاڑ دھاڑ کر برس رہے ہیں . کسی دکھی کے دل کی پکار اور کسی برہن کی آنکھوں کی طرح . . شہنائی کی طرح گونج مجھے کسی نصیب جلی سولہ سالہ بیوہ کی چیخیں محسوس ہوتیں . اور صحن کے کواڑ سے لگ کر خاموش انتظار مجھے مرغ بسمل کی تڑپ دکھائی دیتا .

شاید یہ کانٹے میں نے خود اپنی راہوں میں اپنے ہاتھوں سے بکھیرے تھے . اس امید پر کہ بہت جلد میں انہیں اپنی پلکوں سے چن ڈالوں گا . مگر نہیں معلوم تھا کہ میں نے ضدی باپ کی ضد پر اپنا جسم انگاروں پر پھینک دیا ہے . صرف اس لیے کہ میرے باپ کا نام نہاد وقار معاشرے میں قائم رہے . اگر ان کے چہرے کا خول میں نوچ لیتا تو گاؤں کی پنچایت زبردست قہقہہ لگاتی اور اور یہ مذاق میرے باپ کی نسیں پھاڑنے کے لیے کافی ہوتا . تمینہ مجھ سے شکوہ کیے بغیر میری دنیا سے نکل گئی . . .

اور میں چھوٹے وقار کی بے رحم چکی میں پستا رہا . ادھر ابو میرے سینہ لیتے رہے . ابو کا ذہن نصیح و وسیع اور چابکدست تھا. چنانچہ ہر چہرہ نشانے پر بیٹھتا رہا . مگر انسانی ذہنی بلاغت و فراست کی جولانیاں اور خداوندی حکمت و حشمت سے تو نہیں بڑھ سکتی . ادھر ابو اپنے ایک دوست کے ساتھ بساط پر بیٹھا تھے اور ادھر ابو کے دوست کی بیٹی ہم سے بھی زیادہ زور والے شہاب کے ساتھ بساط پر بیٹھی تھی . ان دونوں نے ایک دوسرے کو نہ ہرانے کی قسم کھا رکھی تھی . تاکہ وہ دونوں تادم زیست یونہی بازی پر بیٹھے رہیں . ابو نے کچھ دیر انتظار کیا اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ میرا دست احسان میرے اور اپنے درمیان بازی کی بجائے شہاب اور اپنی لاڈلی کے کھیل میں دلچسپی لینے لگا ہے . تو با دل نخواستہ انہیں اپنا بھی نقطہ بدلنا پڑا .

آج ابو کی باتوں میں عجیب سا احساس ندامت تھا . وہ امی سے چھپ چھپ کر باتیں کر رہے تھے . امی خاموش تھیں . اور میں گونگا ہی نہیں بہرہ بھی بن گیا تھا . میرے تجسس کی دنیا تو اسی دن اجڑ گئی تھی جس دن ثمینہ سے اپنی وفاؤں کے خون میں ہاتھ رنگے تھے . یہ خون میں نے کیا تھا . اور اس نے مٹھی میں بھر کر اسے چوم لیا تھا . اس نے میری کوتاہ نظری کو میری خوشی جان کر قبول کر لیا تھا . یہ اس کی محبت کی معراج تھی کہ اس نے مجھے بے وفا بھی نہیں کہا تھا .

دن یونہی گزرتے رہے . . . ہر صبح اپنے دامن میں گرد و غبار لیے طلوع ہوتی رہی . اور یہ گرد میرے دل کی فضائے بسیط پر بکھرتی رہی . ایک دن میں گھر میں داخل ہوا تو صحن میں مجھے امی اور ابو کے تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی . میں ڈیوڑھی میں رک گیا . . .

ابو کہہ رہے تھے کہ مجھے اپنے بیٹے سے دشمنی نہیں . میں یہ کام سوچ سمجھ کر اس کی بہتری کے لیے کرتا ہوں . مجھے بتاؤ آخر تمہاری بہن کے پاس تھا ہی کیا . . ؟ ہر روز تمہاری زبان سے ایک ہی فقرہ سن کر مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ تم مجھے پاگل سمجھتی ہو . کان کھول کر سن لو . آئندہ میں تمہاری زبان سے اس چڑیل کا نام نہ سنوں . .

جانے ابو نے امی سے اور امی نے ابو سے کیا کہا تھا . بہر حال یہ ان کی اس نشست کا آخری مرحلہ تھا . امی سہم کر الگ بیٹھ گئیں . اور ابو کمرے میں چلے گئے . میں کئی لمحے وہاں کھڑا اپنی بدنصیبی جواب عرض لاہور

پھر آنسو بہاتا رہا۔ اور پھر میں لڑکھڑاتے قدموں سے اندر چلا گیا۔ امی اس وقت باورچی خانے میں تھیں اور یقیناً رو رہی تھیں مگر مجھ میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو سامنے والے کمرے سے ابو باہر آ رہے تھے۔۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور اپنے پیچھے آنے کا کہہ کر دوبارہ کمرے میں چلے گئے۔۔

جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنا حقہ سیدھا کر کے تکیے سے ٹیک لگا چکے تھے۔ انہوں نے مجھے قریب پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھا تو وہ کتنی ہی دیر میرے چہرے پر کچھ پڑھتے رہے۔ اور پھر حقہ پینے لگے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولے۔

بیٹا احسان اپنی بیٹی کے ہاتھوں شکست کھا گیا ہے۔۔۔ پھر بڑبڑائے۔

پتہ نہیں احسان کو کیا ہو گیا ہے۔ بیٹی اس کے سامنے دندناتی پھرتی ہے۔ اور وہ خاموش ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتا کہ لوگ کیا کہہ رہے ہوں گے۔ میں اسے عقلمند سمجھتا تھا مگر پاگل نکلا۔ جس نے لوگوں کو کھل کر باتیں کرنے کا موقع دیا۔

کل وقتا بیوں اور جدت طرازی تو زمانے کا اصول بن گیا ہے وہ پاگل نہیں، عقلمند نکلا ابا جان۔۔ جس نے چند لمحوں کا سکون بیچ کر ایک ابدی قرار خرید لیا ہے۔ بیٹی کو آخر سے بیاہنا ہی تھا۔ عرفان نہ ملا شہاب سہی۔

عرفان ایک زمیندار کا بیٹا تھا۔ اور شہاب زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تاجر کا بیٹا تھا۔ عرفان کا ورثہ کیا تھا؟ زیادہ سے زیادہ آٹھ لاکھ ادھر شہاب دوگنے کا مالک ہے۔

یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو عرفان۔۔؟ ابو غرائے۔

انسان کا سب کچھ ورثہ نہیں ہوتا۔ شرافت بھی کسی چیز کا نام ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ایک مرد کا قول ہے جو احسان نے مجھے دیا تھا۔۔

قول تو امی نے بھی اپنی بہن کو دیا تھا میں اندھی آواز میں نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

عورتوں کے قول کو چھوڑو بیٹا۔ اگر عورت کے ہاتھ سب اختیارات دے دیے جائیں تو دنیا تباہ ہو جائے۔۔

ابو اپنی دانش پر مسکرائے۔

مگر ابو آپ اپنے زمانے کی بات کر رہے ہیں۔ اس زمانے کی جب عورت بہری بھی تھی اور گونگی بھی۔۔۔ اسے چاہے کسی کھونٹے سے باندھ دیا جائے۔ وہ بندھی رہتی تھی۔ بے چوں و چرا بندھی رہتی تھی۔ چاہے اسے چارہ نہ ملے یا ملے ابو یہ اس زمانے کی بات ہے جب عورت کے جذبات سے ہر نگاہ قطع نظر تھی۔ بلکہ عورت اس احساس سے بیگانہ تھی۔ مگر آج کی عورت اپنے آپ کو مہذب کہنے لگی ہے۔ انہوں نے اپنی عہد بقا کے نئے اصول تلاش کر لیے ہیں۔ ابو آج کی عورت کہتی ہے کہ وہ مرد کے شانہ بشانہ چل سکتی ہے یہ صرف عورت کا دعویٰ ہی نہیں بلکہ وہ بیشتر میدانوں میں عملی طور پر بھی آ چکی ہے۔ جہاں تک مسئلہ شادی کا ہے تو یہ نئی پھلواڑی کہتی ہے کہ شادی کا مقصد دو جسموں کو یکجا کرنا نہیں۔ بلکہ دو ذہنوں کو یکجا کرنا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ احسان بے غیرت ہو گیا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ قدرت نے اس کے انداز تفکر کو جلا بخشی ہے۔ اگر آپ کی طرح سوچتے ہوئے وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیتے اور فرزانہ کی سوچیں میری بجائے شہاب کی یادوں کے گرد رقص کرتیں تو بتاؤ آپ اسے شادی کہتے۔۔

ابو بتاؤ اگر آپ کی ہمدردیاں اور میرا پیار فرزانہ کو انگارہ محسوس ہوتا تو آپ اس جلن کو کس طرح ٹھنڈا کرتے۔ آپ پریشان ہو رہے ہیں حالانکہ آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ اس دن کے تصور سے ہی کانپ جانا چاہیے۔ جس دن فرزانہ کے ارمان میرے گھر کے بند دروازوں کے پیچھے شہاب کے لیے تڑپتے۔۔۔ میں نے خاموش ہو کر ابو کی جانب دیکھا تو ان کے چہرے پر دھواں اٹھ رہا تھا۔۔ وہ بولے۔

نہیں۔۔ نہیں بیٹا۔۔ میں اس لیے پریشان نہیں ہوں کہ بیٹا۔۔ فرزانہ میری بہو نہ بنی۔۔ مجھے تو صرف احسان کی نادانی پہ حیرانگی ہے۔ میں نے کہا:۔

ابو جان۔۔! احسان کی نادانی پر خوش ہونے کی بجائے، خوشی منائیے کہ آپ کو مجھ جیسا بے زبان بیٹا مل گیا۔ ٹھہرا ہوا پانی جس کے آگے بند نہیں باندھنے پڑتے ورنہ اٹھتی جوانی اور بہتے پانیوں کو کون روک سکا ہے۔ شوریدہ سرحد بدلا

جواب عرض لاہور

اللہ کے فیصلوں کو کون بدل سکا ہے . . . .

خیر چھوڑو ان باتوں کو . . . مجھے بتاؤ تمہیں اس کا غم تو نہیں . میرا مطلب ہے کہ کسی کو یوں بلاوجہ ٹھکرا دیا . غم . .

غم کا ہے کا غم . . میں نے ابو کا فقرہ کاٹ کر کہا . . . ماں باپ کے ہوتے ہوئے میں کیوں غم جھیلوں . . ٹھیک آپ نے ٹھکرایا تو وہ غم اسی کا مقدر بن گیا . . . آج زمانہ نے مجھے ٹھکرایا ہے . تو اس غم کو آپ سینے سے لگالیں . . .

ابو جو کافی دیر سے خلافِ معمول درتو تع میرے منہ سے طنزیہ کلمات سن رہے تھے آخر خود پر اختیار نہ رکھ سکے . . . وہ بھرائی آواز میں بولے .

تو گویا تم بھی مجھے کم ظرفی کے طعنے دینے لگے ہو . میرے سامنے بڑبڑانے لگے ہو . . .

میں آپ سے شکوہ کروں . . یہ مجال کہاں اباجان اور چلا جاؤں گا کہاں . . . میں تو اس دن بھی خاموش رہا . جس دن طوفان اٹھے تھے . اور کلیوں کو پاؤں تلے روندا گیا تھا . اس دن میں آپ کی خوشی کا طرفدار بن گیا تھا . اور آج آپ کے غم کا حصہ دار بن گیا ہوں .

ماں کے ذہن کا زہر تمہاری رگوں میں سرایت کر گیا ہے . وہ پھنکارتے ہوئے باہر نکل گئے . اور میں آج پہلی دفعہ سسک سسک کر رو دیا . پھر ایک دن میں نے ابو اور تایا کو سر جوڑے بیٹھے دیکھا . اسی شب ابو نے مجھ سے کہا .

بیٹا . . تمہارے تایا تمہیں اپنی فرزندی میں لینے پر بضد ہیں . .

مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرا ذہن میری کھوپڑی سے اچھل گیا ہے . میں نے ابو کا کہا سن لیا تھا . مگر اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا . ابو نے تمینہ سے میرا رشتہ توڑتے وقت یہ اعلان کیا تھا کہ میں عزمان کی شادی خاندان سے باہر کروں گا اور آج میرا تایا سوالی بن کر آگیا ہے . ابو کے اس ستم پہ میرے حواس گم ہو گئے . اور پھر میں نے اس وقت اپنے حواس پر قابو پایا . . . جب ابو اپنا پہاڑ ہار رہے تھے .

ابو یہ بضد کا لفظ صرف پکی اینٹوں والے مکانوں کے مکینوں کے لیے استعمال ہوتا ہے . . . میرے ذہن نے تڑپ کر ابو سے سوال کر ڈالا .

تمہارا کیا مطلب ہے بیٹا . . ! ابو نرمی سے بولے .

آپ نے ایک احسان کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کیے تھے آپ نے کہا تھا کہ احسان بضد ہیں .

نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں بیٹا . ابو خفیف سا مسکرائے .

تو پھر ابو خالہ بھی تو بضد تھیں . . . وہ تو جھکی بھی تھیں . انہوں نے تو اپنا دوپٹہ بھی تمہارے قدموں میں رکھ دیا تھا میں شاید کچھ اور بھی کہتا مگر پاس بیٹھی ماں نے جھڑک دیا . میں نے صرف اتنا کہا .

ابو میں نے آج تک آپ کے کسی حکم کو نہیں ٹالا . آپ آج بھی جو حکم دیں گے میں پورا کروں گا .

ابو مسکرائے اور پیار کر کے باہر نکل گئے . ابو گئے تو امی سسکنے لگیں . میں نے انہیں چپ نہیں کرایا اس لیے کہ میرے لیے لب کھلتے تو وہ کرب انگیز چیخیں ابل پڑتیں . جو ابو کی اٹھائی ہوئی آندھیوں کے دوش پر میرے گرد و پیش کو رقص کر رہی تھیں .

اگلی صبح شرتی کا تہوار ہوا . اس منظر نے مجھے اتنا دل برداشتہ کیا کہ اس گھر میں رہنا میرے لیے ناممکن ہو گیا . اور آخر کار شام میں نے یہ گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا . تو پیتا دس بجے میں اٹیچی ہاتھ میں تھام کر اپنے کمرے سے نکلا . اس وقت میری چھوٹی بہن کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا . میں باہر کی طرف لپکا تو میری منی بہن صحن پھیر کر مجھ سے آ لپٹی . اور بولی .

بھیا . . ابھی سے تیاریاں شروع مگر یہ رسم حنا بندی کی اشیاء اور تبرک وغیرہ تو ماں باپ خریدتے ہیں .

اوہ . . میں بھی کتنی بھولی ہوں . آپ تو رضو بھابی کے لیے تحفہ خریدنے جا رہے ہوں گے . . . مگر یہ اٹیچی . . میرا اٹھا کر جبر تا ہوا ہاتھ منی کے منہ سے جا ٹکرایا اس کے فقرے کے بقیہ الفاظ کراہوں میں بدل گئے . . . وہ دور جا گری .

کتنی بار دہرایا گیا تھا میرے ساتھ یہ ڈرامہ . . . پہلے تمینہ پھر زمانہ اور اب رضیہ . . میرے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی . مگر یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی . منی کی چیخوں نے مجھے بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیا . وہ شدتِ کرب سے زمین پر پڑی چیخ رہی تھی . اس بے چاری کا کیا قصور ہے . . . یہ خیال آتے ہی اٹیچی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں نے کانپتے

ہاتھوں سے منی کو اٹھا کر لڑکھڑاتے قدموں سے کمرے میں چلا آیا۔ میں نے منی کو پیار کیا۔ اس سے اپنے مارنے کی معافی مانگی اور آئندہ کبھی نہ مارنے کا وعدہ کیا۔

تب کہیں جا کر وہ مسکرائی۔ میں نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور اپنی اٹھا کر لیے لیے ڈگ بھرتا بس شاپ پر آ گیا۔۔۔

۔۔۔ آپ کے سامنے ہوں۔ اس امید پر کہ آپ مجھے کسی قریبی شہر میں چھوٹا سا مکان کرائے پر لے دیں گے۔۔۔ میں وہاں کیا کروں گا۔ یہ سوچنا آپ کا نہیں میرا کام ہے۔

عرفان کی کہانی ختم ہوئی تو میرا رہا سکون بھی بکھر گیا۔۔۔ میں نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس سے کہا کہ آپ سو جائیں۔ مجھے سوچنے دیں۔ رات وہ سے بھی گزرنے کو تھی، اور پھر حالات کچھ اس طرح بے قابو ہو گئے تھے کہ نیند کا سوال ہی پیدا ہونا بدگمانی تھی۔

دوسرے دن کا سورج کچھ زیادہ ہی غضب ناکی سے طلوع ہوا۔ میں ابھی تک کوئی مناسب فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ صبح ہی سے ہم کمرے میں بند تھے۔ اور باہر سورج کافی بلند ہو چکا تھا۔ باہر سورج کی گرمی، کمرے میں پنکھے کی گرم ہوا۔ ایسے میں میرا ذہن اپنے دوست کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر سلگ رہا تھا۔

ہم دونوں سارا دن اپنی اپنی سوچوں میں گم کمرے میں پڑے رہے۔۔۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔۔ مسئلہ پالستی کا نہیں، معاشی کا تھا۔ بے کار بیٹھنے سے تو خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں۔ اور پھر حکم دینے والا کب تک حکم برداشت کرتا۔ زنجیر اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ مجھے اس کی پہلی کڑی نظر ہی آ رہی تھی۔۔۔

ادھر عرفان بے قرار تھا۔ آخر رات آ گئی۔ اور میں کسی بھی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر عرفان پھر مجھے کریدنے لگا۔

عرفان کیا یہ ممکن نہیں کہ تم میرے پاس رہو۔ اور جب کہیں کام بن جائے تو چلے جانا۔ میں نے اس سے کہا تو وہ بولا

شاہد۔۔! مجھے علم تھا کہ تم یہی کہو گے۔۔۔ مجھے آپ کی رفاقت پر شک نہیں ورنہ میں کسی اور طرف بھی نکل سکتا تھا۔ میں آپ سے اس وقت متوجہ لیے ہوں کہ آیا تم مجھے اپنے قریب ترین شہر میں کوئی مکان دلا سکتے ہو۔

بھئی نارض کیوں ہوتے ہو۔۔۔ میں نے مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔ فی الحال تم دو چار دن میرے پاس رہو۔ ان دنوں امید ہے کہ کوئی سبب نکل آئے گا۔

شاہد۔ آج کا دن گزرنا میری بار بار ہمتی تھی۔ مگر مزید دنوں سے میں تھک جاؤں گا اگر آپ میرے ساتھ ملنا چاہیں تو صبح چلیں۔۔ ورنہ میری راہ مت روکنا۔۔۔ یہ میری آپ سے التجا ہے۔۔ وہ ایک عزم سے بولا۔

عرفان اس قدر دل برداشتہ تھا کہ اسے شاید میری باتوں پر یقین نہ تھا۔ میری خاموشی جانے اس کے دل میں کیسے کیسے وسوسے پیدا کر رہی تھی۔ میں وہ سعی کوئی ایسی دلیل ڈھونڈ رہا تھا جو عرفان کو اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دے۔ مگر جب میں نے اس کی ہٹ دھرمی دیکھی تو مناسب وقت کے انتظار میں خاموش ہو گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ عرفان مجھ سے مایوس ہو کر کسی اور طرف نہ نکل جائے۔ چنانچہ میں نے اگلی صبح اس کے ساتھ جانے کا وعدہ کر لیا۔ عرفان نے مجھ سے پوچھا کہ ہم کہاں جائیں گے۔ میں نے اسے اپنے قریب ترین چار شہروں کے نام بتائے۔ اور اس نے ان شہروں میں گوجرہ منتخب کیا۔۔۔

گو یہ شہر چھوٹا تھا مگر عرفان کے لیے بہت بڑا تھا۔ وہاں کالج میں میرے کچھ دوست پڑھتے تھے۔ سوچا کہ ان سے تعارف عرفان کے لیے سود مند ہو گا۔ اگلی صبح ہم گوجرہ جانے کے لیے گھر سے نکلے ہی تھے کہ ضیاء مل گیا۔ جو کہ میرے گاؤں کا ہی رہنے والا تھا۔ اور آج کل ڈگری کالج میں اس کا آخری سال ختم ہونا تھا۔

ضیاء۔۔ میں آپ سے ملنے کالج آ رہا تھا اور آپ یہاں سرگشت کر رہے ہیں۔۔ میں نے اسے دیکھ کر کہا۔

تو پھر آؤ چلیں۔ ضیاء نے مسکرا کر کہا۔۔ میں کالج ہی جا رہا ہوں۔۔۔

کوئی وعدہ دینا ہو گا۔۔۔

کیا بھلا۔۔

ہمیں ایک مکان چاہیے۔۔

تو آؤ مل کر کوشش کر دیکھیں گے۔۔

ہم تینوں بائیکلوں پر وہاں آئے بس کے بس سٹاپ پر

جواب ۶ میں۔۔۔

آ گئے۔ بس آئی تو حواس اڑ گئے۔ اتنی شدت کی گرمی کہ کپڑے پسینہ جذب کرنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ اور ادھر سواریاں چلچلاتی دھوپ کی پرواہ کیے بغیر چھت پر براجمان تھیں۔ بس کے اندر قطاریں لگی تھیں۔ مگر ضیاء کنڈکٹر سے ساز باز کر کے اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ ادھر اس نے ہمیں بھی اشارہ کیا اور ہم اس کی پیروی میں آگے بڑھ لیے۔ آدھا گھنٹے کا سفر ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا اور راستے میں سواریوں نے ایک دوسرے کو جو القابات دیئے وہ قابل شنید تھے۔ کالج جا کر پتہ چلا کہ کالج دو تین دن کے لیے بند ہو گیا ہے۔ مگر ضیاء کو تو ہر صورت یہاں رکنا تھا۔ کیونکہ وہ یہاں اپنے ایک لیکچرار سے ٹیوشن پڑھتا تھا۔

کالج بند تھا مگر ضیاء کے دو تین دوست وہاں موجود تھے۔ ان سے تعارف ہوا اور پھر ضیاء نے نفضل صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرے بہت اچھے دوست ہیں۔ اور گاتے بھی اچھا ہیں..

گانے کا سنا تو مجھے اس صاحب کو سننے کا شوق چرایا۔ چنانچہ میں نے فرمائش کر ڈالی۔ نفضل صاحب نے میز کرسی کے پاس گھسیٹ لیا۔ اور اسے طبلہ بجانے لگے۔ میری فرمائش محض تفریح کی خاطر تھی مگر ان کی غزل کا ہر شعر، چہرے کے [illegible] ول و نزول کا ہر زاویہ کمرے کی فضا کو پریشان کرنے لگا۔ تھوڑی دیر پہلے نفضل جب ہم سے باتیں کر رہا تھا تو وہ مسکرا رہا تھا اور اب اس کے چہرے پر ایک کرب، ایک ملال واضح تھا۔ جو ہر شعر کے علاوہ اس کے چہرے سے بھی عیاں تھا۔ میں نے بعد میں ضیاء سے دریافت کیا تو وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولا۔ یہ بھی ایک کہانی ہے۔ اور میں سوچنے لگا۔ جیسے ہر چہرہ ہی [illegible] ہے۔

دوپہر کا کھانا ہم نے وہیں کھایا اور دوپہر کے بعد ہم تینوں شہر کی خاک چھانتے رہے۔ مگر ہمیں مطلوبہ مکان نہ ملا۔ شام کو میں تو گاؤں لوٹ آیا مگر عرفان ضیاء کے پاس رک گیا۔ میں نے اسے ساتھ چلنے کے لیے کہا تو وہ پہلو تہی کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ میں کہیں اسے اس کے ارادے سے ہٹانے کی کوشش نہ کروں۔

اگلی بار مجھے پھر عرفان کے پاس جانا تھا۔ چنانچہ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر میں ستائیس تاریخ کو گھر سے نکلا۔ گرمی پہلے دن سے بھی زیادہ تھی۔ آدھے گھنٹے ہی میں لو کے تھپیڑوں نے

برا حال کر دیا۔ جی میں آیا کہ واپس لوٹ جاؤں مگر عرفان کی مجبوری نے پابند سلاسل کر دیا۔ قیامت سی گرمی کو چیرتا ہوا بس سٹاپ پر آیا۔ یعنی گھنٹہ یہاں دھوپ اور لو میں جلتا رہا اپنے چہرے کو حدت اور تپش سے بچانے کے لیے میں نے پنجابی فلموں میں ڈاکوؤں کی طرح اپنے چہرے کو چھپا رکھا تھا۔ خدا خدا کر کے بس آئی تو بہتر رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ حسب سابق چھت پر سواریاں رونق افروز تھیں۔

خدا کنڈکٹر کا بھلا کرے کہ وہ میری پتلون اور شرٹ سے دھوکا کھا گیا اور مجھے اندر گھسیٹ لیا۔ بس چلی تو ایک بوڑھا دھکم پیل میں ایک عورت جو سیٹ پر بیٹھی تھی جا ٹکرایا۔ عورت بوڑھے کو کوسنے لگی اور وہ بے چارا اپنی سفید داڑھی کھجلانے لگا۔

موڑ کی سٹاپ پر کنڈکٹر نے آدمیوں کا داخلہ بس میں ممنوع قرار دیتے ہوئے کہا کہ مرد اور پردہ دار عورتیں اندر آجائیں۔ اندر جگہ تو پہلے ہی پر تھی۔ مگر سٹاپ پر سواریاں بھی جانے کب سے بس کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ کنڈکٹر دروازے سے ہٹا تو عورتوں کا ریلا اندر گزر گیا اور میں اس دھکے سے بس کے وسط میں چلا گیا...

بچوں کی چیخ و پکار اور عورتوں کی تو تو میں میں نے ہر ایک کو بے چین کر رکھا تھا۔ عورتیں مردوں کے دامن پر ہاتھ ڈالنے پر تلی ہوئی تھیں۔ جو آدمی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ وہ اپنے اوپر جھکنے والی سواریوں کو اوپر اچھال رہے تھے۔ ان حالات میں میرے سامنے والی سیٹ کے درمیان میں بیٹھا ایک خوش وضع آدمی سونے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بس دوبارہ حرکت میں آگئی۔ میری نظریں غیر ارادی طور پر اس آدمی پر جم گئی تھیں۔ جو اس عذاب کے باوجود اونگھ رہا تھا۔ اچانک بس نے ہچکولا کھایا۔ اور اس آدمی کی پیشانی سامنے والی سیٹ کی پشت پر لگے راڈ سے جا ٹکرائی۔ وہ پیشانی سہلاتا ہوا سیدھا ہو بیٹھ گیا اس کے بائیں جانب بیٹھے کمزور سے لڑکے نے جس کی عمر ۲۲ سال کے لگ بھگ تھی از راہ ہمدردی مسکراتے ہوئے کہا۔

اس گرمی میں آپ سونے کی کوشش کر رہے ہیں

دراصل میں پچھلی تین راتوں سے ایک لمحہ بھر بھی نہیں سو سکا.. پہلا آدمی دکھ سے بولا۔

کیوں..؟ لڑکے نے حیرانی سے پوچھا۔

اس آدمی کے چہرے پہ رنج و الم کے بادل چھا گئے . . .
اس نے ایک آہ سی بھرتے ہوئے کہا .
میرا جوان سال بھائی حادثہ کی نذر ہو گیا ہے . . اس
نے مزید وضاحت کی . . . وہ انجینئر تھا اور اس کی شادی ہوئے
ابھی سات دن ہوئے تھے .
لڑکے نے رنج و الم کا اظہار کیا اور پھر پوچھا . . آپ
کہاں رہتے ہیں . . "
پنڈی . . اس نے مختصر جواب دیا .
اور کرتے کیا ہیں . . ؟ لڑکے نے پوچھا
ڈاکٹر ہوں . . وہ کرب سے بولا .
اسی اثنا میں بس بشیر آباد مشاف پر رکی . اور سواریوں
کا ایک اندھا ریلا اندر گھس آیا . . . کنڈکٹر ڈرائیور والے گیٹ سے
اندر آیا . اور اس نے سواریوں کو ایسی ترتیب دی کہ کوئی منہ
سے تو لاکھ بولے مگر ہاتھوں سے چاہے بھی تو کام نہ لے سکے . اب
دھکے کا امکان بھی ختم ہو گیا تھا . یوں سمجھو کہ ایک دیوار بن گئی .
ہر سیٹ دوسری سیٹ سے پیوست تھی
دھکے ، گرمی اور چیخ و پکار الغرض ہر احساس ختم ہو گیا
تھا . میں کچھ اور آگے سرک گیا تھا . . . وہ لڑکا اور ڈاکٹر
مجھ سے دو سیٹیں پیچھے رہ گئے تھے . بس دوبارہ چل دی . . اب
میرا منہ بھی الٹا ہو گیا تھا . میں کچھ اور آگے سرک گیا تھا . وہ لڑکا
اور ڈاکٹر دو سیٹیں پیچھے رہ گئے . میرے سامنے والی سیٹ پر ایک
خوش پوش لڑکا اور اس کے پہلو میں بھرے بھرے گالوں اور شفاف
چہرے والی لڑکی بیٹھی تھی . وہ بار بار ایک دوسرے کی طرف
دیکھ کر مسکرا رہے تھے . . .
میری نظریں محبت کے اس ساحل پر ٹھہر گئیں یہاں گرمی کا
احساس تھا نہ ماحول کا اثر . . . صرف وہی دونوں تھے اور کوئی نہ
تھا ، جیسے وہ کسی سینما ہال میں بیٹھے کوئی فلم دیکھ
رہے ہوں . . . اور ان کو اپنے ارد گرد کی کوئی
پرواہ نہ تھی ، اور مجھے بھی بے اختیار نسرین کی
یاد آنے لگی . جو کل تک اسی راستہ پر میرے سنگ تھی . گلے میں
پھولوں کے ہار کی طرح ، ہواؤں میں خوشبو بن کر ، اس لڑکی کا میری
نسرین سے کیا موازنہ . .
• خوش گوار تمام تھی . . . میرے من کے آسمان کا سب سے حسین
تارا تھی . دل کے اس پر اپنی صبا یا سینوں کا مقبرہ بنا دیا . دل سے
السّت کے چمن زار کا غنچہ تھی .
کلی بن کر مسکرایا تھا . . بھری بہار میں پھولوں کی ڈالی بھی
جو مجھ پر جھک آئی تھی . مگر آج . . . آج میں اکیلا ہوں .
بازگشت تھا . . . یاد رفتہ کا ترانہ موجودہ وقت کا شاخسانہ
تھا . . . چاک گریبان تھا بند زبان اور زبان تھا . . . انتشار
کا محور تھا . سر بسر الم و نکر تھا . جانے کل اس خوش اور
خرم بہار پہ کیا گزرے . . محبت معراج بن جائے یا نصیب
نامراد ہو جائے .
اچانک جھٹکا لگا ، بس شہر کے موڑ پہ رک چکی تھی . . .
ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا . سواریاں دروازوں سے باہر لٹکنے
لگی تھیں . بس سے باہر نکل کر کھڑے ہونے والے لوگ چلچلاتی
دھوپ اور جھلساتی لو میں یوں لمبے لمبے سانس لے رہے تھے . .
جیسے کسی ائر کنڈیشنر کمرے میں آ گئے ہوں . شہر جانے والی
سواریاں اتریں تو مجھے بھی ڈاکٹر صاحب کے پیچھے کی سیٹ مل گئی .
ڈاکٹر اور وہی لڑکا بڑی محویت سے ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے
سیٹ پر بیٹھتے ہی ڈاکٹر کا کرب انگیز لہجہ میں یہ سوال میری سماعت
سے ٹکرایا . .
لڑکا معصوم سی ہنسی ہنسا اور بولا . . مرنے کے لیے .
مگر کیوں . . . ڈاکٹر کے لہجے میں اضطراب تھا .
کسی سے وعدہ کیا تھا کہ سنگ جئیں گے . مگر ساتھی روٹھ گیا اور
میں ہانپ کر گر گیا . . . . وہ پھر مسکرایا . مگر اس مسکراہٹ پہ
زخمی روحوں کی چیخیں بھی اپنا کرب بھول گئیں .
بس اڈے میں رک چکی تھی . اور سواریاں اتر رہی تھیں .
آخر میں ہم تینوں اترے . وہ دونوں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے
ہوئے فیصل آباد بس سٹینڈ کی طرف بڑھ گئے . اور میں بس کے
سامنے کھڑی شربت والی ریڑھی پر لگے چھتری نما خیمے کے سائے
تلے ہو کر ان دونوں کو جاتا دیکھ رہا تھا . .
وہ قدم بقدم خراماں خراماں خاموشی سے جا رہے تھے . اور
میرے کانوں میں یہ گونج اور گرمی ہو رہی تھی . مگر آپ نے زہر
کیوں کھایا . . مرنے کے لیے . . مگر کیوں . . ؟
وہ بسوں کی اوٹ میں چلے گئے مگر میری سوچ انکا تعاقب
کرتی رہی . . . جانے کب تک . . . وہ تو خیر ہوا کہ بس کا تیر
جواب عرض لاہور

میوزک ہارن میرے ذہن کو واپس لے آیا۔ میں نے شربت والے سے ایک گلاس پانی لے کر آنکھوں اور گالوں کو چھینٹے مارے... پھر ایک گلاس شربت پیا۔ شربت پینے کے بعد مجھے ایک فرحت کا احساس ہوا...

جی نہیں چاہتا تھا کہ شربت والے کی پناہ میں چھوڑ دوں۔ مگر نادل نخواستہ میں نے دل پر پتھر رکھ کر یہ پناہ میں چھوڑ دی... اڈہ زیرِ تعمیر تھا اور جا بجا پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے میں ان پتھروں پر چلتا دھیرے دھیرے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی کسی کی چاہت کیے بغیر غیر ارادی طور پر یہ شعر گنگنا رہا تھا۔ جو شاید شاعر نے کسی ایسی جگہ پر کہا تھا۔

ابھی پتھروں پہ چل کر اگر آ سکو تو آؤ
میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں

جب میں اڈے میں موجود ہوٹلوں کی قطار کے نزدیک آیا تو وہی ڈیلا سا لڑکا مجھے ایک ہوٹل کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ بے اختیار قدم اس کی جانب اٹھ گئے۔ میرے ذہن میں اس سے بات کرنے کا کوئی واضح خاکہ نہیں تھا۔ بہر حال اس سے باتیں کرنا اس وقت میری سب سے بڑی آرزو تھی۔ میں دھیرے دھیرے چلتا عین اس کے قریب جا کر رک گیا۔ اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بڑی چاہت سے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا... ڈاکٹر صاحب چلے گئے۔

کون ڈاکٹر... وہ حیرت سے ارد گرد دیکھتا ہوا بولا۔

اجی وہی جو بس میں آپ کے ساتھ بیٹھے تھے... میں نے زندہ دلی سے کہا۔

اوہ... جیسے اسے یاد آگیا... ہاں جی چلے گئے... آپ بھی شاید اس بس میں سوار تھے... ؟

صرف اسی بس میں سوار ہی نہیں بلکہ آپ کے بالکل قریب بیٹھا تھا... میں نے پھر مسکرا کر کہا۔ بات چل نکلی تو میں نے پندرہ بیس منٹ میں اسے بالکل ہموار کر لیا۔ اور پھر دائیں جانب ایک حلوائی کی دکان میں اسے لے بیٹھا۔ یہاں جگہ نسبتاً تنگ تھی۔ اندر چند کرسیاں اور ان کے سامنے میز پڑے تھے۔ فرنیچر کا رنگ و روغن چمک رہا تھا۔ فرش بھی صاف تھا۔ دکان کے سامنے حلوائی گرم گرم جلیبیاں نکال رہا تھا۔ اس کی پشت پر بڑا سا شوکیس تھا، جس میں طرح طرح کی مٹھائیاں جھانک رہی تھیں۔ درمیان میں اندر آنے کے لیے ایک چھوٹا سا راستہ تھا۔ جس سے گزر کر ہم اندر آئے تھے۔ اور دوسری جانب کوک اور فانٹا کے کریٹ ایک دیوار میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بڑی سی پیٹی تھی جس میں بوتلیں ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔

ہم صفر ہاؤس کی میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے کہ اچانک میرے دل کے زخم رسنے لگے۔ یاد کے دریچوں سے کسی نے جھانکا تو فضا تجسیم ہو کر سسکنے لگی...

کیا کھاؤ گی زریں... ؟ یادِ رفتہ کی میری اپنی بازگشت میری روح کو رسا گئی...

جو تم پسند کرو... وہ میری طرف دیکھ کر محبت کے سرشار لہجے میں بولی۔

تو پھر زہر کیسا رہے گا... ؟ میں نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا تھا...

جو جی میں آئے کھلا دو... اس نے مسکرا کر کہا۔

یہی بہتر ہے زریں... ورنہ گزرے لمحوں کا تصور زباں بن کر جی کو جلائے گا۔ اور کوئی نہ جان سکے گا... کہ شمعِ محبت کیوں پگھل گئی... میں نے خدشات کا اظہار کیا تھا...

کسی مقصد کے لیے مر جانا ہی سعادت ہے۔ وہ یک عزم سے بولی۔ اور اس کا عزم دیکھ کر ایک ڈھارس اور تسکین ہو گئی... اس کا یوں میرے ساتھ ہونا بھی ایک بہت بڑا اعتماد تھا۔ اور پھر حسنِ اظہار کی ایسی شوخی پر سنجیدہ نہ رہنا بھی بہت بڑی زیادتی اور بدگمانی تھی۔

گرم گرم جلیبیاں... سموسے اور کوک سامنے پڑے تھے۔ جنہیں زریں ٹھونگ رہی تھی... چوس رہی تھی۔ جیسے زبردستی دعوت کی رسم پوری کر رہی ہو۔ میری بھی کچھ یہی حالت تھی... وقت کافی گزر گیا تھا مگر ہم کچھ بھی نہ کھا سکے تھے۔ فقط ایک دوسرے کے چہروں کو تکتے رہے۔ کھنگالتے رہے اور پھر نگاہوں سے ایک دوسرے کو اشارہ کر کے اٹھ دیے۔ باہر نکلنے سے قبل ہم نے گرم گرم جلیبیاں ایک پیکٹ میں بند کرائے اور بل ادا کر کے باہر آ گئے...

تھوڑی دیر بعد ہماری موٹر سائیکل پکی سڑکوں پر پھسل رہی تھی اور ہم آنکھیں جھپکتے رہے..... تھوڑی دیر بعد ہم زریں کے گھر تھے۔ گھر اور کوئی نہ تھا... زریں نے ہمسائی کو

جواب عرض لاہور

آپ سے پوچھ رہے تھے کہ آپ نے زہر کیوں کھایا . . . اس بات پر ثاقب اچانک پریشان ہو گیا . چند لمحے توقف کے بعد بولا .

وہ میری غلطی تھی کہ انہیں علم ہو گیا . . . درحقیقت وہ اتنے مہربان اور شفیق نظر آتے تھے کہ مجھ سے جھوٹ نہ بولا گیا . کہتے تھے . میرے ساتھ چلو . . میں تمہارا علاج کروا دوں گا . . . اور بھائی بنا کر رکھوں گا . . .

تو آپ نے واقعی زہر کھایا تھا . . میں نے کرب سے پوچھا .

ہاں . . اس نے بڑی فراخدلی سے اقرار کر لیا .

مگر کیوں . . ؟

یہ بہت لمبی کہانی ہے . . وہ ایک آہ بھر کر بولا .

اور تمہارے دوست کے پاس ٹائم بھی بہت ہے . .

آپ اپنا وقت ضائع کریں گے دوست . . اس نے ٹالنے کے انداز میں کہا .

اگر میں آپ کے کسی کام آ سکا تو خوش نصیبی سمجھوں گا . . میں نے اپنائیت کا اظہار کیا .

کام آنے کا وقت گزر چکا ہے شاہد . . . وہ کسی قدر اطمینان سے بولا . . . مگر یہ جاننے پھر بھی آپ پر اعتماد کرنے کو کیوں جی مچل رہا ہے .

اچانک اس چھوٹے سے کمرے کی فضا غم کے بادلوں سے مکدر ہو گئی . ثاقب ایک نقطے پر نظریں جمائے میری طرف دیکھ کر کانپ رہا تھا . . . میں اس کے قریب ہو گیا .

کچھ زیادہ ہی مصیبت زدہ دکھائی دے رہے ہو دوست !! میں نے اس سے کہا .

اندازوں اور قیاسوں کی دنیا بہت محدود ہے شاہد . . بعض غم ایسے ہوتے ہیں . یہاں تخمینوں کی گنجائش نہیں ہوتی . سمندروں کا پانی کس نے ماپا ہے . . . پہاڑوں کا وزن کون کر سکا ہے . . . میرے غم کا اندازہ لگانا چاہیں تو بعد میں لگا لیں . . . مگر میں خود آج تک اپنے غم کا اندازہ نہیں لگا سکا . . ثاقب نے ایک سسکاری سی بھری . . اور تڑپ کر کہا .

مجھے تو اتنا علم ہے کہ میری بہن کو ایک درندے کی محبت نے نگل لیا . . . باپ غیرت کے جوش میں اپنی بیٹی کے جنازے کو کندھا بھی نہ دے سکا . . . ماں اس ستم ظریفی پر سماج کے منہ پر لعنت کے طمانچے مار گئی اور میری محبت اپنی چاہت کی جھوٹی بقا کی آرزو میں منوں مٹی تلے جا سوئی . . . اور میں زمانے کے . . . .

ثاقب بلک پڑا . . . اور میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا . . . کئی لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ یوں گویا ہوا .

شاہد صاحب . . ! میری کہانی کا آغاز میری پیدائش سے بہت سال پہلے شروع ہوا تھا . اتنا پہلے کہ اس وقت میرے والد محترم نوجوان تھے . اور بھری دنیا میں اکیلے تھے . وہ اس شہر کے کسی گوشے کے چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے . سارا دن محنت مزدوری کرتے اور رات کو اپنے مکان میں سو رہتے . دنیا کے ظلم و ستم سہتے یونہی اٹھائیس بہاریں گزر گئیں . اور پھر ایک دن قسمت نے ان کا ساتھ دیا . انہیں ایک رہنما کریم بخش مل گیا . وہ بھی اسی شہر کا باسی تھا . . . مگر عرصہ دراز گزرا تھا کہ وہ دریا پار چلا گیا تھا . . .

وہاں اس نے کچھ قطعہ اراضی خرید کر ہموار کر لی تھی . کریم بخش محنتی آدمی تھا . اسے کاشت کاری کی ایسی لت پڑی کہ وہ اپنی زمین کو بڑھاتا چلا گیا . . . یہ ذکر شاید میرے والد کے لڑکپن یا پھر بچپن کا ہمعصر ہو . . . کریم بخش کے ماں باپ گوجرہ شہر کے ہی رہائشی تھے . ایک دفعہ وہ اپنے ماں باپ سے ملنے یہاں آیا تھا . تو اچانک اس کی ملاقات ابو سے ہو گئی . اور پھر جب کریم بخش نے ابو کے حالات سنے تو اس کا دل پسیج گیا . . .

اس نے ابو کو پیشکش کی کہ وہ اس کے ساتھ چلے اور زمینوں پر کام کرے . اس نے معاوضے میں ایک معقول رقم دینے کا وعدہ کیا . پہلے تو ابو راضی نہ ہوئے . آخر اس بات پر مانے کہ کریم بخش انہیں اپنی زمین سے ملحق کچھ اراضی خرید دے گا . ابو کے پاس پس انداز شدہ اتنی رقم تھی کہ وہ ٹوٹی پھوٹی زمین کا ایک ٹکڑا خرید سکیں . . . پھر اس زمانے میں زمین کی قیمت ہی کیا تھی . دریا کے پار تو چند سکوں کے عوض زمین کا بڑا قطعہ حاصل ہو جاتا تھا .

ابو کریم بخش کے ساتھ اپنا مختصر سا سامان لے کر دریا کے اس پار چلے گئے . کریم بخش نے اپنا وعدہ نبھایا اور اپنی زمین کے ساتھ آٹھ دس ایکڑ اراضی خرید دی . . . ابو نے اس زمین پر محنت کی جھاڑی بوٹیوں کو تلف کیا . اور اسے ہموار کر کے فصل بو دی . کریم بخش کے التفات اور نوازش کے پیش نظر ، ابو انہیں اپنا محسن

مجھے کہ کریم بخش نے ابو کو ہمیشہ اپنا دوست اور بھائی سمجھا کرتا۔۔۔ کریم بخش کے بیوی اور بچے بھی تھے۔ سوا س نے اپنی رہائش کے لیے اپنی زمین میں ہی پانچ کمروں پر مشتمل ایک خوبصورت کشادہ گھر کچا مکان بنا رکھا تھا۔ صحن کافی وسیع تھا جس پر بڑ کا درخت ہر وقت جھومتا رہتا تھا۔

اس مکان کے عقب میں دو نوکروں کے مکان تھے۔ دونوں نوکر شادی شدہ تھے۔ مکان کے آگے تقریباً پچاس مرلے پر مشتمل مربع نما حویلی تھی۔ جس کی چاردیواری آٹھ فٹ سے زائد تھی۔ یہاں بیل۔۔۔ بھینسیں اور دوسرے جانور رہا کرتے تھے کے لیے ایک لمبا سا کمرہ اور جنوب والے کونے پر اس سے مکان سے ملحق بیٹھک تھی۔ جس کا دروازہ تقریباً حویلی میں کھلتا تھا۔ جنوب اور مغرب والی دیوار میں دیوار میں دریچہ تھا۔ کریم بخش کو خدا نے یکے بعد دیگرے تین بچیوں کا باپ بنایا تھا۔ بالترتیب ان کے نام عطیہ۔۔۔ مشرف اور ذکیہ تھے۔ ابو کو یہاں ہر آسائش مہیا تھی۔ وہ اپنی زمین کے ساتھ کریم بخش کی بھی زمین کی نگرانی کرتے تھے۔ ان دونوں دوستوں یا بھائیوں کی محبت، چاہت اور بھائی چارے کا یہ عالم تھا کہ ان کے درمیان کوئی دراڑ تھی نہ سوراخ۔۔۔ جس سے کسی کو ان کے دو ہونے کا احساس ہوتا۔۔۔

پھر جلد کریم بخش نے ابو کی شادی کر دی اور عائشہ، میری ماں نے ابو کے چہرے سے زمانے بھر کی نقاہتیں نوچ پھینکیں۔ شادی کے چند ماہ بعد ابو نے کریم بخش سے علیحدہ مکان بنانے کا ارادہ ظاہر کیا اور کریم بخش نے کچھ رد و قدح اور پس و پیش کے بعد اس کی اجازت دے دی۔۔۔

یہ اجازت اس شرط پر ملی کہ ابو اپنا مکان ان کے مکان کے بالکل ساتھ بنائیں گے۔۔۔ ابو نے شادی کے بعد مزید دلجمعی سے کام لیا۔ اور اپنی اراضی کو دوگنا بنا لیا۔ ابو کی شادی کو تین سال گزر گئے۔ گلشن کا یا ہی گلزار نہ مہکایا۔ امی ہر وقت اس غم میں کڑھنے لگیں۔ ابو انہیں تسلی دیتے تو غم آنکھوں کی راہ بہہ نکلتا۔۔

ادھر کریم بخش کے ہاں خدا نے ایک پھول کھلایا جس کا نام انجم رکھا گیا۔۔ میری ماں پہلے سے بھی زیادہ رنجیدہ ہو گئی تھیں۔۔ کہتے ہیں کہ خدا کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔۔۔ سو شادی کے چھ سال بعد میری ماں نے ایک کلی کو جنم دیا جس کا نام کوثر رکھا گیا۔ اب ماں بھی خوش تھی اور ابو بھی۔ وہ اپنی معصوم بچی کو کریم بخش کی بیوی کی گود میں دے کر سارا سارا دن ابو کے ساتھ کھیتوں میں کام کرتی۔۔

دن ماہ و سال یونہی بدلتے رہے۔ آئندہ تین سالوں میں میری ماں دو بچوں کو جنم دیا۔ مگر ان کی زندگی اللہ تعالیٰ کو چند سالوں سے زیادہ منظور نہ ہوئی۔۔۔ ماں نے ممتا کے ہاتھوں مجبور ہو کر مختلف پیروں فقیروں سے تعویذ گنڈے کروائے اور منتیں مانیں اور میری پیدائش پر ماں نے رو رو کر خدا کے آگے دیر تک میرے لیے حیاتِ مستعار کی بھیک مانگی۔ دن یونہی گزر گئے۔ اس وقت میری عمر دو سال تھی۔ جب کریم بخش کے گھر پھر ایک کلی کا اضافہ ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام شہناز رکھا مگر انجم نے اپنے بھولپن سے ثریا کو ستارہ میں بدل دیا۔

کریم بخش نے اپنی بچیوں کی تعلیم پر تو کوئی توجہ نہ دی۔۔ مگر انجم کے مستقبل نے اسے پریشان کر دیا۔ چنانچہ وہ انجم کو تعلیم کی خاطر تقریباً ایک میل دور سکول بھیجنے لگا۔ اکثر اوقات کریم بخش انجم کو خود سکول چھوڑنے جاتا یا پھر ابو چھوڑ آتے۔ اگلے سال انجم کی دیکھا دیکھی کوثر بھی سکول جانے لگی۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو ہر طرف بہار ہی بہار رقصاں تھی۔۔۔ خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔۔ میری آپا کوثر بہ ساتھ میری ہزاروں بلائیں لیتی۔۔ زمانہ ایک لمبی کروٹ بدل چکا تھا۔ کریم بخش کی بڑی لڑکیاں عطیہ مشرف اور ذکیہ اپنے اپنے گلزار مہکا بیٹھی تھیں۔ اور ہمارے ارد گرد کی ساری زمین لہلہاتی کھیتیاں اگی تھیں۔۔۔ ابو اور تایا کریم بخش کی باہمی محنت سے ہماری زمینیں بھی پہلے سے کہیں زیادہ عریض ہو گئی تھیں۔ اور اس میں راحت کی ربابیں ہر وقت فضاؤں میں جلترنگ بجاتی رہتی تھی۔

ان دنوں میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ ایک دن سکول سے واپس آیا تو خلاف معمول تایا کریم بخش کے گھر کافی گہما گہمی تھی۔ عطیہ۔۔ مشرف اور ذکیہ اپنے اپنے خاوندوں کے ہمراہ صحن میں چارپائیوں پر بیٹھی تھیں۔ اور ان کے بچے بڑ کی چھاؤں میں کھیل رہے تھے۔ یہ منظر میں نے ان کے دروازے کے

جواب عرض لاہور

سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا... میں خاموشی سے گھر چلا آیا۔ میں سامنے والے کمرے میں داخل ہوا تو ثریا عقبی کمرے سے نکل کر میرے پیچھے بھاگی۔ اور مجھے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سامنے کرتی ہوئی بولی۔

شانی.. آج بھیا انجم اور کوثر کی منگنی ہے۔

میں نے حیرانی سے ثریا کی طرف دیکھا اور معصومیت سے پوچھا.. بھیا.. منگنی کیا ہوتی ہے..؟

آپ کو منگنی کا نہیں پتہ... بدھو ان کی شادی ہے۔ ثریا نے مجھے مسکرا کر سمجھایا۔

مگر شادی میں تو رنگ برنگے کپڑے پہنے جاتے ہیں... طرح طرح کے کھانے پکتے ہیں... ڈھول بجتے ہیں... کئی تماشے ہوتے ہیں... مگر یہاں تو کچھ نہیں ہو رہا۔ میرے ذہن نے مضطرب ہو کر ثریا سے پوچھا...

ہاں..! یہ تو ٹھیک ہے۔ شمو کی شادی ہوئی تھی تو لوگ ناچتے تھے اور عورتیں گاتی تھیں... میں کوثر باجی کے ساتھ گئی تھی۔ سکینہ بھی ہمارے ساتھ تھی... مگر یہاں تو کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ ثریا نے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا.. چند لمحے توقف کے بعد اس نے میرا بازو پکڑ کر باہر کھینچتے ہوئے کہا۔

آؤ شانی... سکینہ سے پوچھتے ہیں۔

ہم عقبی کمرے میں پہنچے، یہاں باجی کوثر اور سکینہ ایک چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی باجی نے اپنی بانہیں کھول دیں۔ اور میں ایک لمحے کے لیے سب کچھ بھول کر ان کی گود میں جا سمایا... وہ جانے کب سے کمرے میں بند تھیں۔ ان کا سارا لباس پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ میں نے باجی کے گلے میں جھولتے ہوئے پوچھا۔

باجی..! آج آپ کی شادی ہے..؟ باجی نے حیرانگی سے سکینہ کی طرف دیکھا اور سکینہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ہاں..! شانی آج تمہاری باجی کی شادی ہے.. میری بجائے پاس کھڑی ثریا جھٹ سے بولی۔

مگر شادی میں تو دلہن نئے نئے کپڑے پہنتی ہے.. اور باجی کوثر نے خراب کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں..؟

سکینہ ایک لمحے کے لیے الجھ کر رہ گئی۔ باجی دھیرے سے مسکرا رہی تھی... سکینہ نے ایک نظر مسکرا کر باجی کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔

شانی.. جب تمہارے بھیا برات لے کے آئیں گے تو ہم کوثر کو خوب صورت کپڑے پہنا دیں گے۔

تو پھر میں بھیا سے کہوں گی کہ وہ کل ہی برات لے کر آجائیں ثریا خوشی سے بولی۔

ہاں ہاں ضرور کہنا.. سکینہ نے شرارت سے باجی کی طرف دیکھا اور باجی نے ایک دھپ سکینہ کو جما دی۔

بکتی ہے.. کسی سے کہہ دیا تو تو وہ کیا سوچے گا..؟ باجی نے دھیرے سے سکینہ سے کہا۔

یہی کہ دل بے قرار ہے۔ خواب۔ خیال... باجی نے سکینہ کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ثریا خوش تھی... اور میں تصور ہی تصور میں اپنی بہن کو ایک دلہن کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ گو میری سوچیں اس وقت کپڑوں اور مکانوں تک محدود تھیں۔ مگر پھر بھی میری خوشیاں کراں تا کراں محو رقص تھیں۔ اس طلسم کو میری ماں کی آمد نے توڑ دیا... وہ کمرے میں آئیں اور کوثر کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے سکینہ سے کہنے لگیں۔

سکینہ..! جاؤ دیکھو انجم ابھی تک آیا ہے یا نہیں۔ ان کے لہجے میں مجبوری بھی تھی اور لاچاری بھی.. سکینہ نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور کہا

خالہ جان..! وہ تو ابھی کالج سے فارغ ہوا ہو گا... اور پھر دس گھنٹے شہر سے یہاں پہنچنے میں بھی لگیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں... ابھی تین بجے ہیں وہ شام تک ضرور آجائے گا... سکینہ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا

خالہ جان برا نہ منانا... اتنے پریشان تو انجم کے اپنے ماں باپ نہیں جس قدر پریشانی کا اظہار آپ کر رہی ہیں۔

وہ... بیٹے والے ہیں۔ اور میں... میں... امی کی آواز بھرا گئی... انہوں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر کوثر کا سر اپنے سینے میں چھپا لیا۔ اس منظر سے سکینہ بھی آبدیدہ ہو گئی۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکل گئی دوسرے ہی لمحے وہ بھاگتی ہوئی واپس آئی اور بولی۔

خالہ جان وہ آگئے... امی باہر کی طرف لپکیں اور ساتھ ہی

کے بڑے بڑے پیڑوں سے جھانک رہا تھا۔۔۔

ہوا میں سوروں سے خوشبو چرا کر اٹھلا رہی تھیں اور شبنمی پودوں سے ٹھنڈک چھین کر گل کاریاں کر رہی تھیں۔ ساتھ والی زمینوں میں لگی سرسراہٹ ان پر کیف طلسم کو مزید پرشباب بنا رہا تھا۔۔ راہٹ کے چلنے کی ریں ریں۔ بیلوں کے گلے میں گھنٹیوں کی ٹن ٹن، ٹولوں سے پھسل کر کھیت کے سینے میں گرتے پانی کی آواز اور بیل ہانکنے والے کا جوان دلوں کے لیے پر آشوب ماہیا ایک عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔۔۔ میں ان تمام دلفریبیوں اور رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتا۔۔۔ خراماں خراماں اپنے راہٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔۔۔ جب میں قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ انجم چاہ پر بیٹھا شفاف پانی کھیل رہا ہے۔ میں اسے ڈرانے کی غرض سے دبے پاؤں اس کے پیچھے چلا گیا۔۔۔ درختوں کے تنوں سے چھن کر آنے والی چاندنی سے ہیولا کچھ واضح ہو گیا تھا۔۔۔ میں نے غور سے دیکھا یہ انجم نہیں تھا بلکہ سکینہ تھی۔

سکینہ۔۔۔ تم اکیلی۔۔۔ رات کے وقت ادھر یہاں۔۔؟ میں نے حیرانگی سے پوچھا

سکینہ میری آواز پر اچھل پڑی۔ اس نے وحشی ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھا اور پھر چند لمحوں کے لئے اپنی نظریں سامنے کپاس کے کھیت میں گاڑھ دیں۔

سکینہ۔۔! تم یہاں کیا کر رہی ہو۔۔؟ میں نے پوچھا۔

بس یونہی۔۔ یونہی۔۔۔ وہ کانپ کر رہ گئی۔

مگر تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو۔۔؟ اتنی دیر میں سکینہ خود پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تم نے ڈرا جو دیا تھا۔۔۔

ادھر انجم بھائی تو نہیں آئے۔۔۔ میں نے اصل بات کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔۔۔

نہیں تو۔۔۔ اس نے اضطراب سے جواب دیا۔ میں واپس گھوما تو سکینہ نے مجھ سے پوچھا۔۔۔

کیا بات ہے ثاقی۔۔۔ انہیں کیوں ڈھونڈ رہے ہو۔۔؟ سکینہ نے پوچھا۔

مجھے ان سے سبق پڑھنا ہے۔ مگر وہ جانے کہاں غائب ہو گئے ہیں۔۔۔ یہ کہہ کر میں واپس چل دیا۔ چند قدم چلا تھا کہ سکینہ کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔۔۔

ثاقی۔۔ کچھ دیر پہلے میں نے انہیں اس کنوئیں کی طرف جاتے دیکھا تھا۔۔۔ آپ ادھر سے آنے والی یہ گانے کی آواز سن رہے ہیں نا۔۔۔ یہ انجم بھیا کو بہت پسند ہے۔ وہ اکثر وہاں ماہیا سننے جاتے ہیں۔ میں نے کان اس آواز پر لگا دیے کوئی درد بھری لے میں گا رہا تھا۔۔۔

پھل کھڑ کھڑ ہس دے سے
اپنا کہہ کے لکی کالے ناگاں دانگوں ڈسدے نے

میں چند لمحے اس آواز کے سحر میں ڈوبا رہا۔ اور پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا حویلی میں آ گیا۔ دوبارہ کتاب کھولی تو بڑی پریشانی دامن گیر ہوئی۔۔۔ اچانک مجھے انگریزی ترجمے کی یاد آئی۔۔ جسے میں نے انجم کی موجودگی میں بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ میں ترجمہ انگلش لینے گھر چلا آیا۔۔ جب میں گھر چلا آیا تو میری ماں مصلے پر بیٹھی تسبیح کر رہی تھی۔

کیا بات ہے بیٹے۔۔؟ امی نے شفقت سے مجھے دیکھ کر پوچھا۔

کچھ نہیں امی جان۔۔۔ کتاب بھول گیا تھا وہ لینے آیا ہوں۔۔۔ میں نے جواب دیا۔ اور وہ دوبارہ مراقبے میں ڈوب گئیں۔۔۔ میں کتاب اٹھا کر باہر نکلنا ہی چاہتا تھا۔۔ کہ کوثر لڑکھڑاتے قدموں سے اندر آئی۔۔۔ سکینہ اسے سہارا دیے ہوئے تھی۔۔ میں ششدر سا رہ گیا۔

کیا بات ہے بیٹی۔۔؟ امی نے لپک کر کوثر کو سہارا دیتے ہوئے کہا۔۔

کوثر کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے خالہ۔۔ کہتی ہے سر میں درد ہے۔۔۔ جس سے چکر آ گیا ہے۔۔۔ امی نے چارپائی پر بستر بچھایا۔ اور بیٹی کوثر کو لٹا دیا۔۔۔ سکینہ اس کا سر دبانے لگی۔ امی نے کوثر کو پیار کیا۔ اور میں سہم کر اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا کوثر کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ چہرے پر دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ وہ ایک ٹک ملاؤں میں گھورے جا رہی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس کی حالت سنبھلی تو میں اٹھ کر حویلی میں چلا آیا۔۔۔ انجم میاں چارپائی پر لیٹا تھا۔۔۔ میں نے اس سے شکایت کی تو وہ کھوکھلی سی ہنسی ہنسا۔۔۔ اور بولا۔

بھئی سبق ہی پڑھنا تھا نا۔ سو اب پڑھ لو۔۔

مگر آپ گئے کہاں تھے۔۔؟

میں۔۔ ہاں۔۔ میں۔۔۔ وہ ساتھ والے کنوئیں پر گیا تھا۔

آپ کو اس کا گانا پسند ہے۔۔؟ میں نے کتاب کھولتے ہوئے کہا۔۔!

گانا۔ اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں کھنچ آئیں۔۔۔ پھر جیسے کچھ یاد آگیا۔۔۔ وہ مسکرا کر بولے۔

ہاں۔۔ ہاں۔۔! مجھے اس کا گانا بہت پسند ہے۔ اس کا نغمہ ختم ہوا تو میں نے کتاب اس کے سامنے کر دی۔ اس نے مجھے سبق یاد کرایا اور مجھے سو جانے کا کہہ کر خود بھی بستر پر دراز ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا۔۔۔

اگلی صبح خلافِ معمول ثریا نے بہت جلد ہمیں آ کر جگا دیا۔۔۔ ہم نے ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر ناشتہ کیا۔ اتنی دیر میں سکینہ کا بابا کرم دین گھوڑا گاڑی تیار کر چکا تھا۔ ہم تینوں اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔۔۔ اور ثریا نے جلدی سے گھوڑے کی راسیں پکڑ کر اسے چابک لگائی۔۔۔

گھوڑا اچھلا اور کچی سڑک پر بھاگنے لگا۔ چھ فرلانگ کی طے کرنے کے بعد پکی سڑک آ گئی۔۔۔ میں اور ثریا باری باری گھوڑے کی باگیں پکڑ کر ایک عجیب سا لطف محسوس کرنے رہے۔۔ پھر جب شہر قریب آیا۔ تو انجم نے باگیں خود سنبھال لیں۔ شہر پہنچ کر سب سے پہلے ہم نے اپنی مرضی کے تحفے خریدے اور پھر مٹھائی کے تین بڑے پیکٹ۔۔ اس کے بعد ہم سنار کی ایک دکان پر پہنچے۔ انجم ہمیں تانگے میں چھوڑ کر زرگر کی دکان میں چلا گیا۔ اس نے اپنی جیب سے کوئی چیز نکالی اور دکاندار کو دے دی۔۔۔ اس نے اسے ہتھیلی پر رکھ کر دیکھا۔۔۔

چند لمحے انجم اور دکاندار میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ جسے ہم دوری کی وجہ سے نہیں سن سکے۔ پھر دکاندار نے سامنے والا شو کیس کھولا اور یہاں سے مختلف قسم کی چھوٹی چھوٹی خوب صورت ڈبیاں انجم کے سامنے بکھیر دیں۔ اس نے باری باری انہیں کھول کر دیکھا۔ اور پھر ایک اس کے سامنے رکھ دی۔۔۔

زرگر نے کچھ کہا اور انجم نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹ گننے۔۔ انہیں اس کی مٹھی میں تھمایا اور ڈبیا جیب میں رکھ کر واپس آگیا۔ وہ تانگے میں سوار ہوتا ہوا بولا۔

چلیں بھئی۔۔

اور پھر دوسرے ہی لمحے گھوڑا ہماری زمینوں کی طرف بھاگ رہا تھا۔۔۔

رات آئی تو حسبِ سابق انجم آج بھی غائب تھا۔ پھر اگلا پورا ہفتہ رات گئے تک دیر سے واپس آنا۔ اس کا معمول بن گیا۔ میں کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس کا انتظار کرتا اور جب وہ واپس آتا تو اس سے سبق لے کر سو جاتا اور وہ دن بھی طلوع ہو گیا جس دن انجم کو دوبارہ شہر ملازمت کے لیے جانا تھا۔ صبح ہی سے گھر میں ایک ہنگامہ سا برپا تھا انجم کے لیے طرح طرح کی چیزیں تیار ہو رہی تھیں۔

کرم دین کا سامان تانگے میں بھر چکا تھا۔ گھر کے سبھی مکین انجم کو چھوڑنے کے غم اور ملازمت کی خوشی کے امتزاجی رنگ میں دیکھ رہے تھے۔ جب وہ جانے لگا تو اس کی ماں نے اسے سینے سے لگایا۔۔ باپ نے اس کی پیٹھ کو تھپکا۔ اور میری ماں نے اس کی بلائیں لیں۔ لیکن ثریا کو انجم نے پیار کیا۔ مجھے گلے سے لگایا اور تانگے میں سوار ہو گیا

جب تانگہ چلا تو میں نے اپنے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں مجھے نیم وا کواڑوں سے کوثر باجی کی سہمی سہمی آنکھیں نظر آئیں۔

انجم بھائی کو گئے آج تین ماہ گزر گئے تھے۔ اس دوران ہمارے گھر والوں نے انجم اور کوثر کی شادی کی تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔۔۔ پھر ایک دن انجم کو خط لکھوایا گیا۔۔ کہ وہ چند دن کی چھٹی لے کر گھر آ جائے۔۔ تاکہ اس کے والدین اپنے کندھوں سے بوجھ اتار سکیں۔ چند دن بعد انجم کا خط آیا کہ ملازمت نئی نئی ہونے کی وجہ سے فی الحال چھٹی کا ملنا نا ممکن ہے البتہ اگلے ماہ میں صرف چار دن کی چھٹی لوں گا۔۔۔ اور شادی اس سے اگلے ماہ ممکن ہو گی۔

چلو۔۔ ایک ماہ سے کیا فرق پڑتا ہے تایا کریم نے انجم کا خط سن کر کہا اور پھر مجھ سے کہنے لگا۔

بیٹا! یہ خط اپنی امی کو بھی سنا دینا۔۔ چنانچہ یہ خط لے کر میں اپنے گھر آ گیا اور سب کے سامنے انجم کا خط سنا ڈالا۔ کوثر باجی خط سن کر پیر پٹختی قدموں سے اندر چلی گئی۔۔ امی نے انہیں یوں دل برداشتہ سا اندر جاتے دیکھ لیا تھا۔ لیکن کر اس کے پیچھے گئیں۔۔ میں بھی اندر چلا گیا کوثر تکیے میں منہ چھپائے سسک رہی تھی امی نے جاتے ہی اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔۔۔ اور اس کے رخساروں کو سہلاتے ہوئے بولیں۔۔

نہ رو میری بیٹی۔ بیٹیاں تو بادشاہوں کی بھی پرائی ہوتی ہیں۔۔ ابھی سے رو رو کر خود کو ہلکان مت کرو۔ تجھے ہم نے کھونے کا غم۔۔۔ ہمارے دل کے خون سے زیادہ نہیں۔ مگر یہی دستورِ دنیا ہے بیٹی۔

امی کے دلاسوں سے باجی خاموش ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں کا سمندر [illegible] پر تلاطم تھا۔ [illegible] دو دن [illegible] باہر نہ نکلیں۔ مگر وہ بدستور چار پائی پر لیٹی رہی۔ مجھے [illegible] کر اس کے ہونٹ کانپنے لگے [illegible] تڑپ کر میرے لیے [illegible] باہیں کھول [illegible] سے [illegible] لگا۔ [illegible] وہ پھر سسک پڑیں

باجی آپ رو کیوں رہی ہیں [illegible] سے کرب میں ڈوبی دبی دبی چیخ نکلی [illegible] دیکھتی رہی اور پھر دھیمی آواز میں بولیں۔

ثاقی۔ [illegible] آج سکول نہیں جاؤ گے؟

آپ کو یوں سسکتا چھوڑ کر میں کہیں نہیں جا سکتا۔ میں نے [illegible] سے کہا۔

تم جاؤ ثاقی۔۔۔ میں اب نہیں روؤں گی۔۔۔ باجی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا

وعدہ۔۔؟

ہاں وعدہ۔۔ انہوں نے کہا

تو پھر مسکراؤ۔۔۔ میں نے کہا

تو پھر باجی نمناک آنکھوں سے مسکرا دیں جب میں باہر جانے لگا۔۔۔ تو باجی نے مجھے روک کر کہا کہ سکینہ کو یہاں بھیج دینا۔

میں سکول سے واپس آیا تو باجی ابھی تک اندر چار پائی پر لیٹی تھیں۔ اور سکینہ اس کے قریب بیٹھی تھی۔ پھر یہ ان کا معمول بن گیا۔ وہ ہر وقت اداس رہتیں اور سکینہ جونک کی طرح اس کے سائے سے چمٹی رہتی۔

جنوری کے آخری ہفتے کی یہ ایک خنک دوپہر تھی۔ جب انجم کی آمد ہر طرف شادمانی و انبساط کی لہر بن کر دوڑ گئی۔ بقیہ سارا دن خوش گپیوں میں گزر گیا۔ اور رات گئے تک محفل شباب پر رہی۔ اگلے دن میں سکول سے واپس آیا تو ابو کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ امی جا نماز پہ بیٹھی قرآن پاک پڑھ رہی تھیں۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب باجی کو تو کہیں نظر نہ آئیں تو میں نے امی سے ان کے متعلق پوچھا۔۔۔

انہوں نے بتایا کہ آج اس کی طبیعت ذرا ٹھیک تھی۔ ابھی ابھی سکینہ کے ساتھ باہر نکلی ہے۔ شاید سکینہ کے گھر ہو۔۔ امی کے اس جواب پر میں دل ہی دل میں مسکا اٹھا کہ باجی کی طبیعت سنبھل گئی ہے۔ میں نے کپڑے بدلے تو امی نے مجھے کھانا دیا اور میں کھانے سے فارغ ہو کر حویلی میں چلا آیا۔

میں صحن میں داخل ہوا تو سامنے بیٹھک کے دروازے پر سکینہ کھڑی اپنے ناخنوں سے دیوار کھرچ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ لپک کر اندر چلی گئی۔۔۔ جب میں اندر داخل ہوا تو باجی کو تنہا ایک بستر پر سر رکھے سسک رہی تھی۔ اور انجم سامنے والی دیوار کے سامنے پڑی کرسی پر خاموش بیٹھا تھا باجی ہر چیز سے بیگانہ بلک رہی تھی۔ سکینہ کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ اور انجم کے چہرے پہ سوچوں کی لکیریں بہت گہری تھیں۔ میں حیران و پریشان کھڑا حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہ سکینہ نے آگے بڑھ کر باجی کو جھنجھوڑ دیا۔ اور وہ لرزتے قدموں سے اٹھ کر اس کے ساتھ باہر چل دی۔۔۔ وہ باہر چلی گئی تھیں۔۔۔ مگر انجم کو شاید اس کی خبر ہی نہیں تھی۔ وہ بدستور دیوار کو گھور رہا تھا۔ مجھے الجھن سی ہونے لگی۔

باجی کیوں رو رہی تھیں بھیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

اپنی بیماری کی وجہ سے پریشان ہے۔۔۔۔ اس نے جواب دیا۔

رات کو حسب سابق میں پڑھنے میں مشغول تھا۔ انجم ساتھ والی چار پائی پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ رات کافی بیت چکی تھی جب مجھے نیند آنے لگی۔ تو میں نے کتابیں میز پر رکھ دیں۔ اور سو گیا۔

انجم بھائی کل آپ چلے جائیں گے۔۔۔ میں نے پوچھا۔

ہاں۔۔۔ انجم نے کہا۔

مگر آپ نے تو لکھا تھا کہ میں چار دن کی چھٹی آؤں گا۔۔؟

سو جاؤ منے۔۔۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ اس نے روکھا سا جواب دیا۔ اور میں نے کروٹ بدل لی

آدھی رات کے قریب میں کسی کے زور زور سے حویلی کا بڑا دروازہ کھٹکھٹانے پر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس وقت انجم بیٹھک کے دروازے کی درزوں سے باہر جھانک رہا تھا۔

اس کی چیخ کافی بلند تھی۔۔ جسے میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ میں دبانے کی کوشش کی۔۔۔ اور ربو کھلا کر باہر حویلی کے صحن میں جھانکنے لگا۔

مجھے کسی کی پرواہ نہیں ثاقی۔۔ تجھے میں یوں برباد نہیں ہونے دوں گی۔۔۔ وہ بلکی۔

ہوا کے دوش پر اڑتے پتوں کو قید نہیں کیا جا سکتا ثریا! انہیں چٹانوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہونا ہی پڑتا ہے۔۔۔ جاؤ تم گھر جاؤ۔۔۔ میں نے کواڑ سے ٹیک لگا کر غم سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

ہوائیں تو تجھے چمن زاروں میں لیے پھرتی ہیں۔ اور پھولوں سے ٹکرانا چاہتی ہیں۔ وہ لرزتے ہوئے بولی۔

سب کچھ چھین کر مجھ پر یہ کرم آخر کیوں۔۔؟ کیا بگاڑا تھا میں نے ان کا۔۔۔ یہ مجھ پر اب کاہے کے لیے مہربان ہو رہی ہیں۔ اب کس چیز پر نظر ہے ان کی۔۔۔ میرے پاس تو اب کچھ نہیں بچا۔۔ جس پر مزید ان کی نظر ہو۔ ایک ایک کر کے سب بکھر گیا۔۔۔ سب لٹ گیا۔۔۔ سب چھن گیا۔۔ میری سسکیاں آہوں میں بدل گئیں۔

ماضی کو بھول جاؤ ثاقی۔۔ حال پر نظر رکھو۔۔ ماضی نے تم سے کیا چھین لیا ہے تو حال تمہیں نئی خوشیاں بخش رہا ہے۔ کیا تم یہ سب ٹھکرا دو گے۔۔؟ وہ روانی سے کہہ گئی۔

کیا بخش رہا ہے مجھے۔۔؟ میں نے آنکھیں کھول کر بھیگی آنکھوں سے ثریا کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اور اس نے اپنا سر دھیرے سے دیوار سے لگا دیا۔

سیاں مجھے اتنا بڑا خواب نہ دکھاؤ۔۔ جس کا میں متحمل نہ ہو سکوں۔۔ وہ خوشیاں نہ بخشو۔۔۔ یہ بہت زیادہ سیاں۔۔ اس سارے جہاں کو پا لینے سے بھی زیادہ۔۔ تیرہ چشم کے سامنے پھول نہ بکھیرو۔۔ ایسا اعتماد نہ بخشو۔۔ جو میرا نصیب نہ ہو۔۔ ایسا سراب نہ دکھاؤ جس کا کوئی کنارہ نہ ہو۔۔ ایسا خواب نہ دکھاؤ جس کی تعبیر مسرت ہو۔۔۔ مجھے اقرار ہے کہ تمہاری رفاقت کا اعتماد میری محرومیوں کے احساس کو ختم کر دے گا مگر۔۔!

ایسا نہ سوچو ثاقی۔۔۔ میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہی اور نہ ہی میرا مقصد ہمدردی ہے۔ یوں سمجھو کہ یہ ساعت مری تکمیل کا لمحہ ہے۔۔

تمہاری تکمیل۔۔۔ میں نے زیر لب حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔۔۔

ہاں ثاقی۔۔ میری تکمیل۔۔ میرے خوابوں۔۔۔ میری آرزوؤں۔۔۔ میری تمناؤں کی تکمیل ہے۔۔۔ ثریا کے زریں و شیریں ہونٹوں کی مٹھاس میری سماعت میں زہر گھول کر دی۔۔۔ عود و عنبر کا دھواں مشام جاں میں بھر دیا۔۔ اتنی بڑی بات اس آسانی سے کہہ دی کہ میں بول بھی نہ سکا۔۔۔ میں فقط حیرت اور مسرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔۔۔ وہ چند لمحے توقف کے بعد بولی۔

تم ابو کی بات مان کر کالج میں داخلہ لے لو۔۔۔ باقی سب بھول جاؤ۔۔۔ تیرے اور میرے درمیان وعدہ کی گواہ وہ خدا کی ذات ہے۔۔۔ ثریا نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے مجھے یقین دلایا۔ جانے معصوم سی۔۔ گڑیا سی۔۔ ثریا نے یہ بڑا اعتماد لہجہ کہاں سے اور کس وقت چرایا تھا۔

ایک بار پھر سوچ لو سیاں۔۔۔ میرے ساتھ میرے اپنوں نے وفا نہیں کی۔۔۔ میں نے مزید اعتماد کی خاطر بے چارگی کے انداز میں کہا تو وہ پھر بولی۔

ثاقی۔۔! خود ساختہ مفروضوں کی میں قائل نہیں۔۔۔ وعدہ دیا ہے تو مزید یقین کی خاطر میں قسمیں نہیں کھاؤں گی۔۔۔ البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ اگر میں اپنا وعدہ وفا نہ کر سکی تو تیرے سامنے اپنے مقدر اور تقدیر کا رونا رونے نہیں آؤں گی۔۔۔ میرا آخری قدم بھی محبت کے لیے قابل رشک ہو گا۔۔۔ وہ ایک عزم سے بولی۔۔ میں نے ثریا کے منہ سے یہ سنا تو مستحکم۔۔۔ مگر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

سیاں! میں بھی تم سے جھوٹا وعدہ نہیں کروں گا۔ آسمان سے تارے توڑ کر لانا اور چاند کو تمہارے قدموں میں بچھا دینا میرے بس کی بات نہیں۔۔۔ میں شاید کل تمہیں تن ڈھانپنے کے لیے کپڑا اور دو وقت کی روٹی بھی نہ دے سکوں۔۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میری ہر حرکت تمہاری مسکراہٹ کی خاطر ہو گی۔ میں جو بھی کروں گا۔۔۔ تمہیں خوش دیکھنے کے لیے کروں گا۔ میری سوچ کا انجام تمہارے لیے آسائش و آرام پر ہو گا۔۔۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر مزید کہا۔

سیاں۔۔! تم نے مجھے جینے کی اک نئی راہ دکھائی ہے۔ جسے میں شاید دیکھنے کی چاہ میں ہی جان دے دیتا۔۔۔ تو نے مجھے اک

طاقت بخشی ہے اور اک نقش اجاگر کیا ہے۔ اب سے عروج پر پہنچانے اور دوام بخشنے کے لیے مجھے تمہاری ضرورت ہے۔۔۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا کانپتا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔۔ ثریا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ایک لمحے میں ویران دل جیسے امنگ اور آرزوؤں سے بھر گیا۔

اب میں کالج میں داخلہ لوں گا۔ میں نے دلو تو ق سے مغلوب ہو کر آہستہ سے کہا اور ثریا کے لبوں عارضوں پر گلاب کھل اٹھے۔

اگلے دن میں نے کالج میں ایڈمیشن کے لیے درخواست دے دی۔ ایک سال ثریا کے بے لوث بحر بیکراں عشق اور تایا کے لامحدود سایہ التفات کے تلے یوں گزر گیا کہ مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔

وہ دن میرے سیکنڈ ایئر کے آخری دن تھے۔ صبح ہی سے طبیعت میں ایک بے نام سی ویرانی تھی۔۔ ناشتہ کرنے کو بھی جی نہ چاہا۔ کلاس روم میں جی نہ سنبھلا تو پھر ہاسٹل آ گیا۔۔ کمرے کا دروازہ کھولا اور چپکے سے چارپائی پر لیٹ گیا۔۔۔

مجھے یہاں لیٹے چند لمحے گزرے تھے کہ میرے روم میٹ سلیم کے والد صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔۔ وہ ایک اونچے قد اور بھرے جسم کے مالک تھے۔ عمر پچاس سے تجاوز کر گئی تھی مگر اب بھی چہرے پر جوان خون کی جھلک نمایاں تھی اپنے علاقے کے پُر رعب و دبدبہ زمیندار تھے۔

سلام انکل۔۔۔ میں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ وہ میرے قریب چلے آئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور کسی قدر رازداری میں بولے۔۔۔

سلیم کہاں ہے۔۔؟

وہ تو پرسوں سے چھٹی پر ہے۔۔ گاؤں جانے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے ادب سے کہا۔

وہ آئے تو اس سے کہنا کہ ملک بختاور کے آدمیوں سے ہوشیار ہے۔۔۔ میں نے ان کے دھواں دھواں چہرے پر تفکر کی سوچ امڈتی اور ڈوبتی دیکھیں۔۔۔ وہ چند لمحے بعد پھر بولے۔

اس سے کہنا کہ چند یوم کے لیے اپنے ماموں کے ہاں کراچی چلا جائے۔۔۔

مگر انکل۔۔۔ ملک بختاور کی بیٹی تو سلیم کی منگیتر ہے پھر۔۔! میرے لہجے میں بلا کی حیرت تھی۔ مگر انہوں نے میرا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بات کاٹ دیا

منگیتر تھی بیٹے۔۔ بیوی نہیں۔۔ وہ کہہ کر تیزی سے بولے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔۔ وہ چلے گئے اور میں انہیں روک بھی نہ سکا میرے حواس بھی ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ میں ان سے مزید کچھ بھی نہ پوچھ سکا۔ مگر وہ جو بتا گئے تھے بات کی گمبھیرتا بھی کم نہیں تھی۔ باقی سارا دن میں نے فکر اور اندیشوں میں گزارا

رات کا دوسرا پہر آیا دروازے پر ہلکی سی دستک پڑی۔ میں جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ اسی لمحے سلیم اندر داخل ہوا۔ چہرے سے بجھا بجھا لگ رہا تھا۔۔۔ بکھرے بال۔۔ چہرے پر تفکر کا دھواں۔۔ چال میں لغزش۔

سلیم کہاں سے آ رہے ہو۔۔؟ میں نے پوچھا۔

آئندہ بغیر تصدیق کیے در پردہ مت کھولنا۔ وہ میرے سوال کو نظر انداز کرتے اور سیڑھی چڑھتا ہوتے بولا۔

تو گویا آپ کو علم ہے کہ ملک کے آدمی تمہارا پیچھا کر رہے ہیں۔۔۔ وہ بولا۔

ہاں کر رہے ہیں۔ آدمی میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ مگر یہ محض بکواس ہے۔۔۔ مگر احتیاط ضروری ہے۔

سلیم یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔۔۔ اسے آخر تمہاری ہی بیوی ہونا تھا۔ تم نے اپنی ضد میں اپنے ماں باپ کی عزت کو خاک میں ملا دیا۔۔ میں نے کہا

سلیم نے کہا:

میں نے کوئی برا تو نہیں کیا۔ میں تو سب سے بھلائی ہی کرتا ہوں۔۔۔ مگر اس کی اصلیت کا مجھے اب پتہ چلا ہے۔ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ میں اس کی ہر بات کو مان کر صرف اور صرف اسی کے اشاروں پر ناچوں مگر مجھ سے یہ ہرگز برداشت نہیں ہوتا کہ میں شادی سے پہلے ہی اس کا غلام بن کر رہ جاؤں۔۔۔ بس میں نے جو کچھ کیا ہے وہ ٹھیک ہی کیا ہے۔۔۔

سلیم کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

میں آپ کے اس فلسفے سے متفق نہیں ہوں۔ آپ نے کسی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔

چھوڑو نائب...! چند دنوں کی بات ہے سب ٹھیک ہو جائے گا... وہ اکتاہٹ سے بولا۔

ملک بختاور کے آدمی آپ کا پیچھا کر رہے ہیں... میں نے اسے آگاہ کیا۔

نہیں... یہ محض افواہ ہے۔ ملک بختاور ایک جہاں دیدہ آدمی ہے... وہ مجھ پر ہاتھ ڈالے گا تو دنیا اصل معاملے سے آگاہ ہو جائے گی... مجھے یقین ہے کہ وہ یہ سب مناسب نہیں سمجھے گا... ورد کا بیکراں احاطہ اسے کچھ کہنے یا کرنے پر اکساتا ہوگا تو دمنع نبھانے کا تقاضا بھی بے دلیل نہیں ہوگا۔ سلیم یہ کہہ کر چارپائی کی طرف بڑھا اور میں اس کی دیدہ دلیری پر حیران رہ گیا... میں کچھ لمحے یونہی مبہوت بنا سلیم کے متعلق سوچتا رہا اور پھر چارپائی پر دراز ہو گیا۔

میں نے ہر لمحہ منتشر خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ مگر عجب سی بے قراری کسی پل چین نہ لینے دیتی تھی... مجھے آج بڑی شدت سے اپنی بہن کوثر یاد آ رہی تھی۔ جب وہ جاں بہ لب ہوتی تھی... اس وقت میرا شعور اشاروں کی زبان سمجھنے سے قطعی قاصر تھا۔ مگر سلیم کی کہانی مجھے عجب سے کچوکے لگا رہی تھی...

مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ میری اپنی کہانی ہو میری بہن کی کہانی ہو... مگر دوسرے ہی لمحے میرا دل مدافعت کرتا اپنی بہن کوثر کے تقدس و عظمت کی قسمیں کھاتا...

نہیں نہیں۔ وہ ایسی نہیں تھی... کسی نہاں خانے سے آواز آتی مگر ابو... ابو کی وفات کا کون ذمہ دار تھا... کوثر تو کئی عرصہ سے بیمار تھی... مگر ابو تو بھلے چنگے تھے اور پھر میرے دل نے یہ دلیل دی کہ بیٹی کی جان بلب دیکھ کر بوڑھا باپ کیسے ضبط کر سکتا تھا... وہ یقیناً ہمیں کوثر کی زیادہ خرابیٔ طبیعت سے آگاہ کرنے آئے تھے... مگر لڑکھڑا کر حویلی کے کواڑ سے ٹکرائے ان کی دائیں کنپٹی پر گہرا زخم تھا۔ بوڑھی جان ایسے گری کہ جانبر نہ ہو سکی۔

میں اپنے دل کو تسلیاں دیتا رہا... مگر یہ عمر تسلیوں سے بہلنے والی نہیں تھی۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ جس رات یہ سانحہ پیش آیا تھا اور حویلی کا دروازہ پیٹا گیا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو انجم جاگ رہا تھا... بلکہ سہم کر دروازے کے اندر کھڑا تھا مگر دروازہ نہیں کھول رہا تھا... آخر کیوں...؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے ہر لمحہ اندوہناک یادوں کے تیکھے نقوش کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی تھی مگر اب میرا دل مزید دلائل دینے سے انکاری ہو گیا تھا۔ اقتدارِ زمانہ کے پیشِ نگاہ دہکتے انگاروں پر تو راکھ کی تہہ جم گئی تھی۔ بادِ سموم کے ایک ہی جھونکے سے فضا میں منتشر ہو گئی اور نیچے عہدِ گزشتہ کے انگارے دہک رہے تھے۔ اس زمانے کی ایک ایک بات... ہر ہر شکوک لمحہ مجھے تلخ حقیقت کا پہاڑ نظر آنے لگا... گزری شاہراہِ حیات پر بکھرے واقعات اور خون آلود یادیں میرے ذہن کو بری طرح مجروح کرنے لگیں سو بقیہ رات کا ایک ایک پل میرا کانٹوں پر گزرا۔

اگلی صبح میں کسی کو بتائے بغیر ہوسٹل سے نکل آیا اور سیدھا سکینہ کے سسرال جا پہنچا... نہ جانے مجھے کیوں یقین ہو چلا تھا کہ سکینہ اس راز سے واقف ہے جس کی آگ میں میں جل رہا تھا۔ میں الصبح وہاں پہنچ گیا۔ مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ سکینہ تین دن قبل میکے جا چکی ہے۔ اس کے سسرال والوں نے مجھے ہر ممکن روکنے کی کوشش کی اور آنے کا مدعا پوچھا۔

میں نے کہہ دیا کہ قریب ہی ایک ضروری کام کی وجہ سے آیا تھا۔ سوچا کہ آپ کی عافیت دریافت کرتا چلوں... غریب لوگ میری اس توجہ پر بہت مسرور ہوئے۔ یہاں سے فارغ ہو کر میں سیدھا اپنی زمین پر پہنچا... سکینہ اور ثریا مجھے دور ہی سے نظر آ گئیں۔ وہ راہٹ پر بیٹھی برتن مانجھ رہی تھیں، چنانچہ میں سیدھے ذہن سے ادھر ہی چل دیا۔

سکینہ کی پشت میری جانب تھی اور ثریا کا پہلو۔ میں دھیمے قدموں سے بغیر آہٹ پیدا کیے ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ثریا نے اچانک گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور مجھے اتنا قریب پا کر فرطِ جذبات سے اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ نیم واں ہونٹوں کی مسکان کچھ کہنے کے لیے بے قرار تھی۔ مگر الفاظ کی گنگا منجمد ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں بھی سب کچھ بھول گیا تھا۔

مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ میں کس مقصد کے لیے یہاں

گیا ہوں۔ اچانک خوشی ملنے پر ثریا کا شہابی رنگ کچھ اور نکھر
ہو گیا تھا اور میرے دل میں گراں تا گراں کلیاں چٹک رہی تھیں۔
نیچے مسکا رہے تھے۔۔ معطر معطر ہوائیں مدھر جلترنگ الاپ
رہی تھیں۔ دنیا کی تمام تر رنگینیاں اور تمام تر حسن کے ساتھ
اس جگہ جلوہ افروز تھیں۔

میں بڑی محویت سے مسکراتی ہوئی ثریا کو دیکھ رہا تھا۔۔
ایسے لگے کوئی راجی چاہا کہ اس وادی میں چلا جاؤں جہاں پیار
کے راگ رہتے ہوں۔۔ اور بس۔

نظاروں کی اس وارفتگی کے عالم میں نہ جانے کیسے دشمنوں
سے بے نیاز اور زمین و آسمان کی لامحدود حدود سے بے پرواہ
ہو رہی تھی۔ اور پھر وہ لمحہ بھی آیا جب میرا جی چاہا کہ میں ہر شے
دنیا سے بیگانہ ہو کر فقط یہی لمحہ تختۂ فکر پر منقش کر لوں
ثریا کو سدا کے لیے اپنا ہمسفر بنا لوں۔

میں خوابوں کی دنیا میں پہنچ گیا۔۔۔ کہ ہر
وقت میں ثریا کی یادوں کے سہارے جیتوں اور
خوابوں میں بھی ثریا ہی میرا دامن پکڑ
کر مجھے بیدار کرے۔۔ اور اپنی معصوم
باتوں اور اپنی دلکش مسکراہٹ سے مجھے
لوریاں سنا دے اور میں دن رات سوتے
جاگتے، اٹھتے بیٹھتے۔۔۔ بس ثریا ہی سے
لو لگاتا رہوں۔ مجھے اس کی یاد سے دور
کرنے والا کوئی نہ ہو۔ اور پھر میں نے اپنے
تصور میں دیکھا کہ وہ میری ہی طرف آ رہی ہے۔

اس کی سیاہ زلفیں ناگ کی طرح بل کھاتی۔۔ شانوں سے
جھول کر پشت تک لہرا رہی ہیں۔۔۔ اس کی لانبی شاخ نما گردن
پر پیارا سا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح دمک رہا تھا۔ اور اس
خوشنما پھول میں دنیا بھر کے رنگوں کا حسین و جمیل امتزاج
تھا۔۔۔ گلے میں جھولتا ہوا کاسنی دوپٹہ ہوا کے دوش
پر بار بار جذبات کے کانپ رہا تھا۔۔ بالکل میرے دل
کی طرح۔۔ میری بانہوں کی طرح۔۔۔ آنکھوں پر پلکیں جیسے
کلیوں پر شبنمی موتی پھسل پھسل کر ٹھہر رہے تھے۔

کتنی ہی دیر میری نظریں ثریا کے اس حیرت زدہ عالم کو
دیکھتی رہیں۔۔۔ ذہن کے کینوس پر منعکس کرتی رہیں اور
پھر یہ سحر۔۔ یہ جادو۔۔۔ یہ طلسم اس وقت ٹوٹ گیا۔ جب
سکینہ نے اچانک ثریا کی طرف دیکھا اور اس کی نظروں کے
ہدف کی تاک میں پیچھے گھومی۔۔۔ وہ مجھے کھڑا دیکھ کر حیرت زدہ
بد حواس ہو گئی۔ اور اپنا دوپٹہ سر پر سنوارتے ہوئے یوں
گویا ہوئی۔۔۔

آپ کب آئے۔۔؟

بہت دیر ہوئی۔۔ میں نے جواب دیا۔۔ میرا ذہن اب
بھی ثریا کے حیا آلود تبسم میں ڈوبا ہوا تھا۔

ثریا تم نے مجھے کیوں نہ بتایا۔ سکینہ نے اس سے شکایت
کے سے انداز میں کہا۔۔ اس نے اشارے سے منع کر دیا تھا۔

تاکہ ایک دوسرے کو جی بھر کر دیکھ لیں۔۔۔ سکینہ نے مسکرا کر
اس کا فقرہ پورا کرتے ہوئے کہا۔

مگر تم کس سوچ میں گم تھی۔۔؟ میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے
اس سے پوچھا۔

بس یونہی برتن دھونے میں کھوئی تھی۔ سکینہ مسکرائی۔۔۔
میرے جی میں آیا اس سے پوچھوں کہ تو کوثر کے متعلق سوچ
رہی تھی۔۔ ان ستم زدہ لمحات پر غور کر رہی تھی جنہوں نے
میری بہن کو نگل لیا تھا۔ مگر مجھ میں یہ پوچھنے کی ہمت نہیں
تھی۔ میں یہی پوچھنے شہر سے آیا تھا۔ مگر سکینہ نے سامنے میرے
سخت جواب دے گئی تھی۔۔۔ الفاظ میری زبان پر ٹھٹھر گئے
تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر سکینہ نے میرے سوال پر اقرار
میں گردن ہلا دی۔۔ تو میں خود پر کیسے قابو پا سکوں گا۔ کیا
انجم میرے ہاتھوں سلامت رہ سکے گا۔ اگر میں کچھ نہ کر سکا تو
کیا باقی زندگی بے غیرت بن کر جیوں گا۔ ایک لمحے میں کئی عالم
گزر گئے۔۔۔ ایک پل صدیوں پر محیط ہو گیا۔ میرا ذہن ایک
دفعہ پھر سانپ کا زہر بھرا سر بن گیا تھا جو میری زبان پر ڈسنے
کے لیے مچل رہا تھا اور میری موت کا پیش خیمہ بھی ہو سکتا تھا۔
اسی لمحے میرے ذہن پر سلیم کے نعرے کی بازگشت تازیانہ بن کر
پڑی۔۔۔ ملک بختاور جہاندیدہ آدمی ہے۔۔ مجھ پر ہاتھ ڈالے
گا تو لوگ اصل معاملے سے آگاہ ہو جائیں گے۔

مجھے آج پہلی دفعہ احساس ہوا کہ سفید پوش دیوانے کیوں
ہو جاتے ہیں۔ ہر چیز تصرف میں ہونے کے باوجود وہ پاگل بن
کر گلیوں گلی کیوں گھومتے ہیں۔۔۔ چپ کی مہر ہونٹوں پر کیوں ثبت

کر لیتے ہیں۔۔۔ ہر لمحہ خلاؤں میں میں کیوں گھورتے رہتے ہیں اس لمحے میں خود کو دنیا کا مجبور ترین انسان تصور کر رہا تھا۔ کسی سے کچھ پوچھنا گناہ نہیں اور جو میں پوچھنا چاہتا تھا وہ میرا استحقاق بھی تھا۔ ۔ ۔ فرض بھی تھا۔۔۔ مگر مجھ میں ہمت نہ تھی۔ اپنے دامن کی دھجیاں سمیٹنے اڑانے کی مجھ میں طاقت نہیں تھی۔۔۔

کیا سوچنے لگے ثاقی۔۔؟

ثریا نے اپنے لہجے کی تمام تر مٹھاس ایک ہی فقرے میں گھولتے ہوئے کہا۔۔ مگر مجھے اس کا یہ فقرہ زہر لگا۔ جی میں آیا کہ کہہ دوں کہ تو ایک ناگن۔۔۔ زہریلے ناگ کی بہن ہے اور تجھ میں زہر اس سے کم نہ ہوگا۔۔۔ مگر میں اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میرے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

اپنی اس بے بسی پر میری آنکھیں بھر آئیں۔ اور میں غیر ارادی طور پر وہاں سے بھاگ آیا۔۔ میرے قدم انجانے طور پر حویلی کی طرف اٹھنے لگے۔۔ پھاٹک کا دروازہ کھلا تھا۔ میں آتے ہی بستر پر گر گیا۔ اور پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔۔۔ میں اپنی بے چارگی اور بے بسی پر دل کھول کر رو دیا۔

ثریا میرے اس چاہت سے دیکھنے اور نفرت سے منہ موڑ کر چلے جانے کو نہ سمجھ سکی۔۔۔ وہ کچھ لمحے سکینہ سے تکدر و تردد بھرے لہجے میں باتیں کرتی رہی۔ اور پھر میرے پیچھے حویلی میں چلی آئی۔۔۔

مجھے یوں بلکتا اور سسکتا دیکھ کر اس کی آہیں نکل گئیں وہ مجھ پر یہ حالت دیکھ کر شدتِ کرب سے چیخی۔۔

ثاقی۔۔! اگر مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے تو بے شک میرا گلا گھونٹ دے۔۔۔ اس نے سسکتے بلکتے انداز میں شدتِ غم کا اظہار کیا۔۔۔ اور کہا۔۔۔

مجھے مار دے ثاقی۔۔! تیرے یوں روٹھ کر چلے آنے سے تو بہتر ہے کہ میری جان نکل جاتی۔۔۔ مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو میں اس کی سزا جھیلنے کو تیار ہوں۔۔۔ مگر یہ نفرت کے تیر نہ برساؤ۔۔۔ اب تک پہلے وہ مجھے صرف انجم کی بہن نظر آتی تھی مگر اب وہ پھر سیاں۔۔۔ اس کے والہانہ و حقیقت سے بھرپور انداز نے اسے سیاں کے روپ میں بدل دیا تھا۔ مجھے روتا دیکھ کر وہ خاموش نہ رہ سکی۔۔ اور بولی۔

کیا سوچ رہے ہو ثاقی۔۔! ختم کر ڈالو مجھے تاکہ تشنگی ہمیشہ کے لیے بجھ جائے۔ مٹا دو اس نقش کو۔۔ جسے تیرے پاؤں کا نشان ہونے پر فخر ہے۔۔۔ اڑا دو اپنی راہ کی اس مٹی کو جو تیری راہوں میں ذرہ ذرہ بکھری پڑی ہے۔۔۔ بجھا دو اس چراغ کو جو تمہارے دامن کے دوش پر جل رہا ہے۔۔۔ اجاڑ دو ان خوابوں کو جو میں نے جاگتی اور سوتی آنکھوں سے دیکھے تھے۔۔۔ مسل ڈالو اس چمن زار کو جو تمہاری یادوں سے مہک رہا ہے۔۔۔ توڑ دو زندگی کے اس ہار کو جو تیرے گلے میں جھولنے کے لیے بے قرار ہے۔ ۔ چھین لو وہ مستعار کی بہار جو۔۔۔

بس کرو سیاں۔۔ بس کرو۔۔ میں نے کانپ رہی لرزتی نگاہوں سے اس کانپتے سیسے کا طواف کیا۔۔۔ اور وہ امر بیل کی طرح میرے ذہن پر چھا گئی۔۔۔ میں نے اس پر اتنا اعتماد کبھی نہ کیا تھا جتنا احساس اس نے مجھے آج دلایا تھا۔ آج مجھے پہلی دفعہ احساس ہوا تھا کہ لڑکیاں لڑکوں سے کس طرح دھوکہ کھاتی ہیں۔ مجھے اس کا بھی اعتراف کرنا پڑا کہ لڑکی جسے چاہے ٹوٹ کر چاہتی ہے۔ ۔ وہ محبت کی خاطر سب کچھ داؤ پر لگا دیتی ہے

ثریا اس امر کی واضح دلیل تھی جو میری عدم توجہگی پر بیکار ہو رہی تھی۔۔۔ کہہ رہی کہ نفرت کی بجائے مجھے مار ڈالو۔۔۔ تیرے بغیر زندگی کا تصور بھی اس کے لیے موت تھا۔۔۔ عورت کی اس کمزوری سے سیسے کا ندھا ٹھہرایا ہوگا۔ پھر کوئی بھی تو ایک عورت ہی تھی۔۔۔ ثریا اب بھی بلک رہی تھی۔

نہ رو سیاں۔۔! میں پیار بھرے لہجے میں کہا۔۔ تم نے ہی تو مجھے زندہ رہنے کا عزم بخشا تھا۔۔۔ میری زندگی تو فقط تمہارے جذبوں کی زیرِ بار ہے۔۔۔ میری زندگی کی ڈور تو تمہارے میرے متعلق احساسات سے منسلک ہے۔۔۔ تم میری آس ہو سیاں۔۔ زندگی ہو۔۔ متاع ہو۔۔ حاصل ہو۔۔ سبھی کچھ تو تمہی ہو سیاں۔۔۔

پھر۔۔ پھر مجھ سے روٹھ کر کیوں چلے آئے تھے۔۔ اس نے استحقاقی لہجے میں پوچھا۔

یہ ناراضگی بھی سچی محبت کا ایک مظاہرہ ہے۔ جو جانے بھی پیاروں سے ہوتی ہے۔۔ اور بات بے بات پہ بھی ہو جاتی ہے۔۔۔ یہ محبت کی پرکھ ہے۔۔۔ کسوٹی ہے۔۔۔ محبت کو ماپنے کا آلہ ہے۔۔۔ یہ کچے دھاگے کی مانند ہوتی ہے۔۔۔

مگر ماں جیسا کہ اس ناراضگی کا پہلو محبت کی تکمیل نہیں بلکہ کسی اور . . . ؟

میں نے ثریا کا فقرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی گویا تسلیم کرتے ہوئے کہا :

ہاں ثریا . . . تم ٹھیک کہتی ہو . . . مگر یقین کرو میں تم سے نہیں روٹھا تھا . . . تمہاری صورت میں انجم کی تصویر نظر آگئی تھی . . . پھر [illegible] بات کرب سے بات واضح کر دی . .

وہ تڑپ اٹھی . . جیسے میں نے اس کے کانوں میں گرم گرم سیسہ انڈیل دیا ہو .

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں . . .

اور جواب میں میں نے اپنے خدشات کا اظہار اس سے کر دیا . . . جسے سن کر ثریا سکتے میں آگئی . . . اور پھر اس نے مجھ سے عہد کیا کہ میں سکینہ سے پوچھ کر تمہیں واقعات سے آگاہ کر دوں گی . . .

میری اطلاع ثریا کے لیے ایک تازیانہ تھی . . . سو وہ بوجھل قدموں سے اٹھ کر باہر چلی گئی . . . میری سوچیں ایک دفعہ پھر ان اذیت ناک لمحات کے بھنور میں ڈوب گئیں . جو میں نے شعور کی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے دیکھے تھے . میرا ذہن پھر باغی ہو رہا تھا . . ثریا کی وفا شکست انکاری ہو رہا تھا . گو میں نے اپنے ذہن کا بوجھ ثریا کے ذہن پر منتقل کر دیا تھا . . . مگر مجھے اطمینان نہیں تھا . . میں سمجھ نہیں رہا تھا کہ وہ اپنے بھائی کو میری نظروں میں کیونکر ننگا کرے گی . مجھے یہ علم تھا کہ وہ سکینہ سے پوچھے گی ضرور . .

مگر یہ یقین نہیں تھا کہ وہ سکینہ کا انکشاف حرف بحرف میرے گوش گزار دے گی . . . مگر اسی شام ثریا نے جو مجھے بتایا کہ وہ میرے حواس کے لیے بجلی کا کرنٹ تھا .

سکینہ نے بتا دیا تھا کہ کوثر انجم سے بے انتہا محبت کرتی ہے اور وہ دل و جان سے چاہتی ہے . . . وہ کسی قیمت پر اسے کھونا نہیں چاہتی وہ خاموشی سے حاصل کرے گی . . . یہ کہہ کر

ثریا خاموش ہو کر سسکنے لگی . . . مجھ میں تاب نہ تھی کہ میں اسے فقرہ مکمل کرنے کے لیے کہتا . . وہ جو کہہ رہی تھی . میں ہونٹ بھینچ کر آنکھیں بند کیے سن رہا تھا . . . کچھ دیر بعد

وہ دوبارہ بولنے لگی .

ایک دن میں اور انجم [illegible] پکچر دیکھنے چلے گئے ، فلم کا [illegible] آیا تھا مگر اس بات کا سبب [illegible] تھا . پھر ایک دن [illegible] آگیا . . . [illegible] سکتی تھی . اس کا خیال تھا اس کا [illegible] انجم کو بھی شادی پر مجبور کر دے گا . مگر انجم کا جواب سن کر وہ [illegible] سے بے گانہ ہو گئی .

اب [illegible] دن سے [illegible] نے [illegible] اس سے ذلیل کرنے سے اس نے بہتر یہی سمجھا کہ اس ظالم دنیا سے ہی چھٹکارا حاصل کر لیا جائے اس سے پہلے کہ [illegible] کے عالم میں [illegible] انجم کے بے بدد ماغی جیسے سن کر [illegible] کا کلیجہ پھٹ گیا . . . اس کی آنکھوں سے [illegible] جھلکنے لگا . وہ برق کی سی تیزی سے کمرے سے نکل [illegible] ہی خون میں نہا گیا اور . . .

بس کرو ثریا بس کرو . میں دھاڑا . . میرے اندر گرد بم پھٹ رہے تھے . شعلے جیسے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے . . . ساری کائنات میں آگ سی لگ گئی تھی . . میں رو رہا تھا . . . ثریا بلک رہی تھی . . جیسے یہ آگ [illegible] نہیں اس کے دامن میں لگی ہو . وہ کہہ رہی تھی .

ثاقی . . . سب جلا دینا . . . راکھ کر دینا مگر مجھے خود سے جدا نہ کرنا . . . میں تیرے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی .

وہ کہہ رہی تھی .

انجم میرا بھائی ہے مگر میں تیرے سامنے خدا کو گواہ بنا کر قسم کھاتی ہوں کہ آج سے وہ میرا کچھ نہیں لگتا . . . میرا اس سے کوئی رشتہ نہیں . . . کوئی ناطہ نہیں . . . میرا اگر ہے تو وہ فقط تو ہی تو ہے . . .

ثریا کتنی ہی دیر سینہ کوبی کرتی رہی . بلکتی رہی . . پھر سسک کر بولی .

ثاقی . . ! تمہاری اس خاموشی سے بڑا کرب میرے لیے اور کوئی نہیں ہے . . . خدا کے لیے میرے متعلق جو فیصلہ ہے جلدی سے سنا دو . . . مجھے بتا دو کہ آپ نے میرے لیے کون سی

سرا تجویز کی ہے۔

میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا... حقیقت کھل کر سامنے آ گئی تھی... مگر میں لاچار تھا... مجبور تھا... بھری دنیا میں تنہا تھا... انجم کے متعلق سوچا تو ہر پہلو تاریک نظر آیا اور آخر انجام میں نے اس رخ پر سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ گو یہ ایک کرب انگیز بات تھی مگر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ پھر ثریا بھی میرے حواس پر بری طرح چھا گئی تھی... وہ میری کمزوری بن گئی تھی... چنانچہ میں ثریا کے حصول کی خاطر سب کچھ خاموشی سے برداشت کر گیا...

انہی دنوں تایا کریم بخش کا انتقال ہو گیا۔ ثریا بلک بلک کر روئی... میں بھی غم سے نڈھال ہو گیا... کیونکہ میرا ایک مضبوط ترین سہارا چھن گیا تھا... میرے والد کی وفات کے بعد انہوں نے مجھے کسی قسم کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔

باپ کی وفات کی خبر انجم کو بھی دی گئی... وہ آیا تو اس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان صفدر اور اس کی والدہ بھی تھی... صفدر انجم کے دفتر میں ایک اعلیٰ عہدے دار تھا۔ صفدر اور اس کی ماں تین دن یہاں رہے۔ ان تین دنوں میں صفدر کی ماں نے ثریا کی ہزاروں بلائیں لیں... ہر وقت اسے پاس بٹھائے رکھتی۔ صفدر کی ماں کی ہمدردی اور اخلاق نے ثریا کے دل میں اپنے لیے کافی جگہ بنا لی تھی۔

چالیسویں پر صفدر کی ماں اور اس کی جوان بیٹی رضوانہ دونوں آئیں... ثریا کو دیکھ کر ماں بیٹی نے مسکرا کر ایک دوسرے کو کچھ کہا اور پھر اپنی روانگی سے قبل ثریا کی ماں سے صفدر کی ماں کہنے لگی۔

بہن اچھا ہو کہ ہم دونوں مل بیٹھیں۔

بہن یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا تھا... ثریا کی ماں نے مسکراتے ہوئے رضوانہ کی ماں سے کہا اور اسی لمحے رضوانہ شرماتی ہوئی درمیان سے اٹھ گئی۔

میں آپ کو قول دیتی ہوں اور انجم کو اپنی فرزندی میں لینے کی دعوت قبول کرتی ہوں... بشرطیکہ آپ صفدر کو اپنا بیٹا بنا لیں... رضوانہ کی ماں نے کہا۔

انجم سے مشورہ کر کے میں آپ کو آگاہ کر دوں گی... ثریا کی ماں نے جواب دیا۔

کسی رشتہ دار سے مشورہ کرنا ہے تو ٹھیک ورنہ انجم سے بات ہو چکی ہے اور طے ہے... رضوانہ کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس سانحے کی اطلاع مجھ سے پہلے ثریا کو ملی... اس کی روح تک کلبلا اٹھی... مگر گھر آئے مہمانوں کے پیش نگاہ وہ خاموش رہی... منگنی کی رسم ایک ہفتہ بعد ہونا تھی۔ جسے صفدر کے ماں باپ کو آنا تھا۔

اگلے دن انجم... رضوانہ اور اس کی والدہ خوشی خوشی شہر روانہ ہو گئے... اور ادھر ثریا نے اپنی ماں سے صاف انکار کر دیا۔ ماں نے کافی سمجھایا مگر اس عزم کے پہاڑ پر خراش تک نہ آئی...

وہ اس فیصلے پر نہ تو روئی اور نہ ہی چلائی... بس مسلسل انکار کرتی رہی۔

انجم طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک دن پہلے گھر آ گیا... جبکہ صفدر کے والدین کو کل آنا تھا۔ انجم گھر پہنچا تو اسے صورت حال کا علم ہوا...

اس نے نرمی سے ثریا کو سمجھانے کی کوشش کی مگر ثریا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ انجم نے حالات یوں کشیدہ ہوتے دیکھے تو جوش میں آ کر یہ فیصلہ سنا دیا کہ اس گھر میں وہی ہو گا جو میں چاہوں گا۔

ثریا نے آہستہ سے کہا کہ میں آپ کا یہ فیصلہ زندہ جی قبول نہیں کروں گی... البتہ میری لاش پر آپ کو اختیار ہو گا۔ چاہے کسی کے حوالے کر دے...

انجم اپنی خوشی کی سرشاری میں ثریا کی بات سنی ان سنی کر گیا... حالانکہ ثریا کے جذبات میں لچک تھی نہ اس کی آواز میں لوچ..

انجم صفدر کا دوست تھا... اس کا صفدر کے گھر بلا روک ٹوک آنا جانا تھا... صفدر کی ماں بھی انجم کو بیٹے کی طرح چاہتی تھی۔ انجم نے اپنے ذہن کی جولانیوں سے کام لے کر صفدر کو کافی حد تک متاثر کیا تھا... انجم کی اس سعادت مندی کے پیچھے رضوانہ کی عشوہ طرازیوں کا بھی کافی عمل دخل تھا۔ وہ تھی ہی ایسے حسن کی مالک کہ انسان ایک دفعہ دیکھ کر دوبارہ دیکھنے کی تمنا کرے... انجم جیسے رانجھے کے لیے تو وہ دو آتشہ تھی... پڑھی لکھی تھی... اور اس پر نیشن درادستگری سے

بس... انجم نے جو سوچا تھا... وہ آج پورا ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں کسی تردد کا شائبہ تک نہیں تھی۔ اس کو کسی کی خوشیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بس ایک دھن تھی کہ اس کے سپنے پورے ہوتے ہیں۔ اس کی جاگتی آنکھوں کے دیکھے خواب شرمندہ تعبیر ہو رہے ہیں۔ اپنی خوشی کی سرشاری میں اسے ہر چیز مسکراتی نظر آ رہی تھی

اگلی صبح مہمان آ گئے... مگر ثریا نے کسی کا سامنا نہیں کیا.. ثریا کی ماں بھی بجھی بجھی رہی... البتہ انجم پیش پیش رہا.. اگلی صبح ثریا کی ماں نند کے کہنے پر اپنے منہ زور بیٹے کے ساتھ اس کی منگنی کی رسم ادا کرنے چلی گئی... مجھے اس ایسے کی اطلاع ملی تو میں نوشتہ تقدیر اپنی آنکھوں سے پڑھنے کالج سے گھر چلا آیا... یہ میری زندگی کا آخری تماشا تھا... جسے میں جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔

میں ہر چیز ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھتا رہا مجھ سے کسی نے کچھ نہیں پوچھا اور نہ ہی میں نے کسی سے کچھ کہا اس واقعے میں میری حیثیت محض تماشائی کی تھی.. البتہ ثریا میری طرف دیکھ کر کانپنے لگتی تھی اس کے ہونٹ لرزنے لگتے تھے... وہ اپنی آنکھوں کا سمندر دکھا کر کسی کونے کھدرے میں چھپ جاتی تھی.. اور میں مدوجزر کا تلاطم سینے میں چھپائے بیٹھک میں لوٹ آتا تھا۔

میں لیٹ کر چھت کو گھورتا رہتا... دیوار کا لکھا بالکل صاف تھا... مجھے یہاں کی ہر چیز صحراؤں سے زیادہ بے رونق نظر آ رہی تھی... یہاں رہ کر میں نے ہر چیز اپنی آنکھوں سے اجڑتی دیکھی تھی... اور آج میرے سامنے میری دنیا اجڑ رہی تھی...

میں بے آب و گیاہ صحرا میں خود کو تنہا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اپنی جنم جنم کی ساتھی بیٹھک کی ہر چیز کو حسرت سے دیکھا اور کسی سے کچھ کہے بغیر باہر نکل آیا... میرے قدم شہر کی جانب اٹھتے جا رہے تھے۔

میں کالج پہنچ کر اپنے کمرے میں مقید ہو گیا۔ میرا جسم اس چھوٹے سے کمرے میں بند تھا۔ اور روح جسم کی قید میں پھڑپھڑا رہی تھی... یاس و ناامیدی کے اس بحرِ بے کنار میں بھی امید کی ایک کرن جگمگا رہی تھی۔ دور کہیں آس کا دیا ٹمٹما رہا تھا دل کے کسی نہاں خانے میں روشنی اب بھی تھرک رہی تھی... یہ روشنی ثریا کے بخشے ہوئے اعتبار کی تھی... اس کی وفاداری کی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو کیسے انکار کی تھی ورنہ اس دنیا میں میرا رہ ہی کیا گیا تھا۔ ایک ایک کر کے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ سب کچھ لٹ گیا تھا... اب تو میری زندگی کی ڈور محض ثریا کے بخشے ہوئے بھروسے کے طفیل سلامت تھی... ورنہ اب میرے درد پر بلکنے والا کون تھا... میری موت پر آنسو بہانے والا کون تھا...؟ مجھے یقین تھا کہ ثریا کی جگر سوزی دو دکھیارے دلوں کو حیات جاوداں بخشے گی اور ہماری چاہتیں... ہماری محبتیں... ساحل مراد پا لیں گی۔

میں سوچ رہا تھا کہ بھابی کوئی زمانہ ہے کہ اپنے ساتھ بڑا بھی مگر ابھی ہن سے [illegible] ہیں ہو سکتا کہ اسے [illegible] ہوں... وقتی طور پر انجم جذبات کی رو میں بہہ رہا ہے... مگر بہت جلد.. جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگا.. تو وہ اپنی تمنا پہ میری دوستی کو ترجیح دے گا۔ یوں ہی اپنے دل کو تسلیاں دیتے ایک ہفتہ گزر گیا... مگر دل کو سکون میسر نہیں تھا... جیسے شب خیزی میرا مقدر بن گئی تھی... دن تو جیسے تیسے گزر جاتا مگر رات پہاڑ بن کر آتی۔ ساری رات میرے دل کے چراغ میں خون جلتا اور دماغ میں خدشات کا لاوا پکتا...

ایک شام میں اپنے کمرے میں بیٹھا ماضی کے فسانوں کے ورق ادھیڑ رہا تھا.. سلیم اپنی چارپائی پر لیٹا کسی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ سکینہ کا شوہر سکندر کمرے میں آیا۔ میں اسے اچانک دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے سلام کے بعد اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

ثریا نے بھیجا ہے..

اس نے خود تجھے دیا تھا.. میں نے لفافہ پکڑ کر بے اختیار اس سے پوچھا۔

نہیں... مجھے سکینہ نے دیا تھا... اور کہا کہ ابھی تک پہنچا دوں سو حاضر ہوں۔

میں نے دھڑکتے دل سے لفافہ چاک کیا۔ تہہ شدہ کاغذ

کھولا... تحریر ثریا کی تھی.. لکھا تھا.

میرے ثاقی!

کہاں ہو تم... آہ! تو وہ... مجھے کس کے حوالے کر گئے ہو کیا مجھ سے روٹھ گئے ہو. مگر... مگر جس سے پیار کیا جاتا ہے اس سے روٹھا نہیں جاتا.

آہ ثاقی..! میرے زخم دل کا نظارہ تو کرو... اس وقت میرے زخموں پر بہار ہے مزید برآں نشتر میرے گرد منڈلا رہے ہیں.. طمانچے ہیں جو میری روح پر پڑ رہے ہیں ذرا دیکھو ثاقی..! یہ تازیانے اٹھاتے پھرتے ہیں. میرے ارمانوں کے لیے... میری محبت کے لیے.. یہ خوشیاں خریدنا چاہتے ہیں. میری خوشیوں کے بدلے.. مجھے بیچنا چاہتے ہیں اپنی خوشیوں کے لیے... اپنے ارمانوں کی مزاریاں سجانا چاہتے ہیں... مہکتے جذبات کے پھولوں سے... اپنے چمن زار کو مہکانا چاہتے ہیں... میرے دل کی کلی کی مہکار سے...

ثاقی..! کچھ تو جواب دو کہ میں صحرا میں کھڑی تمہیں پکار رہی ہوں... اس صحرا میں کھڑی ہوں جس کی حدت نے مجھ کو مجھی سے چھین لیا ہے... تمہیں پا لینے کی آرزو نے مجھے لہولہان کر دیا ہے. تمہارے حصول کی ضد نے مجھے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے... جس کے ایک طرف نفرت انگیز زندگی ہے. زمانے کی لعنت ہے. معاشرے کی بے اعتنائی اور ستم ظریفی ہے اور دوسری طرف.. کانٹے ہیں. خون کا ناسور ہے... ہڈیوں کو سدا سلگائے رکھنے کا بارود ہے...

ثاقی..! اس صحرا کی شدت حدت نے مجھے آبلہ پا کر دیا ہے... میری زبان کو مفلوج اور میرے ہونٹوں پر بے بسی کی پپڑیاں جما دی ہیں... کتنے حسین خواب دکھائے تھے اس زندگی نے... آنکھ کھلی تو سب سراب ہو گئے... مہکتے دنوں کے خوشبودار خواب.. بدبودار تعبیریں بدل گئے. لالہ زاروں کے خواب دیکھے تھے... مگر ویرانے مقدر بن گئے. آرزوؤں کے محل سپنوں میں سجائے تھے مگر تقدیر کی آندھیوں نے جھونپڑی کے تنکے تک اڑا دیے...! پچھلے دنوں کے برے خواب سنگلاخ راہوں پہ ڈال گئے ہیں... ان راہوں پہ ڈال گئے ہیں...

یہاں چاروں سو آندھیاں ہیں... اندھیرا ہے. ہر طرف آسیب لہرا رہے ہیں...

ثاقی.. کتنے ارمان تھے میرے دل میں تمہاری یادوں کو خوشیوں میں بدلنے کے... میں نے سوچا تھا کہ تمہارے سونے سونے من کے گلزار کو سدا سہاگن بہاروں سے ہمکنار کر دوں گی. اپنے خون سے تمہارے من کے مرجھاتے ہوئے پودوں کی آبیاری کروں گی... تمہارے چہرے سے ساری نقاہتیں نوچ کر... مایوسیاں چھین کر.. خزاں کا طلسم توڑ کر... اسے بہار جاوداں سے ہم آہنگ کر دوں گی. مگر... مگر زمانے کے ناخداؤں نے میری تمناؤں... میری آرزوؤں... میری چاہتوں کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا ہے.. ہر وہ امید کو توڑ دیا ہے جس سے میں تیرے حصول کی ہلکی سی دھندلاہٹ بھی دیکھ سکوں...

ثاقی..! میں مایوس ہو گئی ہوں مگر میں تجھے مایوس نہیں ہونے دوں گی.. میں ازل سے تیری ہوں اور ابد تک تیری رہوں گی. تیرے سوا مجھ پر کوئی بھی حق نہیں جتا سکتا. میری روح پر صرف اپنا کیا حق جتائے گا... وہ تو میرا جسم بھی حاصل نہیں کر سکے گا میں تیری ہوں.. ہر حال میں تیری.. آہ... میری صورت کو آخری پیار کر لو.

فقط تمہاری بدنصیب

ستیاں

خط کیا تھا ایک آتش فشاں تھا.. جو میرے دل و دماغ میں پھٹا تھا میرے اردگرد پرآشوب آندھیاں سی چلی تھیں میں نے ثریا کی خاطر مقدر کی ہر ستم ظریفی سہہ لی تھی. ہر اس داغ کو بھول گیا تھا جو ناسور سے کم نہیں تھا. اقتدارِ زمانہ اور ثریا کی رفاقت نے میرے ہر زخم کو مندمل کر دیا تھا. مگر آج اس کے خط نے میرے سارے زخموں کو کھرچ ڈالا تھا. وقت نے میرے مجروح خالوں پہ گرد کی جو تہہ چڑھائی تھی. وہ طوفان کے ایک ہی جھونکے سے فضاؤں میں منتشر ہو گئی... زخم پھر رسنے لگے... رات آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی.. مگر سوچوں کے ناگ میرے انگ انگ کو ڈس رہے تھے... میرا جسم جل رہا تھا... ذہن سلگ رہا تھا.. اور بدن کا ہر جوڑ درد ثاقی بنا ہوا تھا... میں نے سامنے دیکھا سلیم کی الماری کھلی پڑی تھی... مجھے یاد آیا کہ ایک دن سلیم کی نیند بھی اس سے روٹھ گئی تھی... تو وہ کوئی کیپسول لایا تھا. شاید کوئی پڑا ہو...

جواب عرض لاہور

میں کتنی ہی دیر ایسی تو بت مجتمع کرتا رہا۔ پھر میں سلیم کی میز تک گیا تو چند کیپسول مل گئے۔ میں نے دو یا تین کے قریب نگل لیے۔ چند لمحوں بعد میرا سر بھاری ہونے لگا۔۔ اور مجھے یاد نہیں رہا

کیپسول کھانے کے باوجود میری آنکھ صبح بہت پہلے کھل گئی اور ذہن مزید بوجھل تھا۔ اور جسم بھی ٹوٹ رہا تھا۔ مگر دیکھنے جاننے والا کوئی نہ تھا۔۔ پھر مجھے کون پہچانتا۔۔ آخر انجام سے بے خبر ہو کر میں نے متواتر کیپسولز کا سہارا لینا شروع کر دیا۔۔۔

اور پھر۔ ایک دن میں نیم بے ہوشی کے عالم میں کمرے میں پڑا تھا کہ سکندر ہانپتا ہوا اندر آیا۔ اور مجھے جھنجھوڑ کر آہیں بھرتا ہوا بولا۔۔۔

ثاقب۔ !ثریا نے خودکشی کر لی ہے۔۔۔ وہ خاموش ہو کر میرا ردعمل دیکھنے کے لیے ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ مگر میں محض پھٹی پھٹی سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔۔۔ میرے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔ کہانی ہی ختم ہو گئی تھی۔۔ میری زندگی کا آخری ستارہ بھی میرے دل کے آسمان پر یاس کی نہ مٹنے والی لکیر چھوڑتا ہوا افق کے اس پار گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا۔۔۔ میرے من کی سرمئی شام کی شفق بھی اندھیروں میں منتشر ہو کر انہی میں جذب ہو گئی تھی۔ میرے آسمان کے چاند کو افق کے آسیب ہمیشہ کے لیے نگل گئے تھے۔۔۔ پروانے جل کر راکھ ہو گئے تھے۔۔۔ اور شمع ابھی جھلملا رہی تھی۔ میرے سینے میں چیخیں مضطرب تھیں۔۔۔ مگر میرے ہونٹوں نے میرا ساتھ دیا۔ میں اتنے برسوں کی عبادت و ریاضت کو یوں ایک لمحے میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میری محبت کو گوارا نہیں تھا کہ میری چاہتیں بدنام ہو جائیں اور پیار رسوائی کی آگ میں ہمیشہ جلتا رہے۔ میں نے منہ تکیے میں چھپا لیا۔ باوجود استقامت کے میری دکھی اور تڑپتی آنکھوں سے خون کے گرم گرم قطرے تکیے کی پہنائیوں میں جذب ہو گئے۔

میری کتاب زندگی کا آخری باب مکمل ہو گیا تھا۔ میری زندگی کی مالا کی ڈور ٹوٹ گئی تھی اور موتی بکھر گئے تھے۔ میری زندگی کا بکھراؤ ت کے کفن میں سمٹ گیا تھا۔ وہ پل۔۔ وہ لمحہ۔۔ وہ ثانیہ بیت گیا۔۔۔ جو برسوں کی رفاقت پر محیط تھا۔

نہ جانے سکندر کب گیا۔ میں نے لیٹے لیٹے میز کی دراز کھولی۔ اور قطرہ قطرہ زہر ٹپکانے کی بجائے ایک ہی دفعہ شیشی خالی کر ڈالی۔۔

تیسرے دن میری آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا اور ڈاکٹر میرے گرد سوالیہ نشان بنے گھوم رہے تھے۔ سلیم اور اس کے والدین میری چارپائی کے قریب کھڑے ہاتھ مل رہے تھے۔۔

مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر ڈاکٹر مسکرانے لگے۔ سلیم کے والد مجھے زندہ دیکھ کر بولے۔

بیٹا۔۔ !یہ تم نے کیا کیا؟ مگر میرے پاس بھلا اس سوال کا کیا جواب تھا۔ یہ سوال تو مجھے ان سے کرنا تھا۔ جنہوں نے مجھے دوبارہ اس آگ میں پھینک دیا تھا۔ یہاں سے میں فرار ہو گیا تھا۔ اسی زندگی کی صلیب کی نوک پر لٹکا دیا تھا۔ جہاں سے میں تڑپ کر گرا تھا۔

جواہر پارے

۱۔ صبر کی تلخی، علم کی حلاوت اور عمل کی سختی وہ دوا ہے جس سے دل کی ہر بیماری کا علاج ہو سکتا ہے۔
۲۔ علم مومن کا گم گشتہ مال ہے، جہاں سے بھی ملے لے لو۔
۳۔ اتنا کھاؤ، جتنا ہضم کر سکو۔
۴۔ سب کے ساتھ خندہ پیشانی سے ملو، نہ جانے کس روپ میں خدا مل جائے۔

(مرسلہ: طارق ظفر، فیصل آباد)

بے وفا محبت

مجھے چاند سے محبت ہے مگر چاند تو اپنے تاروں کے لیے چاندنی بکھیرتا ہے، مجھے گلاب کے پھول سے محبت ہے مگر یہ مرجھا کیوں جاتا ہے، مجھے روشنی سے محبت ہے مگر رات کو اندھیرا کیوں ہو جاتا ہے مجھے خوشی سے محبت ہے مگر میری آنکھیں کیوں بھیگی ہوئی ہیں آخر میرے دل نے سمجھا کہ محبت بے وفا ہوتی ہے۔

(مرسلہ: ظفر زدہ، ساقی، معاویہ والہ)

کی
سوغات
تحریر- ایس اے خان فضیل آباد

مکرمی و محترمی شہزادہ عالمگیر صاحب:

تسلیمات۔ ۔ ہزاروں خامیوں اور بے شمار غلطیوں کے باوجود۔۔ "یادوں کی سوغات"۔ لے کر جواب عرض کی دکھی بزم میں حاضر ہونے کی جسارت کر رہا ہوں، امید ہے آپ اس کو بوٹ بلیک سمجھ کر نیم تبسم رد نہیں کریں گے۔۔ "یادوں کی سوغات"!۔۔ کوئی افسانہ نہیں بلکہ یہ کسی کا افسانہ نہیں بلکہ یہ تو میری میڈیکل کالج میں پانچ سالوں کی ڈائری ہے۔۔۔

شہزادہ جی! جب میں کالج میں ایڈمشن نہیں ملا تھا تو ذہن میں ایک آئیڈیل سا بنا رکھا تھا۔۔ آہستہ آہستہ گی۔ دکھ اور غلیظ دیکھ کر یہ احساس شدت سے ہوا گیا کہ میڈیکل کالج میں۔ پہلے آئیڈیل سے محبت رہنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ایف ایس سی میں فرسٹ ڈویژن لے کر میڈیکل میں داخلہ لینا اور پھر پیشہ ورانہ امتحانات پاس کر کے ڈاکٹر بن جانا۔ ۔ اور پھر اس "محبت" کرنے کے جذبے کو جلی نے اور ہوا دی اور محبت کرنے کا ایک نیا ڈھنگ سکھایا۔۔۔ اور پھر محبت کرتے کرتے میڈیکل کالج کے پانچ سال بیت گئے۔ اس دوران اپنی مال و متاع کے بے دریغ اسراف کے ساتھ وقت کا بری طرح سے ضیاع کیا۔ اور سوائے دکھ، محبت، رنج اور ناکامیوں کے کچھ نہ ملا۔ اگر پیچھے آنے والے دوستوں نے میری حالت دیکھ کر صحیح راستہ اختیار کر لیا تو میں سمجھوں گا کہ میرے وقت کے ضیاع کی تلافی ہو گئی ہے۔۔۔

شہزادہ صاحب! محبت، پیار، پریم اور خلوص سب محض خوبصورت الفاظ ہیں۔ اس نام کے جذبات اور احساسات بالکل ناپید ہیں۔ نہ تو محبت کا کوئی وجود ہے اور نہ ہی کوئی محبت کرنے والا اس نفسا نفسی کے دور میں موجود ہے۔ اگر محبت کا واقعی کوئی جذبہ ہوتا تو مجھے اپنی وفاؤں اور خلوص کا صلہ یوں نفرتوں میں نہ ملتا۔۔۔ ایک طالب علم کے لیے صرف اور صرف حصول تعلیم ہے اور پھر تنہا نا بچوں کے معدے کے لیے کھیل، بس صرف اور صرف یہی کچھ۔۔۔ باقی سب کچھ دماغ کا خلل ہے۔۔۔

آپ کا مخلص۔۔

ایس اے خان، فائنل ایئر

سی/۱۰ جناح ہال، پنجاب میڈیکل کالج۔ فیصل آباد۔

میں سوات کی سیر کرنے کے بعد واپس آیا تو بالکل تازہ دم تھا۔ میرا روم میٹ ٹونی اور میں کالج میں گھوم پھر رہے تھے۔ اس دوران ٹونی مجھے کالج کی نئی تازی خبریں بھی سناتا جا رہا تھا۔ یہ ٹونی کی عادت تھی کہ وہ وقت کے پہلے ہی لمحوں میں نئے حالات سے آگاہ کر دیتا تھا۔ اچانک ٹونی نے میرا ہاتھ پکڑا اور ہم لائبریری میں جا گھسے۔۔۔

"ادھر کیا کریں گے۔۔؟"۔ میں نے حیرانگی سے کہا۔ "ابھی میرا سٹڈی کرنے کا کوئی موڈ نہیں!"۔۔

"مجھے پتہ ہے پیارے!"۔۔ ٹونی نے اپنے مخصوص انداز میں چٹکی بجائی۔۔۔ "سہمی ہوئی کبوتریاں لائبریری میں گھسی ہیں اور اب "فنڈ مس، فنڈ موں" کرنے میں مصروف ہیں"۔ اس نے کہا۔

فرسٹ ایئر کی ساری لڑکیاں فولنگ کے خوف سے سہمی ہوئی سمٹ کر ایک لائن کے میز اور کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ٹونی ایک ایک کی تفصیل بتانے لگا کہ اس کو نمک اور بے مرچوں والی پوری روٹی کھلائی ہے۔۔۔ اس کو چھ مرتبہ آفس کی جانب لیٹرین اور باتھ کا راستہ دکھایا ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔

اور پھر ایک لڑکی پر آ کر وہ رک گیا اور کہنے لگا:

"بہر حال وہ لڑکی پڑھی لکھی ہے، لیکن ہے بڑی سادہ سی۔ بحث اس نے فولنگ کے معاملے میں کسی کو نہیں چھیڑ دی اور اس کا نام سمیرہ ہے" سمیرہ ایک میز پر کتاب رکھ کر پڑھ رہی تھی۔ اس نے گرمیوں کا براؤن ٹائپ سے کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر سیاہ رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ سفید مکھن جیسی رنگت، اچھا خاصا نکلتا ہوا قد، صحت مند جسم، ہرنی جیسی بڑی بڑی آنکھیں اور چہرے پر بڑا وقار اور تمکنت سی تھی۔۔۔ بس سمیرہ مجھے دوسری لڑکیوں سے الگ تھلگ سی لگی۔ کہ اس کی شخصیت خاصی جاذب نظر تھی۔۔۔ ٹونی نے میری دلچسپی بھانپ لی۔ اور ہم دونوں اس کے پاس پہنچ گئے۔۔۔ میں نے ذرا گلا کھنکارا تو اس نے اخبار سے نظریں ہٹائیں اور ہماری طرف متوجہ ہوئی۔

"کالج میں داخلہ مبارک ہو"۔۔۔ میں نے سلسلۂ کلام شروع کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ"۔۔۔ اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"یہ میرا دوست ٹونی ہے اور سیکنڈ ایئر میں پڑھتا ہے اور اس نے مجھے بتایا ہے کہ آپ بہت مغرور ہیں، سینئر ساتھیوں کا بھی آپ کو لحاظ نہیں۔"

"جی نہیں۔۔۔ میں نے تو ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔" اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔

"دیکھیے دراصل یہ گیت گانا، ریل گاڑی چلوانا یا حد سے زیادہ نمک مرچ والی روٹیاں کھلانے کا مقصد کسی کو بے عزتی کرنا نہیں ہوتا، دراصل یہ صرف تعارف کے بہانے ہوتے ہیں۔۔۔"

"جناب۔۔۔" وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب تو ہم کالج کی باقاعدہ اسٹوڈنٹس بن چکی ہیں۔ کالج آئے ہمیں پورا ہفتہ گزر چکا ہے۔ اس کے باوجود بھی آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ تعارف مکمل نہیں ہوا تو میں آپ کا ہر حکم بجا لانے کو تیار ہوں۔"

"نہیں نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ میرا مقصد آپ کی فولنگ نہیں تھا۔ میں تو محض آپ کو زندگی کا ایک اصول سمجھا رہا تھا کہ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے

پیار"۔۔۔ میں نے کہا۔

"میں آپ کے اس سلوک کے لیے آپ کی بے حد ممنون ہوں"۔ وہ پہلی مرتبہ خوشدلی سے مسکرائی۔

"آپ کہاں سے تعلق رکھتی ہیں؟"

"میانوالی سے"۔۔۔

"میانوالی"۔ ٹونی نے خوشدلی سے تالی بجائی۔ "اوہ پھر تو اس پردیس میں ہم شہر اکٹھے ہو گئے"۔ ٹونی نے لفظ "پردیس" پر دیہاتیوں کا سا انداز اختیار کیا۔ تو ہم سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

اب ٹونی فل سپیڈ سے بولے جا رہا تھا اور ہم دونوں سنے جا رہے تھے۔ کبھی کسی بات کا تذکرہ اور کسی وقت سٹڈی کے بارے میں قیمتی مشورے۔۔۔ ابھی اس کی یہ تقریر جاری تھی کہ لڑکیاں اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھنے کی تیاری کرنے لگیں۔۔۔

"یہ ہیں میری دوست فوزیہ اور نوشین۔۔۔ اب اجازت کیونکہ پیریڈ شروع ہونے والا ہے"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔۔۔" ٹونی نے اسی انداز سے جواب دیا۔۔۔ "بہرحال کسی چیز کی بھی ضرورت ہو بلاتکلف بتا دیا کریں"۔۔۔

"جی ضرور"۔۔۔ اور وہ سب چلی گئیں۔

⁂ ⁂ ⁂

یہ میری عادت ہے کہ جب میں سٹڈی کے لیے بیٹھتا ہوں تو بالکل ہلکی آواز سے ٹیپ ریکارڈر چلا دیتا ہوں۔ اور پوری یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کرتا ہوں۔ ذہن صرف اور صرف کتاب میں الجھا ہوا ہوتا ہے۔ باہر کی آوازیں اور ٹیپ سے ابھرتی ہوئی میوزک ایک دوسرے کو بے اثر بنا دیتی ہیں اور میں پورے انہماک سے پڑھتا رہتا ہوں۔

لیکن آج۔۔۔

آج معاملہ ذرا مختلف تھا۔ بار بار میری توجہ سٹڈی سے بھٹک جاتی تھی اور میرے ذہن میں بجائے مطالعہ کے مفہوم کے سمیرہ سے ملاقات کے مختلف لمحے گھومنے لگے تھے۔ کئی مرتبہ میں نے متہ

آنکھوں میں بہت گہرائی سی محسوس ہوئی۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میری روح اس کی آنکھوں کی سیاہی میں جذب ہو کر اس کے بدن کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ مجھے وہ بہت ہی دل کو اچھی لگی . . . وہ سرتا پا چاہنے کے قابل لگی۔ اس کے سبز دوپٹے میں لپٹے چہرے پر چھوٹے چھوٹے سے سیاہ تل بڑے خوب صورت لگ رہے تھے . . اس کی آنکھوں کی پلکیں لمبی اور ہونٹ سرخ تھے۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بڑا ہی باوقار اور گفتار بڑی ہی نرم اور شائستہ تھی۔

وہ جب کبھی بھی آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی تھی . . . تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی برقی شرارہ میری روح میں اتر گیا ہو . . . یہ ملاقات وقت کے لحاظ سے مختصر تھی مگر تاثر کے لحاظ سے بہت ہی مؤثر . . اور آج جب میں اپنی ٹیپ ریکارڈر سے میوزک سن رہا تھا تو بڑے عجیب سے جذبات ہو رہے تھے۔ پہلے میں میوزک کو صرف ایک خوب صورت تاثر اور خوشگوار جذبات سمجھ کر سنتا تھا، لیکن آج یوں لگ رہا تھا کہ جیسے یہ موسیقی خصوصاً میرے لیے بنائی گئی ہے، اور اس گانے کی دُھن میں لپٹے لطیف جذبات میرے من کا اظہار ہیں۔ اور آج میں بڑے انہماک سے گانے سنتا رہا۔ جب گانا سنتے سنتے آنکھیں بند کرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے سوات کے خوب صورت چشمے میں ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا ہوں۔ اور سمیرا لطیف ہوا کے جھونکے بن کر میری سانسوں اور روح کو معطر بنا رہی ہے . . .

ابھی میں انہی اجنبی جذبات کے سرور میں کھویا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک سی سنائی دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو چوکیدار تھا۔

"سر! آپ کا ٹیلی فون ہے اور ٹونی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں!" . . . اس نے کہا۔

میں سمجھا کہ شاید ٹونی بازار یا شہر کے کسی حصے سے بول رہا ہے۔ اکثر یوں ہوتا تھا کہ ٹونی صاحب کسی کام سے شہر گئے ہیں تو موڈ آ گیا ہے دل کلیجی کھانے کا . . . فوراً ٹیلی فون کیا کہ ٹیکسی سے حاضری بند کر دو، آج اپنی خدمت کا موڈ ہے۔

یا پھر کسی دوست کے گھر گئے تو باتیں کرتے کرتے رات کے کھانے کا موڈ بن گیا اور پھر مجھ پر عنایت کہ آج اکیلے کمرے میں مزے کرو . . .

میں نے چوکیدار سے کہا کہ جاؤ، ٹونی صاحب سے بولو جو بات ہے بتا دو، میں ذرا مصروف ہوں۔

"لیکن صاحب آپ کے لیے کسی لڑکی کا ٹیلی فون ہے اور مسٹر ٹونی صاحب ہولڈ کیے ہوئے ہیں۔"

میں جب ٹیلی فون تک پہنچا تو ٹونی مسکراتے ہوئے ریسیور منہ سے لگائے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر فون پر بولا "لیں جی شہزاد آ گیا"۔ . . اور پھر ریسیور ماؤتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا:

"محترمہ بڑی ناراض ہیں، پلیز معاملہ ٹھیک کر دینا۔"

میں نے اس سے ریسیور لیتے ہوئے کہا . . "ہیلو، میں شہزاد بول رہا ہوں . ." . مگر دوسری جانب سے خاموشی رہی . . "ہیلو . . . ہیلو"۔ . میں نے دوسری طرف سے خاموشی محسوس کر کے پکارا۔

"جی میں سن رہی ہوں"۔ . .

"تو پھر بولیے ناں . . . آخر بلایا ہے تو پھر جواب تو دیجیے ناں"۔ . .

"جواب دینے یا نہ دینے سے آپ کی صحت پر کیا اثر پڑے گا"۔ . . ذرا رک کر میری بات سنے بغیر وہ دوبارہ بولی "سوات کی خوشگوار فضا کا یہی اثر پڑا ہے آپ پر"۔ . . وہ ناراض لہجے میں بولی۔

"کیوں آپ کو مجھ سے کوئی شکوہ ہے"۔ . .

"اچھا چھوڑیئے اس بات کو . . . آپ نے مجھے کیوں نہیں بتلایا تھا"۔

"کس چیز کے بارے میں"۔ . .

"کہ آپ سوات جا رہے ہیں"۔ . . !

"اگر بتا دیتا تو کیا ہوتا . ."؟

"یہی کہ میں خوش ہو جاتی"۔ . .

"تو مجھے کیا فائدہ ہوتا؟"

"آپ ہمیشہ الجھی ہوئی باتیں کیوں کرتے ہیں؟"

سٹڈی کرنے میں بڑی الجھن محسوس ہوتی ہے۔ تم میرے لیے ایک پہیلی بن گئی ہو اور چیلنج بھی"۔۔۔ پھر میں نے ذرا رک کر کہا۔ "لہٰذا اگر آپ چاہتی ہیں کہ ہمارے درمیان تعلقات مزید بڑھیں تو کل صبح دس بجے میں کالج کیفے ٹیریا میں انتظار کروں گا۔۔۔ ورنہ پھر معذرت اور خدا حافظ"۔ یہ کہتے ہوئے میں نے رسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

یہ کوئی لڑکی تھی جو کہ فرسٹ ایئر سے ہی یوں مجھے ٹیلی فون کرتی آ رہی تھی، جب کبھی میں ٹیسٹ سے پاس ہوا تو مبارکباد کا کارڈ بھی بھیجتی تھی۔ ہمیشہ بڑے خلوص سے گفتگو کرتی تھی اور بڑے سلیقے ہوئے اور خوبصورت الفاظ میں باتیں کرتی تھی، لیکن نہ نام کا علم تھا اور نہ ایڈریس کا پتہ۔۔۔ بلکہ بعض اوقات تو یہ اچھا خاصا مسئلہ بن جاتی تھی۔۔۔

ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست کی والدہ کی بیمار پرسی کے لیے اوکاڑہ گیا تو اپنے کمرے کے دروازے پر چٹ چھوڑ گیا کہ میں دو دن کے لیے اوکاڑہ جا رہا ہوں۔۔۔ جب واپس آیا تو یہی لڑکی بڑی ناراض ہوئی تھی کہ میں کالج مس کر کے اپنی یاری دوستیاں نبھاتا پھر رہا ہوں۔۔۔ یا اگر کبھی کالج میں چھوٹی موٹی لڑائی جھگڑا ہو جاتا تو یہ بار بار فون کرتی اور ٹونی سے میرے بارے میں پوچھتی رہتی۔

اور ٹونی میرے کان کھاتا کہ یار تیری بڑی ٹک ہے کہ یوں کوئی لڑکی تم پر اتنی مہربان ہے اور ایک ہم ہیں کہ انگڑائی لیتا ہے سے کر سارے جسم کی ہڈیاں تک چٹخ جاتی ہیں"۔ اور پھر اسے چپ کروانے کے لیے مجھے اس کے تھپڑ رسید کرنا پڑتا۔۔۔

دوسرے روز دس بجے میں کیفے پہنچ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ سامنے کی میز پر سمیرا، فوزیہ اور نوشین آ کے بیٹھ گئیں، بڑی خوش تھیں اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ میں ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتا رہا۔۔۔ اس دوران میں یہ بھی بھول گیا کہ میں یہاں کس مقصد کے لیے بیٹھا ہوں۔ اور ہر لمحہ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اجنبی طاقت سمیرا اور مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور میں بغیر مزاحمت کیے اس کی طرف کھنچا جا رہا ہوں۔

میں اپنی ہی دنیا میں مگن بیٹھا تھا اور سمیرا میرے جذبات سے لاعلم ہنسی مذاق میں مصروف اپنی دوستوں کے ہمراہ خوش و خرم بیٹھی تھی۔ اسی طرح کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا۔ مجھے وقت کا تب احساس ہوا جب سمیرا اور دوسری لڑکیاں اپنی کتابیں سنبھالے اٹھ کر چلی گئیں۔۔۔ اس دوران نہ جانے کتنی لڑکیاں کیفے میں آئیں اور چلی گئیں۔۔۔ مس نامعلوم نہ آئی تھی اور میں مزید ایک گھنٹہ وہیں بیٹھا چائے کی چسکیاں لیتا رہا اور سوچتا بھی رہا تو اس نتیجہ پر پہنچا کہ میری ذات صرف میری اپنی نہیں رہی ہے بلکہ اس پر کسی اور کا بھی قبضہ ہو چکا ہے اور وہ مس سمیرا ہے۔

میری شخصیت مس سمیرا کے بغیر نامکمل اور ادھوری سی ہے۔ جتنا اپیل مجھے اس لڑکی نے اس قدر مختصر وقت میں کیا ہے، کوئی اور نہیں کر سکی۔ اور یوں میں نے اپنے اندر دیوانگی کسی اور لڑکی کے لیے محسوس ہی نہیں کی۔ اس لڑکی نے تو چند دنوں میں ہی میری زندگی کے معمولات کو تلپٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کی شخصیت نے میری روح کو کچھ ایسے نئے لطیف جذبات سے متعارف کروایا کہ میں ایک نئی کیف افزا دنیا میں پہنچ گیا۔ جہاں ہر وقت ٹھنڈی اور ٹرکیف ہوائیں کسی آوارہ زلف کی طرح چھیڑتی رہتی ہیں اور دل و دماغ پر ایک سرور سا خمار طاری رہتا ہے۔۔۔ لہٰذا کسی اور لڑکی کے بارے میں سوچنا بھی فضول ہے اور نہ ہی سمیرا کی پیاری شخصیت نے اپنے پاس اتنا وقت ہی چھوڑا کہ کسی اور کے بارے میں سوچا جائے۔ لہٰذا جب چائے کی پیالی ختم ہوئی تو میرا فیصلہ مکمل ہو چکا تھا کہ مس نامعلوم ہمیشہ کے لیے مس نامعلوم ہی رہے گی۔

* * *

انہی دنوں مجھے ایک اور چیز کا شدت سے

جالب مرض للاہور

احساس ہونے لگا کہ مس سمیرا سے میں اپنے جذبات کے
اظہار کے بارے میں بڑی عجیب سی لاچارگی میں مبتلا ہوں۔
روزانہ عہد کرتا ہوں کہ صبح مناسب لطیف انداز سے ملاقات
کروں گا کہ یہ ملاقات بذات خود ایک خوبصورت یاد
بن جائے گی۔ اور اس ملاقات کے بعد روزانہ ملاقات
اور یوں اس عمل سے میں وہ دنیا دریافت کر لوں گا۔
جس میں ہر وقت عیش و انبساط کی موجیں اٹھتی رہتی ہیں۔
محبت کا دیوتا مہربان ہو جاتا ہے اور انسان بن پیئے
ہی لہراتا رہتا ہے۔ خواب رنگین ہو جاتے ہیں اور سوچیں
خوابناک۔ لیکن ہر آنے والا دن گزرے ہوئے کل کی
طرح گزر جاتا۔ اور اب تو معاملہ اور بھی زیادہ پیچیدہ
ہو گیا تھا۔ جب بھی سمیرہ کا سامنا ہوتا تو میں بالکل ہی
خالی الذہن ہو جاتا۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے اور پیشانی
پسینے کے قطروں سے بھیگ جاتی۔ یہ سب باتیں میرے لیے
بالکل نئی اور حیران کن تھیں۔

میں اکثر و بیشتر فنکشنز میں سٹیج پر جاتا رہتا...
کلاس فیلو لڑکیوں سے بھی اکثر سٹڈی یا دوسرے مسائل
پر بحث ہوتی رہتی تھی۔ بالکل ایسا خوف یا شرم
حائل نہ تھا کہ مجھے اظہار سے روکتا۔ میں بالکل ایک متوازن
شخصیت تھا... میرے دوستوں کا اچھا خاصا حلقہ تھا...
اور میں اپنے دوستوں میں اچھا خاصا مقبول تھا۔ لیکن اس
لڑکی نے ہپناٹائز کر کے میری ساری ہی صلاحیتوں کو
مفلوج کر دیا تھا۔

اسی کشمکش میں دن گزرتے جا رہے تھے کہ ایک
دن میری سوچوں اور طرز عمل نے ایک نیا رخ اختیار
کر لیا۔ آج فرسٹ ایئر کے استقبال کے لیے ایک پارٹی
ترتیب دی گئی۔ جو کہ چھوٹے چھوٹے خاکوں اور ہلکی سی
میوزک پر مشتمل تھی۔ فنکشن کے بعد چائے پارٹی کا اہتمام
تھا۔ اس پارٹی کے انتظامات میں میرا بھی خاصا حصہ تھا۔
ہم نے ہر کام محنت سے کیا تاکہ مجموعی تاثر خوبصورت
رہے۔ یہ فنکشن بھی بڑی دلچسپ چیز ہوتے ہیں...
ان کے لیے فنڈز اکٹھے کرو... پھر خریداری کرو اور
منعقد کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرو۔ اور جب اختتام
پذیر ہو جائے تو تھک کے چور ہو کر سو جاؤ۔ دراصل
یہ مثبت اثرات ہیں۔ اور جب یہ فنکشن گاہے بگاہے
ہوتے رہیں تو زندگی بڑی ہی دلکش سی ہو کر گزرتی
رہتی ہے شاید سٹوڈنٹس لائف کی یادگار دنوں میں
ان کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے...

اس روز سب کچھ ٹھیک تھا۔ میں آنے والے لوگوں
کو استقبالیہ گیٹ سے لیتا اور ان کو سیٹ تک
چھوڑ جاتا، چونکہ یہ فنکشن رات کو تھا، لہٰذا فرسٹ
ایئر کے علاوہ دوسرے سال کے طلبہ و طالبات بھی
آ رہے تھے۔ اور بعض طلبہ اپنے ساتھ دوست بھی لا
رہے تھے۔ اور طالبات کے ساتھ ان کے والدین یا
سہیلیاں آ رہی تھیں... روشنیوں میں شوخ رنگ
بڑے سج رہے تھے۔ اور فضا میں بدیسی خوشبوؤں کی
مہک رچی ہوئی تھی۔ سٹیج پر ہلکی ہلکی موسیقی بج رہی
تھی۔ میں ویسے تو سب لوگوں کا بڑی خوشدلی سے
استقبال کر رہا تھا۔ لیکن سمیرہ کا بڑی شدت کے ساتھ
انتظار تھا۔ مجھے ذرا ہال سے باہر جانا پڑا۔ کیونکہ
ہمارے میڈیسن کے پروفیسر زیدی صاحب تشریف
لائے تھے۔ میں ایک الگ کمرے میں کوک پلا کر انہیں
یہ احساس دلا رہا تھا کہ ہم آپ کا دل سے احترام
کرتے ہیں۔ جب میں واپس ہال میں آیا تو مس سمیرہ
لڑکیوں کی سب سے پچھلی قطار میں فوزیہ اور نوشین
کے ہمراہ بیٹھی تھی۔ آج اس نے اپنے بالوں کو دو حصوں
میں تقسیم کر کے گردن کے اردگرد چھوڑ دیا تھا...
اور اس نے نیلا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ سادہ سا
میک اپ تھا۔ ٹونی ان سے باتیں کر رہا تھا، اور
وہ بھی ان پر مسرت لمحوں سے سرشار ہو کر مسکراتے
ہوئے جواب دے رہی تھیں۔ میں ان کے قریب گیا اور
مس فوزیہ سے کامن روم چلنے کی درخواست کی تاکہ
انہیں کوک پلائی جائے ویسے تو یہ صرف معزز
مہمانوں کے لیے تھی، لیکن میں اپنے اختیارات کا ناجائز
استعمال کر رہا تھا۔ بعض اوقات آدمی اپنے دل کو
خوش کرنے کے لیے اپنے اختیارات میں خیانت کرتا ہے

جاری ہے

میری اس دعوت کو سمیرہ نہ سُن سکی۔ ابھی یہ لوگ اٹھ ہی رہے تھے کہ میری نظر آسند پر پڑی جو میری ہی دعوت پر اس فنکشن میں آیا تھا۔ لڑکی، سمیرہ وغیرہ کو لے کر ڈائننگ روم چلا گیا، اور میں آسند کے ہمراہ اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد مجھے خیال آیا کہ اس سے زیادہ شاندار موقع اور کب میسر آ سکتا ہے۔ ان خوبصورت لمحوں میں تو من کے دروازے وا ہو سکتے ہیں۔ اور ان رنگین لمحوں میں ہی تو دل خوشگوار جذبات سے دھڑکنے لگتا ہے۔ . . لیکن انجانے خوف نے پاؤں پکڑ لیے۔

تھوڑی دیر بعد، سمیرہ، فوزیہ، نوشین اور لڑکی کے ساتھ واپس آ گئیں۔ میں نے سمیرہ کو ایک لمحے کے لیے محبت کی پوری شدت سے دیکھا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ سمیرہ کی خوبصورتی کا پورے ہال میں کوئی ثانی نہیں۔ سمیرہ جب مسکراتی تو اس کے گالوں میں ہلکے ہلکے گڑھے سے پڑ جاتے تھے۔ اس نے پیروں میں سفید سینڈل پہن رکھے تھے۔ حالانکہ لباس نیلا تھا۔ لیکن پھر بھی اتنے خوبصورت لگ رہے تھے، جیسے نیلگوں پانی والی جھیل کی سطح پر تیرتے ہوئے کنول کے پھول۔ میں ایک دو مرتبہ اس کے قریب سے گزرا تو اس کے لباس سے چنبیلی کی مہک اٹھ رہی تھی۔

فنکشن آہستہ آہستہ اپنے اختتام کی طرف بڑھتا رہا اور میرے اندر یہ خواہش شدت اختیار کرتی چلی گئی کہ سمیرہ اور میری شخصیت ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ رہیں۔ مگر میرے تمام تر جذبات کی شدتوں کے باوجود سمیرہ بے خبر تھی . . .

⁂

جب میں نے محسوس کیا کہ پوری کوشش کے باوجود بھی مطالعہ پوری توجہ سے نہیں کر پا رہا، تو کتاب بند کر دی اور ایک انگلش افسانہ پڑھنے لگا۔ یہ ایک پرانا ریڈرز ڈائجسٹ تھا۔ یہ ایک خوبصورت افسانہ تھا جس کا خلاصہ یہ تھا:

روتھی دوسرے لڑکوں سے بڑا مختلف تھا اور ہمیشہ بڑی لطیف لطیف سوچیں سوچتا رہتا اور اس کی ہر بات میں ایک نیا پن اجاگر ہوتا تھا اور جب اسے شدت سے یہ محسوس ہونے لگا کہ اسے کسی لڑکی کی محبت کی ضرورت ہے تو اس نے محبت کا مختصر سا پیغام لکھا اور اسے پلاسٹک کی مضبوط بوتل میں بند کر کے بوتل کے اوپر لوشن سے لکھ دیا "محبت کا پیغام کسی اجنبی دوشیزہ کے نام"۔ اور اس نے یہ بوتل سمندر کی لہروں کے حوالے کر دی۔

چھ ماہ کے بعد اٹلی کی "شیکی" کا جواب اسے موصول ہوا کہ مجھے محبت کی دعوت قبول ہے . . . اور یوں محبت کی ابتدا ہوئی اور صرف چھ مہینے بعد دونوں نے اکٹھے آکسفورڈ میں ایڈمیشن لے لیا، اور پھر ساری زندگی محبت کے ساز کی مدھم لہروں میں مست گزار دی۔

اس افسانے نے میرے ذہن میں خوبصورت سا تصور قائم کیا۔ یہ روتھی کی بڑی معصوم سی حرکت تھی جو مجھے بڑی پسند آئی۔ محبت اتنا نازک جذبہ ہے کہ اسے بڑے پیار اور احتیاط سے آگے بڑھانا پڑتا ہے۔ یہ تو ایک جھرنا ہے جو ہمیشہ فضا میں اپنی موسیقی بکھیرتا رہتا ہے۔

اس افسانے کے تاثر اور میرے کمرے کے نیم تاریک ماحول نے مجھے حساسیت کے لحاظ سے روتھی بنا دیا۔ اور میں روتھی کی طرح اپنی شیکی کے نام پہلی دفعہ محبت کا پیغام لکھنے لگا۔ اور لکھتے ہوئے مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے خوبصورت سبزہ زار میں بیٹھا ہوں اور بادل سانسوں میں گھلے جا رہے ہیں۔ اور ٹھنڈ رکول کوک رہی ہے اور محبت کی دیوی پیار سے میرے گال تھپتھپا رہی ہے۔

دوسرے روز جب ڈاکیہ میری ڈاک دینے میرے کمرے میں آیا تو میں نے خشک میوؤں اور چائے سے اس کی تواضع کی۔ وہ اس قدر پذیرائی اور عزت افزائی کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا اور بار بار شکریہ ادا کر رہا تھا۔ جاتے ہوئے میں نے اسے لفافہ پکڑا دیا، جس

یہ سمیرا کے نام میرا محبت بھرا پہلا پیغام بند تھا۔ لیکن نام اور ایڈریس نہیں تھا۔ سفید کاغذ پر سرخ سیاہی سے صرف اتنا لکھا تھا:

"ڈیئر سمیرہ!

پہلی بار آپ کو لائبریری میں ٹیبل پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے آپ میرے لیے اجنبی نہیں ہیں اور آج اس واقعہ کو چار ہفتے ہو چکے ہیں تو میں اقرار کرتا ہوں کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں۔"

لفافہ پر سمیرا کا نام، رول نمبر اور کلاس لکھ دی۔ پوسٹ مین کو تاکید کر دی کہ وہ ہر حال میں سمیرہ کے ہاتھ میں جانا چاہیے۔ پوسٹ مین نے وعدہ کر لیا۔

ہمارا کالج اور ہوسٹل ملحقہ تھے اور اکثر طلبہ و طالبات کالج جانے کے لیے ہمارے کمروں کے سامنے والے کاریڈور کو استعمال کرتے تھے۔ دوسرے روز صبح ہی صبح میں نے سمیرہ کے چہرے کے تاثرات دیکھنے چاہے لیکن وہ بالکل پرسکون تھی... اور مطالعہ میں مگن تھی۔ شاید اس کا آج کوئی ٹیسٹ تھا۔

اس خط کا بھی کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔ اور ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ جبکہ یہ گمنام تھا۔ لیکن میں دل ہی دل میں خوش ہوا کہ وہ میرے بارے میں سوچتی ہوگی، کہ نہ جانے کس نے خط لکھا ہے؟ کون ہے یہ؟ عجیب عجیب سے خاکے اس کے ذہن میں بنتے ہوں گے کبھی تو دھیمی سے سوچتی ہوگی اور کبھی ناراض ہو کر کوسنا شروع کر دیتی ہوگی...

ٹونی سے ان کے ساتھ تعلقات مستحکم ہوتے جا رہے تھے۔ یہ روزانہ آپس میں ملتے اور کبھی خوش دلی سے مذاق دل لگی بھی کر لیتے۔ لہٰذا میں ٹونی سے بھی اس بارے میں کوئی تبصرہ نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ مجھ سے بدگمان بھی ہو سکتا تھا۔ بہرحال اتنا مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اب بالمشافہ ملاقات میرے بس کا روگ نہیں رہی ہے۔ اور یوں معاملہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ سمیرہ میرے وجود سے بھی بے خبر تھی...

میرے ایک انکل میو ہسپتال لاہور میں داخل تھے۔ انہیں معدہ کا کینسر تھا۔ میں ان کی عیادت کے لیے لاہور گیا اور وہاں دو تین دن ٹھہرنا پڑ گیا۔ اسی دوران اچانک گرما کی شدت کی وجہ سے موسم گرما کی چھٹیاں ہو گئیں۔ میں واپس آیا تو کالج ویران ہو چکا تھا۔ صرف ٹونی میرا انتظار کر رہا تھا۔ ٹونی نے بتایا کہ پرسوں جس وقت تعطیلات کا اعلان ہوا تو سمیرہ سے پارٹی لی۔ کیونکہ سہ ماہی ٹیسٹ میں اس کی فرسٹ ڈویژن آئی ہے۔ اور وہ بڑی خوش تھی۔ میں نے ٹونی کو ٹٹولنے کی کوشش کی کہ شاید سمیرہ نے میرے خط کے بارے میں تبصرہ کیا ہو۔ لیکن اس سے بھی مجھے کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اور یوں ہم بھی ایک دوسرے کو پیار کرتے ہوئے اپنے گھروں کو چلے آئے۔

* * *

چھٹیوں کا کچھ وقت تو گھر میں گزرا اور کچھ وقت سیر کے لیے۔ لیکن ہر جگہ سمیرہ کی یاد اپنی تمام تر شدت سے ہمسفر رہی۔ مری میں جب بھی کوئی خوبصورت منظر دیکھتا تو دل سے خواہش اٹھتی کہ کاش سمیرہ بھی ہمسفر ہو۔ مری میں گھومتے ہوئے درانی میرا دوست بن گیا۔ اس کے والدین تو انگلینڈ میں تھے اور ان کا ایک ذاتی ریسٹورنٹ مری میں تھا۔ وہ چند ہفتوں کے لیے مری آیا تھا۔ مجھے اس لڑکے کی عادات بڑی بھائیں۔ بڑا صاف گو اور ہنس مکھ لڑکا تھا ہم ایک دوسرے کے ہمراز بن گئے۔ اس نے میرے اندازِ محبت کو بڑا پسند کیا۔ ہم سارا دن ایوبیہ گھومتے رہتے۔ رات کو اپنے کاٹیج پر جانے کے بجائے درانی کے ہمراہ ہی چلا گیا...

آج کے موسم، ماحول نے سمیرہ کی بے طرح یاد دلا دی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ بادل بن کر اڑ جاؤں، اور سمیرہ کو لے کر اس وادی میں آ جاؤں۔ جہاں ہر وقت گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ ابھی میں درانی تو سو گئے مگر مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ تب میں نے سمیرہ کی یاد میں کیسٹ میں باتیں بھرنا شروع کر دیں۔ کچھ باتیں کرتا اور پھر اپنی پسند کا ایک گانا لگا دیتا۔ یوں رات

جواب ملا ہے

گئے تک کیسٹ بھرتا رہا۔ اور پھر صبح تک بار بار اس کیسٹ کو سنتا رہا۔ صبح میرا سینہ ہر قسم کے بوجھ سے ہلکا تھا۔ یوں میرے بقایا دن بہت اچھے گزر گئے... جیسے ہی تعطیلات ختم ہوئیں، میں نے یہ کیسٹ سمیرہ کے نام پوسٹ کر دی۔ پوسٹ مین نے تسلی کرائی کہ سمیرہ نے خود موصول کی ہے لیکن سمیرہ بالکل خاموش تھی....

شب و روز یونہی گزرتے رہے، میں سمیرہ کو چھپ چھپ کر پوجا کرتا رہا۔ اس کی محبت میرے دل میں روز بروز بڑھتی رہی۔ سمیرہ سیکنڈ ایئر میں پروموٹ ہو چکی تھی، تو فورتھ ایئر میں اور میرا فائنل ایئر تھا۔ اس دوران میں نے کئی خطوط سمیرہ کے نام لکھے، دو کیسٹ بھی ارسال کیں، لیکن بالمشافہ ملاقات کی جرأت اپنے اندر پیدا نہ کر سکا۔

یہ دسمبر کا یخ بستہ دن تھا۔ سارا دن بارش برستی رہی۔ لوگ رنگ برنگے سویٹر، جرسیاں اور کوٹ پہنے "سی سی" کرتے ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ میں لائبریری کی چھت کے سامنے والے کاریڈور میں یونہی بے مقصد کرسی ڈالے بارش کا نظارہ کر رہا تھا کہ ہم سے سینئر ڈاکٹر نسیمہ آتی دکھائی دیں۔ میری ان سے کالج فیلو ہونے کے ناطے ہیلو ہیلو کی حد تک فرینڈ شپ تھی۔ ایک دو مرتبہ میں بیمار پڑا تو یہ میری بیمار پرسی پر بھی آئیں۔ ان کی والدہ صاحبہ کا انتقال ہوا تو ہم بھی تعزیت کے لیے سرگودھا گئے۔ میں ان کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اندر ہال سے ایک کرسی اٹھا لایا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گئیں۔ رسمی باتوں کے بعد وہ مطلب کی بات پر آ گئیں۔

"شہزاد! آپ شہلا فردوس کو جانتے ہیں؟"..

"کون شہلا فردوس...؟" میں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"جنہیں ہم سب پیار سے ببلی کہتے تھے"۔

"ہاں"... میں نے افسوس سے لمبا سانس لیا۔

"بہت اچھی لڑکی تھی۔ مجھے کل ہی علم ہوا ہے کہ کراچی میں اس کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور کل سارے کالج نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ بھی ادا کی ہے"!

نسیمہ اور ببلی کی آپس میں بڑی گہری دوستی تھی اور اب یہ اپنے اپنے گھروں میں فائنل ایئر کی تیاری میں مصروف تھیں... مس نسیمہ نے ایک بھاری سا لفافہ مجھے تھماتے ہوئے کہا۔

"آپ کی یہ ایک امانت میرے پاس ہے۔ پچھلے دنوں ببلی نے مجھے دی تھی۔ لیکن آپ اپنے فورتھ ایئر کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھے... پھر میں خود مصروف ہو گئی اور یوں ان کی زندگی میں یہ امانت آپ تک نہ پہنچ سکی... جس کا مجھے ساری عمر افسوس رہے گا"۔

میں نے لفافہ کھول کر دیکھا تو یہ مس ببلی ہی تھی، جو مجھ کو ٹیلی فون وغیرہ کرتی تھی اور خط وغیرہ بھی لکھا کرتی تھی... یہ مختلف تاریخوں کے لکھے ہوئے خطوط تھے جو ببلی نے میرے نام لکھے تھے۔ لیکن میری سرد مہری دیکھ کر پوسٹ نہ کر پائی۔ نہ جانے اس نے اظہار کیوں نہ کیا۔ ہر خط اضطراب اور کشمکش کا بھرپور مظہر تھا۔ زندگی کے ہر خوبصورت یادگار لمحے میں ببلی نے مجھے یاد کیا تھا۔

۸۱-۵-۲۹ کے خط میں اس نے لکھا تھا:

"ڈیئر شہزاد!

آج مقصودہ کی بہن کی شادی میں آپ بھی مدعو تھے اور میں بھی۔ کیونکہ مقصودہ، نسیمہ کی گہری سہیلی ہے اور یوں ہم بھی دوست بن گئیں۔ یقین کریں کلین شیو میں آپ بہت اسمارٹ لگ رہے تھے۔ محفل میں سب ہی آپ کی تعریف کر رہے تھے۔ اور میں خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ آپ ہمیشہ کلین شیو کیا کریں۔ آپ دور سے بالکل عمران خان نظر آ رہے تھے... میرا ایک مشورہ مانو تو کرکٹ کھیلنا شروع کر لو۔ میں آج ہی سے آپ کے لیے کرکٹ کا سویٹر بننا شروع کر دوں گی۔ آپ کو بچوں سے بہت محبت ہے، میری بھی یہی عادت ہے جس بچے کو آپ جھولا جھلا رہے تھے۔ بعد میں میں نے بھی اسے خوب پیار کیا...

آج کئی مرتبہ میرے جی میں آیا کہ دوڑ کر آپ کے بازوؤں میں چھپ جاؤں اور کہہ دوں کہ میں ہی وہ بدنصیب ہوں جس سے آپ یوں نا واقف ہیں لیکن میں ڈر رہی تھی کہ کہیں آپ ٹھکرا نہ دیں۔۔۔ آپ ہزاروں میں ایک اور میں عام پاگل سی لڑکی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں ہمیشہ آپ کی رہوں گی۔۔۔

فقط آپ کی۔۔۔ اپنی "

یوں ہر خط اس کی وارفتگی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اور آخری خط میں اس نے تحریر کیا تھا۔

" ڈیئر شہزاد!

اب مجھ میں انتظار کی مزید سکت نہیں رہی۔ میں ہی آپ کی بندی مجبل ہوں۔ اگر مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو ۲ جنوری کو پہلے پرچے کے بعد بارہ بجے کیفے میں میں آپ کا شدت سے انتظار کروں گی۔۔!"

ڈاکٹر نسیمہ نے مزید بتایا کہ پچھلے خطوط تو ویسے میرے پاس تھے اور یہ خط اس نے مجھے آپ کو دینے کے لیے دیا تھا۔ مجھے اس کی ہر بات کا علم تھا۔ لیکن جبلی نے منع کر رکھا تھا۔ وہ آپ کو دور دور سے دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ امتحان میں پاس آپ ہوتے تھے اور مٹھائی میں اور مریم، جبلی سے کھاتے تھے۔ اور جب آپ کبھی بیمار ہوتے تھے تو جبلی ہی کے کہنے پر ہم لوگ آپ کو بیمار پرسی کے لیے آتے تھے۔

* * *

جبلی کی موت، اس کے آخری پیغام نے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جبلی کی خوشیوں کا قاتل میں ہوں۔ اگر میں اس قدر سرد مہری نہ دکھاتا تو وہ ٹیلی فون کرتی رہتی اور کسی نہ کسی دن تو سامنے آ جاتی، لیکن میں اپنی محبت کی وجہ سے خود غرض بن گیا۔ کئی دفعہ اس کے ٹیلی فون آتے تھے لیکن میں نے ہمیشہ ہی انکار کر دیا۔ اور آج وہ ہمیشہ کے لیے دور چلی گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دوں۔۔۔ جب ٹونی نے سنا تو وہ بھی رو پڑا۔

" میں نے کئی دفعہ تمہیں کہا تھا شہزاد کہ اس لڑکی کی باتوں میں وفا اور جذبوں کی خوشبو ہے۔ فون کرنے والے ایسے نہیں ہوتے!"

آج تو میں نے جبلی کی وجہ سے سوچ لیا ہے۔ میں نے پکا عزم کر لیا کہ صبح سمیرہ سے سب دل کی بات کہہ دوں گا۔۔۔

سمیرہ، فوزیہ اور نوشین پلاٹ میں بیٹھی خوش گپیں لگا رہی تھیں۔ میں کانپتے دل سے ان کے قریب جا پہنچا اور انہیں سلام کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔ نوشین اور سمیرہ تو خاموش رہیں اور فوزیہ نے جواب دیا۔ ابھی میں سلسلۂ کلام شروع ہی کرنے والا تھا کہ ٹونی شور مچاتا ہوا آ گیا:

" اچھا ہوا شہزاد تم مل گئے۔ انہیں پروانہ "ہمارے کالج کا میگزین" کے لیے سوالنامہ دے دو تاکہ یہ پرسوں تک اپنے جوابات پہنچا دیں!"

میں نے خاموشی سے سوالات ان کے حوالے کر دیئے اور میری بات دل ہی دل میں رہ گئی۔ اور ہم واپس آ گئے۔ دوسرے دن بیقراری سے سمیرہ کا انتظار کیا مگر وہ کالج نہ آئی۔ حتیٰ کہ ہفتہ بھر گزر گیا اور پھر کالج میں دسمبر کی چھٹیاں ہو گئیں۔

جب کبھی سٹڈی کرتے ہوئے اس کی یاد آ جاتی تو میں بے چین ہو جاتا۔ ایک دفعہ اس کا فون آیا اور بولی:

" آپ کو معلوم ہے کہ میں نے فون کیوں کیا ہے۔۔؟"

" میں کیا جانوں!" میں نے ترش روئی سے کہا۔

" کل ہم لوگ داتا دربار گئے تھے تو وہاں میں نے تمہارے پاس ہونے کی دعا کی تھی!"

" بہت بہت شکریہ۔۔۔ بہرحال اپنی فکر بھی کر لیا کرو۔ میں اپنے لیے خود کافی ہوں!"

" ایک بات کہوں شہزاد۔ میں بہت سوچتی ہوں آپ کے بارے میں، تو اپنی سوچوں میں سے ایک سوچ مجھے بڑی پسند آتی ہے۔۔۔ سن رہے ہو نا؟"

" بالکل آپ اپنی سٹیپ آن رکھیں!"

وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔۔ " ہاں تو میں اپنی پسندیدہ سوچ کی بات کر رہی تھی اور بتا رہی ہے وہ کیسی سوچ ہوتی ہے۔۔۔ میں مر جاؤں اور تمہیں معلوم

جواب عرض لاہور

ہو جائے کہ ... میں مر چکا ہوں"... اور پھر تم مجھے یاد کر کے رو پڑو ..."

"اگر تمہیں میرے رونے سے خوشی ہوتی ہے، تو میں بھی رو دیتا ہوں ..."

"لیکن سنئے تو سنو ..."

"ہاں کہو ..."

"اور پھر جب تصور میں تمہیں روتے ہوئے دیکھتی ہوں تو مجھے خود بھی رونا آ جاتا ہے اور پھر جی چاہتا ہے کہ پھر سے زندہ ہو جاؤں اور آپ کو چپ کرا دوں"

"بس ... تقریر ختم؟ اب اجازت ...؟"

"جی ہاں، خدا حافظ ..." اس نے مخصوص معصوم آواز میں کہا۔

"نہیں میں آپ کی دعا نہیں لیتا"

"کیوں، کیوں؟"

"جب تک آپ اپنا نام نہیں بتاتیں میں تمہاری دعا کیسے لے سکتا ہوں ..." دعا کے بغیر ہی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا گیا ...

لیکن اس نے ہنستے ہوئے پھر بھی مخصوص انداز میں "خدا حافظ" کہا اور فون بند کر دیا۔

✣ ✣ ✣

میں نے ایک خط میں سمیرہ کو لکھا کہ اب آپ سے دور رہنا میرے بس کی بات نہیں۔ میں ۷ جنوری کو کیفے میں ٹھیک بارہ بجے آپ کا انتظار کروں گا اور اگر کسی وجہ سے تم نہ آ سکو تو ۶ بجے ہوسٹل ٹیلی فون پر انتظار کروں گا ... اگر یہ بھی ناممکن ہو تو میری پہچان کے لیے یہ تین نشانیاں ہیں:

۱۔ میں ابھی ابھی فائنل ایئر میں پروموٹ ہوا ہوں۔

۲۔ میرے نام کے آخر میں حرف "ن" آتا ہے۔

۳۔ میری شکل کرکٹ کے ایک مشہور کھلاڑی سے ملتی ہے ...

میں نے اسی طرح پوسٹ مین کو تاکید کرتے ہوئے یہ خط سمیرہ تک پہنچانے کے لیے کہا۔

۷ جنوری کو میں بارہ بجے جا کر کیفے میں بیٹھ گیا۔

میں چھ کرسیوں والی بڑی میز پر بیٹھا تھا۔ میرے ساتھ ٹونی اور حبیب بھی آ کر بیٹھ گئے۔ سمیرہ ٹھیک بارہ بجے آئی لیکن پوری بارہ لڑکیوں کی فوج کے ساتھ۔ مگر سمیرہ، فوزیہ اور نوشین بڑی مضطرب تھیں اور چوری چوری ہماری میز پر نگاہ دوڑا رہی تھیں کہ وہ صاحب ان میں کون ہو سکتا ہے ...

لیکن کیفے میں صورتِ حال کچھ اس قسم کی بن گئی تھی کہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مزید براں میں نے خط میں سمیرہ سے درخواست کی تھی کہ وہ لال کپڑے پہن کر آئے، میں اسے تعارف کی نشانی سمجھوں گا ... لیکن اس نے ہرے رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔

پھر شام کو ٹھیک چھ بجے میں ٹیلی فون بوتھ پر جا بیٹھا۔ ساڑھے چھ بجے فون کی گھنٹی بجی تو کسی لڑکی کی آواز ابھری۔ اور ہم میں کافی دیر تکرار ہوتی رہی۔ وہ بضد رہی کہ آپ بتائیں کون ہیں اور ادھر سے میں پوچھتا رہا کہ آپ کو کس سے ملنا ہے؟ لیکن میں کوئی اندازہ نہ لگا سکا کہ یہ سمیرہ ہے یا کوئی اور لڑکی۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ کئی لڑکیاں وقت گزاری کے لیے رنگ کرتی رہتی تھیں۔ میں نے اسے سختی سے کہا کہ جس سے ملنا ہے بتا دو، میں بلوا دیتا ہوں ... ورنہ بند کر دیں یہ سلسلہ کیونکہ میری کراچی سے ٹرنک کال آنی ہے ...

"اچھا پھر ٹونی کو بلا دو ..."

میں نے ٹٹولنے کی خاطر پوچھا۔ "کمرہ نمبر"؟

اس نے صحیح نمبر بتا یا یعنی کمرہ نمبر ۱۳

ٹونی کیفے چلا گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ٹونی رات ۹ بجے کھانے کے وقت مل سکے گا۔ اور یوں اس نے فون بند کر دیا۔

شام سات بجے تک میں انتظار کرتا رہا ... لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اب مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ لڑکی کون تھی۔ سمیرہ تھی یا کوئی اور ...

✣ ✣ ✣

آج ہم نیو فائنل والے اولڈ فائنل والوں کو ایک جماعت ظہرانہ دے رہے

الوداعی پارٹی دے رہے تھے۔ جس کے لیے ہم نے پچاس روپے فی لڑکے کے حساب سے چندہ جمع کیا۔ جبکہ پانچ ہزار روپے پرنسپل نے اپنے فنڈ سے دیے۔

آج جب ہم فنکشن کے لیے تیار ہو رہے تھے تو ٹونی خلافِ معمول زیادہ ہی بن سنور رہا تھا۔ یہ سانولا دبلا پتلا سا لڑکا مجھے جان سے زیادہ عزیز تھا... دراصل میڈیکل کالج میں یادگار رونق ٹونی ہی کی وجہ سے تھی۔ نٹ کھٹ اور شریر... ہر وقت نئی سے نئی بات ہی سوچتا رہتا۔ میں نے اسے یوں اس اہتمام سے تیار ہوتے دیکھا تو پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"ٹونی پیارے۔ آج کیا ارادے ہیں"...

"نیک ارادے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کیسی لگ رہی ہے آؤٹ لک..."؟

"بہت اسمارٹ... اے ون... میں نے اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے جواب دیا۔ "لیکن ٹونی ملنگوں کا یوں تیار ہونا بڑی عجیب سی بات لگ رہی ہے"... میں نے کہا۔

وہ حسبِ معمول میرے قریب کھسک آیا اور رازدارانہ انداز میں کہنے لگا..." معلوم ہے آجکل لڑکیوں کے معاملے میں اپن کا ستارہ چمکنے لگا ہے"۔

"ارے باپ رے باپ..."۔ میں نے اسی انداز میں کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

ٹونی تو اپنی دُھن میں مست تھا! "شہزاد.. وہ تمہاری ہموطن مس سمیرہ ہے ناں، کل کینٹین میں کہہ رہی تھی... ٹونی دیکھیے آپ کے ہوتے ہوئے کچھ لوگ ہمیں تنگ کرتے ہیں اور اب ان کی زیادتیاں حد سے بڑھنے لگی ہیں... اور میں نے کہا... میں کوئی اس کالج کا کنگ کی تو ہوں.. تو وہ مزید کہنے لگی۔ کم از کم ہمارا تو یہی خیال ہے کہ جب تک آپ اس کالج میں موجود ہیں۔ ہم پر کوئی زیادتی نہیں کر سکتا"!

مجھے ٹونی کی بات میں بہت زیادہ دلچسپی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ اس کا مطلب تھا کہ کچھ ہونے والا ہے "تو پھر تم نے کیا سوچا ہے ٹونی..."؟

میں نے سمیرہ کو کہا... تم ہمیں ان لوگوں کی نشاندہی کرو، ہم ان کی خوب خبر لیں گے۔ تو سمیرہ نے کہا کہ جب تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو ہم ضرور آپ کو آگاہ کریں گے۔"

"ہاں ٹونی جب وہ تم پر اتنا بھروسہ کرتی ہیں تو تمہیں ضرور ان کی مدد کرنی چاہیئے"...

اور ٹونی نے مجھے ہدایت کی کہ تم بھی سمیرا کا خیال رکھنا... اور میں دل ہی دل میں ہنس دیا کہ بھولے ٹونی کن لوگوں کی ذمہ داری سونپ رہا ہے۔

اتنا شاندار فنکشن ہم نے اپنے سابقہ چار سالوں میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ہر ایک نے تہیہ کر رکھا تھا کہ منائیں گے تو یہی فنکشن... حتیٰ کہ بعض لڑکیاں تو اپنی پوری فیملی ساتھ لے آئی تھیں... فنکشن شروع ہوئے آدھ گھنٹہ گزرا تو سمیرہ، فوزیہ اور نوشین آئیں۔ تمام سیٹیں پُر ہو چکی تھیں... ہم تو منتظمین میں سے تھے، ہم نے یوں ہی آخری قطار میں تین سیٹیں روک چھوڑی تھیں۔ ہم نے ان کے لیے وہ جگہ خالی کر دی۔ تینوں نے ایک ہی رنگ کے چمک دار گلابی سوٹ پہن رکھے تھے۔ اور سارے ہال کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں...

ہمارے کالج میں رینگلر نامی ایک گروپ تھا۔ بہت تیز طرار لڑکے تھے۔ جب کسی کے پیچھے پڑ جاتے تو اسے ادھ موا کر کے چھوڑتے۔ انہوں نے سمیرا اور دوسری آخری قطار پر بیٹھی لڑکیوں کا گھیراؤ کر لیا۔ ویسے بھی فنکشن ہماری ذمہ داری پر ہو رہا تھا اور ٹونی نے بھی تاکید کی تھی، لہٰذا میں نے ان لڑکوں سے ذاتی طور پر اپیل کی اور انہوں نے نہایت مہربانی سے میری بات مان لی اور دوسری جانب چلے گئے۔

اب میں اور ٹونی ان کی سیٹوں کی پشت پر کھڑے ہو گئے تاکہ کوئی اور انہیں تنگ نہ کر سکے۔ میں بالکل سمیرہ کی پشت پر کھڑا تھا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات سمیرہ کے بالوں میں لگے گلاب کے پھول پر میرا ہاتھ جا لگتا۔ تب فوزیہ اور نوشین بار بار کی مجھے چور نظروں سے دیکھتیں

اور پھر مسکرا کر آپس میں کھسر پھسر کرنے لگ جاتیں۔ آج میں بے حد خوش تھا۔ سمیرا اور میرے درمیان ایک انچ سے بھی کم فاصلہ تھا۔ ایک دو دفعہ سمیرا نے مڑ کر پیچھے بھی دیکھا۔ اس دوران ٹونی گپ شپ بھی لگاتا رہا۔

لیکن اچانک سمیرا نے ٹونی سے کہا کہ اپنے دوست سے کہئے پلیز میری کرسی کو دھکا نہ دے، مجھے کافی ڈسٹربنس ہو رہی ہے۔۔

سمیرا کے اس ریمارکس پر میرا دل بجھ کر رہ گیا نہ جانے اس نے کس بے رخی سے یہ بات کہی کیوں میرا دل دکھا تھا اور ابھی جو ایک لمحہ پہلے میں چہک رہا تھا۔ بجھ کر رہ گیا۔ اور میں سمیرا کی پشت سے ہٹ کر دور کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس دوران سمیرا نے بھی مڑ کر ایک دو مرتبہ میری طرف دیکھا۔۔ ٹونی نے یوں منہ بنانے کی وجہ پوچھی تو میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر ٹال دیا ... فنکشن کے بعد کھانے پینے کا انتظام تھا۔ ہم لوگوں نے گیٹ سنبھال لیے تاکہ بدنظمی نہ ہو۔ میرے اور ٹونی کے ذمہ لیڈیز سیٹوں کے نزدیک والا گیٹ دیا گیا۔

جیسے ہی فنکشن ختم ہوا لوگ کھانے پینے والے ہال پر لوٹ پڑے۔ بڑی افراتفری تھی۔ بڑی مشکل سے اس طوفان کو سنبھالا۔ پھر بھی کنٹرول بحال رکھنا بڑا مسئلہ بن گیا۔ ٹونی مجھ سے بولا۔ یار اگر یہی حال رہا تو ہمارے لیے ایک پیسٹری بھی نہ بچے گی۔ ہم کچھ لڑکیوں کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ لیکن میرے چہرے پر وہی پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ ٹونی تو سمیرہ اور نوشی کے ہاتھ سے کبھی اور پیسٹری پاس سے لے کر کھانے لگا۔ اور مجھے بھی دینے لگا۔۔۔

میں نے دیکھا کہ عین سمیرہ کے سامنے ایک "کوٹ" فارم پڑی تھی۔ میں وہ اٹھانے کے لیے جھک گیا۔ ابھی میں اٹھا ہی رہا تھا کہ کسی کیمرے کی فلیش چمک اٹھی۔ کسی نے یہ تصویر بنا لی تھی۔۔۔

* * *

دوسرے روز میں اور ٹونی، فارماکولوجی لیبارٹری جا رہے تھے کیونکہ ٹونی کے رزلٹ کا پتہ کرنا تھا۔ کہ سامنے سے سمیرہ وغیرہ آتی ہوئی نظر آئیں۔ ہم پاس سے گزر گئے ... ہمارا فیو کیمس بالکل نئی طرز کا بنا ہوا ہے۔ بڑا وسیع اور خوبصورت ہے۔ [illegible] جس کے اردگرد بڑی اچھی [illegible] لگی ہیں۔ ابھی ہم دو قدم ہی [illegible] ہوں گے [illegible] نے ٹونی کو آواز دی۔ [illegible] ٹونی پاس [illegible] میں اتنی تیزی میں تھا کہ وہ شش نہ سمجھ سکا [illegible] پھر آواز دی جو ٹونی نے سن لی۔ فوزیہ اور [illegible] تھوڑی دور ہٹ کر کھڑی ہوگئیں۔ میں بھی [illegible] چلا گیا ... میرے کانوں میں اس کی [illegible] ہی پڑی ... "آج کالج میں ہمارا کوئی [illegible] تھا، صرف آپ سے ملنا تھا"۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اور جب میں آہستہ آہستہ چلتا [illegible] ان کے قریب گیا۔ دیکھا تو سمیرہ رو رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ ماجرا کیا ہے کہ یوں سمیرہ کی کٹورا جیسی آنکھیں جل تھل ہیں۔ اور پھر میں خود کو ان کے قریب جانے سے باز نہ رکھ سکا۔ میں خاموشی سے جا کر کھڑا ہوا تھا تو ٹونی نے مجھے واپس دھکیل دیا کہ تم جاؤ میں ابھی آتا ہوں ...

سمیرہ نے کہا کہ نہیں انہیں بھی ٹھہرنے دو ...
لیکن ٹونی نے مجھے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ میں واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد ٹونی کمرے میں آیا۔ بڑا خاموش سا تھا۔

"ٹونی کیا بات تھی؟"

"اداکاری نہ کرو ... اب مجھے سمیرہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اب تک جو کچھ کیا ہے، خود ہی تم مجھے بتا دو"...

میں نے مختصراً سے بتا دیا۔ پھر ٹونی نے بتایا کہ سمیرہ کہہ رہی تھی:

"یہ جو تمہارے دوست ہیں نا مجھے تنگ کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں نہیں، شہزاد نے تو کبھی کسی کو تنگ نہیں کیا۔ بلکہ لوگ اسے تنگ کرتے ہیں۔ اس نے کہے

جناب طرحن لاہور

"تنگ کیا آپ کو؟ آپ کا وہم ہوگا۔"

"نہیں ... یہ کا یہ دوست جس کا نام شہزاد علی خان ہے اور یہاں وہ کارخانے والا ہے۔ مجھے بالواسطہ تنگ کرنے کا ذمہ دار وہ ہے"... "ہمیں پہلے بھی اس پر شک پڑتا تھا لیکن اس کی ظاہری شرافت ایسی تھی کہ اس پر ایسی گھٹیا حرکتوں کا گمان نہ پڑتا تھا۔ لیکن کل فنکشن پر جب اس کی حرکات تھیں وہ پھر جو اس نے سوچا ... ہم سب کچھ سمجھ گئے ہیں۔"

"نہیں سمیرہ ... یہ تو فنکشن میں خاصا خاموش رہا تھا۔ پھر اس کا سمیرہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جبکہ ہم لوگ سامنے پاس سمیرہ ہی بیٹھی تھی اور ہیرا شاہد ... ہمیں بلکہ میاں نوانی کا رہنے والا ہے"... میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی

"نہیں ٹونی ... مجھے پختہ یقین ہے کہ یہی شہزاد ہے جو مجھے تنگ کرتا رہتا ہے اور کل اس نے جان بوجھ کر میرے پاس اپنی تصویر اتروائی ہے۔ اور یہ کہ یہ میاں نوانی کا ہوتے ہوئے مجھے تنگ کرتا ہے یہ تو اور بھی بری بات ہے۔ آپ اسے سمجھائیں کہ وہ ایسی حرکتیں چھوڑ دے اور کسی کو تنگ نہ کرے۔"

جب ٹونی یہ ساری باتیں کر رہا تھا تو ساری دنیا میرے سامنے چکرا رہی تھی۔ کیونکہ تصویر کا یہ سلسلہ میرے لیے ناقابل یقین اور اچانک تھا۔ میں شل ہو کر رہ گیا۔ اور ٹونی نے معذرت کی خاطر ایک جملہ کہا:

"آئندہ ایسا حتیٰ طے کر دوں گا ٹونی، مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے"...

پھر اگلے دو دن ٹونی مجھے اس ملاقات کی ایک ایک بات تفصیل سے بتاتا رہا۔ اور مجھے بھی کریدتا رہا۔ مجھے خود یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان سے فرش پر آن گرا ہوں ... یا میرے بازار میں کسی نے مجھے بے نقاب کر دیا ہو۔ سمیرہ نے مجھے "چیپ" کہا تھا ... اور میں خود سے بار بار سوال کرتا کہ کیا واقعی میں "چیپ ہوں ..."؟ کیا واقعی میری حرکات میں چھچھورا پن ہے؟ کیا واقعی میں نے کسی کو ایک عرصے سے پریشان کر رکھا ہے ... ؟

بس یوں لگتا تھا کہ جیسے چوری کرتے ہوئے کسی نے مجھے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے اور اب وہ لوگوں کو چیخ چیخ کر بتا رہا ہے کہ جس کو تم لوگ ڈاکٹر سمجھتے تھے، اپنے دکھوں کا مسیحا جانتے تھے ... جس کی شرافت کی قسمیں کھایا کرتے تھے ... یہ تو چور ہے، بہت بڑا اور خطرناک چور ہے"... اور سمیرہ نے ملامت کر کے مجھے بے حال کر دیا۔

اب کالج میں سمیرہ سے ٹکراؤ ہو بھی جاتا تو میں خاموشی سے اسے تکتا ہوا گزر جاتا۔ اور اس کا چہرہ بالکل سپاٹ ہوتا...

* * *

آخر ایک دن ٹونی نے مجھے مجبور کیا: "جب ہر بات واضح ہو ہی گئی ہے تو تم خود تنہا سمیرہ سے بات کرو اور اسے سمجھاؤ کہ جیسے تم میری LOW THINKING MAN (گھٹیا سوچ) کہہ رہی ہو، حقیقت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ میرے ساتھ بھی ایک لڑکی نے ایسا ہی کیا تھا۔ اور میں بھی تمہاری برائی یا بدنامی کا خواہاں نہ تھا... بلکہ میں تو ایک خوبصورت انداز میں تم سے محبت کرنا چاہتا تھا..."

لیکن یہ سب میرے بس کا روگ نہ تھا۔ ٹونی خود میرے ساتھ نہیں آنا چاہتا تھا کیونکہ سمیرہ نے براہ راست اس سے درخواست کی تھی۔ میں دراصل بہت زیادہ احساس کمتری میں مبتلا تھا۔ اور ایک خوف سا مجھے لاحق ہو گیا تھا۔ اور لاشعوری طور پر مجھ میں سمیرہ کے منہ سے اپنی ذات کے بارے میں نفرت کے جذبات سننے کی تاب نہ تھی۔ اسی گومگو میں کافی دن گزر گئے...

آج کل میرا وارڈ سرجری کا تھا۔ شام کو ٹونی اور میں ہسٹری لینے گئے، یہ زنانہ وارڈ تھا۔ ہم جس بیڈ پر بھی ہسٹری لینے جاتے، مریض اپنی بیماری کم بتاتے اور میرے بارے میں زیادہ پوچھتے ... اور ان میں زیادہ تر نوجوان لڑکیاں تھیں:

"آپ عمران خان کے رشتہ دار ہیں؟"
"آپ کرکٹ کھیلتے ہیں؟"
"آپ پاکستان میں پیدا ہوئے ہیں یا کسی ناردن کنٹری میں وغیرہ وغیرہ ...!"

اور یہ قدرتی بات ہے کہ جب لوگ آپ کو (APPRECIATE) کریں تو آپ اپنے اندر ایک نئی قوت کا احساس کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح مجھے بھی اپنی ذات خاص اہم لگی۔ ایسے میں لڑکی نے میری خوب ڈانٹ ڈپٹ کی ... "شرم ہو تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرو ... ایک لڑکی کے پیچھے یوں مرا جا رہا ہے، جبکہ لوگ تم پر مرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اتنی اچھی صحت دی ہے ... صورت دی ہے ... خاندان دیا ہے ... اور پھر بھی رونی شکل بنا کر پھر رہے ہو ...!"

اور یوں میں ایک مرتبہ پھر وہی بلند حوصلہ اور مستقل مزاج شہزاد تھا ...

⁂ ⁂ ⁂

میرا ایک دوست حماد تھا جس میں دوسروں کو قائل کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود تھی۔ لڑکی کے مشورہ اور اصرار پر میں اور حماد سمیرہ کی کلاس میں اس سے ملنے گئے۔ کلاس بیٹھی تھی مگر ابھی لیکچرار نہیں آیا تھا۔ سمیرہ نے جب ہمیں دیکھا تو اپنی ایک کلاس فیلو نیلوفر کو ساتھ لے کر باہر چلی گئی۔ نیلوفر ایک فارغ سی لڑکی تھی۔ حماد مجھ سے بولا۔ "چلو شہزاد ... وقت ضائع نہ کرو، نیلوفر کی موجودگی میں بات کرنا آسان ہو جائے گا!" ہم باہر آئے اور انہیں ایک برآمدے کے قریب جا لیا۔ سمیرہ نے بچ نکلنے کی بڑی کوشش کی، لیکن حماد نے پہل کر دی:

"آداب مس سمیرہ اور مس نیلوفر" ...

"آداب ..." سمیرہ نے مختصر سا جواب دیا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن اس انداز سے کہ میرے اور اس کے درمیان نیلوفر آ گئی۔

"مس سمیرہ! آپ سے ایک بات کرنی تھی" حماد نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔

"جی فرمائیے، میں سن رہی ہوں!"

"یہ میرے دوست شہزاد علی خان ہیں، اور ہم دونوں خاص طور پر آپ سے ملنے آئے ہیں ... کیونکہ شہزاد کا کہنا ہے کہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے اور اب اس کے لیے یہ معذرت خواہ ہے!"

سمیرہ جو خاموش کھڑی تھی۔ اچانک روہانسی ہو کر پھٹ پڑی ... "سر حماد ... آپ ہمارے سینئر ہیں، ہم آپ کو دل سے عزت کرتے ہیں اور بس ... اور تو ہمارا کوئی تعلق نہیں ... ناراض تو ان سے ہوا جاتا ہے، جن سے کوئی تعلق ہو۔ میں تو ان سے بالکل متعارف نہیں ہوں اور نہ ہی انہوں نے میرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے۔ اس صورت میں معذرت کرنے یا معذرت قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ...!" یہ سب کچھ سمیرہ، حماد سے کہہ رہی تھی ... مجھے بالکل مخاطب نہیں کر رہی تھی ...

"دیکھئے مس سمیرہ ... یہی تو مسئلہ ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان ناراضگی ہے اور ہم آپ لوگوں کے دوست چاہتے ہیں کہ یہ ناراضگی ختم ہو جائے۔ اسی لیے آپ کے پاس آئے ہیں ... جو کچھ بھی ہے شہزاد اپنی غلطی تسلیم کر رہا ہے ... لہٰذا اب آپ کو دل میں میل نہیں رکھنی چاہیے ...!"

"نہیں سر ... مجھے ان سے کوئی شکوہ بھی نہیں ہے۔ جب ہمارے درمیان کوئی معاملہ بھی نہیں تو پھر ناراضگی، معذرت اور صلح تو بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں ... یہ ہمارے سینئر ہیں بس ... یہ ہماری عزت کریں گے تو ہم بھی کریں گے، ورنہ یہ خود بھی جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں ...!"

سمیرہ کی باتوں سے مجھے بڑی الجھن ہو رہی تھی ... میں نے ہمیشہ اس کے بارے میں بہت مہربان ہو کر سوچا تھا۔ میرے بہت سلیقہ اور خوبصورت جذبات تھے۔ اس کی یہ سخت کلامی مجھ سے برداشت نہ ہو سکی، اور میں نے براہ راست اسے مخاطب کیا:

جناب عرض لاہو

"مس سمیرہ! مجھے بھی تو کچھ کہنے دیجیے۔ میں خاموش تھا، جو کچھ ہوتا تھا، خود ہی برداشت کرتا تھا، کسی کو کچھ کہنے کا موقع نہ دیتا تھا، لیکن آپ نے ٹونی کے سامنے رو کر خود کو مظلوم اور مجھے ظالم ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، تو اب مجھے بھی کچھ کہنے دیجیے ناں! کیا میری زبان اتنی ہی بے اثر ہے، میرے جذبات اتنے ہی کھوکھلے ہیں کہ آپ سچ اور جھوٹ میں تمیز نہ کر سکیں۔ کیا میں دو سال انتظار کی آگ میں صرف اس لیے جلتا رہا کہ آپ کے منہ سے نفرت بھرے الفاظ سنوں۔ جو میں نے کچھ کیا اور جس کا آپ کو شکوہ ہے... میں سب الزام قبول کرتا ہوں... لیکن... لیکن مجھے افسوس ہے کہ میرے لطیف انداز الفت کو آپ نے الزام قرار دیا ہے... میرے پُرخلوص اور نیک جذبات کو اپنی توہین جانا ہے۔ بلکہ میرا مقصد نہ آپ کی توہین تھا... اور نہ ہی آپ کی بدنامی۔ میں تو آپ کی خیر خواہی اور بھلائی چاہتا تھا اور آپ کے بارے میں نہایت دوستانہ اور خوبصورت جذبات رکھتا تھا۔ اور اگر آپ یہ سب کچھ توہین پر محمول کر رہی ہیں تو میں یہ اپنا خراب مقدر ہی سمجھوں گا کہ لوگ مجھے یوں غلط سمجھ رہے ہیں"

اس دوران میری آواز خاصی بلند ہو گئی۔ سمیرہ... نیلوفر اور حماد سب خاموش کھڑے سن رہے تھے۔

"مجھے آپ کی کسی زیادتی کا علم نہیں... میں ٹونی کو بھی نہیں جانتی... مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں ہے اور نہ ہی مجھے مظلوم بننے کا شوق ہے"

"اچھا مس سمیرہ، میرا اپنا مقدر"۔ میں حماد کا ہاتھ کھینچے بیٹھا لوجی ڈیپارٹمنٹ میں گھس گیا...

⁂ ⁂ ⁂

دوسرے روز ٹونی نے مجھے بتایا کہ سمیرہ نے میرے ساتھ بات کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بلکہ اتنا کہتی تھی: میں آپ کو تو ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے اب معلوم ہو گیا ہے، آپ کسی دوسرے کے ہاتھوں کھلونا بنے ہوئے ہیں اور موم کے بنے ہوئے لوگ مجھے پسند نہیں ہیں لہٰذا آپ میرے ساتھ بات کرنے سے گریز کریں"

اور ٹونی بڑے غصے میں تھا، کہہ رہا تھا۔ "جب اس نے ہمارا پیار دیکھا ہے، غصہ نہیں دیکھا..." میں نے اسے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ "ٹونی دیکھو اسے غلط فہمی ہوئی ہے اس لیے اسے غصہ ہے ورنہ وہ بڑے سادہ دل کی ہے اور اس کے دل میں کوئی برائی نہیں ہے"

"شہزادے! ایک تو مجھے تیری سمجھ نہیں آتی... تجھ غریب شہزادے، شہر ادا[illegible] ... تو نے اسے ذرا بھر بھی اہمیت نہ دی... اور سمیرا مجھے ذرہ بھر نفرت نہیں کرتا تو اور تم ہو کہ اس کی ہر کڑوی بات کو امرت جان کر نگل رہے ہو..."

"تم یہ باتیں نہ سمجھو گے ٹونی، آؤ سیر کو چلیں"...

⁂ ⁂ ⁂

پندرہ بیس روز مزید گزر گئے۔ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ میری ڈیوٹی چیسٹ وارڈ میں لگ گئی، اپنا چوبیس گھنٹے مصروف رہنا پڑتا۔ ٹونی ایبٹ آباد میں اپنی کسی کزن کی شادی کے سلسلے میں چلا گیا... وارڈ میں دو دن کی چھٹی آ گئی۔ اس روز موسم بھی بڑا خوشگوار تھا۔ طبیعت بھی ہشاش بشاش تھی۔ میں کا بج کا راؤنڈ لگا کر واپس آ رہا تھا تو سمیرہ اور فوزیہ کو کالج بس اسٹینڈ کے ساتھ والے چبوترے میں بیٹھے دیکھا... میں بھی ادھر ہی چلا آیا۔ مجھے آتا دیکھ کر دونوں اٹھ کھڑی ہوئیں...

"آداب..."۔ میں نے کہا۔

"آداب..."۔ دونوں نے سپاٹ چہروں سے جواب دیا۔

"کیسے مزاج ہیں"...؟

"اللہ کا شکر ہے..."۔

"سہ ماہی امتحان کیسے ہوتے ہیں..."

"وہ تو چند دنوں کے لیے ملتوی ہو گئے ہیں"۔

"پروفیشنل کی تیاری کیسی ہو رہی ہے..."

"آپ تیاری نہیں کیا کرتے تھے؟" سمیرہ بولی۔

گو کہ گفتگو انتہائی خوشگوار ماحول میں نہیں ہو رہی تھی، لیکن پھر بھی مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ شاید سب حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا یا سمیرہ کا ذہن بدل چکا...

جواب عرض لاہور۔

تصور بنا تھا، وہ یہی تھا کہ وہ لڑائی کی باتیں کریگی۔۔ آج وہ بالکل میرے قریب اور سامنے کھڑی تھی، اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے گفتگو کر رہی تھی۔ جب اس نے خود میرا سوال مجھ پہ لوٹا دیا، تو میں نے وہی تذکرہ چھیڑ دیا:

مس سمیرہ۔۔ ابھی تک آپ نے دل سے یہ بات نہیں نکالی ہے؟"

"نہیں شہزاد۔۔۔ میرے دل میں کوئی بات بھی نہیں ہے۔ یہ صرف تمہارا ضمیر ہے جو تمہیں اس قسم کا احساس دلا رہا ہے۔"۔

بہرحال کچھ بھی ہے۔ میں نے کوئی زیادتی بھی نہیں کی، لیکن اس کے باوجود جب غلطی کا اقرار کر لیا اور معذرت بھی کر لی۔ تو پھر آپ کا یہ رویہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔"۔ میں نے کہا۔

"اچھی بات ہے، غلطی تسلیم کر لینا بھی اعلیٰ ظرفی کی نشانی ہے ورنہ میانوالی کے لوگ بڑے ہی ضدی ہوتے ہیں۔"۔

"تو آپ میانوالی کی نہیں ہیں؟

ہم لوگ ملازمت کے سلسلہ میں میانوالی میں رہتے ہیں، ورنہ ہم تو کشمیر کے رہنے والے ہیں اور ہماری مستقل رہائش لاہور میں ہے۔"۔

"بہرحال سمیرہ۔۔۔ میں آئندہ کوشش کروں گا کہ آپ کو شکایت کا موقع نہ دوں"۔۔

"آخر آپ نے پہلے کیوں نہ سوچا۔۔"؟

"سمیرہ نے تمام خط اور کیسٹ تمہیں اس لیے نہیں بھیجے کہ تم بدنام ہو جاؤ، لوگ تمہیں طعنے دیں"۔ اس مرتبہ فوزیہ بولی۔۔"سر شہزاد۔۔۔ دراصل آپ کے پیغامات سمیرہ کو نہیں ملتے تھے۔ سمیرہ کا رول نمبر ۲۸ ہے اور آپ کے پیغامات سمیرہ رول نمبر ۱۸ کو ملتے تھے۔ جو کہ راولپنڈی کی ہے اور یوں وہ ہم لوگوں کو اچھا خاصا تنگ کرتی تھیں۔ آپ کی کیسٹ پہلے گرلز ہاسٹل میں سنی جاتی تھی۔۔۔ پھر ہم تک پہنچتی تھی۔ ایک تو سٹڈی اتنی مشکل، پھر سمیرہ کی والدہ فوت ہوگئیں۔۔۔ اور پھر آپ کے خطوط اور کیسٹیں۔۔ ساری لڑکیوں کی باتیں، ہم لوگ تو بہت پریشان رہے اور خدا جانے کب تک رہتے"۔

"نہیں مس فوزیہ۔۔۔ اب تو میں خود ہی آپ لوگوں کے سامنے آ گیا ہوں، خود ہی یہ سسپنس توڑا ہے"۔

"جی۔۔"۔ سمیرہ نے لمبا ہنکارا بھرا۔۔"آپ نے یہ سسپنس توڑا نہیں، توڑا دیا گیا ہے۔ آپ کے تو نہ جانے کیا ارادے تھے"۔

"اچھا جی۔۔۔ میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں آئندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔۔ بس"؟

"یوں اچھے بچے بن جاؤ ناں"۔ پہلی مرتبہ سمیرہ کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔

"دیکھو سمیرہ۔۔۔ اب صلح ہو چکی ہے۔ مجھے غلطیوں کی تلافی کا موقع دو۔ لہٰذا جب کبھی بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو ضرور مجھے یاد کرنا۔۔"۔

"بہت اچھا جناب۔۔"۔ اور وہ پیریڈ اٹینڈ کرنے چل دیں۔ اور چلتے ہوئے سمیرہ نے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دی۔ اس کی سیاہ شفاف آنکھوں میں اس کی معصوم روح کا عکس نظر آ رہا تھا۔۔۔

٭ ٭ ٭

میرے ایک دوست جمیل، جو کہ سمیرہ کا کلاس فیلو تھا، نے بتایا کہ آج ٹیسٹ کے دوران سمیرہ کے چہرے پہ بارہ بج رہے تھے۔۔۔ یعنی اس کا ٹیسٹ اچھا نہیں ہوا۔ میں لائبریری سے باہر نکل رہا تھا کہ یہ تینوں ہی باہر پلاٹ میں بیٹھی نظر آئیں۔ میں نے بھی یوں چلے جانا مناسب نہ جانا۔ انہوں نے بھی مجھے پھولوں کی کیاریاں پھلانگتے ہوئے دیکھا تو ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

"ہیلو سمیرہ کیسے مزاج ہیں"۔۔

"بالکل ٹھیک ہوں۔۔"۔

"کیسی ہیں آپ۔۔"۔ میں نے لفظ "آپ" کو ذرا لمبا کرتے ہوئے کہا۔

"جیسی نظر آ رہی ہوں۔۔"۔ سمیرہ نے بھی مسکراہٹ

گود باتے ہوئے بولی۔

آج کی یہ مہربانیاں دیکھ کر میں اور دلیر ہو گیا۔

"آپ نظر تو ماشاء اللہ بہت صحت مند آ رہی ہیں ... لیکن ..." میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"لیکن کیا ...؟"

"لیکن ..." میں نے محظوظ ہوتے ہوئے بات جاری رکھی ... "آج کا تازہ خبر میں بتایا گیا ہے کہ دوران امتحان (مجیسٹ) آپ کے چہرے پر بارہ بجے رہتے ہیں ..."

فوزیہ اور نوشین دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں ...

"آپ خود آئینے میں جا کر اپنا چہرہ دیکھیں جہاں ہر وقت چار بجے ہوتے ہیں" ...

لیکن فوزیہ میری حمایت میں یوں اٹھی ... "نہیں سمیرہ ... انہوں نے موقع محل دیکھ کر شٹ کھیلا ہے اور یہ کلیر ہو چکا ہے ..."

اور یوں ہم نے کالج لائف میں پہلی مرتبہ فرینک ہو کر باتیں کیں ... مجھے تو ایسے محسوس ہو رہا تھا، کہ جیسے بادلوں کے سنگ سنگ اڑتا جا رہا ہوں ... دوران گفتگو ہم ایک دوسرے کو یہ بھی جتلا رہے تھے کہ ہم ایک دوسرے کی بہت سی ذاتی باتیں بھی جانتے ہیں اور یہ ہمدردی کی ایک دلیل ہوتی ہے .. تب ہی میں نے سمیرہ سے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ ہم نے انسانی ہمدردی کی بنا پر ایک پارٹی "کاروان حق" بنائی ہے، جس کا مقصد غریب لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ اگر آپ نے بھی کوئی نیکی کمائی ہے تو ضرور اس میں دل کھول کر شرکت کریں۔"

"جی نہیں، چوہا لنڈورا ہی بھلا ..." سمیرہ مسکرائی۔

"اگر آپ کے پاس وقت کی کمی ہے تو اپنی پاکٹ منی سے بھی آپ اس نیک کام میں شرکت کر سکتی ہیں ..." میں نے کہا۔

"کتنا فنڈ ہو گیا ہے اب تک" ..

"یہی کوئی دو ہزار کے لگ بھگ ..."

"بس ... تو پھر اب تو آپ کا مری کا ٹور لگ سکتا ہے ..." سمیرہ مسکرائی۔

"نہیں سمیرہ ... یقین کریں ہمارا ایسا کوئی مقصد نہیں۔ ہم تو انسانی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اپنی جیب کاٹ کر رقم پیش کرتے ہیں، حتیٰ کہ نعیم صاحب جو کہ ہماری انجمن کے صدر ہیں، انہوں نے اپنی ٹرنیں بیچ کر فنڈ مہیا کیا ہے ..."

"اور آپ رومیو ... بڑھ کر جوش میں آ گئے۔ اور کیمپس دوڑ سے آئے"

اور تینوں نے مل کر فلک شگاف قہقہہ لگایا ... اور مجبوراً میں بھی ان کی آواز میں شامل ہو گیا۔

"اچھا سمیرہ اب ٹوئی سے صلح کر لو، میری وجہ سے اس سے کیوں لڑائی کر لی۔ اب وہ مجھ سے بھی ناراض ہے ..." میں نے کہا۔

"آپ جھوٹ نہ بولیں ... کل تو آپ اسے کینٹین میں لے کر بیٹھے تھے ..."

یوں ہم خوشی خوشی اپنی اپنی کلاسوں میں چلے گئے۔ بعد میں بھی دو تین مرتبہ ملاقات ہوئی۔ بڑے خوشگوار ماحول میں باتیں ہوئیں اور ایک دو مرتبہ تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے منزل قریب آن پہنچی ہے۔

* * *

آج خوب بارش برسی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ میرا بھی موڈ نہایت خوشگوار تھا۔ میں نے نیلا سوٹ پہنا ٹائی لگائی اور خوب بن سنور کر فائل ہاتھ میں پکڑے گنگناتا کیمپس کو روانہ ہوا۔ آج من میں کوئی ایسی موج تھی کہ سوٹ ٹائی کی پرواہ کیے بغیر چھلانگیں لگاتا جا رہا تھا ... ابھی پوسٹ آفس کے سامنے سے گزرا ہی تھا کہ ایک زبردست قہقہہ کی آواز کانوں میں پڑی ... میں نے عجلت میں مڑ کر دیکھا، تو تینوں سیڑھیوں پر شانے سے شانہ ملا کر بیٹھی تھیں ...

"ہیلو ..." بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

"یہ کیسا پوز بنا رکھا ہے ..." لیکن سمیرہ گھٹنوں میں منہ دیے ہنسی جا رہی تھی ...

"کچھ چھوٹو بھی ..." میں اس کی لمبی لمبی منہسی سے
لگ آکر بولا۔
"آپ نے "لیو آسکڈ فار اِٹ" پروگرام دیکھے
تھا؟" سمیرا ابھی ردک کر بولی۔
"جی بالکل"...
"تو میں ایک پروگرام کو یاد کرکے ہنس رہی تھی"۔
"ذرا ہمیں بھی تو علم ہو"...
"وہاں ایک "فلپ جونس" نامی بندر دکھایا گیا
تھا۔ جسے کوٹ اور ٹائی پہننے کا بڑا شوق تھا۔
اور اس کی مستانی چال بالکل جناب سے ملتی تھی"...
"آج تو سر فلاتے ہی ادھر پڑنے لگے تھے"۔
شہزاد بھی ان کے ساتھ دانت نکالنے لگا: "اچھا
میری جشن فیصل آباد کی سیر کی"...؟
"جی ہاں کی"...
"گھنٹہ گھر بھی گئی تھیں"...
"جی ہاں بالکل"... اس نے اسی شوخی سے جواب دیا۔
"مگر میں نے تو آپ کو نہیں دیکھا"...
"تو گھنٹہ گھر جانے کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہوتا
ہے کہ آدمی گھنٹہ گھر کے اوپر چڑھ کر کھڑا ہو جائے"۔
"مگر گھنٹہ گھر کے اوپر تو سنترا بادشاہ ہوتا ہے
اور اردگرد پالش والے... آپ بھی ان میں سے
ایک تو نہیں"... فوزیہ اور نوشین نے بیمیری حمایت
میں قہقہے لگانے شروع کر دیئے... "اچھا سمیرا، ذرا
اپنا ٹیلی فون نمبر تو نوٹ کروانا"...؟
"کیوں، کیوں اس کی کیا ضرورت پیش آگئی"...
"دیکھئے تا چھٹیاں ہونے والی ہیں اور آپ نے
امتحان کی تیاری کرنی ہے۔ صاف ظاہر ہے آپ کو بھی
گائیڈنس کی ضرورت ہوگی، تو ٹیلی فون نمبر کا علم
ہونا تو ضروری ہے نا؟"
"جی نہیں... کوئی خاص ضرورت نہیں اور میرے
کزن ہیں اگر مجھے گائیڈنس کی ضرورت ہوئی تو وہ
کے۔ اسی میں ماہر دماغ ہیں"...
"یہ کزن کوئی اچھی مخلوق نہیں ہوتے۔ ان سے
ذرا بچ کر رہنا چاہیئے"...
"میرے کزن بہت اچھے ہیں، تمہارے کزن ہی
اس قسم کے ہوں گے"...
"اچھا جی جیسے آپ کی مرضی"...
"شہزاد! آپ کا اور ہمارا معاہدہ ہوا تھا کہ
جب ہمیں کوئی نوٹس درکار ہوں گے تو آپ سے
کہہ دیں گے... مگر آپ تو ان نوٹس کا بہانہ بنا
کر روزانہ ہی ہمارے پاس آجاتے ہیں"...
"جی..." میں نے حیرت سے اسے یوں گرگٹ کی طرح
رنگ بدلتے دیکھ کر لمبا سانس لیا... "دوسرے
لفظوں میں چند لمحوں کے لیے بھی میری موجودگی آپ
کے لیے ناقابل برداشت ہوتی"...
"آپ خود ذہین ہیں، میں کیا کہہ سکتی ہوں"...
"اس کا مطلب ہے کہ میں آپ سے نہ ملا کروں"...
اور سمیرا خاموشی سے ناخن کترنے لگی...

⁂ ⁂ ⁂

لوزی کو میں نے اس ملاقات کا قصہ بتایا اور
وہ بے چارہ بھی محض خاموش ہو کر رہ گیا۔ میں نے
بھی فیصلہ کیا کہ اب سمیرا سے ملاقات نہ کروں گا۔
کیونکہ اپنی ذات کو یوں بے حیثیت بنانا دانشمندانہ
اقدام نہیں ہوتا...
کالج لائف معمول کے مطابق جا رہی تھی۔ کیمپس
میں رونقیں اپنے جوبن پر رہیں۔ کیاریوں میں پھول
کھلتے رہے... وارڈوں میں پرانے مریضوں کی جگہ
نئے مریض آتے رہے۔ لیکن اپنے من کی دنیا سونی
سونی سی رہی... کالج بھی جاتا... وارڈ میں بھی...
کالج کی رنگینی میں حصہ دار ہوتا، مگر دل کے اندر
کی دنیا یخ بستہ ہی رہی... جمود پذیر... زندگی کی
حقیقی رعنائیوں سے بے نیاز... ایسے میں میری
نظریں کسی گوشہ میں بیٹھی، یا کیمپس کے کاریڈور میں
گزرتی یا سیڑھیوں سے ٹیک لگا کر کھڑی سمیرا پر
جم جاتیں، جس کا چہرہ تر و تازہ تھا، شگفتہ تھا،
ہر قسم کی الجھنوں اور پریشانیوں سے صاف تھا، اور

اس کے چہرے بشرہ سے تازگی ٹپکتی تھی اور میں پریشان ہو کر سگریٹ کے کش پر کش لگا لیتا۔

لان کی کیاریاں پھولوں سے بھری ہوتی تھیں کہ موسم بہار کی تعطیلات ہو چکیں۔ ٹونی اپنا بوریا بستر اٹھائے میرپور روانہ ہو گیا۔ اس دفعہ وہ بہت خوش تھا کیونکہ اس کی ممی اور ڈیڈی دونوں گھر پر اس کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے۔ اس کی ممی جاوا سماٹرا کی تھی اور ڈیڈی میرپور کے۔۔۔ اور ٹونی اور اس کی بہن شیری پاکستانی بلکہ کشمیری۔۔۔

٭ ٭ ٭

میں گھر پہنچا تو انگلینڈ سے میرا بچپن کا دوست خالد تیرہ سال بعد آیا ہوا تھا۔ خوب گلے شکوے ہوتے رہے۔ اس نے اپنی زندگی کے رنگین واقعات سنائے اور مجبوراً مجھے بھی اپنی ناکام محبت کا قصہ بتانا پڑا۔ جسے سن کر خالد رنجیدہ ہوا۔۔۔

دوسری صبح میں ابھی سویا ہوا تھا کہ خالد آ گیا اور آتے ہی مجھے کہا کہ پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤ، ذرا میانوالی جانا ہے۔۔۔ خالد کی عادت کا مجھے علم تھا کہ انکار کرنا فضول ہو گا۔۔۔

جب ہماری گاڑی میانوالی سے بھی آگے ملتان روڈ پہ نکلتی چلی گئی تو میں نے خالد کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا "یار! یہ کہاں جا رہے ہو؟"

"تمہاری سمیرہ کے گھر۔۔!"

"کیا کہا۔۔؟" میں یک لخت گھبرا گیا: "یہ کیسے ممکن ہے، میں تو آج تک ان کے گھر نہیں گیا اور نہ ہی ان کے گھر کا علم ہے۔۔ اور نہ ہی میری وہاں پر کوئی واقفیت ہے"۔ میں نے کہا۔

"بس تم خاموش بیٹھے رہو، میں نے سب بندوبست کر لیا ہے۔ عنایت اللہ وہیں ہوتا ہے۔۔ وہ میرا گہرا دوست ہے۔ جب میں لندن سے گھر ٹیلی فون کرتا تھا تو عنایت اللہ سے بھی ہیلو ہیلو ہو جاتی تھی۔ کیونکہ یہ اپنی فون ایکسچینج میں آپریٹر تھا۔ اور بعد میں ہمارے درمیان ٹیلی فونی دوستی ہو گئی۔ اس کو اپنا تحفہ بھیجتے

دوں گا۔۔۔ ملاقات بھی ہو جائے گی اور سمیرہ سے بھی میں خود بات کروں گا۔"

میرا ہر احتجاج اب بیکار تھا۔ ویسے بھی مجھے تسلی تھی کہ خالد خود ہی ناکام ہو کر چپ ہو جائے گا۔۔۔ جب میری تین سال کی محبت کا صلہ اس نے اتنی سرد مہری سے دیا ہے تو اب کیا مثبت جواب ہو گا۔

ہم ساڑھے نو بجے سمیرہ کی کالونی پہنچ گئے۔ عنایت اللہ سے ملاقات ہوئی۔ عنایت اللہ آپریٹر کم اور اسسٹنٹ زیادہ تھا یعنی خوب خاطر مدارت کی۔ اچانک خالد نے سمیرہ کا قصہ چھیڑ دیا۔ عنایت اللہ ہنستے ہوئے کہنے لگا:

"آپ ٹونی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔۔۔ اس کا گھر یہاں سے صرف چار کوارٹر چھوڑ کر ہے۔ اور اسی روڈ پہ ہے۔ اور ویسے بھی اس کالونی کا کون شخص نہیں جانتا۔۔!" وہ مزید بولا۔

مجھے عنایت اللہ کی ان باتوں پر بڑی حیرانی ہوئی۔ کہ سمیرہ اپنے آپ کو بڑی معزز بتاتی تھی اور یہ کیا قصہ ہے کہ اسے ساری کالونی جانتی ہے۔ ہمارے مسلسل سوالوں کے جواب میں عنایت اللہ نے بتایا:

"سمیرہ کا گھرانہ کشمیری ہے۔ اس کے والد یہاں ملز میں درمیانے درجے کے ملازم ہیں۔ دو بھائی ہیں وہ بھی عام درجے کے ملازم ہیں۔ سمیرہ کی تین بہنیں اور ہیں، دو شادی شدہ ہیں اور ایک ابھی گھر پہ ہے۔ اوسط کلاس کے لوگ ہیں، لیکن بہت روشن خیال اور ماڈرن۔۔۔ چونکہ یہ لوگ پردہ نہیں کرتے اور اس آبادی میں سب سے زیادہ خوبصورت ہیں۔۔۔ لہٰذا سب لوگ انہیں جانتے ہیں۔ اور ہمارے ساتھ ان کا گھریلو طور پر آنا جانا ہے۔ اور چونکہ ان کے گھر فون نہیں ہے لہٰذا جب کوئی ٹیلی فون کرنا ہو یا ریسیو کرنا ہو۔ تو ساتھ ہی ایکسچینج ہے، وہیں آ جاتی ہیں۔ کردار کی بالکل صاف ہیں۔ لیکن یہاں کے منیجر کا بیٹا وسیم کہتا ہے کہ سمیرہ کے ساتھ اس کے بہت اچھے تعلقات جا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شام کو ان کے

گھر دیر تک بیکار رہتا ہے۔ ہاں البتہ ان کا والد بہت
نمازی، سادہ اور پرانی طرز کا ہے، لیکن بیٹیوں
کے معاملہ میں بہت روشن خیال ہے۔ ان کی پہلی
دونوں بیٹیوں کی شادی ان کی اپنی پسند سے ہوئی ہے۔
اور سمیرہ کے بارے میں بھی یہی کہتا ہے کہ جہاں سمیرہ
چاہے گی وہیں ہوگی۔"۔
خالد نے مجھے کہا کہ سب کچھ خاموشی سے سنتے جاؤ
اور دیکھتے جاؤ اور ہم سے تعاون کرو۔"۔
ہم جب شام کو نماز ادا کرنے نکلے تو سمیرہ کا والد
اپنے مکان کے سامنے سڑک پہ کھڑا تھا۔ عنایت اللہ
نے اس سے ہمارا تعارف کروایا۔ رسمی سی بات چیت
ہوئی۔ یہ ایک انتہائی سادہ لوح قسم کا بزرگ تھے۔
ان کی زبان بھی کچھ بڑھاپے کی وجہ سے اٹک رہی تھی۔
مسجد اسی سڑک پر کافی آگے تھی۔ ہم جب ذرا آگے
نکل گئے تو خالد نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مجھے ٹہوکا
دیا۔ سمیرہ اپنی بہن اور بھائی کے ہمراہ اپنے گھر سے
باہر آ کے کھڑی تھی۔ شاید اسے اس کے والد صاحب
نے بتایا ہوگا۔۔ جب اس نے ہمیں اپنی طرف متوجہ
پایا تو بھاگ کر اندر چلی گئی۔۔
نماز سے فارغ ہو کر ہم نے وسیم سے ملنے کا ارادہ
ظاہر کیا تاکہ دل سے یہ کانٹا بھی نکل جائے۔ عنایت اللہ
نے بتایا کہ وسیم نو بجے کے قریب اپنی گاڑی میں آئے گا۔
اور یوں ملاقات ہو جائے گی۔ ٹھیک نو بجے وسیم آ
گیا۔ وہ کوئی اٹھارہ سالہ موٹا سا لڑکا تھا۔۔ اور
تن آسانی اس کے چہرے سے مترشح تھی۔ عنایت اللہ
نے ہمارا تعارف کرایا۔ اور وسیم نے ہمیں گاڑی میں بیٹھنے
کی دعوت دی۔۔۔ گاڑی مختصر سی کالونی کی سڑکوں
پر آہستہ آہستہ دوڑنے لگی۔ خالد بہت جلد وسیم کو
مطلب کی بات پہ لے آیا۔ اور اب خالد مختلف
سوالوں سے وسیم کو ٹٹول رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ وسیم
کی ہیلو ہیلو سمیرہ کی چھوٹی بہن طیبہ سے ہے اور یہ
کہ اس کے نزدیک سمیرہ بہت مغرور لڑکی ہے۔ لہٰذا کسی
کو لفٹ ہی نہیں کراتی۔

میں نے وسیم سے کہا۔" یار آپ کی کالونی میں تو بڑی
ویرانی ہے"۔۔
کہنے لگا۔" پریشان مت ہوں پیارے۔ ہماری یہ
کالونی بھی انگلینڈ سے کم نہیں، ابھی آپ دیکھیں"۔۔ اور
پھر اس نے سمیرہ کے گھر کے سامنے جا کر کار ریڈیو کی آواز
فل کر دی۔ کار کی اندر کی بتیاں بھی ہوتی تھیں۔ اس نے
زور زور سے ہارن بجایا اور پھر آگے چلا گیا۔ اور ہم
سے کہنے لگا کہ واپسی پہ یہاں دو گوری چٹی لڑکیاں سیر
کرتی نظر آئیں گی۔"
"یہ کیسے بھلا؟"
"ایک میری دوست طیبہ اور دوسری اس کی بڑی
بہن سمیرہ، دونوں اس وقت سیر کرتی ہیں۔" پھر وہ
ہمیں ایک ہوٹل میں لے گیا اور ہماری خوب خاطر مدارت
کی۔ راستے میں ہمیں اپنا گھر بھی باہر سے دکھایا۔ واپسی پر
جب ہم سمیرہ کے گھر کے نزدیک آئے تو دونوں بہنیں
گھریلو لباس پہنے چہل قدمی کر رہی تھیں۔ انہوں نے
وسیم کی کسی حرکت کا جواب نہ دیا۔ پھر وسیم نے ہمیں
عنایت اللہ کے گھر ڈراپ کیا اور خود اکیلا ہی ان کی
طرف چلا گیا۔ دونوں نے اچھی طرح جھڑک کر دوست
اس سے کوئی بات کی اور گھر چلی گئیں۔۔
ہم رات دس بجے کے قریب واپس اپنے گھروں
کو لوٹ آئے۔۔۔

* * * *

طے یہ پایا تھا کہ عنایت اللہ ان باپ بیٹی کا عندیہ
معلوم کرے گا۔ جب یہ راضی ہو جائیں گے، تو خالد
میرے ابو کو منائے گا اور یوں یہ طویل کہانی اختتام
پذیر ہو جائے گی۔۔۔ پھر دو دن بعد چھٹیاں ختم ہو
گئیں۔ مجھے کام پہ آئے ابھی کوئی ایک ہفتہ ہوا تھا کہ خالد
اور عنایت اللہ ہوسٹل آن دھمکے۔ معلوم ہوا کہ یہ
کل آئے ہیں۔ میرا صبح آپریشن ڈے تھا۔ اس لئے
صبح سویرے ہی چلا گیا۔ مصروفیت کی بنا پر رات
نو بجے واپس آنا نصیب ہوا۔ جب کمرے میں آیا تو ڈا
خالد اور عنایت اللہ سر جوڑے باتیں کر رہے تھے۔
جواب بے حد

دیکھ کر تقریباً مستی ہو گئے۔۔ کھانا کھایا اور پھر سیر کے لیے نکل گئے۔۔ پھر ایک کیبن میں بیٹھ کر چکن سوپ پینے لگ گئے۔ ایسے میں تینوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور ٹونی نے اپنا گلا کھنکارا اور گویا ہوا:

"شہزاد! آپ کو یاد ہے کہ جب ہمارا زرعی یونیورسٹی سے میچ ہوا تھا۔ میں نے بہت زیادہ نیٹ پریکٹس کی تھی تاکہ زیادہ سے زیادہ سکور کر سکوں۔"

"ہوں"۔۔ میں نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"اور آپ کو علم ہے کہ میں پہلی ہی گیند پر کیسے بولڈ ہو گیا تھا۔ اور تم دوڑتے دوڑتے آتے تھے کہ کہیں میں صدمے سے گر نہ پڑوں۔۔۔ یقیناً میں بالکل نارمل اور ہشاش بشاش تھا۔ بتایئے کیوں؟۔۔۔ صرف اس لیے کہ مجھے علم تھا یہ شکست میری قسمت میں اس وقت تک لکھی ہوئی۔ مگر زندگی تو شکست اور فتح کے ساتھ ساتھ مسکرانے چلنے کا نام ہے۔۔۔ یہی وجہ تھی کہ دوسری اننگز میں میں نے ۱۷۸ رنز بنائے اور ناٹ آؤٹ رہا۔۔۔ اور انعام حاصل کیا"۔

میں نے تائید میں سر ہلایا کیونکہ اس کی ہر بات میں سچ تھا۔۔۔

"تو پھر سنو، تم بھی کلین بولڈ ہو گئے ہو۔ لیکن ٹونی کے دوست ہو، ٹونی کی طرح ہی ہنستے ہوئے نارمل حالت میں پویلین میں آؤ۔۔ ورنہ ٹونی اور تمہاری دوستی ختم"۔

پھر عنایت اللہ نے مجھے تفصیل بتاتے ہوئے کہا:

"کل سمیرہ کے والد بھی ہمارے ساتھ فیصل آباد آئے تھے۔ انہوں نے اپنے بھائی کے گھر ہمیں اور سمیرہ کو بلا کر اس کی مرضی معلوم کی تو اس نے اس شادی سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ شہزاد سے میری شادی کسی صورت بھی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد "افسر" میری اچھائی برائی کا مالک ہوگا۔ (یہ افسر کنگ ایڈورڈ میں فورتھ ایئر کا طالب علم ہے۔)

میں نے انہیں یقین دلایا کہ مجھے کسی قسم کی پریشانی نہیں، بلکہ زندگی کی یہ تلخ حقیقت مجھے تہہ دل سے قبول ہے اور جب سمیرہ کو میرا ساتھ قبول نہیں، تو میں زبردستی اس کا ساتھ کیسے مانگ سکتا ہوں:

دوسرے روز خانیوال وغیرہ واپس چلے گئے۔ میں اور ٹونی کالج گئے۔ میں نے دو پیریڈ بھی پڑھے مگر دل نہیں لگ رہا تھا۔ واپس کمرے میں آ گیا۔ سر میں درد محسوس ہو رہا تھا۔۔ سونے کی کوشش کی مگر نیند نہ آئی۔ پھر میں نے سائیڈ ٹیبل کی دراز سے نیند کی گولیاں لیں اور سو گیا۔ اٹھا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اور ٹونی اپنے بستر پر اٹھ بیٹھ کر سیب کھا رہا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ میری آواز سن کر وہ متوجہ ہو گیا۔ اور میرے منہ میں بھی سیب کاٹ کر رکھ دیا۔

جب میں نہا دھو کر تیار ہو گیا تو وہ بالکل میرے سامنے آ کر بیٹھ گیا اور بڑی معصومیت سے بولا:

"شہزاد! مجھ سے کتنا پیار ہے؟"

"بہت"..

"پھر بھی کتنا۔۔"؟ وہ بضد رہا۔

میں نے بازو پھیلا دیے۔۔۔ "اتنا"

وہ میرے پھیلے ہوئے بازوؤں میں آیا اور مجھے زور سے بھینچ لیا۔۔ "شہزاد، مجھے علم ہے کہ سمیرہ نے تمہیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا ہے اور تمہاری مسکراہٹ جعلی ہے۔ تم نے آج سونے کے لیے نیند کی گولیاں استعمال کی ہیں نا۔ لیکن تمہارا یہ نادان دوست اس موقع پر اپنی عزیز ترین متاع تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہے۔۔۔ وعدہ کرو کہ تم میرا مان رکھو گے۔"

ان جذباتی لمحوں میں ٹونی کی ان باتوں نے میرا مصنوعی خول توڑ دیا اور میں بچوں کی طرح سسک پڑا۔ اور پھر ٹونی کی بانہوں میں جانے کب تک سسکتا رہا اور آنسو بہاتا رہا۔۔۔ میرے آنسوؤں میں سمیرہ کی بے وفائی اور بے حسی کی داستان تھی۔ دل کا خون آنکھوں کے رستے بہتا رہا۔۔ اور ٹونی پیار سے میری کمر تھپتھپاتا رہا۔

قمیص کا رنگ اور اوپر بالوں کا رنگ۔ اتنا بیچ کرتا نظر آیا کہ ڈر لگ گیا کہیں اسے نظر ہی نہ لگ جائے۔ اس کی رنگت ہم سب گھر والوں سے مختلف گلابی گلابی سی تھی...

زپ بند کرتے ہوئے میں پوچھنے لگی...

"عنبر ایک بات تو مجھے بتا۔ اپنے خاندان میں تو کوئی تیری رنگت کا لڑکا نہیں ہے، پھر کہاں سے تیرے لیے شہزادہ ڈھونڈیں گے...؟"

"باجو پلیز..." عنبر بچوں کی طرح منمنائی۔

"باجی کو بھی... ترڈوب فاتنل میں ہے، کوئی دودھ پیتی بچی تھوڑی ہے، جو اس تذکرہ پر یوں ریں ریں کرنے لگتی ہے..."

"چھوڑیئے پلیز..." اس نے بچوں کی طرح پیچھے سے نکلنے کی کوشش کی۔

"نہیں تبلی... آج کچھ تو اشارہ کرو۔ تمہیں پتہ ہے امی میرے بارے میں مطمئن ہونے کے بعد اب تیری فکر میں ہے... (بینا کی منگنی ان کے کزن ارشد سے طے پائی تھی) اور سارے رشتہ دار یہ میرا معاملہ طے دیکھ کر ادھر کا رخ کر رہے ہیں اور پھر جب کسی نے امی کو جال میں پھانس لیا تو پھر تو ریں ریں کرتی پھرے گی۔ لہٰذا ابھی سے مجھے اپنا چوائس بتا دے..." میں نے کہا۔

"نہیں باجی... مجھے شرم آتی ہے!"

مجھے اس کی اتنی سادگی پر غصہ آ گیا اور میں نے تھپڑ رسید کر دیا۔ اور تبلی اسی کشمکش میں نیچے سے پھسل گئی۔ اور تھوڑی دیر بعد اپنی البم لے آئی۔ اور ایک فنکشن کا فوٹو دکھا کر کہنے لگی... "اس میں جو سب سے زیادہ اسمارٹ لڑکا ہے وہی..."! اور میرے پکڑنے سے پہلے ہی بھاگ گئی۔

اب یہ پورے کالج کے فنکشن کی تصویر تھی۔ کون کس کے بارے میں سب سے زیادہ اسمارٹ ہونے کا فیصلہ کر سکتا تھا... واپسی پر میں نے اسے بہت کریدا، بال تک کھینچے۔ مگر اس نے صرف اتنا بتایا کہ پٹھان ہے اور عمران خان کی شکل کا ہے..."

میں نے بہت پوچھا کہ اس سے کیا تعلقات ہیں؟ کس نوعیت کے ہیں؟ لیکن وہ تکیے میں منہ دیئے خاموش پڑی رہی... میں نے امی کو دھمکی دی تو وہ ناراض ہو گئی۔

میں فکر میں پڑ گئی کہ آج کل زمانہ بڑا خراب ہے اور تبلی تو بہت معصوم ہے کہیں غلط قسم کے لڑکے کے ہاتھ نہ لگ جائے... تو اس نے یقین دلایا کہ آپ کے خدشے بے بنیاد ہیں۔ وہ ایسا لڑکا نہیں ہے۔ میں اس سے باتیں بھی کرتی ہوں مگر اس نے مجھے کبھی نہیں دیکھا..." میری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آتی تھیں...

ایک دن ہمارے گھر کچھ مہمان آئے تھے اور میں نے چائنیز ڈش بنائی، رات کو جب ہم سونے لگے تو تبلی کہنے لگی... "باجی! آج میں نے انہیں سویٹ ڈش کھانے کی دعوت دی تو انہوں نے قبول کر لی۔ اور پھر میں نے انہیں دو چمچ کھلائے بھی، لیکن اچانک ہماری لڑائی ہو گئی۔ اور وہ چلا گیا..."

میں اٹھ کر بیٹھ گئی... "کس وقت بلایا تو نے اسے؟ اور کہاں بٹھایا؟ اور مجھے کیوں نہ بتایا!" لیکن وہ تکیوں میں سر دیئے اوندھی پڑی ہنس رہی تھی...

"باجی! اسے غصہ بہت جلد آ جاتا ہے، ورنہ ضرور آپ سے ملواتی..."

"خانہ خراب... جلدی بتلاؤ گی کہ چیخ کر ندیم کو بلاؤں..." (تبلی ہمارے منجھلے بھائی سے بہت ڈرتی تھی)

وہ سہم کر بولی... "نہیں باجی پلیز، میں تو آپ سے مذاق کر رہی تھی، آپ خود سوچیں، سارا وقت تو آپ کے ساتھ کچن اور ڈرائنگ روم میں رہی۔"

میں نے ذہن پر زور دیا تو تبلی کی بات سچ تھی کیونکہ تبلی بغیر بنیاد کے کوئی بھی بات اپنے پاس سے نہ کرتی تھی...

از۔ عزیز الرحمن گیلانی سعودی عرب

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

سلام مسنون... اس مرتبہ ایک نئی کہانی "آخری پیار"... [illegible] کہانی میرے ایک مہربان چوہدری اللہ رکھا صاحب نے ایک نامکمل شکل میں مجھے روانہ کی اور انہوں نے اسے مکمل کرنے کے بعد شائع کرانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی... میں یہ کہانی مکمل کرنے کے بعد آپ کی بزم میں [illegible] حاضر ہو گیا ہوں۔ میرے [illegible] کی [illegible] لکھ بھیجئے گا...

شہزادہ صاحب! میں نے اس کہانی پر پوری پوری محنت کی ہے۔ جہاں تک کہانی کے حقائق کا تعلق ہے چوہدری صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ یہ کہانی حرف بہ حرف صحیح ہے [illegible] حیرت ہیں... [illegible] کی طرف سے بے توجہی [illegible] کے بیس اسی ہزار روپے کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔ [illegible] جواب عرض کو [illegible] کے مطابق تمام کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کر دیئے ہیں...

قارئین نے جس طرح میری پہلے شائع ہونے والی کہانیوں کو پسند فرمایا ہے اس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں اور امید کرتا ہوں کہ وہ میری زیر مطالعہ کہانی "آخری پیار" کو بھی پسند فرماتے ہوئے اپنی قیمتی آراء سے نوازیں گے... آخر میں جواب عرض کی مزید ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

فقط خلوص و کاوش...

عزیز الرحمٰن گیلانی

ص ب نمبر ۱۸۴ مدینہ المنورہ۔ سعودی عرب

نوٹ: اپنی ہر تحریر پر رسالہ کی تاریخ ضرور درج فرمایا کریں۔ (ادارہ)

"ڈیڑھ سال پیشتر کا واقعہ آج بھی مجھے اس طرح یاد ہے کہ جیسے یہ کل ہی کی بات ہو"، اکرم نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

اکرم اور میں یعنی (احمد) بچپن کے اکٹھے کھیلے ہوئے دوست ہیں۔ پرائمری تک ایک ساتھ تعلیم حاصل کی... اس کے بعد اکرم کے والد صاحب کا جو کہ ایک پولیس انسپکٹر تھے، تبادلہ کسی دوسرے شہر میں ہو گیا۔ یوں ہم دونوں دوست بچپن ہی میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے... اور پھر عجیب اتفاق دیکھئے کہ ہم آج مدینہ پاک جیسی مقدس سرزمین پر یکجا ہوتے۔ میں اکرم کو اس کی نیلی آنکھوں سے پہچان سکا تھا۔ لیکن وہ مجھے نہ پہچان سکا۔ اتنی مدت بعد جب ہمارا آمنا سامنا کچھ اس انداز سے ہوا کہ میں نے سر راہ اس کو کھڑے دیکھا تو میرے تیز تیز بڑھتے ہوئے قدم یکبارگی منجمد ہو گئے اور میری نگاہیں اکرم پر مرکوز ہو کر رہ گئیں.. یقیناً یہ میرے بچپن کا دوست اکرم ہی ہے... یہ تحت الشعور سے ایک مانوس سی آواز مجھے [illegible] رہی تھی... وہی شکل... وہی صورت اور وہی نیلگوں آنکھیں۔ میں ان سوچوں کے گہرے سمندر میں مستغرق ہو چکا تھا کہ اکرم کی آواز نے مجھے ان سوچوں کے سمندر سے باہر نکالا تو میں چونک گیا...

"اجنبی مجھے سر راہ یوں گھور گھور کر دیکھ رہے ہو کوئی بات ہے کیا...؟"

"ہاں میرے اجنبی دوست، میں اپنی کسی کھوئی ہوئی چیز کو تلاش کر رہا تھا"...

"تو کیا وہ میرے چہرے پر چسپاں ہے"۔ اکرم نے برجستہ جواب دیا...

"یقیناً... مگر ناراض کیوں ہوتے ہو دوست"۔ میں نے پیار سے کہا۔ "اگر ناراض ہوتے ہو تو میں اپنی آنکھیں موند لیتا ہوں مگر میری ایک خلش کو دور کر دیجئے..."

فرمائیے...

کیا آپ انجم تو نہیں..؟

ہاں..

کیا آپ کے والد محترم گجرات شہر میں پولیس انسپکٹر تھے۔

جی ہاں... لیکن آپ کون ہیں۔

پہچان لیجئے... میں بات بڑھاتے ہوئے بولا۔

میں نہیں پہچان سکا۔ انجم نے جواب دیا۔

اگر ایسا ہے تو میں یقیناً آپ کا بچپن کا بچھڑا ہوا دوست سکتا ہوں۔ میں نے کہا۔

او احمد.. تم.. اس نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا۔

ایک لمحے میں برسوں کی دو.. یاں دور ہوگئیں... دو ں ایک دوسرے کے بن چکے تھے۔

چلو یار انجم..! میں نے اس سے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ن پر چلتے ہیں بھولی بسری یادوں کو تازہ کریں گے۔ پھر ہم نوں ہاتھ میں ہاتھ ملائے قہقہے لگاتے مکان پر آگئے... ں نے پیپسی اور فروٹ سے دوست کی تواضع کی۔ اور ں ہی باتوں میں پوچھ بیٹھا۔

یار انجم..! ہمارا ایک کلاس فیلو ساقی جو نظر ہی ساقی لگتا تھا۔ بھلا کدھر ہے۔

وہی جو چوہدری عصمت اللہ کا لڑکا تھا...

بالکل وہی... میں نے بات کو کاٹ کر کہا۔

انجم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری... اس غریب کا واقعہ بڑا دردناک ہے۔ وقت کی بے رحم چکی نے اسے مسخ کرکے رکھ دیا ہے...

یار احمد..! تمہیں یاد ہوگا کہ جہاں وہ ساقی... ایک ساقی مانند تھا، وہاں غروریت بھی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کسی بات کی تہہ تک جانا تو اپنی ہتک سمجھتا تھا۔ س ذرا بات ہوتی اور اُدھر میٹر پھرنے لگتا... تمہیں یاد ہے ناکہ ماسٹر صاحب اکثر اسے اس کی اس عادت کی وجہ سے پیٹا کرتے تھے اور یہ بھی کہا کرتے تھے۔

ساقی..! تم بچے ہو... ایسی غروریت تمہیں زیب نہیں دیتی۔ نہ سنبھلو گے تو وقت تمہیں مٹا کر رکھ دے گا۔

وقت گزرتا رہا.. ہم تم بچھڑ گئے... ساقی بدستور میرے ساتھ ہی پڑھتا رہا... دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں کا روپ دھار گئے... اب ساقی نکھر چکا تھا... خوبصورت گول مٹول سا چہرہ، گھنگھریلے دلکش بال.. اور اپنے چہرے کو ہر وقت پاؤڈر اور کریم کی تہوں میں چھپائے رکھتا۔ لیکن ان تمام تر خوبصورت اوصاف کے باوجود بچپن کی غروریت ضرب المثل بن گئی۔ یعنی بس گئی تھی کہ زمین پر پاؤں بھی اترا کر رکھتا۔ گاؤں کے لوگ اسے اس کی اس فطرت کی وجہ سے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے۔ بڑے.. بوڑھے بزرگ اسے اپنے پاس بٹھا کر سمجھاتے۔

ساقی.. غرور خدا کو بھی پسند نہیں۔ فرعون اور نمرود جیسے مغرور اس مٹی کے نیچے جا چکے ہیں.. تو تمہاری بساط کیا ہے خدارا ان عادتوں کو چھوڑ دو۔ خلوص اور پیار کو اپنا شیوہ بناؤ۔ ورنہ تمہاری تباہی کا تذکرہ صفحۂ قرطاس کے سینوں پر ملے گا۔

لیکن ساقی ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکال دیا کرتا۔ اور لاپرواہی سے جواب دیتا۔

بوڑھے کھوسٹ..! ایک ہی ٹکر سے زمین کی تہوں میں پہنچا دوں گا... آئندہ مجھے نصیحت مت کرنا۔ میں جو کر رہا ہوں بہتر ہے... مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں... سنا ہے کہ پھر سنا دوں...

نہیں بیٹا..! بوڑھے کانپتے ہوئے کہتے... ہم آئندہ کچھ نہیں کہیں گے۔

اس کی خودسری اور بدتمیزی کے چرچے گاؤں کے کونے کونے میں تھے۔ یہاں آکر احمد کو رک گیا.. اور تھوڑی دیر رکنے کے بعد دوبارہ بولا۔

یار احمد..! خدا کی ذات تو غفور الرحیم ہے... وہ تو بسا اوقات ایسے لوگوں پر رحمت کی برسات کر دیتا ہے۔ ساقی پر بھی خداوند قدوس شاید مہربان تھا۔ دولت کی فراوانی تھی۔ "ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا" کی مصداق ساقی پہ دولت کی فراوانی نے اس کی مغروری میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ اور پھر قدرت نے ایک ایسی حسن کی دیوی اس کی جھولی میں لا ڈالی تھی جو چاند کو بھی شرماتے... خوبصورت سی آنکھیں لمبی ناک، بڑے گیسو.. سرو سا قد.. چال میں شاہانہ انداز

گفتگو میں خاصا ٹھہراؤ... قہقہوں میں پائل کی سی جھنکار۔ احمد میں تمہیں کیا بتاؤں... اس الہڑ سی دوشیزہ پر جوانی نے کیا غضب ڈھایا ہوا تھا۔

جہاں سے یہ مٹیار گزر جاتی.. نوجوان اور خود سر نگاہیں اس سے نقاب میں رہا کرتیں۔ گاؤں کا ہر نوجوان اس الہڑ سی گڑیا کو ایک نگاہ دیکھنے کے لیے ترستا۔ حسین لڑکی جس کا نام ماہتاب تھا... اس سے بڑھ کر نیک اور خدا ترس تھی۔

پانچ وقت نماز ادا کرتی... تہجد گزار تھی قرآن کا ورد کرنا۔ وہ اذان کا شیدہ تھا... گلی سے گزرتے وقت نظریں پاؤں پر رکھنا اس کی عادت تھی... الغرض جن کے یہ حسن شہرت تک اور شادی ہو گیا۔

لیکن اس خوب صورت سی ماہتاب کی قسمت نے ساتھ دیا اور اس بد نصیب کی قسمت کچھ یوں پھوٹی کہ اس کے والد عجب خان نے اس مغرور اور ضدی لڑکے کی جھولی میں اسے ڈال...

باقاعدہ منگنی کی رسم ہوئی اور یوں ماہتاب ہمارے رسم و رواج کے مطابق اس کے نام لگ چکی تھی۔ اس بے جوڑ رشتے پر "ف" کہا۔ لوگوں نے جان لیا کہ عجب خان نے فقط دولت کو دیکھا ہے۔ اب تو اس ساقی کے بھائی امجد جو سنار کا کام کرتے تھے۔ اکثر عجب خان کے گھر آنے جانے لگے۔ حجاب کی دیواریں پامال ہو گئیں۔ اپنے جب بن جائیں تو ایسا ہی ہوا کرتے ہیں۔ اس ساقی کا بھائی امجد زیادہ وقت ماہتاب کے گھر ہی گزارنے لگا۔ امجد شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ تھا۔ لیکن اس کا یوں ماہتاب کے اردگرد گھومنا عجب سے خالی نہ تھا... ماہتاب امجد کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

ماہتاب اسے اپنا ہی تو سمجھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کئی کئی راتیں اس کے گھر رہا کرتی... منگنی کے چند ہی ماہ بعد جب مجھے ماہتاب کو دیکھنے کا اتفاق ہوا... تو میں نے اس کی رنگت میں پھیکا پن پایا... میں نے دیکھا کہ وہ سندر سی دوشیزہ کچھ اجڑی اجڑی سی نظر آنے لگی تھی۔

لیکن سوچا..! شاید اس کی شادی ہونے والی ہے۔ اس نے پیا نے گھر جانا ہے... والدین کا گھر چھوڑنے کے احساس نے غالباً اس قدر پرہیزگار اور ایسے تاثرات چھوڑے ہیں۔

لیکن کبھی کبھی ہی ماہتاب اب آخر گھر کی چار دیواری میں اندر رہنے لگی تھی... آخر ایک وقت وہ بھی آ گیا جب شرمیلی.. پرہیزگار اور الہڑ دوشیزہ کو مغرور ساقی کی جھولی میں ڈال دیا گیا...

شادی ہو گئی پھر بعد سے لدی ماہتاب۔ آج ساقی کا چار دیواری کی زینت بن گئی تھی... ماہتاب جو حسن کی دیوی تھی وہ بجھ کر رہ گئی تھی... لیکن اب ساقی کی عادتیں کافی بدل چکی تھیں... اب تو وہ ماہتاب سے ضرورت سے بڑھ کر پیار کرنے لگا.. مگر ماہتاب اس قدر پیار کے باوجود بھی بجھی بجھی سی رہتی... وہ بسا اوقات کئی کئی گھنٹے ایک ٹک نگاہ سے فضا میں گھورا کرتی۔ اور بے خیالی میں ٹپکتے آنسو اس کی گالوں کو تر کرتے ہوئے زمین بوس ہو جاتے..

وقت کا دھارا تھامے نہیں تھمتا... لمحوں کی پل چل رک نہیں سکتی.. اسی طرح تین سال کا عرصہ بیت گیا۔ اب تو ساقی کے گھر رب العزت نے دو ننھی ننھی کلیاں کھلا دی تھیں.. نجمہ اور عابدہ ماں ہی کی طرح حسین و جمیل تھیں..

یہاں پہنچ کر انجم رک گیا... اور کچھ دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد دوبارہ بولا۔

یار احمد..! بسا اوقات تو میں سوچتا ہوں کہ بچپن کس قدر حسین تھا... کاش وہ وقت وہیں تھم جاتا۔ مگر بھلا ایسے کیونکر ہو گا۔

اگرچہ ماہتاب اور ساقی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مگر ان کا ایک جگہ اکٹھا ہو جانا اور وہ بھی ایک میاں بیوی کے روپ میں... یقیناً حیرانگی کا سبب تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مغرور.. ضدی اور ہٹ دھرم سا ساقی ماہتاب کو دل و جان کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ مگر ماہتاب اپنے آپ کو کھاتے جا رہی تھی... اسے کون سا روگ لگ گیا تھا؟ سب کے لیے ایک سوال بن گیا تھا..

ہرنی کی طرح چوکڑیاں لگانے والی ماہتاب یوں سلگ رہی تھی جیسے دو انگلیوں کے شکنجے میں سگریٹ سلگتا ہے... اور لمحہ بہ لمحہ راکھ بن کر زمین پہ بکھرتا چلا جاتا ہے... کچھ

ایسے ہی دو راہے سے ماہتاب گزر رہی تھی۔

ایک دن میں اپنے خیالوں میں گم کسی طرف جا رہا تھا تو اچانک میں نے دیکھا کہ میرے آگے آگے گم سم اور نگاہیں نیچی کیے کوئی لڑکی جا رہی ہے... مجھے شک گزرا کہ یقیناً چال ڈھال سے تو ماہتاب ہی ہے... میں تیز قدم چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا تو واقعی ماہتاب تھی

ماہتاب..! میں نے آہستہ سے کہا۔

کیا بات ہے..؟ اس نے نگاہیں اٹھائے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

ہوں.. آج میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں مجھے اپنا بھائی سمجھو... اور میں جو کچھ پوچھوں وہ بتا دو۔

ماہتاب ٹھہر گئی۔ اس نے میری طرف دیکھا واقعی ماہتاب کو دلیسا ہی کمزور اور نحیف پایا... جیسا کہ سن چکا تھا۔ اس کا رنگ... کبھی گلاب کے پھول کی مانند تھا... اب سیاہ زرد تھا... اُف خدایا.. کیا یہ وہی ماہتاب ہے جس کی خاطر منتظر نگاہیں ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترستی تھیں۔

بولو انجم بھائی... کیا کہنا چاہتے ہو... ماہتاب نے ... ۱۵

میں خوابوں کی دنیا سے نکلا... اور بولا۔

ہاں بہن..! میں کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنا بھائی سمجھو... میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہاری صحت بتدریج بڑی طرح متاثر ہوتی جا رہی ہے... بہن اپنے دلی کرب کو ظاہر کر دو۔ میں شاید تمہارے کام آ سکوں۔

انجم بھیا..! ایک دکھی عورت جو دکھوں سے مزین ہو۔ اور ایک ایسا راز اپنے اندر پوشیدہ کیے ہوئے ہو۔ جسے ظاہر کرے تو تباہی کو قریب تر پائے۔ اور اگر چھپائے تو اس کا حال یوں ہو۔ جیسے آپ کے سامنے ماہتاب..

انجم بھائی! ایک بات جو صاف صاف کرنا چاہوں گی۔ آپ نے سوال کیا۔ میں نے جواب دیا۔ آج کے بعد اگرچہ آپ میرے بھیا بن کر آئے ہیں۔ کبھی بھی اس انداز سے مجھ سے کچھ کہنے کی اور گفتگو کرنے کی آئندہ جرأت نہ کرنا... چونکہ دنیا کی زبان کوئی بند نہیں کر سکتا... اگر تمہیں میری دکھی داستان سے اس قدر دلچسپی ہے تو کچھ صبر کیجئے... میری داستان خود ہی سن لوگے...

میں نے دیکھا کہ اس کی خوبصورت اور بجھی بجھی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میں خاموش کھڑا رہا اور ماہتاب تیزی سے گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گئی۔ میں اسے جاتے دیکھتا رہا...

ماہتاب..! کاش میں تیرے دکھ بانٹ سکتا... یہ سوچتا ہوا چل پڑا... لیکن میرے پاؤں من بھر کے ہو چکے تھے۔ میں لٹے ہوئے جواری کی طرح گردن جھکائے گھر کی طرف رواں تھا کہ میری پریشانی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ بے قراری ایک پل بھی چین نہیں لینے دے رہی تھی

آخر ماہتاب کو کیا ہے؟... وہ کیوں پریشان ہے؟ اس نے اپنا رنگ و روپ یوں کیوں اجاڑ رکھا ہے۔ کیا اسے ساقی پسند نہیں تھا... کیا اس سے بیشتر دریں وہ کسی اور کی بن چکی تھی... نہیں ہرگز نہیں.. ایسا ممکن ہی نہیں.. وہ ایک شریف اور مہذب ترین لڑکی ہے... میری سوچ ہی قطعی گھٹیا ہے

میں کافی دیر ان خود ساختہ سوال و جواب کا تجزیہ کرتا رہا ماہتاب میرے لیے ایک سوال بن چکی تھی۔ میں اس کی خستہ حالی کا واقعہ جاننے کے لیے بے چین تھا۔ میں ہر حالت میں اس راز کو پانا چاہتا تھا

میں انہی سوچوں میں گم گھر پہنچا.. کئی دن اور بیت گئے۔ میں ان واقعات کو بھول ہی چکا تھا کہ میری بہن آسیہ نے ایک دن مجھ کو بتایا... انجم کیا تم نے نہیں سنا کہ ساقی نے ماہتاب کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔

سچ کہتی ہو آسیہ... میں دھاڑا ایسے جیسے مجھے شدید صدمہ ہوا ہے۔

ہاں.. ہاں انجم..! یہ سچ ہے۔ اور ماہتاب ان دنوں اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے۔ اور دونوں بچیاں بھی ساتھ لے گئی ہے...

میں نے جونہی آسیہ کی زبانی سنا تو ماہتاب کے وہ الفاظ میرے کانوں میں گونج اٹھے... جو اس نے مجھ سے کہے تھے..

انجم میں ایک دکھی داستان سے منسلک ہوں۔ اگر وہ

راز ظاہر کر دوں تو تباہی میری منتظر ہے۔ اور اگر چھپائے رکھوں تو قبر میرا مسکن... لیکن انجم بھیا! مجھے یوں میرا راز نہ اگلوائیں اس لیے کہ دنیا کی رسان کوئی بند نہیں کر سکتا۔ اگر تمہیں میری داستان جاننا چاہو تو کچھ صبر کیجئے۔ میری داستان منزل پر پہنچ رہی ہے۔

ماہتاب کے یہ الفاظ میرے دماغ میں تازیانے لگا رہے تھے... میں تڑپ اٹھا۔ بستر کو چھوڑ دیا۔ اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آسیہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔

کیا بات ہے بھیا۔ میری یہ بات سن کر کیوں پریشان ہیں۔ آخر کیا ماجرا ہے۔

بس آسیہ... تم میری پیاری بہن ہو۔ تم یہ جانتی ہو کہ میں اس کا دکھ سن کر برداشت نہیں کر سکتا۔ آج ماہتاب کی اجڑی زندگی دیکھ کر مجھے انتہائی دکھ ہوا ہے۔ لیکن میں جاننا ہوں کہ آخر ایسا کیوں ہوا۔ اگر یہ ہونا ہی تھا تو تین سال پہلے کیوں نہ ہوا۔ آخر ماہتاب ساقی کی نظر میں آج بری کیوں ہے۔ یہی ایک سربستہ راز ہے جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔

انجم بھیا! آسیہ نے کہا گھبرائیں نہیں... ماہتاب میری بچپن کی سہیلی ہے۔ اگرچہ میں اسے کافی دیر سے نہ مل سکی۔ لیکن اب تو مجھے آپ کی خاطر جانا ہی ہوگا۔ اور پھر اپنی ماہتاب کے دکھوں کو بھی بانٹنا ہوگا... انشاء اللہ یہ راز کھل جائے گا۔ جس نے تجھے پریشان کر رکھا ہے... اگلی صبح آسیہ ماہتاب کے گھر جا پہنچی۔

آسیہ جونہی ماہتاب کے مکان کی چوکھٹ سے اندر داخل ہوئی جیسے اس کی نگاہ اجڑی سی... بکھرے بکھرے بال اور گندے کپڑوں میں ملبوس ماہتاب پر پڑی تو ٹھٹھک گئی اور بڑھتے قدم رک گئے... اُف میری ماہتاب کا کیا حال ہو گیا ہے... کاش اس کی مسکراہٹیں سدا اس کے خوب صورت چہرے پر سجی رہتیں...

آسیہ کی نگاہیں ماہتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پاگلوں کی طرح دھر ادھر تکے جا رہی تھی۔ آسیہ دوڑ کر ماہتاب کے گلے جا لگی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

میری ماہتاب..! تم تو چاند سے زیادہ حسین تھیں... تمہارے حسین قہقہے جن کی آواز پائیل کی چھنکار کی مانند تھی۔ اور تمہاری مسکراہٹ ایک کھلے پھول کی مانند تھی۔ تیری رنگت سیب کو شرماتی تھی... آخر یہ سب کچھ کیسے چھن گیا۔ خدا کے لیے اپنی آسیہ کو بتا دو۔ شاید میں تیرے بتانے سے تمہارا دکھ کچھ بانٹ سکوں۔

ماہتاب پاگلوں کی طرح اس کے چہرے کو تکے جا رہی تھی اور پھر جھٹ آسیہ سے علیحدہ ہو گئی۔ اور گھبرا کر چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

تم آسیہ ہو...؟

ہاں ہاں میں آسیہ ہوں ماہتاب میرا دل تمہارا حال سننے کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔ خدارا مجھے جلدی بتا دو۔ آخر تم نے اپنا رنگ روپ کیوں بگاڑ لیا... وہ کونسا دکھ تھا جس نے تیری کایا پلٹ دی وہ کون سا ظالم ہے جس نے تمہیں اس درجے پر لا کھڑا کیا۔

خاموش ہو جاؤ آسیہ! ماہتاب چیخ اٹھی۔ دوبارہ ظالم کا لفظ میں نے تیری زبان سے سنا تو تیری زبان... یہ کہتے کہتے ماہتاب خاموش ہو گئی.. تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

دیکھو آسیہ.. ناراض نہ ہونا۔ دراصل ساقی کے خلاف میں ایک لفظ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ تم مجھے ملنے آئی ہو اور میں نے غیر ارادی طور پر نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا ہے... معاف کر دینا آسیہ۔ میں پاگل جو ٹھہری۔

میری ماہتاب! مجھ میں کیوں ناراض ہونے لگی۔ میں تو خود شرمندہ ہوں کہ میں نے تمہارے ساقی کے بارے میں بھول کر گستاخانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ اس کی بار میں نے دیکھا کہ مجھے پوچھتے ہوئے اس سبزہ اور زرد چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

ایسا مت کہو۔ میں خود معافی مانگتی ہوں۔ ماہتاب نے جواباً کہا... اور خاموش ہو گئی۔ اور اپنے پاؤں پر نگاہیں گاڑ دیں...

ماہتاب۔ میں نے آہستہ سے کہا... وہ خاموش رہی تو میں نے دوبارہ آواز دی۔ وہ بدستور ایک بے جان بت کی مانند بیٹھی رہی۔

ماہتاب..! آخر تم خاموش کیوں ہو... بولتی کیوں نہیں

میری بے قرار سا مروج پر تھی ... ماہتاب مجھ سے نہ روٹھو. خدا کے لیے بولو ... میں تمہیں بولنا چاہتی ہوں۔

میں نے دیکھا کہ اگلے ہی لمحہ جب ماہتاب نے نگاہ اونچی کی تو اس کی خوب صورت آنکھوں کے پپوٹوں سے ایک ایک کر کے موتیوں کی طرح آنسو ٹپک رہے تھے ... یہ موتی اس کے گالوں پر سے ہوتے ہوئے صراحی مانند گردن کی طرف لڑھک رہے تھے ...

ماہتاب ... ! تم تو بالکل ہی بدل کر رہ گئی ہو ... تم تو کہا کرتی تھی ... زندگی زندہ دلی کا نام ہے ... مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں. لیکن آج تم آنسو بہا کر اپنی زندہ دلی کا ماتم اس انداز سے کیوں کر رہی ہو ... تیرے یہ بہتے آنسو ہرگز تیرے دل کے کرب کا مداوا نہ کر سکیں گے۔

بولو .. خدا کے لیے بولو ... ان کلی نما ہونٹوں کو جنبش دو تمہاری آسیہ تمہیں مسکراتا دیکھنا چاہتی ہے ... تو ماہتاب نے ایک جھٹکے سے گردن کو اونچا کیا اور اس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ٹکرا گئیں ... دیکھا کہ اس کی نگاہوں کے سوتوں میں واقعی درد ناک داستان مدفن تھی ... وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھے جا رہی تھی ... نہ معلوم یہ سماں کب تک قائم رہتا ... لیکن میں نے جرأت کی اور پوچھ لیا۔

آخر ایسا کیوں ... ؟

ماہتاب کے ہونٹوں پر جنبش کے آثار نمودار ہوئے اور یوں گویا ہوئی ...

آسیہ ... ! تم مجھے مسکراتا دیکھنا چاہتی ہو ... تم نے یہی کہا ہے نا .. ؟

ہاں ہاں .. میں یہی چاہتی ہوں۔

آسیہ ... ! عرصہ گزرا ہے کہ میری مسکراہٹیں چھن چکی ہیں. میری زندگی کے حسین و دلفریب چمن کو خزاں رسیدہ ہواؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے ... میں تو اب اس تنگ دھڑک تیلے کی مانند ہوں. جیسے خزاں کے بے درد جھونکوں نے اپنی تسکین کی خاطر مجھے اس نوبت تک پہنچایا میرے گلشن میں خوشیاں آئی ہی کب ہیں کہ میں مسکرا سکتی. اب تو میرے لیے رب عظیم سے دعا کرتی رہا کرو کہ وہ میری زندگی مجھ سے چھین لے .. اور میں سکھ کا سانس لے سکوں۔

اپریل ۸۲ ۱۹ء

نہیں نہیں ... ایسے ہرگز نہ ہوگا ... میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پر اپنی انگلیاں رکھ دیں۔

آسیہ میں کیا کروں .. ؟ تم ہی بتاؤ. ماہتاب چارپائی سے اٹھ کھڑی ہوئی . اور ہوتے ہوئے چلتی ہوئی مغربی طرف کھلے ہوئے دریچے میں جا کھڑی ہوئی . اور پھر ایک دم مڑی. اور ایک آہ بھرتے ہوئے بولی۔

آسیہ .. ! شادی کے حالات تک تو تم واقف ہو ہی کہ میری شادی ساقی کے ساتھ ہو گئی تھی. میں نے شادی کے تین سال جو ساقی کی رفاقت میں گزارے . میں ان تین سالوں کی اذیت ناک گھڑیوں کو بیان کرنے سے قاصر ہوں . اور پھر مجھ سے بھول یہ ہوئی کہ میں انہیں اپنی زندگی کا راز بتا بیٹھی . میرا خیال یہ تھا کہ اس طرح میرا ضمیر مجھے ملامت کرنا چھوڑ دے گا۔

لیکن تم نے ایسا کیوں کیا . میں نے ماہتاب کو درمیان میں ٹوک کر کہا۔

اگر میں ایسا نہ کرتی اور اس راز کو پوشیدہ رکھتی تو میں یہ محسوس کر رہی تھی کہ دیر یا بدیر مجھے ٹی بی ہو جائے گی. اور میں یوں ایک بوڑھی عورت کی مانند کھانس کھانس کر قبر میں چلی جاؤں گی ... اور ماہتاب پھر خاموش ہو گئی . اور دور بہت دور فضاؤں میں گھورنے لگی . اس کی نرم و نازک و خوب صورت پیاری پیاری آنکھوں سے ساون بھادوں کی رم جھم کی برسات رواں دواں تھی . اگلے لمحے اس نے ان موتیوں کو اپنے آنچل سے خشک کیا اور پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

ہاں تو آسیہ .. ! میں کہہ رہی تھی کہ میں کھانس کھانس کر قبر میں جا سکوں گی ... یہی ایک خلش تھی جو مجھے کھوکھلا کیے جا رہی تھی . میری مثال کچھ یوں تھی "نہ بتائے مرے اور بتلائے بھی مرے" اس ضمیر کی کشمکش کے تابع جب میں نے محسوس کیا. کہ مجھے ان دو راستوں سے ایک راستہ اپنے لیے نخو سر کرنا ہی ہوگا ... ورنہ چھٹکارے کا کوئی تیسرا راستہ ہرگز نہیں۔

ایک بدنصیب رات کو میں اپنے چھوٹے سے مگر خوبصورت آنگن میں سوئی ہوئی تھی . دونوں خوب صورت گڑیاں میرے پہلو میں تھیں . ایک دائیں طرف اور ایک بائیں طرف . چاندنی حسین چاندنی جوبن پر تھی . مگر آج ماہتاب کی چمکتی حسرتوں میں

گھپ اندھیرا ہونے والا تھا۔

آسیہ ... میں چاندنی رات میں دیکھا کہ میرا پیا میرے ... چاندنی پر سیدھ کی گہری آغوش میں تھا۔ میں اضطرابی حالت میں چارپائی سے فوراً اٹھی۔ میں نے اپنی نگاہیں کھلے آسمان پر گاڑ دیں۔ اے خداوند قدوس جہاں کے پیدا کرنے والے مجھے یہ بتا کیا میری پر خزاں زندگی میں کبھی بہار بھی آئے گی؟ میں اس خدا سے سوال کر رہی تھی۔ جو کل جہاں کا مالک ہے... لیکن میری دعاؤں کا اثر نہیں ہو رہا تھا... غالباً آسمان کی بے کلی وسعتوں سے ٹکرا کر واپس آ رہی تھیں... کیا کروں... بے قراری سے ہٹنے لگی... ضمیر کی خلش چین نہ لینے دیتی تھی... بتا دو بتا دو۔ تم اپنے پیا کی چور ہو... یہ میرے ضمیر کی آواز تھی... میرے قدم ڈگمگانے لگے... میرے آنسو سبیل رواں کی طرح بہ نکلے... میں لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنے سرتاج کے سرہانے جا کھڑی ہوئی۔

قدموں کی آہٹ اس نے اپنے نزدیک محسوس کی تو ہڑبڑا کر آنکھ کھول دی... ذرا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں بھی قدرے قدرے سنبھل چکی تھی... نکھری چاندنی میں میرے بہتے آنسو اسے صاف نظر آ گئے۔

ماہتاب... ! میری چاندنی ماہتاب! تمہیں کیا ہو گیا ہے کیا میری ماہتاب نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ آخر میری ماہتاب کو کون سی بے چینی تھی جس نے بے آرام کیا... میرے ... آہستہ آہستہ چھلکے پن کے سے ... اور پھر گلابی چہرے پر ... پھیلی ہوئی پژمردگی... کچھ ایسے آثار نمایاں تھے۔ جو مجھے کئی دنوں سے پریشان کیے ہوئے تھے۔ مجھے بتاؤ تو سہی ماجرا کیا ہے۔

جب میرے سرتاج نے یوں کچھ اس انداز سے سوالات کیے تو میں نے بہتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کیا۔ اور چہرے پر سنجیدگی برقرار کرتے ہوئے گویا ہوئی۔

سرتاج... ! آپ نے آج سوالات کر کے اپنی ماہتاب کو مطمئن کر دیا ہے۔ اور ماہتاب آج اس غبار اور گھٹن سے یقیناً چھٹکارا چاہتی ہے۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو... بھلا اس خزاں رسیدہ زندگی کا کیا فائدہ... میں ایسے راز کو مدفن رکھوں ... جس نے میرے چہرے کی رنگت کو چھین لیا ہے۔

جس راز نے مجھے آپ سے نفرت کی ترغیب دی۔ میں آج... سب کچھ بتا دینا چاہتی ہوں۔ راز کا پردہ چاک کر دینا چاہتی ہوں...

ماہتاب... ماہتاب! یہ کہتے کہتے میرے سرتاج کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جواب دیا...

خدا کے لیے کوئی اچھی بات کرنا... ورنہ میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ جاؤں گا... میرے گلشن میں روشنی تم سے ہے۔ جس کے لیے پورا شہر ترستا تھا۔ لیکن خداوند قدوس نے یہ حسین تحفہ میرے نصیب کیا... تو حوصلہ کرنا چاہو۔ سوچ کر کرنا۔ دل ایک نازک ترین آبگینہ ہے... چھن سے ٹوٹ جائے گا... اور اس کی کرچیاں بکھر جائیں گی۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو تم کیا... دنیا کی کوئی طاقت ان کرچیوں کو نہ سمیٹ سکے گی... یہ تھے میرے سرتاج کے الفاظ... یہ کہہ کر ماہتاب خاموش ہو گئی... تھوڑی دیر سکوت رہنے کے بعد وہ پھر گویا ہوئی۔

آسیہ! میں ایک آخری فیصلہ پر پہنچ چکی تھی... میں اپنے خاوند کو ہرگز دھوکہ میں نہ رکھنا چاہتی تھی۔ بیتے ہوئے تین سال تین صدیوں سے بھی بڑے تھے۔ میں نے سوچ لیا کہ میں خاموشی کی مہر لگا کر ضمیر کی خلش کی وجہ سے زندگی بھر کیا ایک بار پھر تڑپتی رہوں... یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کوئی بے جان مورتی تو نہ تھی... جو محسوس نہ کر سکے... میں تو گوشت پوست سے بنا ہوا ایک انسان تھی... ضمیر کی خلش جیت گئی۔ اور میں ہار گئی

میرے سرتاج... ! میرا فیصلہ مستقبل کا وہ فیصلہ ہو گا کہ اگر آپ نے حوصلہ اور بردباری کا ثبوت دیا تو ماہتاب کے اجڑے چمن میں بہاریں ہی بہاریں ہوں گی۔ اور اگر آپ کا فیصلہ ماہتاب کے خلاف گیا تو آپ کی ماہتاب جیتے جی مر جائے گی۔

کہہ دو ماہتاب... ! جو کہنا چاہتی ہو۔ خدا کے لیے زیادہ نہ ستاؤ۔ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

آسیہ... ! پھر میں نے بہتے آنسوؤں سے وہ کہہ دیا جو کہنا چاہیے تھا۔ لیکن تم نے کیا کہہ دیا۔ آسیہ نے بے قراری کے سے انداز میں کہا...

اپریل ۱۹۸۳ء

ں تو تیا نے کہا کہ ۔۔ پھر خاموش ہو گئی ۔۔ یوں محسوس
ھا کہ جیسے وہ درد و کرب کا شکار ہے ۔ چونکہ خاموشی
رہ گہری تھی ۔ اتنے ہی چہرے پر بدلتے ہوئے رنگ
تھے ۔ چند لمحات کی کربناک خاموشی کے بعد ماہتاب
نگاہ اونچی کی ۔۔ اور ٹھنڈی آہ بھری ۔ ۔ اور بولنا شروع

۔۔۔ میں اُس رات کو کبھی نہ بھول سکوں گی ۔ جس رات میں
ے دلور امجد کے آنگن میں سوئی تھی ۔۔ ہیٹھی اور دھیمی
یمی مطلع بہار کی ہوا چل رہی تھی ۔ رات کے ایک بجے کامل
دگار میں نے چارپائی پر سرسراہٹ محسوس کی ۔
اس سے قبل کہ میرے منہ سے چیخ نکلتی کسی مضبوط ہاتھ نے
میرے منہ کو بند کر دیا ۔۔۔
میں امجد ہوں ۔۔ میں امجد ہوں ۔ خدا کے لیے نہ چیخنا ۔
ماہتاب میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گا ۔
میں نے زبردستی اس کے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے سے
اپنا منہ آزاد کرایا ۔ اور پھر جلدی سے بھائی کو آواز دی ۔ مگر
میں یہ جان کر حیران رہ گئی ۔۔ کہ گھر میں تو کوئی فرد بھی موجود
نہیں ہے ۔۔۔ ایک امجد تھا یا پھر میں ۔۔۔

اور پھر میری نگاہیں ندامت سے اپنے سرتاج کے سامنے
جھک گئیں ۔۔۔ درچھم چھم برستے آنسو گالوں کو تر کرنے لگے ۔
کچھ دیر خاموشی رہی ۔
تھوڑی دیر سکوت کے بعد ساقی اٹھا اور ادھر اُدھر چل
کر کچھ سوچ لگا ۔۔۔ اور ۔ قدرے
ٹھوکریں دیں ۔ آج سسک رہی ہوں ۔۔۔ موت قریب
سے گزر جاتی ہے ۔۔ اور دنیا کی ٹھوکروں کے لیے زندہ جانے
مجھے کب تک زندہ رہنا ہو گا ۔۔ میرے لیے دعا کرو کہ مجھے
موت آجائے ۔
سنا ہے ، آج کل میرا خاوند سعودی عرب میں ۔ روضۂ رسول
پر ہے ۔۔ یعنی مدینہ پاک میں ہے ۔ خداوند کریم اسے خوش رکھے
ہاں امجد تم تو دلہا ہو بعد بچوں کے ۔ زندگی کی خوشگوار بہاروں
سے منسلک ہو ۔۔
امجد میرا پیغام سن لو تڑپتی نگاہیں قیامت کی منتظر ہیں ۔
انشاء اللہ قیامت کے دن تیرا گریبان اور میرا ہاتھ ہو گا
پھر تم خدا کو کیا جواب دو گے ۔۔
بولو ۔۔ بے غیرت امجد ۔۔ بولتے کیوں نہیں ہو ۔ میں تو
اپنی اجڑی زندگی کے آٹھ سال گزار چکی ہوں ۔ زندگی کا زیادہ
حصہ کٹ چکا ہے ۔۔ تھوڑی زندگی اب باقی ہے ۔۔۔ اگر خدا
نے چاہا تو تمہارا حشر اس دنیا میں وہ ہو گا کہ لوگ تھوک کر گزریں
گے ۔۔۔ تم مرنا چاہو گے تو نہ مر سکو گے ۔ امجد سن رہے ہو نا ۔
یہ کہہ کر ماہتاب خاموش ہو گئی اور آسیہ سے اٹھ بیٹھی
بہتے ہوئے آنسوؤں سے آسیہ بھی اسے تسلی دینے لگی ۔۔۔
دلاسہ دینے لگی ۔ ۔ خدا تمہیں صبر دے ۔ یہ کہہ کر آسیہ باہر
نکل گئی ۔۔

~(◉)~

شاید کہ پھر انہوں نے کھولی ہے زلف اپنی
تب ہی تو بہکے بہکے ہیں بدلیوں کے سائے
(نسرین ۔ لاہور)

قسمت کے کھیل

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

تسلیمات... یہ جانتے ہوئے کہ جواب عرض ہی دنیائے مرتّقی میں معکوس حقائق کی صحیح معنوں میں نقاب کشائی کر رہا ہے۔ اسی امید اور حوصلے کے ساتھ ایک معکوس حقیقت اس کی بزم کی نذر کر رہا ہوں کہ یہ کسی بھی نئے لکھنے والے کا دل نہیں توڑتا، بلکہ ہر نئے لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے.... یہ حقیقت میں نے "جواب عرض" کے لیے بہت محنت اور کوشش سے لکھی ہے....

شہزادہ صاحب! میری یہ تحریر ان لوگوں کے نام ہے، جنہیں اپنے اس عظیم وطن سے کوئی محبت نہیں، جنہیں اپنی اولاد سے بھی کوئی محبت نہیں اور جن کی آنکھوں پر دولت کی پٹی بندھی ہوتی ہے... وہ لوگ صرف اور صرف دولت کو ہی اپنا سب کچھ جانتے ہوئے اسی سے محبت رکھتے ہیں۔ میری یہ تحریر اگرچہ کافی طویل ہے لیکن اس کے باوجود یہ اپنے اندر بہت سے تلخ و شیریں حقائق لیے ہوئے ہے۔ اسے میں نے .. "قسمت کے کھیل"... کا نام دیا ہے۔ آپ کو حق حاصل ہے کہ قسمت کے کھیل کو شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد اگر چاہیں تو اس کا عنوان بھی بدل سکتے ہیں...

شہزادہ بھی! چونکہ یہ میری پہلی تحریر ہے اس لیے بلاشبہ اس میں بہت سی فنی خامیاں ہوں گی لیکن آپ کے ہوتے ہوئے مجھے اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ میری یہ تحریر جواب عرض کے معیار پر پوری اترتے ہوئے آپ کو ضرور متاثر کرے گی۔ اگر ایسا ہو گیا تو اسے کسی قریبی اشاعت میں ضرور شامل کر لیجئے گا.. علاوہ ازیں اپنی اس تحریر کو میں نے اس لیے سسپنس و محبت سے شروع کیا ہے کہ جہاں یہ بعض قارئین کے لیے دلچسپی کا سامان ہوتی ہے، وہاں بعض قارئین کی غذا بھی ہے، لیکن میرا یہ کہانی تحریر کرنے کا جو اصل مقصد ہے وہ قارئین کو ساری کہانی پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا... تاہم میں نے جواب عرض کی منفرد پالیسی کے تحت اپنی اس تحریر کے تمام کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کر دیئے ہیں۔ قارئین کی تمام تر تعریفی اور تنقیدی آراء کا شدت سے منتظر رہوں گا۔

آخر میں جواب عرض کی مزید ترقی کے لیے خلوص دل سے دعاگو ہوں...

والسلام... خلوص کیش....

ایم اسحاق ناصر معرفت ایم ایوب بٹ کریانہ فروش
محلہ سلطان پورہ۔ گکھڑ منڈی۔ ضلع گوجرانوالہ

~~~~ . ~~~~ . ~~~~ . ~~~~ * ~~~~ . ~~~~ . ~~~~ . ~~~~

کہتے ہیں کہ وقت بڑے بڑے گہرے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے... اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان بہت کچھ بھول جاتا ہے۔ لیکن میرے زخموں کے لیے تو یہ وقت کبھی مرہم نہیں بن سکا۔ اور یہ زخم مندمل ہونے کے بجائے اور زیادہ گہرے ہوتے جا رہے ہیں اور نہ ہی یہ گزرتا ہوا وقت میرے ذہن سے یادوں کے نقش مٹا سکا ہے۔ بلکہ یہ وقت کا ہر ہر گزرتا ہوا لمحہ مجھے نوشی کے ساتھ گزارے ہوئے لمحوں کو یاد دلاتا ہے۔ میں بار بار اپنے ماضی میں کھو جاتا ہوں، جہاں میری خوشگوار اور پُرکیف یادیں میرا استقبال کرتی ہیں۔

یادوں کے اس گہرے اور وسیع سمندر میں جہاں مجھے بے پناہ سکون محسوس ہوتا ہے وہیں مجھے ایسا بھی لگتا ہے کہ جیسے وقت نے مجھے یادوں کے اس سمندر میں پھینک کر بے بس کر دیا ہو اور گزرے وقت کا ہر ہر لمحہ خوفناک ناگوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔
~~~~

اس سے پہلے کہ وقت کے یہ بے رحم ناگ مجھے ڈس لیں اور میں ہمیشہ کے لئے اس دار فانی سے کوچ کر جاؤں۔ میں اپنی تمام یادیں تم کو سنا دینا چاہتا ہوں۔ خوشی کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات بھی میری یادوں میں

خوشی میری زندگی میں ان دنوں وارد ہوئی تھی۔ جب میں نے نیا نیا فرسٹ ائر میں داخلہ لیا تھا۔

بس شاپ سے کالج تک کا راستہ میں پیدل طے کیا کرتا تھا کیونکہ بس شاپ سے کالج کا فاصلہ کوئی زیادہ نہیں تھا۔ اس لئے اکثر لڑکے پیدل ہی یہ راستہ طے کرتے تھے۔

جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جس سڑک پہ ہمارا کالج تھا اسی سڑک پہ ہمارے کالج کے راستے میں گرلز کالج بھی تھا۔ لڑکے چھٹی کرکے آتے تو دو دو تین تین کی ٹولیوں میں اکٹھے گزرتے تھے۔ چونکہ میں ابھی نیا نیا داخل ہوا تھا۔ اس لئے میرے ابھی دوست نہیں بنے تھے۔

میں اکیلا ہی کالج جاتا اور خاموشی سے واپس آتا تھا۔

مجھے چونکہ بونی روڈ پہ واقع ایک گاؤں سے کالج جانا ہوتا تھا اس لئے پہلے بس پہ سوار ہو کر شہر کے بس شاپ تک جانا پڑتا اور کالج سے واپسی پہ پیدل ہی بس شاپ تک آنا ہوتا تھا

ایک روز میں کالج سے بس شاپ تک آرہا تھا۔ جونہی میں گرلز کالج کے گیٹ کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ لڑکیاں بھی گیٹ سے باہر آرہی تھیں میں نے سوچا کیوں نہ سڑک کی دوسری جانب ہو جانا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں سڑک کراس کرنے لگا تو دیکھا کہ ایک رکشہ آرہا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھا کر سڑک عبور کرنے لگا۔ ابھی میں نے دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر قدم رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک ترنم بھری نسوانی آواز آئی۔

بہت جلدی ہے جی، کیا مرنے کا ارادہ ہے؟ اس کے ساتھ ہی قہقہوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے پیچھے دیکھا اور فوراً دھیان آگے کرکے تیز تیز چلنے لگا۔ میرے پیچھے پانچ لڑکیاں آرہی تھیں وہ پانچوں زور زور سے ہنس رہی تھیں۔ مجھے تیز چلتا دیکھ کر ایک نے پھر کہا۔

کیا کہیں آگے جا کر خودکشی کا ارادہ ہے اور اس کے ساتھ ہی ان کے قہقہے اور بلند ہو گئے۔

میں شرمندہ ہوتے ہوئے اپنی رفتار اور زیادہ تیز کردی اور ان سے آگے نکل گیا۔

اس دن کے بعد میں احتیاط کے طور پر اپنے کالج کے گیٹ سے نکلتے ہی سڑک عبور کر لیتا۔ تاکہ پھر ان لڑکیوں کے مذاق کا نشانہ نہ بنوں۔ کافی دنوں تک مجھے وہ لڑکیاں نظر نہ آئیں

ایک روز جونہی میں گرلز کالج کے گیٹ کے پاس پہنچا میری نظر انہی پانچ لڑکیوں پر پڑی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آرہی تھیں ان کو دیکھتے ہی میں نے تیز چلنا شروع کر دیا۔ مگر شاید انہوں نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ تبھی مجھے ان میں سے کسی ایک کی آواز سنائی دی

وہ دیکھو اسی دن والا ڈرپوک معلوم ہوتا ہے

ہاں وہی ہے دوسری آواز آئی۔

مجھے تو پاگل لگتا ہے تیسری آواز سنائی دی۔ پھر کسی اور نے کہا۔

پاگل نہیں بزدل ہے دیکھو تو کیسے لڑکیوں کو دیکھ کر احمقوں کی طرح بھاگ رہا ہے۔ اس کے بعد مجھے ان کے ہنسنے کا شور سنائی دیا اور ان قہقہوں کے درمیان ایک اور آواز سنائی دی۔

بے وقوف کہیں کا

تمام دن میرے کانوں میں ان کے قہقہوں کے درمیان بار بار یہ فقرہ سنائی دیتا

"بے وقوف کہیں کا"

تب مجھے خیال ہوا کہ میں واقعی بے وقوف ہوں۔ بھلا مجھے کیا پڑی ہے ان لڑکیوں سے ڈر کر بھاگوں۔ اگر وہ مذاق کرتی ہیں تو اپنے منہ سے کرتی ہیں میری بلا سے مجھے کیا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ان لڑکیوں پر بھی غصہ آتا کہ آخر وہ میرے پیچھے ہی کیوں پڑ گئی ہیں وہ کسی اور لڑکے کو مذاق کیوں نہیں کرتیں۔ اور لڑکے بھی تو سڑک سے گزرتے ہیں پھر اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا کہ شاید دوسرے میری طرح بے وقوف نہیں ہیں۔ کیونکہ اکثر لڑکے بھی لڑکیوں کو مذاق کرتے ہیں۔ اور میری طرح لڑکیوں سے ڈر کر تو نہیں بھاگتے ہیں

مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ سب قصور تو میرا ہے۔

جواب عرض لاہور

اپریل ۸۳ء

میں ان کے سامنے بدھو بنوں اور نہ وہ مجھے مذاق کریں

اگلے روز کے لئے میں نے فیصلہ کر لیا کہ کل بھی اسی راستے سے گزروں گا اور اگر کسی لڑکی نے مذاق کیا تو اس کا دو ٹوک جواب دوں گا۔ لیکن جب میں اگلے روز وہاں سے گزرا تو مجھے ان میں سے کوئی بھی لڑکی نظر نہ آئی۔

اس سے تین چار روز بعد کی بات ہے کہ میں تین لڑکوں کے ساتھ کالج سے بس شاپ کی طرف جا رہا تھا۔ جونہی ہم گرلز کالج کے گیٹ کے سامنے پہنچے میری نظر ان لڑکیوں کی طرف پڑی آج ان کی تعداد چار تھی۔ میں نے ان کو دیکھا تو فوراً لڑکوں کی آڑ میں ہو گیا۔ اور گردن نیچے کر لی۔ مجھے ڈر تھا کہیں آج پھر نہ وہ مذاق کر دیں اور مجھے ان لڑکوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے ایک نظر ان کی طرف دیکھا وہ چاروں ادھر ادھر دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ شاید انہوں نے میری یہ حرکت دیکھ لی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے مجھے کوئی مذاق نہیں کیا۔ لیکن ان کو مسکراتے دیکھ کر میرے ساتھ والے لڑکے بھی مسکرانے لگے اور ان کو اشارے کرنے لگے تب میں نے سوچا کہ کیوں نہ آج گلیوں میں سے گزر کر جلد بس شاپ کی طرف پہنچا جائے یہ سوچ کر میں ایک قریبی گلی میں ہو گیا

گرمیوں کے دن تھے۔ ایسے دنوں میں گلیاں عام طور پر سنسان ہوتی ہیں۔ میں جس گلی میں داخل ہوا تھا اس میں بھی ہو کا عالم تھا۔ صرف چند ایک ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ میں ذرا سا ہی آگے گیا تھا کہ پیچھے سے ایک آواز آئی۔

ذرا ٹھہریئے

میں نے پیچھے دیکھا تو حیران رہ گیا۔ یہ انہی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ اس کو آج میں نے سڑک پر ان کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ کوئی مذاق کرے گی۔ لہذا میں نے فوراً دھیان آگے کر کے چلنا شروع کر دیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر میں رک گیا کہ ذرا سنوں تو بھلا کیا کہنا چاہتی ہے۔ اگر یہ کوئی مذاق کرے گی تو میں بھی اسے اسی طرح جواب دوں گا۔ ویسے بھی اسے اکیلی دیکھ کر میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں نے رک کر

اسے دیکھا اس کا رنگ بہت دلکش تھا۔ نقش و نگار بھی بہت خوبصورت تھے۔ مجموعی طور پر وہ ایک حسین لڑکی تھی۔ جونہی وہ میرے قریب آئی میں نے کہا

فرمائیے کیا بات ہے۔

وہ چلتے ہوئے مجھ سے آگے نکل کر بولی۔ کیا آپ کے پاس وقت ہو گا کہ آپ مجھے کہیں علیٰحدگی میں مل سکیں۔ میں بھی اس کے پیچھے چل پڑا اور کہا۔

کیوں اپنی سہیلیوں سے مذاق کرنے کا ارادہ ہے۔

جی نہیں یہ بات نہیں۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔

تو کیا میری پٹائی کے لئے اپنے بھائیوں کو بلا رکھا ہے۔ میں نے طنزاً کہا

نہیں آپ یقین کریں کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے جواب دیا۔

اگر ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر اور کونسی بات ہے جس کے لئے آپ مجھے تنہائی میں ملنا چاہتی ہیں۔ میں نے دوبارہ سوال کیا۔

دراصل میں آ...... آ..... آپ سے ایک اور بات کرنا چاہتی ہوں اس کے منہ سے الفاظ ذرا اٹک اٹک کر نکل رہے تھے۔

ہاں تو کہیئے وہ بات جو آپ کہنا چاہتی ہیں۔ میں نے فوراً کہا

جونہی اس نے بات کرنے کے لئے لب کھولے میں اسی لمحے ایک دروازہ کھلا اور ایک آدمی دروازے سے باہر نکلا۔ وہ فوراً خاموش ہو گئی۔

تب میں تیز تیز قدم اٹھا کر اس سے پھر آگے نکل گیا۔ وہ آدمی ہماری مخالف سمت یعنی جدھر سے ہم آ رہے تھے۔ ادھر کو چلا گیا۔ وہ کسی ضروری کام سے نکلا ہو گا کیونکہ ان دنوں بارہ ایک بجے لوگ گھروں سے بہت کم باہر نکلتے ہیں۔ بلکہ اس وقت تمام لوگ گھروں میں آرام کر رہے ہوتے ہیں۔

وہ آدمی جب ذرا دور چلا گیا تو میں نے پیچھے دیکھے بغیر آہستہ سے کہا بتایئے جی کیا بات ہے۔

لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پیچھے دیکھا تو وہ یہ کہہ کر فوراً ایک دوسری گلی میں مڑ گئی۔

بجواب عرض لاہور

لڑکوں کو دیکھتی اور چھیڑتی ہیں۔

باتیں کرتے کرتے ہم ان کے گھر کی طرف جانے والی گلی کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس نے کوئی بات کئے بغیر خدا حافظ کہا اور اپنے گھر کو جانے والی گلی کا موڑ مڑ گئی۔

گھر پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ آج کی اس کے ساتھ گفتگو نے دل پر گہرا اثر کیا ہے۔ بار بار اس کا خیال آ جاتا۔ تصور میں بار بار اس کے ساتھ محو گفتگو ہوتا۔ میں نے اپنے آپ کو اس کے خیال سے آزاد کرنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے اس سے اس کا نام کیوں نہ پوچھ لیا۔ میں نے اس کے متعلق اس سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ کاش میں اس کا نام ہی جان سکتا۔

تب میں نے سوچا کہ کل دوبارہ اس سے ملاقات کی کوشش کروں گا۔ اور اگر وہ مجھے مل گئی تو اس سے اس کا نام ضرور پوچھوں گا۔

علی الصبح اٹھا تو دل اس سے ملاقات کو بے چین ہو رہا تھا

اس روز میں کالج جانے کے لئے کچھ جلد ہی تیار ہو گیا اور شاپ سے کالج جانے کے لئے اسی گلی والا راستہ اختیار کیا۔ جس میں اس کے ساتھ میری ملاقات ہو چکی تھی۔ لیکن مجھے مایوسی ہوئی وہ مجھے نہیں مل سکی۔ کالج میں ذہن ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ ہر پروفیسر کے لیکچر کو سنا مگر سمجھ خاک بھی نہیں آئی۔

ابھی ایک پیریڈ باقی تھا کہ کالج سے روانہ ہو گیا جب میں اسی گلی میں پہنچا تو گلی سنسان پڑی تھی میں نے گلی کی نکڑ پہ رک کر ایک نظر سڑک پہ ڈالی کوئی لڑکی کالج گیٹ سے نکل کر سڑک پہ چلتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ لیکن وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دی۔ دل میں خیال آیا کہ کہیں وہ گھر جا نہ چکی ہو۔ تب فوراً خیال آیا کہ میں آج ایک پیریڈ پہلے یہاں پہنچ گیا ہوں۔ وہ ابھی کالج سے نہیں لوٹی ہو گی۔ میں نے گلی میں نظر ڈالی چند قدم آگے کچھ بچے گولیاں کھیل رہے تھے۔ میں ان بچوں کے پاس جا کر رک گیا اور ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ بظاہر میں کھیل دیکھ رہا تھا اور حقیقت میں میں ایک ایسی لڑکی کا انتظار کر رہا تھا جس کا مجھے نام تک نہیں معلوم تھا۔ میں بار بار بے قراری سے اس طرف دیکھتا جدھر سے اسے آنا تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کسی کا انتظار بھی کتنا کٹھن ہوتا ہے

اپریل ۸۳ء

وقت کا ہر لمحہ ایک صدی جتنا طویل ہو جاتا۔ مجھے وہاں کھڑے ہوئے کافی عرصہ گزر گیا تو میں مایوس ہو گیا اور ایک آخری بار نگاہ سڑک کی طرف ڈالی تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ جونہی میں نے سڑک کی طرف دیکھا وہ مجھے گلی میں داخل ہوتی ہوئی نظر آ گئی تھی۔ میں جان بوجھ کر کھیل میں اس قدر محو ہو گیا کہ اسے شک نہ ہو کہ میں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ جونہی وہ کھیلتے ہوئے بچوں سے ذرا آگے نکلی میں نے گلی کے دونوں طرف ایک نگاہ دوڑائی گلی میں سوائے ایک بوڑھی عورت کے اور کوئی نہیں آ جا رہا تھا۔ وہ بوڑھی عورت بھی اس طرف جا رہی تھی جدھر سے وہ لڑکی آئی تھی۔ چنانچہ میں تیز تیز چلتا ہوا اس سے ذرا آگے جا کر چلنے لگا۔ آگے جا کر میں نے ایک نظر پیچھے دیکھا وہ ہنس پڑی اور بولی۔

کیا کر رہے تھے وہاں

تمہارا انتظار بلا ارادہ یہ الفاظ میرے منہ سے نکل گئے۔

کیوں؟ اس نے دھیمے اور پیار بھرے لہجے میں سوال کیا۔

تمہیں دیکھنے کے لئے۔ میں نے فوراً بغیر جھجکے جواب دے دیا۔

کس کے لئے۔ اس نے شرماتے ہوئے تیسری بار سوال کیا

جی اپنے لئے۔ میں نے جواب دیا۔

وجہ؟ اب کی بار اس کے سوال کرنے کے انداز میں غصے کی جھلک نمایاں تھی۔

جی وجہ در اصل یہ ہے کہ اس وقت ذرا فارغ تھا سوچا کیوں نہ کسی لڑکی کو دیکھ لیا جائے۔ میری بات سن کر وہ ہنس دی اور پھر اچانک مہربان ہوتے ہوئے بولی

دیکھ لیا؟

نہیں ابھی نہیں اور سنئے میں آپ سے ایک بات بھی کرنا چاہتا ہوں میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔

اچھا تو باری اتارنا چاہتے ہیں۔ آپ وہ مسکرا کر بولی۔

جی نہیں تم سے معذرت کے ساتھ میں نے التجا آمیز لہجہ میں کہا۔

کبھی آپ اور کبھی تم یہ کیا تک ہوا . . . . .

میں فوراً بولا جی در اصل مجھے اردو گرامر پہ اتنا عبور

جواب عرض لاہور

نہیں اس لئے ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے علاوہ میں آپ سے ۔ ۔

میں نے بات ادھوری چھوڑ دی ۔

تب وہ بولی ۔

ہاں آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں ۔

جی بات یہ ہے کہ مجھے آپ کا نام نہیں معلوم ہوا میں آپ سے آپ کا نام پوچھنا چاہتا ہوں تاکہ آپ کو آپ اور تم کی بجائے نام سے مخاطب کر سکوں ۔ مہربانی فرما کر بتا دیجئے ۔ آپ کا نام کیا ہے

کیا کرنا ہے پوچھ کر اس نے بے رخی سے کہا ۔

جی نام پوچھنے کی ایک وجہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اپنا نام تبدیل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں ہو سکتا ہے کہ آپ کا نام پسند آ جائے تو وہی رکھ لوں ۔ مجھے امید ہے اب آپ اپنا نام ضرور بتا دیں گی ۔ ویسے بھی نام بتانے میں کوئی نقصان نہیں ہے

نوشین اور مختصر نوشی ویسے بھی مجھے تمام نوشی کہتے ہیں اب ذرا آپ بھی اپنا نام بتا دیجئے گا

نوشی میرے منہ سے جھٹ نکلا

وہ مسکرائی اور بولی جناب یہ تو میرا نام ہے آپ اپنا نام بتا دیجئے ۔

دراصل آپ کا نام بہت پیارا ہے ۔ مجھے بہت پسند آیا ہے چنانچہ اپنے لئے یہی نام مناسب سمجھ کر آپ کو بتا دیا ۔ میں نے وضاحت کی

خوب مذاق طبیعت کے مالک ہیں آپ ۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا ۔

دیکھئے نوشین صاحبہ میں نے تو آپ سے کوئی مذاق نہیں کیا میں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا ۔

چلو چھوڑئیے ان باتوں کو اور ہاں آپ کچھ اور پوچھنا چاہتے ہوں تو پوچھئے ۔ اس نے اپنی رفتار ذرا بڑھاتے ہوئے کہا

آپ کے والد صاحب کا نام کیا ہے ۔ میں نے بدستور سنجیدگی سے کہا ۔

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی ۔

کیا کہنا ہے ان سے ۔

ان سے ایک شکایت کرنی ہے میں نے جواب دیا ۔

کیا شکایت کرنی ہے میرے والد صاحب سے اس نے اور سوال کیا ۔

یہی کہ آپ اپنی بیٹی کو کچھ سمجھائیں کیونکہ یہ راہ چلتے ہوئے لڑکوں سے مذاق کرتی ہے

آپ کی بات ماننے کا کون اس نے آہستگی سے کہا

آپ کے والد صاحب میں نے جھٹ کہا

اس کا الٹ بھی تو ہو سکتا ہے اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔

اگر ایسا ہوا تو یہ بعد میں دیکھا جائے گا

اس کے گھر کی طرف جانے والی گلی قریب آ رہی تھی میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا نوشی صاحبہ ایک بات کہوں ۔

جواباً اس نے ہاں کہی اور پوچھا کہ آپ کونسی بات کرنا چاہتے ہیں ۔

بات یہ ہے نوشی کہ اس دن میں نے کہا تھا کہ ۔ ۔ ۔

میں نے ذرا دم لیا تو وہ فوراً بولی

ہاں بولئے کیا کہا تھا میں نے

تم نے کہا تھا کہ وقت ہو گا آپ کے پاس کہ آپ مجھے کہیں علیحدگی میں مل سکیں ۔

جی ہاں میں نے کہا تھا اب آپ فرمائیے ۔ کیا کہنا چاہتے ہیں ۔ اس نے تائید کرتے ہوئے کہا ۔

دراصل میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرا خیال ہے کہ آپ کو علیحدگی میں مل سکتا ہوں ۔ اور جب بھی تم کہو میں تیار ہوں

لیکن مجھے اب آپ سے علیحدگی میں ملنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں جو بات آپ سے کہنا چاہتی تھی وہ کہہ چکی ہوں ۔ اس نے بے رخی سے کہا ۔

لیکن میں نے جو بات تم سے کہنی ہے وہ میں ابھی تک نہیں کہہ سکا ۔ لہٰذا تمہاری مہربانی ہو گی اگر تم میرے لئے کچھ وقت نکال سکو تو میں نے پر امید لہجے میں کہا ۔

چند لمحے وہ خاموش رہی جیسے کچھ سوچ رہی ہو پھر آہستہ بولی کہاں مل سکتے ہیں آپ

اس کی ہاں سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ میں نے کہا یہ تم پر منحصر ہے نوشی تم کل جس جگہ آسانی سے مجھے مل سکو بتا دو میں آ جاؤں گا ۔

جواب عرض لاہور

اپریل ۸۴ء

وہ دوبارہ خاموش ہو گئی جیسے کسی مناسب جگہ کے انتخاب پر غور کر رہی ہو۔ ... نا کے گھر کی طرف جانے والی گلی بالکل قریب ... رہی تھی۔ مجھے اس کے جواب کے لئے بے چینی ہو رہی تھی۔ پھر ... کی پیاری سی اس کی آواز سنائی دی۔

کل گورنمنٹ پارک میں آ جانا یہ کہتے ہی اس نے خدا حافظ کہا اور گلی کا موڑ مڑ گئی۔

اس دن ... میں تصور میں اس کے ساتھ عوامی پارک میں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ جب بھی اس کا تصور میرے سامنے آتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے نوشی اور میں صدیوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں اور جیسے ہم دونوں جنم سے ہی ایک دوسرے کے لئے بنے ہوں۔

چونکہ اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ کل کونسے وقت عوامی پارک میں آنا۔ اس لئے اگلے روز میں نے کالج سے چھٹی کی اور سیدھا پارک میں چلا گیا۔ جب میں پارک پہنچا تو تقریباً سوا آٹھ کا وقت تھا۔ میں نے پارک کے ہر طرف نظر دوڑائی لیکن نوشی مجھے کہیں بھی دکھائی نہیں دے سکی۔

میں کچھ دیر تک پارک میں ادھر ادھر گھومتا رہا اور پھر ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ میری نظر بار بار گھڑی پر جاتی اور میں اٹھ کر چاروں طرف دیکھتا اور پھر مایوس ہو کر دوبارہ بیٹھ جاتا۔ وقت تیز رفتاری سے گزر رہا تھا اور اس کی رفتار کے ساتھ ساتھ میری مایوسی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب تک ساڑھے دس بج چکے تھے۔ گرمی کی شدت آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ پارک میں موجود لوگ اب گھروں میں جا رہے تھے۔ میرا انتظار کرتے کرتے برا حال ہو رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں نوشی نے مجھے بیوقوف بنانے کے لئے ہی نہ یہاں آنے کو کہہ دیا ہو اور اس کا وعدہ ایک دھوکا ہی نہ ہو۔ لیکن اس کے برعکس میرے ذہن میں یہ خیال بھی بری طرح مسلط تھا کہ نوشی آئے گی ضرور آئے گی۔ وہ مجھ سے دھوکا نہیں کر سکتی۔ تقریباً گیارہ بجے کے قریب میں نے اٹھ کر ایک دفعہ پھر پارک میں نظر دوڑائی تو مجھے بے پناہ مسرت ہوئی کیونکہ میری نظروں نے نوشی کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ میں ذرا پیچھے بیٹھ گیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ ابھی تک مجھے نہیں دیکھ سکی۔ لیکن جلد ہی میں نے اس کو اپنے سامنے پایا۔ ایک ہاتھ میں کتابیں تھامے اور اپنے خوبصورت لبوں پہ ایک دلفریب مسکراہٹ بکھیرے ہوئے وہ بہت تیزی سے میری طرف بڑھ رہی تھی۔

میں نے آپ کو بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس نے میرے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ تو میں شرمندہ ہو گیا۔

بہت دیر کر دی تم نے نوشی میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں میں نے مسکراتے ہوئے کہا

سچ، اس نے ایسے پوچھا جیسے میری بات کا یقین نہ ہو۔

ہاں تو کیا جھوٹ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

اوہ آئی ایم ساری، میں دیر سے آنے کے لئے معذرت خواہ ہوں دراصل مجھے امید نہیں تھی کہ آپ اتنی جلدی آ جائیں گے میرا خیال ہے کہ دو پیریڈ پڑھ کر آپ ادھر ہی آ گئے ہیں۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا

جی نہیں ایک پیریڈ بھی نہیں پڑھا بلکہ آج کالج گیا ہی نہیں اور صبح سے ادھر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔

تب وہ ہنسی اور بولی معلوم ہوتا ہے جیسے کچھ زیادہ ہی شوق ہو گیا ہے لڑکیوں کو دیکھنے کا۔

ہاں نوشی: مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔ جیسے اب تجھے دیکھے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ ہر وقت تجھے دیکھتا ہی رہوں۔ یہ کہتے ہوئے میں نے نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیں

اس نے شرما کر چہرہ جھکا دیا تو میں نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے کہا۔

نوشی جان اب مجھے جی بھر کر دیکھنے تو دو۔ وہ صرف مسکرا دی اس کی مسکراہٹ سے جیسے کائنات کے ذرے ذرے کو ایک نئی زندگی مل گئی ہو۔ کس قدر دلنشیں تھی اس کی مسکراہٹ جیسے تمام کلیاں کھل گئی ہوں اور اس وقت پتے خوشی سے جھوم اٹھے تھے۔ جیسے وہ پیار کے اس انداز کو کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔

اس طرح نوشی سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ جس میں ہم دونوں نے اپنے دلوں کی باتیں ایک دوسرے سے کہیں

وقت کے تیز بہاؤ کے ساتھ ساتھ میری اور نوشی کی محبت بھی جواں ہوتی گئی۔ اور ہم ایک دوسرے کے دلوں کی گہرائیوں میں اترتے چلے گئے ہم اکثر اسی درخت کے سائے میں ملاقاتیں کرتے اور آپس میں پیار و محبت کے عہد و پیماں کرتے رہے اور زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔

ایک روز میں اور نوشی پارک میں اسی سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ جو ہماری پہلی ملاقات سے لے کر اب تک ہماری محبت کا گواہ تھا۔

نوشی اس روز کالج نہیں گئی تھی وہ گھر سے اپنی سہیلی کی سالگرہ پر جانے کا بہانہ بنا کر آئی تھی۔ اس کی سہیلی کی واقعی سالگرہ تھی لیکن وہ ادھر پارک میں بیٹھی اپنی محبت کی سالگرہ منانے میں مصروف تھی اور وہ خوب سج دھج کر آئی تھی۔

اس کی ملتی ساہ گھنگھور گھٹاؤں کی سی زلفیں اس کے شانوں پر بکھری ہوئی تھیں جیسے وہ چاند جیسے مکھڑے کو اپنی آغوش میں لے لینا چاہتی ہوں۔ مانگ سے ذرا ہٹ کر سرخ گلاب کا پھول بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ اس نے گہرے بلیو رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ اور اس کے بازوؤں میں کھنکھتی ہوئی چوڑیاں خزاں کے موسم میں بھی بہار کا سماں پیدا کر رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی بے پناہ گہرائی میں ڈوب جانے کو جی چاہتا تھا۔ اس کی قدرتی گلاب جیسے ہونٹ اور پھر ان پر سجی ہوئی دلفریب مسکراہٹ بہت بھلی لگ رہی تھی۔

نوشی اس وقت بالکل ایک پری معلوم ہو رہی تھی۔ ایسی پری جو پرستان کا راستہ بھول گئی ہو اور غلطی سے زمین پر آگئی ہو۔ اس وقت آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ادھر ادھر آوارگی کر رہے تھے جو کبھی کبھار سورج کا راستہ روک کر اس پری پر اپنا سایہ کرتے اور پھر آگے نکل جاتے۔

میں نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

نوشی۔

ہاں

ایک بات کہوں

ہاں کہو کیا بات ہے۔

وعدہ کرو نوشی کبھی بھی میرا ساتھ چھوڑ کر تو نہ جاؤ گی۔

ساجد! کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔

اعتبار تو ہے نوشی لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ آؤ آج ہم دونوں مل کر وعدہ کریں کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ تم بھی آخری سانس تک میرا ساتھ نہیں چھوڑو گی۔ اور زندگی کے کسی بھی موڑ پر مجھے دھوکا تو نہیں دو گی۔ نوشی نے بڑے تحمل سے میری باتیں سنیں اور صرف مسکرا دی۔ وعدہ کرو نوشی یہ سب باتیں نہیں منظور ہیں میں نے جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی لیکن جلد ہی مجھے سنجیدہ دیکھ کر خاموش ہوگئی۔ اور بولی

ساجد مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے

سچ میں نے خوشی سے کہا۔

ہاں بابا کہو تو لکھ کر دے دوں۔ اس نے شوخی سے کہا۔

جی نہیں مجھے یقین ہے میں نے کہا

شکر ہے خدا کا جو آپ کو میری محبت کا یقین آیا۔ وہ اس وقت شوخی کے موڈ میں تھی۔ ابھی ہم اور باتیں کرنا چاہتے تھے کہ آسمان پر اچانک ہلکے ہلکے بادلوں کی جگہ گھنگھور گھٹاؤں نے لے لی جلد ہی ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی پارک میں موجود تمام لوگ درختوں کے نیچے ہونے لگے ہم نے بھی اپنے ہمیشہ کے ساتھی درخت کے نیچے پناہ لی۔ اگرچہ خزاں کی آمد نے اس درخت کے کافی پتے گرا دیئے تھے لیکن اس کے باوجود بھی اس درخت نے ہمیں بہت زیادہ بھیگنے سے بچا لیا۔ چند لمحوں بعد بارش ختم ہوگئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہا اور گھروں کو چل دیئے۔

وقت کے تیز دھارے نے خزاں کو ایک دفعہ پھر شکست دی اور موسم بہار نے ماحول اور سبزہ زاروں کو ایک دفعہ پھر بارونق کر دیا۔ ایسی بہار کے موسم میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان ہم دونوں نے دیئے۔

پیپرز دیئے ہوئے دو ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ ہمیں رزلٹ کا بے چینی سے انتظار تھا۔

چند دنوں بعد ہی رزلٹ کا اعلان ہوگیا اور میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وقت ایک دفعہ پھر میرے لئے خوشیوں کا پیغام لایا۔ میں انٹر کے امتحان میں اچھی پوزیشن میں پاس ہوگیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر بہت احسان تھا۔ گھر والے میری اس کامیابی پر بہت خوش تھے۔ میری خوشی کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں ابھی جا کر نوشی کو اپنی کامیابی کی خوشخبری

قسمت کے کھیل

سادی. لیکن ضروری تھا کہ نوشی کے لئے مٹھائی کا بندوبست بھی کیا جاتا میں نے ابا جان سے اپنے دوستوں کا منہ میٹھا کرانے کے لئے ایک سو روپے مانگے تو ابا جان نے کہا ابھی میرے پاس نہیں صبح لے لینا۔ دوسری صبح ہوتے ہی ابا جان نے پیسے دیئے میں سیدھا بازار گیا اور مٹھائی کا ڈبہ خرید کر نوشی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس سے قبل میں کبھی نوشی کے گھر نہیں گیا تھا۔ صرف ایک دو دفعہ نوشی کو اس کے گھر داخل ہوتے دیکھا تھا۔

تمام راستے میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ جب میں نے نوشی کے دروازے پر دستک دی تو میرا دل بے چینی سے دھڑکنے لگا۔ جو شرمسنی سے دروازہ نوشی نے ہی کھولا

مجھے دیکھ کر نوشی کے چہرے کا رنگ چند لمحوں کے لئے بدل گیا لیکن جلد ہی اس کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر آ گئی۔ اس نے مجھے اپنے پیچھے آنے کو کہا اس وقت وہ سر سے بال جھٹک رہی تھی شاید ابھی غسل خانے سے غسل کر کے نکلی تھی۔ تو میں اس کے نوشی کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ڈر ڈری محسوس کی میرا دل کسی ان دیکھے احساس سے بری طرح دھڑک اٹھا۔ مجھے یہی احساس ایک اس قیامت کا احساس ہوا۔

صحن میں ایک جانب ایک عورت برتن میں بیٹھی پکانے کے لئے چاول صاف کر رہی تھی۔ برآمدے میں ایک بزرگ بانیلوں کی چارپائی پر نیم دراز گردن جھکائے ہوئے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھے

دونوں نے بیک وقت میری طرف دیکھا۔ دونوں کے چہرے حیرانی کی تصویر بن گئے۔

اس دوران نوشی اس عورت کے پاس جا چکی تھی۔ لیکن مجھ سے ایک قدم آگے بڑھنے کی سکت نہ رہی۔ مجھے اپنی خوشی میں یہ بالکل خیال نہیں آیا تھا کہ میں نوشی کے گھر جا رہا ہوں تو وہاں اس کے والدین بھی ہوں گے۔ جو مجھے جانتے تک نہیں۔ وہ مجھے دیکھ کر کیا سمجھیں گے۔ کیا وہ یہ بات برداشت کر سکیں گے۔ میں ان کی بیٹی سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ ان تمام باتوں کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ مجھے اپنے آپ پر بہت غصہ آیا۔ میں نے یہ سب باتیں یہاں آنے سے قبل کیوں نہ سوچیں۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوتا۔ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے مصداق میں نے آگے بڑھتے ہوئے نوشی کے والد کو سلام کیا اور ان کی اجازت کے بغیر ہی ان کے پاس نیلوں کی چارپائی پر بیٹھ گیا

نوشی کے والد صاحب نے اپنی آنکھوں سے عینک اتار کر دیکھا تو میں اور زیادہ گھبرا گیا۔ قریب تھا کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتے نوشی کی والدہ اٹھ کر ہمارے قریب آ گئی۔ اس نے آتے ہی دونوں ہاتھوں سے میرے سر پہ پیار دیا اور ماؤں کی طرح بلائیں لیتے ہوئے پھر اپنے خاوند نوشی کے والد کو حیران دیکھ کر فوراً بولی۔

نوشی کے ابو! یہ ساجد ہے جس کا میں آپ سے ذکر کر چکی ہوں۔ دیکھو تو کیسا خوبرو نوجوان ہے۔ اللہ عمر دراز کرے میرے بیٹے کی۔ پھر اچانک وہ میری طرف متوجہ ہوئیں اور بولی۔

بیٹے مجھے تمہارے متعلق نوشی نے سب کچھ بتا دیا تھا یہ ہماری بہت لاڈلی بیٹی ہے اور پھر لاڈلی بیٹی کیوں نہ ہو ہماری بھی تو ایک بیٹی ہے۔ جس کو ہم بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں اس کی ہر خوشی ہماری خوشی ہے اس نے کبھی کبھی ہمیں دکھ نہیں دیا یہ ہر بات ہمیں بتاتی ہے۔ خاص طور پر میرے ساتھ تو اپنے دل کی کوئی بات نہیں چھپاتی۔ ہم جیسی ماں بیٹی آپس میں رازداں ہوتی ہیں۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔ کہ ساجد سے محبت کرتی ہوں اور ساجد بہت اچھا لڑکا ہے۔ جب میں نے اس نے تمہارا ذکر کیا تو میں نے اس کو سمجھایا کہ بیٹی آج کل کسی پر بھروسہ مت کرو کیونکہ ہر کوئی دھوکے باز ہوتا ہے۔ جب اس نے یقین دلایا ہو کر تم ہماری عزت کو داغدار نہ کرو گے تو میں نے کہا تمہارے والدین سے بات کروں گی۔ اور لڑکا اور اس کا گھر بار دیکھ کر اس کے والدین سے بات کریں گے۔ پھر میں نے ایک دن نوشی کے والد صاحب سے تمہارا ذکر کیا اور انہیں کہا کہ۔

میں نے نوشی کے لئے ایک لڑکا دیکھا ہوا ہے۔ نیک خاندان سے ہے۔ میں نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ نوشی نے خود ایک لڑکے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن آج تم آ ہی گئے ہو تو ان کو بھی پتہ چل ہی جانا چاہیئے۔ ویسے میری بیٹی کی پسند بہت اچھی ہے۔

میری نظر نوشی پر پڑی تو وہ دوڑ کر ایک کمرے میں چلی گئی جونہی نوشی کی والدہ کی بات ختم ہوئی۔ نوشی کے والد صاحب آگے بڑھے اور میرے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

ہاں بیٹے نوشی کی والدہ نے مجھ سے تمہارا ذکر کیا تھا اس نے کہا تھا کہ۔

میں نے خود ایک لڑکا دیکھ رکھا ہے۔ لڑکا خوبصورت عقلمند ہے۔ ابھی زیر تعلیم ہے۔ اس کے گھر والے بہت اچھے

ہوئی میں پڑھ لکھ کر کوئی ملازمت کرے تو اس کے والدین سے بات کریں گے۔ لیکن آج پتہ چلا ہے کہ یہ نوشی کی پسند ہے۔ مجھے اپنی بیٹی بہت عزیز ہے اور جیسا کہ اس کی والدہ نے بتایا ہے کہ اس کی خوشی ہماری خوشی ہے۔ اس لئے اس کی پسند میری بھی پسند ہے۔

میرا خیال تھا کہ جونہی نوشی بارھویں جماعت پاس کرے تو میں اس کے رشتے کی بات کر دوں کیونکہ میں جیتے جی اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتا ہوں۔ اپنا تو معلوم نہیں کب دم نکل جائے ویسے بھی اب سر پہ بڑھاپا ہے اب یہ پڑھ بھی تو نہیں سکے اب تو پنشن کی رقم سے اس کے جہیز کی فکر کروں گا۔ ماشاءاللہ اب تو بارھویں جماعت کا امتحان بھی پاس کر بیٹھی ہے۔ کل ہی نتیجہ نکلا ہے اللہ کے فضل و کرم سے اچھے نمبروں سے پاس ہو گئی ہے۔ اس نے کبھی کسی کام میں مجھے مایوس نہیں کیا۔ اس نے ہمیشہ لڑکوں سے بڑھ کر میرا خیال رکھا ہے ہمیشہ فرماں برداری کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں تو اس کو بیٹی نہیں بلکہ بیٹا ہی سمجھتا ہوں بیٹا کہتے ہوئے نہ جانے نوشی کے والد کی آواز جذبات میں ڈوب گئی اور وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔

بیٹا ازلی مجھے خدا نے ایک ہی دیا تھا۔ جس پر میں نے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں۔

میں اس بیٹے کو اپنے اس پاک وطن کا پاسباں بنانا چاہتا تھا میرا خیال تھا کہ وہ جب پڑھ لکھ کر جوان ہو جائے گا۔ اور اچھے برے کی پہچان کے قابل ہو جائے گا تو میں اسے اس عظیم وطن کی حفاظت کے لئے خدا کی راہ میں قربان کر دوں گا اور اسے بتاؤں گا کہ اس کے دشمن کی نظر ہر وقت تیرے اس پاک وطن پر ہے تیرا دشمن تیرا دوست کبھی نہیں ہو سکتا میں اسے اس کی قوم کے دشمن کے گھناؤنے کردار کی تصویر دکھانا چاہتا تھا۔ بیٹا تم نہیں سمجھ سکتے کہ تمہارے دشمن کا کردار کس قدر گھناؤنا اور مکروہ ہے آہ میں نے تو اس کے اس کردار کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے دشمن کو بھی قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے اس دشمن کے ہاتھوں اپنا بہت کچھ لٹایا ہے۔ میں ابھی تک اسے بھولا نہیں۔ میں اسے کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ میں اسے بھلا بھی کیسے سکتا ہوں۔ نوشی کے والد صاحب کی آواز جذبات

کے سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھی اور بولتے جا رہے تھے۔

آہ! میں ۱۴ اگست سے پہلے کے اور اس کے بعد کے حالات کبھی نہیں بھلا سکوں گا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوؤں نے جو سلوک کیا تھا وہ میرے سینے میں دفن ہے۔ ہندوؤں کے اس گھناؤنے کردار نے ایک بہت درد ناک داستان کو جنم دیا تھا۔ یہ داستان ہمارے سینوں پر لکھی ہوئی ہے اس داستان کا ایک ایک لفظ ہندوؤں کے ظلم و ستم کا منہ بولتا ثبوت ہے اور یہ ہندوؤں کے اس مکروہ کردار کی ایک مکمل تصویر ہے۔ یہی وہ داستان ہے جس کی تصویر میں اپنے بیٹے کو دکھانا چاہتا تھا اور اسے بتانا چاہتا تھا کہ تیرا کل کا یہ دشمن آج تیرا دوست نہیں ہو سکتا۔ اس کی نظر تمہارے وطن پر ہے جسے وہ اپنا ملک سمجھتا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ ظلم و ستم اور ان کا خاتمہ وہ اپنا دھرم سمجھتا ہے۔ اس لئے تمہیں ہر وقت اپنے ملک و قوم کی حفاظت کے لئے تیار رہنا ہو گا۔ اسے میں بتانا چاہتا تھا کہ تجھے ابھی اس پاک وطن کی خاطر مزید قربانیاں دینے کے لئے بالکل اسی طرح تیار رہنا چاہیئے جس طرح اس کو حاصل کرنے کے لئے تمہارے بڑے بوڑھوں نے قربانیاں دی تھیں۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ تمہارے بڑے بوڑھوں کی ان گنت قربانیوں کے صلے میں ملے ہوئے خدا کی زمین کے اس ٹکڑے کی حفاظت کا ذمہ صرف اور صرف تمہارے اور تم جیسے نوجوانوں پر ہے۔

لیکن قسمت کے کھیل بھی عجیب ہوتے ہیں کہ میں اسے کچھ بھی نہ بتا سکا۔ میری خواہش تھی کہ میرا بیٹا پاک وطن کی پاک فوج میں شامل ہو کر اپنے عظیم وطن اور قوم کی حفاظت کرتا ہوا شہید ہوتا۔ تاکہ میری بے چین روح کو سکون حاصل ہوتا صرف میری روح ہی نہیں ان تمام شہیدوں کی روحوں کو سکون چاہیئے۔ جو اس ملک کے حصول کی خاطر قربان ہو گئے۔ اور ان کی روحیں بھی سکون کی متلاشی ہیں۔ جنہوں نے پاکستان کے نام پر اپنے پورے خاندان لٹوا دیئے تھے۔ ان مستورات کی روحوں کو سکون چاہیئے۔ جنہوں نے پاکستان کے نام پر اپنی عزت قربان کی۔ اور ان ماؤں اور ان بہنوں کی روحیں بھی سکون کی متلاشی ہیں جنہوں نے ہندوؤں کے ہاتھوں اپنے دودھ پیتے بچے اور اپنے بھائی اور والدین، خاوند سب اپنی آنکھوں سے کٹتے دیکھے تھے آہ وہ وقت کس قدر بھیانک اور دردناک واقعات کا مجموعہ تھا۔ وہ وقت کسی کو نہیں بھول سکتا۔

لاکھوں بہنیں اپنے بھائیوں کو اور کروڑوں بھائی اپنی بہنوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔

اے کاش کہ مجھے خبر ملتی کہ تمہارا بیٹا اپنے ملک و قوم کی ناموس پہ قربان ہو گیا ہے۔ تو میں قیامت کے دن فخر سے خدا کو کہتا کہ اے اللہ!

دیکھ میرے بیٹے نے تیرے رسولؐ کی امت کی حفاظت کرتے ہوئے اور تیرے عطا کردہ خطے کی آبرو کی خاطر اپنی جان قربان کی تھی۔ لیکن افسوس کہ خدا کو یہ سب منظور نہ تھا۔ خدا کو اصغر کی قربانی منظور نہ تھی۔ خدا کو میری قربانی بھی منظور نہ تھی۔ خدا کو میرے بیٹے کی قربانی منظور نہ تھی اسی لئے تو خدا نے اس کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔

پانچ سال ہوئے اس نے میٹرک کا امتحان دیا تو اپنا نتیجہ سنے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ نوشی کے والد صاحب بغیر رکے بولتے جا رہے تھے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوتا اگر میں شہادت حاصل کر لیتا۔ مگر شاید میرے نصیب میں شہادت نہ تھی۔ میری قربانی اللہ تعالیٰ کو ہرگز قبول نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں۔ ۔۔۔ میں نے شہادت حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے دن سکھوں کے ساتھ مقابلے کئے۔ میرے دو بھائی اور میں کنویں سے گھر پہنچے تو میرے گھر پہ سکھوں نے حملہ کر رکھا تھا۔ میرے ماں، باپ کی لاش صحن میں پڑی تھی۔ ایک دو سکھ میری چھوٹی بہن کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تمہاری بڑی بہن اپنی عزت بچانے کی خاطر قریب کے کنویں میں چھلانگ لگا کر مر گئی ہے تو اس وقت مجھے کتنا سکون نصیب ہوا تھا۔ اب تین سکھ میری چھوٹی بہن کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ہم تینوں بھائیوں نے سکھوں کا مقابلہ کیا اور تینوں کو ختم کر دیا۔ ہم چاروں بہن بھائی پاکستان کی طرف جانے والے ان دیکھے راستے پہ چل پڑے راستے میں کئی دفعہ ہم پہ سکھوں اور ہندوؤں نے حملہ کیا۔ ہم نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ایسے ہی سکھوں کے ایک حملے میں میرا ایک بھائی شہید ہو گیا ہم تین بھائی بہن رہ گئے راستے میں ایک اور حملہ ہم پہ ہوا جس میں میرا دوسرا بھائی بھی شہید ہو گیا۔ اب میں اکیلا لڑ رہا تھا۔ میرے پاس صرف ایک کلہاڑی تھی۔ سکھ چار تھے اور چاروں کے پاس کرپانیں اور خنجر تھے میں کب تک ان کا مقابلہ کرتا میں گر پڑا میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں تھیں میرا خیال تھا کہ ابھی کوئی سکھ خنجر یا کرپان مار کر میرا کام تمام کر دے گا لیکن ایسا نہ ہو سکا سکھوں نے شاید مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا اور میری بہن کی طرف بھاگے۔ میں نے بے بسی سے چار سکھوں کو اپنی معصوم بہن کی طرف جاتے دیکھا اور اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھا نہ گیا۔ میں نے دوبارہ بے بسی سے ایک نظر اپنی بہن پر ڈالی وہ بھاگی نہیں۔ اس نے بڑے آہستہ انداز میں آگے بڑھ کر میرے چھوٹے بھائی جو شہید ہو چکے تھے۔ کے ہاتھ سے کلہاڑی نکالی میرا خیال تھا کہ وہ سکھوں کا مقابلہ کرے گی۔ مگر میں نے صاف دیکھا کہ اس نے کلہاڑی کے تین چار وار اپنے سر میں کئے اور سکھوں کے قریب پہنچنے سے قبل ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملی تھی اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو نوشی کی والدہ کے والد صاحب (نوشی کے نانا) کو اپنے قریب پایا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے انہوں نے مجھے بتایا کہ میں ان کے راستے میں بے ہوش پڑا ملا تھا۔ انہوں نے مجھے اٹھا لیا اور پاکستان لے آئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اب ہم پاکستان کے مہاجر کیمپ میں ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اسی کیمپ میں ان کی بیوی (نوشی کی نانی) اور ان کی بیٹی (نوشی کی والدہ) کا بھی پتہ چلا ہے۔ ایک دو دن تک میں ان کو تلاش کروں گا وہاں کسی کو تلاش کرنا اتنا آسان نہ تھا کیونکہ مہاجر کیمپ کی ہر طرف مہاجر پناہ گزینوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا یہ سب لوگ بے یارو مددگار اور بے آسرا تھے۔ انہوں نے بہت کچھ پاکستان کے نام پر لٹا دیا تھا۔ اپنے خاندان کے سب افراد کٹوا دیئے اور اب اس امید پہ کہ شاید کوئی ان کے خاندان کا بچا کھچا افراد مل جائے۔ ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے

دوسرے دن نوشی کے نانا کو اس کی بیوی اور بیٹی مل گئی۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے ایک جھونپڑی بنائی اور ہم سب وہاں رہنے لگے۔ مجھے انہوں نے اس قدر پیار دیا کہ میں اپنے ماں باپ کے پیار کو فراموش کر بیٹھا۔ میرے دل سے اپنے شہید بہن بھائیوں کا خیال مٹ گیا۔ اب تو صرف ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح سکھوں اور ہندوؤں سے بدلہ لے سکوں۔ ان کے مشورے اور اجازت سے میں نے فوج میں ملازمت کر لی۔ ایک سال بعد میں چھٹی آیا تو انہوں نے اپنی بیٹی سے میری شادی کر دی

میں نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگیں لڑی لیکن میں شہادت کی دولت نہ پاسکا۔ مجھے خدا نے ایک بیٹا عطا فرمایا تو میں نے اس سے اپنی امیدیں وابستہ کر لیں لیکن وہ بھی چل بسا اس غم میں رو رو کر آنکھوں کی بینائی کم کر لی۔ جس کی وجہ سے فوج سے مجھے ریٹائر کر دیا گیا۔ اب تین سال سے پنشن پر گزارا کر رہا ہوں۔

یہاں تک پہنچ کر نوشی کے والد اچانک چونکے اب تک ان کے جھریوں بھرے گال آنسوؤں سے مکمل طور پر بھیگ چکے تھے۔ انہوں نے اپنے گال صاف کرتے ہوئے کہا۔

بیٹا معاف کرنا میں جذبات میں آکر بہت دور چلا گیا تھا ورنہ تم سے ہرگز ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیں تھیں لیکن نہ جانے دل بیٹھے یہ خواہش ہوئی تمہیں نہ سننے والی داستان کیوں اتنا مجبور کر رہی ہے کہ تم جا بنا تکر لیں کہ یہ داستان سنا کر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کر دوں۔ مجھے معاف کر دینا

نوشی کے والد صاحب کی جذبات سے مغلوب داستان نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں نے بہت مشکل سے اپنے آنسو روکے اور ان سے کہا۔

انکل خدا جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔ اس لئے اس کے شکوہ کرنے کی بجائے اس کا شکر اور صبر کرنا چاہیئے۔ تب وہ بولے

ہاں بیٹا۔ خدا جو کرتا ہے۔ وہ ٹھیک کرتا ہے۔ اس لئے تو میں صبر کئے بیٹھا ہوں

میں نے کن آنکھیوں سے نوشی کی والدہ کی طرف دیکھا وہ بھی دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ میں نے ان کو بھی حوصلہ دیا اور کہا

انکل آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کیوں آیا ہوں۔ اس پر وہ دونوں بیک وقت چونکے۔

نوشی کے والد صاحب دوبارہ بولے بیٹا معذرت چاہتا ہوں میں جذبات میں بہہ کر اپنی کہانی لے بیٹھا اور تمہاری طرف خیال تک نہ کیا پھر انہوں نے نوشی کو آواز دی جو ابھی تک کمرے سے باہر نہ نکلی تھی۔ بیٹی ذرا ساجد بیٹے کے لئے چائے ہی بنا لاؤ۔

نہیں انکل مجھے طلب نہیں۔ رہنے دیجئے۔ تب انہوں نے مجھ سے پوچھا ہاں تو کیسے آنا ہوا۔

میں نے کچھ کہے بغیر چار پائی پہ پڑا ہوا مٹھائی کا ڈبہ اٹھایا اور نوشی کی والدہ کو دیتے ہوئے کہا کہ۔

میں نوشی کو انٹر کے امتحان میں اچھی کامیابی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ تب دونوں نے مجھے مبارک باد دی۔ میں نے انہیں کہا میری طرف سے بھی آپ کو نوشی کی کامیابی پر مبارک باد قبول ہو۔ نوشی کے والد صاحب نے مبارک باد دیتے ہوئے نوشی کو باہر آنے کے لئے آواز دی۔ چند لمحوں بعد نوشی کمرے سے باہر نکلی تو اس نے اپنے بالوں کے درمیان مانگ نکال رکھی تھی

جی ابو! نوشی نے آتے ہی کہا

بیٹی ساجد میاں کو مبارک باد دو۔ نوشی نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور مبارک باد دی۔ اتنے میں اس کی والدہ نے مٹھائی کا ڈبہ کھول دیا۔ نوشی کے والد صاحب بولے

بیٹا ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ نوشی کی کامیابی پہ تمہارا منہ میٹھا کرائیں۔ لیکن ہم نے باتوں میں تمہیں چائے تک بھی نہ پلائی

کوئی بات نہیں انکل۔ آپ کا خلوص میرے لئے چائے سے کیا کم ہے میں نے کہا۔ تب ہم سب نے مل کر مٹھائی کھائی

مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے رخصتی کی اجازت لی۔ تو نوشی کے والد اور والدہ نے اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا دروازے سے باہر نکل کر میں نے اپنے پیچھے دیکھا تو اچانک میری نظر چھت پر پڑی۔

نوشی ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے الوداع کہہ رہی تھی۔

مجھے نوشی کے والدین سے اس طرح کے پرخلوص سلوک کی ہرگز امید نہ تھی۔ وہ بلاشبہ دونوں عظیم انسان تھے۔ ایسے عظیم انسان جنہیں دولت سے نہیں، اپنی اولاد اور اپنے وطن سے محبت تھی اور پھر وطن سے محبت کیوں نہ ہوتی انہوں نے اس کے لئے اپنے بہن بھائیوں اور والدین کی قربانیاں جو دیں تھیں وہ اس پاک سرزمین کی قدر سے آشنا تھے۔ دوسری محبت انہیں اپنی اولاد سے تھی جسے وہ اپنے وطن و قوم کی آبرو کی خاطر قربان کر دینے کا عزم رکھتے تھے۔ مگر افسوس ان کی اس آرزو کی تکمیل نہ ہو سکی

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے نوشی کے والد صاحب نے اپنے

لاکھوں بہنیں اپنے بھائیوں کو اور کروڑوں بھائی اپنی بہنوں کو ڈھونڈ رہے تھے۔

اسے کاش کہ مجھے خبر ملتی کہ تمہارا بیٹا اپنے ملک و قوم کی ناموس پر قربان ہو گیا ہے۔ تو میں قیامت کے دن فخر سے خدا کو کہتا کہ اے اللہ!

دیکھ میرے بیٹے نے تیرے رسول کی امت کی حفاظت کرتے ہوئے اور تیرے عطا کردہ خطے کی آبرو کی خاطر اپنی جان قربان کی تھی۔ لیکن افسوس کہ خدا کو یہ سب منظور نہ تھا۔ خدا کو معذور کی قربانی منظور نہ تھی۔ خدا کو میری قربانی بھی منظور نہ تھی۔ خدا کو میرے بیٹے کی قربانی منظور نہ تھی اسی لئے تو خدا نے اس کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔

پانچ سال ہوئے اس نے میٹرک کا امتحان دیا تو اپنا نتیجہ سنے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ نوشی کے والد صاحب بغیر رکے بولتے جا رہے تھے۔ میں کتنا خوش نصیب ہوتا اگر میں شہادت حاصل کر لیتا۔ مگر نہیں میرے نصیب میں شہادت نہ تھی۔ میری قربانی اللہ تعالیٰ کو ہرگز قبول نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اب تک زندہ ہوں۔ ورنہ میں نے شہادت حاصل کرنے کی بہت کوشش کی۔ میں نے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے دن سکھوں کے ساتھ مقابلے کئے۔ میرے دو بھائی اور میں کنویں سے گھر پہنچے تو میرے گھر پر سکھوں نے حملہ کر رکھا تھا۔ میرے ماں، باپ کی لاش صحن میں پڑی تھی۔ ایک دو سکھ میری چھوٹی بہن کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ تمہاری بڑی بہن اپنی عزت بچانے کی خاطر قریب کے کنویں میں چھلانگ لگا کر مر گئی ہے۔ تو اس وقت مجھے کتنا سکون نصیب ہوا تھا۔ اب تین سکھ میری چھوٹی بہن کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ہم تینوں بھائیوں نے سکھوں کا مقابلہ کیا اور تینوں کو ختم کر دیا۔ ہم چاروں بہن بھائی پاکستان کی طرف جانے والے ان دیکھے راستے پر چل پڑے راستے میں کئی دفعہ ہم پر سکھوں اور ہندوؤں نے حملہ کیا۔ ہم نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ایسے ہی سکھوں کے ایک حملے میں میرا ایک بھائی شہید ہو گیا ہم تین بھائی بہن رہ گئے راستے میں ایک اور حملہ ہم پر ہوا جس میں میرا دوسرا بھائی بھی شہید ہو گیا اب میں اکیلا لڑ رہا تھا۔ میرے پاس صرف ایک کلہاڑی تھی۔ سکھ چار تھے اور چاروں کے پاس کرپانیں اور خنجر تھے میں کب تک ان کا مقابلہ کرتا میں گر پڑا میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں تھیں میرا خیال تھا کہ ابھی کوئی سکھ خنجر یا کرپان مار کر میرا کام تمام کر دے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا سکھوں نے شاید مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا اور میری بہن کی طرف بھاگے۔ میں نے بے بسی سے چار سکھوں کو اپنی معصوم بہن کی طرف جاتے دیکھا تو اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھا نہ گیا۔ میں نے دوبارہ بے بسی سے ایک نظر اپنی بہن پر ڈالی وہ بھاگی نہیں بس نے بڑے آہستہ انداز میں آگے بڑھ کر میرے چھوٹے بھائی جو شہید ہو چکے تھے۔ کے ہاتھ سے کلہاڑی نکالی میرا خیال تھا کہ وہ سکھوں کا مقابلہ کرے گی۔ مگر میں نے صاف دیکھا کہ اس نے کلہاڑی کے تین چار وار اپنے سر میں کئے اور سکھوں کے قریب پہنچنے سے قبل ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو نوشی کی والدہ کے والد صاحب (نوشی کے نانا) کو اپنے قریب پایا اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے انہوں نے مجھے بتایا کہ میں ان کے راستے میں بے ہوش پڑا ملا تھا انہوں نے مجھے اٹھا لیا اور پاکستان لے آئے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اب ہم پاکستان کے مہاجر کیمپ میں ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اسی کیمپ میں ان کی بیوی (نوشی کی نانی) اور ان کی بیٹی (نوشی کی والدہ) کا بھی پتہ چلا ہے۔ ایک دو دن تک میں ان کو تلاش کروں گا۔ وہاں کسی کو تلاش کرنا اتنا آسان نہ تھا کیونکہ مہاجر کیمپ کی ہر طرف مہاجر پناہ گزینوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ یہ سب لوگ بے یار و مددگار اور بے آسرا تھے۔ انہوں نے بہت کچھ پاکستان کے نام پر لٹا دیا تھا۔ اپنے خاندان کے سب افراد کٹوا دیئے اور اب اس امید پر کہ شاید کوئی ان کے خاندان کا بچا کھچا افراد مل جائے۔ ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔

دوسرے دن نوشی کے نانا کو اس کی بیوی اور بیٹی مل گئی۔ چند دنوں کے بعد انہوں نے ایک جھونپڑی بنائی اور ہم سب وہاں رہنے لگے۔ مجھے انہوں نے اس قدر پیار دیا کہ میں اپنے ماں باپ کے پیار کو فراموش کر بیٹھا۔ میرے دل سے اپنے شہید بہن بھائیوں کا خیال مٹ گیا۔ اب تو صرف ایک ہی خیال تھا کہ کسی طرح سکھوں اور ہندوؤں سے بدلہ لے سکوں۔ ان کے مشورے اور اجازت سے میں نے فوج میں ملازمت کر لی۔ ایک سال بعد میں چھٹی آیا تو انہوں نے اپنی بیٹی سے میری شادی کر دی

میں نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگیں لڑیں لیکن میں شہادت کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔ مجھے خدا نے ایک بیٹا عطا فرمایا تو میں نے اس پر اپنی امیدیں وابستہ کر لیں لیکن وہ بھی چل بسا اس کے غم میں رو رو کر آنکھوں کی بینائی کم کر لی۔ جس کی وجہ سے وقت سے پہلے ریٹائر کر دیا گیا۔ اب تین سال سے پنشن پر گزارا کر رہا ہوں۔

یہاں تک پہنچ کر نوشی کے والد اچانک چونکے اب تک ان کے جھریوں بھرے گال آنسوؤں سے مکمل طور پر بھیگ چکے تھے۔ انہوں نے اپنے گال صاف کرتے ہوئے کہا۔

بیٹا معاف کرنا میں جذبات میں آ کر بہت دور چلا گیا تھا۔ مجھے تم سے ہرگز ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں تھیں لیکن نہ جانے کیوں سینے میں سلگتی ہوئی کبھی نہ مٹنے والی داستان کیوں، اتنا مجبور کرتی ہے کہ جی چاہتا ہے کسی کو یہ داستان سنا کر اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کروں۔ مجھے معاف کر دینا

نوشی کے والد صاحب کی جذبات سے مغلوب داستان نے مجھے بہت متاثر کیا۔ میں نے بہت مشکل سے اپنے آنسو روکے اور ان سے کہا۔

انکل خدا جو کرتا ہے ٹھیک ہی کرتا ہے۔ اس لئے اس سے شکوہ کرنے کی بجائے اس کا شکر اور صبر کرنا چاہیئے۔ تب وہ بولے۔

ہاں بیٹا۔ خدا جو کرتا ہے۔ وہ ٹھیک کرتا ہے۔ اس لئے تو میں صبر کئے بیٹھا ہوں۔

میں نے کن آنکھیوں سے نوشی کی والدہ کی طرف دیکھا وہ بھی دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کر رہی تھی۔ میں نے ان کو بھی حوصلہ دیا اور کہا۔

آنٹی آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کیوں آیا ہوں۔ اس پر وہ دونوں بیک وقت چونکے۔

نوشی کے والد صاحب دوبارہ بولے بیٹا برا مت منانا۔ میں جذبات میں بہہ کر اپنی کہانی لے بیٹھا اور تمہاری طرف خیال تک نہ کیا پھر انہوں نے نوشی کو آواز دی جو ابھی تک کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ بیٹی ذرا ساجد بیٹے کے لئے چائے ہی بناؤ۔

تمہیں انکل مجھے طلب نہیں۔ رہنے دیجئے۔ تب انہوں نے مجھ سے پوچھا ہاں تو کیسے آنا ہوا۔

میں نے کچھ کہے بغیر چارپائی پر پڑا ہوا مٹھائی کا ڈبہ اٹھایا اور نوشی کی والدہ کو دیتے ہوئے کہا۔

میں نوشی کو میٹرک کے امتحان میں اپنی کامیابی کی اطلاع دینے آیا تھا۔ تب دونوں نے مجھے مبارکباد دی۔ میں نے انہیں کہا۔

میری طرف سے بھی آپ کو نوشی کی کامیابی پر مبارکباد قبول ہو۔ نوشی کے والد صاحب ... مبارک۔ کہتے ہوئے نوشی کو باہر آنے کے لئے آواز دی۔ چند لمحوں بعد نوشی دروازے سے باہر نکلی تو اس نے اپنے بالوں کے درمیان مانگ نکالی رکھی تھی۔

جی ابو۔ نوشی نے آتے ہی کہا۔

بیٹی ساجد میاں کو مبارکباد دو۔ نوشی نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور مبارکباد دی۔ اتنے میں اس کی والدہ نے مٹھائی کا ڈبہ کھول دیا نوشی کے والد صاحب بولے۔

بیٹا ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ نوشی کی کامیابی پر تمہارا منہ میٹھا کرائیں۔ لیکن ہم نے باتوں میں تمہیں چائے تک بھی نہ پلائی۔

کوئی بات نہیں انکل۔ آپ کا خلوص میرے لئے چائے سے کیا کم ہے میں نے کہا۔ تب ہم سب نے مل کر مٹھائی کھائی۔

مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے رخصت کی اجازت لی۔ تو نوشی کے والد اور والدہ نے اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا دروازے سے باہر نکل کر میں نے اپنے پیچھے دیکھا تو اچانک میری نظر چھت پر پڑی۔

نوشی ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے الوداع کہہ رہی تھی۔

مجھے نوشی کے والدین سے اس طرح کے پرخلوص سلوک ہرگز امید نہ تھی۔ وہ بلاشبہ دونوں عظیم انسان تھے۔ ایسے عظیم انسان جنہیں دولت سے نہیں اپنی اولاد اور اپنے وطن سے محبت تھی اور پھر وطن سے محبت کیوں نہ ہوتی انہوں نے اس کے لئے اپنے بہن بھائیوں اور والدین کی قربانیاں جو دی تھیں وہ اس پاک سرزمین کی قدر سے آشنا تھے۔ دوسری محبت انہیں اپنی اولاد سے تھی جسے وہ اپنے وطن و قوم کی آبرو کی خاطر قربان کر دینے کا عزم رکھتے تھے۔ مگر افسوس ان کی اس آرزو کی تکمیل نہ ہو سکی

اچانک میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔ مجھے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے نوشی کے والد صاحب نے اپنے

۱۸۷ پر

داستان مجھے سنا کر اصغر کی ذمہ داری کا بوجھ میرے کاندھوں پہ ڈال دیا ہے ۔ مجھے ایسے لگا جیسے اب اس سرزمین اور وطن کی حفاظت کا ذمہ میرے اور میرے جیسے نوجوان پر ہے اور ہمیں ہی اپنے ان بوڑھوں کی آرزوں کی تکمیل کرنی ہے جنہوں نے ہماری خاطر اپنا تن من قربان کیا تھا ۔ مجھے ایسے لگا جیسے یہ ایک نوشی کے والد کی خواہش نہیں بلکہ ہر اس باپ کی خواہش ہے جو اپنے وطن کا محب اور وفادار ہے ۔ میں نے ایک فیصلہ کر لیا کہ میں اپنے بڑے بوڑھوں کی اس آرزو کو ہر صورت پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا ۔ اور پاک فوج میں شامل ہو کر اپنے ملک وملت کی حفاظت کرتے ہوئے شہادت حاصل کروں گا ۔ مجھے اس طرح احساس ہو رہا تھا کہ جو باتیں نوشی کے والد اصغر کو بتا نہ سکے وہ انہوں نے مجھے بتا کر یہ فرض پورا کر دیا ہے اور یہ ذمہ داری مجھ پر ڈال دی ہے ۔ میں نے سوچ لیا کہ میں اپنے والد صاحب اور والدہ سے مشورہ کر کے پاک فوج میں شامل ہو جاؤں گا لیکن سب کچھ انسان کی سوچ کے مطابق کب ہوتا ہے انسان ہمیشہ سے ہی مجبور و بے بس رہا ہے ۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتا ہے وہ نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ وہ ہر معاملہ میں خود مختار نہیں ہے ۔ اس کے راستے میں لاکھوں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں ۔ جنہیں وہ پہلے مجبوری اور بعد میں قسمت قرار دے کر خاموش ہو جاتا ہے ۔

قسمت بھی انسان کے ساتھ بہت سے کھیل کھیلتی ہے ۔ میرے ساتھ بھی قسمت نے یا مجبوری نے ایسا کھیل کھیلا کہ میں نوشی کے والد صاحب کی عظیم خواہش کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا ۔ ہوا یوں کہ ۔

ایک روز میں اپنے کسی دوست سے ملنے اس کے گھر گیا ہوا تھا ۔ وہاں سے جب واپس گھر آیا تو گھر میں ماموں اعجاز کو دیکھ کر بہت حیران ہوا کیونکہ میرے یہ بس ایک ہی ماموں ہیں اور عرصہ دراز سے کویت میں رہتے ہیں ۔ وہاں وہ کسی اچھی پوسٹ پہ ملازم ہیں ۔ انہوں نے جب آنا ہوتا وہ پہلے اطلاع دیتے کہ میں کب اور کونسی تاریخ کو پاکستان آ رہا ہوں ۔ اب ان کی اچانک آمد میرے لئے حیرانگی کا قدرتی امر تھا ۔ کیونکہ ایک تو انہوں نے اپنے آنے کی کوئی اطلاع تک نہ دی تھی اور دوسرا یہ کہ ابھی تقریباً چھ ماہ پہلے ہی وہ پاکستان میں تین ماہ کا عرصہ گزار کر گئے تھے ۔

میں نے ماموں کو اسلام کیا اور پوچھا ۔ ماموں جان خیریت تو ہے کہ آپ بغیر اطلاع دیئے اتنی جلدی پاکستان آ گئے ۔

بیٹے سب خیریت ہے ۔ مگر کوئی بات نہیں میں تو بس تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں ۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی ۔

میں نے ان کی بات کو مذاق سمجھ کر سنی ان سنی کر دیا ۔ لیکن جب امی جان سے ان کی یوں اچانک آمد کے بارے میں پوچھا تو صورت حال کا ہر باب میرے سامنے روشن ہو گیا ۔

امی نے بتایا کہ بیٹا تمہارے ماموں تمہیں اپنے ساتھ کویت لے جانے کے لئے آئے ہیں کیونکہ تمہارا رزلٹ آؤٹ ہوتے ہی میں نے انہیں خط لکھ دیا تھا کہ ساجد پاس ہو گیا ہے ۔ انہوں نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ جونہی ساجد الف اے کر لے گا میں اسے اپنے ساتھ کویت لے جاؤں گا ۔ میں نے خط لکھا تو اتفاق سے وہاں پر ان دنوں ایک پوسٹ بھی مل گئی ۔ یہ پوسٹ ان کی اپنی کمپنی میں ہے اور تنخواہ بھی بہت بتاتے ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ میں ساجد کی ملازمت کا سب بندوبست کر آیا ہوں ۔ اور ساتھ ساجد کا ویزا بھی لے آیا ہوں ۔ جلد ہی ہم دونوں ماما بھانجا کویت روانہ ہو جائیں گے ۔ میری آنکھوں کے سامنے جیسے اندھیرا چھانے لگا ۔ مجھے ایسا لگا جیسے ماموں عزرائیل بن کر آئے ہیں اور مجھے اس دنیا سے ہی لے جانے والے ہیں ۔ میں نے امی کی بات کاٹ کر کہا ۔

لیکن امی جان میں تو مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں ۔ میری تعلیم کا کیا بنے گا ۔ میں تو کم از کم بی اے ۔۔۔۔

بیٹے تمہارے ماموں کا کہنا ہے کہ تعلیم اسی لئے حاصل کرنی ہے کہ اچھی سی نوکری مل سکے سو وہ نوکری کا انتظام کر آئے ہیں ۔ تو پھر مزید دو سال تعلیم پہ ضائع کرنے سے کیا فائدہ ۔ امی میری بات کاٹ کر بولتی جا رہی تھیں ۔ امی کی یہ باتیں مجھے زہر لگ رہی تھیں ۔ میں ان کی زبان سے کچھ بھی اور نہیں سننا چاہتا تھا لیکن وہ بولتی جا رہی تھیں ۔

بیٹے ان کا کہنا ہے کہ اپنے ملک میں تعلیم حاصل کر لینے کے بعد بہتر ملازمت ملنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ۔ ابھی

ی بہتر ملازمت کا حصول نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بھی ہے
پھر اگر کوئی ملازمت مل بھی جائے تو تنخواہ اتنی قلیل ہوتی ہے
انسان نہ صرف اپنے خاندان کا خرچ ایک بوجھ بن جاتا ہے
ہوتا ہے ہر حال میں اپنے بیوی بچوں کی کفالت کرنی ہوتی
ہے۔ اس لیے وہ رشوت لینی شروع کر دیتا ہے۔ کیونکہ نہ ایسی
ہوتی ہے پیا جائے جبکہ اس کا کہنا ہے کہ وہاں کویت میں تمہاری
تنخواہ ۔۔۔۔ ۹ ہزار روپے پاکستانی فی ماہ ہوگی۔ بیٹے کتنا خیال
میں ہی وہ تمہارا۔ بس سمجھے تو وہ اپنے بچوں سے بھی زیادہ
ر ہے سمجھتے ہیں۔ امی کی باتیں ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں۔
چونکہ وہ ماموں کی تعریفیں کرتیں مجھے ان کی باتیں حد سے زیادہ
ناگوار گزر رہی تھیں لیکن ان سے کسی قسم کی بحث بے کار تھی
ہوتی۔ وہ تو بس ہر صورت میں اپنی بات منوانے کی عادی
تھیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کیوں نہ امی سے بحث کرنے کی
بجائے ابو سے بات کی جائے۔ کہ وہ مجھے ماموں اعجاز کے ساتھ
نہ جانے دیں

میں امی کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور انتظار
کرنے لگا کہ جونہی ابا جان دفتر سے آئیں تو ان سے علیحدگی میں ملنے
کا موقع دیکھ کر بات کر سکوں۔

تقریباً چار بجے کے بعد ابو گھر آئے۔ میں اپنے کمرے سے ابو کی
آواز سن کر باہر نکلا۔ میری نظر امی جان پہ پڑی وہ باورچی خانے میں
بیٹھی رات کا کھانا تیار کر رہی تھیں اور پاس ہی ماموں بیٹھے نہ جانے
آہستہ آہستہ کیا باتیں کر رہے تھے میں چپکے سے ابا جان کے
کمرے میں چلا گیا۔ وہ صوفے پر دراز صبح کے اخبار کو الٹ پلٹ
رہے تھے۔ مجھے اپنے کمرے میں دیکھ کر چونکے۔ اور بولے۔

کیا بات ہے ساجد بیٹے یوں چوروں کی طرح کیوں داخل ہوئے ہو
میں ان کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا اور آہستہ لہجے میں یوں بولا۔

ابو ماموں اعجاز آئے ہوئے ہیں
ہاں بیٹے ان سے میں مل کر آ رہا ہوں۔
ابو پتہ ہے وہ بغیر اطلاع دیئے اتنی جلدی کیوں واپس
آ گئے ہیں؟

نہیں بیٹے میں نے ان سے بغیر اطلاع آنے کی وجہ ابھی نہیں
پوچھی کیونکہ میں دفتر سے تھکا ہوا آیا ہوں۔ صرف دعا سلام کی ہے
اور اپنے کمرے میں آ گیا ہوں۔ ویسے بھی اس وقت وہ دونوں
بہن بھائی (امی اور ماموں) نا جانے باورچی خانے میں بیٹھے
بیٹھے کیا باتیں کر رہے تھے میں نے ان کی باتوں میں دخل دینا
مناسب خیال نہیں کیا۔ شام کو کھانے پر اکٹھے باتیں ہوں گی
تو تمہیں بھی پتہ چل جائے گا۔

ابو مجھے پتہ ہے کہ وہ بغیر اطلاع کیوں آئے ہیں اس لئے میں
آپ کے پاس آیا ہوں۔ تاکہ آپ سے اس بات پہ کہہ سکوں مجھے
امید ہے کہ آپ میری بات ضرور مانیں گے۔

اگر ماموں کے ساتھ کوئی بات کرنے کا ارادہ ہے تو پھر میں تمہاری
کوئی بھی بات ماننے سے رہا۔ ابا جان ہنستے ہوئے بولے۔

نہیں ابو ایسی بات نہیں
تو پھر اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ بتاؤ۔

ابو امی جان نے مجھے بتایا ہے کہ ماموں اعجاز مجھے اپنے ساتھ
کویت لے جانے کے لئے آئے ہیں اور میرے ویزے کا بھی
بندوبست کر آئے ہیں

اچھا تو تمہارا ارادہ ان کے ساتھ جانے کا ہوگا تبھی تو
میرے پاس آئے ہو کہ کہیں میں انکار نہ کر دوں تو بیٹے تم
خوشی سے جا سکتے ہو بھلا مجھے کیا پڑی ہے کہ انکار کر دوں ابا جان
خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولے۔

نہیں ابو میں اس لئے آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ ان
کے سامنے انکار کر دیں

ابا جان نے پہلی دفعہ نظریں اخبار سے ہٹا کر میری طرف
دیکھا اور بولے کیوں کیا وجہ ہے؟ اس سے قبل انہوں نے
میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ وہ پہلے ہی میرے چہرے کے
تاثرات سے میرے دل کی بات جان لیتے کہ میں کیا کہنا چاہتا ہوں
ابا جان کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ پایا تو میں نے دھیمے لہجے
میں کہنا شروع کیا۔

ابو میں ماموں کے ساتھ کویت ہرگز نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ
میں چاہتا ہوں کہ کم از کم بی اے کرنے کے بعد کسی کام کے
متعلق سوچوں اور پھر اپنے وطن میں ہی کوئی ملازمت مل جائے
تو بہتر ہے۔ غیر ممالک میں جا کر کام کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے
ملک میں ہی محنت کریں تاکہ ہمارا وطن بھی ترقی کرے۔

ابا جان میری باتیں سن کر ہنس پڑے اور نظریں دوبارہ
اخبار پر مرکوز کر کے بولے۔ بیٹے تمہارے اس جذبے سے

دلی مسرت حاصل ہوئی ہے بلاشبہ اس وقت ہمارے ملک کی یہ ایک اہم ضرورت ہے کہ پاکستان کے باشندے دوسرے ممالک میں جا کر کام کرنے کی بجائے پاکستان کی ترقی و خوشحالی کی خاطر پاکستان میں ہی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں۔ میں نے ابو کو اپنی طرف مائل دیکھا اپنی باتوں میں اور زیادہ اثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور پھر ابو یہ سب باتیں ایک طرف میں آپ کی اور امی جان کی جدائی ہرگز برداشت نہیں کرسکوں گا۔ لیکن ابو کو نا جانے کیا سوجھی کہ وہ میری باتوں سے متاثر ہوئے بغیر ایک دفعہ پھر ہنسے اور بولے ۔

بیٹے میرا تو خیال ہے کہ اب مزید تعلیم کا خیال چھوڑو ۔ اور ماموں جان کے ساتھ کویت چلے جاؤ۔ کیونکہ یقیناً وہ تمہارے لئے وہاں کسی اچھی پوسٹ کا انتخاب کرنے کے بعد ہی تمہیں لینے کے لئے آئے ہیں۔ چنانچہ موقع اچھا ہے۔ خدا نے اچھا موقع دیا ہو تو اسے کھونا نہیں چاہیئے پتہ نہیں پھر کبھی ایسا موقع اچھا ملے یا نہیں۔ اور پھر دو سال پڑھنے کے بعد بھی تمہیں کوئی کام تو کرنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ تم ابھی ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ وہ تمہارے ماموں ہیں کوئی غیر تو نہیں۔ کہ تم اس قدر گھبرا رہے ہو وہ تو تمہیں بہت عزیز رکھتے ہیں۔ وہ ہر طرح سے تمہارا خیال رکھیں گے۔ وہاں وہ تمہیں اجنبیت کا احساس بھی نہیں ہونے دیں گے۔ اس کے علاوہ تمہاری ہر طرح سے وہاں مدد کریں گے بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہارے مستقبل کو سنوارنے میں اپنی پوری کوشش کریں گے۔ اور پھر تمہارے ماموں جان کی یہ قدیم خواہش بھی ہے کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ کویت لے جائیں انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار مجھ سے کئی مرتبہ کیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جونہی مجھے کویت میں کوئی اچھی سی پوسٹ ملی تو میں ساجد کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔

مجھے اباجان کی لمبی چوڑی وضاحت سن کر مایوسی ہوئی میرا خیال تھا کہ وہ میری باتوں کی تائید کریں گے اور میں ان سے اس بات کی اجازت لوں گا کہ میں فوج میں کسی عہدے پر فائز ہونے کی کوشش کروں۔ لیکن یہاں صورت حال اس کے برعکس ہو چکی تھی۔ اباجان نے میری بات ماننے کی بجائے اتنی لمبی تقریر سنا دی تھی۔ جس کا مطلب مجھے ماموں کے ساتھ کویت بھیج دینے کے ارادے کے سوا کچھ نہ تھا۔

بلاشبہ ابو کی یہ سب باتیں درست تھیں اور ماموں ابا حقیقتاً میرے بہت خیرخواہ تھے اور وہ اپنی یہ ان خواہش کو پورا کرنے کے لئے۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آئے تھے لیکن میرے خیال میں اباجان کے دماغ پر دولت کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ تبھی تو وہ مجھے کویت چلے جانے کا درس دیتے رہے تھے جو مجھے ہرگز قبول نہ تھا۔

میں نے رونا شروع کر دیا اور ساتھ اباجان کو ماموں کے سامنے انکار کر دینے کے لئے بھی قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا میں نے روتے روتے کہنا شروع کیا۔

ابو اگر آپ میری مزید تعلیم پر بیسے خرچ نہیں کر سکتے اور اب آپ میرے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہی چاہتے ہیں کہ میں اب اپنا خود کما کر کھاؤں تو میں آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔ لیکن خدارا اتنا تو خیال رکھیئے کہ میں آپ کی، امی کی اور شازیہ (میری چھوٹی بہن) کی جدائی کیسے برداشت کرسکوں گا۔

ماموں لاکھ مجھے عزیز رکھتے ہوں لیکن جو محبت آپ کو مجھ سے ہے وہ انہیں نہیں ہوسکتی جو پیار مجھے آپ سے ملتا ہے وہ کہیں اور سے نہیں مل سکتا اس لئے میں ہرگز آپ سے بچھڑنے پر تیار نہیں ہوں۔ اگر آپ ضرور مجھ سے کام ہی کروانا چاہتے ہیں تو مجھے اپنے ملک بلکہ اپنے شہر میں ہی کہیں کام پر لگوا دیجئے۔ تاکہ میں ہر شام گھر آسکوں اور آپ لوگوں کے چہرے دیکھ سکوں۔ خدارا مجھے اپنے سے دور نہ بھیجئے میں یہ تمام باتیں ہچکیوں کے درمیان ایک ہی سانس میں کہہ دیں۔ میری آواز جذبات میں ڈوبی ہوئی تھی

میرے ان جذبات کا اباجان پر فوری اثر ہوا۔ اور انہوں نے فوری ہار مان لی۔ اور بولے۔

بیٹا تم تو خواہ مخواہ رونے لگ گئے بھلا میں تجھے خود سے کیسے جدا کر سکتا ہوں میں تو ویسے تم سے ہنس رہا تھا۔ دراصل میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کس حد تک سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گئے ہو۔ لیکن تم تو فوراً جذبات میں آگئے۔ میں تو تجھے اپنے سے جدا کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ میں تم سے کس قدر محبت رکھتا ہوں۔

ابا جان کی محبت کا مجھے پورا یقین تھا وہ واقعی مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اس کی وجہ شاید ان کا اکلوتا بیٹا تھا مجھ سے چھوٹا میرا ایک بھائی تھا۔ وہ بچپن ہی میں وفات پا گیا۔ اس سے ایک چھوٹی بہن تھی وہ بھی وفات پا گئی تھی۔ اب صرف میری ایک بہن تھی جس کا نام ستارہ تھا۔ ستارہ ہم دونوں سے چھوٹی تھی۔ ہم صرف دو بہن بھائی بچے تھے اور ہم دونوں سے بہت شفقت سے پیش آتے لیکن میرے ساتھ خاص طور پر کدورت سے پیش آتے لیکن میرے ساتھ بالخصوص طور پہ محبت سے پیش آتے تھے۔ لہٰذا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کہ وہ میری بات نہ مانیں۔ ابا جان کے کمرے سے میں خاصا مطمئن ہو کر نکلا

شام کے کھانے کے بعد ماموں نے بات شروع کر دی بولے۔ بھائی جان (میرے ابو) آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ میں بغیر اطلاع دیئے اتنی جلدی واپس آ گیا ہوں۔ میں کل ہی پاکستان پہنچا تھا۔ رات ادھر لاہور گھر میں گزاری اور صبح ادھر آپ کے ہاں آ گیا

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے آپ سے پہلے بھی اس بات کا اظہار کیا تھا کہ جونہی مجھے کوئی اچھی اور معیاری ملازمت مل گئی تو میں ساجد کو اپنے ہمراہ کویت لے جاؤں گا۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے مجھے وہاں اپنی کمپنی میں ہی ایسی پوسٹ مل گئی ہے جو ساجد کے لئے ہر لحاظ سے بہتر اور موزوں ہے۔ اور پھر تنخواہ بھی ۹۰۰۰ ہزار روپے پاکستانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بلا اطلاع اس قدر جلد آ گیا۔ میں ساجد کے لئے ویزا بھی لے آیا ہوں جو مجھے کمپنی کی طرف سے ملا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اب میں ساجد کو ساتھ لے کر جلد روانہ ہو جاؤں۔ ویسے بھی صرف ایک ماہ کی رخصت پر آیا ہوں۔ میں جلد ہی جہاز میں دو سیٹیں بک کرانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو میرے اس فعل سے دلی خوشی ہوئی ہوگی اور ساجد کو میرے ساتھ کو میرے ساتھ بھیجنے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ماموں (اعجاز) نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ امی جان ماموں کی گفتگو کے دوران بار بار تائید کی صورت میں گردن ہلا رہی تھیں۔

بھئی جہاں تک میرے اعتراض کی بات ہے تو عرض یہ ہے کہ میں کیا کہہ سکتا ہوں لیکن میرے خیال میں بہتر یہ ضروری ہے کہ اس سلسلے میں ساجد سے پوچھ لیا جائے کہ وہ آپ کے ساتھ جانے پر رضامند ہے یا نہیں۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اولاد کی مرضی پر والدین اپنے فیصلے ٹھونسیں میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ کام وہی اچھا ہوتا ہے جس کے لئے والدین اور اولاد دونوں کی رضامندی ہو۔ اگر ساجد بخوشی آپ کے ساتھ کویت جانا چاہے۔ تو میرا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ابا جان نے ماموں کی بات ختم ہونے پر جواب دیا

جونہی ابا جان خاموش ہوئے سب نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنا شروع کر دیا مجھے ابا جان سے اس بات کی امید نہ تھی کہ وہ اس خوبصورتی کے ساتھ اس معاملے سے نکل جائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ وہ خود ہی ماموں کے سامنے انکار کر دیں گے لیکن انہوں نے بہت عمدگی سے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں خود ہی انکار کر دوں۔ تب مجھے مجبوراً بولنا پڑا۔ میں نے بڑی آہستگی سے کہنا شروع کیا۔

ماموں جان! پہلی بات تو یہ ہے کہ میرا ارادہ ابھی مزید تعلیم حاصل کرنے کا ہے اور اگر ایسا نہ ہو سکا۔ تو پھر میں کوشش کروں گا کہ مجھے اپنے وطن میں ہی کوئی چھوٹی موٹی ملازمت مل جائے۔ تو بہتر ہے کیونکہ میں غیر ممالک میں جا کر کام کرنے کی بجائے اپنے وطن میں کام کرنے کو پسند کرتا ہوں کہ پاکستان کو اس وقت محنت اور محنت کشوں کی ضرورت ہے۔

یہ تمہاری غلط فہمی ہے ساجد! ماموں میری بات ختم ہوتے ہی بول پڑے۔ تم چاہے کتنی ہی تعلیم کیوں نہ حاصل کر لو۔ تم اپنے ملک میں کوئی بہتر تنخواہ والی ملازمت نہیں پا سکتے کیونکہ پاکستان میں نہ تو تعلیم کی قدر ہے اور نہ فن کی یہاں تو صرف قدر ہے تو وہ دولت کی اور وہ یہاں کوئی حاصل نہیں کر سکتا۔ جبکہ بیرون ممالک میں تعلیم اور فن کی بہت قدر ہے۔ وہاں ہر کام کا پورا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ ماموں نے وضاحت کی۔

لیکن ماموں جان اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تمام لوگ دوسرے ملکوں میں جا کر دولت اکٹھی کرنی شروع کر دیں اور پھر اپنی آنکھوں پر دولت کی پٹی باندھ کر اپنے پاک وطن

کی خدمت کے جذبے کو فراموش کر دیں اور اس کی عزت کا مذاق اڑانے لگیں۔ یہ تو ہم لوگوں کا فرض ہے کہ ہم اپنے ملک کو اس قابل بنائیں کہ یہاں کے لوگ نہ صرف دولت کے حصول کی خاطر دوسرے ملک میں جائیں بلکہ وہ اپنے ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے محنت اور مشقت کریں۔ اس طرح ہمارے ملک کی معیشت مضبوط ہو گی۔ تو یقیناً لوگوں کو دگنا معاوضہ دیا جائے گا۔ لہذا ضروری ہے کہ انسان اپنے ملک میں اپنی تعلیم اور فن کی قدر کا متوقع صرف اسی صورت میں ہو کہ وہ خود ایک سچا اور پرخلوص محب وطن ہو۔ اس کے اندر اپنے وطن کی خدمت کرنے کا جذبہ ہو اور وہ نیک نیتی اور دیانتداری کے ساتھ اپنے فرض کو ادا کرے۔ تو یقیناً ہمارے ملک میں بھی فن و تعلیم کی بے حد قدر ہو سکتی ہے۔ جس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ ہم اپنی آنکھوں پر بندھی ہوئی دولت و ہوس کی پٹی کھول دیں۔

ابا جان میری باتوں کو بہت غور اور حیرت کے ساتھ سن رہے تھے جبکہ امی جان کا چہرہ اس دوران غصے سے لال ہو گیا تھا آخر وہ بول پڑیں۔

بہت جذبہ ہے تمہارے اندر اپنے ملک کا جو اسقدر بکے جا رہا ہے۔ بھلا وہ (ماموں) بھی تو تمہارے بھلے کو ہی کہہ رہے ہیں۔ تب ماموں نے امی کو خاموش رہنے کو کہا اور دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے۔

بیٹے وطن کا جذبہ انسان کو بھوک کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ تم خواہ مخواہ جذبات میں جا رہے ہو۔ اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے روپیہ پیسہ ایک اہم بلکہ بہت ہی اہم ضرورت ہے۔ دولت کے بغیر زندگی بے معنی سی ہے۔ ماموں کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے کہ مجھے ایک خیال سوجھا۔ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ماموں جان مجھے آپ کی کسی بات سے اختلاف نہیں بے شک آپ کی بات درست ہے۔ لیکن یہ بھی تو سوچئے کہ بھلا میں اپنی امی ابو اور شازیہ (میری چھوٹی بہن) سے کس طرح جدا ہو سکتا ہوں۔ اور پھر امی جان کسی صورت میری جدائی برداشت نہ کر سکیں گی کیونکہ وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی ہیں۔ اور پھر میں بھی امی جان سے دور نہیں ہونا چاہتا۔ اس لئے میرا ارادہ آپ کے ساتھ جانے کا نہیں ہے۔ میں نے امی کی محبت کا حوالہ اس لئے دیا تھا کہ شاید وہ میری طرف داری کریں گی۔ لیکن وہ تو جیسے میرے ماموں کے ساتھ جانے پر ہی تلی ہوئی تھیں میری بات ختم ہوتے ہی ایک دفعہ چیخ اٹھیں۔

لاحول ولا قوۃ توبہ اتنی بدتمیز اولاد کہ بڑوں کا ذرا ادب نہیں رہا۔

موبا یا ایسے جواب دے رہا ہے جیسے کوئی غیر ہے بدتمیز ذرا شرم کرو اور اپنے گریبان میں جھانک کہ انہوں (ماموں) نے تمہاری بھلائی کی خاطر اتنا کچھ کیا ہے اور تو ہے کہ ......

بیگم ساجد جو کہتا ہے ٹھیک کہتا ہے۔ ابا جان امی کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔

اگر ساجد رضامند نہیں ہے تو ہم کسی طور اسے مجبور نہیں کر سکتے۔ اور اعجاز ماموں سے مخاطب ہوتے ہوئے ابو نے کہا۔

تم نے غلطی کی ہے کہ بغیر اطلاع دیئے ویزا لے آئے۔ تمہیں پہلے ہم سب کی رائے سے آگاہ ہونے کے بعد ویزا لانا چاہیئے تھا۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ویزے پر اپنے بیٹے حامد کو لے جاؤ اور اگر ایسا نہ کرنا چاہو تو بہتر ہے کہ ویزا کسی غریب آدمی کے ہاں فروخت کر دو۔ وہ تمام عمر تمہیں دعائیں دے گا۔

امی ماموں کے جواب دینے سے قبل ہی بول پڑیں۔ میں تو کہتی ہوں۔ تمہاری اپنی نیت ہی خراب ہے۔ میں سب جانتی ہوں تم نے اسے پورا آدھا گھنٹہ اپنے کمرے میں بٹھائے رکھا ہے اور اسے سکھاتے رہے ہو کہ انکار ہی کرے۔

اب وہ موبا تمہاری بات مان کر انکار نہ کرے گا تو اور کیا کرے گا۔

ایک طرف بھائی جان (ماموں) ہیں کہ انہوں نے اس کے لئے اتنے روپے خرچ کئے اور تمہارے بیٹے کے لئے ویزا لائے اور اب یہ صاحب انہیں مشورہ دے رہے ہیں کہ ویزا فروخت کر دو۔ بھلا انہوں نے کون برا کیا جو تمہارے بیٹے کی خاطر فوراً یہاں دوڑے آئے آخر انہوں نے

جواب حصہ نمبر ۳

ایریل ۱۹۸۱ء

ہمارے بھلے کو سوچا وہ تمہارے دشمن تو تھوڑے ہی ہیں۔ مجھے تو امید تھی کہ تم نے ساجد کو بھائی جان کے ساتھ روانہ کر دیا ہے لیکن تم نے تو دن کبھی ان کا پاس نہیں کیا۔ تب اچانک وہ میری طرف متوجہ ہوئیں اور بولیں۔

"ہوا را امی کی مشہور کالی کہتا ہے۔ ابھی مزید پڑھوانا ہے مزید پڑھ کر ہی ڈاکٹر بن جانا"

انہوں نے میرے لئے اس قدر کوشش کی اور اپنی رقم برباد کی اور تو لئے کہ انہیں آنکھیں دکھا رہا ہے۔

امی ناجانے کیا کچھ کہتی رہیں۔ میں اٹھا اور اپنے کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے یقین تھا کہ اباجان کا فیصلہ اٹل ہے چنانچہ گہری نیند سو گیا لیکن صبح اٹھا تو حالات بدل چکے تھے مجھے ایسے لگا جیسے اباجان کل مجھے کوبت سمجھے پر تل گئے ہوں یا پھر قسمت میں ہی میرا کوبت جانا لکھا ہے۔ صبح اباجان نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں مجھ سے کہا بیٹا تمہاری امی کی ضد پر مجھے اپنا فیصلہ بدلنا پڑا ہے وہ تمام رات روتی رہی ہے اور یہی کہتی رہی ہے کہ تم میرے بھائی کے دشمن ہو جو اس کی اس قدر بے عزتی کی ہے اور پھر بیٹے ذرا سوچو کہ تمہارے ماموں نے دل کو ہمارے اس رویے سے کس قدر دکھ ہوا ہوگا کسی کا دل مت توڑنا چاہیئے وہ ہمارے پاس ایک امید لے کر آئے ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ تم وہاں جانا نہیں چاہتے لیکن مجھے امید ہے کہ تم میری عزت کو محفوظ رکھو۔ کیونکہ میں نے تمہارے ماموں اور امی سے تمہیں کویت بھیجنے کا وعدہ کیا ہے۔ تم اسے میرا فیصلہ سمجھو یا میری خواہش۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہیں کرو گے۔ یہ کہتے ہوئے ابو نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

میں نے ٹوٹے دل سے ان کی خواہش کو پورا کرنے کا وعدہ کیا۔ آہ وہ اپنی اس خواہش کے لئے کس قدر مجبور تھے وہی مجبوری جسے ہم قسمت کا نام دیتے ہیں۔ اس روز ماموں خوشی سے یہ کہہ کر چلے گئے کہ میں جلد ہی سیٹیں بک کرا کر آپ کو اطلاع دوں گا۔ ابھی ایک ماہ گزرنے میں پانچ دن باقی تھے کہ ماموں نے آکر اطلاع دی کہ سیٹیں بک ہو گئی ہیں۔ پرسوں روانگی ہے تیاری مکمل کر لیں۔

دوسرے دن میں روشی کے گھر چلا گیا وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اس کی والدہ اور والد صاحب بھی بہت خوش ہوئے۔

میں نے ان کو اپنے گھر میں ہونے والی تمام باتیں بتائیں اور یہ بھی بتایا کہ میں مجبوری کی خاطر ہی کل کویت روانہ ہو رہا ہوں۔

انہوں نے میری خوب حوصلہ افزائی کی اور مبارکباد دی کہ روانہ ہونے لگا تو روشی دروازے تک میرے ساتھ آئی میں نے اسے دوسرے دن بھی پارک میں آنے کے لئے کہا اور واپس آ گیا۔ دوسرے دن ہماری روانگی کا وقت رات ۹ بجے کا تھا۔ مجھے امی ابو کے ہمراہ لاہور ماموں کے گھر ۵ بجے پہنچنا تھا اس لئے صبح سے تقریباً بارہ ایک بجے تک کا وقت میرے لئے فارغ تھا۔ میں ٹولی پارک پہنچا۔ روشی پہلے سے وہاں موجود تھی۔

ہم نے اس دن بہت زیادہ پیار و محبت کی باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو کبھی نہ بھولنے اور ہمیشہ ساتھ نبھانے کے عہد و پیمان کئے۔ جی بھر کر ایک دوسرے کو دیکھا لیکن پھر بھی ایک دوسرے سے بچھڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ روشی بار بار کہتی۔

ساجد کویت جا کر مجھے بھول تو نہ جاؤ گے۔ میں نے اس کا کھلتے ہوئے کنول کے پھول جیسے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر اسے مطمئن کیا کہ میں کبھی بھی تمہیں نہیں بھلا سکوں گا۔

میری نظر گھڑی پر پڑی ساڑھے گیارہ کا عمل تھا وقت اس دن کتنی تیز رفتاری سے گزر رہا تھا میں نے بے چین دل سے روشی سے رخصتی کی اجازت طلب کی تو اس کا کنول کے پھول جیسا چہرہ ایک دم مرجھا سا گیا۔ اس کی سمندر جیسی گہری آنکھوں میں اداس اداس سے آنسو تیرنے لگے۔ اس کی بے چینی سے پھڑ پھڑاتی ہوئی پلکوں نے غمگین آنکھوں میں سے بہنے والے اداس بھرے آنسوؤں کو روکنا چاہا۔ لیکن ناکام رہیں اور روشی کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے گالوں پر رینگنے لگے سیاہ گھٹا جیسی لمبی زلفیں آج کس قدر خاموش تھیں ایک لمحے کے لئے میرے سامنے ہر طرف تاریکی چھانے لگی۔ اس دن پارک۔

جواب عرض، جون

اپریل ۸۳ء

بالکل سونا سونا سا لگ رہا تھا اور وہ درخت جو ہمارے پیار کا خاموش گواہ تھا وہ بھی اس دن کس قدر اداس ہو گیا تھا۔ جیسے وہ اپنی زبان حال سے کہہ رہا ہو کہ میں بھی تمہاری یہ جدائی برداشت نہ کر سکوں گا۔ اس کا پتا پتا سر جھکائے ہوئے تھا

آخر شکستہ دل سے میں نے نوشی کو الوداع کہا تو اس کے گالوں پر رینگتے ہوئے آنسو اس کی بکھری ہوئی خاموش زلفوں پر بکھر گئے

میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ میں نے شدتِ جذبات سے مغلوب آواز میں کہا نوشی ایسے نہیں مجھے ایک دفعہ خوب مسکرا کر دکھا دو! دیکھو مجھے ان آنسوؤں سے نہیں بلکہ اپنی دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ رخصت کرو۔ تاکہ میں تمہاری اس شگفتہ مسکراہٹ کے کنول کو اپنے دل میں سمو کر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر سکوں۔

تب نوشی مسکرا دی اور سونے سونے پارک میں جیسے پھر بہار آ گئی۔ کلیاں کھل اٹھیں اور اس درخت کے پتوں نے خوشی سے جھومنا شروع کر دیا میں نے نوشی کی اس مسکراہٹ کو اپنے دل کی گہرائیوں میں جذب کر لیا۔ کیونکہ نوشی کی مسکراہٹ ہی میرے لئے اداس لمحوں کو ایک نئی زندگی بخشنے کے لئے کافی تھی۔

شام نو بج کر پندرہ منٹ پر میں اور ماموں اعجاز طیارے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ چند لمحوں کے بعد طیارے نے میرے پاک وطن کی سرزمین پر رینگنا شروع کر دیا۔ اور پھر جلد ہی طیارہ میرے عظیم وطن کی حسین فضاؤں میں تیرنے لگا نیچے اس پیارے وطن کے مکینوں کے مکان اس کے نشیب و فراز اور لہراتی ہوئی فصلیں اور حسین سبزہ زار اس کے قدرتی حسن کو اور زیادہ نکھار رہے تھے اوپر سے ہمارا خوبصورت اور پیارا وطن ایک پرستان معلوم ہو رہا تھا۔ جسے ہم دولت کے حصول کے لئے چھوڑ کر جا رہے تھے۔

طیارہ اب تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا اور میری محبت نوشی اور اس کا گھر مجھ سے اسی تیزی کے ساتھ دور ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن نوشی کی دلفریب مسکراہٹ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

اپریل ۸۳ء

کویت پہنچنے کے تین چار روز بعد میں نے نوشی کے نام ایک خط لکھا۔

جان سے عزیز نوشی۔

سدا خوش رہو۔

تمہیں یقیناً خوشی ہوگی کہ میں بفضلِ خدا بخیریت کویت پہنچ گیا ہوں۔ تمہاری آخری الوداعی مسکراہٹ اب بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں محفوظ ہے میری دعا ہے کہ تم سدا اسی طرح مسکراتی رہو۔

میں تمہیں کبھی بھی نہ بھلا سکوں گا۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی میرے ساتھ کئے ہوئے وعدوں کو فراموش نہیں کرو گی! اور میرے ساتھ بے وفائی نہیں کرو گی۔ اور اگر میں بشرط زندگی وطن واپس آیا تو تم ایسی دلنشیں مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کرو گی۔

اچھا خدا حافظ

آپ کا ساجد فاروق۔

ایک علیحدہ کاغذ پر نوشی کے والد صاحب کے نام یہ تحریر لکھی

پیارے انکل

آداب!

میں بفضلِ خدا بحفاظت کویت پہنچ گیا ہوں۔ میں آپ کے حسن سلوک کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ آپ سے عرض ہے وقتاً فوقتاً آپ اپنے حالات سے آگاہ کرتے رہا کریں گے۔

میری طرف سے آنٹی کو سلام قبول ہو۔

والسلام

ساجد فاروق۔

تب میں نے دونوں کاغذوں پر اپنا ایڈریس قلمبند کیا اور دونوں کاغذوں کو تہہ کرنے کے بعد ایک پر صرف "نوشی کے نام" لکھ کر دونوں کو پوسٹ کر دیا۔

اپنے گھر میں خط لکھنے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا۔ بس ماموں نے گھر والوں کو بذریعہ تار بخیریت پہنچنے کی اطلاع کر دی تھی۔

کویت میں ماموں اعجاز نے واقعی میرے لئے اچھی پوسٹ کا انتخاب کیا تھا۔ تنخواہ بھی ان کے کہنے کے مطابق تھی

سب سے بڑھ کر یہ کہ ماموں میرے ساتھ پہلے سے بھی زیادہ شفقت و محبت سے پیش آتے تھے۔ انہوں نے مجھے وہاں کبھی کسی قسم کی تکلیف کا احساس نہیں ہونے دیا تھا لیکن اس کے باوجود بھی اگرچہ میرے دل میں ماموں کے لئے عزت رہتی پر محبت بھی پیدا نہ ہو سکی۔ اور پھر ان سے میری محبت ہو بھی تو کیسی؟ آخر انہوں نے مجھے میرے گھر میرے وطن میرے والدین، میری ننھی منی بہن شازیہ اور پھر ان سب سے بڑھ کر میری محبت نوشی سے جدا کیا تھا۔

دن بہت مسرت سے گذر رہے تھے لیکن مجھے نوشی کے خط کا بے قراری سے انتظار رہتا تھا۔

آخر ایک دن نوشی کا محبت نامہ میرے لئے خوشیوں کا پیغام بن کر آ ہی گیا۔ میں نے بڑی بے تابی سے لفافہ چاک کیا تو لکھا تھا۔

ڈئیر ساجی

السلام علیکم۔

تمہارا خط ملا کھولا تو دو علیحدہ علیحدہ کاغذ برآمد ہوئے میں نے اپنے نام لکھا ہوا خط علیحدہ رکھ لیا اور دوسرا خط ابو اور امی کو سنا دیا۔ ساجی مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ تم کویت پہنچ گئے ہو۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کامیاب و کامران کرے۔ اور تمہاری زندگی خوشیوں سے بھر دے آمین

یقین کرو ساجد میں آخری سانس تک تمہاری امانت رہوں گی۔ میرے متعلق تم کوئی فکر نہ کرنا۔

دعاگو

تمہاری نوشی

وقت کے گزرنے کے ساتھ میں نے اپنے آپ کو وہاں کے ماحول کے مطابق ڈھال لیا تھا۔

روزانہ میں اور ماموں صبح جب غسل کرنے کے بعد لباس تبدیل کر لیتے تو اس وقت تک نعمان ناشتہ تیار کر چکا ہوتا جونہی ہم ناشتے سے فارغ ہو جاتے تو نعمان ہمیں کمپنی تک ماموں کی گاڑی پہ چھوڑنے جاتا اور پھر چھٹی کے وقت واپس بھی لے آتا یہ گاڑی اور رہائش کی جگہ وہاں کمپنی نے دے رکھی تھی رہائش کی جگہ اس قدر کھلی تھی کہ اس میں ایک چھوٹا سا خاندان رہائش رکھ سکتا تھا۔ میں اور ماموں علیحدہ علیحدہ کمروں میں رہتے تھے اور ایک کمرہ نعمان کے لئے وقف تھا۔

نعمان ماموں اعجاز کا ملازم تھا جو ماموں کے ہاں ہی رہتا تھا اور ان کا بیک وقت باورچی اور ڈرائیور بھی تھا۔ نعمان کی عمر تقریباً مجھ سے دو سال زیادہ تھی۔ وہ بہت سمارٹ اور خوشگفتار تھا۔ وہ اردو بہت اچھی اور پیاری بولتا تھا اس لئے مجھے اس کی شخصیت نے کافی متاثر کیا تھا جس کی ایک وجہ اس کی شائستہ زبان اور دوسری یہ کہ اس کے ہر کام میں پاکستان کی جھلک نمایاں تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ باتیں کروں اور اس سے پوچھوں کہ کیا وہ پاکستانی ہے اور اگر وہ پاکستانی ہے تو پھر کبھی اسے اس کے گھر والے خط کیوں نہیں لکھتے کیونکہ میں نے کبھی بھی اس کا کوئی خط آیا نہیں دیکھا تھا۔ میرے لئے مجبوری یہ تھی کہ ایک تو مجھے کبھی اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ میں اس کے ساتھ گفتگو کر سکوں اور دوسری یہ کہ نعمان ایک خاموش طبع انسان تھا۔ وہ بہت مختصر بات کرتا جتنی کہ ضرورت ہوتی۔ اس لئے میں اس سے اس کے متعلق ابھی تک کچھ نہ جان پایا تھا۔

ماموں جان کے ساتھ میں اپنے دل کی کوئی بات کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس لئے اکثر اوقات جب مجھے فرصت ہوتی تو میں اپنے کمرے میں بیٹھ کر نوشی کے تصور میں کھو جاتا۔ اور اس کے ساتھ گزارے ہوئے ہر لمحے کو اپنے تصور میں لانے کی کوشش کرتا اور تصور ہی تصور میں اس کے ساتھ باتیں کرنے لگتا۔ ایسے میں اگر کبھی نعمان میرے کمرے میں مجھے چائے دینے آتا یا کسی اور کام سے آتا تو میرا جی اس سے باتیں کرنے اور اس کی سننے کو چاہتا۔ لیکن دل کی یہ خواہش دل میں ہی دب جاتی کیونکہ میں یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ شاید وہ میری اس حرکت کا برا منائے وہ ہر بات کو ایک خاص سلیقے سے کرتا۔ جس سے اس کی ذہانت کا پتہ چلتا۔ میں اکثر اس کے متعلق سوچتا کہ اگر یہ ایجوکیٹڈ ہے۔ پھر یہ یہاں باورچی اور ڈرائیور کیوں ہے۔ اسے تو کوئی اچھی سی ملازمت ملنی چاہیئے تھی۔ لیکن ان باتوں کا جواب دینے والا مجھے کوئی نہ تھا۔ اور نعمان میرے لئے بالکل ایک معمہ بنا ہوا تھا۔ ایک دن میں دفتر سے آیا تو کمرے میں بیٹھ کر نوشی کے تصور میں کھو گیا۔ میں تصوروں میں محو تھا کہ مجھے نجانے کیا سوجھی کہ میں تصور ہی تصور میں نوشی سے باتیں کرنے لگا۔

قسمت کے کھیل

اچانک ایک مسرور کن آواز سے میرے تصوروں کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور میں حقیقت کی دنیا میں آ گیا نعمان میرے سامنے چائے لئے کھڑا تھا اور پوچھ رہا تھا۔

بھائی جان آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں

میں نے اس سے چائے لیتے ہوئے جواب دیا۔

بس نعمان یہ مجھے عادت ہے۔ میں کبھی کبھی یونہی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہوں۔

جب وہ خالی ٹرے لے کر جانے لگا تو نا جانے میرے اندر کہاں سے اتنی جرأت آ گئی میں نے اسے کہا۔

نعمان یار ادھر آؤ کبھی کبھار ہمارے پاس بھی بیٹھ کر ایک دو باتیں کر لیا کرو۔ تم تو بس اپنی مستی میں مگن رہتے ہو آؤ آج کچھ وقت آپس میں باتیں کریں۔ نعمان نے چند لمحے مجھے حیرت سے دیکھا اور پھر کچھ کہے بغیر میرے پاس بیٹھ گیا۔

میں نے اسے کہا کہ تم اپنے متعلق کوئی بات بتاؤ کہ تم کس طرح ماموں کے پاس پہنچ گئے۔

بھائی جان یہ ایک لمبی بات ہے آپ کو شاید پسند نہ آئے میں نہیں چاہتا کہ آپ خواہ مخواہ بور ہوں۔ نعمان نے بہت شائستہ لہجے میں ٹالنا چاہا۔

لیکن میں نے اسے کہا میں ہرگز تمہارے متعلق جان کر بوریت محسوس نہیں کروں گا۔ بلکہ مجھے تمہارے متعلق جاننے کا بہت اشتیاق ہے اور ہاں ایک بات اور کہ تم مجھے بھائی جان نہ کہا کرو کیونکہ تم مجھ سے بڑے ہو۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم میرا نام لے کر پکارا کرو۔ اور اب جلد مجھے بتاؤ کہ تم کس طرح ماموں اعجاز کے پاس پہنچے۔

تب اس نے سنانا شروع کیا۔

بھائی جان دل تو میرا بھی چاہتا تھا کہ کسی کے ساتھ اپنے دل کی باتیں کروں لیکن خیال آتا کہ یہاں میری باتیں سننے کے لئے کون ہے۔ آج آپ نے موقع دیا ہے۔ تو پھر سنئے میرے دل کو بھی ایک سکون محسوس ہوگا کیونکہ سنا ہے کہ دل کی باتیں کسی کو سنانے سے دل سے بوجھ ہلکا ہوتا ہے تو لیجئے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں کس طرح یہاں تک پہنچا۔

میں نے جب گھر میں ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ ہمارے گھر میں غربت بری طرح مسلط ہے۔

میرے ابا جان لوگوں کی حجامتیں کرتے ہیں۔ اس وقت بھی وہ یہی کام کرتے تھے۔ کیونکہ یہی ہمارا آبائی پیشہ ہے ابا جان تمام دن میں جو کچھ کما پاتے۔ اس سے بمشکل گھر میں دال روٹی چلتی۔

والد صاحب نے کسی نہ کسی طرح مجھے میٹرک تک تعلیم دلوا دی۔ لیکن کالج کے اخراجات ان کی برداشت سے باہر تھے۔ میں نے کسی جگہ ملازمت کے حصول کی کوشش کی لیکن ہر طرف سے مایوسی ہوئی۔ تب ابا جان نے مجھے بھی حجامت بنانا اور لوگوں کی بیاہ شادی پہ دیگیں وغیرہ پکانی سکھانی شروع کر دیں چونکہ آبائی پیشہ ہونے کی وجہ سے میں یہ کام جلد ہی سیکھ گیا۔ اور ابو کے ساتھ ساتھ میں بھی یہی کام کرنے لگا۔ ماں میرے کمائے ہوئے پیسے علیحدہ رکھتی جاتی۔ کیوں کہ اس پر تو بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ جلد از جلد میری شادی کر دے تاکہ وہ اپنے گھر میں بہو دیکھ سکے۔ میری منگنی بچپن سے ہی میرے والدین نے میرے چچا کے ہاں کر دی تھی۔

جب کچھ پیسے جمع ہو گئے تو ایک روز میری والدہ میرے چچا کے ہاں شادی کی تاریخ لینے گئی لیکن چچی اور چچا جان نے حیلے بہانے کرنے شروع کر دیئے اور کہنے لگے۔ ابھی تو نعمان کم عمر اور ناسمجھ ہے اور پھر عابدہ (میری منگیتر) بھی ابھی کونسی جوان ہے اس کے علاوہ ابھی تو عابدہ بارہ جماعتیں پاس کرے گی تو پھر اس کی شادی کا سوچیں گے۔ اور پھر نعمان کو بہتر ملازمت بھی نہیں حاصل کر سکا نہ اس نے کوئی اچھا کام سیکھا ہے تم نے خواہ مخواہ اسے گھر بٹھا لیا ہے اسے کالج کیوں نہیں داخل کروا دیا۔ بھلا حجامتوں کی آمدنی سے وہ شادی کے بعد گھر کا خرچ کیسے برداشت کر سکے گا۔

ڈھکے چھپے لفظوں میں انہوں نے امی جان کو جواب دیا تھا اور ہماری غریبی کا بھی خوب مذاق اڑایا میری والدہ مایوس ہو کر گھر آئی تو اس کی طبیعت میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا وہ اب ہر وقت ابا جان کو ایک ہی بات کہتی رہتیں کہ دیکھ لیا نا اپنے بھائی کو بہت مان تھا تمہیں اپنے بھائی پر لیکن ذرا سی دولت آ گئی تو انہوں نے اپنا کیا ہوا وعدہ بھلا دیا۔

جواب عرض لاہور

آخر ایک دن اباجان والدہ کی ہر روز کی طعن سے تنگ آکر اپنے بھائی (میرے چچا) کے گھر خود گئے لیکن اسی دن وہ بھی ذلیل اور نامراد لوٹے انہوں نے بتایا کہ
ان کے بھائی نے کہا ہے کہ ہم عابدہ کی شادی ایک نکمے لڑکے سے شادی کرنے کی بجائے کسی امیر اور اچھے گھرانے میں کریں گے۔ اس کے علاوہ چچی اور چچا نے ابو کو غریبی کے سخت سے طعنے دیئے اور گھر سے نکال دیا۔
اباجان نے جب یہ باتیں گھر آکر کیں تو میرا دل بجھ سا گیا۔

عابدہ سے مجھے بے حد محبت تھی اگرچہ میں نے اپنی اس محبت کا اظہار عابدہ سے نہیں کیا تھا مگر پھر بھی مجھے یقین تھا کہ عابدہ کو میری محبت کا علم ہے۔ میرے دل میں عابدہ کو حاصل کرنے کی تمنا مچلنے لگی۔ میں نے سوچا کہ میں اگر شادی کروں گا تو صرف عابدہ سے اور اس کے لئے چاہے مجھے چچی کے پاؤں ہی کیوں نہ رکھنا پڑے۔ پھر خیال آیا کہ جب چچا نے اپنے بھائی کی بات نہیں مانی تو پھر میری فریاد وہ کب سنیں گے۔ انہیں تو لوگوں نے اب دولت سے ہی پیار تھا اور وہ لوگ دولت کو ہی اپنا سب کچھ سمجھنے لگے تھے۔ اس کے علاوہ دوسری بات یہ تھی کہ شاید عابدہ کو مجھ سے محبت ہے بھی یا نہیں کیونکہ میں ایک غریب حجام تھا جبکہ اس کے والد بھی شہر میں حجام تھا اور اس کا ایک بھائی سعودیہ میں تھا پھر وہ اب سیکنڈ ائر میں پڑھ رہی تھی۔ بھلا وہ مجھ سے کیسے شادی کرنا پسند کرسکتی ہے
لیکن دل بار بار یہ یقین دلاتا کہ عابدہ ضرور مجھ سے محبت کرتی ہے۔

چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں عابدہ سے شادی ضرور کروں گا۔ اور اس کے لئے میں حل سوچنے لگا کہ کس طرح امیر بن جاؤں اور پھر عابدہ سے شادی کروں۔
سوچتے سوچتے میرے ذہن میں ایک ہی حل آیا کہ کسی طرح عابدہ کے بھائی کی طرح سعودیہ چلا جاؤں تو میں امیر بن سکتا ہوں۔ سعودیہ جاکر امیر بننے کے خواب میں مجھے اپنے سپنوں کی تعبیر نظر آئی۔
کیونکہ میرے ذہن میں یہ تھا کہ ہر آدمی بیرون ملک جاکر امیر بن سکتا ہے اس کا ثبوت میرے پاس عابدہ کا بھائی تھا جو سعودیہ گیا ہوا تھا اور خوب پیسے والدین کو بھیج رہا تھا۔ اس کی کمائی سے ہی عابدہ کے والد صاحب (میرے چچا) نے شہر میں ایک حمام کھول لیا تھا۔ ورنہ عابدہ کے بھائی کی طرح سعودیہ جانے سے قبل وہ بھی میرے والد صاحب کی طرح گاؤں میں ہی لوگوں کی حجامتیں بنایا کرتے تھے لیکن جب سے ان کا بیٹا سعودیہ چلا گیا تھا تو وہ کسی سے آنکھ نہ ملاتے کیونکہ اب حمام کی بھی بہت آمدن تھی اور سعودیہ سے بھی دولت ان کے گھر آرہی تھی
ایسی باتوں سے جیسے نظر ایک ... میں نے والد صاحب سے کہا کہ وہ مجھے سعودیہ بھیج دیں۔ والد صاحب نے مجھے سمجھایا کہ
بیٹا ہر آدمی کی قسمت اتنی اچھی نہیں ہوتی کہ وہ باہر جاکر امیر بن جائے لیکن میں بضد رہا کیونکہ مجھ پر تو اب امیر بننے کا بھوت سوار تھا۔ اس لئے میں نے اباجان سے کہا کہ اباجان انسان کی قسمت انسان کے ہاتھ پر تو لکھی نہیں ہوتی کہ وہ اسے پڑھ کر کوئی کام کرے۔ اس لئے انسان کو کوشش ضرور کرنی چاہیئے۔ آگے جیسے قسمت ہو وہ دیکھا جائے گا
تب میں نے امی جان سے بات کی وہ چونکہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرتی تھیں۔ اس لئے وہ جلد ہی رضامند ہوگئیں دوسری وجہ ان کے رضامند ہونے کی یہ بھی تھی کہ وہ بھی کسی طرح امیر بن کر عابدہ سے میری شادی کرکے چچا سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا چاہتی تھیں انہوں نے اباجان کو بھی قائل کرلیا۔ گھر میں کچھ پیسے جمع تھے کچھ امی نے اپنی بہن سے ادھار لئے اور ۰۰۰ ۷ روپے کی کل رقم بناکر ایک ایجنٹ کو دیئے یہ ایجنٹ ہمارے ساتھ کے گاؤں کا تھا یہ بھی سعودیہ میں گیا ہوا تھا اور کہتا تھا کہ اب آدمیوں کو لینے کے لئے آیا ہوں۔

جب ہم سعودیہ کے لئے روانہ ہوئے تو میرے ساتھ ایجنٹ کے علاوہ چودہ آدمی اور تھے جو ہمارے گاؤں کے ارد گرد کے گاؤں کے تھے۔ اور دو میرے گاؤں کے تھے۔ یہ سب بہت خوش تھے کیونکہ وہ سعودیہ امیر بننے کے لئے جارہے تھے۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ کس قدر دھوکا ہو رہا ہے۔

ایجنٹ نے ہم سب کے ساتھ دھوکا کیا۔ چونکہ ہم سب گاؤں کے لوگ تھے۔ کراچی تو کیا کبھی لاہور بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایجنٹ ہمیں گاڑی پہ بٹھا کر لاہور لایا اور وہاں سے ہوائی جہاز پہ بٹھا کر کراچی چھوڑ کر خود غائب ہو گیا۔

جب ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے تو ہم سب سر پیٹ کے رہ گئے۔

اس وقت مجھے اباجان کی وہ بات شدت سے یاد آئی کہ بیٹا ہر آدمی کی قسمت اچھی نہیں ہوتی کہ وہ باہر جا کر امیر بن جائے۔

آہ! قسمت بھی کس قدر بے رحم ہے۔

میرے گاؤں کا ایک آدمی تو واپس چلا گیا اور دوسرا نہ معلوم کدھر غائب ہو گیا۔ باقی کے تمام آدمی بھی آہستہ آہستہ غائب ہونے گئے۔ میری جیب میں ایک سو روپیہ تھا۔ اگر میں چاہتا تو گاڑی پر واپس جا سکتا تھا لیکن میں اب واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔

دو دن تک تو ادھر ادھر پھرتا رہا۔ ماں نے آتی دفعہ کچھ کھانے کی چیزیں ساتھ باندھ دی تھیں وہ ہی کھاتا رہا۔ لیکن چوتھے دن وہ بھی ختم ہو گئیں۔ شام کا وقت تھا۔ بھوک سے برا حال ہو رہا تھا تب میں ایک ہوٹل میں کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ جب میرے سامنے بل آیا تو میں حیران رہ گیا۔ یہ ایک وقت کا کھانا مجھے پندرہ روپے میں نصیب ہوا تھا۔ میں نے بل ادا کیا میں ابھی وہیں بیٹھا سوچنے لگا کہ یہ باقی کے روپے مجھے اور کتنے دنوں تک کھانا کھلا سکیں گے۔ یہ سوچ آتے ہی بلا ارادہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے کم از کم گھر میں روٹی تو بلا معاوضہ نصیب تھی۔ اور بلا روک ٹوک پیٹ بھر کے کھانے کو میسر تھا۔ انہی خیالوں میں مگن تھا کہ میرے شانوں پہ کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ میرے ساتھ ہی ایک صاحب جو اچھے اور قیمتی سوٹ میں ملبوس تھے۔ بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہی میرے شانوں پر ہاتھ رکھا تھا ان کے دوسرے ہاتھ میں اخبار تھا۔

شاید انہوں نے مجھے افسردہ اور روتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر پوچھنے لگے کہ تمہارے رونے کی کیا وجہ ہے؟ جب ان کی زبان میں شفقت اور محبت محسوس کی اور ان کو اپنی تمام کہانی سنا دی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی اور اپنے ساتھ آنے کو کہا۔

وہ مجھے ایک سٹین لیس سٹیل کی دکان پہ لے گئے اور بتایا کہ یہ ہماری اپنی ملکیت ہے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ میں ان کے گاہکوں کو برتن پیک کر کے دے دیا کروں جس کا وہ مجھے معاوضہ دیں گے یہ محض ان کی خدا ترسی تھی رات کو میں دوسرے ملازمین کے ساتھ ان کے گودام کے ساتھ ملحق کمرے میں سو جاتا۔

پانچ چھ دن کے بعد میں نے اپنے گھر ایک خط لکھا جس میں ایجنٹ کے دھوکے کے متعلق لکھا اور اس کے بعد انکو مطمئن کرنے کی خاطر لکھا کہ میں ایک بہت نیک اور اچھے انسان کی وجہ سے سعودیہ پہنچ گیا ہوں اور کام کی تلاش میں ہوں۔ جونہی کوئی کام ملا میں آپ کو خط لکھوں گا۔ اور پھر ایڈریس بھی لکھوں گا۔ یہ الفاظ تحریر کرتے ہوئے میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کیونکہ یہ سب جھوٹ لکھ رہا تھا لیکن گھر والوں کی تسلی کے لئے ضروری تھا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ جو آدمی ہمارے گاؤں کا واپس چلا گیا ہے۔ وہ ہمارے گھر اطلاع دے گا تو وہ بہت بے چین ہوں گے۔ اس لئے یہ جھوٹ لکھنا مناسب سمجھا شام کو میں نے دو نفل نماز ادا کی اور خدا کے حضور سربسجود ہو کر روتے ہوئے خدا سے دعا اور شکوہ کیا۔

اے اللہ ہماری قسمت کے کھیل بھی تو نے کیسے کیسے لکھ دیئے ہیں کہ انسان کرتا تو کچھ ہے لیکن ہوتا کچھ اور ہے خدا آخر انسان اتنا مجبور کیوں ہے۔ حالانکہ تو نے تو انسان کو اپنا نائب اور اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا ہے لیکن تیرا یہ نائب کس قدر بے بس ہے۔

آخر تیرا اشرف المخلوقات تیرے لکھے کے آگے اس قدر مجبور کیوں ہے۔

یہاں تک پہنچ کر نعمان رک گیا اور بولا۔ بھائی ساجد کہیں آپ میری کہانی سے بوریت تو محسوس نہیں کر رہے نعمان کی آنکھوں میں آنسو تھے جو بہنے کے لئے بے چین تھے۔ لیکن نعمان ان کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

نہیں دوست میں بالکل بور نہیں ہوا تم اپنے متعلق بتاتے جاؤ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا حالانکہ اس کی درد بھری کہانی سن کر خود میری آنکھوں سے بھی آنسو بہنے کو بے تاب
بجواب عرض لاہور

تھے جنہیں میں نے بڑی مشکل سے روکا

نعمان اپنی کہانی کو جاری رکھتے ہوئے دوبارہ بولا۔
ہاں تو بھائی جان ساجد صاحب میں نے اللہ تعالیٰ سے اس کے نائب کی بے بسی کو خوب رو کر اظہار کیا۔

شین لیس شبل کی دکان پر ابھی مجھے پندرہ دن ہی ہوئے تھے کہ قسمت نے میرے ساتھ ایک اور کھیل کا آغاز کر دیا۔ ہوا یوں کہ ایک دن آپ کے ماموں اسی دکان پر آئے میں ان کو بھی گاہک سمجھا۔ لیکن انہوں نے دکان کے مالک سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب وہ دکان کے مالک سے ملے تو میں نے دیکھا کہ وہ مالک سے بہت بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے جیسے بہت گہرے دوست ہوں۔

دکان کے مالک نے مجھے بلایا اور کہا کہ جاؤ سامنے کے ٹی سٹال سے دو چائے لاؤ۔ جب میں چائے لے کر واپس آیا تو آپ کے ماموں نے میری طرف غور سے دیکھا اور دکان کے مالک سے بولے۔

ٹھیک ہے! میں چھٹی پر آیا ہوا تھا تین چار روز بعد واپس چلا جاؤں گا۔ سوچا آپ سے مل لیا جائے تو بہتر ہے اس سے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ کیونکہ میرے پاس ویزا ہے۔

میری سمجھ میں ان کی کوئی بات نہ آسکی۔ جب وہ چلے گئے تو دکان کے مالک صاحب نے مجھے ایک دفعہ پھر بلایا اور کہنے لگے بیٹے تمہاری قسمت اچھی ہے۔ بس تمہارا کام بن گیا ہے یہ اعجاز صاحب میرے گہرے دوست ہیں یہ میرے کلاس فیلو بھی رہے ہیں۔ میں نے ان سے تمہارا ذکر کیا تو وہ بولے کہ ٹھیک ہے میں نعمان کو ساتھ لے جاؤں گا۔ اعجاز صاحب کویت میں ہی ملازمت کرتے ہیں بہت اچھے انسان ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ۔

میں اپنے ایک دوست کے لئے ویزا لایا تھا لیکن میرا دوست بعض مجبوریوں کی وجہ سے میرے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں اگر کوئی آدمی بھجنا ہو تو بتاؤ۔

میں نے اعجاز صاحب سے تمہاری بات کی تو وہ راضی ہو گئے بلکہ انہوں نے کہا ہے کہ وہ خرچہ خود ہی کریں گے اس سے تیسرے روز بعد آپ کے ماموں دوبارہ وہاں آئے اور اسی شام انہوں نے مجھے ساتھ لیا اور یہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے اپنا باورچی رکھ لیا

چونکہ کھانے پکانے میں میں ماہر تھا۔ انہوں نے میرے پکے ہوئے کھانے بہت پسند کیے آہستہ آہستہ انہوں نے مجھے ڈرائیونگ بھی سکھا دی اور مجھے لائسنس بھی بنوا دیا تب سے آپ کے ماموں کو میں ہی دفتر چھوڑنے اور وہاں سے لینے کے لئے جاتا ہوں آپ کے ماموں بلاشبہ بہت اچھے انسان ہیں وہ ہر ماہ باقاعدگی سے مجھے تنخواہ دے دیتے ہیں انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ پیسے ہر ماہ بنک میں جمع کرا دیا کروں اور کچھ اپنے گھر بھیج دیا کروں

ڈیڑھ سال ہو گیا ہے اب تک بنک میں میرے ۱۲۰۰۰ ہزار روپے اور ... جمع ہو چکے ہیں۔ بس یہ ہے میرے یہاں پہنچنے کی داستان۔ نعمان نے اپنی کہانی ختم کرتے ہوئے کہا۔

نعمان کیا تم نے اب بھی کبھی عابدہ سے شادی کرنے کے بارے میں سوچا ہے۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

کیوں نہیں بھائی جان یہی تو میری ایک آرزو ہے۔ جس کی تکمیل کے لئے میں یہاں تک پہنچا ہوں۔ اب کی بار میں آپ کے ماموں کے ساتھ جاؤں گا۔ اور پاکستان جاتے ہی عابدہ سے شادی کر لوں گا۔ آپ کے ماموں کہتے ہیں کہ اب ڈیڑھ سال کے بعد پاکستان جائیں گے۔ اس وقت تک میرے پاس کافی پیسے جمع ہو چکے ہوں گے۔ اور میں ایک امیر آدمی کی حیثیت سے پاکستان جاؤں گا۔

تب میں نے اس ایک اور سوال کیا

نعمان اس کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارے چچا جان نے اب تک عابدہ کی شادی نہ کی ہو۔ اور مزید یہ کہ عابدہ تم سے محبت کرتی ہے اور وہ تم سے شادی کے لئے رضامند ہو جائے گی۔

بھائی جان مجھے پورا یقین ہے کہ عابدہ کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی اور یہ بھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ یہ کہتے ہوئے نعمان اٹھ کر کمرے سے نکل گیا اور چند پل بعد ہی دوبارہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک میلا تہہ شدہ کاغذ تھا۔ وہ کاغذ مجھے دیتے ہوئے بولا۔ یہ دیکھئے بھائی جان یہ خط اس بات کا ثبوت ہے کہ عابدہ واقعی مجھ سے محبت کرتی ہے

میں نے تہہ شدہ خط کھول کر پڑھنا شروع کیا لکھا تھا۔

میرے نعمان !

السلام علیکم

اگرچہ میں اپنے والدین کے اس سلوک کی وجہ سے شرمندہ ہوں جو انہوں نے تمہارے والدین کے ساتھ کیا لیکن انتہائی افسوس کی بات ہے کہ تم اتنی جلدی جذبات میں آ گئے اور اپنے گھر سے باہر نکل گئے کہ کسی طرح میرے رشتے حاصل کر سکو۔ تمہاری یہ سوچ کسی حد تک غلط تھی کہ تم مجھے دولت کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہو۔ نعمان دنیا میں دولت ہی سب کچھ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ ایک دوسرے کی چاہت و محبت بھی کوئی چیز ہے۔ یقین کرو تم ہی میرے دل کے مندر میں صرف اور صرف ایک تیرا ہی مجسمہ ہے۔ جس کی میں نے ہر وقت پوجا کی ہے۔ میرے دل میں تمہاری بے حد محبت ہے۔ تمہارے ساتھ جانے والے تمہارے گاؤں کے ایک شخص نے جب آ کر بتایا کہ ہم سب کے ساتھ دھوکا ہوا ہے اور تمہارے متعلق اس نے بتایا کہ نا جانے کہاں چلا گیا ہے تو تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے اس وقت کتنا دکھ ہوا تھا

لیکن جب تمہارا خط ہمارا گھر میں آیا تو میں نے ایک سکون پایا۔ میں نے ایک سکون پایا۔ میں کبھی کبھار تمہارے گھر میں آیا کرتی ہوں۔ یہ خط بھی سے تمہارا ایڈریس لے کر لکھ رہی ہوں

میں تو تمہیں دل و جان سے چاہتی ہوں۔ میں پہلے بھی تمہیں اسی طرح چاہتی تھی۔

لیکن مجھے اپنے والدین کے اس طرح بدل جانے والے ذہن کا علم نہ تھا۔

جب تمہارے اس طرح چلے جانے مجھے علم ہوا تو مجھے بہت دکھ ہوا۔ میں نے امی اور ابو سے کہہ دیا تھا کہ میں اگر شادی کروں گی تو صرف نعمان کے ساتھ۔ انہوں نے میرے فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔ تم جب کبھی آؤ گے مجھے اپنا منتظر پاؤ گے خدا تمہیں کامیاب و کامران کرے۔

تمہاری امانت

عابدہ

اب تو تمہارے پاس کافی رقم جمع ہو گئی ہے اور تمہارے والدین بھی یقیناً تمہارے بھیجے ہوئے پیسوں سے امیر بن چکے ہوں گے۔ اب تو عابدہ کے والدین کو بھی کوئی عذر نہ ہو گا۔ اب تم پاکستان جاتے ہی عابدہ سے شادی کر لینا

تب وہ ہنس پڑا اور بولا۔

ہاں اب ہم دونوں جلد ہی ایک دوسرے کو حاصل کر سکیں گے۔ بشرطیکہ قسمت اب ہمارے ساتھ کوئی اور بڑا کھیل نہ کھیلے۔ یہ کہتے ہوئے وہ میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس گفتگو کے بعد میں اور نعمان اکثر اکٹھے بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتے۔ میں جب کبھی وقت ملتا تو ماموں سے اجازت لے لیتا اور نعمان کو ساتھ لے کر ماموں کی گاڑی میں کویت کے مختلف حصوں کی سیر کو نکل جاتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں اور نعمان آپس میں گہرے دوست اور ایک دوسرے کے رازداں بن گئے۔ تین چار ماہ میں میں نے نعمان سے مکمل ڈرائیونگ سیکھ لی۔

بہت مشکل سے ایک سال اور گزرا۔ میرے لئے تو اب وقت بالکل سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ اس ڈیڑھ سال کے دوران نوشی کے خطوط مجھے ملتے رہے۔ اس کے والد صاحب کی طرف سے بھی دو تین خطوط مجھے موصول ہوئے نوشی اپنے ہر خط میں میری کامیابی کی دعائیں اور مجھے اپنی محبت کا یقین دلاتی رہی

نوشی کی جدائی میرے لئے بہت بڑا عذاب بنتی جا رہی تھی اس کے علاوہ اب میرا دل اپنے ابو امی اور شازیہ کے لئے بھی اداس ہو گیا تھا۔

ایک روز میں ماموں کے کمرے میں چلا گیا وہ مجھے دیکھ کر چونکے اور بولے

آؤ آؤ ساجد بیٹے بیٹھو۔ کیا بات ہے

ماموں جان پاکستان واپسی کب ہو گی۔ میں نے بیٹھتے ہی کہا۔

کیوں۔ بیٹے کوئی تکلیف تو نہیں یہاں۔ وہ میری بات کا جواب دیئے بغیر بولے۔

نہیں ماموں بس ابو اور امی کے لئے دل اداس ہو رہا ہے ماموں ہنس پڑے اور بولے۔

بس بیٹے صرف پانچ ماہ تک انتظار کرو۔ جونہی دو سال پورے ہوئے تو ہم تین ماہ کی رخصت لے کر پاکستان روانہ

رب میں گئے۔

اور ہاں سنو تمہارے لئے ایک خوشی کی بات ہے۔ چند دن پہلے تمہاری امی جان کا خط ملا تھا انہوں نے لکھا ہے کہ جونہی ہم لوگ پاکستان آئیں گے تو میں ساجد کی شادی بہت دھوم دھام سے کروں گی۔

میں نے ان کو جواب میں لکھ دیا ہے کہ آپ ہمارے آنے تک منگنی کا کام ختم کر لیں۔ تاکہ ہمارے آتے ہی شادی ہو جائے۔ یہ کہتے ہوئے ابو نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں شرمندہ سا ہو کر ان کے کمرے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

مجھے خیال آیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امی میری منگنی کہیں اور کر دیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ابو کو آفس کے پتے پر ایک خط لکھنا شروع کیا

پیارے ابا جان!

آداب!

مجھے امید ہے کہ جہاں میں آپ کی خوشیوں کی خاطر آپ سے اور امی سے علاوہ اپنی بہن سے بھی دور ہوں یہاں پردیس میں ہوں آپ بھی یقیناً میری خوشی کا خیال رکھیں گے۔ بات یہ ہے کہ ابو نے مجھے بتایا ہے کہ آپ لوگ ان دنوں میری منگنی کے متعلق سوچ رہے ہیں۔ تاکہ جب ہم پاکستان آئیں تو میری شادی کر سکیں۔

ابا جان اس سے قبل کہ آپ میری منگنی کسی اور لڑکی سے کر دیں آپ کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ کسی بھی لڑکی سے میری منگنی نہ کریں کیونکہ میں شادی اگر کروں گا تو صرف نوشی کے ساتھ۔ نوشی میری محبت ہے۔ میری چاہت ہے۔ آپ یقیناً اس کو اپنی بہو بنا کر مسرت محسوس کریں گے۔ کیونکہ نوشی ایک بہت ہی اچھی سلیقہ مند اور سمجھدار لڑکی ہے۔ وہ ایک شریف خاندان کی بیٹی ہے نوشی اور میں دونوں ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں

آپ سے عرض ہے کہ آپ ان کے گھر جا کر اس کے والدین سے نوشی کو میرے لئے مانگ لیں۔ کیونکہ نوشی ہی میری زندگی میں سرخوشی ہے۔ آپ یقیناً مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ میں یہ خط آپ کو اس حوصلے اور جرأت سے لکھ رہا ہوں کہ آپ ہر کام میں اولاد کی مرضی اور خوشی کی قدر کرتے ہیں

آپ کا بیٹا

ساجد فاروق۔

خط کے نیچے میں نے نوشی کے گھر کا ایڈریس لکھا اور بند کر کے لفافے میں بند کر کے ایک اور خط نوشی کے نام لکھنا شروع کیا۔

جان سے عزیز نوشی!

السلام علیکم!

تمہارے لئے خوشخبری ہے کہ میں عنقریب پاکستان آ رہا ہوں۔ اس کے علاوہ ضروری بات جس کی خاطر میں یہ خط تحریر کر رہا ہوں یہ ہے کہ ہمارے گھر سے ایک خط آیا ہے۔ جس سے پتہ چلا ہے کہ ہمارے گھر والے میری منگنی کے متعلق سوچ رہے ہیں تاکہ جب میں پاکستان آؤں تو وہ میری شادی کر دیں۔ تو جان میں میں نے جواب میں ابا جان کو لکھ دیا ہے کہ میں شادی صرف اور صرف نوشی سے کروں گا۔ میں نے انہیں لکھا ہے کہ وہ تمہارے گھر جا کر تمہارے والدین سے تمہیں ہمیشہ کے لئے میرے لئے مانگ لیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ایک دو ماہ کے اندر اندر تمہارے گھر آئیں گے اور ہاں تم سے عرض ہے کہ اگر وہ دو ماہ تک نہ آئیں تو تم اپنی والدہ سے کہنا کہ وہ تمہارے ابا جان کو ساتھ لے کر ہمارے گھر جائیں تاکہ......

میرے والدین یقیناً انکار نہیں کریں گے۔

تمہارا ساجد فاروق۔

دوسرے دن میں نے دونوں خط پوسٹ کر دیئے اور ان کے جوابات کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی والد صاحب لکھیں گے کہ ہم نے تمہاری منگنی نوشی سے کر دی ہے اور پھر نوشی بھی اس خوشی میں مجھے خط لکھے گی۔ اس لئے میں بہت خوش تھا۔ لیکن انتظار کے دن گزرتے جا رہے تھے۔ لیکن دونوں طرف سے کوئی خط نہ ملا۔ چار ماہ کا عرصہ انتظار میں گزر گیا۔ میں بری طرح بے چین تھا کم از کم نوشی کو تو ایک خط ضرور لکھنا چاہئے تھا۔ مگر وہ تو جیسے مجھے بھول ہی گئی تھی۔ میری پریشانی اور اداسی ہر روز بڑھتی جا رہی تھی آخر کیا وجہ تھی کہ ابھی تک کسی طرف سے جواب نہیں آیا تھا۔ ایک روز میں بہت پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں بیٹھا نوشی اور ابا جان کو ایک اور خط لکھ رہا تھا کہ نعمان کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک

لفافہ تھا بھائی جان آپ کا خط آیا ہے اس نے فوراً کہا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میں نے لپک کر لفافہ اس سے جھپٹ لیا۔ اور رما جلدی سے کھولا تھا۔ اور اس میں سے ایک خوشگوار سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ آخر نوشی نے خط لکھ ہی دیا تھا۔ بھلا وہ مجھے کس طرح بھول سکتی ہے۔ میں نے دھڑکتے دل سے لفافہ چاک کیا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ میرے سپنوں کے ستبش محل ایک لمحے میں گر گئے مجھے ایسے لگا جیسے قیامت آگئی ہے۔ اور سورج سوا نیزے پر ہے جس کی تیز لو میں میں بری طرح جھلس رہا ہوں۔ اور کوئی میرا پرساں حال نہیں خط میں لکھا تھا

میرے لخت جگر ساجد

اسلام علیکم۔

جونہی ہمیں تمہارے ماموں جان کا خط ملا تو میں نے تمہارے ابو سے بات کی۔ تمہیں خوشی ہوگی کہ ہم نے چند دن ہوئے تمہاری منگنی راشدہ سے کر دی ہے راشدہ تو بس چاند ہے ماشاللہ کیا خوب جوڑی سجے گی۔ ہم پاکستان آتے ہی اپنے بیٹے کی شادی کر دیں گے۔ دو تین اور رشتے بھی آئے لیکن میں نے انکار کر دیا میں تو بس اپنے بیٹے کی دلہن راشدہ کو ہی بناؤں گی۔ لوگ تو ہمارے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔ لوگ تو بس چاہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی غریب لڑکیوں کو دولتمند گھرانے میں بیاہ دیں،

تمہارے ماموں کا کہنا ہے کہ وہ راشدہ کے بہت سے جہیز کے ساتھ تمہیں ایک کار بھی خرید کر دیں گے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ تم نے ڈرائیوری سیکھ لی ہے

فقط

تمہاری امی۔

خط کے الفاظ جگنو ذروں کی طرح میرے گرد گھوم رہے تھے آج مجھے پتہ چلا کہ ماموں آخر مجھ پر کیوں اس قدر مہربان تھے صرف اس لئے کہ وہ راشدہ کو میرے ساتھ بیاہنا چاہتے تھے راشدہ ماموں کی بیٹی تھی وہ مجھ سے پانچ سال بڑی تھی۔ اسے ٹی بی کی بیماری تھی وہ تندرست تو ہو گئی لیکن اس قدر دبلی پتلی ہو گئی کہ بالکل تنکے کی طرح لگتی تھی۔ بیماری سے قبل خوبصورت بھی تھی لیکن بیماری نے اس کا حسن چھین لیا تھا۔ چہرہ زرد پڑ چکا تھا اس کا رشتہ کوئی امیر آدمی قبول نہ کرتا تھا لیکن غریبوں میں رشتہ دینا ماموں اپنی توہین سمجھتے تھے۔

امی کے اس خط کے بعد میں کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ ماموں سے مجھے شدید نفرت پیدا ہو گئی۔ اگر وہ کبھی بلاتے یا بات کرتے تو میں خاموش ہو جاتا۔ تب ایک دن مجھے کہنے لگے۔

بیٹے لگتا ہے کہ تم بہت زیادہ اداس ہو گئے ہو فکر نہ کرو بس ایک ماہ کی بات ہے میں ابھی سے رخصت کی درخواست دے دیتا ہوں۔

نعمان اکثر مجھے تسلیاں اور حوصلے دیتا۔ اور کہتا بھائی جان آپ اس قدر غم نہ کیا کریں ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہماری قسمت میں لکھ دیا ہے۔ انسان تو بس مجبور ہے وہ کیا کر سکتا ہے۔ لیکن میرا غم اس کی تسلیوں سے ہلکا نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک روز ماموں نے بتایا کہ درخواست قبول ہو گئی ہے پندرہ دن بعد پاکستان روانگی ہے لیکن مجھے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ نوشی کی طرف سے مجھے کوئی خط موصول نہیں ہوا تھا۔ ایک رات میں سونے لگا تو مجھے اپنی قسمت پر بہت رونا آیا۔ بستر پر پڑا پڑا نا جانے کب تک روتا رہا اور کب نیند کی دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا سوتے میں میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں نوشی کے پاس بیٹھا اس سے پیار و محبت کی باتیں کر رہا ہوں کہ اچانک نا جانے کیوں نوشی مجھ سے دور ہٹنا شروع کر دیتی ہے میں اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا ہوں مگر وہ مزید آگے چلی جاتی ہے جونہی میں ایک قدم اس کی طرف بڑھاتا ہوں وہ تیزی سے پیچھے ہٹ جاتی ہے۔ میں حیران و پریشان اس کی طرف دیکھنے لگتا ہوں۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے نوشی نے پریوں جیسا روپ دھار لیا ہے اور وہ اوپر فضا میں اڑنا شروع کر دیتی ہے۔ میں تیزی سے اس کے پیچھے بھاگتا ہوں اور اسے آوازیں دیتا ہوں مگر وہ میری طرف توجہ کئے بغیر اوپر ہی اوپر اور آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ میں بھی مسلسل اس کے پیچھے بھاگتا ہوں۔ اچانک بھاگتے میں اپنے سامنے ایک بہت گہرا سمندر پاتا ہوں۔ میں گھبرا کر اس کے کنارے پر کھڑا ہو جاتا ہوں اور بے بسی سے نوشی کو آوازیں دیتا ہوں۔

نو ... شی ... ی ... مگر میری آواز حلق میں ہی پھنس جاتی ہے۔ قریب تھا کہ میں اپنے ہوش و حواس کھو کر گر جاتا اور سمندر کی لہریں مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے جائیں۔ تب اچانک نوشی

سمندر کی اوپر نیچے اٹھتی ہوئی بے چین لہروں کے او پر فضا میں معلق نظر آتی ہے اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہتی ہے

اے انسان لوکیونکر اس سمندر سے پیچھے بھاگ رہا ہے میں تو ایک روح ہوں جبکہ تم ایک چلتے پھرتے انسان ہو جو تمہارے سامنے سمندر ہے یہ پانی کا نہیں بلکہ انسانوں کا ہے تم بھی انسانوں کے سمندر میں کھو جاؤ یہ تمہیں نگلنے کو بے تاب ہے۔ یہ انسانوں کا سمندر ایسے جیسے ہر انسان کو نگل لینا چاہتا ہے اور تو نے دیکھا کہ تو اپنے جیسے ان انسانوں سے ڈر گیا آخر تمہیں ان انسانوں سے ڈرنا ہی چاہیئے۔ یہ تمام انسان اللہ سے نہیں ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں اور یہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ ایک دوسرے کی راہ کے کانٹے ہیں تمہاری اور میری راہ کے بھی کانٹے ہیں۔ یہ ہمیں ہرگز آپس میں ملنے نہ دیں گے کیونکہ یہ کسی کے دوست اور غمخوار نہیں یہ تو بس ہر ایک کے دشمن ہیں یہ اپنے بھی دشمن ہیں یہ اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کرتے یہ اپنے وطن کو بھی معاف نہیں کرتے اور یہ خدا کو بھی معاف نہیں کرتے یہ اس کے بھی احکامات کی روگردانی کرتے ہیں۔ شاید خدا بھی انہیں معاف نہ کرے۔ جب تک تم ان انسانوں کے ساتھ تعلق رکھو گے۔ تم مجھے نہیں حاصل کر سکتے تمہارا میرے پیچھے آنا بیکار ہے لیکن ایک بات یاد رکھو! جب تم میری دنیا میں آجاؤ گے اور انسانوں کے اس وسیع و عریض دلدل جیسے گہرے سمندر سے اپنے آپ کو بچا لوگے تو مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔ تب تمہاری روح مجھ سے مل سکے گی میں اس طرح بے خودی سے نوشی کی باتیں سن رہا تھا جیسے اس نے مجھے ہپناٹزم کر رکھا ہو۔ اچانک آسمان سے ایک سفید رنگ کی روشنی نمودار ہوئی۔ جو آہستہ آہستہ نیچے آنے لگی پھر وہ اتنا نیچے آگئی کہ اس نے نوشی کو اپنے اندر نگل لیا۔ مجھے اس کے بعد کچھ ہوش نہ رہا۔ صبح نعمان مجھے جھنجوڑ جھنجوڑ کر اٹھا رہا تھا۔ اس وقت سات بج رہے تھے۔ میں نے ناشتہ کئے بغیر ناشتہ کیا اور کام پر چلا گیا۔ آٹھ دن کے بعد میں ماموں اور نعمان ایک دفعہ پھر وطن واپسی کے لئے طیارے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ طیارہ بہت تیزی سے میری پاک سرزمین کی طرف آ رہا تھا لیکن میں نے اپنے اندر کوئی خوشی محسوس نہ کی۔ بس خوشی تھی تو صرف ایک کہ میں جلد ہی نوشی سے ملنے والا تھا جو میری محبت تھی۔

نوشی کا خیال آتے ہی مجھے وہ خواب یاد آ گیا۔ جس کی نامعلوم تعبیر نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ طیارے کو اپنے وطن کی پاک سرزمین پر رینگتے دیکھ کر چونکا۔ یہ لاہور ائیرپورٹ تھا۔ ابو امی اور ان کا بیٹا حامد (ماموں کا لڑکا) اور بھائی ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ امی مجھے دیکھتے ہی میری طرف لپکیں لیکن میں دور کھڑے ابو سے لپٹ گیا امی سے مجھے شدید نفرت ہو چلی تھی امی اور بھائی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور تمام راستے مجھ سے وہاں کسی قسم کی تکلیف کے متعلق پوچھتی رہیں میں نے ان کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ تقریباً رات ساڑھے دس بجے ہم گھر پہنچے۔ نعمان راستے میں ہی اپنی راہ پر گاڑی سے اتر گیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی شازیہ مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ مجھ سے باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے کہا کہ جاؤ تم ابھی سو جاؤ مجھے بھی نیند آ رہی ہے صبح باتیں ہوں گی۔ میں فوراً اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ صبح اٹھا تو مجھ پر بس ایک ہی دھن سوار تھی جا کر نوشی سے ملوں نہ جانے اب وہ کیسی ہے میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ابو کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے۔

بیٹے کیا بات ہے؟ تم بہت اداس معلوم ہو رہے ہو۔ تم نے کسی سے بات تک نہیں کی۔ خاص طور پر امی کے ساتھ تمہارا رویہ عجیب ہے لگتا ہے ابھی تک تم امی سے ناراض ہو بیٹے دیکھو جو ہو چکا سو ہو چکا۔ اب ان کے لئے اپنے دل میں نفرت مت رکھو وہ آخر تمہاری ماں ہے۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا آخر بات کیا ہے۔ ابو نے مجھے خاموش کراتے ہوئے کہا۔ ماموں سے کہیں لڑائی تو نہیں ہو گئی تھی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا جانتے کیوں نہیں یا عبد آخر وجہ کیا ہے۔ کہ یوں عورتوں کی طرح روئے جا رہے ہو۔ بھلا بتاؤ تو سہی کہ کیا بات ہے۔ اگر تمہارے ماموں نے وہاں تمہارا خیال نہیں رکھا تو مجھے بتاؤ میں اس سے بات کروں گا۔ یا تمہیں وہاں کوئی اور تکلیف ہو تو بتاؤ۔ میں اب کی بار تمہیں کویت نہیں جانے دوں گا۔ لیکن پتہ بھی تو چلے کہ وجہ کیا ہے اس طرح روتے رہنے سے کیا فائدہ۔

جواب عرض لاہور

اپریل ۱۹۸۳ء

تب وہ خود ہی ہنستے ہوئے بولے۔
اچھا تو اب میں سمجھ گیا۔ میں بھی کہوں آخر بات کیا ہے جو میاں ساجد سیدھے سیدھے بتاؤ اس لئے رو رہے ہو تاکہ میری شادی جلد کر دیں۔ فکر نہ کرو بیٹے ہم بہت جلد تمہارے ماموں سے شادی کی تاریخ لے کر راشدہ سے تمہاری شادی کر دیں گے۔ یہ سنتے ہی میں پھوٹ پڑا۔

ابو میں راشدہ سے شادی ہرگز نہیں کروں گا۔ ابو نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

کیوں کیا وجہ!

بس ابو کہہ جو دیا ہے کہ میں یہ شادی ہرگز نہیں کروں گا۔ میں اگر شادی کروں گا تو صرف نوشی سے! جس کے متعلق میں نے آپ کو خط بھی لکھا تھا۔ ابو ایک دفعہ پھر حیرت سے بولے

کونسا خط! مجھے تو تمہارا کوئی خط موصول نہیں ہوا اور نہ ہی تمہاری والدہ نے میرے ساتھ تمہارے کسی خط کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر اب تو ہم راشدہ سے تمہاری منگنی بھی کر چکے ہیں۔ ابو توڑ دیجئے یہ منگنی میں کسی صورت بھی اس شادی کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ابو اگر تمہیں میری خوشیاں عزیز ہیں تو یہ منگنی توڑ دیں۔ میں صرف نوشی سے شادی کروں گا۔ یہ کہتے ہوئے میں اور زیادہ زور سے رونے لگا۔ مجھے قسمت جیسے لفظ سے بہت سخت نفرت ہو چکی تھی۔ کیونکہ یہ میرے اوپر کسی صورت مہربان نہ تھی اگر ابو کو میرا تحریر کردہ خط مل جاتا تو وہ یقیناً میری نوشی سے منگنی کرتے۔ مجھے نعمان کا خیال آگیا وہ خوش قسمت تھا کہ اسے اس کی محبت ملنے والی تھی لیکن میں کس قدر بدقسمت تھا کہ . . . .

دیکھو ساجد اتنے جذبات سے کام نہ لو۔ بعض اوقات انسان جذبات میں آ کر غلط فیصلے کر لیتا ہے۔ لیکن میں اسے اپنے کئے ہوئے فیصلوں پر پچھتانا پڑتا ہے۔ تم مجھے صحیح صورت حال سے آگاہ کرو کہ راشدہ سے شادی پر تم کیوں رضامند نہیں اور نوشی سے شادی کے لئے اس قدر بضد کیوں ہو! جبکہ راشدہ سے تمہاری منگنی بھی ہو چکی ہے۔

ابو راشدہ سے میری منگنی امی جان اور آپ کی مرضی سے ہوئی ہے نا کہ میری مرضی سے حالانکہ آپ کو چاہئے تھا کہ آپ اس کام میں میری رائے ضرور لیتے کیونکہ زندگی مجھے گزارنا تھی نا کہ آپ لوگوں کو۔ اور پھر آپ کا ہی یہ دعویٰ ہے کہ میں اولاد کی مرضی کے خلاف اپنے فیصلے نہیں ٹھونسنا چاہتا۔ آپ تو اس بات پر قائل تھے کہ اولاد کی رائے سے جو کام ہو بہتر ہوتا ہے مگر اب آپ کا یہ دعویٰ کدھر گیا کہ آپ نے مجھ سے رائے لئے بغیر میری زندگی کے اہم کا فیصلہ کر دیا یہ کہاں کا انصاف ہے میں نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

تو ابو شرمندہ ہوتے ہوئے بولے۔ بیٹے ہوئی تو مجھ سے واقعی غلطی ہے لیکن یہ میرے اکیلے کا قصور نہیں تمہاری امی نے مجبور کر دیا تھا۔ ساجد کے آنے سے پہلے اس کی منگنی راشدہ سے کر دی جائے میں نے اس سے تمہاری منگنی پر تمہاری رائے لینے کے لئے کہا تو اس نے مجھے تمہارے ماموں کا خط دکھایا لکھا تھا بھائی جان (میرے ابو) آپ کو خوشی ہو گی کہ ساجد بھی راشدہ سے شادی پر رضامند ہے کیونکہ میں نے اس سے بات کی تو وہ خاموش رہا۔ جس کا مطلب ہاں ہوتا ہے آپ سے عرض ہے کہ آپ ہمارے آنے تک ساجد اور راشدہ کی منگنی کر دیں تاکہ پاکستان پہنچتے ہی ان کی شادی کی جا سکے۔ میں خط پڑھنے کے باوجود بھی یہ کہتا رہا کہ ساجد آئے گا تو پھر یہ کام کر لیں گے۔ لیکن تمہیں معلوم ہی ہے کہ تمہاری والدہ کس قدر ضدی عورت ہے اس کے علاوہ مجھے تمہارا خط بھی نہ مل سکا۔ اس لئے میں نے مجبوراً تمہاری منگنی راشدہ سے کر دی۔ جس میں زیادہ تر ہاتھ تمہاری والدہ کا ہے۔

تو پھر امی سے ہی کہئے کہ وہ راشدہ سے شادی کر لیں میں نے ہچکیاں لیتے لیتے کہا۔

ابو میری اس بات پر ہنس پڑے اور بولے بیٹے وہ تو میرے ساتھ شادی کر چکی ہے۔ میرا بھی کچھ خیال رکھو اور یہاں تم مجھے نوشی کے متعلق بتاؤ کہ آخر اس میں کیا خوبی ہے کہ وہ راشدہ میں نہیں۔ میں نے ابو کو نوشی سے اپنی پہلی ملاقات سے لے کر آخری ملاقات تک اور اس کے والدین کا اخلاق بتایا اور آخر پر جب میں نے نوشی کے والد صاحب کا نام اور ایڈریس اباجان کو بتایا تو وہ کچھ اس طرح چونکے جیسے انہیں پہلے سے جانتے ہوں۔

ابا جان تم اس فضل دین کی بیٹی کا ذکر کر رہے ہو جو ہمارے گھر بھی آیا تھا۔

ابا اسکل فضل ہمارے ہاں واقعی آئے تھے ابو ایک دم افسردہ ہو گئے تھے اور بولے

ہاں بیٹے وہ آیا تھا اس دن میں ہی گھر میں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں آپ کے پاس ایک امید لے کر آیا ہوں۔ میری ایک بیٹی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے اپنی بیٹی بنا لیں۔ مگر افسوس اس وقت تک ہم تمہاری منگنی راشدہ سے کر چکے تھے اس کے علاوہ تمہاری والدہ نے اس بیچارے کو خوب بے عزت کر کے گھر سے نکالا اس نے اسے جب کہا کہ بڑے میاں کہیں اور جگہ کی راہ لو ہم تو ساجد کی منگنی اس کی ماموں زاد راشدہ سے کر چکے ہیں۔ یہ سننا تھا کہ فضل دین بہت افسردہ ہو گیا مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ مایوس ہو کر واپس لوٹتے ہوئے آہستہ آواز میں کہہ رہا تھا۔ میں تو بہت امیدیں لے کر آیا تھا۔ لیکن اس کی قسمت داد دی۔ قسمت! تو کس قدر بے رحم ہے اب اس بیچاری کا کیا حال ہوگا۔ میں اس وقت اس کی باتیں نہیں سمجھ سکا تھا۔ لیکن اب سمجھا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کاش وہ چند روز قبل آ جاتا یا تمہارے خط ہی مجھے مل چکے ہوتے۔ یہ کہتے ہوئے ابو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آہ وہ اپنی بیٹی کی خوشیوں کی بھیک مانگنے آیا تھا مگر مایوس لوٹا۔

کاش میں اس وقت سمجھ سکتا کہ اس کی اکلوتی بیٹی کی خوشیاں میرے ساجد سے وابستہ ہیں ورنہ بیٹیوں والے بہت کم کسی کے گھر جا کر کہتے ہیں کہ میں اپنی بیٹی کا رشتہ تمہارے بیٹے کو دینا چاہتا ہوں۔ آنسو آنکھوں سے نکل کر ابا جان کے گالوں پر ڈھلک گئے اور وہ جذبات سے رندھی ہوئی آواز میں بولے۔

ساجد بیٹے مجھے معاف کر دو۔ میں آج ہی اس منگنی کو توڑنے کا اعلان کرتا ہوں۔ اور پھر فضل دین کے گھر جا کر اس سے معافی مانگوں گا۔ اور اس کے سامنے اپنا دامن بھی پھیلاؤں گا۔ تب اچانک تڑاخ سے دروازہ کھلا اور امی اندر داخل ہوئیں ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی چیخ پڑیں۔

میں کہتی ہوں کہ منگنی توڑنے کا اعلان کرنے سے پہلے میرا گلا گھونٹ دو۔ میرے جیتے جی یہ سب کچھ نہیں ہو سکے گا۔ میں اپنے بھائی کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ اور میرا بھائی و بھاوج کو کیا منہ دکھا سکے گا اس لئے تم یہ اپنی مہربانیاں کہیں اور آج ذرا سے بہلا دے رہے ہو کہ اس کی بیٹی سے بیٹے کی منگنی کرنے تو رہے ہو۔ میں یہ ہرگز برداشت نہ کر سکوں گی میں کہتی ہوں پہلے میرا کام تمام کر دو تب امی نے روتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولیں

تم میرے مرنے کے بعد بھی اس موئے کی محبوبہ کو گھر لانا۔ ایک تو یہ آج کل کے لونڈے سے جیسے لبڑ میں ہیں اور عشق بازیاں پہلے شروع ہو جاتی ہیں۔ اپنے آپ کو رانجھا، مجنوں اور مہیوال کے رشتہ دار سمجھنے لگتے ہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ میں تو بس کسی ہیر، لیلیٰ یا سوہنی سے ہی شادی کروں گا۔ والدین کی عزت ملے خاک میں انہیں تو والدین کا ذرا برابر پاس نہیں ہوتا انہیں تو یہ جو کرے اپنا دشمن سمجھنے لگتے ہیں۔ حالانکہ ان کے لئے اتنے جتن کرتے ہیں۔ میں تم دونوں کی تمام گفتگو سن چکی ہوں۔ میں دیکھتی ہوں تو کیسے انکار کرتا ہے۔ جانے کیا ہے نوشی کو خدا دے یہ اسقدر اس کا دیوانہ ہوا جا رہا ہے آخر ہماری بھی کوئی زبان ہے۔ موئے تجھے ہماری عزت و بے عزتی کا ذرا برابر بھی خیال نہیں کیسے بتاؤ مجھے راشدہ میں کیا کمی ہے۔ کہ تم اس سے شادی کو تیار نہیں۔ کیا وہ خوبصورت نہیں اندھی ہے یا وہ لنگڑی ہے۔

امی راشدہ چاہے لاکھ خوبصورت کیوں نہ ہو۔ میں اس سے شادی کے لئے کسی صورت رضامند نہیں ہوں۔ میں نے ان کی بات کاٹ کر کہا

تب امی نے ایک زوردار تھپڑ میرے گال پر رسید کیا اور مزید بپھرتے ہوئے بولیں زبان بند رکھ بدتمیز یہ سب تمہارے والد کی وجہ سے ہے جو تم اس قدر زبان دراز ہوتے جا رہے ہو۔ ہم نے تجھے پالا پوسا۔ بڑھاپا جوان کیا اور آج تم پر ہمارا کوئی حق ہی نہیں۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکوں گی۔

تمہیں یہ سب کچھ برداشت کرنا پڑے گا بیگم۔ تمہیں اپنے بیٹے کی خوشیوں کی خاطر یہ سب باتیں برداشت کرنا ہوں گی۔ میں اب دو دلوں کے ارمانوں کو کچلنے نہ دوں گا میں ابھی تمہارے بھائی کو جا کر بتاتا ہوں کہ وہ راشدہ کی شادی کہیں اور کر دے

اور وہاں سے آتے ہی نفضل دین کے گھر جاؤں گا تاکہ میں اس
سے اپنے بیٹے کی خوشیاں مانگ سکوں۔ یہ کہہ کر ابا جان اٹھ کھڑے
ہوئے اور چند لمحوں بعد ہی وہ ماموں اعجاز کے گھر روانہ ہو گئے
امی میرے کمرے سے نکل کر باہر صحن میں بری طرح رو رہی
تھیں۔ مجھے امی کی کوئی پرواہ نہ تھی میں خوشی سے اچھل کر بستر
سے اترا غسل کیا اور جلد جلد لباس تبدیل کرکے بریف کیس
کھولا جس میں میں نے نوشی کے لئے ایک خوبصورت ساڑھی
کویت سے خرید کر رکھی تھی میں نے اسے نکالا اور لے کر
نوشی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ نوشی یقیناً میرے اس تحفے
کو بہت پسند کرے گی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا تو مسرت
کی ایک لہر میرے پورے وجود میں دوڑنے لگی۔ یہ خوشی اس
لئے بھی تھی کہ میں نوشی کو ایک عرصہ دراز کے بعد ملنے جا رہا تھا
اور پھر اس کے لئے یہ خوشخبری بھی کہ جلد ہی ابا جان اسے میرے
لئے ہمیشہ کے لئے مانگنے گھر آ رہے ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں
نوشی اور اس کے والدین سے معافی مانگوں گا اور انہیں بتاؤں گا
کہ جو کچھ اس سے قبل ہوا ہے اسے بھول جائیں کیونکہ یہ سب
کچھ میری لاعلمی میں ہوا تھا۔ اور یہ میرے والدین کی غلطی ہے۔
جس کی تلافی میرے والد صاحب کرنے والے ہیں۔

انہی خیالوں میں گم میں نے نوشی کے دروازے پہ دستک
دی لیکن کسی نے دروازہ نہ کھولا میں نے ایک مرتبہ پھر دستک دی
مگر جواب نہ آیا۔

تب میں بلا اجازت اندر داخل ہو گیا لیکن یہ کیا، اندر
کا منظر دیکھ کر میرے ہواس جواب دینے لگے۔ نوشی سامنے
ہی چارپائی پر آنکھیں موندے پڑی تھی اس کے سرہانے اس
کی والدہ اس کا سر دبا رہی تھی۔ ساتھ والی چارپائی پر نوشی
کے والد صاحب، سر جھکائے بیٹھے تھے

میں نے سلام کیا تو دونوں نے بیک وقت چونکتے ہوئے
میری طرف دیکھا۔ دونوں کے منہ سے صرف ایک ہی بات
نکل سکی۔

"ساجد تم!"

اس کے بعد دونوں خاموش ہو گئے۔ نوشی کے والد
کی بوڑھی آنکھوں سے دو بڑے بڑے آنسو نکلے اور ان کے
جھریوں بھرے گالوں پر سے لڑھکتے ہوئے نیچے زمین پر
گر پڑے جنہیں مٹی نے خاموشی سے اپنے اندر جذب کر لیا

نوشی ابھی تک اسی طرح آنکھیں بند کئے پڑی تھی اس کا
چہرہ بہت زرد پڑ چکا تھا۔ اس کی سمندر کی سی گہری آنکھیں اندر
کو دھنس گئیں تھیں اور اس کے قدرتی گلاب جیسے شگفتہ
ہونٹ آج خاموش تھے۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرا سب کچھ
لٹ گیا ہے۔ میرے دل کے گلستان پہ خزاں چھا گئی۔ میں
چیخ اٹھا یہ نوشی کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا ہو گیا ہے اسے الکل
بولو تم بتاتے کیوں نہیں۔

جواب میں صرف نوشی کی والدہ کی بے چین آنکھوں سے
بے شمار آنسو بہہ کر نوشی کے گالوں پہ گر پڑے لیکن نوشی نے
تب بھی کوئی حرکت نہ کی۔ اس کی والدہ نے پہلے نوشی کے چہرے
سے اپنی آنکھوں سے گرنے والے آنسو صاف کئے اور بعد میں
اپنا چہرہ صاف کیا تب نوشی کی والدہ نے اپنا منہ نوشی کے کان
کے قریب لے جاتے ہوئے کہا

نوشی اٹھو دیکھو تو بھلا کون آیا ہے۔ نوشی نے تب بھی
آنکھیں نہیں کھولیں۔ اس کی والدہ نے دوبارہ اونچی آواز
سے کہا۔

نوشی اٹھو دیکھو ساجد آگیا ہے۔

تب آہستہ آہستہ نوشی کی پلکوں کو تھوڑی سی جنبش ہوئی
شاید وہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر کمزوری
اس قدر تھی کہ کوشش کے باوجود نوشی کی آنکھیں نہیں کھل
رہی تھیں۔ میں ابھی تک ساکت و جامد کھڑا تھا۔ سمجھ
میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں کہ نوشی نے بمشکل آنکھیں کھولیں
چند لمحوں تک وہ مجھے حیرت سے دیکھتی رہی۔ جیسے اسے
میری وہاں موجودگی کا یقین نہ ہو۔ اور پھر اچانک وہ اٹھ
کر بیٹھ گئی۔ تم نے بہت دیر کر دی ساجد۔ میں نے اس کی
کمزور سی آواز سنی اور اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ وہ مجھ
سے ہنس ہنس کر کہنے لگی۔

ابو دیکھا میں کہتی تھی کہ ساجد ضرور آئے گا۔ نوشی کے
والدین کے چہرے پر ایک مسرت بھری لہر ابھری جو
فوراً ہی غائب ہو گئی۔

نوشی بڑی بے تابی کے ساتھ باتیں کئے جا رہی تھی جیسے وہ
مجھ سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہو۔ وہ اپنی ماں اور باپ کا

جواب عرض لاہور
اپریل ۸۳ء

خیال کئے بغیر مجھ سے بہت سی باتیں کئے جا رہی تھی اس کی یہ حالت دیکھ کر بے اختیار میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں مجھے روتا ہوا دیکھ کر وہ اچانک پیچھے ہٹ گئی اور بولی

ساجد تم کیوں رو رہے ہو میں تو ابھی زندہ ہوں۔ میں تو تمہارے آنے تک زندہ ہوں۔ میں تو ابھی تک جی رہی ہوں بھلا تم کیوں رونے لگے۔ خدا تمہیں سدا خوش رکھے۔

لیکن نوشی یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ یہ بہار کے موسم میں ہی مر اس طرح آ گئی ہے۔ بولو نوشی بولو۔ تم بولتی کیوں نہیں۔ آخر تمہاری یہ حالت کیوں ہوئی ہے

نوشی نے ایک زور کا قہقہہ لگایا اور بولی۔ پگلے میں تو بالکل تندرست ہوں۔ بھلا مجھے کیا ہوا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے

دراصل یہ میری غلطی سے بیٹے۔ نوشی کے والد صاحب نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

انکل آپ ہی بتائیے اسے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

انکل فضل کی آنکھیں ایک دفعہ پھر بھر سے لگیں اور وہ بھی بولی آواز میں بولے بیٹا بات یہ ہے کہ ۔۔۔۔ ان کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

ذرا بتائیے انکل کیا بات ہے میں نے دوبارہ پوچھا۔

ساجد بیٹے میں نے نوشی کو وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو کچھ تمہاری والدہ نے مجھ سے کہا تھا۔ بس اسی دن سے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے جو تم دیکھ رہے ہو آج پہلا موقعہ ہے کہ وہ تمہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھی ہے۔ ورنہ چارپائی پر پڑے پڑے ہر وقت بہکی بہکی باتیں کرتی رہتی ہے۔ اور یہ ہی کہتی رہتی ہے وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا اس نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے وہ میرا ہے وہ ضرور آئے گا۔ ساجد آؤ گے ناں ہاں مجھے یقین ہے کہ تم ضرور آؤ گے۔ بھلا تم مجھے کس طرح بھول سکتے ہو۔ اور بعض اوقات آنکھیں بند کئے کہنے لگتی ہے۔ امی وہ دیکھو ساجد آ رہا ہے ابو وہ دیکھو ساجد آ رہا ہے میں نے کہا تھا ناں کہ وہ ضرور آئے گا۔ لو وہ آ گیا اسے تو بس تمہارا ہی انتظار تھا۔

نوشی کی والدہ نے اسے دوبارہ لٹا دیا۔ نوشی نے پوری طرح آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بے جان سی مسکراہٹ ابھری اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنے قریب ہونے کو کہا۔ میں اس کے مزید قریب ہو گیا اور اپنا کان اس کے منہ کے قریب کر دیا نوشی بے جان اور مریل سی آواز میں بولی۔

ساجد میں نے اپنے تمام وعدے پورے کر دیئے مجھے بھول جانا لیکن اپنے آپ کو بھی مت بھول جانا۔ تم ضرور ملنے آئے میں نے آخری سانس تک تمہارا انتظار کیا لیکن تم نے بہت دیر کر دی ہے میری چند سانسیں اور مرنے کے بعد میری روح تمہاری امانت رہے گی میرا کہا نہ کرنا۔ راشدہ سے شادی کر لینا۔ اگر تمہیں خدا نے کوئی بیٹا دیا تو اسے اپنے وطن کی حفاظت کے لئے پاک فوج میں بھیجنا اسے اپنے دشمن کی پہچان ضرور کرانا اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا

نوشی تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ اٹھو دیکھو تو بھلا میں کویت سے تمہارے لئے ساڑھی لایا ہوں۔ میری بات کو سن کر وہ ہنسی اور بولی تم کو میرا کس قدر خیال ہے تم میرے لئے اتنی دور سے اور غیر ملک سے ساڑھی لائے کاش تم اپنے وطن سے میرے لئے کفن بھی لے۔ ۔ ۔ ۔ نوشی اپنا جملہ بھی مکمل نہ کر سکی اور اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ باقی تھی۔ میں نے زور سے ایک چیخ ماری اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑنا چاہا۔ لیکن مجھے اس کے بعد کچھ یاد نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں اپنے گھر اپنے کمرے میں پڑا تھا۔ میرے ابو امی اور شازیہ کے علاوہ ایک ڈاکٹر مجھ پر جھکا ہوا تھا مجھے یاد آیا کہ میں نوشی کے پاس بیٹھا تھا۔ میں یک لخت چلا اٹھا نوشی کہاں ہے۔ تم مجھے وہاں سے کیوں لائے میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دے رہا تھا امی زور زور سے رو رہی تھیں اور بولیں بیٹے مجھے معاف کر دو۔ میں نے امی کی پرواہ کئے بغیر کہا۔ ابو مجھے نوشی کے پاس لے چلو میں نوشی سے ملنا چاہتا ہوں۔ تب ابو میرے قریب بیٹھ گئے اور بولے۔ اب تم کبھی بھی نوشی سے نہ مل سکو گے کیوں ابو کیوں میں نے چیخ کر کہا تو ابو بولے بیٹے اسے بھول جاؤ وہ اب اللہ کو پیاری ہو چکی ہے اسے کل ہی دفنا بھی آئے ہوں گے۔

نہیں ایسا نہیں ہو سکتا یہ سب جھوٹ ہے میں نے چیخ ماری اور جب دوبارہ مجھے ہوش آیا تو ڈاکٹر جا چکا تھا۔ ابو بہت تھک گئیں

جواب عرض ضرور

حالت میں میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے ۔ میری چھوٹی بہن شازیہ رو رہی تھی تب مجھے امی کی آواز سنائی دی ۔

مجھے معاف کر دو بیٹے مجھے معاف کر دو میں بہت گنہگار ہوں ۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تم دونوں اسقدر محبت کرتے ہو مجھے معاف کر دو بیٹے ۔ تم جہاں ہو گے میں وہیں تمہاری شادی کراں گی صرف ایک بار کہہ دو کہ میں نے تمہیں معاف کیا پھر شاید میرا خدا بھی مجھے معاف کر دے ۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی ہے امی کی کسی بات کا بھی مجھ پر اثر نہیں ہو رہا تھا ۔ تب میری بہن شازیہ مجھ پر جھک گئی اور روتے ہوئے بولی ۔

بھائی جان اب اٹھ بھی جایئے نا ۔ آپ امی کو معاف کر دیں وہ کل سے رو رہی ہیں ۔ میں نے بے دلی سے اٹھ کر اپنی بہن کو گلے لگایا اور اسے خاموش ہونے کے لئے کہا ، تو وہ دوبارہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی ۔ بھائی جان آپ امی کو معاف کر دیں بھلا ان کا کیا قصور ہے آپ کی قسمت میں ہی یہی لکھا تھا باجی نوشی کو امی نے تو نہیں نا اللہ میاں کے پاس بھیجا ۔

نوشی کا نام سنتے ہی مجھے کویت آنے والا خواب یاد آ گیا جس کی تعبیر نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا تھا ۔ آہ اس خواب کی تعبیر کس قدر بھیانک تھی ۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہی نوشی کا قاتل ہوں ۔ پھر مجھے نوشی کی وہ تمام باتیں یاد آنے لگیں جو اس نے آخری وقت میں کہیں تھیں

تم نے بہت دیر ...... میرا غم نہ کرنا ..... راشدہ سے شادی ..... اپنی خوشیوں کو .... تمہیں میری قسم ساجد میری خوشی کے لئے ہمیشہ ..... اور دیکھو میرے ابو کی بھی ایک خواہش تھی جس کا ذکر انہوں نے تمہارے ..... اگر خدا نے تمہیں کوئی بیٹا دیا ..... تمہیں اس کا اجر اللہ .... کاش تم میرے لئے اپنے وطن سے کفن .....

اور دیکھو میرے ابو کی بھی ایک خواہش تھی ۔ جس کا ذکر انہوں نے تمہارے ساتھ کیا تھا ۔ اگر خدا نے تمہیں کوئی بیٹا دیا تو اسے اپنے عظیم وطن کی حفاظت کے لئے پاک فوج میں بھیجنا ۔ اسے اپنے دشمن کی پہچان ضرور کرانا ۔ اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا ۔ راشدہ سے شادی کر لینا کیونکہ اس سے تمہاری منگنی ہو چکی ہے ۔ نوشی کی یہ دونوں باتیں ایسی تھیں کہ بار بار میرے ذہن میں گھوم رہی تھیں ۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے نوشی نے اپنے والد صاحب کی خواہش کا ذکر کر کے مجھے احساس دلایا کہ یہ عظیم خواہش صرف اس کے والد کی ہی نہیں بلکہ یہ خواہش اس کی اپنی بھی ہے ۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں نوشی کی اس عظیم خواہش کو پورا کرنے کے لئے راشدہ سے شادی ضرور کروں گا ۔ کیونکہ یہ بھی نوشی کی ہی خواہش تھی کہ راشدہ سے شادی کر لینا ۔

چند دن گزرنے کے بعد ایک روز میں سونے لگا تو امی میرے کمرے میں آ گئیں ۔ آتے ہی بولے بیٹے لگتا ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا ۔ تم اب بھی مجھ سے دور دور رہتے ہو جو ہونا تھا سو ہو چکا ! خدا کے لئے اب مجھے معاف کر دو ۔ اور بولیں بیٹے اب تم جہاں کہو گے میں وہیں تمہاری شادی کروں گی اب میں تمہاری مرضی کے مطابق تمہاری پسند کی شادی کروں گی ۔

نہیں امی اب میں اپنی پسند سے نہیں بلکہ آپکی پسند سے شادی کروں گا امی نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا کیا تم راشدہ سے شادی کے لئے رضامند ہو ۔ میں نے ایک اداس سی مسکراہٹ سے کہا ہاں میں رضامند ہوں ۔ میرے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی امی خوشی سے اٹھ کر میرے کمرے سے نکل گئیں صبح ہی امی جان ماموں کے ہاں ماموں کو دوبارہ میری اور راشدہ کی شادی پر راضی کرنے چلی گئیں کیونکہ ابو ماموں کے گھر جا کر منگنی توڑنے کا کہہ آئے تھے

تقریباً اس سے ایک ماہ بعد میری شادی راشدہ سے ہو گئی ۔ شادی سے ایک روز پہلے امی اور ابو نوشی کے والدین کے گھر گئے دونوں نے ان سے معافی مانگی اور شادی پر آنے کی دعوت دی وہ لوگ کسی طور مانتے نہ تھے ۔ غم سے دونوں میاں بیوی کا برا حال تھا امی اور ابو کی منت سماجت سے وہ شادی پر آ گئے وہ بہت اداس تھے انہوں نے مجھے حوصلہ دیا ۔ آج میری شادی کو تین برس ہو چکے ہیں ۔ میری بیوی راشدہ میرا بہت خیال رکھتی ہے ۔ میرے دو بہت پیارے بچے ہیں ایک بچی اور ایک بچہ ہے جسے میں بہت محبت سے پال رہا ہوں ۔ تاکہ وہ جوان ہو کر نوشی اور اس کے والد کی خواہش کی تکمیل کر سکے تو نوشی کی روح کو سکون مل جائے ۔ لیکن ابھی تو میں خود سکون کا متلاشی ہوں ۔ میرے پاس بے شمار دولت ہے کاروبار ہے ماموں کی دی ہوئی کار ہے لیکن یہ سب چیزیں مجھے وہ سکون نہیں دے سکتیں جو مجھے نوشی کی قبر پر جا کر حاصل ہوتا ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ کبھی کبھی کار میں بیٹھ کر نوشی کی قبر پر چلا جاتا ہوں ۔

مجرم کون
تحریر فضل حمید

محترم و قبلہ جناب ایڈیٹر صاحب!

آداب ... زیر نظر میری پہلی کاوش ... "مجرم کون"... حاضرِ خدمت ہے۔ یہ کہانی کوئی افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے۔ میں نے جواب عرض کی پالیسی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اپنی اس کاوش کے مقامات اور کرداروں کے نام وغیرہ بالکل نہیں بدلے، بلکہ سب کچھ من و عن بیان کر دیا ہے، یہاں تک کہ میں نے اپنا بھی اصلی نام ہی استعمال کیا ہے، وہ اس لیے کہ یہ میری اپنی ہی آپ بیتی ہے نا ...

شہزادہ جی ... آپ ہی کے نومبر ۱۹۸۱ء کے جواب عرض میں محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ کی آپ بیتی بعنوان ... "زمین کا بوجھ" پڑھنے کے بعد مجھ پر جو کچھ بیتی، اسے سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ میں کوئی مستقل قلم کار یا ادیب تو نہیں ہوں، اس لیے میری اس تحریر میں بیشمار خامیاں ہو سکتی ہیں، اگر یہ آپ کے معیار کو تھوڑا سا بھی اپیل کرے تو اس کی نوک پلک آپ خود ہی سنوار لیجیے گا ...

شہزادہ صاحب! میں پوری امید کرتا ہوں کہ اس کہانی کو آپ اگلی قریب ترین اشاعت میں جگہ دے کر محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ کو اس بات کا موقعہ فراہم کریں گے کہ وہ مجھے اصل حالات سے فوری طور پر آگاہ کر سکیں، تاکہ مجھے بھی پتہ چل سکے کہ اصل مجرم کون ہے ... میں ... یا ... محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ ... یا پھر ... یہ معاشرہ ... جو ہم اور آپ سے مل کر بنا ہے۔ اگر آپ کہانی شائع کرنے سے انکار کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ادارہ "جواب عرض" اصل مجرم ہے، جو صرف من گھڑت کہانیاں ہی شائع کرتا ہے ...

میں بڑی شدت کے ساتھ اس کہانی کی اشاعت کا منتظر ہوں ... آخر میں جواب عرض کی دن دگنی ترقی کا خواہاں ہوں۔ اور قارئین کی آراء کا طالب کا رہی ہوں ...

آپ کا خلوص کیش ...

فضل حمید، سیکشن نمبر ۲

(یکم اگست ۸۲ء) سینٹرل جیل دمام۔ سعودی عرب۔

آج میں جیل میں بالکل اکیلا ہوں۔ ایک وقت وہ تھا کہ میرے ارد گرد ہر لمحے یار دوستوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ ہر وقت ہنسی مذاق کی محفلیں جمی رہتی تھیں ... وقت تھا کہ جیسے پر لگا کر اڑا چلا جا رہا تھا۔ ہم سب کے سب بے فکرے اور غم دنیا سے آزاد تھے۔ سوائے وقت پر ڈیوٹی پر پہنچنے اور کھانے پینے کے اور کسی چیز کا فکر نہ تھا آج جب وہ وقت یاد آتا ہے تو میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ کیونکہ وہی دوست، جو میرے ایک اشارے پر اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار رہا کرتے تھے ... اب وہ کبھی میری ملاقات کے لیے بھی نہیں آتے۔

واہ ری دنیا، جو ہمیشہ چڑھتے سورج کی ہی پجاری رہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ یہ سارا قصور کس کا ہے۔ میرا اپنا یا ان لالچی انسانوں کا جو محض چند سکوں کے فائدے کی خاطر اپنے پرچے میں بے بنیاد کہانیوں کو جگہ دیتے ہیں ... اب مجھے جیل میں آٹھ ماہ ہونے کو آ ... ہیں، جبکہ میرا قصور صرف اتنا ہے کہ

اپریل ۸۳ء

جواب عرض لاہور

ایک دن اتفاق سے جواب عرض پڑھ لیا۔ اس کے پڑھنے سے مصائب و آلام کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا جو آج تک جاری ہے جو کچھ بھی وہ صرف میں ہی جانتی ہوں۔ اس کا اندازہ ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جن کے ساتھ ایسا اتفاق پیش آیا ہو۔ یہ آج سے نو ماہ پہلے کی بات ہے کہ ایک روز میں اکبری منڈی (سعودی عرب) کے بازار میں کچھ ضروری سامان خریدنے گیا تھا۔ گھومتے پھرتے ایک بک سٹال میں داخل ہو گیا۔ یہ اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کے بعد روزنامہ جنگ اور ماہنامہ جواب عرض کا نومبر ۸۲ء کا شمارہ خرید لیا

گاڑی میں سامان رکھ کر ہم بازار سے نکل آئے۔ چونکہ گاڑی میرا ساتھی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس لئے میں نے اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ جب گاڑی اس بلڈنگ کے سامنے رکی۔ جس میں ہمارا فلیٹ تھا۔ تو میں بھی اپنے ساتھی سمیت گاڑی سے اتر آیا اور سامان اٹھا کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ فلیٹ میں داخل ہو کر ہم نے سامان رکھ دیا اور میں نے اپنے کمرے کی راہ لی۔ اور بستر پر دراز ہو کر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گیا اخبار سے فارغ ہو کر میں نے جواب عرض کا شمارہ اٹھایا۔ ابھی شروع بھی نہ کرنے پایا تھا۔ کہ میرے ساتھی کھانے کے لئے بلانے لگے۔ کھانا کھا چکنے کے بعد میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا اور دوبارہ "جواب عرض" پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر میں "بلاعنوان" پڑھ ڈالی اور اس کے لئے کوئی مناسب عنوان تلاش کرنے لگا۔ پھر سوچا کہ عنوان تلاش کرنے سے پہلے کہانی کو اچھی طرح پڑھنا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ فیصلہ کیا کہ پہلے پورا پرچہ پڑھ لوں اس کے بعد دوبارہ "بلاعنوان" پڑھنے کے بعد کوئی مناسب عنوان تلاش کروں گا۔ چنانچہ عنوان کی تلاش چھوڑ کر اگلی کہانی پڑھنا شروع کر دی۔ یہ آپ بیتی محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ کی بعنوان " زمین کا بوجھ" تھی کہانی کیا تھی ایک ایسا نشتر تھی کہ جس نے مجھے پوری طرح جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ کیونکہ اس سے پہلے میری نظر میں عورت کے صرف چار روپ تھے۔ عورت ایک ماں ہے۔ عورت ایک بہن ہے۔ عورت ایک بیوی ہے اور عورت ایک بیٹی ہے۔ لیکن جب عورت کا یہ

روپ میرے سامنے آیا۔ تو میں تڑپ اٹھا۔ نیز محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ کے ان الفاظ سے دل کو بہت ہی دکھ ہوا۔

میرا نام نہاد شوہر بوڑھا ہونے کے ساتھ ساتھ ایک آنکھ سے بھی محروم ہے اور دلالی کے ذلیل پیشے سے مجھے چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ کیونکہ میں اس کی کمزوری ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے ہونے والے بچے کی بھی ماں بننے والی تھی میں نے اپنے دل میں یہ تہیہ کر لیا تھا کہ۔

اگر لڑکی ہوئی تو ... تو میں اسے طوائف نہیں بننے دوں گی .... اور اپنی بیٹی کی خاطر اس ماحول سے فرار حاصل کر لوں گی۔ اور اگر لڑکا ہوا تو اسے اچھی تعلیم و تربیت دلا کر شریفانہ زندگی بسر کر لوں گی... لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میں ایک لڑکی کی ماں بن گئی۔ یہ میری زندگی کا سب سے کرب ناک لمحہ تھا.... طوائفیں تو لڑکی کی پیدائش پر جشن مناتی ہیں لیکن ایک میں تھی کہ اس دن بہت روئی

کچھ ہی عرصے کے بعد ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے باعث "بازار حسن" پر پابندی لگا دی گئی مجھے ایک روحانی سی خوشی ہوئی بازار حسن بند ہونے کی وجہ سے گھر کی آمدنی محدود ہو گئی۔ اور میرا دلال نما باپ میری ماں کے تمام زیورات چرا کر بھاگ گیا اور بھائی بھی شادی کر کے والدہ سے بیگانہ سا ہو گیا۔ متواتر حادثات کی وجہ سے والدہ پر دل کے دورے پڑنے لگے اور ایک دن رات کے وقت والدہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے بچھڑ گئیں۔ میرے نام نہاد شوہر نے بھی پولیس کے خوف سے آنا جانا کم کر دیا ہے..... کبھی کبھی وہ پولیس سے نظر بچا کر آ جاتا ہے میں نے کئی بار اس سے کہا ہے کہ

خدا کے لئے تم مجھے چھوڑ دو۔ میں اس زندگی سے تنگ آ چکی ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ

میری بچی مجھے واپس کر دو..... یا پھر میری وہ تمام رقم مجھے واپس لوٹا دو جو میں نے تمہاری ماں اور

لیکن مجھ میں بھی دینے کا حوصلہ ہے نہ رقم واپس کرنے کی ہمت . . . . اور وہ میری اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر میری زندگی میں مزید زہر گھول رہا ہے ۔ ایک بار بھیا نے مجھے کہا تھا ۔

" طلعت تمہارے ماحول کی ابتداء بڑی رنگین ہوتی ہے اور انجام انتہائی بھیانک ہوتا ہے ۔

بھیا کے یہ الفاظ میرے ذہن میں گردش کرتے ہیں ۔ تو ماضی اور حال کے ستم [illegible] جسم میں نشتر سے لگتے ہیں ۔ مجھے اپنے مستقبل [illegible] وہ اتنی مشکل ہے ۔ کیونکہ میری بیٹی بڑی [illegible] ہوتی جارہی ہے اور بہت خوبصورت بھی ۔ میرے [illegible] جو میرے دو سگے ماموں ہیں جو [illegible] ہیں ۔ اور بہت بڑے تاجر ہیں ۔ کئی بار جی چاہا ہے کہ بھارت چلی جاؤں ۔ لیکن میرے حالات اجازت نہیں دیتے اور پھر اپنا پیارا وطن چھوڑنے کو بھی دل نہیں چاہتا لیکن مجھے یہ بھی یقین کامل ہے کہ بھارت جانے کے بعد میری بچی کا مستقبل سنور جائے گا ۔ اور میں بھی گناہوں کی [illegible] سے چھٹکارا حاصل کر لوں گی ۔ کیونکہ میرے دونوں ماموں کے تمام گھر والے شریفانہ ماحول میں رہتے ہیں . . . . . .

میں نے اب فیصلہ ناظمین جواب عرض کی جوابدید پہ چھوڑ دیا ہے ۔ کہانی پڑھنے والوں سے میری ایک درخواست ہے کہ وہ میری رہنمائی کریں . . . . تاکہ ان کے نیک اور مفید مشوروں سے میں اپنی اور اپنی بیٹی کی زندگی کا تعین کرسکوں

یہ سب پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ اگر میں کچھ اور نہ کرسکا تو اپنے ساتھیوں کے تعاون سے امداد ضرور کروں گا ۔ کہ اس مجبور و بے بس عورت کو اتنے پیسے بھیج سکوں کہ وہ اپنے نام نہاد شوہر کو راضی کر سکے اور گناہ کی اس دلدل سے نکل کر اپنی مرضی کی شریفانہ زندگی گزار سکے ۔

چنانچہ دوسرے دن شام کے وقت جب میرے تمام ساتھی اپنے اپنے کام سے واپس آئے اور کھانا وغیرہ کھا کر فارغ ہو گئے تو میں نے سب کو مختصراً یہ کہانی سنائی کہ ایک بے بس و مجبور مسلمان لڑکی کی امداد کے لئے کہا ۔ جس پر میرے کچھ ساتھیوں نے ازحد افسوس کا اظہار کیا اور حسب توفیق امداد کا وعدہ لیا ۔ لیکن کچھ ساتھی بگڑ گئے ۔ بلکہ یہاں تک کہنے لگے کہ یہ طوائف اس طرح اپنے برائے تماش بینوں کو اس طرح مطلع کرنا چاہتی ہے کہ بازار بند ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑا بلکہ اب بھی وہ مذکورہ مقام پر آکر اپنا مطلب پورا کر سکتے ہیں اور طرح طرح کے فضول سوال کرنے لگے ۔ پھر ہم سب نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ اس کو خط لکھتے ہیں کہ اگر وہ حقیقتاً امداد چاہتی ہے تو ضرور جواب دے گی ۔ پھر ہم سب مل کر اس کی امداد کریں گے ۔ کیونکہ اگر ہم سب مل کر ایک ایک ہزار ریال فی کس بھی اکٹھا کرتے تو کسی پر بھی بہت زیادہ بوجھ نہ پڑتا اور اس بے بس عورت کو کم از کم تیس ہزار پاکستانی روپیہ مل جاتا ۔ اس فیصلے کے بعد ہم نے متفقہ طور پر ایک خط کا مضمون تیار کیا اور اس کی تین چار کاپیاں تیار کر لیں ۔ جن میں سے ایک ظہران ائیرپورٹ پہ پوسٹ کر دیا اور دو خطوط پاکستانیوں کو دیئے جو کہ وطن عزیز واپس آرہے ہیں ۔ پاکستانی بھائیوں نے وعدہ کیا کہ کراچی پہنچتے ہی وہ خط پوسٹ کر دیں گے ۔ یہ تمام خطوط پوسٹ کرنے کے بعد ہم شدت سے جواب کا انتظار کرنے لگے

لیکن جب پچیس دن گزر جانے کے باوجود بھی خط کا جواب نہیں ملا تو ہمارے وہ ساتھی جو پہلے ہی اس بات کے مخالف تھے ۔ بات بات پر میرا مذاق اڑانے لگے ۔ اور کہنے لگے کہ ہم یہ کہتے تھے کہ ایک طوائف کبھی بھی اس بات پر راضی نہیں ہوتی کہ وہ شریفانہ ماحول میں رہے ۔ طلعت بھی ایک طوائف ہے وہ گناہوں سے توبہ کرنا نہیں چاہتی ۔ بلکہ اس کہانی کا سہارا لے کر اپنے نئے نئے گاہک پیدا کرنا چاہتی ہے ۔ اب جبکہ اس کا مقصد پورا ہو گیا ہے ۔ تو وہ ہمارے خط کا جواب کیوں دینے لگی ۔ آخرکار بات اتنی بڑھ گئی کہ ہمارے ساتھیوں کے دو گروپ بن گئے اور نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچ گئی ۔ جب ہم تمام ساتھی آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے تو کچھ ساتھی زخمی ہو گئے ہماری

مجرم کون

لڑائی کا سن کر قریب کے لوگ جمع ہو گئے اور زخمیوں کو
گاڑی میں ڈال کر ہسپتال لے گئے۔ خود میرے اپنے دائیں
کان کے قریب زخم آیا تھا اور بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی
بھی ٹوٹ گئی تھی۔ میرے دو ساتھیوں کے سر پھٹ گئے تھے
جن سے خون بہہ رہا تھا اور ایک ساتھی کا بازو ٹوٹ گیا تھا
ہسپتال پہنچے تو چونکہ یہ پولیس کیس تھا اس لئے ڈاکٹر اپنا
کام کرتا۔ ہمیں پولیس کا انتظار کرنا پڑا۔ پولیس رپورٹ مکمل
ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنا کام شروع کیا۔
جیسے ہی ڈاکٹر نے اپنا کام ختم کیا۔ ہم اس خیال سے
اٹھے کہ اب گھر چلتے ہیں۔ لیکن پولیس والے ہمیں اس
وارڈ میں لے گئے جس کے تمام دروازے آہنی سلاخوں کے تھے
وہاں پر موجود مریضوں سے معلوم ہوا کہ یہ وارڈ قیدیوں کے
لئے ہے۔ اس وارڈ کے ارد گرد پولیس کا پہرہ تھا۔ جب
پولیس والے کسی کو باتیں کرتے دیکھتے تو سختی سے منع کر
دیتے۔ خیر جیسے تیسے رات گزر ہی گئی۔ صبح کے وقت
ایک پولیس افسر آیا اور ہر ایک سے دوبارہ بیان لینے
کے بعد چلا گیا۔ تین دن کے بعد ہمیں پولیس سٹیشن لے
گئے۔ پولیس سٹیشن پر دوبارہ پھر بیان لئے گئے۔ لیکن اس
دفعہ پولیس سٹیشن میں ہمارے ساتھ بہت سخت رویہ اختیار
کیا گیا۔ ہمیں سات دن پولیس سٹیشن میں رکھا گیا اور
ہمارے کسی ملاقاتی کو بھی ملنے نہیں دیا گیا۔ ہمیں اپنے تین
ساتھیوں کا جو ابھی تک ہسپتال میں تھے۔ بڑا فکر تھا۔
ساتویں دن پولیس والوں نے ہمیں بتایا کہ ان کی حالت اب
اچھی ہے کیونکہ پولیس نے ان سے بھی آج دوبارہ بیانات
لئے تھے۔ اس سے اگلے دن ہمیں عدالت میں لے جایا
گیا۔ قاضی نے بیانات لئے اور ہمیں واپس پولیس سٹیشن
بھیج دیا۔ پولیس نے ہمارے چار ساتھیوں کو رہا کر دیا
جبکہ ہم تین ساتھی پولیس سٹیشن میں باقی بچ گئے۔
اس سے اگلے دن صبح کے وقت ہم تین ساتھیوں کو دمام
سنٹرل جیل میں بھیج دیا گیا۔ جیل میں ایک مہینہ گزارنے
کے بعد دوبارہ پھر قاضی کے سامنے ہماری پیشی ہوئی۔ اس
دفعہ قاضی نے میرے دو ساتھیوں کو چھ چھ ماہ قید اور
مجھے اس تمام فساد کی جڑ قرار دیتے ہوئے ایک سال
قید کی سزا سنائی۔

جیل کیا ہے۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کا مجموعہ ہے
جس میں انسان بھیڑ بکریوں کی طرح بند ہوتے ہیں۔ [illegible]
کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ یہاں نہ تازہ ہوا [illegible]
ہے نہ روشنی کا۔ سورج کی روشنی کبھی ہفتے دو ہفتے
میں ایک آدھ بار نصیب ہوتی ہے

اب میں سوچتا ہوں کہ کیا کسی کو گناہ [illegible]
نجات دلانا اتنا ہی بڑا گناہ ہوتا ہے کہ اس کے بدلے
جیل کی چار دیواری نصیب ہو۔ جیل میں رہ کر میں
جس کرب سے گزر رہا ہوں اس کا اندازہ بھی لوگ نہ [illegible]
یہاں رہنے کے لئے مناسب جگہ ہے نہ لیٹنے کے لئے
اور نہ ہی روزانہ دھوپ میں نکلنے کا انتظام ہے۔ چاند تارے
جو کہ قدرت کا معمولی عطیہ ہے۔ انہیں دیکھنے کے لئے بھی
آنکھیں ترس گئی ہیں۔ پولیس ہم سے زرخرید غلاموں جیسا
سلوک کرتی ہے۔ سونے جاگنے کے کوئی اوقات مقرر نہیں
ہیں۔ پولیس کا جب دل چاہتا ہے۔ ہمیں سوتے سے جگا
دیتی ہے اور نئے نئے عجیب و غریب حکم جاری کرتی رہتی ہے
جس کی تعمیل ہمارے فرائض میں شمار کی جاتی ہے۔ جیل میں
ریڈیو نہ ہونے کی وجہ سے ہم یہاں وطن عزیز کے حالات سے
بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ جب کوئی ساتھی نیا آتا ہے تو اسی
سے وطن میں پیش آنے والے واقعات کا پتہ چلتا ہے

پچھلے آٹھ ماہ سے گھر والوں کو بھی کوئی رقم نہیں بھیج سکا۔
جب گھر والوں کے خط آتے ہیں کہ بیٹا کیا بات ہے پہلے جو تم
نے ایک دم گھر رقم بھیجنا بند کر دی۔ تو دل خون کے آنسو روتا
ہے۔ گھر والوں کو کیا بتاؤں کہ ایک نیکی کا ارادہ کیا تھا۔ جس
کے بدلے میں ایک سال کی قید نصیب ہو گئی ہے۔

جیل میں میرے دو [illegible] قید تھے۔ وہ اپنی سزا پوری
کر کے [illegible] اور جاتے وقت یہ دھمکی بھی دے
گئے کہ [illegible] تو ہم اس کا سر ضرور کچل دیں
گے۔ [illegible] وجہ سے قید نصیب ہوئی ہے۔ اب
میں بیٹھے [illegible] پریشان ہو کر پہلے ہی ایک سال
قید کی سزا [illegible] جب میں یہ سزا پوری کر کے باہر جاؤں گا
تو پتہ نہیں کہ وہ میرا کیا حشر کریں۔

[illegible] لاہور

[illegible]

افسوس تو اس بات کا ہے کہ جس کے لئے بھاری مصیبت اٹھانا پڑی، اس کا کچھ پتہ نہیں۔ کیونکہ جیل میں سے میں نے بیسیوں خطوط ارسال کئے۔ مگر آج تک محترمہ طلعت نوشاد کی طرف سے ایک بھی خط کا جواب نہیں ملا کہ جس سے کم از کم اس بات کا تو پتہ چلتا کہ محترمہ واقعی گناہ آلود زندگی سے پاکیزہ ماحول اپنانا چاہتی ہیں۔

سوچتا ہوں کہ ایک سال کا عرصہ جو کہ جیل کی نذر ہو گیا۔ اس کے لئے کس کو مورد الزام ٹھہراؤں۔ اپنے آپ کو یا محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ کو یا پھر معاشرے کو

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ فیصلہ کس بنیاد پر ہو

۱۔ اگر دکھی انسانوں کی مدد کرنا جرم ہے۔ تو بے شک میں مجرم ہوں۔ جس کی سزا مجھے مل گئی ہے

۲۔ یا پھر محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ مجرم ہیں۔ جنہیں گناہ آلود زندگی سے چھٹکارہ دلانے کے سلسلے میں مجھے جیل نصیب ہوئی

۳۔ یا معاشرہ جو کہ کبھی بھی کسی دکھی انسان کے اندر جھانک کر نہیں دیکھتا۔

میں ایک بار پھر محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ اور ادارہ جواب عرض سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر ماہ نومبر ۱۹۸۱ء میں شائع ہونے والی کہانی بعنوان "زمین کا بوجھ" سچ ہے تو پھر محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ آج کل کہاں ہیں۔ کیا وہ اب بھی خدا ترس انسانوں سے امداد کی خواہشمند ہیں۔ یا کسی فرشتہ صفت انسان کی مدد سے گناہ آلود زندگی سے چھٹکارا حاصل کر چکی ہے

مجھے آج بھی ان سوالات کے جوابات کا شدت سے انتظار ہے

۱۔ کیا محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ کسی کے مشورے پر عمل کر کے گناہ آلود زندگی سے چھٹکارا حاصل کر چکی ہیں

۲۔ یا ابھی تک اپنے دلال شوہر کے شکنجے میں پھنسی ہوئی ہیں۔

۳۔ محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ بھارت سدھار چکی ہیں یا ابھی تک وطن عزیز پاکستان میں ہی قیام پذیر ہیں

۴۔ کیا۔ انہوں نے اپنے بچھڑے ہوئے بھائی سے ملنے کے لئے کوئی ترکیب نکالی یا نہیں۔

۵۔ اگر محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ آج بھی امداد کی خواہشمند ہیں تو میں رضائے الٰہی کی خاطر ہر ممکن مدد کے لئے تیار ہوں۔ اگر محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ اب بھی مجھے جواب سے نہیں نوازیں گی تو میں ہر ممکن ذریعے کو بروئے کار لا کر جہاں کہیں بھی محترمہ طلعت صاحبہ مل سکیں انہیں تلاش کر کے اگر ممکن ہو سکا تو اس جھوٹ کا مزا ضرور چکھاؤں گا کیونکہ یہ محترمہ طلعت صاحبہ ہی کی مہربانی ہے تو میں زندگی کا ایک قیمتی سال جیل میں گزار رہا ہوں۔

محترمہ طلعت نوشاد صاحبہ، قارئین کرام اور ادارہ جواب عرض سے منت درگزارش کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا [illegible] مجھے صحیح حقائق سے آگاہ کیا جائے۔ میں تا حیات ممنون رہوں گا

ناپسندیدہ کی سزا

پولیس نے جنگی حالات میں قہوے کے استعمال پر پابندی عائد کر دی تھی۔ ایک مرتبہ اس کا گزر ایک مضافاتی گھر کے قریب سے ہوا جہاں ایک شخص قہوہ بنانے کے لئے بن بھون رہا تھا

پولیس نے اس سے کہا کہ نامعقول! تجھے معلوم نہیں کہ قہوہ کا استعمال ممنوع ہے؟ اس شخص نے برجستہ جواب دیا۔ "جناب والا، میں اسی لئے بن کو آگ میں جھونک کر جہنم رسید کر رہا ہوں"

پولیس بے ساختہ ہنس پڑا۔

★

بلاعنوان

قابلِ احترام شہزادہ عالمگیر صاحب!

سلام مسنون... امید ہے آپ بخیریت ہوں گے... میں اس وقت درد کی کیفیت میں ڈوبا ہوا ہوں... کچھ لکھنا چاہتا ہوں مگر الفاظ نہیں مل رہے... چیخنا چاہتا ہوں مگر حلق سے آواز نہیں نکل پا رہی، رونا چاہتا ہوں مگر آنکھوں میں آنسو نہیں... تڑپنا چاہتا ہوں مگر اس کی سکت نہیں... صبر کرنا چاہتا ہوں مگر قوت برداشت نہیں۔ میں کیا کروں، کہاں جاؤں... اپنے غم کو سمیٹ کر اور کس طرح سے دور کروں، میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا...

شہزادہ جی... جواب عرض تک میں اپنے ڈوبتے دل، تھرتھراتے وجود اور لرزتے قلم کا سہارا لے کر پہنچا ہوں... بلاشبہ قارئین جواب عرض نے ہمیشہ میرے درد کو بانٹنے کی کوشش کی ہے اور بڑی حد تک بانٹا بھی ہے۔ جواب عرض کی محفل میں حقیقتاً مجھے سکون ملتا ہے۔ میں جب بھی بے سکونی سی محسوس کرتا ہوں، جواب عرض کی دکھی دنیا میں چلا آتا ہوں اور کیا لکھوں، لکھنے کو کچھ نہ بچا، کہنے کو کچھ نہ رہا۔

شہزادہ جی... میں اپنے پیارے، باوفا پُرخلوص قارئین جواب عرض کو یاد دلا دوں کہ یہ زیرِ نظر کہانی میری اپنی داستان غم ہے... عرصہ تیرہ سال سے میں اپنی کہانی نہیں لکھ پایا تھا اور شاید کبھی لکھتا بھی نہیں۔ لیکن سورج میانی ملتان کی رفعت سلطانہ صاحبہ نے اپنے خط میں ایک الٹا سا سوال کر کے مجھے اپنے دل کا درد لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ محترمہ کہانی کی صورت میں اپنا جواب پا کر مطمئن ہو جائیں گی...

ڈھیروں اور پُرخلوص دعاؤں کے ساتھ... خدا حافظ...

نوٹ: (اپنی تحریر پر روانگی کی تاریخ ضرور درج فرمایا کریں۔ (ادارہ)

اختر رضا تبسم معرفت نعمت کشیدہ کاری اورنگزیب روڈ۔ بیرون دہلی گیٹ۔ ملتان

موت ۵۵ کتنی بھیانک چیز ہے... ہم سب زندگی کی رنگینیوں میں مست ہیں... جب کوئی مر جاتا ہے تو ایک لمحہ کے لیے ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے بھی ایک دن مرنا ہے... کبھی رات کے بیکراں سناٹے میں جب نیند پلکوں سے جدا ہوتی ہے۔ تو طرح طرح کے خیالات و خدشات میں موت کا تصور بھی آ جاتا ہے کہ ایک روز ہم بھی قبر میں لیٹے ہوں گے... تب دہشت سے جان نکلنے لگتی ہے... ایسے میں یہ رنگین اور دلکش دنیا بہت ہی بے وقعت، نامعقول اور بے مایہ سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہم بہت کچھ کرنے کا عہد کرتے ہیں توبہ تائب کرتے ہیں... لیکن پھر دوسرے دن اسی دنیا کی بھول بھلیوں میں کھو جاتے ہیں...

اپریل ۸۲ء

میں جان بوجھ کر کسی انسان تو کیا کسی مردار جانور کو بھی نہیں دیکھا کرتا... جانے میرے دل کو کیا ہو جاتا ہے، مگر لوگ نہ جانے کیسے برداشت کر لیتے ہیں اس کی یادیں ہر لمحہ کھولتی رہتی ہیں دن جوں توں کر کے گزر جاتا ہے... راتیں کیسے گزرتی ہیں... لیکن جب کوئی مر جاتا ہے تو کچھ دن دردناک ہو جاتا ہے... پھر اس سے ملنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں، محسوس ہوتا ہے کہ میرے سینے پر اس کا موم پگھل رہا ہے، یوں لگتا ہے کہ آج سے ہی دیکھا ہے... افسانہ میں اس کے لیے کتنا اداس ہو گیا ہوں۔ جیسے کئی دنوں سے اس نے خط نہیں لکھا۔ جیسے ابھی پلیٹ فارم سے وہ گاڑی گئی ہے جس میں وہ تھی...

جواب عرض لاہور

شکستہ کر کے ان کے گھر کے سامنے بیٹھو لیا جاتے۔ انہیں دیکھنے سے خود بخود پیار ہو جاتا ہے۔ جیسے چھینک آئے تو آنکھیں آپ ہی آپ بند ہو جاتی ہیں ...

اسے دیکھ دیکھ کر میں بو ندبوندبن کر پگھلتا رہا۔ چھت سے نیچے اتر کر میں بیماروں ایسے پڑ رہا ... جیسے میں کسی اندھیرے کنوئیں میں محبوس ہوں۔ میرا کوئی نہیں ہے۔ جیسے کسی نے وعدہ کر کے ایفا نہیں کیا۔ میں اس آگ میں جلنے کے لیے تنہا تھا۔ اور حسن نے اس چتا کو شعلہ دکھایا تھا اسے کچھ خبر ہی نہیں تھی۔ برے وقت میں کون کسی کے کام آتا ہے۔ یک یک شب و روز اتنے ویران ویران ہو گئے تھے۔ محبت کی آنچ بہت تیکھی ہوتی ہے۔ محبت دونوں سمت ہو تو دردِ دل کا سمجھوتہ ہوتا رہتا ہے۔ یک طرفہ چاہت تو آندھیوں ایسی تند ہوتی ہے۔ جس کا کوئی سدباب نہیں ... وہ کسی کھولے ہوئے شعر کی طرح ہی اس پر چھا گئی۔ ہر جتن آزمایا لیکن میں اس کے تصور سے چھٹکارا حاصل نہ کر سکا جیسے آج کل اگر کسی وجہ سے بجلی کا کنکشن کٹوا بھی دیں تو پھر بھی بل آتا رہتا ہے۔ وہ ان اداس گداز شبوں کو گہری نیند سویا کرتی۔ اور میں جاگ جاگ کر ... جب بہو تے سگتے ہوتے تو میں حسرتوں کی گہری اداسی مسلسل برس رہی ہوتی ... [illegible] دروازے پر دستک دیتا میری اداس شام کے بعد مہکتا تر و تازہ سویرا تھی [illegible] رہتی تھی

ایک روز ان کے گھر [illegible] آئے [illegible] وقت وہ حضرت شاہ [illegible] کے مزار پر حاضری [illegible] وہ بھی ان کے ہمراہ تھی ... بے صبر ہو کر تو میں بھی [illegible] پیچھے چل گیا۔ وہ سب دربار کے احاطے میں کھڑے تھے اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ تھوڑا سا مسکرا دی۔

انہوں نے مزار پہ دعا مانگی۔ وہ بھی دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھی۔ اس نے نہ جانے کیا دعا مانگی ... میں نے ایک ہی دعا مانگی ..

اے صاحبِ اختیار کرم کر مجھ پر ... مجھے در د بنا دے .. مجھے کمرہ بنا دے ... تکیہ بنا دے ... آئینہ بنا دے ... کہ درد بن کے اس کے دل میں بس جاؤں۔ کمرہ بن جاؤں تو وہ مجھ میں رہے میں اسے خلوت وجلوت میں دیکھوں تکیہ ہو جاؤں تو وہ مجھ پر شب بھر بال بکھیرا کرے۔ اور اگر آئینہ ہوں تو وہ مجھ میں جھانکا کرے۔ آرائش کرے میں اسے ہمہ وقت دیکھوں .. یہ عذاب ناک کیفیات ختم ہوں ...

پھر واپس گھر آ گئے ... ان روٹھے لمحوں اور معاندانہ رویوں نے جینا دوبھر کر دیا۔ کبھی می اجی کرتا اسے پکڑ کر سامنے بٹھا لوں اور کہوں۔

میرا دل تم رکھ لو یہ تمہارے پاس رہے گا تو خوب پھلے پھولے گا۔ میری کشتی کی بادبان بن جاؤ ... بے سہارا تم نہیں کمزور تو میں ہوں یہ زندگی بذاتِ خود کیا کم غم ہے جو تم اور غم دینے پر مائل ہو۔ خدا کے لیے مجھے دکھ کے اس جہنم سے نکال لو ... میرا دماغ پھٹ جائے گا ... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جتنا تمہیں چاہا ہے اتنا تو کبھی کسی اپنے کی خواہش بھی نہیں کی۔ لیکن اب تک کچھ کہا نہیں تھا ... اس نے کچھ سمجھا نہیں تھا۔ اس نے کبھی کوئی بات نہ کی تھی اس خیال سے کبھی کچھ نہ کہہ سکا کہ عرضِ حال کرنے ایسا نہ ہو۔ اس سے بھی محروم ہونا پڑے۔ وہ روٹھ جاتے۔ دراصل بات یہ کوئی روٹھ جائے۔ تو وہ کبھی راضی نہیں ہوا کرتا۔ مجھے یہ جوا کھیلنا منظور نہیں تھا۔ میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنا بنانا چاہتا تھا۔ اسے بھی اس سوز سے آگہی ہو۔ پھر ہم شادی کریں۔ سنا تھا ایسی رفاقتیں کامیاب نہیں ہوا کرتیں .. مد یا بدیر خمار اتر جاتا ہے۔ لیکن ہم ایسا کر کے دکھائیں [illegible] کہتا ہے کہ تو میرج خالی گیراج ہے۔ جہاں گاڑی نہیں ہوتی [illegible] سپیئر پارٹس بھی نہیں ملتے۔ ہم سارے گلے غلط کر دیتے۔ ایسے دامن باندھ لیتے کہ موت ہی وہ گرہ کھولتی ... لیکن یہ روگ سنبھال لینے والے نہیں ہوا کرتے۔ ان لکیروں کا رنگ مٹا نہیں کرتا۔ انہیں تو بڑھنا ہی آتا ہے۔ پانی جتنا سر کھتا ہے عشق کو اتنا ہی ہریالی میسر آتی ہے۔ اس کے چہرے پہ سکون و اطمینان ہوتا اور یہ کرب و بے چینی گہرے ہو جاتے ... اذیت کے سائے پھیل جاتے۔ وہ مجھے بے طرح یاد آتی۔ بوتل کے جن کی طرح اس کے خیال تھے۔ جو اب واپس جانے پر آمادہ نہ تھے۔ اس جن نے سوچا تھا رہائی دینے والی کو دنیا کا بادشاہ بنائے گا۔ پھر کچھ عرصہ بعد فیصلہ بدل دیا تھا۔

اپریل ۱۹۸۳ء

جواب عرض لاہور

ہو کھلا جائے۔ خوشیوں کے پنچھی فضاؤں میں بکھر گئے۔ کائنات کی لامحدود دنیا میں ہر چیز مسکراتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تو آئی تھی کہ مجھ سے سنبھالے نہ سنبھلتی تھی۔ میرا جسم جو مردہ تھا زندگی کی رعنائیوں سے لپٹ گیا۔ سسکتی روح پرسکون ہو گئی۔ پتہ نہیں میں کب تک اپنے آپ میں گم رہا۔ اب میری حالت بدل چکی تھی... میں جو کبھی بھولے سے بھی نہ ہنستا تھا۔ اب بات بات پر کھل اٹھتا... میرے بچھڑے ہوئے قہقہے پھر سے واپس آ گئے۔ زندگی کی ویران راہوں میں لاکھوں پھول مسکرا کر کھل اٹھے...

وہ روزانہ ہاتھ ماتھے پر رکھ کر سلام کرتی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی پلکوں کی چلمن گر جاتی تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں...

وقت کی کشتی دھیرے دھیرے حالات کے سمندر کی سطح پر کبھی ہراتی کبھی ڈولتی چلتی رہی۔ میں اور شمو... شمو اور میں خاموش محبت کے پرستار اجنبی راہوں پر چلتے رہے۔ وقت گزرتا رہا۔ ہم کبھی ملے نہ تھے... بس تحریروں کے چار دیواری میں محصور رہے تھے۔ ایک دن وہی بچہ پھر اس کا غذ لیے آ گیا۔ میں نے سابقہ بے تابی کے ساتھ پڑھا...

میں آج رات کو دس بجے اپنے مکان کی چھت پر آپ کا انتظار کروں گی... آؤ گے ناں... انتظار کتنا درد ہوتا ہے۔ اس دن محسوس ہوا۔ سورج تھا کہ غروب ہونے کا نام نہ لیتا تھا میں نے اس کی دل ہی دل میں لاکھوں منتیں کیں۔ لیکن وہ میری ملکیت ہوتا تو شاید میں اسے زبردستی کھینچ لیتا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح رات کی دیوی چلی ہی آئی... دس بجے میں شمو سے ملنے اس کی منتخب کردہ جگہ پر پہنچا۔ سیاہ شال میں لپٹی ہوئی حوروں کا تقدس لیے وہ دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ میری حالت ایسی تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ تھا... زبان خشک... حلق میں کانٹے چبھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں گم سم کھڑا ایک ٹک شمو کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چپ تھی۔ یوں ہی کئی لمحے بیت گئے پھر میں اپنے حواس میں آ گیا...

شمو... میری آواز بڑی دھیمی تھی...

جی ہاں جی... جواب میں جلترنگ بجی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آج کی رات کو کیا نام دوں۔ اپنی زندگی کی روشن رات کہوں یا کچھ اور..؟ کوئی نام دیں۔

یہ تو آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔

ہاں شمو..! آج کی رات میری مرضی کی محتاج ہے آج تو چاند بھی آسمان سے اتر کر تمہارے وجود میں تحلیل ہو کر میرا انتظار کرتا رہا ہے۔

میں گہری جھیل کی تہہ میں ڈوب رہا تھا۔ اپنے آپ میری آواز بوجھل ہوتی چلی گئی۔

شمو... میں نے کہا۔

جی... اس نے آہستہ سے کہا۔

میری ہستی تمہاری ہم رہی ہو نا... اب ساتھ تو نہ چھوڑو گی... ہے نا اچھا

ہاؤں... مرتے دم تک نہ چھوڑوں گی۔ کوئی بھلا اپنا آپ کا بھی ساتھ چھوڑتا ہے۔ کبھی پھول سے خوشبو بھی علیحدہ ہوئی ہے.. شمو نے جواب دیا۔

انہی دنوں مجھے جالندھر آباد ایک ضروری کام کے لیے جانا پڑا... وہاں کافی دن لگ گئے۔ میری غیر موجودگی میں شمو کی نسبت میاں چنوں طے ہو گئی تھی۔ میرے وہم میں بھی نہ تھا کہ اس کی شادی یوں جلدی تیار ہو جائے گی۔ میں تو ہوش و حواس کھو بیٹھا...

تم نہ کر دو شمو..! خدا کے لیے انکار کر دو۔ میں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا... ہماری رنگین دنیا کو کس کی ہائے کھا گئی۔ تم کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ گی... شمو مجھے چھوڑ جاؤ گی... تڑپنے کے لیے... سسکنے کے لیے۔ چپ کیوں ہو بولتی کیوں نہیں... تم یہ گوارا کر لو گی.. چپ رہی.. مجبور تھی..

نیندیں حرام ہو گئیں۔ جس کے نصیب سو جائیں اسے بھلا نیند کیا آئے... کلیجہ کٹنے لگا... جی کرتا کہ کپڑے پھاڑ ڈالوں سر کو پاش پاش کر دوں۔

میں ارادے باندھتا رہا... اور توڑتا رہا۔ سوچتا کہیں نکل جاؤں۔ کبھی خیال آتا قلعہ کہنہ کے دمدمے سے کود پڑوں ملتان میں یہی بلند جگہ تھی... ایک ایک ہڈی کے بکھیا سوں ٹکڑے ہوتے۔ دل ایسے ویران ہو گیا کہ ہوا کے جھونکے بھی

واقف تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ میرے لیے یہ کہہ رہی ہے۔ اس قربانی پر تیار ہے۔ لیکن اسے محبت کا یہ المیہ انداز ہرگز پسند نہیں تھا۔ میں یوں منتشر ہو گیا۔ جیسے ہوا چلے اور کسان کی ایلیوں میں سے اچھالی ہوئی گندم میں سے بھوسہ دور دور تک بکھرا چلا جائے۔ یونہی روتے روتے بڑی دیر گزر گئی۔۔۔

میں نے اس کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ اگر میں اس سے کہہ دیتا کہ ٹھیک ہے چپو رات کی رات ہم دور کہیں نکل جائیں گے۔ ایسی جگہ جہاں صرف ہم ہوں گے۔ چھوٹا سا گھر ہو گا۔ ۔۔۔ روکھی سوکھی کھا کر بھی گزارا کریں گے۔۔۔ ابھی میرے پاؤں میں دم ہے۔۔ محبت کے سہارے ہر تنگی ترشی برداشت کریں گے۔۔۔

تو وہ مجھے کتنا کم ظرف سمجھتی۔۔۔ راضی تو ہو جاتی۔ لیکن وہ بہت حساس تھی۔۔۔ عمر بھر ضمیر اسے کچوکے لگاتا رہتا۔ پھر وہ میرا ساتھ بھی نہ دے سکتی۔۔۔

آج رات ہے آخری۔۔۔ آج تم جو فیصلہ کرو مجھے منظور ہے۔ اس کے الفاظ میرے لیے تازیانہ تھے۔۔۔ میں اس کی نظروں سے گر جاتا۔۔۔ تو میرے لیے میری وقعت کیا رہ جاتی۔ اور اپنی نظر سے گر جائے۔۔۔ تو انسان کے لیے سوائے خود کشی کے کوئی ۔۔۔ نہیں ہوتا۔

مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔۔۔ تم اپنے گھر سکھی رہو۔ تقدیر میں یہی تھا۔۔۔ کچھ دن اچھے گزر گئے۔ تمہیں ٹھہرنے کو منزل مل گئی۔۔۔ میرا کیا ہے جیسے تیسے گزارہ کر لوں گا۔۔۔

الفاظ میرے حلق میں پھنس گئے وہ اونچے اونچے سسکنے لگی۔۔۔ شکست اور پھر محبت کی پر آنسو بہانے کے سوا کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔

بادی۔۔۔! تمہیں میری قسم۔۔۔ مجھ سے ایک وعدہ کرو۔۔۔ اس کے لہجہ میں اتنا اضطراب تھا کہ میرا دل بھر آیا۔۔۔ بادی! اداس مت رہنا۔۔۔ اپنا خیال رکھنا۔۔۔ ہو سکے تو اپنا گھر ضرور بسا لینا۔۔۔ اس کی مہک ابھی تک چھائی ہوئی تھی۔

اسی وقت تیاری کی۔ اور ایک دوست کے پاس چلا گیا۔۔۔ میں مرد تھا۔۔۔ لیکن بہت کمزور تھا۔ اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنی دنیا کو لٹتے دیکھوں۔۔۔ مجھ پہ وحشت کا عالم طاری تھا۔ دوست اس کیفیت پر حیرت زدہ تھا۔ اسے میرے اندر کے طوفان کی کیا خبر تھی۔۔۔ رات کا وہ وقت یاد آتا۔۔۔ جب وہ میرے ساتھ ہوتی تھی۔۔۔ تو روح ہونے لگتی۔۔۔ میری آہیں نکل جاتیں۔۔۔ اس کی ہنسی۔۔۔ باتیں۔۔۔ لہجہ میرے اعصاب میں ہلچل مچا دیتا۔۔۔

رات گئے تک باہر پھرتا رہا۔ واپس آیا تو کچھ بھی نہ بچا تھا۔۔۔ چمن اجڑ گیا تھا۔۔۔ ویرانے پہ اداسیاں مسلط تھیں۔۔۔ میں سمجھتا رہا تھا کہ رخصت کیوں آیا۔ بھوک پیاس مر گئی۔۔۔ دن کو بے آرامی۔۔۔ راتوں کا جاگنا۔۔۔ چہرہ بکھرے بال۔۔۔ ذہنی اذیت۔۔۔ ایسا گداز۔۔۔ اب دن ۔۔۔ سے پتہ چلا تھا۔۔۔ زندگی سے دلچسپی نہ رہی۔۔۔ کچھ ۔۔۔ لگتا تھا۔ اپنی ذات سے پہلے ہی تعلق نہ تھا ۔۔۔ جانب توجہ مبذول کی تھی۔ شاید اس کی آنکھوں ۔۔۔ گیا ہو۔۔۔ میں خود سے بیگانہ بن کر رہنے لگا۔ ۔۔۔ لگ گئی۔ زخموں پہ مرہم رکھنے والا کوئی نہ تھا۔۔۔ میں بہت بیمار ہو گیا۔ بے ہوشی میں جانے کیا کیا بکنے لگا۔ بہت کمزور ہو گیا۔۔۔ حکیموں کو بھی مرض سمجھ نہ آتا تھا۔۔۔ دل پہ ہاتھ رکھ کر دیکھتے تو جی میں آتا۔۔۔ کہوں کہ یہاں کیا ہے یہ تو حریم ناز ہے۔۔۔ میرے حضور یہاں ہوں گے۔۔۔

ذرا طبیعت سنبھلی تو حکیم صاحب واپس چلے گئے۔۔۔ شب و روز کے چکروں میں بہل گیا۔۔۔ لیکن اسے بھلا نہ سکا۔ ہوا کے خلاف چلا جائے تو جدوجہد زیادہ کرنا پڑتی ہے کپڑے زیادہ اڑتے ہیں۔۔۔

لاکھ ویران سہی۔۔۔ لیکن دل کی اجڑی بستی میں وہ ضرور آیا کرتی۔۔۔ کتنی بادفا تھی۔۔۔ اس بیاباں کی خبر لیتی رہی۔۔۔ میں سوچتا وہ اپنی دنیا میں مگن ہوں گے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ زندگی کی راہوں پر سرگرم عمل ہو گئی ہے۔۔۔ تو میں اسے کیوں یاد کرتا ہوں۔۔۔ اب کیا رہ گیا ہے۔ اب سوچنے سے حالات سنور نہیں سکتے۔۔۔

جب تک مشغول ہوتا دل قائم رہتا۔۔۔ ورنہ میں ہوتا اور یادوں کے لامحدود سلسلے۔ ایک ایک کر کے اس کی قربت کے تمام لمحات آنکھوں میں گھوم جاتے۔۔۔ دماغ پھٹنے لگتا۔ میں اپنے سینے میں اسے تلاش کرنے لگتا۔۔۔ سوچیں سیلاب کے پانیوں کی طرح ہوا کرتی ہیں۔ ۔۔۔ کسی اور

جناب عرفان لاہور

رفتہ رفتہ راستہ بنا لیتی ہیں۔ . . ندیوں سے ندیاں نکلتی ہیں۔
اور یہ سب مل کر پھر ایک دریائی شکل اختیار کر لیتی ہیں جو
پہاڑوں اور چٹانوں جیسی مضبوطی کو توڑ کر ایک نیا رستہ بنا لیتا
ہے ... آگے چلنے کے لیے راستہ تلاش کر لیتا ہے۔

ایسا ہی آج میرے ساتھ تھا۔ سوچوں کے سمندر میں
غوطہ زن ہوں ... اس کے آگے انسان تو اتنا ہی جو اس
کے نزدیک بے بس ہو کر رہ جاتا ہے ... مجبور ہو جاتا ہے۔
لاچار ہو جاتا ہے ... کچھ کر نہیں سکتا

شب و روز کانٹوں کی سیج بن گئے ... سکون حرام
ہو گیا ... کبھی کبھی پرانے درد بھی اپنے ہو جاتے ہیں۔
یہ تو میرا اپنا تھا ..

اس کی جدائی کے چار ماہ بیت گئے ... سہ پہر کا وقت
تھا۔ دفعتاً محلے میں شور و غل مچ گیا ... بہت سی ملی جلی
رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں .... سبھی قیاس کرنے لگے
کہ ایسا کون بیمار تھا ..

محلے کی ایک عورت گھر میں داخل ہوئی ... کاش اس کی
بات سننے سے قبل آسمان پھٹ جاتا .. میرے کان بند ہو
جاتے .. موت آ جاتی ... "شمو مر گئی" .. جیسی صبح سے
دل ڈوبے جا رہا تھا .. جی چاہا بال نوچ ڈالوں ... اپنا سر
پھاڑ دوں ... کپڑے تار تار کر دوں ... اور قہقہے لگاتا کسی
بیابان میں نکل جاؤں۔

جیسے مجھے سکتہ ہو گیا ... ٹانگوں نے میرا ساتھ نہیں دیا ...
جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ کر دیوار کا سہارا لے لیا ... آنکھوں تلے
اندھیرا چھا گیا۔ حواس گم ہو گئے۔ کیا کروں کس سے لڑ
پڑوں ... چیخ چیخ کر کس کو سناؤں کوئی خبر نہ رہی۔ میں کہاں
ہوں کیا کر رہا ہوں ... مجھے کیا ہو گیا ہے۔ دل اڑا جا رہا تھا
ہر سندر سے جدا ہو گئی تھی۔ اس نے تو کہا تھا میں تجھے ملتی رہوں
گی۔ تمہارے بغیر زندگی گزارنا نہیں کاٹنا ہو گی۔ تمہارے بغیر
دل نہیں لگے گا۔ وہ تو اپنی خوشیاں بھی مجھے دیتی تھی ... یہ
غم کی بارش کیوں کر گئی ... وہ تنہا کیسے چلی گئی ..

سب سے چھپ کر روتا رہا۔ لگتا کہ وہ ابھی آ جائے
گی آ کر مجھے دیکھے گی .... میرا حال پوچھے گی ... مجھے تسلی
دے گی .. میرا حوصلہ بڑھائے گی ... کہے گی۔

اپریل ۱۹۸۳ء

باؤجی کیا حال ہے؟ ابھی کسی بچے کے ہاتھ پیغام بھیج دے دار
مجھے ہو ... سانس بھیل رہے تھے۔ محلے والے تعزیت کے لیے
اکٹھے ہو رہے تھے۔ سنا کہ وہ کافی دنوں سے علیل تھی، میرے
بھی تو جانا تھا ... وہ مرحوم ہونے لگی اور دل میں
رہنے والوں کی بے مروتی سے بڑھ کر کوئی دکھ نہیں ہوتا ...

نہ جانے کس طرح اس تک پہنچا ... سامنے وہ چارپائی پر
دراز تھی۔ اس نے ہر دلہن کی طرح پیری پڑیاں پہن کی ...
اپنی چمکیلی شوخ نظروں سے نہیں دیکھا ... نہ ہنس کر دوپٹہ
ٹھیک کیا ... ڈاڑھیں مار ماتم سی تھیں ... میرے پارہ پارہ
جسم کے کسی معتبر کردہ سرے کی خبر نہیں تھی۔ ذہن بالکل کورا
ہو گیا تھا۔ دل کٹ رہا تھا ... ٹانگوں میں لرزش تھی۔ بہت
ضبط کے باوجود آنسو نکل آئے۔ اب بھی اس کی سسکیاں سنائی
دے رہی تھیں۔ فضاؤں میں اس کی سرگوشیاں تھیں۔ اس کی
چوڑیوں کی کھنک تھی۔ آواز کی دھڑکن تھی۔ اور وہ مجھ سے کہہ
رہی تھی ...

باؤجی! میں آپ کو ہمیشہ ملتی رہوں گی ... بہت برس
بیت گئے ہیں ... سونے سونے بیابان سے دل میں کسی
حسرت کا سایہ تک نہیں .. زندگی جستجو کا نام ہے۔ میرے
لیے اب کیا رہ گیا ہے ...

غموں نے اتنا سخت جان کر دیا ہے کہ موت بھی نہیں
آتی ... شمو کہتی تھی .. کئی لوگوں کی زندگی دکھوں سے بنی
ہوتی ہے ... زمانے بھر کے غم میرے لیے منہ پھاڑے حقیقت
لیے لپک رہے ہیں ... بڑے غیر یقینی سے حالات ہیں۔
جانے بہا کر کہاں لے جائیں ... پت جھڑ کی شام کی طرح
اداس اور تربت کے سرہانے ٹمٹماتے چراغ ایسا ہوں ...
محرومیاں اور اداسیاں ہیں۔

میری شادی تو ہو چکی ہے مگر وہ شمو تو نہیں۔ شمو۔ شمو
ہی تھی۔ طویل عرصہ بیت جانے کے باوجود اب بھی راتوں
کی تنہائیوں میں شمو کی یادیں ستاتی ہیں۔ اب بھی دل اس
کے نام پر دھڑک اٹھتا ہے۔ کاش ...

جمال عرفی، لاہور

بھکارن

تحریر۔ ساجد کمالوی کمالیہ

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

سلام خلوص ... جوابِ عرض کی محفل میں ایک عرصہ کے بعد "بھکارن"... کے عنوان سے ایک حقیقت لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ یہ اس عورت کی داستان الم ہے، جو اپنی منزل کو پانے کے لیے غلط قدم اٹھا بیٹھی اور دنیا کی نظروں میں گر گئی۔ یہاں تک کہ اپنی عزت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی، لیکن جس شخص نے اس لڑکی کو اس کی منزل تک پہنچایا یا اسی شخص کے ایک اور آدمی نے اس لڑکی کو ذلت کے گہرے گڑھے میں پھینک دیا... اسے بہن بنا کر دھوکہ دیتا رہا اور جب اس سے جی بھر گیا تو اسے فروخت کر دیا یہ شاید اس لڑکی کی اپنی غلطی کی سزا تھی، جو اس نے اپنے گھر کی چار دیواری کے باہر قدم رکھ کر دی تھی۔

شہزادہ صاحب! یہ رنگین دنیا کا نام عورتوں کے لیے ایک سیٹج ہے اور کتنی لڑکیاں جن کو اپنی منزل کا علم نہیں ہوتا اور وہ گھر کی چار دیواری سے نکل کر اس سٹیج پر پہنچ جاتی ہیں جو ان کی منزل نہیں ہوتی، لیکن بدقسمتی سے ان منزل کی طرف نہیں جاتیں بلکہ ان کو کوئی نہ کوئی انسان ہی اس منزل کا راستہ بتاتا ہے جو انسانیت کے نام پہ ایک داغ ہے، اور ہم اسے معاشرے کا نام دیتے ہیں، لیکن یہ سوچنے کی زحمت نہیں دیتے کہ اصل میں یہ معاشرہ ہے کیا۔ اور اس کو کس نے جنم دیا ہے۔

میری کہانی کی صداقت کے بارے میں صرف اتنا عرض ہے کہ اس شادی کی ساری ذمہ داری میرے دوست اور یہ ہے، جس کی شکل جاوید سے ملتی تھی، یعنی جاوید اس لڑکی کی بربادی کا ذمہ دار ہے، اور یہ لوگ انسانیت کے نام پر ایک داغ ہیں ... میں نے کہانی کے تمام کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کر دیئے ہیں ... پہلے کی طرح اپنے معزز قارئین کے تبصرے اور خطوط کا اس مرتبہ بھی منتظر رہوں گا ...

آخر میں جوابِ عرض کی مزید ترقی کے لیے دعا کرتا ہوں

فقط ... آپ کا مخلص ...

ساجد عالوی، مکان نمبر ... ٹی۔ ٹی۔ سنگھ

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

انور کی دوستی میرے ساتھ چند ماہ قبل سے شروع ہوئی تھی، کیونکہ میں جس کمپنی میں الیکٹریکل انجینئر کی پوسٹ پر تھا، اس کمپنی نے چار مختلف جگہوں پر ٹھیکے لے رکھا تھا جس میں کراچی، ملتان، لاہور اور اسلام آباد کے شہر شامل تھے۔ ان تمام جگہوں پہ کام شروع تھا مگر کراچی میں کام مکمل ہونے کے قریب تھا جبکہ لاہور میں ابھی الیکٹرک کا کام شروع نہیں ہوا تھا۔ جبکہ اسے بھی ساتھ ساتھ چلانے کے لیے چند آدمیوں کی ضرورت تھی۔ اور جب وہاں کے انچارج نے کمپنی کے مالک کو اطلاع دی تو انہوں نے مجھے لاہور بھیج دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی مجھے یہ بھی ہدایت کی کہ میں وقت نکال کر اسلام آباد میں بھی چکر لگاؤں

اپریل ۸۳ء

تاکہ اس بات کا اندازہ لگایا جا سکے کہ وہاں پر بجلی کا کام کب شروع کیا جا سکے گا۔

میں اپنے کمپنی مالک کی تمام ہدایات لے کر کراچی سے لاہور چلا آیا۔ اور چند دن آرام کرنے کے بعد میں نے اسلام آباد کا رخ کیا۔ مگر وہاں پر تو ابھی کام کی ابتداء ہو رہی تھی تو بجلی کے کام کا ابھی سوال ہی پیدا نہ ہو رہا تھا لہٰذا میں وہاں سے تیسرے دن ہی لاہور چلا آیا۔ پنڈی سے انور صاحب میرے ہم سفر ہوئے۔ مختصر تعارف کے بعد میں نے دریافت کیا کہ انور صاحب کہاں جا رہے ہیں؟

"جہاں یہ بس لے جائے گی ..."۔ انور نے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر راستہ میں بہت سارے سٹاپ آتے ہیں، میرا مقصد ہے کہ آپ کہاں تک جائیں گے۔"

جوابِ عرض لاہور۔
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

ساجد صاحب جہاں سب مسافر اتر جائیں گے وہیں میں اتر جاؤں گا۔ اچھا تو آپ لاہور جا رہے ہیں۔۔۔

جی ہاں۔ مجھے تو آپ نے پوچھا مگر آپ بھی بتا دیں کہ کہاں جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں خیال ہو کہ آپ نے اتنے سوال مجھ سے پوچھے اور میں جواب دینے کے سوا آپ سے کچھ نہیں پوچھا۔۔۔ انور نے کہا۔

نہیں بھائی انور۔۔! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے آج کا سفر بہت اچھا گزرے گا کیونکہ آپ جیسا ہمسفر جو مل گیا ہے۔ جو راستے میں بور نہیں ہونے دے گا

ساجد صاحب: آپ سے میں نے یہ بات پوچھی ہی نہیں جس کا جواب آپ نے دیا۔

تو اور کیا پوچھا تھا۔۔؟ میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

یہی کہ آپ نے کہاں جانا ہے۔۔

اچھا اچھا تو آپ نے میرے جانے کے متعلق پوچھا ہے تو جناب میں بس وہیں جاؤں گا جہاں آپ جائیں گے۔

ایسا نہیں ہو سکتا ساجد صاحب! آپ کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ مذاق کر رہے ہیں۔

میں نے آج تک کسی کے ساتھ مذاق نہیں کیا

واہ جی واہ۔۔! مذاق بھی کر رہے ہو اور اوپر سے کہتے ہو مذاق نہیں کیا۔۔۔

اچھا بھئی۔ تجھے تب سمجھ میں آئے گا جب میں ٹکٹ خرید لوں گا۔۔

ہم ان باتوں میں مصروف تھے اور بس پنڈی سے باہر آئی کنڈکٹر نے آواز لگائی کہ ٹکٹ لے لو۔ کیونکہ وہ ہمارے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں ٹکٹ کے لیے رقم نکالنے کی خاطر پاکٹ میں ہاتھ ڈالتا انور نے پہلے ہی لاہور کے دو ٹکٹ لے لیے۔ اور ساتھ ہی میں بول پڑا کہ میں نے لاہور تو نہیں جانا۔

کیوں جی۔ اب بتاؤ مذاق ہو رہا ہے۔ اور ساتھ ہی کنڈکٹر نے دو ٹکٹ کاٹ کر انور کو پکڑا دیے۔

اے بھائی اب تو مذاق مذاق میں لاہور جانا پڑے گا۔۔۔ ویسے میرا ارادہ تو نہیں تھا اور اس کے ساتھ ہی میں نے ٹکٹ کی رقم نکال کر انور کو دی تو وہ صاف انکار کرنے لگا۔ مگر اس کے ساتھ ہی میں نے کہا کہ یہ میرے اصول کے خلاف ہے تو کہنے لگا۔۔۔

میں تمہارے اصول تو نہیں جانتا یہاں میرا اصول ہی چلے گا انور نے کہا۔

اچھا تو یہ بات ہے۔۔ میں نے انور کی طرف دیکھا۔

جی ہاں۔۔۔

میں نے وہی رقم کنڈکٹر کی طرف بڑھا دی۔ اور کہا کہ ایک ٹکٹ لاہور کا۔۔

اس کے ساتھ ہی انور بول پڑا۔۔۔ یہ کیا بات ہے جناب ساجد صاحب!

کچھ بھی ہو اگر تم ٹکٹ کے پیسے نہیں لے سکتے تو میں اس پر سفر نہیں کر سکتا۔۔۔

اچھا ساجد بھائی۔۔۔ ناراض مت ہونا لاؤ۔۔۔

باتوں باتوں میں میں نے انور سے پوچھا کیا لاہور میں ہی رہتے ہو۔۔۔

نہیں جناب! میرا تو غریب خانہ پنڈی میں ہے میں لاہور ملازمت کے سلسلے میں جا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اخبار کا وہ ٹکڑا مجھے دکھایا جو ہماری کمپنی کا تھا۔ اور کمپنی والوں کو لاہور کے لیے ہی اوورسیر کی ضرورت تھی۔ اور وہ بھی ایک جس کے ساتھ پانچ سال تجربہ بھی تھا۔

میں نے انور کو وہ ٹکڑا واپس کیا اور پوچھا کہ تجربہ تمہارے پاس ہے تو اس نے جلدی سے وہ تجربے کے کاغذ دکھا دیا۔

میں نے کہا اب تمہارا کام بن جائے گا۔

واہ ساجد صاحب! آپ نے یہ بات کتنی آسانی سے کہہ دی ہے پاکستان میں کام اتنا آسان نہیں بنتا بلکہ سفارش کی ضرورت ہے۔ تب جا کر کام بنتا ہے۔

میں نے سفارش کا سن کر پوچھ دیا کہ تمہارے پاس ہے کوئی سفارش

ابھی تو نہیں ہے وہاں پہنچ کر کوئی نہ کوئی بنا ہی لیں گے۔ اور کسی اللہ کے بندے کو ہم پر ترس آ ہی جائے گا۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے بتا ہی دوں۔ مگر پھر سوچا کہ صبح ہی اسے علم ہونے دوں گا۔ باتوں باتوں میں سفر کا تو علم نہیں ہوا کیونکہ انور نے سارے راستے میں بور نہ ہونے دیا۔۔ خیر بعد پہنچ کر انور نے مجھے اپنے ہاں چلنے کی دعوت دی کیونکہ

تھے۔ ویسے بھی میں نے اکثر ان کو اپنے سے چھوٹے ملازموں کے ساتھ ہی دیکھا تھا لیکن کچھ لوگ ایسے دیکھے تھے کہ جن کو اچھی کوئی اونچی پوسٹ ملی اور دولت کمانے کے قابل ہوئے تو طوطے کی طرح آنکھیں بدل لیتے ہیں۔ مگر یہاں میری اور جاوید کی تنخواہ میں تین گنا فرق تھا لیکن آج تک انہوں نے مجھے انسانیت کی نظر سے دیکھا تھا اور مجھے بزرگوں کا وہ قول یاد آرہا تھا کہ اچھا انسان وہی ہے جس کی دشمن بھی تعریف کرے اور جاوید صاحب نے آج تک یہ خیال رکھا ہے کہ کسی کو تکلیف نہیں دی اگر کوئی مجبوری سے وہ کام نہ کر سکتے تو اس سے ایسے انداز میں معافی مانگتے کہ دیکھنے والا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اور اسے دوسری جگہ ملازمت دلا دیتے تھے۔ لیکن اس کے برعکس وہ ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے جو کام چور تھے۔ ملازمت پہ آتے اور کام نہیں کرتے تھے۔

مگر انہوں نے کبھی مالک کے سامنے شکایت نہیں کی تھی۔ لیکن جب مالک چلا جاتا تو اسے سمجھاتے اور اسے ایسی باتیں کرتے کہ جس آدمی نے زندگی بھر کام نہ کیا ہو ان کی باتوں سے متاثر ہو کر کام ضرور کرتا۔

یہ میرا تجربہ تھا کیونکہ میں اکثر ان کے ساتھ ہی رہتا تھا بلکہ ان کے کام میں میں بھی ہاتھ بٹاتا تھا کیونکہ میرا کام بہت آسان تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے مجھے بیٹا بنا لیا تھا۔ اور جتنا پیار میرے ساتھ تھا شاید ہی کسی سے کرتے ہوں۔ میں ان کے اخلاق کے سپنوں کی سیر کرتا ہوا نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح اٹھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں ان کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد امیدواروں کی لائن لگ گئی جاوید صاحب نے ایک ایک سب کو اندر بلایا اور انٹرویو اس حساب سے لے رہے تھے کہ آنے والے کو احساس تک نہ ہوا کہ میرا انٹرویو ہو رہا ہے یا مجھ سے کوئی اپنی بات کر رہا ہے جب انور کی باری آئی تو مجھے اندر دیکھ کر حیران رہ گیا اور سب سے پہلے اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بعد میں کچھ سے۔ جب انٹرویو کے بعد وہ باہر آیا تو میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا اور چپڑاسی کو چائے کے لیے کہا۔

باتوں باتوں میں انور نے مجھ سے پوچھا کہ آپ بھی یہاں انٹرویو کے لیے آئے ہیں۔

جی نہیں! میں تو یہاں پہلے ہی الیکٹریکل سپروائزر ہوں۔ میں نے کہا۔

اچھا تو مجھے پتے اس لیے نہیں بتایا کہ میں سفارش کے لیے نہ کہوں۔ کوئی بات نہیں۔ اب تو تجھے میری سفارش ضرور کرنا ہو گی۔

میں انور صاحب! ایسا نہیں کر سکتا وہ اس لیے کہ انہوں نے آج تک کسی کی بات نہیں مانی۔ بلکہ انہوں نے اسے رکھنا ہے جو قابل ہو گا۔ کیونکہ یہ قابل آدمی کا حق نہیں چھین سکتے۔

ارے بھئی! کوشش تو کرو۔

میں نے کہہ جو دیا کہ میں نہیں کہہ سکتا۔

کیا بات ہے بیٹا... انکل جاوید نے ہماری باتیں سن کر پوچھا...

کوئی بات نہیں انکل...! میں نے کہا

دیکھو مجھ سے آج میرا بیٹا جھوٹ بول رہا ہے انہوں نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا۔ اور غصے سے پھر کہا.. کیا بات ہے؟..

اصل بات یہ ہے کہ انکل صاحب! جس کو آپ تسلیم نہیں کرتے۔ کیونکہ میں آپ کے اصول کو جانتا ہوں۔

پھر بھی کیا بات ہے بیٹا! مجھے بھی تو علم ہو۔

بس انور صاحب کا خیال کچھ؟

اچھا تو یہ بات ہے یہ لو میں چلا جو تمہارے دل میں آئے کہہ لینا۔ ویسے میں نے ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔ مگر میں اپنے ہاتھ میں سے تو ایسا کام نہیں کر سکتا۔ میں نے تمام امیدواروں کے نمبر لگائے ہیں۔ آگے تمہاری مرضی رکھ لو دیے چار امیدوار ایسے ہیں جن کو میں نے اس قابل قرار دیا ہے جسے تم رکھنا چاہتے ہو رکھ لینا۔

مگر یہ کام تو آپ کا ہے... مجھے اس کے بارے میں علم نہیں ہے۔

علم ہو یا نہ ہو میں نے کہہ جو دیا۔ جو بھی تجھے پسند ہو اسے رکھ لو کام لینا میرا کام ہے۔

انکل کی اتنی بات سن کر انور مجھ سے مخاطب ہوا کہ نرم بھی ہیں اور سخت بھی...

ارے انور...! تو کیا جانے انہوں نے تو سختی آج تک

ملی نہیں۔ اور جب تجھے ان کے اخلاق کے بارے میں بتاؤں کا تو پھر علم ہوگا کہ میں نے تمام کاغذوں کو نمبروار لگایا تو انور دوسرے نمبر پر تھا۔ مگر پہلے نمبر والے امیدوار کا تجربہ کم تھا جس کی وجہ سے میں نے انور کے کاغذات اوپر رکھ دیے۔ اور جب صاحب انکل آئے تو انہوں نے دستخط کیے اور انور کو ملازمت کا لیٹر دے دیا۔ انور نے میرا شکریہ ادا کیا اور پھر چلا گیا . . .

چوتھے دن انور نے اپنی ڈیوٹی سنبھال لی۔ اور اس نے کام بھی اس طریقے سے کیا کہ جاوید صاحب بہت خوش ہوئے اور ایک دن مجھ سے پوچھا کہ یہ تمہارا کون ہے۔؟

پہلے نہیں تھا لیکن جب میں اسلام آباد گیا تو دوستی ہو گئی۔ یہ انٹرویو دینے کے لیے حاضر ہوا تھا اور آپ کی مہربانی سے کامیاب ہو گیا۔

اچھا تو میں اسے تمہارا عزیز ہی سمجھوں گا۔ کیونکہ یہ میرے بیٹے کا دوست جو ہوا۔

ایک دن میں اور انور انارکلی گئے۔ یونہی ہم بازار میں داخل ہوئے ہی تھے کہ پیچھے سے ایک صدا آئی۔

"بابو جی! اللہ کے نام پر کچھ دے دو"

میں نے پانچ روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا مگر اس فقیر لڑکی نے لینے سے انکار کر دیا۔ اور دوسری طرف چلی گئی۔ میں بہت حیران ہوا کہ اس لڑکی نے صدا بھی کی۔ اور پیسے لینے سے بھی انکار کر دیا۔ بلکہ خاموشی سے ہمیں دیکھا اور چلی گئی۔ کیونکہ میں نے آج تک کوئی فقیر ایسا نہیں دیکھا تھا جس نے صدا دی اور دینے والے نے دیا بھی اور لینے سے انکار کر دیا . . .

میرے دل میں خیال آیا کہ ضرور اسے کوئی شک گزرا ہے۔ جس کی وجہ سے اس نے کچھ لیا نہیں، ہو سکتا ہے کہ ہماری شکل کے کسی آدمی نے دھوکہ دیا ہو . . . اس لیے اس نے نفرت کی ہو گی۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ انور نے مجھ سے کہا کہ ساجد صاحب چھوڑو نہیں لیا تو کیا ہوا اس کی مرضی ہے نہ سے . . . ہم چلے گئے مگر میرے دل میں بار بار اس بھکارن کا خیال آتا . . . افسوس کہ اب میں کچھ نہیں کر سکتا . . . کیونکہ وہ چلی گئی تھی جس کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا جس کا مجھے علم ہوتا۔ مگر اس کے حالات جاننے کے لیے میں بے چین تھا . . . میرے ذہن نے یہ فیصلہ جلدی کر لیا کہ اس کے اندر ایک کہانی ضرور پوشیدہ ہے جس نے اسے اس منزل تک پہنچایا ہے۔

ہم نے تھوڑی بہت شاپنگ کی اور واپس چل پڑے۔ دن گزرتے رہے۔ ایک دن میں نے سوچا کہ چلو آج داتا صاحب ہی چلتے ہیں۔ کیونکہ انور راولپنڈی چلا گیا تھا اور جاوید صاحب دفتر کے کام کے سلسلے میں کراچی چلے گئے . . . چھٹی تھی اور میں نے جیسے ہی دربار کے سامنے پاؤں رکھا تو مجھے پھر وہی صدا سنائی دی۔

"بابو جی! اللہ کے نام پر کچھ دے دو"

میں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور دیکھا وہی تھی جس نے مجھ سے ایک روز پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر اس دفعہ اس نے وہ روپیہ وصول کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے وہ روپیہ واپس کر دینے کے لیے کہا۔ لیکن میں نے لینے سے انکار کر دیا۔ تو اس نے وہیں زمین پر نوٹ پھینک دیا۔ اور جب جانے لگی تو میں نے اسے بلایا۔ تو واپس آ گئی۔

جب میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی جو جاوید کا دوست ہو گا۔ وہ انسان نہیں ہے۔ اور میں نے انسان سمجھ کر تجھ سے بھیک مانگی تھی۔ مگر بعد میں مجھے یاد آیا کہ تمہیں میں نے انارکلی میں دیکھا تھا جاوید کے ساتھ . . . اس لیے تجھے یہ روپیہ واپس کر دیا کہ تم بھی جاوید کی طرح کے ہو گے۔ تو میں ساری بات سمجھ گیا۔

تم کہاں رہتی ہو . . ؟ میں نے تو اس کی کہانی لکھنی تھی اور اس وقت تک میرے قلم میں چلنے کی طاقت نہیں تھی جب تک وہ اپنے حالات سے پردہ نہ اٹھاتی۔

تجھے اس بات سے کیا . . ؟

دیکھیے بہن! میں نے کوئی غلط خیال کے لیے تو تجھ سے دریافت نہیں کیا۔ بلکہ میں تو خود قلم کار ہوں میں چاہتا ہوں کہ تمہاری کہانی لکھوں۔ کیونکہ میں نے یہ تو اسی دن ہی سوچ لیا تھا کہ تم نے صدا بھی کی اور لیا بھی کچھ نہیں . . تو ضرور تجھے ہم میں ایسی چیز نظر آئی ہے . . جو تم نے لینے سے انکار کر دیا ہے۔ اور یہ وجہ نہیں تو ہماری وہ غلطی بتائی جائے۔

جواب عرض مانچسٹر

اپریل ۱۹۸۲ء

جس کی وجہ سے تم نے ہم سے کچھ لیا نہیں جب کہ صدا بھی ہم سے ہی کی تھی چلو اس بہانے ہماری وہ خامی دور ہو جائے گی۔
میرے یہ الفاظ سن کر وہ رونے لگی... میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگی.. میں نے یہ لفظ تو صرف آج ہی سنا ہے۔ اور مجھے اپنے بھائی کے نہ ہونے کا احساس ہوا تو آنسو آ گئے۔
کوئی بات نہیں.. میں نے تجھے بہن کہا ہے تو بہن کا ہی پیار دوں گا... میں نے کہا۔
جب اسے مکمل تسلی ہو گئی تو اس نے مجھ سے کہا میں اپنے بھائی کا نام پوچھ سکتی ہوں..؟
کیوں نہیں... تمہارے بھائی کا نام ساجد ہے.. اور میری بہن کا نام..؟ میں نے ساتھ ہی سوال کر دیا۔
میرا نام کوثر ہے... اس نے بتایا۔
ہمارے یوں سڑک پر باتیں کرنے سے لوگوں کی آنکھوں کے اشارے میں تو سمجھ رہا تھا۔ سامنے پارک تھا کوثر کو وہاں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنی کہانی سنا کر میرے تمام کو تو اڑا دیے ہیں۔ وہ سن کر جواب عرض کی خدمت میں حاضری دے رہا ہوں۔
ساجد بھائی آپ کب سے جاوید کو جانتے ہیں۔ کوثر نے مجھ سے پوچھا۔
کون سے جاوید کی بات کی ہے آپ نے بہن..؟
وہی جو انارکلی میں تمہارے ساتھ تھا۔ جس دن میں نے بھیک مانگ کر نہیں لی تھی۔
ارے پگلی..! وہ تو میرا دوست الفد تھا... اس کا نام جاوید کب ہے؟
کہاں رہتا ہے..؟ اس نے سوال کیا۔ شاید اس لیے کہ میں نے اسے غلط بتایا ہو۔
وہ راولپنڈی میں رہتا ہے.. میں نے کہا۔
اچھا تو پھر میں نے غلط اندازہ لگایا۔ سب سے پہلے تو میں آپ کے دوست کی شان میں گستاخی کی معافی طلب کرتی ہوں کوثر نے معذرت کی...
ارے بھئی یہ کیا.. میں نے اس کے ہاتھ علیحدہ علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔
دراصل ساجد بھائی! جاوید نامی ایک شخص ہے جو ملتان کا رہنے والا ہے۔ اس نے مجھے اس مقام تک پہنچایا ہے ورنہ میں نے اس گھر میں جنم لیا... جہاں ہر سو خوشیاں رقصاں تھیں۔ دولت اتنی تھی کہ میں جھوٹ بول کر بھی اتنی نہیں بتا سکتی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم تھا۔ دولت سے انسان سکون نہیں خرید سکتا۔ میں نے یونیورسٹی میں اکثر دولت کے پرستار لڑکوں اور لڑکیوں کو دیکھا تھا۔ جو دولت کی آڑ میں بہت بڑے جرم کرتے تھے۔ دولت کی وجہ سے جرم تو چھپ جاتا تھا مگر جو انسانیت کے نام پر داغ لگ جاتے دولت سے پردہ تو ڈالا جا سکتا ہے مگر جو داغ لگتے ہیں انہیں مٹایا نہیں جا سکتا۔
اللہ تعالیٰ نے جتنی دولت دی تھی اس سے کہیں زیادہ حسن بھی دے دیا۔ اسی وجہ سے میں یونیورسٹی میں [illegible] کے نام سے مشہور تھی۔ کیونکہ کسی کی بات پر دھیان ہی نہیں دیا کرتی تھی میرا یہاں آنے کا مقصد تعلیم حاصل کرنا تھا۔ محبت کی ڈگر میں [illegible] [illegible] آپ کی قسم کی [illegible] میں [illegible] چلتی ہوئی بات کو روک کر پوچھا۔
بس بھائی جان! میں اس وقت تھرڈ ائیر میں تھی جب میں اپنی منزل تک پہنچنے سے قبل ہی بھٹک گئی اور مجھے یہاں تک پہنچانے والا جاوید ہی ہے۔
جاوید کون تھا.. میں نے پوچھا۔
ایسے تو آپ کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا میں نے جب آپ سے سب کچھ بتانے کا وعدہ کیا ہے تو پھر درمیان میں آپ نہ پوچھیں...
ٹھیک ہے۔ میں درمیان میں نہیں روکوں گا
اچھا تو بھائی جان...! بات کہاں تھی اس نے مجھ سے پوچھا
تم کسی لڑکے کو لفٹ نہیں کراتی تھیں.. میں نے کوثر کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔
ہاں.. ہاں! ہماری یونیورسٹی کا ایک لڑکا اسلم تھا جو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑا ہوا تھا لیکن مجھے اس سے نفرت تھی۔ وہ بھی میری طرح امیر گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ جب میری دولت مجھے سکون نہ دے سکتی تھی تو اس کی دولت بھلا مجھے کیسے چین کی گھڑیاں میسر کر سکتی تھی۔ میں اکثر غریب لوگوں کے متعلق سوچا کرتی تھی کہ وہ بھی انسان ہیں۔ ان کے اندر بھی دل ہے اور جذبات عرض [illegible]

بزرگوں سے سنا تھا کہ غریب لوگوں میں انسانیت کا مادہ موجود ہوتا ہے اور میں اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک غریب انسان کو اپنا آئیڈیل بنانے کی سوچنے لگی۔ اور اس سوچ میں ایک دن میں اپنی سہیلی کے ہاں گئی۔

اپنی گاڑی پر واپس آ رہی تھی یونہی میں نے گورنمنٹ کالج سے گاڑی کا رخ باہر سیما کی طرف موڑا تو جلدی میں میری کار کا پچھلا حصہ ایک سائیکل سوار سے ٹکرا گیا۔ اور وہ دور جا گرا۔ اسے معمولی سی چوٹ آئی۔ میں نے جلدی سے بریک لگائی۔ اور اتنے میں وہ لڑکا سائیکل اٹھا کر میرے قریب سے گزرا تو میں نے پوچھا

ارے مسٹر۔! آپ کے چوٹ زیادہ تو نہیں آئی۔۔

اس نے میری طرف حواس نظروں سے دیکھا تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ کہہ رہا ہو کہ تمہیں نظر آتے ہوئے [illegible] رہی ہو [illegible] اس نے لب کھولے [illegible] ترنم [illegible] تمہارے کہ

محترمہ [illegible] میں بیٹھ کر [illegible] جیسوں کا پیدا کر دیا [illegible] تمہاری اپنا ہے اس پر ہم جیسے غریبوں کا بھی چلنے کا حق ہے چلو ہم تمہارے قابل تو نہیں ہیں مگر دل ہمارا بھی آپ کی طرح ہے کوئی پتھر کا نہیں کہ اس پر اثر ہی نہ ہو۔۔۔ غریبوں کو اس بے دردی سے گرایا نہ کرو۔۔ کیونکہ ان میں اٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اور گزارش ہے کہ آئندہ گاڑی دیکھ کر چلایا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دی ہیں۔۔۔ اس لیے ہر کام سوچ سمجھ کر کرو۔۔۔

اتنے الفاظ کہہ کر سائیکل سوار چل دیا۔ اور میں گھر آ گئی اور اپنے کمرے میں جا کر ابھی لیٹی ہی تھی کہ خیال آیا آج مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے اور اس کے الفاظ میرے ذہن میں ابھرنے لگے۔ ہر انسان کے اندر دل ہوتا ہے پتھر نہیں۔ اور احساس بھی ایک جیسا محترمہ!

میں نے جتنی بار اس بات کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اتنی ہی بار وہ بات میرے ذہن میں داخل ہوتی گئی۔ اور پھر میرے دل نے کہا کہ یہی تو میرا آئیڈیل تھا کہ تو غریب کو ہی اپنا ہمسفر بنائے گی۔ اور تجھے اس سے اچھا اور کون ملے گا۔ اور پھر دل میں اس خیال نے جنم لیا کہ تو اسے کہاں تلاش کرے گی۔ تجھے تو اس کا پتہ بھی نہیں ہے۔۔۔ کون ہے کہاں رہتا ہے

آخر میں ہار گئی۔ اپنی منزل کو دیکھ کر بھی نہ حاصل کر سکی۔

یونیورسٹی میں بھی اس کے متعلق سوچتی رہتی۔۔ تعلیم سے بھی دل اچاٹ ہو گیا وہ غریب لڑکا میری کمزوری بن چکا تھا۔ میری سہیلی اس کیفیت کے بارے میں پوچھتی۔۔ لیکن میں اس کو کیا بتاتی۔ جبکہ مجھے خود علم نہیں تھا۔

ایک دن میں بہت ہی پریشان تھی کہ میری سہیلی نے مجھے اپنے ہاں چلنے کی دعوت دی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ تو اس نے کہا اس لیے میرے ساتھ نہیں جا رہی کہ میں ایک ملازم کی بیٹی ہوں جو پانچ چھ سو روپے تنخواہ لیتا ہے کوئی بات نہیں کوثر۔۔ میں تجھ سے شکوہ نہیں کروں گی۔ ویسے دیکھا ہے کہ اکثر غریبوں کے دل کو [illegible] [illegible] دیا جاتا ہے۔

میں نے تجھ سے کوئی [illegible] تو نہیں [illegible]۔۔ [illegible] انکار کر رہی۔

[illegible] الفاظ [illegible] لڑکا [illegible] کہہ رہا [illegible] ہیں بہتر ہیں۔

پریشان تو میں پہلے ہی تھی۔۔۔ [illegible] زیادہ ہو گئی۔

اور پھر میرے دل نے یہ فیصلہ کر لیا کہ میں آج [illegible] کے ہاں ضرور جاؤں گی۔ اس لیے طبیعت تو پہلے ہی خراب تھی اور میں نے فوزیہ کو کہا کہ چلو گھر چلتے ہیں۔

میرے اقرار پر فوزیہ نے بھی یونیورسٹی سے چھٹی کر لی۔ میں فوزیہ کے گھر چلی گئی اس نے مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں بٹھایا اور خود چائے بنانے چلی گئی میں نے اس کمرے کو غور سے دیکھا جس میں دو چارپائیاں تھیں اور دو ٹیبل تھے جو کمرے کے ایک کونے میں تھے۔ ان پر کتابیں بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔۔۔ ایک ٹیبل کے اوپر فریم میں جڑی ہوئی ایک تصویر تھی۔ جس کو میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس میں بہت ہی سادگی نظر آئی۔ اور تصویر دیکھ کر مجھے وہ اجنبی یاد آ گیا۔۔۔ بالکل اسی تصویر کی طرح وہ بھی سادہ تھا۔۔۔ میں تصویر کو ہی دیکھتی رہی۔۔۔ میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اس کا بھائی ہوگا۔۔۔ فوزیہ کے قدموں کی آہٹ سے میری سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

چائے کے دوران میں نے فوزیہ سے اس تصویر کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا یہ میرے بڑے بھائی ہیں۔۔

کیا کرتے ہیں ..؟ میں نے پوچھا۔

گورنمنٹ ڈگری کالج میں ایم ایس سی کر رہے ہیں۔ فوزیہ نے کہا۔

پھر تو تمہاری طرح یہ بھی کالج میں لائق ہوں گے؟ میں نے سوال کیا۔

ہاں ہاں۔ بزرگوں کی دعائیں سے ...

ہم کافی دیر باتیں کرتی رہیں ... وقت گزرنے کا ذرا احساس نہ ہوا۔ ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور ساتھ ہی بند ہو گیا ... لیکن یہ نگاہیں اسی ہستی کا دیدار کر چکی تھیں۔ جس کے لیے دل بے چین تھا۔ ایک جھلک سے تھوڑا سا سکون ملنے کے ساتھ لذت کا بھی احساس ہوا۔ جسے دیکھنے کی تمنا تھی۔ آرزو تھی ... وہ پوری ہو کر پھر حسرت بن گئی .. دل میں ارمان تھا کہ میں اسے صحن میں بیٹھا پاؤں گی ... جب باہر نکلی تو وہ وہاں نہیں تھا۔ اور میں گھر آ گئی ...

افسوس کہ میں جس سہیلی کے گھر جانے سے کتراتی تھی وہ ہی میرا آئیڈیل تھا۔ یہ سوچ کر تسلی ہوئی کہ آئیڈیل کے ٹھکانے کا تو پتہ چل گیا ہے ناں ... اور پھر اسی خیال میں رہنے لگی کہ اب فوزیہ مجھے کب اپنے گھر جانے کا کہتی ہے .. مگر انسان جو چاہتا ہے وہ کبھی نہیں ہو سکتا ...

فوزیہ نے بعد میں اپنے گھر چلنے کا نہ کہا شاید سوچ لیا ہو گا کہ اب مجھے گھر کا علم ہو گیا ہے اگر میرے دل میں خواہش ہوا تو میں خود اسے ملنے چلی جاؤں گی ... مگر اسے کیا معلوم تھا کہ اب میں اسے کب ملنے آؤں گی۔ میں تو اپنے آئیڈیل کا دیدار کرنے آؤں گی

آخر ایک دن میں مجبور ہو کر بن بلائے مہمان کی طرح فوزیہ کے گھر چلی گئی ... کیونکہ فوزیہ اس دن یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ اور مجھے بہانہ مل گیا ... میں دستک دے کر کھڑی ہو گئی۔ اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا ... اور دروازہ کھولنے والے کو دیکھ کر دنگ رہ گئی سوچا کہ آج تو خوش آمدید کہے گا۔ مگر وہ خاموشی سے ایک طرف ہو گیا۔ میرا دل ٹوٹ گیا کہ اس نے اندر آنے کا بھی نہیں کہا ...

اپریل ۱۹۸۳ء

میں اندر داخل ہو گئی۔ مجھے دیکھ کر فوزیہ بھاگی جو سامنے بیٹھی تھی۔ میں نے پوچھا کہ آج یونیورسٹی کیوں نہیں گئیں تاکہ فوزیہ مجھ سے کوئی سوال نہ کر ڈالے۔

بس ضروری کام تھا والدہ ملتان گئیں تو مجھے گھر رہنا پڑا۔ اور پھر اکیلی ہونے کی وجہ سے میں نے بھائی جان کو بھی گھر ہی رہنے کا کہا۔

اتنے میں فوزیہ کیلئے آواز آئی جو اس کے بھائی نے کمرے سے دی تھی۔ میں تو اسی لیے بیٹھ گئی کہ اب دیکھوں گی کہ میرے سامنے کیسے نہیں آتا ... مگر وہ مجھے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ جب فوزیہ کمرے سے ہو کر باہر آئی تو مجھے کہنے لگی ...

چلو کمرے میں بیٹھتی ہیں تو میں نے کہا یہاں ہی ٹھیک ہے ... یہ سن کر فوزیہ کا بھائی صحن سے باہر کی طرف چلا گیا۔ میں اسے جاتا دیکھ کر سمجھ گئی کہ اس نے کوئی کھانے پینے کی چیز منگوائی ہے۔ تو میں نے فوزیہ کو کہا کہ اگر اپنے بھائی کو کچھ لانے کے لیے کہا ہے تو میں چلی ...

ارے نہیں ... کھانے پینے کا سامان تو گھر میں موجود ہے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا ہے ... لیکن میں نے کہا ہے کہ سب کچھ ہے تو کہنے لگے اچھا میں ابھی آیا ایک دوست سے مل آؤں۔ فوزیہ نے کہا۔

دل میں ایک آہ سی ابھری کہ جس کو ملنے کی حسرت لے کر آئی ہو وہ تو چلا گیا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ ابھی آ جائے گا کیونکہ اس کی بہن گھر میں اکیلی ہے۔ اسے یہ تو معلوم نہیں کہ میں کب چلی جاؤں گی ... اور میری نظریں دروازے سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ وہ جیت گیا اور میں ہار گئی وہ نہ آیا۔

بہت انتظار کے بعد میں نے فوزیہ سے اجازت طلب کی۔ جب باہر نکل آئی تو دیکھا کہ اس کا بھائی مجھے سامنے میڈیکل سٹور پر کھڑا نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ میں ان کے گھر سے الوداع ہو چکی ہوں تو وہ شاد گھر چلا گیا۔ میں سمجھ گئی کہ اسے ملنا بھی گوارا نہیں لیکن بے بس ہے۔ اپنی بہن کی سہیلی کا دل بھی دکھانا نہیں چاہتا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ غریب انسان کے دل میں ہر ایک کے لیے جگہ ہوتی ہے ... اور نفرت بھی۔ وہ اپنی بہن سے یہ

کھولی ہوئی تھی اس نے مجھے کمرے میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود
دروازے کے قریب جا کر باہر سے کسی کو آواز دی۔ اور تھوڑی
دیر بعد ایک چھوٹا سا بچہ آیا اور اسے دودھ والا برتن دے کر دودھ
لانے کے لیے بھیج دیا۔ اور خود باورچی خانے میں چلا گیا۔ میں
نے سوچا کہ دیکھیے کیا کرتا ہے۔ اس کا منہ چولہے کی طرف تھا اور
بڑے آرام سے اپنے کام میں مشغول تھا اور کام کرتے ہوئے
ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے اس کام میں کافی تجربہ ہے۔ یونہی اس
نے سلیقے سے برتن ٹرے میں رکھے اور اٹھنے لگا تو میں کمرے
میں آکر بیٹھ گئی۔ اور اس کے ٹیبل سے ایک کتاب اٹھالی۔ جو
شاید انگلش کی تھی۔ میں اس کے ورق الٹ پلٹ کرنے لگی۔
اتنے میں وہ اندر داخل ہوا۔ اور چائے کے سامان کو چارپائی
پر رکھ کر فوراً ٹیبل خالی کیا اور میرے سامنے رکھ کر چائے
رکھ دی۔ اور خود بیٹھ کر چائے بنانے لگا۔ یونہی اس نے
ہاتھ بڑھایا تو میں نے اسے روک دیا کہ چائے میں بناتی ہوں۔

نہیں آپ اس وقت ہماری مہمان ہیں۔ اور چائے میں
بناؤں گا... اشرف نے کہا۔

جی نہیں۔ : یہ اصل میں عورتوں کا کام ہے اس لیے
یہاں پر آپ کی بہن نہیں ہے اور یہ میرا فرض ہے۔ میں اتنی بات
کہہ کر چائے بنانے لگی۔

کتنے چمچ چینی کے...؟

ایک... مختصر جواب دینے کے بعد اشرف پھر خاموش ہو گیا۔

میں نے چائے بنا کر اسے دی۔ اور خود بھی پینے لگی۔ مگر
میں نے چور نگاہوں سے کئی دفعہ اشرف کو دیکھا۔ مگر وہ اپنے
چائے کے کپ کو خالی کرنے میں ہی مصروف تھا۔ آخر چائے کا
کپ ختم کرنے کے بعد وہ اٹھ کر دوسری چارپائی پہ جا بیٹھا۔
میرا کپ خالی ہوتے ہی اس نے برتن اٹھائے اور باورچی
خانے میں رکھنے کے بعد کمرے میں داخل ہوا۔

جی اب آپ کو اجازت ہے کیونکہ آپ نے پہلے جانے
کے بارے میں کہا تھا۔

اگر میں نہ جاؤں تو...؟

آپ ہماری مہمان ہیں۔ ویسے آپ کا دل جب تک چاہے
رہیں۔ پھر بھی آپ نے جس سے ملنا تھا وہ یہاں نہیں ہیں۔
اور میں یہاں اکیلا ہوں۔ اس لیے مہربانی کر کے آپ جا سکتی

ہیں۔ کیونکہ غریب انسان ہوں عزت کا ڈر ہے ورنہ اگر نذیر
یہاں ہوتی تو میں آپ کو کبھی یہ الفاظ نہ کہتا بلکہ خود ہی چلا جاتا۔

فرض کرو اگر میں خود ہی تجھ سے ملنے آئی ہوں تو... میں
نے کہا...

تو پھر میرا حکم ہے کہ یہاں سے چلی جاؤ۔ وہ اس لیے کہ مجھے
امیروں سے نفرت ہے۔ جن کے دل میں غریبوں کے لیے کوئی
خلوص نہیں ہے۔ اور میں نفرت کرتا ہوں۔ ایسے لوگوں سے
جن کو انسانیت کے نام کا علم تک نہیں مگر وہ اپنے آپ کو
انسانوں کی فہرست میں شامل کر کے انسانیت کے نام پر ایک
سیاہی ملتے ہیں۔

میں نے حسرت بھری نگاہ سے دیکھا تو اشرف نے اپنا چہرہ
دوسری طرف کر لیا مگر میں آج ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔
میں نے دل پہ ہاتھ رکھا۔ اور پہلی دفعہ اس کے نام سے
پکارا۔ اشرف.. میں اپنے کہے کی معافی چاہتی ہوں۔ میں تو
اس دن سے ہی تمہاری تلاش میں تھی مگر تم مجھے نہیں ملے۔
اگر اب مل ہی گئے ہو تو مجھے معاف کر دو۔

واہ محترمہ! اشرف نے کہا۔

محترمہ نہیں اشرف صاحب! میرا نام کوثر جبیں ہے مگر
پیار سے سارے کوثر ہی کہتے ہیں۔

دیکھیے محترمہ۔ میں تمہاری ان باتوں میں آنے والا نہیں
ہوں۔ اور تم جیسے لوگوں کو تو میں اچھی طرح جانتا ہوں جو دولت
کے سہارے غریبوں کا جو استحصال کرتے ہیں.. خدا کے لیے کام
کرو۔ تم لوگ ہمارے جینے کا حق چھیننے پہ کیوں تلے ہوئے ہو..
خدا کی قسم! یہاں سے بھی جاؤ ورنہ میں بدنام ہو جاؤں گا۔

جب میں نے دیکھا کہ یہاں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تو میرے
ذہن میں ایک خیال نے جنم لیا کہ یہ لوگ اپنے گھر سے خالی نہیں
جانے دیتے۔ بلکہ یہی چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں سے جانے والا
خوش ہو کر جائے تو میں نے الفاظ کے تیر اشرف پر چھوڑ دیے۔

اشرف! جو چاہے تم کر لو مگر میری یہ بات یاد رکھنا کہ
جس طرح تم نے کہا ہے کہ دولت والے لوگ انسانیت کے نام
پر ایک سیاہی کا داغ ہیں تو اس طرح میں بھی تجھے کہتی ہوں
کہ تم بھی انسانیت کے نام پر سیاہی کا ایک داغ ہو۔ وہ اس
لیے کہ میں نے دولت سے ہر وہ چیز خریدی ہے۔ جس کی مجھے طلب

تھی غریب میں دل کا سکون تلاش کرنے نکلی تو مجھے غریبوں سے وہ کہیں نظر نہ آیا اور میں نے دل میں عہد کر لیا کہ اگر کسی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنایا تو غریب ہی کو بناؤں گی۔ کیونکہ ان کے دل میں خلوص چاہت سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ اس لیے کہ وہ دولت سے اندھے نہیں ہوتے۔ ان کو رشتوں کی پہچان ہوتی ہے۔ اور جس دن تم نے مجھ سے اتنا کہا تھا کہ غریب بھی دل رکھتے ہیں۔ ان کا بھی احساس ہوتا ہے۔ میں نے اس دن تمہاری باتوں کا کافی اثر لیا۔ اور تجھے اپنا آئیڈیل سا لیا۔ لیکن مجھے اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ میرا آئیڈیل میری سہیلی کا بڑا بھائی ہے۔ جو الفاظ تم نے مجھے کہے تھے وہی الفاظ میری سہیلی نے بھی مجھے کہے تھے تو میں ایمان سے کہتی ہوں کہ مجھے اس وقت وہ الفاظ سہیلی کے نہیں لگتے تھے بلکہ تمہارے لگتے اور مجھے وہی جگہ یاد آگئی تھی۔ لیکن پھر میرے دل نے فیصلہ دیا کہ جس کو تم اپنا آئیڈیل بنا چکی ہو اس کے ساتھ ہی رہو اس کو تو نہیں جانتی۔۔۔ مگر اس کی روح کو تو جانتی ہو جانتی ہو کہ اس میں انسانیت کو پرکھنے کا دل موجود ہے اور میں اپنی سہیلی کے ساتھ تمہارے ہاں چلی آتی مگر میرے والدین کی بیٹی میں نے پھر بھی تجھ سے محبت کی تم میرے گھر میں داخل ہوتے ہی باہر چلے جاتے۔ آج تم اسے مجبور ہو کر جا نہیں سکتے۔ اور ہاں تجھے میں یہ بھی بتا چلوں میں نے اس گھرانے سے آج سبق سیکھا ہے کہ غریب کے اندر دل ہوتا ہی نہیں جو وہ سر بلند کیے بات کہہ دے کہ تمہارے اندر دل نہیں پتھر ہے۔ مجھے تجھ سے کوئی گلہ نہیں جو ذرا سی معافی کردو۔ میں نے تجھے اپنا سمجھ لیا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ غریب کے اندر دل ضرور ہوتا ہے مگر وہ اوپر سے خلوص دکھاتے ہیں اور اندر سے لوگوں کو کاٹتے ہیں۔

خاموش ہو جاؤ کوثر۔۔

اس مرتبہ اس نے مجھے محترمہ نہیں کہا بلکہ اس کے دل میں ایک بھونچال آگیا۔

میں نے تو کبھی اس بارے میں سوچا بھی نہیں تھا مگر تجھے مجھ سے محبت ہے یا ایک غریب سے۔۔

میں نے تجھے کہا ہی کب ہے کہ مجھے تجھ سے محبت ہے۔ مجھے تو اس سے محبت ہے۔ جس نے مجھے اتنا کہا تھا کہ غریب لوگوں کا دل پتھر نہیں ہوتا۔ وہ بھی تمہاری طرح کا ہی دل رکھتے ہیں۔۔ میں نے کہا۔

آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو۔۔؟ اس نے کہا۔

کچھ بھی نہیں۔۔۔ میں نے جواب دیا۔

تجھے ایک غریب سے اتنی محبت ہے اگر وہ تجھے اپنانا چاہے تو۔۔؟

جی ہاں۔۔ کیوں نہیں۔۔ میں نے کہا۔

میرا لباس دیکھ رہی ہو۔

جی ہاں۔۔۔ میں نے جلدی سے کہا

ایسا لباس استعمال کر سکتی ہو ؟

کیوں نہیں۔۔۔

دیکھ لو کہیں تمہارے والدین یہ نہ کہہ دیں کہ تم نے یہ کم قیمت والے کپڑے کیوں پہنے شروع کر دیے ہیں۔ اشرف نے مجھ سے کہا۔

میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔۔

مگر غریب اپنی مرضی کا مالک نہیں ہوتا

میں تمہارے ساتھ ہوں اور اس بات کا اعلان کرتی ہوں۔ اس نے کہا۔

جو تم کہو گے وہی میں کروں گی۔

اچھا کوثر۔۔! جاؤ آج کے بعد تجھے تمہاری محبت مبارک ہو۔۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ مگر آج کے بعد میں تجھے بے پردہ نہ دیکھوں۔ اگر تجھے ایک غریب سے محبت ہے تو میں اس بات کی تصدیق کروں گا کہ تم نے واقعی پردہ کر رکھا ہے۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے ان کو اپنے دوپٹے سے خشک کیا تو اشرف نے مجھے اپنے پاس بلا لیا اور کہا۔

ہمارا دل بہت نازک ہوتا ہے یہی سمجھ لو کہ کانچ کا کھلونا ہے۔ تھوڑی سی ٹھیس پہنچی تو ٹوٹ جائے گا۔ لیکن اس سے کھیلنے کا کسی کو موقع نہ دیں گے۔ اگر یہ دل ٹوٹ گیا تو زندگی بھر اسے جوڑ نہ سکو گی۔

نہیں اشرف۔۔! ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

اچھا تو اب جاؤ! جس کی مجھے تمنا تھی۔ میں نے اس کا ذکر کر دیا۔۔ مگر میری کہی باتوں کو نہ بھولنا۔

میں وہاں سے آ گئی۔ آج خوشی کا سکون مجھے آج تک نہیں ملا تھا۔ لیکن بات اب یہ در پیش تھی کہ برقعہ اب کیسے پہنوں جبکہ میں نے آج تک پہنا ہی نہ تھا۔ میرے والدین نے اس بارے میں کئی بار کہا مگر میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ لیکن آج میری محبت یہ پابندی لگا رہی ہے۔

آج میں نے صبح اپنی والدہ کو برقعہ کے لیے کہا تو امی بولیں۔ کہ کیا ضرورت ہے برقعے کی میری بیٹی کو۔۔۔

در اصل امی جان! جب میں گھر سے باہر نکلتی ہوں تو لوگوں کی نظریں میرا تعاقب کرتی ہیں۔ میں ان سے بچنے کے لیے برقعہ پہن رہی ہوں۔ نہ کوئی دیکھے اور نہ نگاہوں کے تیر چلائے۔ میں نے بڑے پیار سے امی جان کو سمجھایا کہ امی نے مجھے کہہ دیا۔ جیسے میری بیٹی کی مرضی ہے۔ میں تو اپنی لاڈلی کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔

پھر وہ عورت جو دولت کی آڑ میں اپنے شرم و حیا کے مقام کو بھلا چکی تھی اسے ایک غریب کے گھر سے نصیب ہوئی اور جب میں برقعے کر یونیورسٹی گئی تو سب سے پہلے تو فوزیہ نے ہی کہا۔

ایمان سے اسے اتار نہ پھینکنا بہت اچھا لگتا ہے۔۔ فوزیہ کو کیا علم تھا کہ میں نے تو اپنے پیار کی بات کو عملی جامہ پہنایا ہے۔ اور مجھ کو برقعہ پہن کر وہ سکون ملا۔ جس کی میں برسوں سے تمنا رکھتی تھی۔ اور میرے عام لباس میں بھی تبدیلی آ گئی۔ کہاں اونچے درجے کے لباس اور کہاں آج ایک معمولی لباس میں تھی۔۔۔ یہ میرا ہی دل جانتا تھا کہ میں ایسے میں کتنی خوش کتنی سکون تھا۔

دن گزرتے رہے۔۔۔ محبت پروان چڑھتی رہی اور واقعی اشرف نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ محبت کا خلوص تو صرف اور صرف غریبوں کے دل میں ہوتا ہے اور اس خلوص اور محبت میں ہم بہتے ہوئے وہاں تک نکل آئے جہاں سے ہمارے لیے واپس جانا مشکل تھا۔

ایک دن میں اپنی سہیلی سے ملنے گئی تو وہ مجھے گھر نہ ملی۔ بلکہ اشرف اکیلا ملا۔ میں اس کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد چائے لے آیا۔ میں چائے بنانے لگی یونہی میں نے چور نگاہوں سے اسے دیکھا تو میری طرف ہی وہ دیکھ رہا تھا۔ یونہی میں نے چائے کا کپ اسے دیا تو اس نے کپ پکڑنے کے ساتھ ہی پوچھا۔

کوثر۔ ؟

جی۔۔ میں نے کہا

میں نے اب ارادہ کر لیا ہے کہ تجھے تمہارے والدین سے مانگ لوں۔۔۔

میں یہ بات سن کر شرم سے سرخ ہو گئی۔ اور مجھے اپنا آپ مہکتا محسوس ہوا۔ اور دل سے یہ صدا بار بار اٹھنے لگی کہ کاش ایسا ہو جائے۔ اور میں تو خود اسے کہنا چاہتی تھی تاکہ مجھے یہ نہ کہہ دے میں نے اسے بتایا نہیں۔۔

میں اپنی سوچوں میں گم تھی مگر پھر اچانک خیالوں کی دنیا سے باہر آ گئی جب اس نے مجھ سے پھر کہا۔

مجھے ابھی تک جواب نہیں ملا۔

میں کیا کہہ سکتی ہوں۔۔

نہیں پھر بھی آپ کا ارادہ۔ ؟ اس نے میری طرف شوخ نظروں سے دیکھا تو میں ان کی تاب نہ لا سکی۔ اور اپنا چہرہ اپنے ہی ہاتھوں میں چھپا لیا۔

تمہارا اقرار سمجھ گیا ہوں۔ میں چند دنوں بعد اپنے والدین کو تمہارے ہاں بھیجوں گا۔ کیونکہ اب تو میں نے ملازمت اختیار کر لی ہے ملتان میں۔۔۔ اب ہم غریب نہیں رہیں گے۔ لیکن یہ بھی دل میں خیال مت لانا کہ ہمارے پاس دولت آ گئی تو ہم اپنے اس دور کو بھول جائیں گے جو گزر چکے ہیں۔ جو لوگ دولت کا سہارا لے کر ان دنوں کو بھول جاتے ہیں میں ان میں سے نہیں ہوں۔

میں نے آنا چاہا تو اشرف نے مجھ سے کہا کہ اب ہمارے ہاں مت آنا کیونکہ یہ ہم غریبوں کی عزت ہے۔۔۔ انشاء اللہ اب تو۔۔! یونہی اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا تو میں بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکی اور شرما کر اشرف کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔

میں اپنے گھر چلی آئی۔ ابھی دو ہفتے گزرے ہوں گے کہ میری سہیلی اپنی والدہ کے ساتھ ہمارے گھر آئی۔ آج تک اسے

میرے اور اشرف کی محبت کے بارے میں علم نہ تھا۔ مگر آج تو وہ میرے قریب آ کر کہنے لگی کیا جادو کر دیا ہے میری بھابی جانی نے بھیا پر کہ آپ کا ہی نام لیتے ہیں... اور مجھے اس بات سے بے خبر رکھا۔

نہیں... میں نے کہا۔

واہ بھئی! نہیں والی کون سی بات ہے۔ بھائی نے مجھے صاف صاف بتا دیا ہے اور آج ہم آپ کو اپنی بھابی بنا کر ہی جائیں گے۔ ورنہ پھر کبھی نہیں آئیں گے۔

فوزیہ کی والدہ میری والدہ کے پاس چلی گئیں۔ اور پھر باتوں باتوں میں مجھے اپنی والدہ کی آواز سنائی دی۔ ہاں بہن، تو ایسا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ میری بیٹی کی خوشی اسی میں ہے گر۔ میں کیا کروں میاں جی کی بات ہے۔ وہ آنے والے ہیں۔ میں ان سے بات کروں گی۔ اور تجھے بتا دوں گی جونہی فوزیہ اور اس کی والدہ جانے لگی تو ابا جان آ گئے۔ کیونکہ پہلے ہی ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ ابا جان نے کہا۔

بیٹی خیریت سے کی۔ ہے کہ تم چل دیں کیسے آنا ہوا

... فوزیہ نے ابا جان نے جب اتنے سوال کر دیے تو وہ بیاہ کی کہہ بیٹی۔ خالہ جان سے میں نے سب کچھ کہہ دیا ہے ... نے کیا ہے بیٹی فوزیہ نے... ابا نے امی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امی ابا جان کو خوش موڈ میں دیکھ کر بتانے لگیں اور ہم واپس کمرے میں آ گئیں... ہمیں اس وقت پتہ چلا جب ابا جان اونچی اونچی آواز میں کہہ رہے تھے "اپنی حیثیت جانتی ہو"

میں اور فوزیہ آواز سن کر جلدی سے دروازے کے قریب آ گئیں... تو فوزیہ کی والدہ نے کہا۔

بھائی جان آپ کی بات درست ہے۔ میں اپنے لڑکے کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ہم غریب ہیں۔ مگر اس نے کہا ماں میری خوشیوں کی خاطر ایک دفعہ آپ چلی جائیں۔ یہی ہے نال کہ انکار کر دیں گے۔ لیکن تمہاری قسم کھاتا ہوں کہ اگر انہوں نے انکار کر دیا تو تم جہاں کہو گی میں انکار نہ کروں گا۔ بھائی جان! آپ نے مجھے میری حیثیت یاد کرا کر جو انکار کیا ہے اس کے بغیر بھی آپ کے پاس جواب کے حل بہت تھے آپ کہہ دیتے کہ میں رشتہ کر چکا ہوں۔ تو ہمیں ہمارا جواب مل جاتا تھا

کسی کا حیثیت بتانے کے لیے آپ نے جو الفاظ استعمال کیے ان سے انسان کی حیثیت کا علم نہیں ہوتا۔ انسان کی حیثیت دولت سے نہیں اخلاق سے پہچانی جاتی ہے۔ ویسے میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔ اچھا کیا جو آپ نے ہمیں یاد دلوا دیا مگر یاد رکھنا پہلے کبھی کسی موڑ پر تمہاری بیٹی نے کسی اور کو ٹھکرا دیا تو میرے در پر نہ آنا۔ میں اپنی حیثیت جانتی ہوں اور تمہاری بیٹی وہ اس لیے کہ غریبوں کے پاس دینے کے لیے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اور باقی ایک بات میں تجھے بتا دوں کہ جن کے ہاں بیٹیاں جنم لیتی ہیں۔ ان کی اونچی ناک نہیں ہوتی۔ وہ اس قدر جھک جاتے ہیں جیسے کوئی تیر چلانے والے کمان کو جھکا لیتے ہیں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کوئی بات نہیں میں یہ سوچ کر چلی جاؤں گی کہ آپ نے انکار کر دیا۔ آپ کا اپنا اختیار ہے جسے چاہیں پسند کریں۔ اور شاید آج کل کی لڑکیاں بھی اپنے والدین کی پسند کو اچھا سمجھتی ہیں...

فوزیہ نے میری طرف غور سے دیکھا اور کہنے لگی کیا کروں مقدر میں نہ تھا ورنہ تجھے بھائی کے روپ میں دیکھنے کو یہ آنکھیں بے تاب تھیں... مگر اب کبھی نہ دیکھ سکوں گی اگر میرے بھائی نے تجھے کوئی ایسی بات کہہ دی یا تم نے کوئی چیز وغیرہ دی ہے تو وہ بھی آپ کو مل جائے گی۔ کیونکہ ہم غریب ہیں۔ جو کسی کی رسوائی پسند نہیں کرتے۔

نہیں فوزیہ! ہم نے ایسی کوئی چیز نہیں لی دی۔ بس سے بعد میں رسوائی ہو۔ فوزیہ اور اس کی والدہ چلی گئیں۔ ابا جان اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں امی کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اور سب کچھ بتا دیا کہ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میری ماں میرا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ ابا کو اس بارے میں کوئی علم نہ تھا کہ اس کی بیٹی کی خوشی اشرف کی زندگی کے ساتھ ہے امی نے ابا سے یہ بات کی تو ان کا پارہ چڑھ گیا۔ اس کے بعد مجھے یونیورسٹی جانے سے روک دیا گیا۔ پڑھا اب کیا تھا۔ محبت جس کی تمنا کی تھی دنیا والوں نے چھین لی۔ اس وقت میں تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی۔ اور میں خاموش پنچھی کی طرح سونے کی چار دیواری جو سونے کا پنجرہ تھی۔ اس میں بند کر دیا گیا۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ دنیا اس میں نفرت اور جدائی کی دیوار بھی بن جاتی

بُھلا کر جس روپ میں جی چاہے ڈھالا جا سکے۔ اور اس گناہ کے کرشمے میں پورے چار سال گزر گئے ...

میں نے کئی دفعہ خودکشی کی بھی کوشش کی مگر پھر دل میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے لیکن یہ نہ کہے کہ میں نے تجھے زندگی دی تھی تو نے اس کی حفاظت نہ کی ... اس کو اپنے ہی ہاتھوں ختم لیا۔ آخر میں نے یہ ارادہ بھی بدل دیا .. مگر مجھے اس ماحول سے نفرت ہو چکی تھی ... میں یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی

آخر ایک دن قسمت نے ساتھ دیا ... موقع پا کر فرار ہو گئی ... چھپتے چھپاتے لاہور پہنچ گئی ... کیونکہ اب میں گھر کون سا منہ لے کر جاتی ... اپنے اشرف کو کیا منہ دکھاتی یہاں داتا صاحب چلی آئی ...

چند دن تو یوں ہی گزر گئے ... میرے پاس نہ تو کپڑے تھے اور کوئی اور سوٹ جو میں پہن لیتی۔ جو میں نے پہن رکھا تھا وہ بھی بہت گندا ہو چکا تھا ... تو لوگوں نے مجھے بھکارن سمجھ کر کچھ نہ کچھ دینا شروع کر دیا ... میں نے اسے ہی اپنی بھوک کا سہارا بنا لیا .. زیادہ بھی نہیں جب بھوک لگتی ہے تو کھانے کے لیے چند سکے مانگ لیتی ہوں۔ اور اس کے بعد پیٹ بھر جاتا ہے۔ تو خاموش ہو جاتی ہوں .. شام کو داتا دربار سے باہر جا کر سو جاتی ہوں۔

کتنا عرصہ ہوا ہے تمہیں یہاں آتے ہوئے .. میں نے کوثر کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ جو ساون کی طرح رم جھم کا سا سماں بنائے ہوئے تھیں۔

دو سال سے اوپر ہو چکے ہیں ... مجھے یہاں آئے ہوئے کوثر نے کہا ...

ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو تو ...

کیا بات ہے بھائی جان .. ؟

میں یہاں پر اجنبی ہوں اور ملازمت کر رہا ہوں ... ہمارے پاس نہ کوئی کھانا پکانے والی ہے۔ اس لیے خود ہی پکا لیتے ہیں۔ اگر تم ہمارے ساتھ چلو تو یہ کام تم خود کر لیا کرنا۔ اور تمہیں ایک بھائی کا پیار بھی مل جائے گا۔ اور سکون بھی ... اور یہ پیشہ بھی ترک ہو جائے گا۔

کوثر نے بہت انکار کیا۔ مگر اس نے بعد میں اقرار کر لیا۔

تو میں اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ اور اسے گھر چھوڑ کر کچھ کپڑے ریڈی میڈ خریدے۔ اور لا کر اسے دیئے ... پھر سبزی وغیرہ۔

کوثر ہمارے پاس دو ماہ رہی۔ کیونکہ تیسرے دن انور آ گیا ... تو میں نے سارا واقعہ اسے سنایا نہ جانے اس نے کس وقت کوثر سے ایڈریس لیا ..

چند دن کی چھٹی پر چلا گیا جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک بزرگ تھے۔ جونہی انہوں نے کوثر کی جانب دیکھا تو رونے لگے۔ اور بعد میں پتہ چلا کہ یہ کوثر کے والد ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ کوثر کی والدہ اس کی جدائی برداشت نہ کر سکی۔ اور وہاں چلی گئی ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ اور پھر انور نے ہی اشرف سے ملاقات کی اور تمام حالات اس کے سامنے رکھ دیئے ... جو کوثر نے بتائے تھے۔

اشرف نے جب کوثر کے متعلق یہ سنا کہ وہ کس حال میں ہے تو کہنے لگا میں نے اس کی روح سے محبت کی ہے۔ میں تو اب بھی اسے اپنانے کے لیے تیار ہوں۔ اسے جو بھی تکلیف اٹھانی پڑی وہ میری خاطر اس نے اٹھائی۔ اور آج اگر میں اس کو سہارا نہ دوں تو وہ کیا کہے گی کہ وفا کی راہ پر چلتے چلتے ایک عورت بھٹک گئی تو منزل نے بھی اسے ٹھکرا دیا ہے۔

آخر کوثر کے باپ نے اپنے کیے کی معافی مانگی اور کوثر کا نکاح اشرف کے ساتھ کر دیا۔ وہی صورت جس سے اس کو نفرت تھی بلکہ اس کے ساتھ چلنا بھی گوارا نہ تھا۔ وہی صورت اصل میں اس کے لیے ایک فرشتہ ثابت ہوئی اور وہی صورت جو ایک بھائی کے ہاتھوں لٹتی رہی ... اس کا بھائی نے گوہر نایاب لوٹ لیا تھا۔ اور دوسروں کے لیے نفرت کا سامان بن گئی تھی۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں یہ نکاح ہوا اب وہ اپنے گھر میں خوش ہے مگر جب اس کا خیال آتا ہے ... تو بے اختیار یہ نغمہ گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔

لے آئی پھر کہاں پر قسمت ہمیں کہاں سے
یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

~~~ * ~~~
~~~

تحریر۔ حریت لبنیٰ لاہور

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

خلوص بیکراں ... ایک مدت کے بعد اپنی ایک نئی کاوش ... "بیتے ہوئے دن" ... لے کر جواب عرض کی بزم میں شریک ہو رہی ہوں۔ اس سے پیشتر آپ نے میری دوست کی آپ بیتی ... "زخمی دل" ... کو جواب عرض میں جگہ دے کر جو مجھ پر احسان کیا ہے، وہ شاید میں کبھی نہ اتار سکوں۔ میری اس کاوش کے شائع ہونے پر میری دوست کو قدرے دلی سکون نصیب ہو گیا ہے ... اس کے لیے ہم دونوں ہی آپ کی بے حد ممنون ہیں۔ اس کہانی کے سلسلے میں میرے جن قاری بہن بھائیوں نے مجھے خطوط ارسال کیے ہیں، ان کو چونکہ میں فرداً فرداً جواب نہیں دے سکی، اس لیے ان سب سے معذرت خواہ ہوں۔ اور میں ڈاک کا بھاری خرچہ اٹھانے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ لہٰذا اپنے اس خط کے ذریعے ان سب بھائی بہنوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں ...

شہزادہ صاحب! آپ کی حوصلہ افزائی نے ہی مجھ کو مزید حقائق تلاش کرنے کے لیے اکسایا ہے۔ میں ابھی ادب کے میدان میں طفلِ مکتب ہوں۔ میں کچھ بھی تو نہیں لکھ پاتی، یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے جو آپ میری ٹوٹی پھوٹی تحریروں کو اپنے زیریں قلم سے سنوار کر جواب عرض کے قارئین کی نذر کرتے ہیں۔ اگر آپ یونہی میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے تو مجھے یقینِ کامل ہے کہ میں کسی روز میں جا کر صحیح معنوں میں جواب عرض کے معیار کے مطابق حقائق تخلیق کر سکوں گی ...

شہزادہ بھیا! زیرِ نظر کہانی مجھے میری ایک قلمی دوست نے بذریعہ ڈاک ارسال کی ہے۔ جو بظاہر بیشک مختصر سی ہے مگر اس کے اندر بیتے ہوئے دنوں کی یادیں تازہ ہو رہی ہیں کہ دل بے اختیار لوزنے کی بے بسی پر رونے لگتا ہے۔ اس کی سچائی میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے کہ لوزرین میری جانی پہچانی دوست ہے۔ اسے میں نے اپنی دوست کی زبانی ہی قارئین کی نذر کیا ہے۔ نیز میں نے تمام کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کر دیئے ہیں کہ میری دوست کی خواہش بھی یہی ہے ... آخر میں جواب عرض کی مزید ترقی کے لیے دعاگو ہوں ...

آپ کی دعاؤں کی طالب۔

عفت لبنیٰ معرفت

جواب عرض ۷۷۔ نسبت روڈ۔ لاہور

(ستمبر ۱۹۸۲ء)

میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ گھر کے سب افراد میرے ساتھ بے پناہ پیار کرتے تھے۔ اس وقت میں دسویں کلاس میں زیرِ تعلیم تھی ... مجھ سے چھوٹے چار بہن بھائی تھے۔ دو بہنیں اور دو بھائی تھے۔ ہم کراچی میں پُرسکون زندگی کے دن گزار رہے تھے ... کہ میرے ابو کی ٹرانسفر لاہور میں ہو گئی۔ ہم آنے کو تو لاہور چلے آئے مگر یہاں پر ہمارا جی نہیں لگ رہا تھا ... نیا شہر ہونے کی وجہ سے میری تعلیم بھی متاثر ہو رہی تھی۔ اسی تذبذب میں دن گزر رہے تھے کہ اپنے آپ کو نئی جگہ پر کیسے سیٹ کیا جائے؛

لاہور میں آئے ہوئے ہمیں ابھی ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ایک روز آفس سے آتے ہوئے ابو اچانک ایک جانکاہ حادثے کا شکار ہو گئے۔ شدید زخمی حالت میں انہیں لوگوں نے میو ہسپتال پہنچایا۔ جب ہمیں خبر ہوئی تو ہم سب بہن بھائی اور امی جان چیختے چلاتے ہسپتال میں گئے۔ جہاں پر آکسیجن کے ذریعے ڈاکٹر ابو جان کی سانس بحال رکھنے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے ... مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا .. یا شاید تقدیر کو بھی ہمارا پُرسکون زندگی گزارنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ہمیں ابو کے ساتھ بات کرنے کی بھی مہلت نہ ملی اور وہ

آناً فاناً ہمیں داغِ جدائی دے کر اپنی منزل کو سدھار گئے۔ یہ ہمارے لیے کسی قیامتِ صغریٰ سے کم نہیں تھا۔ ہمارے سروں سے شفقتِ پدری کا سایہ تقدیر نے اٹھا لیا تھا۔۔۔ ہم یتیم ہو گئے تھے۔۔۔

میری امی جان اس صدمے کو برداشت نہ کر سکیں، اور بیمار پڑ گئیں۔۔۔ ہمارا کوئی بھی تو پرسانِ حال نہ تھا لاہور ہمارے لیے نیا شہر تھا اس لیے زیادہ میل ملاقات بھی نہ تھی۔ یہ تو خدا کا شکر ہوا کہ ہم جس محلے میں رہ رہے تھے وہاں کے باسی بے حد ملنسار اور رحمدل قسم کے لوگ تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ لیکن ہمارا سرپرست کوئی نہ ہونے کی وجہ سے فکرِ معاش ہمارے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔ اوپر سے امی جان شدید بیمار تھیں، گھر میں جو تھوڑی بہت پونجی ابو جان نے پس انداز کر رکھی تھی، وہ تھوڑی تھوڑی کر کے امی جان کی بیماری پہ اٹھتی چلی گئی۔۔۔

مگر وقت بہت بڑا مرہم ہے، امی جان بھی اس مرہم سے تندرست ہو گئیں۔۔۔ مگر ان کے دل کا گھاؤ رہ گیا۔ اور چند اقتصادی وجوہ سے میں اپنی تعلیم بھی جاری نہ رکھ سکی اور دسویں میں ہی اسکول چھوڑ دیا۔ امی جان نے ہم بہن بھائیوں کا پیٹ پالنے کے لیے محنت مزدوری شروع کر دی۔ وہ کپڑے سینے میں ماہر تھیں لہٰذا انہوں نے گھر پہ محلے والوں کے کپڑے سینے شروع کر دیے۔ چونکہ محلے کے لوگ رحم دل ہونے کے ساتھ ساتھ ہمارے دگرگوں حالات سے بھی بخوبی واقف تھے۔ اس لیے وہ ہر ممکن کپڑے سلائی کے لیے امی جان کو دے جاتے۔ اب سارا سارا دن امی جان سلائی کرتی رہتیں اور اگر کبھی موقع مل جاتا تو وہ اڑوس پڑوس کے گھروں میں جا کر ان کا گھریلو کام کاج بھی کر آتیں جس سے انہیں چند روپے کی مزید آمدن ہو جاتی۔۔۔ لیکن شب و روز کی محنت شاقہ کی وجہ سے امی جان کی صحت بھی دن بدن گرتی چلی جا رہی تھی۔ جو کم از کم میرے لیے بہت زیادہ تشویشناک تھا۔ کیونکہ میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی ناں۔۔۔

اپریل ۸۳ء

اب ہمارا ماں کے سوا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا اس لیے ماں کی زندگی ہمیں سب سے زیادہ عزیز تھی۔ جب گھر کی مالی حالت قدرے سنبھلی تو میں نے امی جان کے کہنے پر گھر بیٹھے رہتے ہوئے اپنے دسویں کے امتحان کی تیاری شروع کر دی۔ چونکہ ٹیوشن رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اس لیے میں نے درسی اور ماڈل ٹیسٹ پیپرز اور نوٹس وغیرہ سے مدد لے کر امتحان کی مکمل تیاری کی۔ اور پھر پرائیویٹ طور پر داخلہ بھیج کر دسویں کے امتحان میں بیٹھ گئی۔ قسمت نے ساتھ دیا اور میرے تمام پرچے بہت ہی اچھے ہو گئے۔ جس کی وجہ سے رزلٹ کی طرف سے میرا دل پُرسکون ہو گیا۔ پھر جب انسان خلوصِ دل اور نیک نیتی سے کسی کام کے لیے محنت کرتا ہے تو قدرتی طور پر انسان کا ذہن اس کام کے نتیجے کی طرف سے مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہی حال میرا تھا۔۔۔ اور پھر جب میرا رزلٹ آؤٹ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے میری محنت کا ثمر اعلیٰ فرسٹ ڈویژن میں عطا فرمایا۔ اس وقت میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔۔۔ میرے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ میں کامیابی و کامرانی کی ہواؤں کے دوش پہ اڑ رہی تھی۔۔۔

میں نے جب یہ خوشخبری امی جان کو سنائی تو ان کے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ یہ خوشی اور مسرت کے آنسو تھے مگر عین اسی لمحے ہم ماں بیٹی ایک دم بے حد اداس اور سوگوار ہو گئیں۔ کہ مجھے اپنے پیارے ابو اور امی جان کو اپنا مجازی خدا یاد آ گیا تھا۔۔۔ کاش۔ خوشی کے اس موقع پر میرے ابو ہمارے درمیان موجود ہوتے تو ہماری یہ خوشی کئی گنا زیادہ بڑھ جاتی۔۔۔ لیکن قدرت کے کاموں میں کسی انسان کو دخل اندازی کرنے کا یارا نہیں ہے۔ خداوند قدوس کا ہر کام انسان کے حق میں بہتر ہوتا ہے، خواہ ظاہری طور پر اس میں انسان کا کتنا ہی بڑا اور زیادہ نقصان کیوں نہ ہو۔

بہرحال رات اور دن کی آنکھ مچولی جاری رہی، خزاں کے بعد بہاریں آتی رہیں، پت جھڑ میں درخت ٹنڈ منڈ ہوتے رہے۔ وقت کا دریا اپنی رفتار پر

جوابِ شوق لاہور

بہتا رہا... کبھی اس میں طغیانی آجاتی اور کبھی پھر سرد سی شکست روی پیدا ہو جاتی...

لاہور میں ابھی تک میری کوئی سہیلی نہ بنی تھی اور نہ ہی میں نے کسی سے ایسے مراسم پیدا کیے تھے۔ کیونکہ میرے گھر کے حالات ہی ایسے نہ تھے کہ میں دوستیاں پالتی پھرتی۔ دن رات سلائی کا کام کرتے کرتے امی جان کی صحت بہت زیادہ گر چکی تھی... میں ان کی حالت دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔ اور پھر اس کے سوا میں صورت ذات کر بھی کیا سکتی تھی۔ امی جان سے میں نے اجازت چاہی کہ میں کہیں ملازمت کر لیتی ہوں تا کہ گھر کے خرچ اور چھوٹے بہن بھائیوں کی تعلیم کے سلسلہ میں آپ کا ہاتھ بٹا سکوں۔ مجھ سے چھوٹا میرا بھائی ناصر چھٹی کلاس میں تھا، اس سے چھوٹا عامر پانچویں میں اور اس سے چھوٹی بہن نائلہ تیسری کلاس میں تھی... جبکہ سب سے چھوٹی مونا ابھی امی جان کی گود میں تھی۔ مگر امی جان نے مجھے ملازمت کرنے کی اجازت نہ دی، ان کا کہنا تھا کہ آج کا دور لڑکیوں کو ملازمت کروانے کا دور نہیں ہے... یہاں انسانوں کے روپ میں بھیڑیئے پھر رہے ہیں اور عورت کی عزت پر ان کی ہوس پرست نظریں ہر وقت لگی رہتی ہیں...

ان کی اس بات کا تجربہ مجھے اس وقت ہوا جب میں نے ان کی مرضی کے خلاف چوری چھپے چند ایک جگہوں پر سروس کے لیے اپنی درخواستیں ارسال کیں، جن کے اشتہار اخباروں میں چھپے تھے۔ مگر کسی ایک نے بھی مجھے اپنے اشتہار کے مطابق نہ پرکھا بلکہ الٹے پلٹے تنگ سوالات کر کے مجھے رام کرنے کی کوشش کرتے رہے.... تب میں نے اپنے ذہن سے ملازمت کرنے کا خیال ہی ترک کر دیا۔ کہ عورت کو عزت سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں ہوتی۔ کہ یہی اس کا سرمایۂ حیات ہوتا ہے۔

دن جوں توں کرتے ہوئے گزرتے رہے۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ امی جان کی آنکھیں کام کر کر کے ورم آلود ہو چکی ہیں... تب مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے ارادہ کر لیا کہ گھر کی چار دیواری میں رہ کر عزت سے محلے کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو ٹیوشن پڑھاؤں گی۔ جب میری امی جان نے میری اس خواہش کا اظہار محلے کی عورتوں سے کیا تو انہوں نے معقول فیس پر اپنے بچوں کو میرے پاس ٹیوشن کے لیے بھیجنا شروع کر دیا۔ اور میں بچوں کو ٹیوشن پڑھانے لگ گئی۔

اس سے ہماری مالی حالت بہت حد تک سدھرنی شروع ہو گئی۔ اور میں نے امی جان کا کام بھی کم کروا دیا۔ میرے پاس خاصی تعداد میں بچے آنے شروع ہو گئے چونکہ میں بچوں کو پڑھاتی بھی بڑی محنت اور شوق سے تھی، جس کی وجہ سے آس پاس کے محلوں سے بھی بچے آنے لگ گئے۔ وقت ایک بار پھر خوشگوار اور پُرسکون ماحول میں گزرنے لگا۔ اور میں مطمئن سی ہونے لگی...

ایک روز شام کے وقت امی جان کسی کے گھر سلائی کا کام دینے گئی ہوئی تھیں اور میں بچوں کو پڑھا رہی تھی کہ ایسے میں اچانک ایک خوبصورت ماڈرن سی لڑکی ہمارے گھر میں داخل ہوئی... وہ کسی امیر گھرانے کی فرد لگ رہی تھی۔ اس نے آ کر کہا:

"میں نے سنا ہے کہ آپ گھر میں رہ کر بچوں کو ٹیوشن دیتی ہیں..."۔ میں نے جواب میں کہا۔ جی ہاں۔ اس پر وہ کہنے لگیں کہ ہمارے دو بچے ہیں، جو ابھی نرسری میں ہیں۔ اگر آپ انہیں ہمارے گھر آ کر ایک گھنٹہ ٹیوشن دے آیا کریں تو ہم آپ کو معقول فیس دے دیا کریں گے۔"

میں نے کہا... "میں اپنی امی جان کی اجازت کے بغیر ہاں نہیں کر سکتی... میں ان سے بات کر کے آپ کو کوئی جواب دے سکوں گی"۔

تب وہ لڑکی مجھے اپنے گھر کا ایڈریس دیتے ہوئے کہنے لگی: "کل آپ امی سے پوچھ کر آ جائیں..."۔

میں اس کا ایڈریس دیکھ کر بولی... "باجی میں تو لاہور کی گلیوں سے ابھی واقف نہیں ہوں"۔

"کیا آپ یہاں پر نئے نئے آئے ہیں"۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔

"جی نہیں تو... کچھ عرصہ ہو ہی گیا ہے یہاں پہنچے ہوئے، لیکن چونکہ کبھی کہیں آئی گئی نہیں ناں، اس لیے"۔ میں نے مزید کہا۔

میری بات پر وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے آج آپ اپنی امی جان سے بات کرلیں، گر وہ راضی ہوگئیں تو کل میں خود آ کر تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی!.. ورنہ کر وہ پھر بولیں... "اوہ! ابھی تک ہمارا تعارف تو ہوا ہی نہیں... میرا نام سلمیٰ ہے... اور آپ کا...؟"

"مجھے نورین کہتے ہیں باجی!"

"بہت پیارا نام ہے... اچھا تو نورین ٹھیک ہے نا پھر امی جان سے ضرور بات کرنا!!"

"جی بہت اچھا..."

پھر وہ کچھ دیر بیٹھی میرے ساتھ باتیں کرتی رہی اور دوسرے دن آنے کا کہہ کر چلی گئی...

شام کو جب امی جان واپس گھر آئیں تو میں نے ان سے بات کی... پہلے تو امی جان نہ مانیں اور کہنے لگیں "کہ بیٹا میں نہیں چاہتی کہ تم روزانہ کسی کے گھر جا کر ٹیوشن پڑھاؤ۔ کیونکہ زمانہ بہت خراب جا رہا ہے"۔

مگر جانے سلمیٰ میں کیا بات تھی کہ میں نے اس کی وکالت کرتے ہوئے امی جان کو راضی کر ہی لیا...

دوسرے دن سلمیٰ آئی اور میں اس کے ساتھ ان کے گھر چلی گئی.... بہت خوب صورت گھر تھا ان کا... وہ اپنی ماں کے پاس رہ رہی تھی۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ جبکہ اس کا خاوند کہیں بیرون ملک سروس کر رہا تھا۔ بہرحال میں نے اس کے بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا۔ صبح کے وقت میں اسکول کے بچوں کو پڑھاتی، جبکہ شام کو اپنے محلے کے بچوں کو پڑھاتی۔ اب ہماری مالی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی اور گھر کا نظام بہت خوب طریقے سے چل رہا تھا۔ گھر کی سب ضروریات پوری ہو رہی تھیں... میں نے امی جان سے کہہ کر ایک ٹی۔وی بھی منگا لیا تھا۔ اب امی جان نے لوگوں کے گھر جا کر کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ صرف گھر میں رہ کر چند ایک اچھے گھرانوں کی سلائی کا کام کر لیتی تھیں۔ اب شام کو کافی بچے میرے پاس پڑھنے کو آتے تھے۔ گھر میں ایک اسکول کا سا سماں ہوتا تھا۔

ایک روز شام کو ایک بچی مجھ سے کہنے لگی۔ "مس آپ کو میری باجی ملنا چاہتی ہے!.."

میں نے اس بچی سے کہا: "بے بی اگر آپ کی باجی مجھ سے ملنا چاہتی ہیں تو وہ خود آجائیں... میرے پاس تو ٹائم نہیں ہے!.."

کچھ دنوں کے بعد اس بچی کے ساتھ ایک بہت ہی ماڈرن قسم کی لڑکی آئی۔ اور اپنا تعارف کراتے ہوئے مجھ سے کہنے لگی۔ "میرا نام ثریا ہے۔ گڑیا ہر روز آپ کی بہت تعریفیں کیا کرتی ہے کہ ہماری مس ہمیں بہت اچھا پڑھاتی ہیں... اس لیے آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا!.."

میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔ چائے وغیرہ پلائی۔ اور پھر وہ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد واپس چلی گئی۔

اور پھر وہ تقریباً روزانہ ہی میرے پاس آنے لگی۔ اور اکثر اوقات کافی دیر بیٹھی باتیں کرتی رہتی۔ ثریا مجھے روزانہ کہتی کہ کبھی ہمارے گھر بھی آؤ نا نورین! مگر میرے پاس اتنی فرصت کہاں ہوتی تھی کہ کسی کے گھر جا کر گپ شپ لگا سکتی...

ایک دن میرے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا کہ جو میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی... آج بھی جب کبھی اس واقعہ کو یاد کرتی ہوں تو خوف سے اپنی آنکھیں بند کرلیتی ہوں۔ ہوا یوں کہ ایک روز ثریا میرے پاس آئی اور کہنے لگی:

"نورین آؤ ذرا بازار چلیں، میں نے کچھ چیزیں وغیرہ خریدنی ہیں"...

"مجھے میرے پاس تو ٹائم نہیں ہے اس لیے تم اکیلی ہی چلی جاؤ"... میں نے جواب دیا۔

لیکن وہ میری بڑی منت سماجت کرنے لگی کہ میری امی نے صرف اس شرط پر مجھے بازار جانے کی اجازت دی ہے کہ میں تمہیں ساتھ لے کر جا رہی ہوں... اس لیے تم میری خاطر ساتھ چلی چلو، ورنہ میری امی مجھ سے ناراض ہوں گی...

میں ثریا کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں آگئی اور ہم صبح دس بجے کے قریب گھر سے چل پڑیں۔ سردیوں کے دن تھے... بازار جا کر ثریا مختلف دکانوں پر مول تول کرتی رہی، ایک دو دکانوں سے اس نے چیزیں بھی خریدیں۔ بازار گھومتے اور شاپنگ کرتے ہمیں تین بج گئے... ایک دوکان سے جب ہم باہر نکلیں تو ثریا مجھ سے بولی:

"چلو نورین آج فلم دیکھیں"...

اس دوران میں محسوس کر رہی تھی کہ ایک نوجوان لڑکا برابر ہمارے تعاقب میں ہے، میں نے ثریا کی توجہ بھی اس طرف دلائی مگر اس نے بات گول کر دیا۔ تب میں نے اس سے کہا کہ نہیں ثریا میں نے کبھی سینما میں فلم نہیں دیکھی۔ اس لیے گھر چلو... مگر ثریا شاید آج گھر سے فلم کا ارادہ ہی لے کر نکلی تھی اور شاپنگ محض بہانہ تھا... میں نے بہت انکار کیا مگر وہ نہ مانی۔ اور مجھے زبردستی ایک سینما لے گئی۔ بات بڑھ جاتی اس سے میں تکرار بھی نہ کر سکی۔ مگر دل ہی دل میں، میں بہت ڈر رہی تھی۔ کیونکہ زندگی میں یہ میرا پہلا موقع تھا کہ میں گھر سے اکیلی نکلی تھی... ثریا سے میں نے بہت کہا کہ پہلے مجھے گھر چھوڑ آؤ پھر تم شوق سے فلم دیکھتی رہنا۔ مگر ثریا اپنی ضد پر اڑی رہی...

یہاں پر بھی وہ بازار والا لڑکا ہمارے تعاقب میں رہا۔ ثریا نے خود ہی جا کر بکنگ آفس سے دو ٹکٹ لیے، ایسے میں وہ لڑکا ثریا کے قریب کھڑا نہ جانے کیا کھسر پھسر کرتا رہا۔ ثریا ٹکٹ لائی اور مجھے ساتھ لیے سینما ہال میں آگئی۔ اس سینما میں پاکستانی فلم "تیری صورت میری آنکھیں" کی نمائش کی جا رہی تھی۔ فلم شروع ہوئی مگر میرے ذہن میں اپنے خدشات سر ابھارتے رہے... مجھے تب ہوش آیا جب فلم کا انٹرول ہوا۔ ثریا نے ایک بیرے سے دو کوک لیے اور ہم پینے لگ گئیں... ایسے میں اچانک وہی لڑکا، جو بازار سے ہمارے تعاقب میں تھا، ہمارے قریب آیا۔ اور بے تکلفی کے سے انداز میں ثریا سے بولا:

"آپ دونوں اکیلی ہیں کیا؟"

"جی ہاں!" ثریا نے جواب دیا۔ پھر ثریا نہ جانے اس لڑکے کے ساتھ کیا کھسر پھسر کرتی رہی...

جب فلم کا شو ختم ہوا تو شام کے چھ بج چکے تھے۔ میں بے حد خوف زدہ تھی۔ مجھے گھر کے راستے کا بھی ٹھیک طرح سے علم نہ تھا۔ میں نے ثریا کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ "خدا کے لیے جلدی گھر چلو میری امی جان میرا انتظار کر رہی ہوں گی..." مگر اس لڑکے نے ثریا کو نہ جانے کیا سبز باغ دکھایا تھا کہ وہ اس کا پیچھا ہی نہ چھوڑ رہی تھی... جب میں اکیلی ہی گھر جانے والے انجانے راستے پر چل پڑی تو وہ لڑکا کہنے لگا:

"محترمہ! بس پانچ منٹ اور رک جائیے... بس ایک کپ چائے پی لیں، پھر بے شک چلی جائیے گا۔"

اور پھر ثریا زبردستی مجھے لے کر اس لڑکے کے ساتھ چل پڑی تھی۔ وہ ہمیں ایک قریبی ریستوران میں لے گیا۔ اور چائے وغیرہ کا آرڈر دے دیا۔ چائے آئی تھی ان دونوں کے بے حد اصرار پر میں نے نہایت بددلی سے چائے کے زہریلے گھونٹ حلق سے نیچے اتارے... چائے پینے کے بعد ہم ریستوران سے باہر نکلے تو وہ لڑکا ہمیں لارنس گارڈن لے گیا۔ اب تو میں بہت ہی پریشان ہوئی۔ وہ ہمیں وہاں پر بھی پہاڑی کے اوپر ایک سنسان گوشے میں لے گیا۔ رات بدستور آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ میں جب بھی ثریا سے گھر چلنے کے لیے کہتی تو وہ مجھے تسلی دیتے ہوئے کہتی:

"نورین! تم گھبراؤ نہیں... کچھ نہیں ہوگا۔ میں خود آنٹی سے کہہ دوں گی کہ میں تمہیں اپنے ہمراہ لے گئی تھی"

مگر خوف تھا کہ لمحہ بہ لمحہ میرے جسم کے رگ و پے میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اور میرے منہ سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ جہاں ہم بیٹھے ہوئے تھے، اچانک وہاں پر ایک آدمی آیا اور اس لڑکے کو، جو ہمیں یہاں لایا تھا، اٹھا کر ایک طرف کو لے گیا... کچھ دیر تک وہ آپس میں نہ جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ ہم کچھ دور سے کچھ نہ سن سکیں۔ ایسے میں ثریا سے میں نے ایک مرتبہ پھر زور دیتے ہوئے کہا کہ ثریا چلو یہاں سے بھاگ چلیں، مجھے

ان دونوں کی نیت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ مگر ثریا نے میری
ایک نہ مانی اور وہیں بیٹھی رہی۔ اتفاق سے میرے پاس
کوئی جیسے کھانا پکا تھا جو میں اکیلی ہی نگلتہ کر کے ادھر چلی آئی۔
میرا ذہن بار بار گھر والوں کی طرف چلا جاتا کہ وہ میرے بے
نہ جانے کس قدر پریشان ہو رہے ہوں گے۔ اور امی جان
میرے بارے میں کیا کیا سوچتی رہی ہوں گی۔
پھر اسی لڑکے نے دور سے ثریا کو اشارے سے
اپنے پاس بلایا اور میں تنہا رہ گئی۔ آس پاس کوئی
بھی نہ تھا۔ سردیوں کے موسم کی خنک ہوا تیز ہوتی جا رہی
تھی۔ آس پاس لگی ہوئی جھاڑیاں ہوا سے سرسراتیں تو
ماحول اور زیادہ خوفناک ہو جاتا۔۔۔ میں اب تک
معلوم نہیں کتنی ہی دیر بیٹھی رہی۔ ثریا کی راہ
دیکھتی رہی مگر اس کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کہاں چلی گئی تھی
خوف کے مارے میرا سارا وجود کانپ رہا تھا کہ اچانک
وہ آدمی جو پہلے ریڈیو کو اور پھر ثریا کو بلا کر لے گیا تھا
میرے پاس آیا اور بولا:
"آپ کو ثریا بلا رہی ہے"۔۔۔
"مگر وہ خود کہاں ہے"۔ میں نے پوچھا۔
"وہ پہاڑی سے نیچے اس طرف کھڑی ہے"۔۔۔
میں اس کے ساتھ پہاڑی سے نیچے اتر آئی اور وہ
مجھے کسی ایک طرف کو جانے لگا۔ مگر مجھے ایک دم شک
ہو گیا کہ اس کی نیت خراب ہے۔۔ میں نے رک کر اس
کے ساتھ چلنے سے انکار کرتے ہوئے کہا:
"ثریا تو مجھے کہیں نظر نہیں آ رہی، کہاں ہے وہ؟"
"ابھی آپ چلیں تو سہی، ثریا بھی آ جائے گی"۔۔۔
"مگر کہاں اور کیوں؟" میں مزید خوفزدہ ہو گئی۔
"یہ کہاں اور کیوں کے سوال میرے ساتھ مت کرو،
اور چپکے سے میرے ساتھ چلتی جاؤ"۔۔۔ اس نے مجھے
دھمکی دیتے ہوئے مزید کہا۔۔۔ "اگر تم میرے ساتھ نہ
گئیں تو صبح کے اخبار میں تمہاری تصویر شائع کرا دوں
گا کہ فلاں لڑکے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے ہوئے
موقع پر پکڑی گئی ہو"۔۔۔ اب اس آدمی نے ذرا اونچی
آواز میں بولنا شروع کر دیا تھا۔ اور اس کی آواز سن
کر راہ چلتے کچھ لڑکے اکٹھے ہو گئے جنہیں دیکھ کر میں
اور زیادہ گھبرا گئی۔ کہ اس سے پہلے کبھی ایسے حالات سے
میں دوچار نہ ہوئی تھی۔۔۔ وہ آدمی دوبارہ بولا۔۔۔ "تم
میرے ساتھ چلو، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا" ساتھ ہی
وہ قسمیں کھا کر اپنی شرافت کا یقین دلانے لگا۔
مگر میں اس کے ساتھ نہ جانے پر بضد رہی۔ جس
پر وہ کہنے لگا۔ "اگر تم خود نہیں چلو گی تو میں تمہیں زبردستی
اپنے ساتھ لے جاؤں گا"۔۔
اس کی یہ دھمکی سن کر میں بہت پریشان ہوئی اور میں
نے رونا شروع کر دیا۔ اور اس سے ہاتھ جوڑتے ہوئے
بولی: "خدا کے لیے مجھے گھر جانے دو۔ میری امی جان میرا
انتظار کر رہی ہوں گی۔۔۔ میں نے تمہارا کیا قصور کیا ہے
جو تم مجھے ناحق تنگ کر رہے ہو"۔۔
میری یہ بات سن کر اس خبیث کے چہرے پر غصے کے
شدید آثار نظر آنے لگے اور اس نے زبردستی مجھے اپنے
ہمراہ لے جانے کی کوشش شروع کر دی۔ جس پر میں اور
زیادہ زور سے رونے لگ گئی۔ ہماری یہ کشمکش، بلکہ میرا
انکار اور اس شیطان نما انسان کی زبردستی دیکھ کر پاس جمع
ہونے والے لڑکوں میں سے ایک صحت مند نوجوان آگے بڑھا
اور اس آدمی سے بولا:
"بھائی! جب یہ لڑکی آپ کے ساتھ نہیں جانا چاہتی تو
پھر آپ اس کو یوں سرِعام زبردستی اپنے ساتھ کیوں لے
جا رہے ہیں۔ چھوڑ دیں اسے"۔۔۔ اس نے ذرا سخت لہجے
میں اس سے کہا۔ جس پر وہ آدمی الٹا اس سے الجھ پڑا۔ اور
ان کی ہاتھا پائی تک نوبت آ گئی۔
یہ صورتحال دیکھ کر پاس کھڑے دوسرے لوگوں نے
بھی اسی لڑکے کی حمایت کی اور اس آدمی کو مار بھگایا۔
یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ جاتے جاتے بھی وہ آدمی
مجھے سنگین نتائج کی دھمکی دے گیا۔ مگر میں نے اس کی
پرواہ نہیں کی کہ میں اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ اس آدمی کے
چلے جانے کے بعد اسی نوجوان نے مجھ سے اصل بات پوچھی
کہ وہ آدمی مجھے کیوں اپنے ہمراہ اس طرح سے زبردستی
لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔

میں نے جواب میں ساری اصل بات اسے بتا دی۔ جب میں نے اسے اپنی رہائش کے بارے میں بتایا تو وہ مجھے پہچانتے ہوئے اپنے بارے میں بتلانے لگا:

"محترمہ! میرا نام شہزاد ہے اور میں آپ کے محلے کے ساتھ والے محلہ میں ہی رہ رہا ہوں۔ میری چھوٹی بہن نادیہ غالباً آپ ہی کے پاس شام کو ٹیوشن پڑھتی ہیں۔ کیونکہ اکثر اس سے میں نے محسن کے طور پر آپ کا نام سنا ہے۔۔ آپ فکر نہ کریں میں خود آپ کو آپ کے گھر چھوڑ کر آتا ہوں مگر آئندہ کے لیے ایسی آوارہ قسم کی لڑکیوں کی دوستی سے محتاط رہیں کہ یہ عورت ذات کی شرافت پر بدنامی کا بدنما داغ ہیں"۔۔ شہزاد نے کہا۔

شہزاد کے لفظ لفظ سے شرافت ٹپک رہی تھی۔ میں اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ تب شہزاد اپنے اسکوٹر پر مجھے بٹھا کر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب ہم گھر پہنچے تو رات کے دس بج رہے تھے۔ جب میں اپنے گھر میں داخل ہوئی تو امی جان کا رو رو کر بُرا حال ہو رہا تھا۔ شہزاد کو میرے ساتھ دیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گئیں۔ جب شہزاد نے ساری صورت حال امی جان کو بتائی تو وہ اسے لاکھ لاکھ دعائیں دینے لگیں۔ کہ بیٹا تو نے میری بچی کی عزت بچائی ہے اللہ تعالٰی تمہیں اس کا اجر دے گا"۔ پھر امی جان نے اس کی شرافت کو دیکھتے ہوئے کہا۔۔" بیٹا! یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے تم بلا روک ٹوک میرے پاس آ جایا کرو، اس سے مجھے خوشی ہو گی"۔۔

اور پھر میں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ کر لی کہ آئندہ سے کبھی ثریا جیسی لڑکی کے ساتھ بات چیت نہ رکھوں گی۔۔۔ ساتھ ہی میں نے ثریا کی چھوٹی بہن کو بھی اپنے پاس ٹیوشن پڑھنے سے روک دیا۔۔۔۔

اب شہزاد اکثر و بیشتر ہمارے ہاں آنے جانے لگا۔ مگر اس نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہ کی تھی کہ جس سے مجھے یا امی جان کو اس کا آنا ناگوار گزرتا۔۔۔ تاہم وہ جب بھی آتا تو باتیں امی جان سے کرتا مگر ساتھ ہی ساتھ میری جانب بھی دیکھتا رہتا۔ مگر اس کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ اس کا یوں دیکھنا مجھے بُرا نہ لگتا۔ بلکہ میں خود بھی اس میں ذرا دلچسپی لینے لگی تھی۔ اس لیے میں خود بھی کبھی کبھار شہزاد کی بہن نادیہ کے ساتھ اس کے گھر چلی جاتی۔ اس کی امی اور بڑی بہنیں بھی مجھے بے حد چاہتی تھیں۔۔۔

ایک دن میں شہزاد کے گھر گئی تو وہ اپنی بہنوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا، مجھے دیکھ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی بہن ٹیپ ریکارڈر سن رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی" باجی! آج میں آپ کو اپنی پسند کا گانا سناتی ہوں۔ کیا آپ سننا پسند کریں گی"۔۔؟

"خود گاؤ گی یا کیسٹ پر سناؤ گی"؟ میں نے پوچھا۔

" میں خود سناؤں گی"۔ وہ بولی۔ اور پھر اس نے گانا شروع کیا ؎

جب بھی یہ دل اداس ہوتا ہے

ابھی اس نے ایک ہی مصرعہ پڑھا تھا کہ شہزاد دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا، جسے دیکھ کر وہ یک دم چپ ہو گئی اور مجھ سے کہنے لگی کہ باجی دوسرا مصرعہ اب آپ پورا کر دیں، مجھے شرم آتی ہے۔۔"۔

اور میں نے یوں مصرعہ پورا کر دیا۔۔۔

جب بھی یہ دل اداس ہوتا ہے
جانے کون آس پاس ہوتا ہے

میں نے جب مصرعہ پورا کیا تو شہزاد داد دیتے ہوئے کہنے لگا۔۔" واہ بھئی واہ۔۔۔ آپ کو تو گانا بھی آتا ہے، بہت اچھی آواز ہے آپ کی۔۔"۔

میں نے مسکراتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر کچھ دیر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد میں اٹھ کر اپنے گھر آ گئی۔ پھر کئی روز اسی طرح گزر گئے مگر شہزاد ہمارے ہاں نہ آیا۔ میں نے بہانے سے اس کی بہن نادیہ سے اس کے بارے میں دریافت کیا، تو اس نے بتایا کہ بھائی جان کئی روز سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں جسے سن کر میں اداس سی ہو گئی اور بچیوں کو پڑھانے کا جی بھی نہ چاہا۔۔۔

کئی روز بعد شہزاد ہمارے ہاں آیا تو امی جان اس سے پوچھنے لگیں کہ تم اتنے دن کہاں تھے؟

جس پر اس نے بتایا کہ وہ دفتر کے کام سے اسلام آباد

گیا ہوا تھا۔۔"۔

پھر امی جان اٹھ کر باہر کسی کام سے چلی گئیں اور میں اور شہزاد تنہا رہ گئے۔ تب اس نے موقعہ پا کر مجھ سے اپنی چاہت کا اظہار کر دیا۔ جسے سن کر میں اپنے دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔ پھر مجھے خاموش پا کر وہ مزید بولا۔ " نورین میں تم سے اپنی چاہت کا اظہار اس لیے نہ کر پایا تھا کہ کہیں تم میرے اظہار کو غلط رنگ نہ دے دو۔ اور۔۔"۔

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ میرے چھوٹے بہن بھائی اندر آ گئے اور وہ خاموش ہو گیا۔۔۔ پھر وہ کچھ دیر بیٹھا ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اور دوبارہ آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

دوسرے دن شام کو شہزاد ٹی۔وی دیکھنے کے بہانے ہمارے گھر آیا۔ اور موقعہ پا کر جلدی سے ایک خط مجھے تھما دیا۔ خط تو میں نے لے لیا مگر میں بہت گھبرا گئی۔ وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ کسی نے اس چیز کو نوٹ نہیں کیا۔ اس وقت ٹی وی پر بہت اچھا ڈرامہ دکھایا جا رہا تھا جب شہزاد چلا گیا اور دوسرے سب گھر والے ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھے تو میں نے دوسرے کمرے میں جا کر خط کھولا۔۔۔ خط کی تحریر کچھ یوں تھی:

" جان سے زیادہ عزیز نورین!

آداب۔۔۔ نورین آپ واحد لڑکی ہیں، جسے میں اتنے خلوص اور دل و جان سے چاہتا ہوں۔ میرا پیار شبنم کی طرح پاک اور روح کی طرح پوتر ہے۔ آپ کی معصومیت اور بھولی بھالی باتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ آپ نے میری چاہت کو قبول کر کے مجھ پر احسان کر لیا ہے۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ مجھے اتنی جلدی میری منزل مل جائے گی۔ اس وقت آپ سے کھل کر بات نہیں ہو سکی، اس لیے کل جب میں آپ کے ہاں آؤں تو مجھے مسکرا کر اپنی چاہت کا یقین دلا دیجئے گا۔۔۔ اور ہاں سدا اسی طرح میرے سنگ رہنا ورنہ تمہارا پجاری تمہاری پوجا کرتے کرتے اپنی جان دے دے گا۔

صرف اور صرف تمہارا۔۔۔ شہزاد!

خط پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں ہواؤں کے دوش پر اڑتی چلی جا رہی ہوں۔۔۔ ساری کائنات میرے قدموں میں آ گری ہے۔ خوشی کے یہ لمحات بھی عورت کو مقدروں سے ہی ملتے ہیں اور عورت کو یہ سب سے بڑی جیت ہوتی ہے کہ کوئی مرد اسے چاہنے لگ جائے۔۔۔ اب تو میں سارا سارا دن شہزاد کی ہی یادوں میں کھوئی رہتی، جب وہ ہمارے ہاں آتا تو میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی۔

ایک روز جب میں ٹیوشن میں بچوں کو ٹیوشن دے رہی تھی کہ شہزاد آیا اور آتے ہی میرے پاس کرسی پر بیٹھ گیا اور خود بچوں کو پڑھانے لگا۔۔۔ میں نے شوخی سے کہا:

" آپ تو بچوں کو بہت اچھا پڑھاتے ہیں!"

تو جواب میں وہ شرارت کے سے موڈ میں بولا۔۔۔ " پھر ابھی سے مزید مشق کر رہا ہوں تا کہ کل کو اپنے بچوں کو پڑھانے و لائیق ہو سکوں"۔۔۔ اس کا جواب سن کر میں جھینپ سی گئی۔ مجھے شرماتے ہوئے دیکھ کر وہ دوبارہ بولا۔۔ " ارے۔۔۔ رے رے۔۔۔ آپ تو شرما رہی ہیں بھئی ایسی باتوں سے شرمانا نہیں چاہیئے"۔

" آپ بہت شریر ہیں، جائیں یہاں سے، مجھے بچوں کو پڑھانے دیں"۔ تب شہزاد تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔۔۔ رات ہوئی تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اور میں شہزاد کے خیالوں میں کھو گئی۔۔۔ آج وہ کیسی باتیں کر گیا ہے۔۔۔ اے باری تعالیٰ تو ہی ہمارے خواب پورے کرنے والا ہے۔۔۔ ہمارے پیار کو دنیا کی نظر سے بچائے رکھنا۔۔۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے نہ جانے کب نیند کی دیوی نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح ہوئی، شام کو جب بچے پڑھنے کے لیے آئے تو نادیہ سے پتہ چلا کہ شہزاد اپنی خالہ کے پاس کسی دوسرے شہر میں گیا ہے۔۔۔ یہ سن کر میرا دل ایک دم سے اداس ہو گیا کہ وہ مجھے بتا کر کیوں نہیں گیا۔ تب میں نے اپنے دل میں ارادہ کر لیا کہ جب وہ آئے گا تو میں اس سے بالکل نہیں بولوں گی۔۔۔ اور پھر نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور میں کافی دیر تک

جواب عرض لاہور

اپریل ۲۰۰۳ء

یوں ہی روتی رہی۔۔۔

کئی روز کے بعد شہزاد آیا تو میرے دل کو کچھ سکون سا ملا۔ مگر میں تو اپنے طور پر اس سے ناراض تھی، اس لیے اپنی خوشی کا اظہار نہ ہونے دیا۔ جب اس سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا۔ جائیں میں آپ سے نہیں بولتی۔ جب شہزاد کو پتہ چلا کہ میں واقعی اس سے ناراض ہوں تو وہ شام کو ہمارے گھر آیا۔ ابھی ٹی۔ وی پر کوئی خاص پروگرام نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے ٹی۔ وی بند تھا۔ اور کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ جبکہ میں اور امی جان باہر بیٹھی سلائی کر رہی تھیں۔ شہزاد جا کر اندر کمرے میں بیٹھ گیا اور امی سے آواز دے کر بولا:

"خالہ جان ذرا ٹی۔ وی تو لگا دیں"۔۔۔

مگر مجھے تو پتہ تھا کہ یہ محض مجھے اندر بلانے کی خاطر ٹی۔ وی لگانے کو کہہ رہا ہے۔۔۔ ایسے میں اچانک میرا چھوٹا بھائی باہر سے آ گیا۔ تو میں نے اس سے کہا:

"پپو جانا ذرا اندر اپنے بھیا کو ٹی وی لگا دو۔۔۔

پپو نے جا کر ٹی۔ وی لگا دیا اور دونوں بیٹھ کر ٹی۔ وی دیکھنے لگ گئے۔ اچانک پپو نے شور مچانا شروع کر دیا کہ باجی، باجی بھائی شہزاد نے ٹی۔ وی کی تصویر خراب کر دی ہے، آ کر اسے ذرا ٹھیک کر دیں۔۔۔ میں خاموش بیٹھی رہی تو امی جان نے بڑے پیار سے مجھے کہا کہ جاؤ بیٹی جا کر انہیں ذرا تصویر ٹھیک کر دو۔!۔ جبکہ میں اپنے دل میں سوچنے لگ گئی کہ یہ کام تو شہزاد خود بھی کر سکتا تھا۔ بہرحال میں اندر گئی، اور ٹی۔ وی ہولڈ تک سے تصویر صاف کر دی۔ اسی دوران شہزاد میرے بھائی سے کہنے لگا:

"پپو بھائی! مجھے ایک گلاس پانی کا تو لا دو"۔۔

پپو جونہی پانی لینے گیا تو شہزاد جلدی سے بولا:

"نورین! ناراض ہو مجھ سے کیا۔۔۔ مجھے پتہ ہے جس بات پہ تم ناراض ہو۔۔۔ پھر میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں کہ میں تمہیں بتا کر نہیں گیا۔ ایک بار مجھے معاف کر دو، آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا"۔۔

جب شہزاد مجھ سے معافی مانگ رہا تھا تو اس پر اس قدر پیار آیا کہ جی خود بخود اسے معاف کرنے کو چاہنے لگا۔ اور پھر میں نے اپنے دل کا کہا مانتے ہوئے شہزاد سے صلح کر ہی لی۔ اس سمے شہزاد کا چہرہ خوشی سے کھلا رہ گیا۔ ابھی ہم مزید باتیں کر ہی رہے تھے کہ پپو پانی کا گلاس لیے آ گیا۔ اور میں اٹھ کر باہر آ گئی۔ اور امی جان کے ساتھ کام کرنے لگ گئی۔ تھوڑی دیر پپو سے باتیں کرنے کے بعد شہزاد بھی اٹھ کر باہر آ گیا، اور امی جان کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تب امی جان اس سے کہنے لگیں:

"شہزاد بیٹے! کل تمہاری امی کہہ رہی تھیں کہ ہم نے شہزاد کی منگنی کرنی ہے"۔۔

"خالہ جان منگنی تو میری کب کی ہو چکی ہے"۔ شہزاد نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

ظاہر ہے میں یہ کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ شہزاد ایسی باتیں کرے۔۔۔ لیکن پھر بھی میں نے انجان بنتے ہوئے اشارہ کیا کہ کہاں منگنی ہوئی ہے تمہاری۔۔؟ جواب میں اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تم سے۔۔۔ اور پھر میں نے شرم سے نظریں جھکا لیں۔۔ ایسے میں امی جان پھر بولیں:

"بیٹے تم کہہ رہے ہو کہ میری منگنی ہو چکی ہے، جبکہ کل تمہاری امی کہہ رہی تھیں کہ ابھی ہم نے شہزاد کے لیے رشتہ دیکھنا ہے"۔۔

"خالہ جان! امی کی کیا بات ہے"۔ شہزاد بولا۔۔۔ "ابھی میں راضی کروں گا۔۔۔ میں شادی کروں گا تو اپنی پسند کی۔۔۔ اور پھر میری نیت تو یہ ہے کہ پہلے ایک بار باہر کا چکر لگا آؤں، خوب پیسہ کما کر لاؤں۔۔ اور پھر اپنا کاروبار سیٹ کر کے خوب دھوم دھام سے شادی کروں۔"۔

امی جان اس کو دعائیں دیتے ہوئے کہنے لگیں "بیٹا اللہ تعالیٰ تمہاری دلی مرادیں پوری کرے۔"۔

جواب میں شہزاد ایک دم سے بولا "آمین ثم آمین"۔

یوں ہی کافی دیر تک باتیں کر کے شہزاد رات گئے اپنے گھر لوٹ گیا۔۔۔

شب و روز یونہی خوشگوار ماحول میں گزرتے رہے۔ ہمارا ہر روز، روزِ عید اور شب، شبِ برات ہوتی۔ اور جب انسان کو اس کی توقع کے خلاف خوشیاں مل جائیں تو وہ اسی زمین پر جنت کا لطف حاصل کر لیتا ہے۔ یہی حال کچھ اپنا بھی تھا۔

اور پھر کوئی دو ماہ کے بعد ہی ایک روز شہزاد نے آ کر خوشخبری سناتے ہوئے مجھ سے کہا کہ میرے ویزے کا بندوبست ہو گیا ہے، میں عنقریب باہر جا رہا ہوں جہاں سے خوب دولت کما کر لاؤں گا، تاکہ تمہیں بھی کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہو۔ مگر میں نے روتے ہوئے جواب دیا:

"شہزاد! خدا کے لیے مجھے اکیلے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں تمہارے بنا ایک پل بھی سکون سے نہ گزار سکوں گی"۔

اس روز پہلی مرتبہ مجھے روتا دیکھ کر شہزاد خود بھی رونے لگا اور پھر بولا۔۔۔ "جانو! صرف ایک مرتبہ ہنس کر مجھے جانے کی اجازت دے دو، اور پھر صرف ایک سال کی تو بات ہے، میں جلد ہی لوٹ آؤں گا"۔

میں نے جواب میں کہا: "جانو! اگر تم ضرور جانا ہی چاہتے ہو تو پہلے اپنے گھر والوں کو راضی کرو، ان سے کہو کہ وہ میری امی جان سے تمہارے لیے رشتہ مانگیں، کیونکہ تمہارے جانے کے بعد نہ جانے کیسے حالات پیدا ہو جائیں"۔۔۔؟

اور پھر شہزاد نے اپنے گھر والوں سے بات کر کے ان کو راضی کیا اور اس کے امی ابو ہمارے گھر میرے رشتہ کے لیے آئے۔ جسے میری امی نے بخوشی قبول کر لیا۔ تب ایک چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کر کے اس میں ہماری باقاعدہ منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔۔۔ کچھ ہی دنوں بعد میں نے مجبوریوں کے تحت اپنے محبوب کو باہر جانے کی اجازت دیتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ اس سے مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے شہزاد سے میری یہ آخری ملاقات ہو۔ اس کے بعد میں اس سے کبھی نہ مل سکوں گی۔۔۔

شہزاد پردیسی بن کر چلا گیا اور مجھے آنسوؤں کے سپرد کر گیا۔ چند ماہ تک اس کے باقاعدگی سے میرے نام خطوط آتے رہے۔۔۔ پیارے پیارے خلوص بھرے خط، جنہیں پڑھ کر میں اتراتی سی ہو جاتی۔ ایسے میں جی چاہتا کہ مجھے پر لگ جائیں اور میں اڑ کر شہزاد کے پاس پہنچ جاؤں۔۔۔

اور پھر اچانک شہزاد کے خط آنے بند ہو گئے۔ میں دن رات پریشان رہنے لگی۔ برے برے خیالات ذہن میں آنے لگے۔ یہ سچ ہے کہ جب انسان نے کوئی دکھ دیکھنا ہو تو اسے اس کے متعلق خواب آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح مجھے بھی ہر رات کوئی نہ کوئی خواب ضرور آتا جو میری پریشانی میں مزید اضافہ کر جاتا۔ اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا جو میرے لیے کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ ایک روز شہزاد کے والد روتے ہوئے گھر آئے اور گھر میں داخل ہوتے ہی چیخ و پکار شروع ہو گئی۔۔۔ میری دنیا لٹ چکی تھی۔۔۔ ہماری محبت کو کسی کی نظر لگ چکی تھی۔ میرا شہزاد، میری روح، میری زندگی مجھے تنہا چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا تھا، وہ جو میرے لیے خوشیاں اکٹھی کرنے گیا تھا، دنیا جہان کے غم میرے لیے چھوڑ گیا تھا۔ شہزاد کو کام کرنے کے دوران بجلی کا ایسا زبردست شاک لگا تھا کہ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔۔

میں اب شہزاد کی قبر پر روزانہ جاتی ہوں۔ اور کہتی ہوں کہ شہزاد مجھے بھی اپنے پاس ہی بلا لو، مگر وہ خاموش ہے۔ اسے اس دنیا سے گئے دو سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر میرے دل سے اس کی یاد کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جب بھی مجھے اس کے ساتھ بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں تو میں یکدم بے چین اور بے قرار ہو جاتی ہوں۔ اور اس کی قبر پر جا کر گھنٹوں آنسو بہایا کرتی ہوں۔ اسی کے پاس مجھے سکون ملتا ہے۔ یہ پہاڑ جیسی زندگی میں اسی کی یاد میں تڑپ تڑپ کر گزار دوں گی کہ یہی میرا اس سے وعدہ ہے۔۔۔

قلمکار، قارئین متوجہ ہوں!

اپنے طویل حقائق اور ناقابلِ فراموش واقعات ارسال کرتے وقت اپنے شناختی کارڈ کی فوٹو سٹیٹ لازماً ارسال کریں، روانگی کی تاریخ درج کریں اور اپنی تحریریں عریانی، فحاشی اور غیر مہذب جملوں سے پاک رکھیں۔ تمام مخش تحریریں ناقابلِ اشاعت قرار دے دی جاتی ہیں۔

(ادارہ)

طلاق
تحریر۔ عارف حسین عمان

مکرمی شہزادہ عالمگیر صاحب :

سلام عقیدت ... میں "جوابِ عرض" کا پرانا پرستار ہوں ۔ آج تک اسے صرف پڑھتا ہی چلا آ رہا تھا مگر آج اس کی رنگین بزم میں پہلی بار عملی طور پر شریک ہو رہا ہوں ... اور وہ بھی ایک انوکھی داستان حقیقت لے کر ... یہ کہانی جس کا نام میں نے ..." طلاق یافتہ دلہن"... تجویز کیا ہے، یہ میری اپنی ہی زندگی کا ایک خونچکاں باب ہے ۔ اس لیے میں نے جوابِ عرض کی پالیسی کی کھلی طور پر خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کے کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی ۔

شہزادہ جی ! میں اس کہانی کو بہت ہی سادہ پیرائے میں تحریر کر کے آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ۔ میں تو اسے سادہ ہی کہوں گا کیونکہ میں نہ تو کوئی ادیب ہوں اور نہ ہی قلمکار ... بلکہ میں تو ایک ٹی وی ٹیکنیشن ہوں اور جس طرح یہ حقیقت میرے ساتھ بیتی ہے اسی طرح اسے آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں .... اب آگے آپ جس طرح بھی چاہیں اس کی نوک پلک سنوار کر خوب صورت تحریر کا روپ دے لیں ۔ اگر یہ آپ کے معیار پر پوری اترے تو اسے جوابِ عرض کی کسی قریب ترین اشاعت میں شامل کر کے قارئین کی عدالت میں پیش کر دیں کہ شاید اسی طرح میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے ...

آخر میں جوابِ عرض کی زیادہ سے زیادہ ترقی کی دعا کے ساتھ ساتھ اپنی اس آپ بیتی کے بارے میں قارئین کی آراء کا شدت کے ساتھ منتظر رہوں گا ...

نیک تمناؤں کے ساتھ ....

نوٹ :
اپنی ہر تحریر کے ساتھ روانگی کی تاریخ ضرور درج کریں تاکہ آپ کی باری جلد آ سکے .... (ادارہ)

عارف حسین ، ٹی وی ٹیکنیشن
ایس ۔ ٹی بی سی پوسٹ بکس نمبر ۳۸۷
مسقط سلطنت آف عمان

میں بھی کتنا بدنصیب انسان ہوں کہ چھوٹی عمر سے لے کر اب تک مجھے کتنے ہی دکھوں، پریشانیوں اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا ۔ رشتہ داروں نے اتنے زخم دیئے کہ اگر انہیں تحریر کرنے بیٹھ جاؤں تو ایک ایک دن کا حال لکھنے پر پورے جوابِ عرض کے کاغذ کالے ہو جائیں مگر میری داستانِ غم ختم نہ ہو۔

اس وقت میری عمر ۲۹ سال ہے ۔ اس وقت میری عمر ۲۰ سال تھی جب میں نے شادی کی ۔ شادی کیا تھی .. لوگ شادیوں کو بہت خوب صورت تصور دیتے ہیں، مگر میرے لیے یہ شادی کسی عذاب سے کم نہ تھی ۔ میں نے بھی سوچا تھا کہ شادی کے بعد کچھ تو سکون ملے گا، مگر مجھے الٹا دکھ درد اور پریشانیاں اٹھانا پڑیں ۔ یہ نہیں کہ بیوی مجھ سے لڑتی یا جھگڑتی تھی ... نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی ...

میں ایک غریب والدین کا چشم و چراغ ہوں ۔ ساری عمر مجھے پریشانی کے علاوہ کچھ نہیں ملا ۔ اور شاید ملے گا بھی نہیں ... بہت تگ و دو کے بعد میں نے اپنے آپ کو سیٹ کیا اور اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے بڑی حد تک اس میں کامیاب بھی کیا ۔ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ہماری بنتی نہیں تھی ۔ یہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے کی بات ہے کہ رشتہ نہ لینے دینے کی وجہ سے رشتہ داروں سے اَن بن سی ہو گئی ... اور ویسے بھی ہم اپنے خاندان والوں میں تقریباً سب سے غریب تھے ۔ سب رشتہ دار اچھی اچھی پوزیشن میں تھے ۔ اس لیے وہ سب دُور ہوتے چلے گئے ۔ اور تو اور ہمارے ماموں تک نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ۔ سگے ماموں نے

نے زخم دیئے کہ مجھے ان سب سے گھن آنے لگی اور مجھے رشتہ داروں سے نفرت ہو گئی۔ جس کی وجہ یہ نکلی کہ مجھے عزیزوں میں شادی کرنا پڑی۔ یہ شادی بھی عجیب انداز میں ہوئی۔

میری دکان ملتان روڈ لاہور شہر میں عارف ٹی وی سنٹر کے نام پر تھی۔ اللہ کے فضل و کرم سے دکان خوب چلی، ایک دن کی بات ہے کہ حسب دستور میں دکان پر کام کر رہا تھا۔ ایک بڑھیا ریڈیو لے کر میری دکان پر آئی۔ کہنے لگی۔

بیٹے یہ ریڈیو چلتا نہیں ہے۔ اسے ٹھیک کردو۔۔۔ اللہ تمہارا بھلا کرے۔

اچھا ماں جی۔۔۔۔ بیٹھیں۔۔۔۔۔ میں ریڈیو ٹھیک کرنے لگ گیا تو بوڑھیا نے مجھے کریدنا شروع کر دیا۔ کہنے لگی۔

بیٹے۔۔۔ آپ کی شادی ہو چکی ہے یا نہیں۔۔۔

نہیں ماں جی۔

ماں باپ زندہ ہیں۔

ہاں ماں جی

کہاں رہتے ہیں۔

وہ گاؤں میں رہتے ہیں۔ لاہور سے تقریباً ۸۰ میل دور ایک گاؤں ہے

تمہارے پاس کون رہتا ہے

کوئی بھی نہیں۔

کھانا کدھر سے کھاتے ہو۔

ہوٹل سے

بیٹا ہوٹل کا بھی کوئی کھانا ہوتا ہے۔

ماں جی کیا کروں۔۔۔۔ مجبوری ہے۔

بیٹے! تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے۔

مجھے کون دے گا۔۔۔۔ نہ تو میرا مکان ہے اور نہ ہی میرے پاس اتنا پیسہ ہے کہ شادی کر لوں۔۔۔ ویسے بھی کون مجھے دے گا رشتہ دار تو چھوٹ گئے ہیں غیر کے دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اگر تم چاہو تو شادی ہو سکتی ہے۔ دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں ہے غریبی امیری اللہ کے ہاتھ میں ہے اللہ تعالیٰ آپ کے ضرور بخت کھولے گا۔ گھبرانا نہیں بیٹا۔۔۔۔ ہو سکتا ہے۔ تمہاری قسمت شادی کے بعد کھلے۔

میرا ارادہ ابھی تک شادی کا نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کیا تھا جب تک شہر میں اپنا مکان اور اچھا کاروبار نہیں کر لوں گا شادی نہیں کروں گا۔۔۔ میں نے مذاقاً بڑھیا کو کہہ دیا کہ ٹھیک ہے شادی کرا دو۔ مجھے تو معلوم تھا کہ بڑھیا پیسے نہ دینے کی وجہ سے چکما دے رہی ہے۔ ریڈیو میں نے تیار کر کے دے دیا اور بڑھیا پیسے دینے کی بجائے دعا دیتی ہوئی چلی گئی۔۔

خدا تمہارا بھلا کرے اور جاتے جاتے شادی کا بھی کہہ گئی۔

میں اسے دیکھتا رہ گیا کہ عجیب عورت ہے۔ پیسے کی بجائے دعا دے کر چلی گئی

وقت معمول کے مطابق گزرتا رہا۔ ایک دن میری دکان کے سامنے رکشا آ کر رکا اور وہی بڑھیا میری طرف آئی۔ کہنے لگی

بیٹا چلو

ماں جی کدھر

ایک رشتہ دیکھا ہے بہت اچھا ہے۔ اچھا خاندان ہے تم میرے ساتھ چلو۔۔ ۔۔۔ وہ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ سب گھر کے حافظِ قرآن ہیں۔ شریف نیک اور مذہبی لوگ ہیں چلو اٹھو بیٹا۔ نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔۔۔۔ کیا سوچ رہے ہو۔۔۔۔۔۔

کچھ نہیں ماں جی۔

بیٹا میں انہیں وقت دے کر آ رہی ہوں۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔

میں بڑھیا کی باتیں سن کر ایک دم نروس ہو گیا کہ بڑھیا بھی عجیب عورت ہے۔ میں نے تو مذاقاً اسے کہہ دیا تھا اور یہ حقیقت سمجھ کر سب کچھ کر بیٹھی ہے۔ اب کیا کہا جائے۔ سوچنے کا کوئی راستہ بھی نہیں مل رہا تھا۔ اسی سوچوں میں غلطاں کہ پھر بڑھیا کی آواز سنائی دی۔

بیٹا جلدی کرو۔ باہر رکشہ کھڑا ہے بڑھیا سوچنے کا موقع بھی تو نہیں دے رہی تھی۔ آخر میں نے بہانہ بنایا کہ میرے کپڑے اچھے نہیں ہیں پھر کبھی پروگرام بنا لیں گے۔ مگر بڑھیا بھی بہت چالو تھی کہنے لگی

کوئی بات نہیں میں انہیں کہہ دوں گی کہ دکان سے لے کر آ رہی ہوں۔ اس لئے کپڑے میں نے خود نہیں بدلنے دیئے۔ تم اس کی فکر مت کرو۔

جواب عرض لاہور

اپریل ۸۳ء

نہیں ! آپ کل کا پروگرام رکھ لیں تو بہتر ہوگا۔ ... مگر بڑھیا بھی بہت ضدی تھی نہ مانی ...... نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑا۔

میں اور بڑھیا رکشہ میں بیٹھ گئے۔ رکشہ والے نے رکشہ سٹارٹ کیا اور سمن آباد کی طرف رواں دواں ہو گیا اور میں سوچوں کے سمندر میں بہتا چلا گیا ..... پتہ بھی نہیں چلا کہ کب منزل مقصود آ گئی۔ ہوش اس وقت آیا جب بڑھیا بولی کہ گھر آ گیا ہے۔ اترو۔

میں اس بار بوڑھیا کو بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ کہیں یہ بوڑھیا رشتے کروانے والوں میں سے تو نہیں۔ یا ویسے میرے لئے اتنا سب کچھ کر رہی ہے۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ رکشے سے اترا اور سامنے مکان کی طرف بڑھیا چل دی۔ اہر بل لگی ہوئی تھی بہت شاندار کوٹھی۔ بڑھیا نے بل دی ایک معزز عورت ایک کمرہ سے نکل کر صحن کی طرف آہستے آہستے آئی اور دروازہ کھولا۔ اس وقت میرا دل بہت تیزی کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔ سوچ رہا تھا اگر میری قسمت کا فیصلہ ہو گیا تو ..... خیر میں نے اپنے آپ کو ہمت بندھائی کہ ایسی کوئی بات نہیں مجھے یہ لوگ رشتہ نہیں دے سکیں گے یہ لوگ امیر ہیں۔ سوچا میری ایسی قسمت کہاں کہ اتنے بڑے خاندان سے رشتہ مل سکے۔

یہ خیالات اس وقت ٹوٹے جب معزز عورت نے کہا۔

آپ اندر آ جائیں۔ میں نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک بزرگ سفید داڑھی والے عصر کی نماز پڑھ رہے تھے اور دوسری نظر میری ایک کمرے میں گئی جہاں تین لڑکیاں ایک ساتھ نماز عصر ادا کر رہی تھیں۔ میرے دل کو بہت دھچکا لگا کہ ایک میں ہوں جو پانچ وقت نماز نہیں پڑھتا۔ یہ لوگ اتنے امیر ہونے کے باوجود کتنی پابندی سے نماز پڑھتے ہیں۔

بڑھیا نے مجھے اپنے ساتھ آنے کو کہا شاید وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔ معزز عورت بھی ہمارے ساتھ تھی معزز عورت نے ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں بیٹھایا۔ اور خود کہیں دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بہت سا فروٹ اور چائے لا کر رکھ دی۔ بڑھیا اور میں نے کچھ فروٹ کھایا اور چائے پی تھوڑی دیر بعد باتوں کا سلسلہ بھی چلا کہ وہ بزرگ صاحب بھی آ گئے جسے سب حافظ صاحب کہتے ہیں یہ حافظ صاحب اور معزز عورت دونوں میاں بیوی تھے اور یہی بعد میں میرے ساس اور سسر بنے۔ حافظ صاحب بہت باتونی ثابت ہوئے تھے۔

وہ گھنٹے سے لگاتار باتیں کئے جا رہے تھے مگر باتیں تھیں کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اپنی زندگی سے لے کر اب تک کے سب حالات بتانے شروع کر دیئے تھے۔ آخر جب میں بوریت محسوس کرنے لگا تو شاید حافظ کی بیوی نے اندازہ بھی لگا لیا ہوگا حافظ صاحب سے مخاطب ہوئیں کہ

اب باتیں بہت ہو گئیں دراصل مسئلہ پر بھی بات ہو جائے۔

حافظ صاحب چیف انجینئر تھے دو سال سے ریٹائر تھے اور اب پنشن پر گزارا تھا اور کچھ چھوٹا موٹا کام۔ ان کا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ بس چھ لڑکیاں تھیں۔ جس میں سے تین شادی شدہ تھیں۔ سب سے بڑی لڑکی انگلینڈ میں تھی۔ شادی کے فوراً بعد اس کا خاوند اسے انگلینڈ لے گیا۔ دوسری ملتان میں ایک بنک کے منیجر کے ساتھ شادی ہو چکی تھی۔ اور تیسری لڑکی گونگی تھی اسے ایک گونگے لڑکے سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ اب باقی تین لڑکیاں رہ گئی تھیں۔ جن کی شادی کرنا باقی تھا۔ مگر تینوں لڑکیاں پیدائشی کمزور تھیں۔ تمام اعضاء سوائے آنکھوں کے کمزور تھے۔

یعنی اونچا سننا۔ سمجھنے میں دیر لگ جانا۔ زبان توتلی۔ کان کمزور اور چلنے پھرنے کے لئے ٹانگیں بھی کمزور یعنی دھیرے دھیرے چلنا۔ تیزی سے نہ چلا جانا۔ یہ ان کی پیدائشی کمزوریاں تھیں۔ جو شادی کے بعد کچھ عیاں ہوئیں۔ اب حافظ صاحب نے بات اصل نوعیت کی طرف موڑی۔

بیٹا کیا کام کرتے ہو۔

ٹی وی سیل اینڈ سروس

روزانہ کتنا کما لیتے ہو۔

یہی کوئی سو، دو سو کے قریب

لاہور میں تمہارا کوئی ذاتی مکان ہے۔

نہیں حافظ صاحب اپنا ذاتی مکان تو گاؤں میں ہے۔ ہر آدمی کا ضروری نہیں جہاں رہتا ہو وہاں مکان بھی ہو۔ ابھی ابھی حافظ صاحب آپ نے کہا تھا

ہماری ایک دفعہ مشرقی پاکستان میں ٹرانسفر ہوئی تھی۔ کیا آپ نے ادھر مکان اپنا خرید اتھا۔

نہیں ! حافظ صاحب بولے

تو اسی طرح آدمی نوکری کی خاطر کہیں جاتا ہے تو ضروری نہیں کہ وہاں مکان بھی فوری طور پر خرید سکے۔ ویسے ارادہ ہے کہ

جواب عرض لاہور

اپریل ۸۳ء

بہت جلد کوئی نہ کوئی زمین یا مکان خرید لوں گا۔ ویسے حافظ صاحب میرا ارادہ ابھی شادی کا نہیں تھا۔ اس بڑھیا نے مجبور کیا تو چلا آیا۔ ورنہ میں باہر ملک جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ واپسی پر شادی کرنے کا ارادہ تھا۔

شادی کے بعد بھی تو تم باہر جا سکتے ہو۔

ٹھیک ہے حافظ صاحب جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔

تم اپنے والدین کو ہمارے ہاں لانا تاکہ رشتہ کی بات پکی ہو جائے تو اچھا ہے۔

بیٹا ایک ہفتے کے اندر اندر حافظ صاحب کی بیوی بولیں

ٹھیک ہے میں آج ہی والدین کو خط لکھ دیتا ہوں۔

وہاں سے فارغ ہو کر سیدھا دکان پر آیا اور گاہکوں کا کام جلدی ختم کرنے کے بعد گھر چل دیا۔ دکان سے گھر اتنا دور تو نہیں تھا مگر پھر بھی سوچوں میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ پتہ ہی نہ چلا کب گھر پہنچا۔ آتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ جوتے بھی اتارنا اسے گوارا نہ کئے مگر نیند کہاں.... سوچیں تھیں اور میں تھا.....

ایک تنہائی دوسری سوچیں..... ہونہوں۔ مجھے صاف صاف بتا دینا چاہیئے تھا کہ میں شادی نہیں کر سکتا۔ ابھی میرا کوئی ارادہ نہیں اور یہ بڑھیا مجھے مجبور کر کے لائی ہے مگر میری تو جیسے زبان ہی بند کر دی گئی ہو۔ بولنے کا موقع بھی تو کسی نے نہیں دیا تھا

نہیں نہیں۔ مگر میں نے تو اظہار کر دیا تھا کہ ابھی ارادہ نہیں ہے شادی کا..... مگر حافظ صاحب کتنی ادا کے ساتھ ٹال گئے تھے۔ میرا نہ تو کوئی گھر ہے نہ آگے نہ پیچھے...... یہ لوگ کیسے ہیں.... بغیر کریکٹر اور خاندان دیکھے رشتہ دینے پر رضامند ہیں۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ انہوں نے اتنی جلدی کیوں کی۔

نہیں نہیں کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی.... خاندان تو اچھا اور نیک ہے سب غازی اور پرہیزگار ہیں۔ ایسی باتیں مت سوچو..... انہی سوچوں میں نیند نے آ لیا کچھ پتہ نہیں چلا کہ کب آنکھ لگی آنکھ کھلی تو صبح کے نو بجے تھے۔ جلدی جلدی نہایا ناشتہ کیا اور دکان کی راہ لی۔ حسب معمول آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا۔ گھر والوں کو خط نہیں لکھا۔ کوئی دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ حافظ صاحب میری دکان پر پہنچ گئے۔

اس وقت میں گھڑی ٹھیک کرنے میں اتنا مگن تھا کہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ کب آئے پتہ اس وقت لگا جب سلام علیکم کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ سر اٹھایا تو حافظ صاحب کو سامنے کھڑے پایا۔ پتہ نہیں حافظ صاحب کتنی دیر سے کھڑے مجھے ٹی وی ٹھیک کرتے ہوئے دیکھ رہے تھے......

وعلیکم سلام! حافظ صاحب آپ کب آئے۔

ابھی کوئی چھ سات منٹ ہوئے ہیں دیکھا تو تم ٹی وی ٹھیک کر رہے ہو اس لیے مداخلت کرنا اچھا نہیں سمجھا۔ بیٹے حافظ صاحب ایک دوسرے کا حال پوچھا.... مشروب پلایا باتوں کا دور چلا اور بات بھی اپنی اصل نوعیت پر آ گئی

حافظ صاحب کہنے لگے میں ادھر سے گزر رہا تھا سوچا آپ کو بھی ملتا چلوں۔ کیا بات ہے ایک ہفتے کا وعدہ کر کے تم گئے تھے۔ کہ والدین کو بھیجوں گا۔ مگر اب دو ہفتے ہو گئے ہیں مجھے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔

خط میں نے لکھ دیا ہے پتہ نہیں ابھی تک کیوں نہیں آئے۔

بیٹا اب کرو ایک خط اور لکھ دو اور ہاں یہ ضرور لکھنا کہ اگر آپ نہیں آئیں گے تو میں شادی کر لوں گا۔ اگر آپ شامل ہو سکتے ہیں تو خط ملتے ہی فوراً آ جائیں۔

اچھا حافظ صاحب ایسا ہی لکھوں گا۔

بیٹا تو تم ایسا کرو ابھی اور اسی وقت خط لکھ دو۔

میرے پاس تو لفافہ نہیں ہے۔

ایسا کرو تم جا کر لے آؤ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔

جیسے آپ کی مرضی حافظ صاحب.... اور میں خط لینے کے لیے چلا گیا۔ حافظ صاحب دکان میں بیٹھے رہے۔ واپس آیا تو خط بھی حافظ صاحب کے پاس ہی لکھنا پڑا اور رقعہ کو خط میں بند کیا اپنے والدین کا اڈریس لکھا۔

اچھا بیٹا اب میں چلتا ہوں.... اٹھ کر چلے تھے کہ پھر کچھ یاد آیا.... کہنے لگے بیٹے میں پوسٹ آفس کے پاس سے گزروں گا۔ تمہیں یاد رہے یا نہیں۔ ادھر مجھے دو، میں جاتے ہوئے خط ڈال دوں گا۔ حافظ صاحب چلے گئے مگر میں دکان میں بیٹھا گزرے ہوئے واقعات پر سوچنا شروع کر دیا، گزرے ہوئے واقعات آنکھوں کے سامنے کسی پردہ سیمیں کی طرح میرے سامنے آتے گئے۔

بیٹا میری خواہش ہے کہ اب تم شادی کر ہی ڈالو ہر والدین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہماری زندگی میں بیٹا کو دولہا کے روپ میں دیکھیں یہ ہماری خواہش پوری نہیں کرو گے بیٹا۔

امی جان اتنی جلدی بھی کیا ہے

زندگی کا کیا بھروسہ بیٹا۔

امی جان دیکھونا..... رشتہ دار تو ہمیں چھوڑ گئے ہیں اب تو غیروں سے رشتہ لینا پڑے گا

وہ میرے اوپر چھوڑ دو بہت رشتے مل سکتے ہیں۔ اگر تم رضامند ہو جاؤ تو۔

امی اگر غیروں میں ہی میری شادی کرنا ہے تو میں اپنی پسند کی شادی کروں گا۔ لڑکی کو خوب دیکھ بھال کر..... امی میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں جب اچھی لڑکی مل جائے گی تو آپ کو اطلاع کر دوں گا۔ اب ان کو میرا خط ملے گا تو وہ بہت ہی خوش ہوں گی۔ اور سوچیں گی کہ میرے بیٹے کی پسند ہے حالانکہ میں نے تو ابھی تک لڑکی کو دیکھا بھی نہیں۔ دماغ بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ سوچا آج پکچر دیکھنے جاتے ہیں۔ ان گزرے ہوئے واقعات کو دماغ سے جھٹکا اور پکچر دیکھنے چلا گیا۔

یہ ہفتہ میں نے گھر کی تیاری اور خرید و فروخت میں گزار دیا کیونکہ والدین کے آنے کا امکان تھا۔

خط لکھنے کے پانچ دن کے بعد گھر والے میرے پاس پہنچ گئے سب خوش خوش نظر آ رہے تھے۔ امی گھر سے آتے وقت ایک انگوٹھی جو کہ بہت پہلے سے بنوا رکھی تھی ہونے والی بہو کے لئے۔ وہ بھی اپنے ساتھ لے لی تھی تاکہ بات پکی ہونے کے بعد فوراً بہو کو پہنائی جائے۔

یہ رات بہت خوش و خرم اور خوشی خوشی میں گزاری۔ سب بہن بھائی اور والدین بہو کے بارے میں ہی بات کر رہے تھے بہنوں اور بھائیوں نے مجھ سے علیحدگی میں ایک ایک کر کے تنگ کرنے لگے کہ بھائی جان ایک بات تو بتلائیے جس گھر ہم رشتہ لینے جا رہے ہیں۔ لڑکی کو آپ نے دیکھا ہے۔

نہیں...

جھوٹ بولتے ہو۔ ضرور آپ کی پسند ہوگی آپ نے پسند کرنے کے بعد ہی تو ہمیں بلایا ہے۔ مگر کسی نے میری بات کا یقین نہیں کیا سب نے یہی کہا کہ میں جان بوجھ کر انجان بن گیا ہوں۔ ان کے خیال میں یہ لڑکی میں نے دیکھی ہے اور میری پسند ہے۔ صبح دس بجے ہم سب حافظ صاحب کے گھر گئے۔ اور انہوں نے ہماری آؤ بھگت کی۔ اس کے بعد رشتے کی بات چلی اور انہوں نے ہاں کر دی۔ انہوں نے کسی جہیز کا کوئی مطالبہ نہیں کیا انہوں نے بس اتنا کہا کہ ہم اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں سونے چاندی سے کوئی لالچ نہیں۔ بس وہ یہ چاہتے تھے کہ جیسے بھی ہو لڑکا ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔ اور ہوا بھی ایسے۔ جب تاریخ مقرر کرنے کا وقت آیا تو میری امی نے تین ماہ کا وقت لیا تاکہ اچھی طرح سے ہم تیاری کر سکیں۔ مگر حافظ صاحب کے گھر والے نہیں مانے۔ کہ ہمیں کچھ نہیں چاہیئے بس اسی مہینے میں شادی ہو جائے تو اچھا ہے خیر امی جان مان گئیں۔ میرے خیال میں انہیں یہ خطرہ تھا کہ تاریخ زیادہ دینے کی صورت میں۔ ان لوگوں کے بارے میں یعنی لڑکی کے بارے میں پتہ نہ چل جائے۔ بات پکی ہو گئی۔ بیس دن کے بعد شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی ہم واپس گھر آ گئے اور شادی کی تیاری میں لگ گئے دو دن کے بعد وہی بڑھیا۔ جس نے یہ رشتہ کروایا تھا۔ میری دکان پر آ گئی

بیٹا منگنی کی مبارک ہو۔

ہاں جی تم کو بھی مبارک ہے

تم نے مجھے منگنی پر نہیں۔ بلایا خیر کوئی بات نہیں۔ شادی پر ضرور بلانا..

اچھا ماں جی

بیٹا اب میرا بھی حق بنتا ہے کہ تم سے منہ میٹھا کرنے کے لئے کچھ مانگ سکتی ہوں۔

ہاں ہاں ماں جی کیوں نہیں

میں ابھی مٹھائی کا ڈبہ لائے دیتا ہوں۔

بیٹا مٹھائی وٹھائی کو چھوڑو۔ بس تم مجھے دو سو روپیہ دے دو اور .... اور..... دیکھو نا بیٹا۔ میرا کتنا کرایہ رکشہ پر خرچ ہو گیا ہے میں تو تم سے کچھ بھی نہیں مانگ رہی ہوں۔ مجھے تو تم سے آٹھ سو روپے لینا چاہیئے تھا۔ مگر میں تم کو زیادہ تنگ نہیں کروں گی۔ لیکن شادی کے بعد تین سو روپے اور لوں گی۔ میں نے سوچا بڑھیا کا ویسے بھی حق بنتا ہے ویسے مجھے پتہ چل گیا تھا کہ یہ بڑھیا رشتہ کرانے والوں میں سے ہے۔ اب تو یقین ہو چکا ہے کہ اس کی فیس پانچ سو روپے ہے۔ بڑھیا نے دو سو روپے جیب میں ڈالا اور رکشہ میں بیٹھ کر دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی کہ بیٹا اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے۔

شادی کی تاریخ بھی آ گئی۔ شادی بڑے دھوم دھام

سے کی ۔ بہت دوستوں اور رشتہ داروں کو ملایا ۔ دو سو آدمیوں کی برات تھی ۔ رات کو بارہ بجے دلہن کو گھر لے آئے ۔

سہاگ کی رات ہر انسان کی قسمت میں آتی ہے ۔ وہ بدقسمت ہی ہوگا جس کی قسمت میں یہ رات نہ آئی ہو لیکن میں بھی انہی لوگوں میں تھا ۔ رات تو آئی مگر اس کی صحیح خوشی نصیب نہیں ہوئی ۔ جو ہونا چاہئے تھی ۔ یہ پرلطف و پرکیف و خوشیوں بھری رات دلہن دلہا کے لئے کتنی دلکش اور مسرور رات ہوتی ہے مگر میرے لئے تو یہ رات ایک بھیانک خواب تھی ۔ ۔ لطف و نہ سرور یہ رات ایسے تھی جیسے میں ایک رات کے لئے حوالات میں بند کر دیا گیا ہوں ۔ دلہن کا نہ بات کرنا ۔ ۔ میری طرف دیکھنا نہ مسکرانا ۔ میرے لئے یہ سب کچھ حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی تھا ۔ میں نے لاکھ جتن کئے کہ ایک بار دلہن بات کرے یا میری طرف دیکھ لے بس میری یہی خواہش تھی کہ ساری خوشیاں دلہن کے قدموں میں ڈال دوں ۔ مگر یہ کیا یہ لو رو نے لگ گئی ۔ میرے ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ دلہن نے بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا بس دلہن اتنا بولی کہ مجھے امی کے پاس لے جاؤ مجھے ڈر لگ رہا ہے ۔ اس نے یہ بات ایسے کی جیسے کہ بچہ رو رہا ہو میں کہتا ہو کہ مجھے امی کے پاس لے چلو ۔ مجھے بہت پریشانی اٹھانی پڑی ۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ اب میں تمہارا خاوند ہوں ۔ سمجھنے کی کوشش کرو ۔ اب ادھر کیا ہے صرف امی کی تمہاری امی نے تو اب مجھے دے دیا ہے ڈولی میں ڈال کر ۔

نہیں نہیں ۔ مجھے امی کے پاس لے چلیے ۔ اور زور سے رونا شروع کر دیا ۔ آخر مجبور ہو کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا ۔ تاکہ باہر کے لوگ نہ سن سکیں ۔ آخر سمجھا بجھا کر اسے چپ کرا دیا اور دلاسا دیا ۔

میں تمہارا دوست ہوں ڈرنے کی ضرورت نہیں ۔ صبح ہوتے ہی تمہیں تمہاری ماں کے پاس لے جاؤں گا ۔ اب تم سو جاؤ ۔ تب جا کر بڑی مشکل سے اس کی سسکی ختم ہوئی ۔ اور جب اسے یقین ہو گیا کہ میں اس کا واقعی دوست ہوں تو وہ چپ ہو گئی ۔ اور بولی میں تو امی کے بغیر نہیں سو سکتی

تم کوشش کرو نیند آ جائے گی ۔ تم کب تک امی کے پاس سوتی رہو گی ۔ اب تو تمہیں امی کے بغیر ہی سونا ہوگا ۔ کیا بتاؤں بس ایسی باتوں میں رات گزر گئی ۔ صبح ہوئی امی کو بتایا امی جان منگنی کے وقت آپ نے دلہن سے باتیں تو کی ہوں گی ۔

بیٹے کیا ہوا امی نے کہا ۔

امی جان پہلے آپ بتلایئے ۔

بیٹا مجھے تو موقع نہیں ملا بات کرنے کا ۔ ہاں البتہ انگوٹھی پہناتے وقت ضرور اتنا کہا تھا کہ دونوں کی جوڑی سلامت رہے اور لڑکی کی ماں پاس کھڑی تھی بولی اللہ کرے

امی جان کیا دلہن نے جواب نہیں دیا تھا ۔

نہیں بیٹا ۔ وہ کیسے جواب دیتی اس وقت ہر لڑکی شرما جاتی ہے

امی جان آپ نے اس کے چہرے کا تاثر نہیں دیکھا ۔

نہیں بیٹا ۔

امی جان کیا ہر بات کا جواب اس کی امی دیتی تھیں ۔ جبکہ آپ دلہن سے کچھ پوچھتی تھیں ۔

ہاں بیٹا ۔ . . . . میں نے دلہن سے نام پوچھا تھا . . . دلہن نے کوئی جواب نہیں دیا پھر میں نے دوبارہ پوچھا تو اس نے میری طرف دیکھا اور کچھ بولی مگر میں سمجھ نہیں سکی کہ کیا نام ہے دوبارہ پھر پوچھا بیٹی کیا کہا ۔ تو اس کی ایک خالہ پاس بیٹھی ہوئی تھی اس نے اس کا نام بتا دیا ۔

بیٹا آپ اتنی باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں ۔

امی بات یہ ہے کہ وہ ٹھیک نہیں ہے

کیا مطلب بیٹا ۔

میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ۔ میرے خیال میں دلہن پیدائشی کمزور ہے اس کے ہر عضو پیدائشی طور پر کمزور ہے

بیٹا یہ کیا ۔

ہاں ماں جی ۔ جب آپ نے اس سے نام پوچھا تھا تو اس نے نہیں سنا کیونکہ وہ اونچا سنتی تھی ۔ آپ نے پھر دوبارہ اس کا نام پوچھا تو اس نے سنا اور آپ کو جواب دیا مگر آپ سمجھ نہ پائیں کیونکہ اس کی زبان توتلی تھی ۔ اس لئے دلہن کی بجائے اس کی خالہ نے آپ کو نام بتایا ۔

بیٹا میں نے تو سمجھا تھا کہ یہ تمہاری پسند کی شادی ہے ورنہ میں خوب دیکھ بھال کر کے رشتہ کرتی ۔ میں نے تو یہ سمجھا

کہ لڑکی شرمائی ہے۔ شادی کے بعد شرمانا ختم ہو جائے گا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب دلہن کی کمزوریاں ہیں جس وجہ سے ہم سے شادی سے پہلے بات نہیں کرتی تھی۔ بس ہاں، ہوں ہاں میں جواب دیتی ہے اور کبھی کبھی ہوں ہاں بھی نہیں کہتی اب تو وہ شک یقین میں بدل گیا ہے

مگر بیٹا اب یہ قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔ ورنہ رشتہ دار ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ وہ ہمیں جینے نہیں دیں گے۔ آہستے آہستے ٹھیک ہو جائے گی۔ ویسے بھی دلہن غیروں میں ہے۔ ہمیں جانتی پہچانتی نہیں ہے جب گھل مل جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹے ..... گھبرانے کی اب ضرورت نہیں صبر سے کام لو..... ویسے بیٹا تمہاری ساس نے کہا تھا کہ دلہن کی کوالیفکیشن بی اے ہے

اوہ وہ تو مجھے بھی ایسا ہی کہا تھا۔ بس اس لئے تو میں نے بھی لڑکی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اور نہ آپ کو بتایا.......

شادی کے دوسرے دن ہی میں نے دکان کھول لی ...

جان پہچان اور دوستوں نے دکان کھولنے پر اعتراض کیا کہ اتنی جلدی دکان کھولنے کا مطلب ابھی تو پرسوں آپ کی شادی ہوئی ہے اور اتنی جلدی دکان بھی کھول لی۔ کچھ شادی کا مزہ لیتے اور ہنی مون کے لئے جاتے۔ آپ کو شاید پیسے کمانے کا لالچ زیادہ ہے اس لئے تو کہیں پروگرام نہیں بنایا ہماری بھابھی کیا سوچتی ہو گی۔ ...... مگر ان لوگوں کو کیا معلوم آخر میرا بھی یہی ارادہ تھا کہ شادی کے بعد دو تین ہفتے ہم دونوں گھومیں پھریں۔ مگر پہلی رات سب خواہش ختم ہو گئی

رات کو گھر آیا تو وہی بڑھیا گھر میں بیٹھی نظر آئی جس نے یہ رشتہ کروایا تھا۔ میں جب اندر داخل ہوا۔ تو بڑھیا نے شادی کی مبارک دی۔ مگر میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

بیٹا کیا بات ہے میں تم کو شادی کی مبارک دے رہی ہوں مگر آپ سنتے ہی نہیں

اچھا اچھا ٹھیک ہے ایک بار کہہ دیا ہے اتنا ہی کافی ہے بڑھیا پر غصہ تو بہت تھا مگر والدین اور بہن بھائیوں کے سامنے غصہ نکال نہ سکا۔ چپ ہو رہا۔

بیٹا۔ بڑھیا آپ کا کب سے انتظار کر رہی ہے۔ اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ امی نے کہا۔

ماں میں نے کچھ بات نہیں کرنی اب کیا ضرورت ہے بات کرنے کی۔ ... بڑھیا سے نہیں رہا گیا۔ بولی ...

بیٹا میں نے سوچا کہ شادی کی مبارک دینے چلوں اور ساتھ ہی آپ کے وعدہ کے مطابق تین سو روپیہ بھی۔ بس اب کیا تھا میرا غصہ سے پارہ چڑھ گیا اور پتہ نہیں غصہ میں کیا کیا بڑھیا کو بکتا گیا۔ ... مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مگر سب گھر والے پریشان ہو گئے کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

بیٹا آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ ماں بولیں۔

ماں اس ذلیل اور لالچی بڑھیا سے کہہ دو یہاں سے چلی جائے ورنہ ....

بیٹے بات کیا ہے۔

ماں اس نے یہ رشتہ کروایا ہے۔ پہلے بھی مجھ سے دو سو روپے لے چکی ہے اور اب تین سو روپے اور مانگ رہی ہے اس سے کہہ دو کہ یہاں سے دفع ہو جائے۔ اس بڑھیا نے پیسے کی لالچ میں آکر میری زندگی خراب کر دی ہے۔ بڑھیا چپ کر کے بغیر جواب دیئے چلی گئی۔ پھر کہیں بھی نظر نہ آئی۔ بعد میں سسرال والوں سے بھی معلوم ہوا کہ ان سے بھی پانچ سو روپے لے چکی ہے۔ مگر سسرال والوں نے تو ٹھیک ہی دیا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے خود ہی اس بڑھیا کو کہا تھا۔ ان کا تو کام اچھا ہو گیا تھا۔ اور میں اس طرح ان کے جال میں پھنس کر رہ گیا۔

وقت دھیرے دھیرے گزرتا رہا۔ دوستوں نے دعوتیں دیں مگر میں ٹالتا رہا کیونکہ ایک بار کزن کے مجبور کرنے پر مجھے دعوت پر جانا پڑا۔ تو جب میں اور بیگم کزن کے گھر گئے تو اس کے بہن بھائی، قریبی رشتہ دار اور دوست تھے۔ دعوت میں عموماً مذاق اور باتوں کا خوب سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سب نے بہت کوشش کی کہ میری بیگم ان سے باتیں کرے۔ مگر اسے تو چپ لگی ہوئی تھی ..... کزن کے بہن بھائیوں نے بہت مذاق بھی کیا۔ مگر اسے تو بات کرنے کا پتہ ہی نہیں تھا۔ مجھے اس وقت بہت افسوس ہوا۔ ان لوگوں کے مذاق کا جواب تھوڑا بہت بھی دے دیتی تو مجھے خوشی ہوتی مگر مجھے خود ہی جواب دینا پڑتا۔ کہ بے چاری شرماتی ہے۔ ان کو بڑی مشکل سے ٹالا کہ بیگم ابھی آپ لوگوں سے بے تکلف نہیں ہے جب ہو جائے گی تو تم سب کو بولے

نہیں دے گی۔ کزن کی بہن نے یوں بات کی۔ کہ بھابی جان کیا تم گونگی ہو۔۔۔

ہوں کیا کہا۔

کیا تم گونگی ہو۔ اس وقت ذرا اونچا بولا۔

نہیں تو۔۔۔۔۔

پھر جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔

دیتی تو ہوں۔

بھائی جان دیکھو تمہاری لاڈلی بیگم ہم سے بات چیت بھی نہیں کرتی۔۔۔۔ دعوت ختم ہوئی اور میں نے کام کا بہانہ کر کے کزن سے جانے کے لئے اجازت مانگی۔۔۔ تو اسے مجبوراً اجازت دینی پڑی۔۔۔ میں نے بہت دور ہو کر بیگم کو ساتھ لیا اور کزن کے گھر سے نکلے تو پیچھے سے جو آوازیں سنیں۔ تو میرا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

میرے خیال میں عارف کی بیگم بہری اور گونگی ہے دیکھو نا اس کی چال ایسے ہے جیسے بہرے اور گونگوں کی چال ہوتی ہے جیسے گونگے اور بہروں کا ذہنی توازن برابر نہیں ہوتا تو ان کی چال بھی برابر نہیں ہو سکتی، اس لئے ہی اس کا بھی ذہنی توازن برابر نہیں ہے اس لئے اس کی چال ایسی ہے

بھائی جان سنتی ہے اور بات بھی کرتی ہے۔ کزن کی بہن بولی۔

مسٹر تم نے سنا نہیں کہ بات اونچا سنتی ہے اور توتلی زبان میں بات کرتی ہے۔

بھائی جان میں نے غور نہیں کیا۔

ٹھیک ہے کبھی پھر ملے گی تو بات کر کے دیکھنا

اتنے میں ہم ان کی آوازوں سے اتنا دور ہو گئے کہ دوسری باتیں سن نہ سکے مگر میرے خیال میں وہ لوگ ہمارے بارے میں بہت کچھ کہتے رہے ہوں گے۔

اس کے بعد میں کبھی کسی دعوت میں بیگم کو لے کر نہیں گیا۔ اگر کبھی گیا تو اکیلا گیا مگر جب جاتا ہوں تو سب لوگ وجہ پوچھتے ہیں کہ بھابی کو کیوں نہیں لایا۔ بہانہ بنا لیتا ہوں کہ تمہاری بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لئے نہیں لا سکا۔ مگر کب تک بہانے بناتا۔

آخر تنگ آ کر دوست و احباب لڑتے جھگڑتے کہ اگر اب کی بار بیگم کو نہ لائے تو تم بھی مت آنا۔ اب میں اکیلا بھی کسی دعوت یا فنکشن پر نہیں جاتا۔ کیسے جاؤں لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں آہستہ آہستہ سب دوست و احباب نے آنا جانا بھی بند کر دیا ہے

میں نے کئی بار بیگم کو احساس دلانے کی کوشش کی مگر اسے کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میں کئی بار اپنے گھر والوں اور سسرال والوں کے پاس بیگم کو حد سے زیادہ مذاق کرتا ہوں اور بے عزتی بھی تاکہ بیگم کو احساس ہو جائے اور عزت بے عزتی کو سمجھنے لگ جائے۔

محفل میں تو اس کا کندا درکنار علیحدگی میں بھی کہہ دے۔ تو میں سمجھوں کہ اس کا ذہن ٹھیک ہے۔۔۔۔۔۔۔ عارف آپ نے اچھا نہیں کیا کہ محفل کے سامنے میرا مذاق اڑایا۔ اگر کسی آدمی کا محفل کے سامنے مذاق اڑایا جائے تو وہ ضرور ناراض ہو جائے گا۔ اگر محفل میں آپ کا احترام کر بھی لیں تو بعد میں ضرور آپ کو کہے گا کہ آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہر ایک کو اپنی عزت پیاری ہوتی ہے۔ آپ نے مجھ سے حد سے زیادہ مذاق کر کے محفل میں ذلیل کرنے کی کوشش کی ہے مگر بیگم کو احساس ہی نہیں۔ کہ مذاق کیا ہوتا ہے حالانکہ رشتہ داروں نے بھی اس کے منہ پر بہت کچھ کہا۔ تاکہ اسے احساس ہو۔ مگر وہ کیا سمجھے کہ عزت اور بے عزتی کیا ہوتی ہے۔ وہ تو ہر بات سے نا آشنا ہے۔ کئی بار رشتہ دار اور دوستوں کی شادیاں ہوئیں اور مجھے اکیلا جانا پڑتا۔ بیگم کی طبیعت خراب کا بہانہ کرتا۔۔

آخر میرا بھی دل ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ غم اور خوشی میں شریک ہو۔ اور ہر قدم پہ ہم قدم رہے۔ مگر یہ سب حسرتیں ابھی تک دل میں ہیں اور روگ لگا لیا ہے اپنے آپ کو۔ اب تو یہ حالت ہے کہ میں خواب اور گولیوں کا سہارا لے کر جی رہا ہوں۔ سوچیں اتنی ہیں کہ شادی ساری رات جاگتے گزر جاتی ہے مگر کچھ فیصلہ نہیں کر پاتا۔ آخر تنگ آ کر ملک چھوڑ دیا ہے تاکہ تنہا رہ کر اچھے سے اچھا فیصلہ کر سکوں۔ تاکہ زندگی آرام سے گزر سکے۔ مگر ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ اگر کوئی مہمان گھر آ جائے تو بیگم کا فرض ہوتا ہے انہیں کھانا پینا دے یا حال پوچھ ہی لے۔ تاکہ بعد میں مہمان

باتیں نہ کرے کہ ہمیں پوچھا تک نہیں۔ ہم عارف کے ہاں گئے۔ تو کسی نے پانی تک نہیں پوچھا

بیگم کو ہزار بار کہنے کے باوجود بھی مہمانوں کو کچھ بھی نہیں پوچھتی جبکہ خود مہمانوں کو کہنا پڑتا ہے کہ پانی دو...... اس میں اتنی بھی ذہانت نہیں کہ مہمان گھر میں آئے اور وہ بستر پر جا کر سو جائے حتیٰ کہ مہمان اس کا انتظار کرتے کرتے چلا جائے۔ بعد میں مجھے شکایت کرے کہ ہم آپ کے گھر گئے تمہاری بیوی نے ہماری بہت اچھی طرح خاطر تواضع کی کہ پانی تک بھی نہیں پوچھا۔ آخر کار آہستہ آہستہ سب دوست و احباب کو اس کا پتہ چل گیا۔

جب بھی میں گھر میں آتا ہوں آج تک اس نے مجھے نہیں پوچھا کہ آج کیا کام کیا ہے آج آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں یا آج آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں تو سر دبا دوں وغیرہ

اگر بیوی سمجھدار ہو تو آدمی جتنا بھی پریشان یا تھکا ہوا کیوں نہ ہو۔ گھر میں آتے ہی سب پریشانی اور تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے مگر اس کے برعکس میری پریشانی اور تھکاوٹ گھر آتے ہی دوگنی ہو جاتی ہے اور کھانا بھی مجھے ہی گرم کرنا پڑتا ہے۔ بیوی کے ہوتے ہوئے بھی آج تک کھانا ایک ساتھ نہیں کھایا۔ اگر پوچھوں گا تو بچوں کی طرح کہے گی کہ مجھے بہت زور کی بھوک لگی تو کھانا کھا لیا حالانکہ دو چار منٹ میرا انتظار بھی کر سکتی تھی۔

ایک دن میرا خالہ کا لڑکا غفور ہمارے گھر آیا۔ میں گھر پر نہیں تھا۔ باتوں باتوں میں غفور نے میری بیوی سے یہ معلوم کرنے کے لئے پوچھا کہ کیا واقعی اس کا ذہن کام نہیں کرتا۔

بھابھی کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بیویاں ہیں

کہنے لگی مجھے تو معلوم نہیں۔

تمہیں نہیں معلوم تو ہم بتاتے ہیں اللہ کی دو بیویاں ہیں......

اچھا......

جب میں کام سے فارغ ہو کر گھر آیا تو خالہ کا لڑکا جا چکا تھا۔ بیگم نے رات کے کھانے کے دوران بتایا کہ غفور آیا تھا تمہارا انتظار کر کے چلا گیا۔ کھانا ختم کیا عشاء کی نماز پڑھی تھکاوٹ اور نیند کا غلبہ تھا۔ اس لئے جلدی بستر پر چلا گیا ابھی آنکھ بند کی ہی تھی کہ بیگم بولیں۔ (بیگم توتلی زبان میں

عارف کی بجائے عاریف کہتی ہے)

عاریف آپ بتا سکتے ہیں اللہ کی کتنی بیویاں ہیں.....

... میں یہ بات سن کر حیران ہو گیا کہ کیا اتنی بڑی لڑکی کو اتنا معلوم نہیں

مجھے معلوم نہیں۔

کہنے لگی۔ اللہ میاں کی دو بیویاں ہیں۔

اچھا....

اور عاریف تمہاری ایک بیوی ہے تم اسے ناراض رکھتے ہو مگر اللہ کی دو بیویاں ہیں انہوں نے کبھی دونوں بیویوں کو ناراض نہیں کیا

اچھا بیگم میں بھی ایک اور شادی کر لوں گا تو میری بھی دو بیویاں ہو جائیں گی پھر میں بھی تمہیں کبھی ناراض نہیں کروں گا

سچ عاریف

ہاں بیگم۔

یہ تھا ایک گنہگار مذاق۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کرے مگر بتائے بغیر کچھ چارہ بھی تو نہیں تھا۔ ہمارا المیہ کہ بیگم کو اتنا بھی علم نہیں کہ کوئی عورت بھی اپنی زندگی میں دوسری عورت برداشت نہیں کر سکتی۔

ایک حافظ قرآن اور نیک والدین کی بیٹی اور پھر اس کے علاوہ ایف اے ہو اور اسے اتنا بھی معلوم نہ ہو کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام کیا ہے۔ حالانکہ اگر یہ سوال مسلمان بچے سے بھی پوچھ لیا جائے تو میرے خیال میں وہ بھی بتا دے گا۔ کہ نبی ؐ کا نام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ طلاق دے دوں کیوں اپنی زندگی کو خراب کر رہا ہوں۔ ایک بے عقل و بے ذہن لڑکی کو میں کب تک رکھ سکوں گا۔ آخر میں نے اپنے گھر کو بھی چلانا ہے۔ دو کام تو مجھ سے نہیں ہو سکتے یا تو میں دکان کو چلاؤں یا پھر گھر کو

میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں۔ اگر ایک خراب ہو تو گاڑی نہیں چل سکتی۔

میں پہلے ہوٹل سے کھانا کھاتا تھا مگر اب بھی ہوٹل سے ہی کھا رہا ہوں۔ سوچا تھا شادی کے بعد گھر کی روٹی نصیب ہو گی اور کچھ سکون ملے گا۔ مگر میں نے آخر فیصلہ کیا کہ طلاق دے کر یہ سکون مل سکتا ہے مگر امی سے بات کی تو وہ رضامند نہیں

جواب عرض لاہور

اپریل ۱۹۸۸

طلاق یا شادی

ہوئیں کہنے لگیں کہ اب تو اسے بچے کی امید ہے بچہ ہونے کے بعد سوچوں گی ۔ اس وقت تک انتظار کرنا ہوگا ۔ آخر میں نے ایک دوست سے مشورہ کیا تو اس نے کہا تم کچھ دنوں کے لئے کہیں باہر چلے جاؤ اور میں اسلام آباد ویزا لگوانے کے لئے گیا واپس آیا تو بیوی کو ہسپتال میں پایا ۔ پتہ چلا کہ بچہ ہوا ہے مگر وہ بھی آپریشن سے ۔ بچے کو دیکھنے کے لئے گیا ....

وارڈ میں داخل ہوا اور بیگم کے روم میں پہنچا ۔ مگر بچہ نہیں تھا ۔ پتہ چلا کہ بچہ بچے وارڈ میں ہے ۔ اور نرس کو بولا کہ آپ میرے بچے کو چند منٹ کے لئے لا سکتی ہو تو لاؤ کیونکہ میں کل مسقط جا رہا ہوں ۔ نرس واپس آئی اور بچہ کو میری گود میں دیا ۔ ماشا اللہ بچہ بہت خوبصورت اور صحت مند تھا ابھی میں بچہ کو پیار کر ہی رہا تھا کہ بیگم بولیں ۔

بچہ مجھے دو میں نے اسے پیدا کیا ہے

اچھا بیگم دیتا ہوں ۔

اس وقت ساس کسی عورت سے بات کر رہی تھی . . .

خیر میں نے بچہ بیگم کے حوالے کیا ۔

عارف میں نے کتنا خوبصورت بچہ دیا ہے ......

نرس یہ بات سن کر ہنستے ہنستے باہر نکل گئی ..... میں شرم کے مارے کچھ بھی نہ کہہ سکا ۔

پھر بیگم کو سمجھایا کہ اب تو تم ایک بچہ کی ماں بن گئی ہو ۔ کچھ سمجھداری سے بات کیا کرو ۔

کیوں میں نے کوئی غلط کہا ہے

ہاں بیگم تمہیں کہنا چاہیئے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کتنا خوبصورت بیٹا عطا کیا ہے مگر عقل ہوتی تو تب نا ...... آخر میں ساس سے بولا میں کل کی فلائٹ پر مسقط جا رہا ہوں ۔ بیٹی کو اپنے پاس رکھئے ۔ مجھ سے جتنا ہو سکا ہر مہینہ پیسہ بھیج دیا کروں گا ...

ساس ایک دم ہکا بکا مجھے دیکھنے لگی ۔

بیٹا تمہیں اللہ نے بیٹا دیا ہے اور کل تم جا رہے ہو ۔

ہاں ساس مجھے جانا ہی ہوگا ۔ سب باتیں بیگم بھی سنتی رہی بیگم نے کوئی نہیں مجھ سے پوچھا کہ عارف تم کیوں جا رہے ہو آخر میں تمہاری بیوی ہوں ۔ تم نے کبھی مجھے باہر جانے کے لئے نہیں کہا ۔ حالانکہ ایسی باتیں ضرور بیوی کرتی ہے مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا ... ہاں باہر نکلتے وقت میں نے اتنا ضرور سنا کہ بیگم ماں کو کہہ رہی ہیں کہ

امی عارف باہر کے ملک جا رہا ہے ۔

ہاں بیٹی ۔

امی پھر تو بہت اچھا ہے میرے بیٹے کو بھی وہ اپنے ساتھ لے جائے گا ناں ۔

ہاں بیٹی ..... لے جائے گا مگر اداسی کے ساتھ جواب دیا

کل کی فلائٹ سے میں مسقط پہنچ گیا ۔ اب میں یہاں مسقط میں عرصہ دس ماہ سے رہ رہا ہوں ۔ مگر چین نہیں مل رہا ۔ بیٹے کو بھی بھول چکا ہوں ۔ بیٹے کی تصویر بھی مدہم ہو چکی ہے ۔ بس دھندلا دھندلا عکس دکھائی دیتا ہے ... مگر پہچان نہیں پاتا ۔ آخر ایک منٹ ہی تو میں نے اپنے بیٹے کو دیکھا تھا ۔ کیا ایسے بھی لوگ بدقسمت ہوتے ہیں کہ ادھر بیٹا ہوا اور ادھر باپ دوسرے ملک کو سدھار جائے ۔ میں نے ایسا باپ نہیں دیکھا جیسا میں ہوں ۔ بیٹے کی خوشی بھی نہ کر سکا ۔ اور پریشانی کے عالم میں یہ بھی نہ سوچ سکا کہ بچہ بڑا ہو کر کیا سوچے گا ۔ سنا ہے انسان ایسی سوچوں میں آ کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے کہیں میرے ساتھ بھی ایسا نہ ہو ۔ آخر میں ایک بات مزید کہوں گا ۔ کہ اگر کوئی آدمی شادی کرنا چاہتا ہے تو میری رائے یہی کہ اگر غیروں میں کرنا چاہتے ہیں تو ضرور اچھی طرح دیکھ بھال لیں جلدی نہ کریں تاکہ بعد میں میری طرح پچھتانا نہ پڑے ۔ کبھی سوچتا ہوں کہ دوسری شادی کر لوں اور اسے طلاق دے دوں مگر بیٹے کا کیا ہوگا ۔ پھر سوچتا ہوں ۔ کہ اسے بھی رکھوں مگر اپنے گھر نہیں ۔ اپنے سسرال والوں کے گھر ۔ تاکہ سسرال والوں کو اپنے کئے کی سزا ملتی رہے اور میں دوسری شادی کر کے علیحدہ گھر بسا لوں ....

قصور تو اس کے والدین کا ہے اس میں قصور بے چاری لڑکی کا تو نہیں سسرال والوں کو چاہیئے تھا کہ مجھے ہر بات بتا دیتے ۔ اگر لڑکی کے والدین مجھے بتا دیتے کیا میں رشتہ قبول کر لیتا ۔ کبھی نہیں ۔ تو پھر غلطی کس فریق کی ہے میری جس نے بغیر دیکھے رشتہ کیا یا سسرال والوں کی ۔ انہیں کیا حق تھا کہ میری زندگی کو خراب کریں آخر دنیا اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کی زندگی کیوں تلخ بنا دیتی ہے

۔ آخر میں قارئین سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے اپنے مفید مشورے سے نوازیں تاکہ میں کچھ فیصلہ کر سکوں ۔ طلاق یا دوسری شادی دونوں میں سے جو قارئین کو فیصلہ اچھا لگے ضرور بھیجئے گا ۔ تاکہ میری الجھن ختم ہو جائے ۔

جواب عرض لاہور

اپریل ۸۳ء

زخم زخم زندگی
تحریر: محمد اقبال زاہد میاں چنوں

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

آداب و تسلیمات... آپ کی شفقت، آپکی محبت اور قارئین جواب عرض کی حوصلہ افزائی کی بدولت اپنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر، راتوں کو جاگ جاگ کر... اپنے پیارے سے جریدے جواب عرض کے لیے اکثر اوقات تلخ حقیقتیں اور ناقابل فراموش واقعات تلاش کرتا ہوں۔ اور جب بھی جواب عرض کے معیار کے مطابق کوئی حقیقت ملتی ہے تو اپنے زخموں کی لڑی میں پرو کر ان سنچے موتیوں کو آپ کی خدمت میں بھیج دیتا ہوں۔

شہزادہ صاحب! زیر نظر کہانی میرے ایک دوست شہنشاہ کی آپ بیتی ہے... جسے میں حقیقت ہی کے رنگ میں قارئین جواب عرض کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ یہ آپ بیتی قدرے طویل ہو گئی ہے۔ میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش بھی کرتا، لیکن اس طرح حقیقت کا رنگ مفقود ہو جاتا... اور ایک منہ بولتی حقیقت ایک افسانہ بن جاتی۔ جسے نہ آپ پسند فرماتے اور... نہ ہی مجھے یہ گوارا ہے کہ میرے پیارے جواب عرض کے صفحات پر افسانوی تحریر کی سیاہی پھیلے۔ تاہم میں نے جواب عرض کی عین پالیسی کے مطابق اپنی تحریر... "زخمی زخمی زندگی"... کے تمام کرداروں کے نام اور مقامات تبدیل کر دیئے ہیں۔

محترم ایڈیٹر صاحب! میں اپنی یہ کاوش اس قابل احترام ہستی کے نام کرتا ہوں، جس نے مجھے قلم پکڑ کر زندگی کے حساس گوشوں کی طرف قدم بڑھانے پر مجبور کیا تھا۔ جواب عرض کی برق رفتار ترقی کے لیے آپ، کارکنان ادارہ اور محبان جواب عرض کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خداوند تعالیٰ اسے مزید بلندیوں سے نوازے...

پُرخلوص تمناؤں کے ساتھ... آپ کا اپنا!

محمد اقبال زاہد، مکان نمبر ۴ ۲۲ سٹریٹ نمبر ۱۱
محلہ رحمانیہ، میاں چنوں، ضلع ملتان

نوٹ:
(اپنی ہر تحریر پر ارسال کرنے کی تاریخ ضرور درج کریں۔ (ادارہ)

سورج خراماں خراماں مشرق سے طلوع ہو رہا تھا ہر طرف ہلکی ہلکی روشنی پھیل رہی تھی... گرمیوں کی یہ صبح بھی اپنے اندر حبس سمیٹے ہوئے تھی میں اپنے آبائی گاؤں ایک شادی کی تقریب میں ایک دن پہلے شرکت کرنے آیا تھا اور اب اپنے گھر واپس جا رہا تھا کہ اچانک گاؤں کے شمال مغربی حصے سے مجھے شور و غل سنائی دیا۔ گاؤں کے تقریباً سبھی لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور دکھ درد میں اپنی سمجھ اور بساط کے مطابق ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ گاؤں کا ماحول بڑا پُرسکون سا ہوتا ہے۔ جب کبھی کوئی شور سنائی دے تو کوئی نہ کوئی ناگہانی آفت یا انہونی بات ہو چکی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے میری موٹر سائیکل بھی غیر ارادی طور پر اسی شور کی جانب مڑ گئی اور اپنی منزل پر پہنچ کر رک گئی۔ اب میرے پریشان ہونے کی باری تھی کیونکہ یہاں کا منظر ہی بہت روح فرسا تھا میرے بچپن کا ساتھی ماسٹر مقبول ایک بستر پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ چارپائی کے ارد گرد بیٹھی ہوئی عورتیں بین کر رہی تھیں اور مرد دکھ سے نڈھال ہو رہے تھے ماسٹر کی بیوی روح اور معصوم سی بہن اپنے بھائی کو اس حالت میں دیکھ کر بلک بلک کر رو رہی تھی۔ میرے وہاں پہنچتے ہی فوراً عورتوں اور بچوں نے ایک طرف سمٹ کر مجھے راستہ دیا۔

میں نے سب سے پہلے اس کی نبض دیکھی تو نبض کی طرح مجھے چاول بھی ڈوبتا ہوا محسوس ہوا میں نے نفرت سا جھٹکے ایک لڑکے کو کہا

"ڈاکٹر کو جلدی سے بلا لاؤ" اس نے بتایا

گاؤں کا ڈاکٹر رنگیلا چند دن ہوئے اپنے گھر گیا ہوا ہے اور ابھی تک واپس نہیں آیا ہے۔ ہم پہلے ہی معذور ہو چکے ہیں۔

یہ سنتے ہی میرے حواس منتشر ہو گئے۔ ماتھے پر پسینہ کے قطرے جھلملانے لگے لیکن اتنی دیر میں ماسٹر کا ماموں زاد بھائی لیاقت بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور یہ شیشی میرے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا حکیم کے شاگرد سے لے کر آیا ہوں۔ اس کے سونگھنے سے بیہوشی دور ہو جاتی ہے۔

میں نے شیشی کا ڈھکن کھول کر ماسٹر کی ناک سے لگا دی۔ کچھ لمحے بعد ماسٹر نے ایک گہرا سانس لیا اور ہائے کی آواز کے ساتھ ہی ساتھ اپنے دل پر رکھ لیا۔ شیشی میں نے ہٹا لی۔ اس کے ساتھ ہی وہ پھر تڑپ کر ساکن ہو گیا۔ میں نے پھر نبض پر ہاتھ رکھا تو وہ پہلے سے بھی ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ میں نے بے چینی سے ماسٹر کے بھائی کی طرف دیکھا اور تیزی سے کہا۔

فوراً ٹریکٹر ٹرالی لے آؤ اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مریض کی حالت خطرناک ہے

ماسٹر کا ماموں زاد بھائی لیاقت میری بات سنتے ہی بھاگ کر گھر گیا۔ اور چند لمحے بعد ہی ٹریکٹر ٹرالی لے آیا۔ ہم نے جلدی سے مریض سمیت چارپائی ٹرالی پر رکھی اور ٹریکٹر تیزی سے شہر روانہ ہو گیا۔ ہمارے گاؤں حسن آباد سے شہر میاں چنوں پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ لیکن آج یہ سفر بہت طویل معلوم ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ہم میاں چنوں پہنچے اور ماسٹر مقبول کو ڈاکٹر شوکت کے کلینک میں پہنچا دیا۔ ڈاکٹر نے نہایت عجلت میں مریض کا معائنہ کیا اور چند ضروری انجکشن لگانے کے بعد بتایا۔

اب فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے خواب آور گولیاں کافی مقدار میں کھالی تھیں۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تم بروقت یہاں پہنچ گئے ورنہ ... خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو جاتا"

ماسٹر کے بھائی رواں حسین کی نگاہیں ممنونیت کے احساس سے میری جانب اٹھ گئیں اور اس کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو نکل بہے۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری جانب دیکھا اور کہنے لگا

بھائی راہد! آپ نے ہم سب پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ جو ہمیں بروقت مریض کو شہر لانے کا احساس دلایا میرے پاس شکریہ ادا کرنے کے لئے موزوں الفاظ بھی نہیں ہیں!

میں نے جواب دیا "برادرم! یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا۔ میں نے کسی پر کوئی احسان نہیں کیا ہے۔ پھر ماسٹر میرا بچپن کا ساتھی اور دوست بھی تو ہے۔ ماسٹر دنیا و مافیہا سے بے خبر بستر پر لیٹا ہوا تھا ڈاکٹر نے گلوکوز کی بوتل بھی لگا دی تھی۔ چند گھنٹوں بعد ماسٹر نے آنکھیں کھولیں۔ تو مجھے دیکھ کر اس کے مرجھائے ہوئے زرد چہرے پر خوشی کے آثار ظاہر ہوئے اس کے سوکھے ہوئے لبوں پر ایک لمحہ کے لئے مسکراہٹ عود کر آئی۔ لیکن نہ جانے کیا سوچ کر وہ پھر غمگین ہو گیا۔

میں نے پوچھا "بھئی! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے سب عزیز پریشان ہو رہے ہیں۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ .... اب حالت کیسی ہے؟" وہ اک ٹک چھت کی طرف گھورتا رہا پھر یکدم چونک اٹھا اور میری طرف دیکھتے ہوئے نحیف آواز میں پوچھنے لگا۔

راہد بھیا ..... آپ کیا کہہ رہے تھے۔

میں نے جواب دیا۔ بھئی تمہارے لئے ہم سب پریشان ہیں۔ تمہاری حالت اب کیسی ہے؟

اس نے جواب دیا۔ تھوڑی سی کمزوری محسوس کر رہا ہوں تمام جسم بھی ٹوٹ رہا ہے، اتنے میں ڈاکٹر آگیا۔ اس نے مزید انجکشن اور گلوکوز کی بوتل لگا دی اور ہمیں ہدایت کر دی

پلیز آپ لوگ مریض کے پاس سے دور ہو جائیں۔

اب اسے آرام کی ضرورت ہے۔ مریض پر بے ہوشی سی چھا گئی۔ میرا دل وہاں سے اٹھنے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر مجبوراً اٹھنا پڑا۔ میں ڈاکٹر کے ویٹنگ روم میں آکر بیٹھ گیا۔ یکایک میرے ذہن میں سوال ابھرا کہ مقبول نے آخر خودکشی کی کوشش کیوں کی ہے۔ جبکہ آج اس کو دنیاوی تمام سہولتیں میسر ہیں۔

معزز قارئین!

میرا یہ دوست انتہائی محنتی اور ذہین ہے آپ سے ذرا تعارف بھی کرواتا چلوں۔ اس کا بچپن بھی ایک کہانی ہے۔ ماسٹر کے والد ملک رفیق صاحب کی دو بیویاں تھیں ایک بیوی سے پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں اور دوسری بیوی سے صرف ایک مقبول ہی تھا۔ مقبول کے والد ملک رفیق صاحب ایک زمیندار ہی نہیں بلکہ لکڑی کے کاروبار کے ایک بہت بڑے ٹھیکیدار تھے۔ انکوں کا کاروبار تھا۔ یوں تو دیکھنے والوں کو اس گھرانے میں سکون ہی سکون نظر آتا تھا لیکن جس طرح ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتی ہیں۔ اسی طرح ان دونوں بیویوں میں سے ہر ایک کی یہی کوشش رہی کہ ملک رفیق کے تمام التفات صرف اور صرف مجھ ہی سے وابستہ رہیں۔ اس کوشش میں اکثر مقبول کی سوتیلی والدہ کا پلڑا بھاری ہی رہتا تھا۔ پھر ایک دن مقبول کی والدہ اور اسکی سوتیلی ماں کا آپس میں جھگڑا ہوگیا۔ شام کو جب ملک رفیق گھر آئے تو مقبول کی سوتیلی ماں نے مقبول کی ماں کے خلاف ملک صاحب کو خوب بھڑکایا۔ تھوڑی سی بات کا بتنگڑ بن گیا۔ مقبول کی والدہ میکے چلی آئی اور پھر یہ ناراضگی طول پکڑ گئی۔ مقبول کے ماموں سعید پوش قسم کے زمیندار تھے۔ انہوں نے جب دیکھا زمیاں بیوی کی صلح بہت مشکل ہے تو انہوں نے اپنی بہن کو اس کے حصے کی جو تھوڑی بہت زمین تھی اسے دے دی۔ خوددار اور شفیق ماں نے اپنے بیٹے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا عزم مصمم کرلیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اب میں اپنی زندگی کی تمام خوشیاں اپنے بیٹے پر نچھاور کردوں گی لیکن اس کے والد یا دیگر رشتہ داروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گی۔ اس طرح مقبول

ایک ہی گاؤں میں رہتے ہوئے بھی اپنے سوتیلے بھائیوں سے دور ہوتا چلا گیا۔ اسے والد کا پیار تو نہ ملا۔ لیکن ماں نے باپ بن کر اس کی پرورش کی۔ والدہ کا پیار.... خلوص اور جانثاری پاکر وہ باقی سب رشتے بھول گیا وہ ایک ذہین لڑکا ثابت ہوا۔ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ دوسرے ہم جماعت طلبا میں اسے نمایاں پوزیشن ملتی رہی اور اس طرح اس نے نہایت آسانی سے میٹرک کے امتحان کو نہایت اچھے نمبروں میں پاس کرلیا۔ میٹرک کے بعد اس نے ہوسٹل واغ میاں چنوں میں داخلہ لے لیا اور عین اس وقت جب ایف۔اے کا امتحان سر پہ تھا۔ اس کی والدہ بیمار ہوگئیں۔ اور علاج معالجے کے باوجود اس کی حالت بگڑتی چلی گئی۔ ایک دن تو بخار بہت تیز ہوگیا۔ مقبول اپنی والدہ کو اس حالت میں دیکھ کر تڑپ تڑپ جاتا تھا۔ ڈاکٹر بھی جی چھوڑ بیٹھا۔ یوں معلوم ہونے لگا جیسے مریضہ کا آخری وقت آپہنچا ہے۔ آج مقبول کو زیست کے اس مقام پر پہنچانے والی ایک با عدل ہستی.... پیار وخلوص اور جانثاری کا درس دینے والی ماں خود بستر مرگ پر پڑی دھیمے دھیمے سانس لینے لگی۔ گھر کے تمام افراد مقبول کے ماموں ممانی، سوتیلے بھائی بہنیں، ماموں زاد بہن بھائی اور دیگر رشتہ دار اس کی امی کے اردگرد جمع ہوگئے۔ ڈاکٹر بھی مریضہ کو انجیکشن لگاکر مایوس سا بیٹھا تھا۔ کیونکہ بخار حد سے زیادہ تیز ہوگیا تھا۔ لیکن یہ خطرناک لمحات خداوند تعالیٰ کی رحمت سے جلد ہی بیت گئے۔ بخار ذرا سے کم ہوا تو مریضہ نے ایک کراہ کے ساتھ کروٹ لی پھر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔

مقبول بیٹے:

جی امی جان۔ مقبول نے نہایت انکساری اور رقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔

بیٹے تم میری وجہ سے اسقدر پریشان کیوں ہو۔ اس کی امی نے خفیف آواز میں نصیحت آمیز لہجے میں پوچھا۔ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گی۔ ذرا سا بخار ہوگیا تھا انشاءاللہ جلد اتر جائے گا۔ تم پڑھ کیوں نہیں رہے۔ امتحان کب شروع ہو رہا ہے

پرسوں ..... امی جان، مقبول نے پُرنم آنکھوں کو رومال سے صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

ماں نے شفقت بھرے لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ تعلیم کا حصول سب باتوں سے افضل ہے ..... تمہارا پرسوں امتحان ہے اور تم اپنا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہو ..... آخر کیوں؟

مقبول نے نہایت ادب سے جواب دیا "لیکن امی جان ..... آپ کی حالت .. .."

اس کی امی نے بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے یقین ہے تمہارے امتحان دینے اور رزلٹ نکلنے تک میں ٹھیک ٹھاک ہی رہوں گی میں اپنے خدا سے چند سانسوں کی مہلت مانگ لوں گی۔ پھر اس نے تائید طلب لہجے میں ڈاکٹروں سے پوچھا کیوں ڈاکٹر صاحب آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

ڈاکٹر نے حیران پریشان ہوتے ہوئے جواب دیا "خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ جلد تندرست ہو جائیں گے۔ وہ بیچارا تو پہلے ہی حیران ہو رہا تھا کہ اس عورت کی قوت ارادی نوجوانوں سے بھی زیادہ ہے۔ جو اتنے تیز بخار میں بھی حوصلہ قائم رکھے ہوئے ہے اور اس کا دل و دماغ بھی معمول کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ پھر اس نے اپنے بیٹے سے کہا۔

بیٹے ..... میں نے تمہیں کن جان جوکھوں سے پال پوس کر جوان کیا ہے۔ اور تمہیں تعلیم دلانے کی کوشش کی ہے۔ کیا تم میری محنت پر اتنی آسانی سے پانی پھیر دو گے۔ نہیں ..... میرے بیٹے ..... نہیں ..... ایسا کبھی نہیں ہو گا تم ابھی میرے سامنے کتابیں اٹھاؤ اور پڑھنے کے لئے گاؤں کے سکول کے پلاٹ میں چلے جاؤ۔ (مقبول ہمیشہ سکول کے پلاٹ میں الگ تھلگ بیٹھ کر پڑھا کرتا تھا) میری تیمارداری کے لئے اتنے ڈھیروں تیماردار جو موجود ہیں۔

لیکن امی جان ..... میں آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا" مقبول نے نہایت عاجزی سے عذر پیش کیا۔

مقبول بیٹے تم یقین کرو مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ لیکن اگر تم یہیں بیٹھے رہے تو میں اپنی موت سے پہلے اپنے سانس ہار بیٹھوں گی میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ تم ابھی اور اسی وقت کتابیں اٹھا کر چلے جاؤ" مقبول نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے چلا آیا کیونکہ وہ سارے زمانے کو ٹھکرا سکتا تھا لیکن اپنی ماں کا حکم ٹالنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ رشتہ دار، احباب اور گاؤں والے اس عظیم ماں کے اس عجیب حکم پر عش عش کر اٹھے لیکن اتنی دیر میں مقبول کی والدہ پر بخار کی غنودگی چھا گئی۔ شام ڈھلے اس کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔ بخار بھی قدرے کم ہو گیا۔ شام کو مقبول واپس آیا تو امی کی حالت دیکھ کر قدرے مطمئن ہو گیا۔ ماں بھی اپنے بیٹے سے خوشی باتیں کرتی رہی لیکن رات کو بارہ ..... ایک بجے اس کی طبیعت پھر خراب ہو گئی۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا یہاں تک کہ مقبول نے اپنا آخری پرچہ بھی دے دیا لیکن اس وقت تک مقبول کی امی ہڈیوں کا ڈھانچہ سا رہ گئی۔ ڈاکٹر کے علاج سے کوئی افاقہ نہ ہوا بلکہ بخار ٹائیفائیڈ کی شکل اختیار کر گیا۔ مقبول اپنی والدہ کو شہر میں لے گیا اور وہاں مختلف ڈاکٹروں سے علاج کروانے لگا۔ لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ایف اے کے نتیجہ سے چند دن قبل اس کی ماں کی حالت بہت خراب ہو گئی ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو وہ اپنی والدہ کو شہر سے گھر لے آیا۔ نتیجہ سے ایک رات قبل مقبول کی دور اندیش ماں نے اپنے بیٹے کو وصیت کی۔

مقبول ..... میرا ارادہ تھا کہ تمہیں تعلیم کی دولت سے اس قدر مالا مال کر دوں کہ گاؤں کے لوگ تم پر رشک کرنے لگیں افسوس کہ قدرت کو ایسا منظور نہیں تھا۔ میرے دن شاید پورے ہو چکے ہیں۔ تمہارے لئے یقیناً یہ موزوں ہو گا کہ تم میری نصیحت کو غور سے سنو اور اس پر عمل بھی کرو۔ کل تمہارا ایف اے کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا بیٹا اچھے نمبروں سے ایف اے کا امتحان پاس کر یگا مزید تعلیم حاصل کرنے کی اپنے طور پر کوشش کرنا لیکن اس سے پہلے کوئی کورس کر کے کوئی معزز پیشہ اختیار کر لینا خدا تمہیں کامیاب کرے گا۔ میرے بعد اپنے ماموں اور ممانی کی خدمت کرنا لیکن اپنے باپ کے سامنے کبھی بھی ہاتھ نہ پھیلانا۔ ورنہ میری روح کو تکلیف پہنچے گی۔ کیونکہ تمہارے

باپ نے مجھے ناقابلِ بیان اور ناقابلِ برداشت اذیت پہنچائی ہے۔ اس نے میاں اور بیوی کے پرخلوص رشتے کا احترام نہیں کیا بلکہ اس پاکیزہ اور پرتر رشتے کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ البتہ تمہارے سوتیلے بہن بھائیوں کا کوئی قصور نہیں ہے اس لئے اپنے بہن بھائیوں سے ہمیشہ اچھا سلوک کرنا اگر کبھی برا وقت آ جائے تو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے صبر کرنا

مقبول اپنی امی کی باتیں نہایت غور سے سن رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اشک بار تھیں اس نے چھلکتے آنسوؤں کے دوران اپنی امی سے وعدہ کیا۔" امی جان آپ کو اپنی تربیت اور اپنے خون پر اعتماد ہونا چاہیئے۔ لیکن خدارا ابھی ایسی مایوسی کی باتیں نہ کریں۔ آپ ہی نے تو مجھے بارہا سبق دیا ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا گناہ ہے۔ اس کی امی کی پلکوں میں بھی موتیوں کے قطرے جھلملانے لگے۔ اس نے نحیف آواز میں کہا۔

میرے بیٹے ... موت برحق ہے۔ ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے" پھر اگلے دن جب مقبول کا نتیجہ اخبار میں آنا تھا۔ اس کی امی کی طبیعت بہت خراب ہو گئی اسے بار بار غشی آنے لگی۔ مقبول نے اپنے ماموں زاد بھائی لیاقت کو اخبار لینے کے لئے شہر بھیج دیا اور خود اپنی ماں کے پاس ہی موجود رہا۔ اس کی امی کو جب ہوش آیا تو اس نے نقاہت سے بھرپور لہجے میں کہنا شروع کیا ......

میرے بیٹے میری خواہش تھی کہ میں ..... اپنی زندگی ہی میں ...... کوئی ..... خوبصورت اور ..... خوب سیرت بہو اپنے گھر ..... میں لا کر اس گھر کو ..... رونق بخش سکتی ..... لیکن اب ..... میرے دن پورے ہو چکے ہیں۔ پھر اس نے قریب ہی بیٹھے ہوئے مقبول کے ماموں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا بوجھ تمہارے ماموں پر ڈال دیا ہے لیکن میں نے وضاحت بھی کر دی ہے کہ میرے بیٹے کی پسند کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ تم بھی اپنے ماموں کو کوئی دکھ نہ پہنچانا۔

ٹھیک ہے امی جان ایسا ہی ہوگا۔ مقبول کے رقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔ اس کی امی نے مزید کہنا شروع کیا۔

میں نے اپنی ..... ہونے والی بہو ...... کے لئے زیورات اور کپڑے ..... تیار کروا رکھے ہیں ..... یہ تمام سامان بڑے صندوق میں پڑا ہے۔ میرے بیٹے ..... یہ امانتیں ..... میں تمہارے سپرد کر رہی ہوں ...... ، ے میری ہونے .... والی بہو .... کو .... دے دینا اس کی امی کو پھر غشی طاری ہو گئی۔ تمام خاندان اس کے اردگرد جمع ہو گیا تھا۔ اتنی دیر میں لیاقت بھاگتا ہوا آیا اور پھولی ہوئی سانسوں کے دوران کہنے لگا۔ مبارک ہو مبارک ہو خالہ جان ..... مقبول نے ایف۔ اے کا امتحان فسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا ہے" مقبول کی امی نے جب سنا تو ایک گہرا سانس لیا اور آسمان کی جانب نگاہ اٹھا کر کہا

" یا خدا ... تیرا شکر .. ہے .... اے اللہ تیرا ..... شکر ہے۔ میں اپنے ..... بیٹے .. کو .... اب ..... تیرے .. حوالے .... کرتی ہوں .. تو ہی .... اس کا نگہبان .. ہے"

پھر اس نے نحیف آواز میں کلمہ توحید کا ورد کیا۔ آہستہ آہستہ اس کے دل کی دھڑکن ڈوبتی چلی گئی اور یوں مقبول کی شفیق ماں اسے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اپنے آخری سفر پہ روانہ ہو گئی۔ مقبول مہینوں کھویا کھویا سا رہا۔ ماں کی جدائی میں صبح و شام اس کی آنکھیں موتی برسایا کرتی تھیں۔ کسی پل بھی اسے قرار نہیں ملتا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ ماموں اور ممانی کے خلوص نے جدائی کے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ جب ذہن کچھ نارمل ہوا تو سب سے پہلے اس نے اپنی ماں کی وصیت کے مطابق پی ٹی سی میں داخلہ لے لیا اور نہایت محنت اور جانفشانی سے یہ کورس کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت ضائع نہیں ہونے دیتا اس کا راتوں کا جاگنا اور لگاتار محنت رنگ لائی اور کورس میں اس نے نمایاں پوزیشن حاصل کر لی۔ جس کی وجہ سے اسے جلد ہی میاں چنوں شہر کے ایک پرائمری سکول میں آسامی مل گئی اور اس کی گزر بسر اچھے طریقے سے ہونے لگی اس دوران وہ اپنے سوتیلے بہن بھائیوں سے بھی نیک سلوک

کرتا رہا۔ پھر اچانک اس کا والد بیمار ہو کر چل بسا۔ اس نے والد کی وفات کے بعد اپنی بساط کے مطابق اپنے بہن بھائیوں کی مدد کرتا رہا۔ لیکن کبھی بھی والد کی جائیداد سے ایک پائی بھی نہ مانگی۔ اس طرح مزید دو سال کا عرصہ گزر گیا۔ مقبول کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر اس کی سوتیلی ماں اور بھائی اس کے پاس آئے۔ اور اس کی ماں نے کہا بیٹے!

جی ماں جی۔

بیٹے میں نے تمہاری ماں کو بہت دکھ دیئے ہیں لیکن میں نے تمہاری والدہ سے آخری دن معافی مانگ لی تھی۔ میں تم سے بھی بہت شرمندہ ہوں۔ تم بھی نوازحسین اور دیگر بچوں کی طرح میرے بیٹے ہو۔ باپ کی جائیداد میں تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرے دوسرے بیٹوں کا۔ اس لئے تم جاکر زمین بانٹ لو۔ مقبول نے انکار کر دیا۔ لیکن برادری اور گاؤں کے معززین نے اسے مجبور کیا تو اس نے اپنا حصہ لے لیا۔ اس کے بعد ماسٹر مقبول نے فارغ وقت میں گندم اور کپاس کے سیزن میں ان دونوں فصلوں کی تجارت شروع کر دی۔ اپنی ذہانت اور لگن کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں بڑے بڑے بیوپاریوں اور تاجروں میں شمار ہونے لگا۔ بچپن ہی سے فراخدلانہ فطرت اور حسن سلوک کی وجہ سے دوست احباب اسے شہنشاہ کے نام سے یاد کرنے لگے تھے۔

ضرورت مندوں اور دوست احباب کی مالی امداد کرنا اس کی عادت تھی اب تو دولت کی فراوانی کی وجہ سے وہ اپنے لقب شہنشاہ کو صحیح معنوں میں زندہ رکھے ہوئے تھے۔ مزاح اور ظرافت اس کی رگ رگ سے ٹپکتا تھا۔ میں حیران تھا کہ جب نامساعد حالات تھے تو اس خوددار انسان نے صبر اور شکر سے اپنا وقت پاس کیا لیکن اب جبکہ اس پر خدا کی خاص رحمت تھی۔ دولت کی فراوانی تھی۔ ہر وقت خوش و خرم رہنے والے انسان کو آخر خودکشی کی کیوں سوجھی۔ یہ سوال بار بار میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ یقیناً مقبول کے ساتھ کوئی ٹریجڈی ہو چکی تھی۔ یہی معلوم کرنے کے لئے میرا دل بیقرار ہو رہا تھا۔ دو گھنٹوں بعد ہمیں مقبول سے چند لمحوں کے لئے بات چیت کرنے کی اجازت ملی۔

تو میں فوراً اپنے دوست کے پاس پہنچ گیا۔ اب اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ میں نے رسمی گفتگو کے بعد اس سے اجازت لے لی۔ کیونکہ مجھے کاروبار سے متعلق چند اہم کام بھی سرانجام دینے تھے۔ پھر اگلے چند دن میں بہت ہی زیادہ مصروف رہا۔ لیکن اس دوران میں نے مقبول کی مزاج پرسی کے ساتھ ساتھ پیش آنے والی ٹریجڈی سے پردہ اٹھانے کا وعدہ لے لیا تھا۔

چودھویں رات کا چاند اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی اور پرنور کرنوں سے سرسو نرالی روشنی بکھیر رہا تھا۔ میں اور ماسٹر گاؤں کے سکول کے گراؤنڈ میں گھاس کے قدرتی فرش پر آمنے سامنے بیٹھے تھے حسب وعدہ وہ اپنی زخم زخم زندگی سے پردہ اٹھانے والا تھا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر چند لمبے لمبے کش لئے اور گہری سانس لے کر کہنا شروع کیا۔

زاہد بھیا! آپ پوچھتے ہیں کہ میں نے قدرت کی عطا کردہ زندگی جیسی بہترین نعمت کو ٹھکرانے کی کوشش کیوں کی ہے۔ زندگی کو کون ٹھکراتا ہے..... لوگ تو اپنی زندگی کی بقا کے لئے دوسروں کا گلا کاٹ دیتے ہیں۔ اپنی زندگی کی راحت کے لئے معصوم لوگوں کی گردن میں پھانسی کا پھندا ڈال دیتے ہیں۔ اپنی خوشیوں کے لئے دوسروں کی خوشیوں پر ڈاکہ ڈال لیتے ہیں۔ پھر مجھے اپنی زندگی سے نفرت کیوں ہوئی۔

پیارے بھیا! میرے بچپن کے حالات سے آپ واقف ہیں لیکن کچھ واقعات ایسے بھی ہیں۔ جنہیں آپ نہیں جانتے ہیں۔ میرے یہ واقعات میری زخم زخم زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ جب میری شفیق ماں مجھے سسکتا... بلکتا ہوا چھوڑ کر اپنے آخری سفر پر چلی گئی تو میرا دل بھی گھر میں نہیں لگا۔ میں اپنا زیادہ وقت ماں کی قبر پر گزارنے لگا۔ میں اپنے ساتھ قرآن پاک بھی لے جاتا تھا۔ اور اپنی ماں کے سرہانے بیٹھ کر تلاوت قرآن پاک کرتا رہتا تھا۔ اور اس کا ثواب اپنی والدہ کی روح کو بخش دیتا تھا۔ اس طرح چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ ایک دن میں حسب معمول قرآن پاک پڑھ رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسے قبر پہ میرے علاوہ بھی کوئی ذی روح موجود ہے۔ لیکن میں تلاوت میں مشغول رہا۔

آخر جب پروردگارِ عالم سے دعائے مغفرت کی اپیل کر چکا تو میں نے اپنے پہلو کی طرف نگاہ دوڑائی تو شازیہ کو اپنی جانب محویت سے تکتے ہوئے پایا۔ شازیہ اور میں نے بچپن میں ایک سید زادی کے ہاں قرآن مجید کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن دو پارے پڑھنے کے بعد میں نے شاہ صاحب سے مسجد میں سبق لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ گاہے بگاہے ہمارے گھر آ کر میری والدہ کا کام میں ہاتھ بٹایا کرتی تھی۔ دور کے رشتے سے میری کزن لگتی تھی۔ لیکن والدہ کی وفات کے بعد میں نے اسے کبھی گھر پر نہیں دیکھا تھا۔ شاید میں خود ہی گھر پر نہیں رہتا تھا.... اس لئے مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ شازیہ کبھی ہمارے گھر بھی آئی ہے یا نہیں.... ماں اسے پیار سے شازی کہا کرتی تھی۔ میں اپنا کوئی کام شاذ و نادر ہی اسے کہا کرتا تھا۔ لیکن وہ میرے بغیر کہے میری کتابوں کو ترتیب سے لگا دیا کرتی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں بہت پہلے کی تھیں۔ ماں کی وفات کے بعد تو وہ مجھے آج نظر آئی تھی۔ مجھے شام کے وقت اس کی یہاں موجودگی پر بہت تعجب ہوا۔ سو میں نے اس سے پوچھا۔

شازی تم یہاں کیا کرنے آئی ہو۔

اس نے شیریں لہجے میں جواب دیا۔ میں ادھر سے گزر رہی تھی تو میرے دل میں خیال آیا کہ آپ کی امی کی قبر پر سے ہوتی جاؤں۔ آپ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ مجھے بھی یہاں وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا۔

میں نے سرزنش کی۔ لیکن تمہیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے تھا

کیوں.... ؟ اس نے بھولپن سے پوچھا

کوئی ہم دونوں کو یہاں ویرانے میں اکٹھا دیکھ لیتا تو میں نے تشویشناک لہجے میں کہا۔

تو کون سی قیامت آ جاتی۔ اس نے میری بات کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

مس شازیہ.... ! لوگ بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں دیکھو ناں.... اب ہم جوان ہو گئے ہیں۔ ابھی تک بچے تو نہیں ہیں۔ میں نے وضاحت کی۔

اس نے شریر لہجے میں جواب دیا " جوان.... اوہ تمہیں بھی جوان ہونے کا احساس ہے.... پھر تو مجھے بہت خوشی ہو گی کہ تمہارے نام کے ساتھ میرا نام آئے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور غصیلے لہجے میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ شازی زیادہ باتیں بنانے ضرورت نہیں ورنہ میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا اب تم جلدی سے چلتی پھرتی نظر آؤ''

اس نے ایک دلفریب مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے کہا ''فضول.... تم کتنے نادان اور معصوم ہو۔ تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ میں کتنے عرصہ سے تمہارے پیار کو ترس رہی ہوں۔ میں نے تمہاری مورتی کو اپنے من مندر میں ایک عرصہ سے چھپا رکھا ہے۔ نہ جانے تم کس دنیا میں آباد رہتے ہو۔ کبھی اپنی بنائی ہوئی مخصوص دنیا سے نکل کر تو دیکھو کہ کتنی رنگینیاں تمہیں خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہیں۔ تمہیں معلوم نہیں کہ گاؤں کے لڑکے مجھ سے بات کرنے میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں لیکن میں نے کبھی انہیں منہ نہیں لگایا۔ بلکہ تیرے میٹھے بول سننے کو ترس رہی ہوں۔

میں نے بیزاری سے جواب دیا۔ ٹھیک ہے۔ کبھی فرصت ملی تو تمہارے متعلق بھی سوچوں گا۔ فی الحال میری جان چھوڑ دو۔

وہ الہڑ دوشیزہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔ اس نے ایک ادائے محبوبانہ سے داہنے ہاتھ کو ماتھے پر لے جاتے ہوئے سلام کیا اور چوکڑیاں بھرتی ہوئی قبرستان سے نکل گئی۔ میں نے ایک لمبی سانس لے کر خداوند تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اس واقعہ کو تقریباً دو ماہ گزر گئے ایک دن میں چند دوستوں کے ساتھ گپ ہانک رہا تھا کہ لیاقت نے کہا۔

نازسینما میں فلم عندلیب لگی ہوئی ہے۔ کل اس فلم کو دیکھنے چلیں گے۔ سب دوستوں نے اس پروگرام کو پسند کیا۔ سب کا خرچہ اٹھانے پر بیشگی ٹاس ڈالی گئی تو ٹاس میرے نام آئی۔ میں نے حامی بھر لی۔ ایک آدمی سے پیسے لینے تھے۔ اس کے پاس گیا تو وہاں سے کچھ نہ ملا۔ ماموں جان وردن سے گاؤں آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے جواب عرض ا

تھا ہر بار بازی سلسلے میں گئے ہوئے تھے۔ ان دنوں میری مالی حالت خراب تھی لیکن بھرم قائم تھا۔ میں پریشان تھا کہ دوستوں سے کیا ہوا وعدہ کیسے نبھا سکوں گا۔ شام کے وقت میں فٹ بال کھیل کر واپس آ رہا تھا تو میرا ذہن پیسوں کے حصول کے متعلق حل تلاش کرنے میں مگن تھا۔ گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اچانک شازیہ میرے سامنے آ گئی۔ اس نے شاید مجھے پریشان سا محسوس کیا ہوگا تبھی تو اچانک سوال کر بیٹھی۔

کیا بات ہے مقبول آج تم پریشان کیوں ہو۔

تمہارا وہم ہے۔ میں نے اسے ٹالنے کے لئے کہہ دیا نہیں مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو تمہارا چہرہ چغلی کھا رہا ہے کہ تمہیں کوئی پریشانی لاحق ہے۔

میں نے ہنس کر مذاقیہ لہجے میں کہا۔ مجھے تو اچانک ایک سو روپے کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ کیا تم میری ضرورت پوری کر سکتی ہو

اس کے چہرے پر شناسائی سی پھیل گئی۔ اس نے اپنی غزالی آنکھوں سے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا میں کوئی بھکارن نہیں ہوں بڑا بیوپاری ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے گھر کی طرف دوڑ کر بال بھری ہوئی چلی گئی میں نے دل ہی دل میں کہا۔

پگلی کہیں کی۔ اور اپنی راہ لی۔ گھر پہنچ کر میں نے منہ دھو کر کپڑے تبدیل کئے اور گھر سے باہر نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شازیہ نے اپنے مخصوص لہجے میں سلام کیا۔ اور سو روپے کا نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

مقبول ... یہ لو سو روپے۔ میں حیران سا اس کی طرف دیکھنے لگا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شازیہ واقعی سو روپے لے کر آ جائے گی۔ میں نے تو مذاقاً کہہ دیا تھا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس کے پاس چند روپے بھی نہیں ہوں گے۔ سو روپے تو بہت دور کی بات ہے۔ اس نے میری حیرانی کو محسوس کرتے ہوئے مسرور لہجے میں کہا۔

مقبول ..... کیا سوچتے ہو یہ پیسے رکھ لو... نا۔ میں شرمندہ ہوتے بولا۔ نہیں شازی .... تمہارا بہت بہت شکریہ.... تم یہ پیسے واپس لے جاؤ۔ مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔

اس نے تعجب سے کہا "کیوں .... کیا بات ہے! کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ گئے کہ میں یہ پیسے اپنے گھر والوں کے چرا لائی ہیں۔ قسم سے .... یہ پیسے میرے اپنے ہیں۔ کپاس کی چنائی سے میں کچھ نہ کچھ بچاتی رہی ہوں۔ کسی کو بھی ان پیسوں کا علم نہیں ہے۔

میں نے جلدی سے کہا۔ نہیں شازی ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم ایسی لڑکی نہیں ہو۔ لیکن میں تم سے پیسے نہیں لوں گا۔

شازیہ نے روہانسی آواز میں کہا مقبول! خدا کے لئے اب یہ پیسے رکھ لو جب تمہارے پاس ہوں گے مجھے لوٹا دینا لیکن اگر تم نے ابھی واپس کرنے کی کوشش کی تو میں اس نوٹ کو چولہے میں پھینک دوں گی۔ یہ کہہ کر اس نے نوٹ میری طرف پھینکا اور بھاگ کر گھر سے نکل گئی۔ میں نوٹ اٹھا کر اس کو تکارتا ہی رہ گیا۔ لیکن اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ گلی کے آخری سرے تک اس کے پیچھے آیا لیکن وہ نہ جانے کدھر غائب ہو گئی تھی۔ آخر میں نے نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیا۔

رات کے وقت بستر پر لیٹا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس دنیا میں اب بھی ایک غمگسار ہستی ہے۔ آج پہلی بار میرے دل کو وہ کامنی سی بھولی بھالی لڑکی بہت بھلی لگی۔ میں نے دل ہی دل میں عہد کیا کہ آئندہ میں اس کے پیار کا جواب پیار سے دوں گا۔ اگلے دن مجھے اپنے دوستوں سے وعدہ خلافی کرنا پڑی۔ ایک کام کا بہانہ بنا کر تین دن تک معذرت کر لی۔ پھر شام کے وقت میں نے سو روپے والے نوٹ کے بدلے دس دس روپے کے نوٹوں کا پیچ لیا اور شازیہ کے پاس ایک بچے کو بھیج کر اسے بلوایا۔ شازیہ بھاگتی ہوئی میرے پاس پہنچ گئی۔ وہ میرے بلاوے پر بہت مسرور دکھائی دیتی تھی۔ میں نے دس نوٹ دس روپے والے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

شازی! میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں کہ تم میرے برے وقت میں کام آئی ہو۔ مجھے اپنے پیسے مل گئے ہیں۔ اس لئے اب یہ پیسے تم واپس لے لو۔

اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ مقبول تم مجھے غیر نہ سمجھو

تمہیں اگر اور پیسوں کی ضرورت ہے۔ تو تین سو روپے اور بھی پڑے ہیں وہ بھی لے لو۔ یقین کرو۔ مجھے حد سے زیادہ خوشی ہوگی

میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ شازی میں تمہیں غیر نہیں سمجھتا ہوں۔ اسی لئے تو تمہارے پیسے استعمال کئے ہیں لیکن اب جبکہ میرے پیسے آگئے ہیں تو مجھے تمہارا قرض لوٹا دینا چاہیئے" شازیہ بولی۔

مقبول میری ہر چیز تمہاری ہے۔ یہ تو پیسے ہیں۔ میں نے معذرت کی۔

لیکن شازی بھیک لینا میری عادت نہیں ہے۔ ہاں میں نے تم سے قرض لیا تھا وہ میں لوٹا رہا ہوں۔ اگر تم اپنے پیسے واپس نہیں لوگی تو آئندہ میں تمہارے ساتھ بات بھی نہیں کروں گا۔ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھ سے پیسے لے لئے پھر روہانسی آواز میں کہا۔

لیکن وعدہ کرو کہ آئندہ جب بھی تمہیں پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ مجھ سے بغیر جھجک کے مانگ لوگے۔

میں نے اس کے خلوص کا اندازہ کرتے ہوئے اس کا دل رکھنے کے لئے کہہ دیا۔ ٹھیک ہے شازی میں ایسے ہی کروں گا۔ وہ میری بات سن کر خوش ہوگئی اور خوشی سے جھومتی ہوئی گھر جانے کے لئے مڑ گئی اور میں سوچنے لگا کتنی بھولی بھالی اور پر خلوص لڑکی ہے۔ اگلے دن ماموں جان گھر لوٹے تو میں نے اپنے دوستوں سے کیا ہوا فلم دکھانے کا وعدہ ایفا کیا۔ پھر چند دن بعد ایک شام ماموں جان نے مجھ سے مزید تعلیم حاصل کرنے کے متعلق پوچھا۔ میں نے بتایا کہ میں پی ٹی سی کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میرے ارادے کو سراہا اور میرے داخلے کی کوشش کرنے لگا۔ جلد ہی مجھے اگلے کورس کے لئے داخلہ مل گیا۔ اس طرح ماموں جان نے مجھے پی ٹی سی کرنے کے لئے بہاولپور بھیج دیا۔ جہاں ہوسٹل میں رہتے ہوئے میں سخت محنت کے ساتھ اپنے کورس کو اچھے نمبروں میں پاس کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ میرے کورس کے دوران شازیہ مجھے خط لکھتی رہی۔ اپنی محبت کا یقین دلاتی رہی۔ میرا دل بھی چاہتا تھا کہ محبت کا جواب محبت سے دوں۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ خطوط کا جواب کس ایڈریس پہ دوں۔ گاؤں کے ماحول میں لڑکی کی طرف خطوط بھیجنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے میں نے خاموش ہی رہا۔ میرا کورس ختم ہونے میں دو ماہ رہ گئے تھے۔ جب شازیہ کا ایک خط اور ملا اس نے لکھا تھا۔

جان سے پیارے مقبول!

آداب و تسلیمات۔

پیار بھی کتنی عجیب سی لذت کا نام ہے۔ جتنا اس سے دور بھاگو اتنا ہی یہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ میں نے تمہیں چاہا۔ اپنے من مندر میں بسایا۔۔ تخیل میں ہر وقت اس مورتی کی پوجا کرتی رہی لیکن سکون کی بجائے بیقراری بڑھتی ہی گئی ..... تمنائیں .... آرزوئیں تشنہ ہی رہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے سہانے سپنے تخیل میں دیکھے تھے لیکن آج یہ سب خواب کانچ کی چوڑی کی طرح چکنا چور ہو چکے ہیں جی ہاں میرے محبوب! بچپن میں میرا نکاح میرے ماموں زاد رشتہ کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن رخصتی ہونا باقی تھی۔ سب یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں پرایا دھن۔ پرایا مال ہوں۔ تم سے پیار کرتی رہی۔ شاید میں سوچتی تھی کہ میرا محبوب میری سونی سونی ..... اجڑی اجڑی سی تقدیر کو بدل کر جنت کی پرسکون وادیوں میں لے جائے گا۔ لیکن تم تو پتھر نکلے۔ تم نے تو پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔ اب میری شادی کا دن آج سے دس دن بعد چاند کی چودہ تاریخ کو مقرر ہوا ہے۔ شاید یہی میرا آخری دن ہے کیونکہ تمہارے بغیر میں نے کسی اور کی سیج کی زینت بننے کا تصور بھی نہیں کیا تھا اس وقت کسی کو بھی میرے سسکتے .... سلگتے ارمانوں کا احساس نہیں ہے۔ یہاں تک کہ تم بھی خاموش ہی ہو۔ اب تم ہی بتاؤ کہ ایسی زندگی کا کیا فائدہ جو حسرتوں سے بھرپور ہو۔

میرے محبوب! میری آخری خواہش ہے کہ تم ایک بار مل لو نہ جانے پھر عالم ارواح میں ملاقات ہو۔ ہمیشہ ہمیشہ سے تمہاری راہ تکنے والی

تمہاری داسی

شازیہ

(اس کہانی کا اختتام اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں)

*

جواب عرض لاہور

ارمانوں
کا
خون
تحریر:
فیصل کیانی زیاد، جہلم

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب! سدا نیلے گگن تلے مسکراتے رہیں!

آداب و تسلیمات، امید ہے مزاج بخیریت ہوں گے۔ میری زیرِ نظر داستان معاشرے کے ان نام نہاد ٹھیکیداروں کا اصل روپ ہے جو من گھڑت رواجوں کی بھینٹ معاشرے میں جنم لینے والی نوخیز کلیوں کو چڑھا دیتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ خدا ایسے لوگوں سے ہر ایک کو بچائے...

شہزادہ صاحب۔ میری زیرِ نظر حقیقت جسے میں نے... "ارمانوں کا خون" کا نام دیا ہے۔ یہ "ناجو" نامی معصوم کلی پر ڈھائے گئے ستم کے پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ یہ ستم گر اس کے اپنے ہی ہیں جو نام کے انسانیت اور مذہب کے علمبردار بنے بیٹھے ہیں۔ جبکہ وہ اپنی ہی بیٹی کو دن دہاڑے دہکتی آگ میں دھکیل چکے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ وہ کس مذہب کی نمازیں اور تہجد پڑھتے ہیں! اگر میری یہ تحریر پڑھ کر ایک بھی نام نہاد ٹھیکیدار راہِ راست پر آگیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

میں جوابِ عرضِ حق کا ایک مدت سے قاری ہوں، لیکن اس میں عملی طور پر شمولیت کے لیے پہلی مرتبہ اپنا کاوشہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ میں نے حقائق پر مبنی جوابِ عرض حق کی پالیسی کے تحت نام وغیرہ تبدیل کر دیئے ہیں۔ کہانی کی صداقت پر کوئی شبہ کی گنجائش نہیں ہے چونکہ میں نجی طور پر اس کے کرداروں کو بخوبی جانتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حسبِ سابق اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے میری اس ناقص سی کوشش کو بھی شامل اشاعت کر کے میرے لڑکھڑاتے قلم کو سہارا دیں گے۔ اور اس معصوم کلی کو سکون بخشیں گے جس کے ساتھ یہ ہولی کھیلی گئی ہے.... آخر میں جوابِ عرض حق کی مزید ترقی کے لیے دعاگو ہوں...

نیک تمناؤں کے ساتھ... خدا حافظ...

خ یس۔ اکبر سدوزئی

پی او بکس، نمبر ۳۱۱۶، الدمام سعودیہ العربیہ

ناجو! ایک مقتولہ کی نقاب کشائی کرنے کی جسارت کر رہا ہوں، حقیقت میں وہ بہ قیدِ حیات ہے اور اپنے ارمانوں کا لاشہ لاغر کاندھوں پر اٹھائے زندگی کی بے کیف ناؤ کو دھکیل رہی ہے۔ اگرچہ وہ زندہ ہے مگر اس کے ارمانوں، اس کے خوابوں، اس کے خیالوں، اس کے منصوبوں اور اس کی خواہشات کو قتل کر دیا گیا ہے....

ناجو میرے قریب کے جاننے والے حلقہ میں سے ہے۔ یہ اس نام نہاد مشرقیت پر وردیرانے کی لہلہاتی اور مسکراتی کلی ہے جو اس سے قبل تین بھائیوں اور تین بہنوں پر مشتمل تھا۔ تو جب رب العزت نے ناجو کو ان کے ویرانے کی زینت بنایا تو ان کی بہنیں چار ہو گئیں۔ ان کا ایک متوسط گھرانہ تھا... ناجو کے والدین دونوں آرمی میں تھے۔ ناجو کی آمد پر بھی انہوں نے خوب خوشیاں منائیں۔ ان کا گھرانہ زیورِ تعلیم سے قدرے نابلد ہی تھا۔ اس لیے اس کا بڑا بھائی بھی ساتویں جماعت سے تعلیم کو خیرباد کہہ کر فوج میں بھرتی ہو گیا... دوسرے نمبر پر ان کی بہن تھی جسے اسکول کا منہ دیکھنا تک نصیب نہ ہو سکا... تیسرے نمبر والے بھائی نے بھی بڑے بھائی کی روایات کو دہرایا اور تعلیم جیسی نعمت سے آنکھیں چرا کر فوج میں شمولیت اختیار کر لی۔ ان سے چھوٹی بہن تھی جس نے اسکول وغیرہ کے تردد میں پڑنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی...

یہاں میں یہ وضاحت کیے جاؤں کہ یہ گھرانا ایک پہاڑی علاقے کا باسی ہے، جہاں قدرت کے نظاروں کی ہر پل ہر گھڑی بے دام سیل ہوتی ہے۔

جوابِ عرض حق لاہور

۴۸۳

ں تک پرسس پہاڑ خدا کی بلندی کی ناگزیر نظیر پیش کرتے ہیں۔ رو گھس بہنے والی ہلکی موسیقی سے شریں عجیب کیفیت کی پیدا کرتی ہیں۔ سرسبز لہلہاتی کھیتاں بل کھاتی ندیاں جنت کا سا سماں پیش کرتی ہیں۔

دیکھو یارو! ان حسین و جمیل اور پیکر قدرت کی مرتع وادیوں میں بھی قاتل رہتے ہیں۔ جو صرف اور صرف چھوٹی انا اور جھوٹے بھرم کی بھینٹ ان کومل کلیوں کو چڑھا دیتے۔ جنہوں نے ابھی مسکرانا بھی نہیں سیکھا ہوتا۔

ہاں تو جناب میں بھٹک گیا تھا۔ یعنی اصل موقف سے ہٹ گیا تھا۔ نامعلوم کیا بات ہے جو میں آدمیت کو جلتے ہوئے انگاروں میں نہیں دیکھ سکتا۔ کہتے ہیں ہمارے زمانے کا درد میرے دل میں کچھ ایسی ہی بات ہے۔ اچھا تو واپس چلتے ہیں۔

میں بتا رہا تھا کہ پانچویں نمبر پر ان کے ایک بھائی آتے تھے۔ جنہیں ان کے اہل گھرانہ نے سکول بھیجنا مناسب جانا۔ شاید کسی نے مشورہ دیا تھا یا زمانے کی دیکھا دیکھی انہیں بھی یہ زحمت سوجھی کہ اولاد کو پڑھانا چاہیئے۔ مگر اس میں بھی ان کی ذاتی رائے مقدم نہ تھی بلکہ بچے کو ارد گرد کے بچوں کی نسبت خود سکول جانے اور پڑھنے کا بہت شوق تھا جس کے باعث وہ سکول چلا گیا۔ اور اسی شوق کے نتیجے میں بلا روک یا ریسٹ کہ اس نے میٹرک کر لیا۔ گھر پر بھی ان کے نظریات کے مطابق بڑی تیر ماری تھی۔ خیر موصوف چونکہ متمنی زیور تعلیم تھے۔ اس لیے انہوں نے بغیر کسی کی رائے کا انتظار کیے نزدیکی شہر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ جہاں سے وہ ہر روز شام کو بخوبی واپس چلے آتے تھے۔ اسی اثنا میں ان کی ایک دوسرے گاؤں اور دوسرے قبیلے سے منگنی کر دی گئی۔ اس منگنی کی وجہ دونوں کے والد صاحبان کی فوجی رفاقت تھی۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ارمانوں بھرا زمانہ ایک ساتھ گزارہ تھا اور کئی برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں پر پیارے وطن کی پاسبانی کرتے ہوئے انہوں نے اس بندھن کو باندھنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ لڑکی کے گھر والے بھی نزاکت دنیا سے تقریباً ناآشنا تھے۔ ان کے ہاں بھی علم کی کوئی قدردانی نہیں تھی۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ بھی اس نعمت سے محروم تھے۔ مگر نئی پود نے ان کے ہاں بھی چند تبدیلیاں رونما

کیں۔ جس کی نظیر یہ ملتی ہے کہ ان کے دونوں بیٹے میٹرک ہیں۔ جبکہ ایک لڑکی ان پڑھ ہے۔ دوسری بھی تقریباً نیلا ہی جبکہ تیسری نے بادور بانزدل چھٹی ساتویں تک سکول کا پیمانہ چھوڑا مگر کب تک آخر وہ معصوم بازو، بھی تھک ہار کر گھر کے ہو کر رہ گئے۔

یہاں ایک اور بات واضح کرتا جاؤں کہ ناجو کے دو ستر تمبر والے بھائی جو فوج میں چلے گئے تھے۔ ان کو شاید وہاں کی ٹھوکروں نے یا پھر اللہ نے یہ شرف بخشا تھا کہ وہ باوجود ان پڑھ ہونے کے صاحب بصر ہیں، صاحب ہوش ہیں۔ صاحب ... ہیں۔ زمانے کے نشیب و فراز کا تخمینہ لگا جانتے ہیں۔ ان کا اسم شریف امجد ہے۔ جبکہ ان کے چھوٹے بھائی جو کالج کی دنیا تک پہنچ چکے تھے۔ ان کا نام ظفر ہے۔

ظفر نے فرسٹ ایئر پاس کر لیا۔ مگر اس میں جو ولولہ اور جوش و خروش کالج کی دنیا سے پہلے تعلیم کے میدان میں پایا جاتا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے پستی کی طرف گامزن تھا... یہ میرے خیال میں اور حالات کی ...... نزاکت کے تحت اس لیے ہوا کہ اسے شاید فخر ہو چلا تھا کہ میں اپنے خاندان میں واحد فرد ہوں۔ جو اس قدر تعلیم یافتہ ہوں۔ اس کے اندر غرور نے اپنے بیل بوٹے لگا لئے تھے۔ جن کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی تھیں۔ خردمندوں نے کہا ہے کہ غرور کسی کا مان نہیں چھوڑتا۔ جبکہ یہی عالمی حقیقت اس کے ساتھ بھی دہرائی گئی۔ یعنی وہ انٹرمیڈیٹ میں ناکام ہو گیا۔ ظفر کے گھر والوں کے لیے یہ کوئی المیہ نہیں تھا۔ وہ پھر بھی فخر کرتے تھے کہ ان کا چہیتا یہاں تک آن پہنچا ہے

اس دور میں ظفر کی چھوٹی بہن سیما بھی آٹھویں تک پہنچ چکی تھی۔ وہ بہت شریر، چنچل اور کھری کھری باتیں کرنے والی تھی۔ اللہ نے اسے انتہائی فراخ دماغ بخشا تھا۔ وہ آج تک ہر جماعت میں امتیازی حیثیت میں کامیاب ہوتی رہی تھی: وہ مسکراتی کلی کی مانند تھی۔ اسے پڑھائی سے جنون کی حد تک پیار تھا۔ انتہائی عمدہ لکھتی اور پڑھتی تھی اس کے لیے سن رکھا تھا کہ بچپن سے ہی ایک صاحب کی منگیتر ہے۔ وہ صاحب زمانے کے کاہل اور اپنے لواحقین کے معاملے میں پرلے درجے کے لاپرواہ تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی

ایسی حرکات کے وہ دلدادہ تھے۔ جن کے باعث کوئی بھی صاحبِ ہوش لڑکی نہیں ساتھی بنانا تو در کنار، سوچنا بھی گناہِ کبیرا سمجھا لکا سکے مترادف سمجھتی ہوگی۔ سیما چونکہ بلا کی ذہین تھی جس کی وجہ سے اس نے اپنے دل سے بھی اس کے ذہن میں بات آتی تو سٹپٹا جاتی اور خدا برتر سے ہزاروں دعائیں مانگتی کہ آل ظلم سے محفوظ فرمانا۔ اس کی اللہ نے کہیں سن لی اور تسلی طور پر ان دونوں قبیلوں میں رخنہ پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ اور اللہ اللہ کرتے ایک دن وہ بھی آیا جب سیما کے بھائی نے انہیں صاف صاف جواب دے دیا کہ ہمیں یہ رشتہ قبول نہیں ہے آپ کوئی اور بند و بست کر لیں۔ اب ہوا یہ کہ ان کے ہاں بہت سے خاندانوں نے اس سندر پھول کے حصول کی خاطر پھیرے لانے شروع کر دیے ان کے بالکل قریبی حلقہ سے ایک محترم نے پیغام بھیجا جو ماشاء اللہ تیس اور چالیس کے پیٹے میں تھے۔

خیر اسے تو جلد ہی جواب ہو گیا۔ یہاں میں بتا تا چلوں کہ ظفر کے بڑے دونوں بھائی اور دونوں بہنیں شادی شدہ تھے۔ انہی دنوں میں ایک اور صاحب مقصد ان کے ہاں حصولِ سیما کی خاطر ڈورے ڈالنے شروع ہوئے موصوف دوسرے ضلع کے باسی تھے۔ اور سونے پہ سہاگہ دیکھو کہ ان کے صاحبزادے بھی ۲۴ برس کی حدود پھلانگ رہے تھے۔ جبکہ سیما بمشکل ۱۷ برس کی ہوتی ہوگی۔ یہ صاحب کچھ صاحبِ رسائی تھے۔ ایک تو کوئی دور سے رشتے دار بھی بنتے تھے۔ کہتے ہیں جب ضرورت ہو یا وقت پڑے تو رشتے خود بخود مل جاتے ہیں۔ باوجود علم ہونے کے کہ موصوف کو قریبی رشتہ داروں نے بھی ٹھکرایا ہے۔

سیما کے گھر کے چند خواہ مخواہ صاحب اس معاملے میں حقیقت کی نظر سے سوچنے لگے۔ وہاں ایک چکر اور بھی تھا وہ یہ کہ ظفر جو کہ جوانی سے مزین تھا اس کا منہ کالا کرنے والا دھندا موصوف کی ہٹ سے چل رہا تھا۔ جس کے باعث ظفر ان کے حق میں اپنا ووٹ ڈالنا فخر، سعادت اور احسان کا بدلہ جانتا تھا۔ ان ہی دنوں ظالموں نے ان چکروں کی وجہ سے سیما کی شوق کا گلا ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دبا دیا۔ یعنی اسے سکول سے ہٹا دیا گیا۔ جس پر اس نے کافی دنوں تک آنسو بہائے۔ مگر لاحاصل!

جبکہ سیما کی ہیڈ مسٹریس نے بھی کہا کہ وہ ایک ذہین بچی ہے اس کی زندگی میں زہر نہ گھولو۔ سنگدل بزرگوں کی ستم ظریفی دیکھیں کہ اس وقت سیما میٹرک کی طالبہ تھی۔ اور اس کی سکول پراگرس رپورٹ اس امر کی غمازی کرتی تھی کہ وہ کس قدر صاحبِ شوق ہے۔ اس کے تمام ٹیسٹ امتیازی نمبروں میں تھے۔ مگر ان سماج کے چھوٹے ٹھیکیداروں نے اس کی حصولِ علم کی امنگوں کا گلا ہمیشہ کے لیے دبا دیا۔

سیما اب مایوسی کی دلدل میں پھنس گئی تھی۔ اس کا سلسلۂ تعلیم بھی جاتا رہا تھا۔ اور ادھر اس نامراد عاشق کے لیے اہلِ گھرانہ سنجیدگی سے سوچ رہے تھے۔ سیما ہر سمے خدا سے دعا کرتی کہ یارب! تمہیں کو اس مشرقی کلی کی امنگوں کی حفاظت کرنی ہے۔ جو نہ انکار کر سکتی ہے اور نہ اپنی راے کا اظہار کر سکتی ہے۔ یعنی نہ کھل سکتی ہے اور نہ مرجھا سکتی ہے

سیما کا آئیڈیل ایسا تھا وہ سوچتی تھی مجھے ایک شریف گھرانہ نصیب ہو۔ ساتھی زیست تعلیم یافتہ ہو۔ سسرال سلجھے ہوئے طبقے سے ہو۔ جہاں وہ اپنی تشنگی علم کی پیاس کو بجھا سکے۔ ہم سفر ہم عمر ہو... حسن ہو.. محب ہو۔ چھیل چھبیل ہو... سرو قد ہو۔ حسن کا پیکر ہو۔ یعنی قدرت کا عظیم شاہکار ہو۔

حقیقت میں سیما اس قابل تھی بھی کہ اسے اس کی امنگوں تمناؤں، خواہشوں اور خوابوں کے مطابق ساتھی ملے۔ چونکہ وہ بھی قدرت کا ایک انمول تحفہ تھی۔ اللہ نے شاید اس کی فریاد منظور کر لی کہ انہی دنوں اس کے دو بھائی جو حقیقت کو جاننے کی صلاحیت رکھتے تھے دو ماہ کی چھٹی آ گئے۔ آتے ہی انہوں نے گھریلو ماحول کا جائزہ لیا۔ پھر بیوی کی وساطت سے پہلے جملہ امور معلوم کیے۔ جب انہیں سب کی سنجیدہ سوچ کا علم ہوا تو انہوں نے ایک بزرگ ہونے کے ناطے اپنی بہن کی رائے جاننے کو سوچا۔ مگر یہ بات ان کے گھرانے میں توہین آمیز گردانی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ وہ زمانے کی ضروریات سے آشنا ہو چکے تھے۔ اللہ نے انہیں ارمانوں کی قدر کرنے کی صلاحیت بخشی تھی۔ وہ مناسب طریقے کے لیے سوچ رہے تھے کہ کس طرح سیما کے دل کی کیفیات بھانپ لی جائے کہ ان کی بیوی چائے لے کر آ گئی۔ انہیں کسی عمیق سوچ میں غرق

دیکھتے ہوئے اس نے سوال داغ دیا۔

رجی۔ کیا چوٹ لگ گئی ہے جو کہیں کھو گئے ہم جانتے تا سکتے۔

ہوں۔۔۔ آں۔۔۔ نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ میں۔۔۔ میں!

جناب اچھا یہ بیچئے ہم آپ کے۔۔۔

اس نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اس پر انہوں نے سوچا کیوں نہ سے قرض سونپا جائے۔

آں۔۔۔ ہاں۔۔۔ او بات یہ ہے۔۔۔ ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے کہا۔

کیا بات ہے، خیریت تو ہے نا۔ اللہ کرے آپ خیریت ہی سے ہیں۔۔۔

ہاں بھئی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اصل میں ایک پریشانی لاحق تھی جس کا حل اب مجھے مل گیا ہے۔ یعنی تم آ گئی ہو۔

کیا بات ہے جس کے لیے آپ اس قدر الجھن کا شکار تھے۔

بتاتا ہوں دیکھو! بات یہ ہے کہ میں اس رشتے کے بارے میں سیما کی دلی کیفیت جاننا چاہتا ہوں۔ جس پر باقی سب بڑی سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ یہ تمہاری ڈیوٹی ہے شام تک مجھے معلوم ہو جانا چاہیئے ٹھیک ہے نا۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میری آمد کی خبر پر کل یا پرسوں وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔

ٹھیک ہے میری جان! ہم کس مرض کی دوا ہیں۔ شام سے قبل ہی بتا دوں گی۔

وہ اب تسلی سے چائے سے محظوظ ہو رہے تھے۔ آس آس میں دن ڈھلا۔ شام ہوتے ہی جونہی انہیں موقع ملا فوری طور پر پوچھا۔

میں نے ایک کام تمہارے ذمے لگایا تھا کیا بنا اس کا؟

سوال سنتے ہی اس کا چہرہ مایوس ہو گیا۔ چونکہ شاید وہ بھی اس رشتہ کے معاونین میں دم مارتی تھی۔ انتہائی بوجھل اور ملکا ہٹ آمیز انداز میں اس نے جواب دینا شروع کیا۔

جناب آپ اگر حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو وہ بہت کڑوی ہے۔

کیا پہیلیاں بجھا رہی ہو۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔ مجھے معلوم ہے حقیقت اور سچ ہمیشہ کڑوے ہوتے ہیں۔ مگر میں انہیں سننے کی اہمیت رکھتا ہوں۔ فوری طور پر صاف صاف بتا دو۔۔

میرے ہمسفر! بات یہ ہے کہ وہ ایسا کوئی رشتہ نہ ہیں کرتی۔ جس میں یہ چند ایک صفات موجود نہ ہوں۔ وہ بیچ وہ والدین کے فیصلے پہ منکر نہیں۔ لیکن تاکرہی نہیں وہ حکم سمجھ کر قبول کرے گی۔ اس نے افسوس ظاہر کیا۔ یار ۔۔ اس نام نہاد مشرقیت اور مذہبی رسم و رواج میں ہم بے زبان ہیں۔ والدین چاہیں تو کنوئیں میں پھینک دیں چاہیں تو تخت پر بٹھا دیں۔ جبکہ مذہب ان باتوں کی تردید کرتا ہے۔ اور میں باوجود علم کے اپنے ہونٹوں پہ چپ کی مہر ثبت کیے ہوئے ہوں۔ اسلام ایسے کسی بندھن کو قوی یا مکمل خیال نہیں کرتا۔ جس میں دونوں فریقین بخوبی راضی خوشی نہ ہوں حتیٰ کہ اسلام میں ایک بکری یا گائے کو جب فروخت کیا جاتا ہے تو باقاعدہ دونوں فریقین کے درمیان راضی خوشی معاہدہ عمل میں آتا ہے اور پھر یہ سودا مکمل ہوتا ہے۔ لیکن یہاں الٹی گنگا کا اللہ حافظ۔ میں کوئی رائے نہیں دے سکی ہاں اگر کوئی رائے کی شنوائی ہوتی تو میری پسند ایک تنا ہوا قدرت تھی۔ محب و محسن انسان تھی۔

دیکھو میری بات سنو! کیا یہ سیما کو معلوم ہے کہ یہ رائے میں نے حاصل کروائی ہے؟

نہیں۔۔۔ نہیں سرتاج! یہ تو ویسے میں نے اسے چھیڑا تھا۔ اگر اسے آپ کا معلوم ہوتا تو شاید وہ پھر کچھ نہ بتاتی۔

اچھا تو اس بات کو دفن کر دو۔ کسی دوسرے کان تک اگر اس نے رسائی پائی تو ٹھیک نہ ہوگا۔

میری امنگوں کے بادشاہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ منع آپ فرمائیں اور میں عمل نہ کروں۔

امجد کو ان باتوں سے جن جذبات کا علم حاصل ہوا۔ وہی وہ جاننا چاہتا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بہن گائے بکری کی طرح دوسروں کے حوالے کر دی جائے۔ اسے سیما کی تعلیم چھوٹ جانے کا سخت دکھ تھا۔ دوسرے دن حسب توقع جب لڑکے والے اپنی بات پکی کرنے کی غرض سے آئے۔ تو قدرت نے سیما کی خلوت میں مانگی گئی دعاؤں کا بھرم رکھ لیا۔ خلوص سے ادا کیے ہوئے جذبات کی قیمت پالی وہ

مکان کے ایک اندھیرے کمرے میں اپنے ارمانوں کے لٹنے پر ماتم کناں تھی کہ اس کی بھابی نے اسے نوید سنائی۔

سیما.. سیما بات سنو! میں ایک خوشخبری لائی ہوں۔

بھابی جلنے دیں ان باتوں کو۔ یہ کان اب خوشخبری سننے کے قابل کہاں..؟

سیما کو ہرگز اس سہانی تبدیلی کی توقع نہ تھی۔ اسی لیئے وہ مایوس تھی۔

دیکھو! میری سندر بہن.. یقین کرو جب تم سنو گی تو تمہاری باچھیں کھل جائیں گی۔

اچھا تو پھر سنا بھی دیجئے۔ اس قدر حسین وجمیل کیا نوید لائی ہیں آپ..؟

تمہارے بھیا نے اُن سے انکار کر دیا ہے۔

سیما نے اچنبے کی حالت میں بے قراری سے دریافت کیا۔ کس کا انکار اور کس کو کیا گیا؟

ارے پگلی! تجھے سوجھائی نہیں دیا۔ تیرے بھیا نے تمہارے رشتے کا انکار کر دیا ہے۔

الحمد للہ... سیما کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اس نے فرحت راحت سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دور بہت دور شاید اللہ کی کرسی دیکھنے جنت کی حسین وادیوں میں پہنچ گئی تھی۔ گویا اسے قارون کا خزانہ مل گیا تھا یا تختِ شاہی نصیب ہوا تھا۔ اس نے کئی سجدے بجالائے رب ذوالجلال کے حضور۔ اس ناگہانی انقلاب پر سیما کے والدین نے بھی بھر پور ناک بھوں چڑھائی۔ مگر قدرت کو جو منظور تھا وہ ہو گیا... انہوں نے اپنے بیٹے سے گو تفتیش تو نہ کی مگر موڈ ضرور بنائے رکھا۔ امجد وقت شناس تھا اس نے ان باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی بلکہ خس وخاشاک جان کر ٹھکرا دیا۔

ادھر ظفر کے بن مول لطف اور وقتی ومطلبی محبت کی پینگیں دھڑام سے ڈھیر ہو گئیں۔ اسے بھی یہ تبدیلی ناگوار گزری مگر لاحاصل۔ امجد اپنی بہن کی پوتر سوچ کا قدر دان ہو گیا تھا وہ چاہتا تھا کہ جیسے بھی ہو وہ ایک مکمل انسان کے بنا کسی کو اس کا ہاتھ نہیں دے گا۔ چاہے سارے من گھڑت رسم و رواج مسمار ہی کیوں نہ کرنا پڑیں۔ سیما کی دعائیں عرش معلیٰ پر قبولیت پا چکی تھیں۔ امجد کی اسی چھٹی کے دوران اُن کے ایک دوست کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ وہ چاہتا تھا کہ امجد کی موجودگی میں ہی شادی ہونی قرار پایا۔ اس کی کوششوں کے صلہ میں یہ معاملہ طے پا گیا۔

ظفر اپنی غیر رسمی سرگرمیوں اور چند مزید وجوہات کی بنا پر پھر ناکام ہو گیا۔ مگر اب کی دفعہ اس نے اس بات کو زار ہی رہنے دیا۔ اور گھر والوں کو مطمئن کر دیا۔ کہ میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ لیکن بس آوارہ گردی ہی اس کا مشغلہ تھی۔

ایک دن اچانک امجد کے دوست نے ایک بات اس سے پوچھی۔ جبکہ وہ دونوں اکیلے ہی گھروں کو واپس آ رہے تھے۔ امجد کا دوست اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے امجد کی بہن سیما کو اپنے چھوٹے بھائی کے لیے مانگنے کی بات کی۔ جو اس وقت گریجویشن میں تھا۔ معمولی سوچ کے بعد امجد نے اپنے دوست کو کہا۔

یار! میں تو اس بات کو تہہ دل سے پسند کرتا ہوں یعنی تم میری جان مانگو تو ہمہ وقت حاضر ہے۔ بہر حال میں اپنے گھر والوں سے مشورہ کر کے تمہیں مطلع کر دوں گا

ٹھیک ہے امجد یار! میں انتظار کروں گا۔

ان دونوں کے گھر ایک ہی گاؤں میں تھے۔ اور درمیانی فاصلہ بھی بہت تھوڑا تھا۔ سیما اور عطرت ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے۔ ان کی عمروں میں تین چار سال کا فرق تھا۔ وہ اکٹھے بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔

بدقسمتی یہ تھی کہ عطرت کی منگنی غیر رسمی طور پر ہو چکی تھی وہ اپنی پھوپھی زاد کا منگیتر تھا۔ گو اسے اس کا فیصلہ کا مکمل طور پر علم نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس کے چچا جو دوسرے شہر میں مقیم تھے۔ وہ بھی اپنی گوٹیاں فٹ کیے ہوئے تھے کہ عطرت میرا بیٹا ہو گا۔ لیکن ہوتا وہی ہے جو اوپر والا کرتا ہے۔ چند ہی دنوں کے بعد امجد نے اپنے دوست کو بتا دیا کہ میرے گھر والوں کو اعتراض نہیں ہے۔ جبکہ میں نے سنا ہے کہ آپ نے عطرت کی منگنی پہلے سے کر رکھی ہے

امجد یار..! یہ منگیاں کوئی گڈی گڈے کا کھیل تو نہیں جو یونہی قرار پا جائیں۔ تم بے فکر رہو۔ میں جو بات کر رہا ہوں اس کا بھرم میں گردن دے کر بھی رکھوں گا۔ یہ تمہارے دوست کا وعدہ ہے مذاق نہیں۔ میں جلد تمہارے گھر رسم

رواج کے تحت سیما کو مانگنے آئیں گا۔

وہ دونوں اس بات پر بے ساختہ ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ اور پھر گرم جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔ کچھ ہی دنوں بعد سیما اور مظفر کی منگنی ہو گئی۔ یہ خبر گاؤں اور رشتہ داروں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ اس منگنی میں سیما کے خاندان والوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا یا کہ۔ ہوا ادھر مظفر کے رشتہ داروں نے بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ لیکن جو بات قدرت نے کرنی تھی کر دی۔ شاید سیما اور مظفر کا ملن تاروں پر لکھنے والے نے خود کر دیا تھا۔ یہ تند و تیز ہوائیں ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ وہ دونوں اس اچانک انقلاب پر تہِ دل سے مشکور تھے۔ گویا دونوں کو اپنے خیالات کے مطابق آئیڈیل مل گئے تھے۔

اس واقعہ کے تھوڑا عرصہ بعد مظفر دیارِ غیر چلا گیا اب ظفر کی چھوٹی بہن ناجو جو نویں جماعت میں زیرِ تعلیم تھی۔ وہ خدا کا حسین کرشمہ تھی۔ پڑھائی میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ وہ گول مٹول پری۔ چودھویں کے چاند کی مانند حسین و پُرتر تھی۔ ان ہی دنوں کسی کی زبانی معلوم ہوا کہ ناجو کی پیدائشی منگنی ہو چکی ہے۔ یہ منگنی خبروں کے مطابق ناجو کے پھوپھی زاد سے طے پائی تھی۔ اس لڑکے کو شاہد کہتے تھے۔ وہ عمر میں ناجو سے بڑا تھا۔ جبکہ تعلیم میں پیچھے تھا۔

وقت کا پہیہ اپنی ہی دھن میں چلتا رہا۔ پھر نجانے کیا تغیرات ظہور پذیر ہوئے کہ ان دونوں گھرانوں میں محبت کی جگہ نفرت اور کدورت نے اپنے ڈیرے ڈال دیے۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ طویل اور مستحکم ہوتے گئے کہ نفرت کی وجہ سے نوبت ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے کی ممانعت تک پہنچ گئی۔ انہی وجوہات کی بنا پر ناجو کے والدین نے انہیں باور کرا دیا کہ ہم نہ تو کوئی رشتہ لینا چاہتے ہیں اور نہ ہی مستقبل میں ایسی توقع کی جا سکتی ہے۔ یعنی اس طرح وہ بندھن اُجاڑ ہو گیا۔

ناجو نے پانچویں جماعت اچھے نمبروں سے پاس کی۔ وہ لکھنے پڑھنے کے اعتبار سے انتہائی عمدہ پوزیشن میں تھی۔ ان کے گاؤں میں چونکہ پرائمری تک تعلیم کا انتظام تھا۔ لہٰذا اب اسے نزدیکی دوسرے گاؤں کے ہائی سکول داخل کروا دیا گیا۔ گو اس کے والدین اب بھی اپنی انہی ہوڑ کے ماننے والے تھے۔ مگر ایک تو ناجو کو خود پڑھائی سے بہت دلچسپی تھی دوسرا امجد جو اس کا بڑا بھائی تھا، وہ اسے اعلیٰ تعلیم دلانے کی سوچ رہا تھا۔

ناجو اپنے بہن بھائیوں سے سب سے چھوٹی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر سب بے حد سے بڑھ کر پیار کرتے تھے۔ وہ انتہائی لاڈلی تھی۔ لیکن باوجود اتنے لاڈ و پیار کے اسے اللہ نے اچھی صلاحیتیں بخش رکھی تھیں۔ وہ بالکل چھوٹی عمر سے ہی اپنے اچھے برے کو بخوبی پہچان لیتی تھی۔ وہ جب آٹھویں میں تھی تو سیما کی شادی کر دی گئی۔ سیما بابل کا گھر چھوڑ کر پیا کے دیس چلی گئی۔ جہاں اسے اپنی امنگوں کے مطابق خدا نے جیون ساتھی نصیب فرمایا۔ واقعی وہ حسن بھی تھا۔ محب بھی تھا۔ اور ماشاءاللہ گھرانہ بھی مذہبی تھا۔ سیما کے پیا کے دیس سدھار جانے پر ناجو پر چند ایک ذمہ داریاں عائد ہو گئی تھیں یعنی گھریلو معاملے میں اب اسے ماں کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ وہ والدین کی فرمانبردار بیٹی تھی۔ ماں کا ہاتھ بٹانے کے باوجود پڑھائی سے میلان اس کے ہاتھ مضبوط رہے۔

انہی دنوں قسمت نے کروٹ بدلی۔ یعنی مختلف اطراف سے حضراتِ طلبِ غنچہ نوخیز نمودار ہونے شروع ہو گئے۔ فی الحال کم سنی کے بہانے سب کو ٹالا جا رہا تھا۔ اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس وقت وہ بلوغت کی دہلیز تک تو شاید پہنچ چکی تھی۔ مگر اندر قدم ابھی نہیں رکھا تھا مالک نے اس کے بڑے دن نزدیک آنا شروع کر دیے۔

ناجو کے بھائی امجد ان دنوں فوج سے ریٹائر ہو کر گھر آ گئے۔ ان کے گھر ہوتے ہوئے یہ تمام مسائل اپنی موت آپ مر چکے تھے۔ لیکن کب تک کوئی بیکار گھر میں بیٹھ سکتا ہے۔ انہیں بھی فکرِ معاش لاحق ہوئی۔ اس وقت تک ان کے والد صاحب بھی پنشنر ہو چکے تھے۔

یوں آہستہ آہستہ معاشرے کے ان ظالم، قاتل اور نام نہاد روایات کے علمبرداروں کی اصلیت سے پردہ اٹھانے کی جانب قدم بہ قدم بڑھ رہا ہوں۔ قسمت کی ستم ظریفی

مسکان کی رزر ... ناجو کے والد محترم بھی اپنی ... مردار نکلے۔

... خاندان سے ایک نامی گرامی ظالم و بدمعاش ... لو میں اس کی زندگی یا ناکردہ گناہوں کو قرطاس پر لا نے نہیں جا رہا۔ وہ اس لیے کہ اس کی داستان کی تکمیل کو ایک عرصہ چاہیئے یا پھر زمین کا غذبن جائے۔ تو شاید ہی قلم بند کر سکوں۔ بہر حال مختصراً اس کے چند مشہور و معروف کارنامے عرض کیے دیتا ہوں۔

جناب صاحب: موصوف اس وقت تقریباً ساٹھ سال کے ہیں۔ تین یا چار بیویوں کے شوہر ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ سوائے ایک بیوی کے باقی تمام اغوا شدہ ہیں۔ جبکہ ایک نئی نویلی بیوی یعنی آخری معرکہ، شرعی عقد سے قبل ہی موصوف کے چھ بچوں کی ماں تھی۔ اور آٹھ نو سال سے اس کے ساتھ رہ رہی ہے۔ یہ حقیقت کوئی ڈھکی چھپی نہ تھی۔ بلکہ عدالتوں، برادری کے پنچایتوں اور شرعی عدالتوں سب کے سامنے روزِ روشن کی طرح کھلی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ موصوف متعدد قتلوں کا مرتکب بھی تھا۔۔۔

علاوہ ازیں اس نے اپنے سگے بھائی سے چچازاد بھائی کو قتل زمین کے معمولی جھگڑے پر کروا دیا تھا۔ جبکہ بعد میں اس کے قاتل بھائی نے اقبالِ جرم کر لیا۔ اور اس طرح وہ تختہ دار کی زینت بن گیا۔ موصوف تا وقت متعدد دیوانی اور فوجداری کے مقدمات میں ملوث ہے۔ اتفاق سے موصوف سے ایک دفعہ بات ہوئی کہ آپ کی اکثر اولاد شرعاً آپ کی نہیں ہے تو مستقبل میں ان کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے جواب میں یہ کہا۔

باوجی: سب کو پولیس میں بھرتی کروا دوں گا۔

اس باغیانہ، احمقانہ اور اس کے گھٹیا نظریہ کے تحت دلیرانہ جواب پر میں نے دوسرا سوال کر دیا۔

اچھا تو آپ کی پہلی بیوی کی اولاد ہے وہ باقیوں کو جائیداد میں شریک کرے گی؟

جناب میری عمر سال کے لگ بھگ ہو چکی ہے۔ جلد ہی دنیا چھوڑ جاؤں گا۔ پیچھے چاہے لڑیں یا مریں وہ ان کی صواب دید ہے۔

ہاں تو موصوف نے ایک دفعہ ایک تھانیدار کا سر بھی سرِ بازار پھاڑا تھا۔ مگر سزا سے فرار حاصل کر لیا۔ اس کے علاوہ کوئی غریب و بے سہارا آدمی اس نے اپنے گاؤں میں نہیں چھوڑا۔ جسے علاقہ بدر نہ کیا ہو۔ جس کی وجہ سے کافی زمین اس کے قبضہ میں ہے۔ اور اکثر بزدل اور نادار لوگ اس سے خائف رہتے ہیں۔ گاؤں تو کیا اکثر پیشہ ور بدمعاش اس سے مفرور رہتے ہیں۔ جبکہ نزدیکی گاؤں اس کی وجہ سے شریفوں اور غریبوں کا جینا حرام کیے ہوئے ہیں۔

صاحبو! میں دور نکل گیا۔ میری مندرجہ بالا اطلاعات کا مقصد یہ تھا کہ میں جس ناجو کی بات کر رہا ہوں۔ اس کے والد انتہائی شریف اور نفاستی آدمی ہیں۔ حتیٰ کہ معاملہ سنجیدہ کرنے تک ہے۔ مگر ہوا یوں کہ محترم نے تمام حضرات کو بری طرح سے ناجو کے رشتے کے لیے رد کر دیا۔ ابھی یہ فیصلہ ہو نہیں پایا تھے کہ امجد جو کہ ناجو کے رشتہ کے لیے موزوں آدمی کی تلاش میں تھا۔ وہ حصولِ معاش کی غرض سے دیارِ غیر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ جب اس کی تیاری آخری مراحل طے کر رہی تھی تو اسے کہیں سے خبر ملی کہ وہ بدمعاش اپنی پہلی بیوی کے سب سے چھوٹے لڑکے کے لیے ناجو کا رشتہ مانگ رہا ہے۔ یہ خبر امجد کو گولی کی طرح لگی۔ چونکہ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم ایسے بدمعاش کو اپنے گھر میں داخل ہونے دیں۔ یہاں ایک اور دلچسپ بات بتا تا چلوں کہ ناجو کے والد اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی دو بہنیں تھیں۔ ایک بقیدِ حیات ہے۔ جبکہ دوسری مر چکی ہے۔ متوفی کے دو بیٹے تھے جن میں سے چھوٹے بیٹے کی بیوی مندرجہ بالا موصوف لے اڑا تھا۔ گو بعد میں صلح ہو گئی مگر عورت ابھی تک ان کے ہی پاس ہے یعنی اس عورت کا شوہر امجد کا پھوپھی زاد بھائی تھا۔ یعنی تو میں عرض کر رہا تھا کہ امجد جب دیارِ غیر جانے لگا تو اس نے تمام گھر کے افراد کو اکٹھے بٹھا کر واضح انداز میں بتایا کہ بیشک وہ بدمعاش دور کے ہمارے رشتہ داروں میں شامل ہوتا ہے۔ مگر ہم ایسے آدمی کو ہرگز رشتہ نہیں دے سکتے جو ہمارے لیے مصیبت بنا ہے۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ ہم کسی شریف آدمی کو ہی اپنا رشتہ دار بنائیں گے۔

جواب عرض لاہور

سب اچھی طرح سن لیں کہ میں ایسی کوئی بات سننا گوارہ نہیں کر سکتا۔ ستم ظریفی کی انتہا دیکھیں کہ انتہائی شریف اور باعزت آدمی ان سے ناجو کے روادار نہیں تھے۔ اس پر بھی بس نہیں۔۔۔ موصوف کے صاحبزادے جن کا رشتہ درکار تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ درخت کی اصلیت پھل چکھنے سے ہی معلوم ہوتی ہے۔

محترم! آٹھویں سے سکول چھوڑ کر آوارہ پھر رہے تھے ان کا محبوب مشغلہ ٹیپ ریکارڈر اٹھا کر گاؤں کے مختلف اطراف کا طواف کرنا۔ اور خواہ مخواہ غریباء اور شرفاء کی عزت کو حقارت کی نظر سے دیکھتے رہنا۔ جبکہ ناجو دسویں کی طالبہ تھی اور حسب سابق ذہین اور قابل تھی وہ حد درجہ شریف اور مذہب پرور تھی۔ ناجو کے گھر ان کے گھر والوں نے دورے شروع کر دیے۔ تو انہیں کوئی اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ لیکن جب کچھ زیادہ ست پڑ گیا تو اسے حالات مشکوک سے دکھائی دینے لگے۔

امجد کو گئے ہوئے تقریباً سات ماہ گزر گئے تھے کہ ناجو کے کانوں نے ایک منحوس خبر سنی کہ اس کے والد کسی جائداد کی خریداری میں اس بدمعاش کی بے جا مدد کے احسان اور ایک اور زمین کے تبادلے کے چکر میں مدد کے وعدے کے احسان میں اسے رشتہ دینا چاہ رہے تھے۔ وہ معصوم کومل ناجو روئی، چلائی پیٹی۔۔ مگر اوپر والے نے شاید آنکھیں پھیر لی تھیں۔ اس نے فیصلے کی صداقت جاننا چاہی تو اسے کوئی شک و شبہ نہ ملا۔

اس نے احتجاج کے طور پر بھائیوں کو بتایا کہ اس سے بہتر یہ ہے کہ آپ میرا گلا گھونٹ دیں۔ ایک دن ناجو اور اس کی ماں ہی گھر میں تھیں۔ اس نے رو رو کر گڑگڑا کر اظہارِ تمنا کر دیا۔ لیکن اس کی ماں بھی اس زمانے کے ظالموں کے حق میں تھی اور کہا کہ وہ صاحب جائداد ہیں تم راج کرو گی۔ اور بھی کئی طرح سے ورغلانے کی کوشش کی۔ بس پھر ناجو کی آنکھیں سوجھ گئیں مگر ماں کا پتھر دل موم نہ ہو سکا۔ ایک اور بات بتاؤں کہ جہاں ناجو کی لاش دینے کے بعد وہ بیاہی جا رہی تھی وہاں کوئی آدمی لفظ تعلیم سے آشنا نہ تھا۔ سب جاہل اور گنوار تھے۔ ان کا کام بس درجنوں بچے جنم دینا تھا۔ وہ اس قدر گندے تھے کہ دیکھ کر قے آ جاتی تھی۔ مگر سماج کے ان بے رحم، ظالم، جابر، جلاد، قاتل، مرتد، فاسق ٹھیکیداروں کے سامنے ایک معصوم مشرقی لڑکی کی کیا چلتی۔ جب وہ تمام حلقۂ احباب سے مایوس ہو گئی تو اسے آخری سہارا جو خدا کے بعد تھا یاد آیا وہ سہارا امجد تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے متعدد خطوط امجد کو لکھے۔ امجد نے وہاں سے والد کو تمام حالات کی پھر یاد دہانی کروائی لیکن جواب کچھ ضرورت سے زیادہ ہی مختلف پایا۔ پھر اس نے دھمکی دی کہ اگر یہ کام کیا تو میں شامل نہیں ہوں گا مجھے عاق کر دیا جائے۔

لیکن باوجود اس کے کوئی اثر نہ ہوا ادھر ناجو کے مسلسل خطوط آ رہے تھے کہ بھیا میں بھیک مانگتی ہوں کہ ان ظالموں کے جال سے بچائیں۔۔ بچائیں۔

آخر کار امجد نے جب کوئی بات نہ بنتی پائی تو اس نے اپنے والد کو ایک عدد ناجو کا خط اپنے خط کے ساتھ واپس پوسٹ کیا کہ ظالم باپ اپنی آنکھوں سے اپنی بیٹی کے جذبات پڑھ لیے۔

پھر جا ہے جو فیصلہ کر۔ ادھر ناجو کا میٹرک کا امتحان شروع ہو گیا۔ وہ ان ساعد حالات کے باعث امتحان یکسوئی سے نہ دے سکی۔ اور سابقہ ہی خطوط کا سلسلہ جاری رہا۔ چونکہ وہ خود سکول جاتی تھی تو وہاں سے خط پوسٹ کر دیتی تھی۔ اس کے بعد اس پر کڑی نگرانی ہو گئی کہ یہ کسی کو خط نہ لکھے یعنی اس کی فریاد کسی تک نہ پہنچ سکے۔ امجد بے قراری سے منتظر تھا کہ کیا فیصلہ ہوا۔ ایک اسے دوسری بہن کا خط ملا کہ ناجو فیل ہو گئی ہے۔ اس کا دل پڑھائی سے اٹھ چکا ہے۔ امجد کو اس خبر سے بہت دکھ ہوا۔ والد کا خط ملا کہ امجد پانی کو آگ نہیں لگ سکتی۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا کر دیا مجھے کسی کی مدد یا حمایت کی ضرورت نہیں۔ اب کے بعد مجھے ایسا خط لکھنے کی جرأت نہ کرنا۔ تھوڑے دنوں کے بعد اسے ناجو کا خط مل گیا جو اس نے جانے کیسے چھپ کر لکھا تھا۔

زمانے کے بھیا۔۔ اکسی زمانے کی بہن ناجو آخری سلام کہتی ہے آج کے بعد کوئی میرا بھائی ہے نہ بہن، نہ والدین، یہ سب رشتے جسم و نفس کے ہوتے ہیں۔ میں نے ہر رشتے دار کو کہا ہے مگر میری سننے والا کوئی نہیں ہے۔ شاید یہ رشتے کانچ کے ہوتے ہیں۔ آج کے بعد سارے رشتے زمانے کو مبارک ہوں۔ میں خودکشی اس لیے نہیں کرتی کہ یہ بزدلوں کا کام ہے۔ اچھے تو نہ مل سکے چلو اب دشمنوں سے نبھا کرنا سیکھوں گی۔ جان لیجئے کہ ناجو مر چکی ہے۔ آج میں آٹھ ماہ پہلے والی ناجو نہیں ہوں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ ناجو۔

درد کچھ ایسے لگے کہ آنکھوں سے رویا نہ گیا
زخم کچھ ایسے لگے پھولوں پہ سویا نہ گیا

جواب عرض بلا ہوا

مئی ۱۹۸۳ء

تحریر:

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

آداب ... "نیلی سپیرن"... کے عنوان سے ایک تاریخی کہانی لے کر جواب عرض کی بزم میں حاضر ہو رہا ہوں۔ جس طرح آپ پہلے میری حوصلہ افزائی فرماتے رہے ہیں امید ہے اپنے قارئین کے ساتھ اپنی یہ رعایت برقرار رکھیں گے ... "نیلی سپیرن"... ماضی کے دریچوں سے جھانکتی ہوئی ایک ہلکی سی کرن ہے۔ ایسی نہ جانے کتنی ہی کہانیاں ہوں گی جو کاغذ کی زینت نہ بن سکی ہوں گی۔ جن کی سحر انگیز مہک کئی ذہنوں پہ آج بھی چھائی ہوتی ہے۔ نیلی سپیرن ایسی ہی ایک پرکشش کہانی ہے جو میں اپنے ایک بزرگ کی زبانی سن کر قارئین جواب عرض کی نذر کر رہا ہوں ...

شہزادہ صاحب! کہانی کے بارے میں صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ جھوٹے اصولوں کے پجاری ... بے مقصد رسموں کے قیدی اور خلوص و محبت کے دیرینہ دشمن ہمیشہ ہی اس دنیا میں نیست و نابود ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف نیک اور پاک جذبوں کے مالک، بہتے دریا اور چٹانوں کی طرح مضبوط ارادوں کے مالک ہمیشہ ہی تاریخ میں نہ مٹنے والے نقوش چھوڑ جاتے ہیں ....

میں اپنے ان تمام قارئین کا بے حد ممنون ہوں جو میری حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور تعمیری تنقید سے نوازتے ہیں۔ اس کہانی کے سلسلے میں ندیم الحسن راجہ اور اعجاز بلوچ کے تعاون کا مشکور رہوں گا۔ آخر میں ایک بار پھر اپنی اس کہانی اور کاوش کے بارے میں قارئین کی قیمتی آراء کا شدت سے منتظر رہوں گا۔ ساتھ ہی ساتھ میں اپنے اس پیارے جواب عرض کی ترقی کے لیے دعاگو رہوں گا ...

خلوص کیش ....

فیصل کیانی فرہاد

معرفت نیو رحمانیہ اسٹور، جی۔ ٹی روڈ، دینہ ضلع جہلم

عزیز قارئین! بزرگ ہمارا وہ مقدس اور قیمتی سرمایہ ہیں۔ جن کی قدر و قیمت ہمیں اسی وقت ہو گی جب ہم موسم بہار سے گزر چکے ہوں گے۔ ہمارے یہ بزرگ چلتے پھرتے مدرسے ہی نہیں بلکہ کتب خانوں کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے سینوں میں ایسی ہی ہزار ہا تاریخی داستانیں پوشیدہ ہیں جو کاغذ کے ٹکڑوں پر اپنے نقوش نہ چھوڑ سکیں ... اس وقت میں ایسی ہی بے شمار کہانیوں اور کہاوتوں بھری ٹوکری سے ایک خوبصورت سا پھول چن کر پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے یہ تاریخی کہانی قارئین کے دل و دماغ کو ایک عرصہ تک متاثر کیے رکھے گی ... اب میں اپنے انہی بزرگ کی زبانی پیش کر رہا ہوں:

"بیٹے فیصل! بہت پہلے کی بات ہے کہ اسی دریا کے کنارے ایک قبیلہ آ کر آباد ہوا۔ یہ قبیلہ سپیروں پر مشتمل تھا۔ اسی دریائے جہلم کی بہتی موجوں ... لہلہاتے درختوں کے پتوں اور جھومتی مست بادِ صبا نے اس قبیلے کے پاؤں میں محبت کی زنجیریں ڈال دیں اور وہ خانہ بدوش یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے ایک طویل عرصہ ان موجوں کی رفاقت میں گزارا۔

کہتے ہیں کہ رونق نہ تو بہاروں سے ہوتی ہے، نہ ستاروں سے اور نہ ہی دولت سے دنیا حسین ہوتی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ رونق تو چہروں سے ہوتی ہے حسین اور دلکش چہروں سے تو دنیا حسین ہے۔ گھروں کی رونق ... اور محلوں کی چمک ہم سب کے ہی دم سے تو ہے ... بالکل اسی طرح اس دریا کے سرسبز و شاداب، خوبصورت ساحل کو رونق انہی سپیروں کے خاندان نے بخشی۔ ان کے ہوتے ہوئے یہاں کا ماحول عجیب منظر پیش کرتا تھا ...

صبح روشن اور شام حسین بن گئی ۔ سورج ڈھلنے کے بعد دار دور تک بکھری ہوئی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں سے ہوتے ہوئے دھواں اٹھتا اور موجوں کے ترنم میں گم ہو جاتا کبھی کبھی یہ آوارہ دھواں نہ جانے کس کی تلاش میں ساحل کے ساتھ ساتھ دور دور تک بھٹکتا رہتا اور پھر ناامید ہو کر دور خلاؤں میں گم ہو جاتا ۔

اس قبیلے میں روشنی کی کرن "نین رانی" تھی نین رانی نین سپیرن کے نام سے مشہور تھی نین سپیرن قبیلے کی اک نوجوان سپیرن تھی ۔ جس نے دریا کی موجوں کے حسن کو چار چاند لگا دیئے تھے ۔ جہاں پھول وہاں کانٹا جہاں یہ حسن تھا وہاں سانپ نین کے دوست تھے ۔ بڑے بڑے اور موٹے موٹے سانپوں سے اسے خاص پیار تھا ۔ نین جس سانپ کو بہت پیار کرتی اسے گلے میں ڈال لیتی ۔ بالکل اسی طرح جیسے یہ سرخ اور سبز موتیوں کا ہار ہو ۔

نین اپنے بکھرے حسن کی پرواہ کئے بغیر سارا سارا دن پٹاری سر پہ اٹھائے گاؤں گاؤں گھومتی ۔ آس پاس کے تمام گاؤں والے اس قبیلے سے بخوبی واقف تھے ۔

بیٹے فیصل ۔ اس قبیلے میں نین سپیرن کا چرچا تھا تو ہمارے گاؤں میں رابن کا ۔ رابن لمبے قد کا ایک حسین نوجوان گذر رہا تھا ۔ اس کی روشن آنکھوں میں اک تیز چمک تھی ۔ رابن کا دوسرا وار اس کی حسین اور سُریلی بانسری تھی ۔ جنگل سارا سارا دن رابن کی بانسری سے معطر رہتا ۔ رابن نہ جانے کئی برسوں سے بانسری بجا رہا تھا ۔ اب اس بانسری میں وہ بجلی پیدا ہو چکی تھی جو دل پہ تیر بن کر گرتی اور کبھی نہ مٹنے والا نشان چھوڑ جاتی ۔ رابن کی بانسری تمام گاؤں میں مشہور تھی ۔ رابن بانسری ہمیشہ گاؤں سے دور بجاتا پھر بھی کبھی کبھی بانسری کی کوک گھنے درختوں کی باڑ کو چیرتی ہوئی گاؤں کے کچے منڈیروں کو چھو لیتی ۔ تو کئی ہنڈیاں جل جاتی ۔ کئی پلکیں بھیگ جاتیں

یہی سریلی آواز ایک روز نین سپیرن کے کانوں سے جا ٹکرائی ۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نین کے قدم آہستہ آہستہ بانسری کی سریلی کوک کی طرف بڑھنے لگی ۔

آخر وہ اس حسین مجسمے تک پہنچ گئی ۔ جو ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کئے ہونٹوں میں بانسری لیئے کھڑا تھا ۔

بیٹے یار ۔ نین خاموش رابن کے پاس کھڑی تھی اسی انتظار میں کہ رابن آنکھیں کھولے مگر رابن نہ جانے کون سی درد بھری داستان سنانے میں مصروف تھا

پھر نین نے کندھے سے اپنی بین اتاری اور اسے ہونٹوں میں دبا لیا ۔ بین بجنے لگی ۔ نین کی انگلیاں تیزی سے حرکت کرنے لگیں ۔ نین خود مست ہوتی گئی اور اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں ۔ دوسری طرف رابن کی بانسری مدھم پڑتی گئی اور رابن کی پکار بھی بین میں گم ہونے لگی ۔ رابن کو یوں محسوس ہوا جیسے نین رانی بھی وہی کہانی سنا رہی ہے ۔ جو رابن کی بانسری کی جان ہے ۔ نین کی آواز کے ساتھ ساتھ رابن نین کی طرف یوں جھکتا گیا ۔ جیسے مست سانپ ۔ یہی وہ لمحہ تھا ۔ جس نے نین اور رابن کو سونے کے پنجرے میں بند کر دیا ۔

انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ برسوں سے شناسا ہوں ۔ جیسے وہ ایک ہی منزل کے مسافر اور ایک ہی شاخ کے دو پھول ہوں ۔ جنہیں قدرت نے ایک بار پھر نین اور رابن کے روپ میں ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ۔

نین سپیرن ۔ میں تو سمجھا تھا کہ کشش میری بانسری ہی میں ہے اور کسی کے پاس نہیں مگر تم تو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

رابن ۔ میں کچھ نہیں جانتی سوائے اس کے کہ میری بین کا درد تیری بانسری سے ہی میں نے چرایا ہے میری بین میں جو رنگ آج پیدا ہوا ہے ۔ رابن خدا کی قسم اس سے قبل کبھی بھی نہ تھا ۔ کتنی شیریں ہے ۔ تمہاری بانسری میں رابن ۔

نہیں نین نہیں ۔ میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا

تم تو مجھ سے بہت بلند ہو۔ کالے کالے ناگوں میں تنہا رہنے والی لڑکی اور میں بھولے بھالے ریوڑ کا مالک میں مقابلہ کیسے کر سکتا ہوں نین

رابن میں مقابلہ نہیں کرنا چاہتی۔ میں تو تیری محبت چاہتی ہوں۔ تیری رفاقت چاہتی ہوں شیریں کوک چاہتی ہوں۔

میں بھی تو یہی چاہتا ہوں رانی۔

پہاڑی میں سورج ڈھلتا جا رہا ہے۔ میرا ریوڑ جمع ہو چکا ہے۔ اچھا نین خدا حافظ پھر سہی۔

خدا حافظ رابن خدا حافظ

نین سپیرن کی بین کی پکار سارے قبیلے میں مشہور ہو گئی۔ ہر کوئی اس بدلتے رنگ کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بوڑھے اور تجربہ کار سپیروں کے اپنے اپنے تجربے کے ترازو میں نین کو تولا۔

اب رابن کی کوک نین کے لئے تھی اور نین کی پکار رابن کے واسطے

بیٹے فیصل! انہی وادیوں میں بین اور رابن کا سچا پیار پروان چڑھا۔ ان کی محبت آسمان کی طرح پاکیزہ ستاروں کی طرح روشن اور موجوں کی طرح شفاف تھی۔ یہ وادیاں کتنی خوش نصیب ہیں جنہیں رابن اور نین کا پیار نصیب ہوا۔ مقدس ہے یہ سرزمین جس پر نین رابن کا پیار امر بن گیا۔

رابن کی بانسری کی کوک سن کر نین سب کچھ بھول جاتی اور اس کے قدم بے اختیار رابن کی طرف بڑھنے لگتے۔ کبھی رات کے پہلے پہر اور کبھی دوسرے پہر۔ چاندنی راتوں کو چاند اپنی چاندنی نچھاور کر کے نین اور رابن کی پاکیزہ محبت کو خوش آمدید کہتا۔

نین یہ کیا ہے۔

رابن یہ میٹھی روٹیاں ہیں میں نے خود اپنے ہاتھوں سے تمہارے لئے پکائی ہیں

مگر نین مجھے تو بھوک نہیں۔

رابن تجھے کیا خبر تو تین دن سے اس درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔ تیری بھوک تو تیری بانسری مٹا دیتی ہے۔

نہیں نہیں میری بانسری نہیں میں تو تمہاری بین کے صدقے زندہ ہوں۔ تمہارے صدقے نین! تمہارے صدقے۔

اچھا تو بیٹا فیصل۔ یوں رابن نہ دنیا کا رہا نہ دنیا اس کی۔ رابن کا ریوڑ بکھر گیا۔ اسے نہ تن کی ہوش تھی نہ من کی۔ اب تو رابن کی بانسری کی مسلسل ایک ہی کوک تھی۔ جس کا مطلب وہ خود جانتا تھا یا پھر نین سمجھتی تھی

نین اب کب آؤ گی۔

شام کو رابن۔ شام کو ہاں ہاں شام کو

مگر شام کب آئے گی نین

جب میں آؤں گی رابن

نہیں نین شام تو اب ہے

میری آنکھوں کو دیکھو میرے دل میں دیکھو تمہارے جاتے ہی اس میں گھٹا ٹوپ اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ میری روشنی تو تم ہو نین میرا سویرا تو تم سے ہے۔

بیٹا فیصل کیا سناؤں اب تو نین اور رابن پھر کی طرح ایک دوسرے سے پیوست ہو چکے تھے اب وہ دو نہیں بلکہ ایک تھے۔ جنہیں صرف اور صرف کاٹ کر ہی ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا تھا۔

نین سپیرن تم کہاں ہو۔ میرے سامنے آؤ۔ اے پاگل لڑکی مجھے معلوم ہے کہ تم جنگل میں رابن گڈریے سے ملنے جاتی ہو۔ اور اس کا ہر طرح کا خیال بھی رکھتی ہو۔ اے بیوقوف کیا تم اندھی ہو گئی ہو۔ تم نہیں جانتی کہ ہم لوگ سپیرے ہیں اور وہ گڈریا۔ گستاخ لڑکی میں پوچھتا ہوں اپنے قبیلے کی عزت خاک میں ملاتے ہوئے تجھے ذرا بھی میرا خیال نہ آیا۔ یاد رکھو جب تک میں تان بابا قبیلے کا سردار ہوں کوئی کام میری رضامندی کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

اس بار میں تجھے معاف کرتا ہوں۔ اگر آئندہ مجھے علم ہوا کہ تم رابن سے ملنے گئی ہو تو یاد رکھو تم میں سے ایک ہی زندہ رہے گا۔ تم یا رابن۔ ایک شخص کی جان اس قبیلے کی عزت و ناموس سے زیادہ قیمتی نہیں ہو سکتی

تان بابا میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ مجھے راہن سے پیار ہے۔ مجھے راہن سے محبت ہے۔ میں کسی قیمت پر راہن کو نہیں چھوڑ سکتی۔

بکواس بند کرو۔ گستاخ لڑکی۔ تیری یہ مجال۔ آج تک پیروں کے خاندان کی کسی لڑکی نے قبیلے سے باہر کے آدمی پہ نظر نہیں رکھی اور تو بھی انہی میں سے ہے تو آئندہ راہن سے نہیں مل سکتی۔ یہ تان بابا کا حکم ہے اور پورے قبیلے کی رضامندی بھی۔ میں اپنی ذمہ داری سے غافل نہیں۔ تان بابا اپنی ذمہ داری ضرور پورے گا۔

میں تمہیں اور راہن کو اس جرم کی سزا ضرور دوں گا۔ یہ میرا فرض ہے اور آخری فیصلہ بھی آج رات سے تمہاری جھونپڑی کی پوری طرح نگرانی کی جائے گی۔ اس کام کے لئے میں نے قبیلے کے چند نوجوان مقرر کئے ہیں۔ جاؤ اور جاکر سانپوں کا خیال رکھو تم ان سے لاپرواہ ہوتی جارہی ہو۔

نین تم نے دیر کیوں کی۔ کیا تم نے میری بانسری کی کوک نہیں سنی۔ میں نے تجھے کئی بار پکارا۔

میں سب کچھ جانتی ہوں راہن تیری بانسری کی کوک مجھ تک نہ پہنچے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

تو تو پھر نین تم .....

راہن تان بابا نے میری جھونپڑی پہ پہرہ لگا دیا ہے تاکہ میں تم سے مل نہ سکوں۔ تان بابا ہمیں جدا کرنا چاہتا ہے۔ راہن وہ مجھے تم سے چھین لینا چاہتا ہے وہ چاہتا ہے کہ میں تمہاری بانسری کی کوک نہ سنوں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں تمہیں بین نہ سنا سکوں۔

نہیں تان بابا ایسا نہیں کر سکتا۔ راہن سے اس کی روح چھین لینا تان بابا کے بس کی بات نہیں۔

جو بھی ہو راہن میں تم سے بچھڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں جیوں گی تو تمہارے ساتھ اور مروں گی بھی تو تمہارے ہی ساتھ،

ہاں ہاں نین پیرن تان بابا ہمیں کبھی جدا نہیں کر سکتا۔ میرے قریب آؤ نین۔ مجھے سہارا دو

میں خود تان بابا کے پاس جاؤں گا۔ اسے اپنی سچی محبت کا یقین دلاؤں گا۔ چلو اٹھو نین چلو۔

نہیں راہن تم نہیں جانتے وہ کتنا ظالم ہے اور پھر تم تو چل بھی نہیں سکتے اور تمہیں کچھ نظر بھی نہیں آتا۔ راہن تم نے تو رو رو کر اپنی آنکھوں کا نور بھی بہا دیا ہے

نین روز قیامت یہی نور ہماری سچی محبت کا ثبوت ہوگا۔ اگر میری آنکھوں میں نور نہیں تو کیا ہوا۔ میرے بدن میں چلنے کی قوت نہیں تو پھر کیا۔ میں تیری جھونپڑی کی راہ آج بھی نہیں بھولا۔ بین کی شیریں آواز ہر وقت میری رہنمائی کرتی ہے۔

راہن ہم ایک دوسرے کو اب کبھی نہیں بھول سکتے یہ ہمارے بس میں نہیں ہم ایک دوسرے کے ہیں تم میرے اور میں تمہاری ہوں راہن میں تمہاری ہمیشہ رہوں گی۔

نامرادو! نین رات پھر کیسے جھونپڑی سے نکل گئی تان بابا ہم تو جھونپڑی پہ ساری رات پہرہ دیتے رہے پھر نہ جانے وہ کیسے نکل گئی

پاگل تم سب اندھے ہو ایک چھوکری نے تمام قبیلے کو پاگل بنا رکھا ہے۔ آج رات میں خود اس کی جھونپڑی کی حفاظت کروں گی۔ پھر میں دیکھوں گا وہ کس طرح راہن سے ملتی ہے۔ اگر میں نے اسے موقعہ پہ پکڑ لیا تو یہ نین کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ ہاں تان بابا نین نے ہم سب قبیلے والوں کی عزت خاک میں ملا دی ہے۔ اب تو ہر گاؤں میں نین اور راہن کے چرچے ہیں اب تو ہم لوگ آس پاس کے گاؤں میں جانے سے بھی کتراتے ہیں۔ جو شخص بھی ملتا ہے۔ نین کا ذکر چھیڑ دیتا ہے۔

تان بابا ہم قبیلے والے تو اب حد سے زیادہ ہی بے عزت ہو گئے ہیں۔

خاموش رہو۔ نین تم قبیلے والوں کو تو دھوکا دے سکتی ہے مگر تان بابا اس کے اندازے سے بھی زیادہ مکار ہے۔ میں خود اس کی جھونپڑی پر پہرہ

جواب عرض ۲۵۴

دوں گا یہ تان بابا کا تم سے وعدہ ہے کہ میں اسے رنگے ہاتھوں پکڑوں گا۔

بیٹے فیصل۔ راہن کو ایک دن جنگل میں اس قبیلے کے دو افراد نے جا لیا اور ایک بولا۔

اٹھو یہاں سے نکل جاؤ راہن تم نے ہمارے قبیلے کو بدنام کر رکھا ہے۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

چھوڑو یار یہ تو اب مرنے کے قریب ہے اس میں اٹھنے کی قوت ہی کہاں ہے۔

نہیں تم نہیں جانتے یہ اندھا عاشق بڑا خطرناک ہے کہو تو اپنے اس نئے ناگ کی پٹاری کھول دوں چند منٹ میں ہی اس سے جان چھوٹ جائے گی۔

نہیں بیوقوف اگر ہم نے اسے کچھ کہہ دیا تو گاؤں کے لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ راہن جو بھی سہی مگر گاؤں کے لوگ آج بھی اسے دل جان سے چاہتے ہیں۔ بلکہ اب تو وہ اس کی بانسری کی کوک اور بھی شدت سے سنتے ہیں۔

تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو تم آ گئے ہو مگر نین کو کیوں نہیں لائے۔ کہاں ہے نین پیپرن نین نین تم کہاں ہو۔ میرے پاس آؤ آؤ نین جلدی کرو نین۔۔۔

چھوڑو یار آؤ چلیں اس اندھے کا دماغ بھی جواب دے چکا ہے۔

ٹھہرو ٹھہرو تم جا رہے ہو۔ نین سے کہہ دینا کہ تیرا راہن تمہیں بلا رہا ہے۔ اسے میرا پیغام ضرور پہنچا دینا

سن رہے ہو بیٹا۔ جی

جی بابا جی آگے سنائیں۔

اچھا تو بیٹا میں کہہ رہا تھا کہ راہن پکارتا رہا مگر کسی نے اس کی بات نہ سنی دونوں سپیروں نے اپنی راہ لی اور راہن تنہا اپنے آپ سے باتیں کرتا رہ گیا۔

تان بابا رات پھر نین راہن سے ملنے گئی تھی مجھے معلوم ہے۔

بابا تو پھر تم نے اسے کیوں نہ روکا۔

نوجوان سپیرو! نین کے پاس نہ جانے کون سا جادو ہے کہ وہ سب کے سامنے جھونپڑی سے نکل جاتی ہے۔ مگر پھر بھی کوئی اسے روک نہیں سکتا۔

کیا تان بابا تم نے رات اسے جھونپڑی سے نکلتے دیکھا تھا۔

ہاں میں نے اسے رات کے دوسرے پہر جھونپڑی سے نکلتے دیکھا تو میں نے اسے روکنا چاہا۔ جونہی میں اس کی طرف بڑھا حیرت کی بات ہے کہ نوکو کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں واپس اپنی جگہ پر پہنچا تو پھر مجھے نین جاتی ہوئی نظر آئی۔ جونہی میں اس کی طرف پاؤں بڑھاتا تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا۔ آخر میں مجبور ہو کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور نین نے جنگل کا رخ کیا اور میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ قبیلے کا سردار یوں اک معمولی سی سپیرن سے شکست کھا جائے گا

اب کیا ہوگا تان بابا۔ آپ تو سردار ہیں۔ اگر اس نے آپ کو بھی شکست دے دی تو پھر ہم لوگ اس کا مقابلہ کیسے کریں گے۔

فکر کی ضرورت نہیں تان بابا آج ہی اپنی اس شکست کا انتقام لے گا۔ پھر کیا تھا پیارے بیٹے فیصل تان بابا نے اپنی سرداری بچانے کے لئے انتقام کی ایک نئی راہ نکالی۔

تان بابا نے رات اس پٹاری میں جس میں وہ راہن کے لئے کھانا لے کر جاتی تھی ایک نہایت ہی زہریلا اور مست سانپ رکھ دیا اب وہ راہن کے انجام کا منتظر تھا۔

نین نین نین تم آ گئیں

ہاں راہن میں آ گئی ہوں۔

نین تم کہاں ہو میرے پاس آؤ قریب آؤ نین کہاں ہو۔

نین اب تو رات کا دوسرا پہر بھی بیت چلا ہے نین میرے انتظار کی گھڑیاں کیوں بڑھاتی ہو تم کہاں تھیں

بس راہن بس ہماری محبت کے ویری بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ اب تو تان بابا خود میری نگرانی کرتا ہے

جراب عرف لاہور

تم ہیں پھر بھی اس کے سامنے تمہیں ملنے چلی آئی ہوں۔

ہاں نین وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ ہماری سچی محبت کے سامنے دشمن کے وار کچے دھاگے سے زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔ پھر تان بابا تو تجھے بھی بہت محبت کرتا ہے نین وہ تو تجھے اپنی بیٹیوں سے زیادہ چاہتا ہے

نہیں راین وہ ہماری محبت کا دشمن ہے اسے اپنی عزت سے پیار ہے سرداری سے محبت ہے وہ اصولوں کا پجاری اور رسموں کا قیدی ہے۔ تان بابا کبھی کسی پر رحم نہیں کرتا وہ ہم سے ضرور انتقام لے گا۔ یہ اس کی فطرت ہے۔ ڈسنے کی فطرت اس میں سانپوں سے بھی زیادہ ہے کیونکہ وہ سپیروں کا سردار ہے۔

یہ یہ کیا ہے نین؟

یہ پٹاری ہے۔ راین وہ خوش قسمت پٹاری جو ہر روز میرے پیار سے راین کو دیکھتی ہے۔ یہ ہماری محبت کی ساتھی اور خلوص کی گواہ ہے

پھر کیا تھا بیٹا فیصل۔ جونہی راین نے پٹاری کا ڈھکن کھولا۔ تان بابا کے زہریلے سانپ نے راین کو ڈس لیا۔ کیا یہ ... یہ خون بہہ رہا ہے نین

راین سانپ .... مجھے تو سانپ نے کاٹ لیا ہے

راین لاؤ ہاتھ میں سانپ کا زہر چوس لوں۔

بزرگ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہانی جاری رکھی بیٹے نین نے راین کا ہاتھ اپنے ہونٹوں میں دبا لیا اور زہر چوسنے لگی۔

مگر یہ سانپ تان بابا کا تھا۔ جس پر نین کا جادو اثر نہ کر سکا۔ زہر راین کے ساتھ ساتھ نین کے جسم میں بھی پھیل گیا۔

راین اور نین رانی نے ایک دوسرے کی باہوں میں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ راین اور نین کی موت نے سچی محبت کے ایسے انمٹ نقوش چھوڑے جو قیامت تک زندہ رہیں گے۔

کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ بیٹے راین اور نین کی محبت کی عظمت یہاں سے شروع ہوتی ہے

مئی ۸۳ء

کہاوت ہے کہ جس وقت سانپ نے راین کو ڈسا اس وقت نین رانی کے قبیلے میں قید تمام سانپ باغی ہو گئے۔ سانپوں نے قبیلے کے بے شمار لوگوں کو غیر متوقع طور پر کاٹ کھایا۔ سانپوں کا نشانہ بننے والا سب سے پہلا شخص اس قبیلے کا سردار اور محبت کا ویری تان بابا تھا۔

اس دن سے نین رانی کے قبیلے کے سب سانپ باغی ہو گئے۔ بے شمار سانپ مار دیئے گئے اس دور کے بعد نین سپیرن کا قبیلہ فاقوں مرنے لگا۔ کیونکہ ان لوگوں کا روزگار صرف انہی سانپوں کے سہارے تھا۔ نین راین کا قاتل قبیلہ نیست و نابود ہو گیا۔ ان کی بستی اجڑ گئی۔

پیارے بیٹے فیصل حوصلہ کرو۔ بزرگ نے میرے بہتے ہوئے آنسو دیکھ کر کہا اور بولے بیٹا کہتے ہیں

آج بھی اس جگہ جہاں راین کو سانپ نے کاٹا تھا ہر سال اس مقام پر چاندنی راتوں میں گرد و نواح کے تمام سانپ جمع ہوتے ہیں اور اپنے سر زمین پر یوں رگڑتے ہیں جیسے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے ہوں۔ جو ان کی نسل سے سرزد ہوا تھا۔ بیٹا نین راین کی یہ کہانی ہمیشہ زندہ رہے گی۔ جیسے دریا کی بہتی موجیں۔

اقوالِ زرّیں

- جو باتیں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دی ہیں، ان سے اجتناب برتو۔
- رضائے الٰہی پر راضی اور شاکر رہو، ایسا کرو گے تو دنیا کے انتہائی بے نیاز لوگوں میں شمار کیے جاؤ گے ...
- اپنے پڑوسی سے اچھا برتاؤ کرو، مومن کامل وہی ہے جو ایسا کرتا ہے۔

(مرسلہ: بشریٰ وقار، لاہور)

اسے بھی پڑھئے

تحریر: مسز اے محمود ملتان

مکرمی شہزادہ عالمگیر صاحب!

تسلیمات . . . میں چند سال سے جواب عرض کا بغور مطالعہ کر رہی ہوں۔ جو کہ مجھے بے حد پسند ہے، مگر اپنے محبوب رسالے میں لکھنے کا یہ پہلا موقعہ ہے۔ مجھے قلمکار ہونے کا دعویٰ تو نہیں ہے، لیکن خدا کے فضل سے میں تھوڑا بہت لکھنا جانتی ہوں۔ اسی لیے تو میں اپنے کالج کے زمانے کالج میگزین کی چیف ایڈیٹر رہی ہوں۔ اس کے علاوہ کئی ایک مقابلوں میں مختلف انعام بھی حاصل کر چکی ہوں۔ بہر حال میری یہ کہانی اپنے دامن میں ہمارے لیے بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے۔

شہزادہ صاحب! زیر نظر کہانی ایک ایسی لڑکی نے مجھے سنائی تھی جو کہ میری منہ بولی بہن بنی ہوئی ہے۔ کہانی تو بہت طویل تھی لیکن میں نے اسے مختصر کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اس کہانی کی سچائی کا ثبوت لبنیٰ، اس کی چھوٹی بہن عظمیٰ اور ان کی امی آج بھی موجود ہیں اور معاشرے کا ستنا رہ رہی ہیں۔ وہ ہم سے کچھ بھی نہیں چاہتیں، وہ صرف یہ چاہتی ہیں کہ کوئی ماں باپ بن کر ان کو اپنی محبت بھری آغوش میں لے لے . . . یا کوئی بھائی بن کر انہیں اپنے سینے سے لگا لے۔ ہم میں کوئی ایسا ہے جو آگے بڑھ کر اس عظیم ذمہ داری کو اٹھالے . . .

شہزادہ جی! میں آپ سے پُر زور گذارش کرتی ہوں کہ میری اس جواب عرض کے لیے پہلی کاوش کو "لائن" میں نہ لگائیے گا بلکہ اس کہانی کو بطور سپیشل کیس جلد از جلد جواب عرض کی زینت بنا لیجیئے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کہانی کی اشاعت میں تاخیر کی وجہ سے لبنیٰ ایک بار پھر تباہی کے راستوں پر چل نکلے . . . امید ہے آپ انسانی ہمدردی کا ثبوت دیتے ہوئے میری درخواست کو ٹھکرائیں گے نہیں . . . کیونکہ اتنا مجھے یقین ہے کہ کہانی کی اشاعت کے بعد لبنیٰ اور اس کے گھر والوں کو کسی ہمدرد ذات کے پاس ضرور پناہ مل جائے گی۔ کیونکہ جواب عرض کے حلقے میں اکثریت ایسے بہن بھائیوں کی ہے جو آج کے پُر آشوب دور میں بھی انسانیت کا پرچم بلند کیے ہوئے ہیں . . . یہ بات میں اپنے بالکل ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہی ہوں . . .

آخر میں قارئین سے گزارش ہے کہ وہ جواب طلب امور کے لیے جوابی لفافہ ضرور ارسال کریں، ورنہ ممکن ہے کہ میں جواب نہ دے سکوں۔ ساتھ ہی جواب عرض کے لیے ڈھیروں دعائیں حاضر ہیں . . .

والسلام . . . آپ کی پُر خلوص . . .

مسز اے محمود معرفت ایم اے اظہر، سدھفاتی ہیڈ ورکس

بیراستہ عبدالحکیم۔ تحصیل کبیر والا۔ ضلع ملتان

لبنیٰ اور میرا تعارف ٹرین میں ہوا تھا۔ ہم نے لاہور سے پسرور تک کا سفر ایک ساتھ کیا تھا، جب ہم گاڑی سے اترے تو میں نے اسے اپنے گھر چلنے کی دعوت دے ڈالی، دراصل لبنیٰ اتنی پیاری اور سحر انگیز شخصیت کی مالک تھی کہ میں اس کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ اور پھر وہ باتیں بھی اتنی اچھی کرتی تھی کہ سننے والا اسی کا ہو کر رہ جاتا تھا۔ جب میں نے اسے اپنے گھر آنے کے لیے کہا تو اس نے معذرت کر دی . . . لیکن چند دن بعد ہمارے گھر آنے کا وعدہ کر لیا . . . ریلوے اسٹیشن سے میں تانگے میں بیٹھ کر اپنے گھر چلی گئی، جبکہ لبنیٰ بھی اپنے گھر چلی گئی . . .

چند دن بعد ہی لبنیٰ حسب وعدہ مجھے ملنے کے لیے آ گئی۔ یہ ہماری دوسری ملاقات تھی، لیکن ہمارے درمیان بے تکلفی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر اس نے مجھے اپنی باجی بنانے کی خواہش ظاہر کی، جسے میں نے بڑی خوشی کے ساتھ قبول کر لیا۔ اب ہم دونوں بہنیں بن چکی تھیں۔ وہ رات رہ کر دوسرے دن اپنے گھر چلی گئی۔ اس کے بعد بھی وہ اکثر ہمارے گھر آتی رہی، لیکن میں حیران تھی کہ اس نے کبھی بھی مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت نہیں دی۔

میں نے ایک دو بار لبنیٰ سے اس کے گھر چلنے کے لئے کہا تو وہ ادھر کی باتوں میں ٹال گئی آخر ایک دن میں نے لبنیٰ سے کہا

تم مجھے کیا سمجھتی ہو.....

آپ میری باجی ہیں.

تو پھر میں تمہارے گھر جانا چاہتی ہوں ... میں تمہاری امی اور بہن سے ملنا چاہتی ہوں لیکن تم ٹال جاتی ہو.

آخر کیوں..... تم مجھے اپنے گھر لے جانے سے کتراتی کیوں ہو. میں نے لبنیٰ سے پوچھا

لبنیٰ خاموش رہی.. اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا..

لبنیٰ تم خاموش کیوں ہو.... تم بولتی کیوں نہیں ہو میں نے لبنیٰ سے سوال کیا

اب کے بار اس نے جواب دینے کی بجائے رونا شروع کر دیا..... میں حیران تھی کہ اسے کیا ہو گیا ہے.... میں نے اسے تسلی دی تو وہ کہنے لگی.

آپ نے مجھ سے پوچھا ہے کہ میں آپ کو اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتی ہوں.... میں آپ کو اس کی وجہ بتاتی ہوں لیکن آپ یہ وعدہ کریں میرا جواب سن کر آپ مجھ سے روٹھ تو نہیں جائیں گی.

ہاں لبنیٰ..... تم سچ بتاؤ میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں ناراض نہیں ہوں گی

باجی.... میرا گھر جی ٹی روڈ پر واقع خانہ بدوشوں کی جھونپڑیوں جیسا ہے.

بھلا اس میں ناراض ہونے والی کونسی بات ہے.... ہم بہنیں ہیں اور تمہارا گھر جہاں بھی ہے اور جیسا بھی ہے. مجھے پیارا ہے کیونکہ تم میری پیاری سی بہن ہو.

لیکن باجی اصل وجہ کچھ اور ہے آپ کو اپنے گھر نہ لے جانے کی.....

وہ بھی بتا دو

دراصل باجی.... وہاں جرائم پیشہ لوگ بستے ہیں

تو پھر تم وہاں کیوں رہتی ہو

اس لئے کہ میرا تعلق بھی جرائم پیشہ افراد کے گروہ سے ہے.

کیا کہا تم نے..

میں ایک جرائم پیشہ لڑکی ہوں

تم کیا کرتی ہو.

میں ایک ماہر جیب تراش ہوں

نہیں... نہیں.... تم ایسا گھٹیا کام نہیں کر سکتی ہو میری بہن جیب تراش نہیں ہو سکتی.

لبنیٰ..... کہیں تم میری آزمائش تو نہیں کر رہی ہو.

نہیں باجی..... میں سچ کہہ رہی ہوں....

اگر تم نے سچ کہا ہے تو آج کے بعد میں تم سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھوں گی.

مگر تم نے تو وعدہ کیا تھا، مجھ سے روٹھیں گی نہیں..

ہاں.... میں نے وعدہ کیا تھا لیکن مجھے تم سے ایسے گھٹیا کام کی توقع نہیں تھی.... تم جانتی ہو کہ ہمارا خاندان معزز اور شریف خاندان ہے... اور جرائم پیشہ دنیا سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے. اس لئے میں تم سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھنے پر مجبور ہوں..... اگر تم غریب ہوتیں تو یہ کوئی جرم نہیں تھا. لیکن تم جیب تراش ہو... اس لئے آج سے ہمارے راستے جدا ہو گئے ہیں.

نہیں باجی..... ایسا نہ کیجئے... ساری دنیا میں آپ ہی تو میری اپنی تھیں..... ورنہ میں تو تنہا ہوں..... میں بچپن سے ٹھوکریں کھا رہی ہوں..... میں وہ سیاہ بخت ہوں جسے باپ نے ٹھکرا دیا تھا..... آپ ہیں تو میں سمجھی تھی کہ آپ کی ذات میرے لئے محبت اور خلوص کا سرچشمہ ثابت ہو گی..... کیونکہ میں محبت کی پیاسی ہوں لیکن آج آپ بھی نفرت سے منہ موڑ کر جا رہی ہیں.... ٹھیک ہے باجی آپ کی خوشی اسی میں ہے تو پھر میں آپ کو آج کے بعد اپنی منحوس صورت تک نہیں دکھاؤں گی..... اچھا باجی.... آپ خوش رہیں. یہ میری دلی دعا ہے.... میں آپ کی دنیا سے دور جا رہی ہوں....

وہ اٹھ کر چلی گئی تو مجھے اپنے رویے پر افسوس ہوا. مجھے یوں بے دردی سے اسے ٹھکرانا نہیں چاہئے تھا.. میں غیر ارادی طور پر لبنیٰ کے تعاقب میں چل پڑی.... ابھی وہ ہمارے گھر سے تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ میں نے اسے پکڑ لیا.

وہ رو رہی تھی ..... مجھے اس پر بے تحاشا پیار آگیا اور میں نے اسے دیکھو اپنے گلے لگا لیا اور اسے منا کر اپنے ساتھ واپس لے آئی ..... گھر میں آکر میں نے اسے پوچھا

بینیٰ ..... ! ناراض ہو مجھ سے .....''

ہاں باجی ..... مجھے آپ سے ایسے رویے کی توقع نہیں تھی ..... کم از کم آپ یہ تو پوچھ لیتیں کہ میں کن حالات کے تحت جیب تراش بنی ..... لیکن دوسروں کی طرح آپ نے بھی بغیر مجھ سے کچھ پوچھے ٹھکرا دیا۔ کیا بہنیں ایسی ہی ہوتی ہیں .....

بینیٰ ..... تم ٹھیک کہتی ہو ..... مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ مجھے معاف کر دو۔ معاف کر دو نا اپنی باجی کو ..... دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔

نہیں باجی ..... ایسا کر کے مجھے گنہگار نہ کیجیئے۔ اب مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہے۔

لبنیٰ ..... ! بتاؤ اپنے بارے میں ..... وہ کونسے حالات تھے جن کی وجہ سے تمہارے جیسی خوبصورت لڑکی نے جرائم کی دنیا میں پناہ لی !''

باجی .....! میں نے آج تک کوئی خوشی نہیں دیکھی میں نے ہوش سنبھالنے سے آج تک ٹھوکریں کھائی ہیں اور نہ جانے ابھی کتنا عرصہ اور ٹھوکریں کھاتی رہوں گی مجھے سب نے دکھ دیئے ہیں ..... کس طرح آپ کو اپنے دل کے زخم دکھاؤں۔ نہ جانے ہمیں کن گناہوں کی سزا مل رہی ہے .....'' یہ کہتے ہوئے لبنیٰ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگ گئے۔ میں نے بینیٰ کو تسلی دی اور کہا

بینیٰ ..... ہمت اور حوصلے سے کام لو ..... وقت بدل جائے گا ..... تم مجھے اپنی کہانی سناؤ مجھ سے جہاں تک ہو سکا میں تمہارے دکھ بٹانے کی کوشش کروں گی رونے سے حالات بدل تو نہیں جائیں گے۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بینیٰ نے اپنی کہانی کا آغاز کیا

"میں نے ہوش سنبھالا تو امی ابو کو ہر وقت ایک دوسرے سے جھگڑتے دیکھا ..... میرا باپ امی کو ہر وقت پیٹتا رہتا تھا۔ اس میں زمانے بھر کی برائیاں موجود تھیں ..... وہ جوا کھیلتا تھا ..... شراب اور چرس اور افیون کا غیر قانونی دھندا کرتا تھا۔ ایک بار تو اس نے امی کو بھی داؤ پر لگا دیا اور پھر ہار گیا ..... جیتنے والا امی کو لینے کے لئے ہمارے گھر آگیا ..... امی نے اس جواری کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا ..... جبکہ میرے باپ نے کہا

اب تم چلی جاؤ کل پھر میں تمہیں جیت لوں گا اور تمہیں واپس اپنے گھر لے آؤں گا۔ اس پر امی نے اسے لعن طعن کی تو وہ ڈھیٹ بنا کھڑا رہا۔ آخرکار دوسرے لوگوں کی مداخلت سے امی بچ گئیں ورنہ وہ ذلیل تو امی کو اپنے ساتھ لے جا کر ہی دم لیتا ..... میرا باپ اخراجات کے لئے کچھ بھی نہیں دیتا تھا ..... بلکہ امی سلائی کڑھائی کا کام کر کے گھر کا خرچہ پورا کرتی تھیں جب میرے باپ کے پاس پیسے ختم ہو جاتے تو پھر اس کے ہاتھ گھر کی جو چیز بھی لگتی وہ اٹھا کر لے جاتا۔ اس طرح سب دو روز کا چکر چلتا ..... ایک بار کافی دنوں بعد میرا والد آیا تو اس نے امی سے پیسے مانگے ..... امی نے انکار کر دیا ..... انکار سن کر ابا کو غصہ آگیا اور اس نے امی کو بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیا ..... میں ابو کی منتیں کرنے لگی کہ وہ میری امی کو نہ مارے اس پر اس ظالم باپ نے امی کو چھوڑ کر مجھے مارنا شروع کر دیا میں زور زور سے رونے لگی تو اس نے مجھے اٹھا کر فرش پر دے مارا ..... جس پر میرے سر سے خون بہنے لگ گیا اور پھر میں بیہوش ہو گئی ..... جب کافی دیر بعد میں ہوش میں آئی تو امی مجھ پر جھکی ہوئی تھیں اور ظالم باپ کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا ..... پھر کچھ دن بعد میری چھوٹی بہن عظمیٰ نے اس دنیا میں قدم رکھا ..... اس پر ابو نے امی کو بہت پیٹا۔ اس کا کہنا تھا کہ امی نے لڑکے کی بجائے لڑکی کو کیوں جنم دیا ہے ..... جیسے سب کچھ امی کے اپنے اختیار میں تھا۔ اس پر اس نے بس نہیں کی بلکہ امی کو طلاق دے کر اسی وقت گھر سے نکال دیا .. امی سے چلا بھی نہیں جاتا تھا ..... لیکن انہوں نے

ہمیں اپنے ساتھ لیا اور بیگم صاحبہ کے گھر چلی گئیں ....
بیگم صاحبہ بہت ہی ہمدرد اور معزز خاتون تھیں .. ان
کے گھر میں روپے پیسے کی کمی نہیں تھی اور وہ ہمارے
جیسے نادار لوگوں کی دل کھول کر مدد کرتی تھیں .....
بیگم صاحبہ نے ہمیں رہنے کے لئے ایک کوارٹر دے
دیا ..... اس طرح ہمارا وقت گزرنے لگا .... امی
سارا دن کام میں لگی رہتیں ۔ میں بھی سکول سے
واپس آ کر عظمیٰ کو اٹھا لیتی ..... یا پھر امی کا ہاتھ
بٹا دیتی .....

میں اس وقت مڈل کا امتحان دے چکی تھی ...
ایک دن بیگم صاحبہ نے امی سے کہا ۔

ایک بات کہوں .... مانو گی ..

بیگم صاحبہ .... آپ کیسی باتیں کرتی ہیں .... آپ
حکم دیں آپ کی خاطر تو میری زندگی بھی حاضر ہے امی
نے کہا ۔ کہیے .... !

جی .....

تمہیں دوسری شادی کر لینی چاہیئے ۔

بیگم صاحبہ .... اب مجھے اپنی شادی کی نہیں بلکہ
لبنیٰ کی شادی کی فکر ہے جو اب ماشاء اللہ چند سال
تک جوان ہو جائے گی ۔

تمہارا کہنا بجا ہے لیکن تم ساری عمر تنہا رہ کے
کیسے کاٹو گی ۔ عورت کا ہمارے معاشرے میں جو مقام
ہے وہ تم جانتی ہو کیا جب تم باہر نکلتی ہو تو لوگ تمہیں
چھیڑتے نہیں ہیں .... وہ تمہیں گناہ کی دعوت نہیں دیتے
... وہ ایسا کیوں کرتے ہیں

اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ تم بے سہارا اور غریب ہو
اور ایسی عورت جلد چکنی چپڑی باتوں میں آجاتی ہے
اور پھر لبنیٰ اور عظمیٰ کو باپ کی ضرورت ہے .... بے سہارا
رہو گی تو لوگ تمہارا جینا عذاب بنا دیں گے ..... کل
تمہاری بیٹیاں جوان ہوں گی .... تمہیں ان کی شادی کرنی
ہو گی اور شادی کے لئے جہیز ضروری ہے اور جہیز تم کہاں
سے دو گی .... تمہاری آمدنی سے تمہارے اخراجات بڑی
مشکل سے پورے ہوتے ہیں ۔ اگر تم اپنی بیٹیوں کو جہیز
نہیں دو گی تو پھر بغیر جہیز انہیں دلہن بنا کر کوئی نہیں لے
جائے گا ۔ اور یہ اپنے گھر میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جائیں
گی اور جوانی کی ضرورتیں ہیں اگر وہ جائز ذرائع سے پوری
نہ ہوں تو پھر ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ناجائز ذرائع
اختیار کر لئے جاتے ہیں

لیکن میں کس سے شادی کروں گی اور لبنیٰ اور عظمیٰ
کہاں جائیں گی ۔

تم ہاں تو کرو ۔

بی بی جی میں آپ کا حکم نہیں ٹال سکتی ۔

ٹھیک ہے ... میں تمہارے لئے کوئی مناسب مرد کو
تلاش کروں گی اور جب تمہاری شادی ہو جائے گی تو لبنیٰ
اور عظمیٰ میرے پاس رہیں گی ... بعد میں تم انہیں اپنے
ساتھ لے جانا ۔

اور پھر ایک دن خاموشی سے امی کی شادی ہو گئی ...
وہ ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں ...... عظمیٰ تو اس وقت چند
سال کی تھی لیکن امی کی شادی کو میں نے اچھی نظر سے نہیں
دیکھا تھا .... چند دن امی ہمیں ملنے کے لئے آئیں تو
ہم ان کے سینے سے لگ کر بہت روئیں ۔ امی نے مجھے
تسلی دیتے ہوئے کہا ۔

بیٹی .... تم نہ روؤ .... میں نے شادی اپنے لئے
نہیں کی .... بلکہ تمہارے لئے کی ہے ۔ تمہیں باپ کی
ضرورت تھی .... اس لئے میں نے تمہاری خوشیوں کے
لئے کریم سے شادی کی ہے ..... اور میں بہت جلد تمہیں
اپنے ساتھ لے جاؤں گی ۔

پھر ایک دن امی ہمیں اپنے ساتھ لے گئیں ... لیکن افسوس
کہ امی دھوکہ کھا گئیں ..... انہوں نے جس مقصد کی خاطر شادی
کی تھی وہ پورا نہیں ہوا ..... کریم کے گھر کا ماحول ہمارے گھر
سے بھی خراب تھا ۔ بلکہ اس گھر میں تو کریم نے جوا خانہ کھول رکھا
تھا ۔ جہاں وہ سارا دن اور ساری رات اپنے دوستوں کے
ساتھ جوا کھیلتا رہتا تھا .... ہمیں اس گھر میں نفرت ملی ...
ہمارا سوتیلا باپ کریم بھی ہمارے لئے جلاد ثابت ہوا ۔ ہماری
زندگی اس گھر میں بھی عذاب ہو گئی تھی ... میرا تعلیمی سلسلہ
رک گیا تھا ..... ہم دن رات کریم اور اس کے دوستوں

کے لئے چائے بنانے میں مصروف رہتی تھیں .... اور پھر
چائے لے کر جانا اور پیالیوں میں ڈال کر پیش کرنا بھی ہمارے
ذمے تھا .... بیگم صاحبہ کو جب امی نے سارے حالات
بتائے تو وہ بڑی شرمندہ ہوئیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔
وقت کی ڈور ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی .... امی میری
وجہ سے بڑی پریشان تھیں کیونکہ میں جوانی کی دہلیز پہ قدم
رکھ چکی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ کریم کا رویہ ہمارے ساتھ بہتر
ہوتا گیا .... عظمیٰ کو سکول میں داخل کرا دیا گیا....
اب کریم صاحب ہر وقت خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا
میرے ساتھ تو اسے کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہو گیا تھا..... وہ
ہمارے لئے نت نئی چیزیں لے آتا تھا۔ میں حیران
تھی کہ یہ پتھر سے پیار کے چشمے کیوں پھوٹ رہے ہیں۔
کریم کے رویے میں تبدیلی سے میں بہت خوش تھی۔ اس
نے مجھے میٹرک میں داخل کرا دیا تھا لیکن اس ظالم کے
دل میں جو چور تھا میں اس سے بے خبر تھی .... لیکن امی سب
کچھ جانتی تھیں انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں کریم سے
ہوشیار رہوں اور اس کی چکنی چپڑی باتوں میں نہ آؤں۔
ایک رات کو ہم سوئے ہوئے تھے۔ میں لیٹرین جانے
کے لئے اٹھی تو امی اور کریم کے کمرے سے ان کی باتیں
کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ امی جان کریم سے کہہ
رہی تھیں۔

لبنیٰ اب جوان ہے اور یہ مناسب نہیں کہ وہ تمہارے
دوستوں کے سامنے جایا کرے۔" اس پر وہ بے غیرت
کہنے لگا

اب تم بوڑھی ہو گئی ہو.... اس لئے مجھے تمہاری
ضرورت نہیں ہے ..... اب مجھے لبنیٰ کی ضرورت ہے
میں نے اس کے جوان ہونے کا بڑا انتظار کیا ہے اور اب
میرا انتظار ختم ہونے کو ہے ..... میں اس کی جوانی سے فائدہ
اٹھاؤں گا..... میں اس کی جوانی بیچوں گا اور بہت ساری
دولت کماؤں گا۔

شرم نہیں آتی تمہیں ایسی باتیں کرتے ہو.... وہ
تمہاری بیٹی ہے۔

وہ میری بیٹی کیوں بن گئی ہے .... نہیں وہ میری
بیٹی نہیں ہے .... جانے کس کی بیٹی ہے ..... میرے
لئے تو وہ ایک خوبصورت اور جوان لڑکی ہے .... پہلے تم
کماتی تھیں اب لبنیٰ کی باری ہے .... اتنے میں عظمیٰ بھی
جوان ہو جائے گی۔ اس وقت میرے وارے نیارے
ہو جائیں گے۔ لبنیٰ اور عظمیٰ دونوں کمائیں گی اور میں دونوں
ہاتھوں سے دولت اکٹھی کروں گا۔

نہیں .... نہیں .... ایسا نہیں ہوگا .... میں ایسا
نہیں ہونے دوں گا .... میں لبنیٰ کو تمہارے مکروہ عزائم
کا نشانہ نہیں بننے دوں گا .... مجھے تھوڑا لوٹا ہے تم نے
میرے جسم کی کمائی سے ابھی دل نہیں بھرا .... کریم ! سنو
میں تو برباد ہو گئی ہوں۔ لیکن میں اپنی بیٹی کو برباد نہیں
ہونے دوں گی

سو کنیز .... اب تم بوڑھی ہو چکی ہے .... تمہاری
بہاریں ختم ہو گئی ہیں ..... اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں
ہے۔ تم میرا احسان سمجھو کہ میں نے تمہیں سر چھپانے کو جگہ
دے رکھی ہے ..... لبنیٰ کو میری بات ماننی پڑے گی۔
نہیں تو میں اسے یہاں رکھنے کی بجائے کنجری بنا دوں گا۔

کریم ... ! میں مر جاؤں گی لیکن اپنی بیٹی کو برباد نہیں
ہونے دوں گی .... تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو۔

امی اور کریم کی باتیں سن کر میرے دماغ پر ہتھوڑے
برس رہے تھے ..... میں یہ ماننے پر تیار نہیں تھی کہ
امی کریم کی کٹھ پتلی بن کر لوگوں کے لئے کھلونا بنی رہی ہیں
میری نظر میں امی کا کردار آئینے کی طرح صاف اور شفاف
تھا .... میری امی تو بہت عظیم تھی ..... لیکن آج امی
کی باتیں سن کر مجھے اتنی اذیت پہنچی کہ میں بیان نہیں کر
سکی ....

کیا میری ماں بھی پیشہ ور عورت ہو سکتی ہے" میں
خود ہی سے سوال کرتی

نہیں .... نہیں .... ایسا نہیں ہو سکتا۔" میں خود
جواب دیتی .... لیکن پھر سوچتی کہ امی بھی ہماری طرح مجبور
سے ہی ظلم کی چکی میں پس رہی ہیں .... وہ چند سال کی
تھیں کہ ماں باپ مر گئے بھائیوں نے جیسے تیسے کر کے پالا...
اور جب وہ جوان ہوئیں تو ایک شرابی اور جواری کے پلے

باندھ دی گئی ..... جہاں امی نے ایک سانس بھی سکھ کا نہیں لیا .. وہاں سے جان چھوٹی تو کریم جیسے بدکردار اور ذلیل انسان نے غیرت کے پلے باندھ دی گئیں جہاں انہیں عزت بھی قربان کرنی پڑی ...... یہ سب حالات کی ستم ظریفی تھی جو امی یہاں تک گر گئی تھیں کہ عزت جیسی انمول چیز کو بھی داؤ پہ لگا دیا ..... اس میں امی کا کوئی قصور نہیں ہے .... اب اگر ہم نہ ہوتیں تو وہ کبھی کی مر گئی ہوتیں وہ صرف ہمارے لئے زندہ ہیں .... اس لئے وہ بہت ہی عظیم ہیں .... میں بے خودی میں باتیں کر رہی تھی۔

مگر اب میرا کیا بنے گا ... کیا میں بھی امی کی طرح بک جاؤں گی۔

نہیں ... میں ایسا کسی قیمت پر نہیں ہونے دوں گی . میں سب کچھ کر گزروں گی مگر اپنی عزت اور عفت کو نیلام نہیں ہونے دوں گی" میں خود سے سوال کرتی اور خود ہی جواب دیتی .... اس کے بعد مجھے نیند نہیں آئی ..... صبح امی بے حد پریشان نظر آ رہی تھیں

امی آج آپ پریشان معلوم ہوتی ہیں" میں نے امی سے پوچھا

بیٹی .... ! ہمیں کس دن سکھ ملے ہیں جو آج میں خلافِ معمول تمہیں پریشان نظر آ رہی ہوں۔ امی نے جواب دیا

ہاں امی ..... ہم تو بچپن سے ہی دکھ جھیل رہے ہیں اور مرتے دم تک دکھ ہمارا مقدر ہیں .... سکھ کا تو ایک سانس بھی ہمارے مقدر میں نہیں ہے

بیٹی .... ہمت اور حوصلے سے کام لو ... دن ضرور بدلیں گے۔

مگر کب امی ... ! اب تو تھک گئی ہوں۔

میری طرف دیکھو بیٹی۔ میں بھی تمہاری طرح بچپن سے ہی مصیبتیں جھیل رہی ہوں ... اور آج میرے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں لیکن میں پھر بھی خدا کی ذات سے مایوس نہیں ہوئی .... اور تم ابھی سے مایوس ہو گئی ہو ." تھوڑی دیر خاموشی ... کے بعد امی نے کہا

بیٹی .... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہمیں یہ گھر چھوڑ دینا چاہیئے۔

مگر امی کیوں ... میں نے پوچھا۔

بیٹی یہاں تمہاری عزت خطرے میں ہے۔ کریم تمہیں بکاؤ مال بنانا چاہتا ہے۔ اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔

ہم کہاں جائیں گے .... !

بیگم صاحبہ کے پاس جائیں گے . ... امید ہے پہلے کی طرح وہ اب بھی ہمیں اپنے گھر میں پناہ دیں گی اور پھر یہ سب کچھ انہی کی وجہ سے تو ہوا ہے .

میں نے امی کو نہیں بتایا کہ رات کے وقت کریم اور ان کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں وہ میں نے سن لی تھیں . اور آج بھی امی کو نہیں بتایا کہ میں ان کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں . اسی دن امی بیگم صاحبہ کے پاس گئیں اور انہیں بتایا کہ اب نوبت کہاں تک پہنچ گئی ہے

انہوں نے کہا

تم فوراً" کریم کا گھر چھوڑ دو۔ اور پھر ہم نے ایک دن موقعہ پا کر کریم کا گھر چھوڑ دیا ..... دوسرے دن کریم بھی بیگم صاحبہ کے گھر آ گیا اور انہیں کہا کہ وہ ہمیں اس کے حوالے کر دیں لیکن بیگم صاحبہ نے اسے بے عزت کر کے نکال دیا وہ خطرناک نتائج کی دھمکی دے کر چلا گیا .

امی غم سہتے سہتے بیمار رہنے لگی تھیں۔ اس لئے وہ کوئی کام نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لئے سارا بوجھ میرے ناتواں کندھوں پر آن پڑا تھا . .. میں اس وقت کچی ہی تھی لیکن میں نے امی اور بہن کا سہارا بننے کا عزم کر لیا اور خدا کا شکر ہے کہ میں نے ایسا کر کے دکھا دیا .... میں نے دن رات کام کر کے امی کا علاج بھی کروایا اور عظمیٰ کی تعلیم بھی جاری رکھی۔ پھر بیگم صاحبہ مستقل طور پر اپنے بیٹوں کے پاس جرمن چلی گئیں تو وہ کوٹھی بھی گورنمنٹ کے ایک ادارے کو کرایے پر دے گئیں۔ اس طرح ہم سے سر چھپانے کی جگہ بھی چھن گئی ..... چند دن کی کوششیں بہر لائیں شہر سے باہر مضافاتی علاقے میں ایک چھوٹا سا کچا مکان کرایہ پر مل گیا تو ہم وہاں شفٹ ہو گئیں۔ لیکن یہاں مشکل یہ آن پڑی کہ اس علاقے میں ہمیں کام بہت کم ملتا

جواب عرض لاہور

تھا کیونکہ یہ علاقہ غریبوں کا تھا۔۔۔۔ اس لئے مجھے کام حاصل کرنے کے لئے شہر جانا پڑتا تھا۔

ایک دن میں شہر میں کام کے لئے گئی تو واپسی پر راستے میں مجھے کریم کے غنڈوں نے اغوا کر لیا۔ انہوں نے مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا۔۔۔ پھر کریم شراب کے نشے میں دہت منہ سے مغلظات بکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں لینے کی کوشش کی لیکن میں نے پوری قوت سے دھکا دیا تو وہ گر گیا۔۔ کمرے میں پانی گرم کرنے والا بجلی کا راڈ پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر کریم کے سر پر مارنا شروع کر دیا۔ پہلے تو اس نے مزاحمت کی لیکن پھر بے ہوش ہو گیا۔۔۔۔ میں نے سڑک کی طرف کھلنے والی کھڑکی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔۔ میں گھر پہنچی تو امی اور عظمٰی میری وجہ سے بہت پریشان تھیں۔

امی نے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو میں نے اپنے ساتھ بیتی ہوئی کہانی سنا دی۔۔۔۔ امی اب مزید پریشان ہو گئیں۔۔۔۔۔ اسی وقت پولیس آ گئی اور مجھے گرفتار کر لیا گیا۔۔۔۔ میں نے انسپکٹر کو ساری کہانی سنا دی۔ لیکن اس کا منہ تو نوٹوں سے بھر دیا گیا تھا۔

ہاں اس نے میری رہائی کے بدلے ایک ایسی چیز کا مطالبہ کیا جسے پیش کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔۔۔۔ کریم مجھے ملا تو اس نے کہا۔

بیٹی۔۔۔۔! اگر تم میری مرضی کے مطابق چلو تو میں تمہارے خلاف کیس واپس لے لوں گا۔ اور تمہیں اس سلوک کی سزا بھی نہیں دوں گا۔ جو تم نے میرے ساتھ کیا تھا۔ لیکن میں نے کہا۔

میں مر سکتی ہوں۔۔۔۔ عدالت کی طرف سے ملنے والی سزا بھگت لوں گی لیکن میں اپنی عزت کا سودہ نہیں کروں گی۔

میرا کیس عدالت میں چلا گیا۔۔۔۔ تاریخیں پڑتی رہیں میں عدالت میں پیشی ہوتی رہی۔۔۔۔ جیل میں میری ملاقات کئی ایسی عورتوں سے ہوئی جو جرائم پیشہ تھیں۔۔۔۔ اس طرح میرا تعلق بھی ان سے گہرا ہو گیا تھا۔ اس روز میری آخری پیشی تھی۔۔۔۔ میں نے رو رو کر جج صاحب سے رحم کی اپیل کی اور انہیں اپنے ساتھ ہونے والے مظالم پوری تفصیل سے بتائے۔۔۔۔ اور پھر جج نے اپنے آخری فیصلہ سنا دیا۔۔۔۔ اور میں رہا ہو گئی تھی۔۔۔۔ ظالم ہار گئے تھے مظلوم جیت گئے تھے۔۔۔۔۔ وہاں سے ہم گھر آ گئے۔۔۔۔

اب پھر وہی شب و روز تھے۔۔۔۔ پھر محلے والوں نے ہمیں وہاں سے نکال دیا کیونکہ ان کی نظر میں، میں بدکردار اور چور تھی۔۔۔۔ وہاں سے نکل کر ہم جی ٹی روڈ پہ واقع ایک خالی جگہ پر گھاس پھوس سے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنا لی جو اب مکان کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ یہاں ہماری آمدنی بالکل ہی ختم ہو گئی۔۔۔۔ شہر بہت دور تھا۔ اس لئے سلائی کڑھائی کے لئے کپڑے لینے جانا بہت مشکل تھا اور پھر ویسے بھی مجھے کپڑے وغیرہ ملتے ہی نہیں تھے۔ کیونکہ سب لوگ مجھے مجرم سمجھتے تھے۔ حالانکہ عدالت نے مجھے بے گناہ گردانتے ہوئے بری کر دیا تھا۔۔۔۔ پھر نوبت فاقوں تک آ گئی۔۔۔۔

عظمٰی نے سکول چھوڑ دیا تھا۔۔۔۔ علاج نہ ہونے سے امی کی صحت دن بدن گر رہی تھی۔۔۔۔۔ ایک دن امی کی حالت بہت خراب تھی۔۔۔۔ لیکن گھر میں ایک پیسہ نہیں تھا۔۔۔ امی کی حالت کے پیش نظر عظمٰی رو رہی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں اور امی کے علاج کے لئے پیسے کہاں سے حاصل کروں۔۔۔۔ آخر سوچ سوچ کر میں ایک فیصلے پر پہنچ گئی۔۔۔۔۔ میں وہاں سے شہر کے لئے چل پڑی چلتے چلتے میں کافی دیر بعد ریلوے سٹیشن پر پہنچی۔۔۔۔ اور پھر میں نے ایک آدمی کی جیب کاٹ لی۔۔۔۔ کیونکہ میں جیب تراشی جیل سے سیکھ آئی تھی۔۔۔۔ اب میرے پاس تین ہزار کے نئے نئے نوٹ تھے۔۔۔۔ میں اسی وقت ٹیکسی میں بیٹھ کر گھر پہنچی۔۔۔۔ امی اس وقت بے ہوش تھیں۔ میں نے انہیں ٹیکسی میں ڈالا اور عظمٰی کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچی۔۔۔۔ ڈاکٹر نے جو کچھ بتایا وہ ہمارے ہوش اڑانے کے لئے کافی تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ امی کو ٹی بی ہو گئی ہے۔۔۔۔۔ شاید ان غموں اور دکھوں کا اثر تھا کہ آج امی ٹی بی کے آخری سٹیج پر پہنچ چکی تھیں۔۔۔۔ ڈاکٹر نے مستقل علاج کا مشورہ دیا اور اس نے امی کے لئے جو ادویات اور خوراک تجویز کی تھی۔۔۔۔ اس کے لئے بہت بڑی رقم کی ضرورت تھی۔

لیکن اب سوال یہ تھا کہ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی ....
پھر یوں ہوا کہ میں نے جیب تراشی کو بطور پیشہ اپنا لیا...
اب امی کا علاج بھی ہو رہا ہے اور عظمیٰ نے پھر سے تعلیم جاری کر دی ہے۔ میں نے اسے ہاسٹل میں داخل کروا دیا ہے۔
تاکہ وہ پوری توجہ اور یکسوئی سے تعلیم حاصل کر سکے۔

لبنیٰ نے اپنی کہانی ختم کی تو میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ میں نے اسے تسلی دی تو اس نے مجھے پوچھا۔

باجی .... اب بتائیے کہ اس میں میرا قصور کتنا ہے۔

ہاں لبنیٰ ..... تم واقعی مظلوم ہو .... اور مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے .... لیکن تم نے جس راستے کو اپنایا ہے وہ تمہیں سیدھا تاریکی میں لے جا رہا ہے

باجی .... ! میں جانتی ہوں کہ جیب تراشی جرم ہے اور جیب تراش معاشرے کے دشمن ہیں .... لیکن سوال یہ ہے کہ اگر میں یہ کام نہ کروں تو پھر کیا کروں ... اور پھر معاشرے نے ہمیں کتنے سکھ دیئے ہیں۔ جو میں معاشرے کی پرواہ کروں ..... معاشرہ ہمارا دشمن ہے اور ہم معاشرے کے دشمن ہیں۔

لبنیٰ .... تم یہ کام چھوڑ کر پہلے کی طرح سلائی کا کام شروع کر دو۔

جہاں سے مجھے سلائی کا کام ملتا تھا وہ سب لوگ مجھے چور اور بدکردار سمجھتے ہیں ..... پھر اس کام سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی جو ہمارے اخراجات کے لئے کافی ہو .... امی کے علاج اور خوراک کے لئے بہت سارے پیسوں کی ضرورت ہے .... عظمیٰ کی تعلیم پر بھی بہت خرچ ہو رہا ہے اور پھر اب اس نے کالج میں داخلہ لینا ہے۔ اس سے اخراجات میں مزید اضافہ ہو جائے گا،،

اگر کبھی تم پکڑی گئی تو ....

یہ بہت معمولی بات ہے ..... نوٹ سب کا منہ بند کر دیتے ہیں۔

لبنیٰ .... اللہ پر بھروسہ رکھو اور جیب تراشی جیسا مکروہ دھندا چھوڑ کر پہلے کی طرح سلائی کا کام شروع کر دو ..... میں تمہیں لوگوں سے اتنا کام لے کر دیا کروں

دوں گی کہ تم دن رات کام کرو گی تو بھی کام ختم نہ ہو گا۔ اگر اللہ نے چاہا تو تمہاری امی بھی ٹھیک ہو جائیں گی اور عظمیٰ کی تعلیم بھی جاری رہے گی۔

باجی .... ! بغیر علاج کے امی کیسے تندرست ہوں گی بغیر پیسے کے عظمیٰ کیسے پڑھے گی۔ میں مانتی ہوں کہ آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن باجی .... ! ایسی باتیں صرف کتابوں میں ملتی ہیں۔ عملی دنیا میں ان باتوں کا کوئی عمل دخل نہیں ہے .... آج کل جو سب سے بے ایمان اور چور اچکا ہے سب اس کی عزت کرتے ہیں .... اور شریف بیچارے کونے کھدروں میں منہ چھپاتے پھر رہے ہیں .... باجی میں جوان ہوں .... میں جدھر جاتی ہوں لوگ بھوکے کتے کی طرح مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہیں ....
بے شمار ہاتھ مجھے سہارا دینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں لیکن میں کسی کو منہ نہیں لگاتی ... مجھے اپنے لئے کچھ نہیں چاہیئے ... لیکن میں اپنی امی اور عظمیٰ کی خاطر اپنی عزت کی قربانی کے سوا سب کچھ کر گزروں گی ...
میں جانتی ہوں کہ موت کا ایک دن مقرر ہے لیکن میں اپنی ماں کو بغیر علاج کے مرنے نہیں دوں گی ... عظمیٰ کی تعلیم اس لئے نہیں رکے گی کیوں کہ وہ بے سہارا ہے۔
باجی ... ! مجھے تو زندگی میں کوئی سکھ نہیں ملا لیکن میں عظمیٰ کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گی۔
میری بہن اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گی .... پھر میں اس کی شادی کروں گی۔

دیکھو بہن .... ! تم خدا پر بھروسہ کر کے دیکھو۔ تم نے کبھی اس پاک ذات کو خلوص سے پکارا ہی نہیں۔ اگر تم اسے خلوص دل سے پکارتیں تو وہ ضرور تمہاری مدد کرتا ..
خدا اپنے بندوں کو کبھی نہیں بھولتا۔

باجی .... ! بات صاف ہے .... اگر آپ امی کے علاج اور عظمیٰ کی تعلیم کا ذمہ اٹھا لیں تو میں جیب تراشی چھوڑ دوں گی ....،،

لبنیٰ بہن ..... اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ساری دنیا کے دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لیتی لیکن افسوس کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ مجھ

سے جو کچھ بھی ہو سکا وہ تمہارے لئے کردوں گی .... اور پھر تم تو ویسے بھی میری بہن ہو۔

پھر میری ماں بغیر علاج کے مرجائے گی۔ میری بہن تعلیم حاصل کر سکے گی۔ اس کی شادی کے لئے جہیز نہیں بن سکے گا تو اس کی شادی نہیں ہو سکے گی .... اور ...

اور پھر میری بہن بھی میری طرح جرائم کی دنیا میں قدم رکھ لے گی .... اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔

اگر تمہاری امی کا علاج بھی ہوتا رہے اور عظمیٰ کی تعلیم بھی جاری رہے تو کیا تم یہ کام چھوڑ دو گی۔

ہاں لیکن ایسا کیسے ہوگا۔

سنو .... ایسا ضرور ہوگا .... ابھی دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔

باجی ایسا کیونکر ہوگا۔

لبنیٰ ... تم ماہنامہ جواب عرض لاہور سے متعارف ہو نا .. میں تمہاری کہانی اس رسالے میں شائع کراؤں گی تو پھر دیکھنا کتنے شفقت بھرے ہاتھ تمہیں سہارا دینے کے لئے آگے بڑھیں گے پھر کوئی نہیں باپ کا پیار دے گا کوئی بھائی بن کر تمہارا دامن خوشیوں سے بھر دے گا۔ تمہارے مقدر کی تاریکیاں ختم ہو جائیں گی۔ اور ہر طرف بہار ہی بہار ہوگی۔

باجی .... واقعی ایسا ہوگا۔

ہاں بہن .... ایسا ضرور ہوگا۔

لیکن کب ....

بہت جلد ....

لیکن تمہیں ایک وعدہ کرنا ہوگا

فرمایئے ....

تم اس وقت تک جیب تراشی نہیں کرو گی

تو پھر ہمارے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے

میرے پاس کچھ رقم جمع ہے وہ تم اپنے پاس رکھ لو وہ چند ماہ کے لئے تمہارے لئے کافی ہے۔ اس کے بعد کا بھی اللہ مالک ہے

ٹھیک ہے باجی ...

پھر میری شادی ہوگئی .... میں اپنی خوشیوں میں ایسی کھوئی کہ مجھے کچھ یاد نہ رہا .... میں سب کچھ ہی بھول گئی .... میں لبنیٰ سے کیا ہوا وعدہ بھی بھول بیٹھی۔

میں جب بھی امی کے پاس جاتی تو امی مجھے بتاتیں کہ لبنیٰ اکثر تمہارے بارے میں پوچھنے کے لئے آتی رہتی ہے۔

اب میں رمضان المبارک کے ماہ میں گھر گئی تو لبنیٰ سے بھی ملاقات ہوگئی .... یقین جانئے میں اسے دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہوگئی .... پہلے وہ مجھ سے میری نئی زندگی کے بارے میں پوچھتی رہی .... اور پھر کہنے لگی۔

باجی .... آپ نے اپنا وعدہ خوب نبھایا ہے۔

میں اسے کیا جواب دیتی .... میں اسے اتنا ہی کہہ سکی۔

لبنیٰ .... ! میں تم سے شرمندہ ہوں۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔

تو پھر .....

میں تم سے معافی مانگتی ہوں .... ساتھ ہی میں وعدہ بھی کرتی ہوں کہ میں گھر پہنچ کر فوراً ہی تمہاری کہانی لکھوں گی ...

پھر میری کہانی کب شائع ہوگی۔

بس چند ماہ اور انتظار کر لو .... تمہارے دکھ اب ختم ہونے ہی والے ہیں۔

باجی اب کی بار بھول لیں گی تو نہیں۔

لبنیٰ میں نے اب وعدہ جو کر لیا ہے کہ میں گھر جاتے ہی پہلا کام یہی کروں گی۔

میں نے اسے اخراجات کے لئے کچھ پیسے دیئے اور پھر وہ مجھے دعائیں دیتی ہوئی چلی گئی ... عید سے ایک روز پہلے میں امی کے پاس سے واپس اپنے گھر آگئی ... اور آج میں لبنیٰ کی کہانی لکھ کر اس سے کیا ہوا وعدہ پورا کر رہی ہوں .... مجھ پر جو فرض عائد ہوتا تھا۔ وہ میں نے پورا کر دیا ہے .... اب یہ قارئین کا فرض ہے۔ کہ وہ آگے بڑھ کر اپنا فرض پورا کریں۔

لطیفہ

* ایک شخص دوسرے شخص سے یار پرندوں کی نظر کمزور نہیں ہوتی
* دوسرا! تمہیں کیسے معلوم ہے
* پہلا شخص۔ میں نے آج تک کسی پرندے کو عینک لگائے نہیں دیکھا

انتقام

تحریر۔ رخسانہ ابنِ ترک لاہور / انتخاب۔ سلیم احمد

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

تسلیمات ... جوابِ عرض کی اٹوٹ پرستار ہوں، ہر ماہ اس کو باقاعدگی سے پڑھنا میرے بہت ہی ضروری کاموں میں شامل ہے، جس ماہ اسے پڑھنے میں کچھ دن بھی لیٹ ہو جاتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے میں اپنا کوئی ناگزیر کام کرنا بھول گئی ہوں ... جوابِ عرض سے میری یہ لگن اور چاہت اس کی حقیقت پسندانہ پالیسی کی وجہ سے ہے۔ دوسرا یہ ہے بھی چاہے جانے کے قابل ...

شہزادہ جی! پہلے کبھی کبھار اس پرچے میں غزل سے کر شریک ہوتی رہی ہوں مگر اس مرتبہ اپنی ایک پہلی کاوش ... "انتقام" ... کے نام سے لے کر شامل ہو رہی ہوں۔ اس کی سچائی کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی کہ حقیقت اپنا آپ خود ہی منوا لیتی ہے اور یہ کہ یہ ہمارے ہی معاشرے کی آپ بیتی ہے، چونکہ یہ میری پہلی کاوش ہے اس لیے اس میں بے شمار خامیاں ہوں گی، لیکن آپ کی راہنمائی میں مجھے کسی چیز کا فکر نہیں ... ہاں البتہ اگر آپ نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے کی اپنی غیر جانبدارانہ پالیسی کے تحت میری بھی حوصلہ افزائی فرمائی تو میں بھی جوابِ عرض کے لیے نت نئے حقائق تلاش کرنے میں سرگرداں رہوں گی ... اگر یہ آپ کے معیار کو تھوڑا سا بھی متاثر کرے تو اسے کسی قریب ترین اشاعت میں شامل کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں ...

علاوہ ازیں شہزادہ صاحب میں نے جوابِ عرض کی پالیسی کے مطابق اپنی تحریر میں تمام کرداروں اور مقامات کے نام فرضی استعمال کیے ہیں اس لیے ان سے کسی کی بھی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔ جس کے لیے میں یا ادارہ جوابِ عرض کسی طرح کے ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ نیز میرا ذاتی ایڈریس کہانی کے ساتھ شائع نہیں کیجئے گا، بلکہ اپنے پاس محفوظ رکھ لیں، اپنے قاری بہن بھائیوں کی قیمتی آراء کی میں جوابِ عرض کی معرفت منتظر رہوں گی ... اس کے ساتھ ہی میں جوابِ عرض کی مزید ترقی کے لیے دعا گو ہوں ...

والسلام .... آپ کے خلوص کی متمنی!

رخسانہ ابنِ ترک، لاہور

معرفت جوابِ عرض ۷۷، نسبت روڈ - لاہور

(۱۳ فروری ۲۰۰۲ء)

موسم بے حد خوشگوار تھا۔ تمام گروپ کی لڑکیوں نے کالج سے پیدل ہی گھر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ ایسے میں نازی اور بینا نے مجھے مجبور کیا کہ میں بھی اس پروگرام میں ان کا ساتھ دوں ...

تب خوش گپیوں میں مصروف سب لڑکیاں ایک دوسرے پر فقرے چست کرتی جا رہی تھیں، مگر میں اپنی پُرحول اداسیوں میں سمٹی ان سب کے درمیان ہونے کے باوجود تنہائی محسوس کر رہی تھی۔ جس قدر موسم اپنی بہار کی خوبصورتی دکھا رہا تھا، اس سے کہیں زیادہ میرا دل اداسی اور ویرانی کا پتہ دے رہا تھا۔ بعض لوگ اپنی ذات میں اس قدر گم ہوتے ہیں کہ ہر شے پہ حاوی ہو جاتے ہیں، لیکن کوئی بھی شے ان پہ حاوی نہیں ہو پاتی۔ یہی اس وقت میرا حال تھا۔ موسم کی خوبصورتی مجھ پر نہ چھا رہی تھی، بلکہ میری اداسی موسم کی خوبصورتی پر حاوی تھی۔ اس لیے ساری فضا بوجھل اور مغموم سی لگ رہی تھی ... میری ساری ہی دوست میری اس اداسی کو دور کرنے کی ناکام سعی کر رہی تھیں۔ لیکن نہ جانے بعض اوقات انسان اپنی ذات کے ہجوم میں اس قدر کیوں کھو جاتا ہے کہ اسے اپنے گرد و پیش کی بھی خبر تک نہیں رہتی ...

پورے گروپ کی لڑکیاں راستے میں اپنے اپنے گھروں کا رُخ کرتی رہیں۔ ایک جگہ پر آ کر میں نے بھی اپنے گھر کا

ے کہنا چاہا، دفعتاً ایک رکشے میں سے کسی نے آواز
،، ذہن کی بھی سوچوں میں اس قدر تپش ہوتی تھی کہ
شعلوں کی آنچ نے قوت سماعت پر بھی پہرے بٹھا رکھے
ے ... آواز سُنی ان سُنی کر کے آگے بڑھنا چاہا ..
ل یہ کہ رکشہ میں سے آتی ہوئی آواز کسی اور کے
بھی ہو سکتی ہے ... ضروری نہیں کہ راستے پُر رونق
ر میں کسی نے مجھے ہی پکارا ہو ... لیکن تب تک
ہ بالکل نزدیک آ گیا اور اس میں موجود ایک آشنا
صورت نظر آئی ... میرے درطۂ حیرت میں جاتے
پہلے ہی وہ بول پڑی :
،، کہاں ہے رفعانہ جی ... اتنی لاتعلق سو اپنے
ب سے بھی ... میں نے اپنی قوت سے بھی بڑھ کر
راز دی ہے اب بھی تم نے نہیں سُنا ؟،،
،، اوہ کوثر تم ... ؟ اتنے دنوں سے کہاں تھیں ؟
سے بعد دیکھا ہے، یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ،،۔ اسے دیکھ
یقیناً دل کو دھچکا سا لگا ۔ میں نے اپنی اداسی بھول کر
ر سانس لیے اتنے بہت سے سوال داغ دیئے اور
اب میں وہ پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پہ لاتے ہوئے
ہنے لگی ...
،، رفعانہ جانی ... اتنے بہت سے سوالات کا جواب
طویل ہے اور میرے پاس ٹائم بھی نہیں ہے کہ تمہیں
تفصیل سے جواب دے سکوں ... بہر حال تم سناؤ
کیسی ہو ... ؟،،
میں نے جلدی سے کہا ... ،، کیوں ٹائم کیوں نہیں،
و میرا گھر قریب ہی ہے، وہاں بیٹھ کر آرام سے
تفصیل بتانا ،، ... میں نے بات کو ذرا پھیرتے ہوئے
پنا سلسلۂ کلام جاری رکھا ... ،، اور ہاں تمہارے
نفضال کا کیا حال ہے ... خیر تو ہے کیا اسی لیے تم
ں تمہارا یہ حال ہے ؟،،
وہ بہت ہی آبدیدہ سے لہجے میں بولی ،، سب
کچھ ختم ہو گیا رفعانہ، اب تو جینے کی تمنا ہی نہیں ...
ہاں کر دو تم مجھے اپنا ایڈریس دے دو، میں تمہیں خط میں
ام کہانی لکھ بھیجوں گی، اسی میں سے تم اپنے ان سوالوں
کے جواب بھی پا لو گی ..،،
،، نہیں نہیں ..،، ۔ میں نے جواب میں کہا۔ ،، تم مجھے اپنا
ایڈریس بتا دو، میں تمہارے گھر آ کر تمہاری کہانی سنوں
گی ۔ اور اپنے جوابات بھی پا لوں گی ..،، ۔
اپنا پتہ بتانے پر وہ بہت گھبرائی اور آبدیدہ سی
ہو کر کہنے لگی .. ،، میرا کوئی گھر نہیں ہے، میں تو جیل
کی کوٹھڑی سے بھی زیادہ اندھیرے گھر میں رہتی ہوں ۔
جہاں نہ تو میں کسی سے مل سکتی ہوں ... اور نہ ہی
کوئی مجھ سے مل سکتا ہے ،، ..
،، لیکن کیوں ،، ؟ میں نے اس سے وضاحت چاہی ۔
،، اسی کیوں کا جواب دینے کے لیے ہی تو میں تمہارا
ایڈریس مانگ رہی ہوں ... پلیز رفعی .. جلدی سے
بتا دو ناں، مجھے دیر ہو رہی ہے ۔ میں تمہیں سب کچھ
بتا دوں گی ،، ..
اس کی مجبوری اور بدحواسی دیکھ کر میں نے جلدی
سے اپنا ایڈریس اسے لکھ دیا اور وہ شکریہ کہتے ہوئے
اسی رکشے میں واپس ہو لی ... اور میں ایک مرتبہ پھر
سے اپنی سوچوں میں گم ہو کر دیکھتی اور سوچتی رہ گئی کہ یہ
وہی شیریں کوثر ہے، جس کی مسکراہٹ بڑی دلنشیں ہوا
کرتی تھی ۔ اسکول کے زمانے میں جب کوثر میری ہم جماعت
ہوا کرتی تھی، جس کا شمار اسکول کی ذہین ترین طالبات
میں ہوتا تھا ... اس کی آواز میں سوز تھا ... اکثر
ہماری دوست اسے گھیر گھار کر پھولوں کی کیاریوں کے
بیچوں بیچ لے جاتیں اور پھر تفریح کا پورا پیریڈ اس
سے گانے سنتے ہوئے گزر جاتا ... کوثر بہت زیادہ
خوبصورت تو نہیں تھی، لیکن ستھرے نقوش اور سانولی
سی رنگت نے اسے خاصا جاذب نظر بنا دیا تھا ۔ اسکول
کے زمانے میں ہی اس کا معاشقہ افضال نامی لڑکے سے
سُنا گیا ... کوثر نے اپنے عشق کو اپنی دوستوں سے
چھپانے کی بہت کوشش کی، لیکن عشق اور مُشک بھلا
کہاں چھپے رہتے ہیں، کسی نہ کسی طرح سب دوستوں کو علم
ہو گیا اور میں خود اسے چھیڑا کرتی تھی ۔ میں نے کئی بار
اس سے پوچھا کہ تمہاری افضال سے کیسے دوستی ہوئی،

لیکن وہ کچھ نہ بتاتی ، بلکہ افضال کے نام سے وہ جھینپ سی جاتی ... میں اس کی سب دوستوں میں سے اسے زیادہ ہی مذاق کیا کرتی تھی ...

بعض لوگوں کو کتنی ہی بار دیکھا جاتا ہے ، ان سے ملا جاتا ہے ، کچھ بھی نہیں ہوتا ، مگر بعض اوقات معمولی سا حادثہ یا واقعہ تغیر کا سبب بن جاتا ہے ... اس وقت میرے ساتھ بھی یہی ہوا ... وہی آشنا سی رُت چھا گئی ، جو کسی کے بہت عرصہ بعد ملنے سے ہوتی ہے ... تین چار دن تک میں اسی سے متعلق سوچتی رہی - ایک دن کالج سے گھر لوٹی تو امی جان نے ایک بھاری سا ڈاک کا لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا .. خط کے بھاری پن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کوثر کی جانب سے ہے - جب میں نے اسے چاک کیا تو وہ کوثر ہی کا تھا - جس کی تحریر یہ کچھ یوں تھی :

" رخسانہ جانی ! یہ تو تم جانتی ہی ہو گی ... کہ میرے والد صاحب ایک معمولی حیثیت کے آدمی تھے - ابا جان اور امی جان کے درمیان بہت ہی اتفاق اور پیار تھا - والدہ صاحبہ نے خود کو بالکل والد صاحب کی عادات کے مطابق ڈھال لیا تھا - اب کوئی بھی یہ تمیز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کوئی غیر خاندان سے ہیں ... میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں - اور والد صاحب نے امی جان سے اس معاملے میں نہ کوئی طعنہ زنی کی اور نہ ہی ان سے بے رُخی برتی ... گھر کے پُرسکون ماحول نے مجھ میں خاصی خود اعتمادی پیدا کر دی تھی - اور شاید اسی خود اعتمادی کا نتیجہ تھا کہ میں اپنی شادی اپنی پسند سے کرنے کی مجاز تھی ... لیکن میرے خاندان کے بہت سے افراد اس تصور کو ہی گناہ عظیم خیال کرتے تھے -

اور رخسی جان ! تمہیں یاد ہے نا ، تم مجھ سے اکثر پوچھا کرتی تھیں کہ افضال سے میری دوستی کیسے ہوئی ، اور میں ٹال جایا کرتی تھی ... لیکن دیکھو تم سے ہی چھپاتی تھی ... اور اب خود ہی تمہی سے سب کچھ کہہ رہی ہوں ، رخسانہ جان ! یہ ہوتی ہیں قسمت کی باتیں اور تقدیر کے کھیل ...

میٹرک کے دوران ہی مجھے افضال پسند آ گیا .. یہ دُبلا پتلا سا لڑکا روزانہ ہی موٹر سائیکل پر اسکول کے سامنے سے گزرا کرتا تھا - بہت ساری لڑکیاں چھپکے ہی چھپکے اسے دیکھا کرتی تھیں ... وہ لباس کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی نفاست پسند اور خوش ذوق واقع ہوا تھا ... اور اوپر سے وہ کچھ اس قسم کی خوشبو استعمال کرتا تھا کہ اس کے گزرنے کا احساس فضا میں دیر تک تیرتا رہتا ... تفصیلی طور پر اس کی ملاقات کا ذکر محض لذت پرستی سمجھتی ہوں - میں اس سے بس اچانک ایسے ملی جیسے ہزاروں لڑکے لڑکیاں ملتے ہیں - ایک دن راہ چلتے چلتے مجھے ٹھوکر سی لگی اور میری ساری کتابیں زمین پر بکھر گئیں ... اچانک افضال بھی وہیں سے گزر رہا تھا - اس نے موٹر سائیکل سے اتر کر میری کتابیں اکٹھی کیں اور میرے سپرد کرتے ہوئے اس کی انگلیوں کی شرارت نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا - اور پھر میری یہی بوکھلاہٹ کچھ دنوں بعد ہی چاہت میں بدل گئی ...

افضال ایک پنجابی سا لڑکا تھا - ہر وقت اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری رہتی - مجھے اس کی یہ عادت بہت ہی پسند تھی - افضال سے میری چاہت اس حد تک آگے بڑھ گئی کہ ہم نے ملنے کا یا بات کرنے کا موقعہ تلاش کیا ... راہ چلتے تو باتیں اکثر ہو جاتی تھیں .. اس میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو ایک آئیڈیل شوہر میں ہونی چاہیئے ... خوددار بہت تھا - شکی مزاج اس حد تک تھا کہ بیوی کے لیے مصیبت نہ بنتے ... اتنا شکی پن تو عورت میں تحفظ کا احساس پیدا کرتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ مجھے دھوکہ نہیں دینا چاہتا تھا کہ عام لڑکوں کی طرح دام الفت میں پھانس کر اپنا مطلب نکالے ... اسکینڈل الگ چھپے اور رسوا کر کے بھاگ جائے ...

اس نے بتایا کہ وہ اپنی چار بہنوں کا اکلوتا بھائی ہے ، یہاں بینک میں بطور آفیسر ملازمت کر رہا ہے ... گھر کے دیگر افراد دوسرے شہر میں ہیں - کچھ دوستوں نے

مل کر ایک فلیٹ لے رکھا ہے۔ سب ایک ساتھ رہتے ہیں۔ شادی کے لیے اس کی امی اور بہنیں کوئی لڑکی تلاش کر رہی ہیں، مگر میں اب انہیں خط لکھ دوں گا کہ وہ اب اس کی زحمت نہ کریں۔ یہ تمام باتیں اس نے مجھے تیسری ہی ملاقات میں بتا دیں۔۔۔

تب میں نے بھی اسے اپنی حیثیت سے آگاہ کر دیا کہ ہم زیادہ امیر نہیں ہیں۔۔۔ والدین کا جو کچھ بھی ہے وہ میرا ہے لیکن جہیز کے نام پر بنگلہ، گاڑی میرے والدین نہیں دے سکتے۔۔۔ یہ بات ابھی سے تم سوچ لو۔۔۔ وہ میری اس صاف گوئی پر خوش ہو گیا اور کہنے لگا:

"شیریں۔۔۔ اگر تم زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی ایسی ہی سچی اور صاف گو رہیں تو یقیناً ہماری زندگی قابلِ رشک گزرے گی۔۔۔ مجھ سے زندگی کے کسی موڑ پر بھی جھوٹ مت بولنا" یہ میری چڑ ہے اور ایسے لوگوں سے میرا زندگی میں کبھی بھی نباہ نہیں ہو سکتا۔ ابھی مجھے اپنی سب سے چھوٹی بہن کی شادی کرنی ہے۔ صرف ایک سال اور لگے گا۔ اس کے بعد میں تمہارے اور اپنے متعلق والدہ صاحبہ سے بات کروں گا۔۔۔ بہن کی شادی سے پہلے اپنی شادی کی بات کروں گا تو والدین ناراض ہو جائیں گے اور۔۔۔ اور بات بننے سے پہلے بگڑ جائے گی۔۔۔

وقت پر تول کر اڑتا رہا۔۔۔ مہینے بیت گئے، افشاں پر میرا اعتماد دوگنا اور محبت چوگنی ہوتی گئی۔۔۔ اس نے مجھے بدنام کرنے یا مجھ سے کسی قسم کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔۔۔ میں اس سے تنہائی میں بہت کم ملتی تھی۔۔۔ ان لمحات کے فریقین میں سے کسی ایک کا بھی اعتبار کرنا فضول ہے۔۔۔ پیش قدمی کرنا مرد کی فطرت ہے۔۔۔ اور زیر ہو جانا عورت کی کمزوری۔ زیر و زبر کا قصہ ازل سے چلا آ رہا ہے اور ابد تک رہے گا۔۔۔ اور میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی کمزور لمحہ ہم دونوں کو سماج کا مجرم بنا دے۔۔۔

اسی لیے میں افشاں سے اکیلے میں ملتے ہوئے گھبراتی تھی۔ وہ سچے دل سے مجھے بہت چاہتا تھا۔ مجھے اپنی عزت بنا کر اپنے گھر لے جانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران اس کے ایک عزیز دوست نے اسے مجبور کیا کہ وہ دونوں الگ مکان لے کر رہیں۔ کیونکہ موجودہ مکان میں شور و غل کی وجہ سے آرام نہیں ملتا۔ لہٰذا افشاں راضی ہو گیا اور ان دونوں نے الگ مکان لے لیا۔ افشاں مجھے اپنے دوستوں سے کبھی نہیں ملاتا تھا، البتہ اپنی نسبت کا ذکر ضرور کیا کرتا تھا۔ لیکن ان سے میرا نام تک بھی چھپا رکھا تھا۔۔۔ مکان الگ لینے کی خوشی افشاں کو اس لیے بھی تھی کہ اب مجھے راہ چلتے سلام دعا کرنے سے نجات مل جائے گی۔ دو چار باتیں ہم یہاں گھر میں بیٹھ کر آرام سے کر سکتے ہیں۔۔۔ لیکن اس معاملے میں اخلاق کو اعتماد میں لینا بہت ضروری تھا۔ ہم دونوں نے بہت دیر تک اس مسئلے پر غور کیا۔ دراصل راہ چلتے بات کرنا اور کہیں جا کر ملنے میں چوری پکڑے جانے کا احتمال زیادہ بڑھ گیا تھا۔۔۔ ادھر میں نے بھی اپنی محبت کو اپنی دوستوں تک سے چھپا رکھا تھا۔ اگر یہ بات وقت سے پہلے میرے گھر پہنچ جاتی تو اباجان، افشاں کو اپنی عزت کا دشمن جان کر کبھی بھی اس سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔۔۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ افشاں ان کی عزت کو اپنی عزت بنانے کی درخواست کرتے وقت ہی پہلی بار ان سے متعارف ہوتا۔۔۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا یہ خوف بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ آج بھانڈا پھوٹا کہ کل پھوٹا۔۔۔ افشاں نے اپنے دوست اخلاق سے میرا تعارف کرانے کا فیصلہ کیا۔۔۔ پروگرام کے مطابق افشاں مجھے ساتھ لے کر اپنے دوست کے گھر آیا۔۔۔ اخلاق کو وہ پہلے ہی بتا چکا تھا، اس لیے اس نے کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ دوپہر کا کھانا اس نے ہمارے ساتھ ہی کھایا۔۔۔ اخلاق بڑے ہی مہذبانہ انداز سے پیش آیا۔۔۔ شکل سے وہ مجھے اچھا نہیں لگا۔ گہری سانولی رنگت اور پھر اس پر گھنیرے بالوں کی یلغار۔۔۔ قلموں کے بال بے تحاشہ

اپریل ۸۳ء

بڑھ کر ٹھوڑی کو چھو رہے تھے... بھنویں بہت گھنی تھیں۔ پلکیں بھی خاصی بڑی بڑی اور گھنی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں وہ اپنے گول تندرست چہرے اور گٹھے ہوئے بدن کے باوجود جنگلی سا لگتا تھا۔ شاید بالوں کی زیادتی نے اس کی شخصیت میں جنگلی پن کا تاثر ابھار دیا تھا... میں بڑے محتاط انداز سے بات کر رہی تھی۔ جی نہیں، جی ہاں... میں شکریہ... کے چند جملوں سے ہی کام لے رہی تھی۔ جب وہ کمرے سے باہر کام سے گیا... تو افتخار نے مجھ سے پوچھا:

"ہو کیسا ہے شیریں؟"

میں نے تھوڑی سی ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا:

"ایک دم سے پورا جنگلی"...

افتخار نے ہنس کر کہا... "سنا ہے لڑکیاں تو ایسے مردوں پر جان دیتی ہیں"...

میں بولی... "دیتی ہوں گی، مگر مجھ جیسی لڑکیاں تو اسے دیکھ کر ڈر سے وحشت سی محسوس کریں گی۔ یوں لگتا ہے کہ ابھی درختوں کی ڈالیوں میں جھولتا، ندی نالے کودتا پھاندتا ادھر چلا آ رہا ہو"...

افتخار قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ لیکن میں ایک لمحے کو ڈر سی گئی۔ میری پشت والی کھڑکی کے قریب قدموں کی آہٹ ابھری تھی... شاید اخلاق چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنی بات کا رخ بدل دیا۔ ذرا سی غفلت کوئی اشارہ سے منع کر دیا... میرا یہ خدشہ درست ہی ثابت ہوا۔ تھوڑی دیر بعد ہی اخلاق واپس کمرے کے اندر آ گیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اور بہت کم بول رہا تھا... مجھ سے ایک پل کے لیے اس کی نظریں ملیں، اف خدایا کیسی غضب کا غصہ اس کی آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔ مجھ سے پھر وہاں نہ بیٹھا گیا۔ خاصی خفت سی محسوس ہو رہی تھی کہ یہ بے چارا تو بجھا جا رہا تھا اور ہماری بیوقوفی تو دیکھو کہ ہمیں بیٹھ کر اس کے متعلق بکواس شروع کر دی، جبکہ مستقبل میں اسی سے ہمیں خاصی مدد درکار تھی۔ جس کی اب امید نہ رہی تھی...

ایک ہفتہ بعد افتخار نے پھر ضد کی کہ میں اس سے ملنے آؤں۔ جب میں سے آنے میں پس و پیش کی تو وہ فون پر ہی مجھے ڈانٹ پلانے لگا... "کیسی فضول لڑکی ہو تم۔ اخلاق نے تمہیں بہت پسند کیا ہے اور مجھ سے تاکید کہا ہے کہ بہت شریف لڑکی ہے، اسے دھوکہ مت دینا۔ اور ایک تم ہو کہ اس سے ڈر رہی ہو"...

افتخار کے کہنے پر مجھے اعتبار آ گیا اور میرے ذہن پر سے شبہ دھل گیا کہ اخلاق نے میرے منہ سے اپنے بارے میں ریمارکس سن لیے تھے... اور پھر اس کے بعد میں متعدد بار افتخار سے ملنے ان کے گھر گئی... ایسے میں اخلاق کی شرارت میں ایک دو جملے مجھ پر اچھالتا اور پھر باہر چلا جاتا... میں نے اس کے متعلق اپنی رائے بدل لی تھی۔ اس کی صورت کا جنگلی پن اب مجھے وحشت زدہ نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اپنے اطوار سے ایک اچھا اور مہذب انسان ثابت ہو رہا تھا۔ افتخار نے بتایا تھا کہ اس نے میرے بارے میں ایک لفظ بھی اپنے دوستوں سے نہیں کہا تھا۔ یہ اس کی شرافت کی بہت بڑی دلیل تھی۔

یہ بات سن کر میرے دل سے اخلاق کا رہا سہا ڈر بھی جاتا رہا... اب وہ ملتا تو میں بھی جواب میں ایک دو فقرے اس پر اچھال دیتی... دو ماہ اسی طرح گزر گئے۔ ایک روز افتخار نے مجھے ٹائم دیا... مگر عین وقت پر اس کے گھر کوئی دوست آ گیا۔ افتخار اسے لے کر چلا گیا اور اخلاق سے کہہ گیا کہ کوثر آئے تو اسے بٹھا لینا۔ میں دس پندرہ منٹ میں آ جاؤں گا...

میں افتخار کے ہاں پہنچی تو اخلاق میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں ذرا جھجکی تو وہ کہنے لگا:

"افتخار اپنے کسی دوست کے ساتھ ہوٹل تک گیا ہے ابھی لوٹ آئے گا، آپ انتظار کر لیں"...

اگر میں اس سے واپس لوٹ آتی تو اخلاق پر بلاشبہ بے اعتمادی کا الزام لگتا... اور اگر رکتی تو اندر سے میرا دل ڈرتا تھا۔ یوں اندر ہی اندر کشمکش جاری تھی۔ تاہم میں تذبذب کے عالم میں جھجکتی، سمٹی کرسی پر بیٹھ ہی گئی...

یہ پہلا موقع تھا کہ اخلاق سے اکیلے میں بات کرنا پڑ رہی تھی ... کچھ دیر خاموشی رہی پھر اخلاق کہنے لگا:

"آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں"؟

میں نے جس لہجے میں جواب دیا وہ خود میرے لیے اجنبی تھا، گھٹی گھٹی جیسے دم اٹک رہا ہو میں بولی:

"جی ... پوچھیے ..."

وہ کہنے لگا ..." کوثر تم بڑی بھولی لگتی ہو ... افضال نے تمہیں جو کچھ بتا رکھا ہے اس پر من و عن تم نے یقین کر لیا ... کیا تمہیں اس نے نہیں بتایا کہ ابھی پچھلے ہفتے اس کی ماں کا خط آیا ہے، جس میں لکھا ہے کہ اس کی نسبت اس کی خالہ زاد سے طے ہو گئی ہے ..."

میرے ذہن پر یکدم بجلی کا کرنٹ سا چھو گیا "نہیں"۔ غیرارادی طور پر میری زبان سے نکل گیا ...

وہ ایک دم اٹھا ... میز کی دراز الٹ پلٹ کی اور ایک خط اس میں سے نکال کر میرے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہنے لگا ..." کوثر ... میں نے یہ صرف تمہاری بھلائی کے لیے کیا ہے۔ تم افضال پر یہ ہرگز ظاہر مت کرنا کہ میں نے تمہیں یہ خبر دی ہے ... یہ خط رکھ لو اور جب افضال آئے تو بتانا کہ تمہاری غیر موجودگی میں دراز سے ملا ہے ..."

میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے خط لیا اور جوں جوں اسے پڑھتی گئی، رنج و غصے کی ایک لہر سارے بدن میں پھیلتی چلی گئی۔ اخلاق کی اطلاع درست ثابت ہوئی تھی ... تھوڑی ہی دیر بعد افضال آ گیا تو میں خط لے کر اس کے سامنے آ گئی اور اسے خط دکھایا۔ جسے دیکھ کر افضال بوکھلا اٹھا اور کہنے لگا:

"تمہیں یہ خط کس نے دیا ..."؟

میں یکدم بگڑ کر بولی ..." کالے چور تمہیں پہلے یہ بتاؤ کہ مجھ سے کیوں چھپایا ..."؟

افضال کہنے لگا ..." دکھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ... کیونکہ وہ میری امی کا فیصلہ ہے اور تم میری آرزو ہو، امی جو چاہیں کرتی پھریں۔ جب مناسب موقع ہوگا، میں تمہارا نام بتا کر ان سب کو راضی کر لوں گا۔

وہ لوگ میری خواہش ٹھکرانے کی ہمت نہیں کر سکتے، شنا کوثر جان ... اب تم بتاؤ کہ یہ خط تمہیں کس نے دیا ہے"؟

میں نے اخلاق کا نام چھپا لیا اور بہانہ بنا دیا کہ "بس یونہی دراز الٹتے ہوئے یہ خط مل گیا تھا"۔ افضال کو شک سا پڑ گیا تھا جو میں نے رفع کر دیا۔ مگر اب میرے دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا تھا کہ پتہ نہیں ... افضال اپنی ماں کی پسند ٹھکرانے کی ہمت بھی کر پاتا ہے یا نہیں ...

کچھ روز بعد ہی اتفاق سے اکیلے میں پھر اخلاق سے ملاقات ہو گئی۔ تو وہ کہنے لگا ... دیکھو کوثر، میں نے کیسی بروقت تمہیں اطلاع دی تھی ... اب ایک خبر اور سن لو ... کل افضال کی ماں نے کسی آدمی کے ہاتھ انگوٹھی بھیجی تھی جو اس نے رکھ لی ہے اور ماں کو کہلا بھیجا ہے کہ کچھ دنوں بعد وہ آنے والا ہے ... میرا خیال ہے کہ وہ شادی کی تاریخ مقرر کرنے جائے گا ... اب تمہاری عافیت اسی میں ہے کہ تم سنبھل جاؤ ... آگے تمہاری مرضی ... تمہارے لیے یہ خبر یقیناً بہت دکھی ہوگی مگر میں سمجھتا ہوں کہ افضال نے تمہارے بارے میں سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں ... تمہیں شاید یہ بھی علم نہیں کہ وہ بینک میں کلرک کی پوسٹ پر ہے جبکہ تمہیں اس نے خود کو افسر بتا رکھا ہے۔ اس نے اپنے ہر معاملے میں تم سے جھوٹ بولا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی اسی نادانی میں آگے ہی آگے بڑھتی جاؤ، جہاں سے تمہارے لیے لوٹنا ناممکن ہو جائے ..."

اخلاق نے جن حقائق پر سے پردہ اٹھایا تھا ... وہ میرے لیے سوہانِ روح بن گئے۔ اخلاق کے سمجھانے پر میں نے حالات کا خاموشی سے جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے ... افضال واقعی بینک میں کلرک تھا۔ مجھے اس بات کا دکھ نہیں تھا کہ اس کی حیثیت کم نکلی ... غم تھا تو صرف یہ کہ اس نے مجھ سے جھوٹ کہا، جبکہ وہ خود کہتا تھا کہ اسے جھوٹ سے نفرت ہے ...

کچھ دنوں بعد اس نے واقعی چھٹی کی درخواست دے دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ واقعی شادی کے سلسلہ میں اپنے والدین کے پاس جا رہا ہے۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا... اور میں جذبات میں آ کر قرآن اٹھا لائی اور اس کے آگے کرتے ہوئے بولی کہ سچ بتاؤ کس لیے جا رہے ہو"۔

افضال کو میرے رویے پر بڑی حیرت ہوئی اور کہنے لگا: "مجھے لگتا ہے کہ کوئی میرے خلاف تمہارے کان بھر رہا ہے۔ مگر تم مجھ پر اعتماد کرو، میں تم سے جھوٹ کبھی نہ بولوں گا"۔

تب میں فوراً ہی طنزیہ لہجے میں بولی... "تبھی تو تم کہتے تھے کہ میں بینک میں آفیسر ہوں"...

یہ سنتے ہی افضال کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ کہنے لگا... "اب تمہیں معلوم ہو ہی گیا ہے تو سن لو، میں نے یہ بات واقعی جھوٹ کہی تھی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے اپنی موجودہ حیثیت میں شادی کر لیتا.. میں بینکنگ کے امتحان میں بیٹھ رہا ہوں، مجھے اپنی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا اور ایک سال میں مجھے اپنا مقصد مل جاتا... جب تمہیں اپنے گھر بیاہ کر لے جاؤں گا، تب میں آفیسر ہی ہوں گا، آپ سمجھیں محترمہ"...

میں چڑ کر بولی... "اگر تم یہاں سے چلے گئے، تو تمہارے والدین پکڑ کر تمہاری شادی کر دیں گے اور پھر تم خط لکھ دو گے... "میری جان میں مجبور تھا..." بتاؤ پھر میں کیا کروں گی"...؟

افضال ہنس پڑا اور کہنے لگا... "دیکھو کوثر، جب تم مجھے ملی تھیں تو میں تم سے محض دل لگی کر رہا تھا، جیسا کہ سبھی مرد کرتے ہیں اور میں نے اسی زمانے میں تم سے تھوڑے بہت جھوٹ بھی بولے تھے، جن پر میں آج تک شرمندہ ہوں... اور جب تک وہ جھوٹ سچ نہیں ہو جاتے، میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ اب وہ جھوٹ کھل چکے ہیں، مگر تم سے اب میں بہت سنجیدہ ہوں، تم اب میرے دل کی دھڑکن بن چکی ہو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھنا تمہاری عادت نہ تھی، تمہیں ضرور کسی نے بہکایا ہے۔ مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں اپنے اور تمہارے متعلق ہی سوچ رہا ہوں۔ اپنے اور تمہارے علاوہ اب کچھ اور نہیں سوچ سکتا"۔

افضال میرا پیار تھا۔ اس کی غلطیاں میں نے سچے دل سے معاف کر دیں۔ اور سوچا کہ مجھے بہکانے والا اخلاق ہے، اس سے اب بات تک نہ کروں گی۔ پھر سوچا کہ اخلاق نے مجھے بروقت وہ باتیں بتائیں جن کا پتہ چلنا بے حد ضروری تھا... اخلاق کی طرف سے اب افضال کو شک ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے بلانا بھی کم کر دیا اور کہنے لگا: "میں اپنے گھر جا کر اپنے گھر والوں سے بات کر آتا ہوں، تاکہ منگنی وغیرہ ہو جائے۔ تو تمہیں بھی اطمینان ہو جائے اور میں بھی بے فکر ہو کر اپنے بینکنگ کے امتحان کی تیاری کروں..."۔

افضال چلا گیا تو اخلاق نے اس کی غیر موجودگی میں مجھ سے ملنا چاہا... میں نے بہانہ بنا دیا۔ تو کہنے لگا... "اگر تم نہیں چاہتیں کہ افضال کے بارے میں تمہیں کچھ اور بھی پتہ چلے تو نہ سہی..."۔

میرا دل چاہا کہ اس سے مل لوں، مگر میں نے ایسی ایسی کہانیاں پڑھی ہوئی تھیں کہ دوست نے دوست کی محبت کو دھوکے سے بلا کر لوٹ لیا۔ اس لیے ہمت نہ پڑی کہ افضال کی غیر موجودگی میں اس سے ملوں... اگر افضال کو اس کی خبر ہو جاتی تو وہ بھی بدظن ہو جاتا۔ اخلاق نے مجھے تیسری مرتبہ فون کیا۔ اس کے انداز میں بے پناہ جھنجھلاہٹ تھی۔ میرے دوبارہ انکار کرنے پر وہ کہنے لگا... "اپنے عاشق سے بہت ڈرتی ہو کیا؟"

اس کے اس فقرے نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی... جیسی کم بخت کی شکل تھی ویسی ہی بات کر رہا تھا لہٰذا میں نے بڑے تحمل سے کہا... "جی بالکل صحیح سمجھا ہے آپ نے"۔ یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد افضال آ گیا، اس سے ملنے کو دل بے تاب تھا۔ دل پر بہت ہی اداسی چھائی تھی... بہت جلن تھی دل میں... لیکن ایک احساس اور بھی تھا اور کچھ احساس بہت گراں ہوا کرتے ہیں۔ ان میں تکلیف دہ سی لذت کا عنصر موجود ہوتا ہے... میرے جذبات میں

مچل سی جاتی تھی... ہر لڑکی کو اپنے محبوب سے ملنے کا بہت انتظار رہتا ہے... لیکن میرا انتظار ان سے کچھ زیادہ ہی مختلف تھا، ایک بہت ہی اذیت ناک سی خلش تھی... ایک جان لیوا سا خیال... فاصلوں کا تصور بہت ہی ہولناک ہوتا ہے۔ جب کسی شے کو اپنا جان لیا جائے تو وہ کچھ ملکیت بن جاتی ہے، پھر اسے یا اس کے تصور کو تبدیل کرنا سہل نہیں رہ جاتا۔ یہی کیفیت کچھ میرے دل کی تھی... افضال سے ملنے گئی تو دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ دل کی تھل پتھل ہوتی ہوئی دھڑکن الجھن کا باعث بن رہی تھی۔ افضال مجھے دیکھ کر خوش ہوا اور بولا:

"آؤ کوثر جان، بہت یاد آئیں تم، مجھے تو یوں لگتا تھا کہ جیسے تم سے ملے ایک عرصہ ہو گیا ہے۔"

اس کے یہ الفاظ بہت عجیب سے لگے۔ چند الفاظ نے ڈھیر سارے جذبات میں جیسے لطیف معنی سمیٹ لیے تھے۔ اس نے مزید بتایا کہ اس کی والدہ نیم رضا مند ہو گئی ہیں، انہیں ہموار کرنے میں کچھ دن اور لگ جائیں گے... میں نے اخلاق کی بات افضال سے چھپا لی تھی۔ کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ افضال، اخلاق سے کچھ چڑ سا گیا ہے...

اتوار کو افضال آیا تھا اور سہ پہر کے روز مجھ سے ملاقات کی اور اسی شام اخلاق راولپنڈی چلا گیا۔ مجھے یہ خوشخبری افضال نے فون پر بتائی تھی، کہنے لگا:

"آج اخلاق گھر پر نہیں ہے، پرسوں آئے گا، تم فوراً پہنچ جاؤ... تم سے اس سے متعلق کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"...

گیارہ بجے کے قریب میں افضال کے گھر دھڑکتے دل سے داخل ہوئی... ہمیں باتیں کرتے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ اچانک دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی۔ افضال باہر گیا، اور تھوڑی دیر بعد میرے ابا جان اسے دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے... میں جو آرام کرسی پر نیم دراز تھی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ اچانک بدلتی ہوئی صورتحال دیکھ کر حالت یہ ہو گئی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اس کے بعد جو ڈرامہ ہوا، اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی رخسانہ، ابا جان جو مجھ پر اندھا دھند اعتماد کرتے تھے.. مجھے یہاں دیکھ کر جس رنج و کرب میں مبتلا ہوئے اس کے خیال ہی سے دل ڈوبنے لگتا ہے... باہر خاصا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا، میں انتہائی ذلالت سے باہر آئی۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے یہ داستان سب کی زبان پر پہنچ چکی تھی کہ ارشد خان کی اکلوتی بیٹی رنگے ہاتھوں پکڑی گئی... میرے ابا جان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔ افضال نے ابا جان کے پاؤں پکڑ لیے اور منت کرتے ہوئے کہا۔ اگر آپ چاہیں تو ابھی اسی وقت ہمارا نکاح کر دیں...

ابا جان نے خاموشی اختیار کر لی۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اخلاق نے ہی انہیں اور دیگر اہلِ محلہ کو میری موجودگی کی خبر دی تھی۔ وہ راولپنڈی نہیں گیا تھا۔ اس نے والد صاحب سے رابطہ قائم کیا۔ انہیں میرے خطوط دکھائے اور چھپ کر میرا تعاقب کیا۔ میرے گھر سے نکلتے ہی اس نے ابا جان کو ساتھ لیا۔ اور ساتھ ہی انہیں دھمکی دی کہ اگر آپ نے اس کی شادی افضال سے کی تو اس کے خطوط اخبار میں چھپوا دوں گا۔ ابا جان جو کہ اپنی شخصیت سے رعب دار لگتے تھے، لیکن وہی ارشد خان اپنی عزت کی خاطر بزدل آدمی بن گئے... یا دوسرے لفظوں میں انہیں عزت دار کہہ لیں...

میری تو ان سے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ دوسرے روز اخلاق اپنے ایک عزیز کے ساتھ آیا۔ گھر میں کھچڑی سی پکی اور مولوی صاحب کو بلایا گیا۔ ابا جان نے مزید رسوائی سے بچنے کے لیے میرا ہاتھ اخلاق کے ہاتھ میں دے دیا... ایک پل میں سارا کھیل ہی ختم ہو گیا۔ اخلاق گھر داماد بن گیا...

اس نے مجھ سے کہا..." تو نے اس روز مجھے جنگلی کہا تھا نا... اب تمہیں پتہ چلا کہ جنگلی شکار کیسے کرتے ہیں، پہلے تمہیں محبت سے رام کرنا چاہا۔ جب جنگلی پن دکھائے بغیر کام نہیں نکلا تو یہ تا اور کون سا راستہ اختیار

کرتا۔ آخر تیرا کہا بھی سچ کر کے دکھانا تھا ناں کہ میں جنگلی ہوں اور تجھ جیسی لڑکیاں مجھ سے دُور بھاگتی ہیں۔ اب بھاگ، کتنی دُور بھاگے گی مجھ سے... مجھے تو نے بزدل گنوار سمجھا تھا کہ اپنے عاشق کے سامنے جنگلی کہہ بیٹھی تھیں۔ اب بُلا اپنے عاشق کو...

مگر رخشی، میں کسے مدد کے لیے بُلاتی... وہ معاشرے کی نظر میں میرا مجازی خدا بن گیا تھا۔ مجھ پہ اسے استحقاق کہاں ہوتا تھا، محبت بھی اسے پہلے تھی اور نہ ہوئی ہے اور آج میں اس جنگلی کی بیوی ہوں۔ جو ہر مہینے اور ہر دن اپنی گرل فرینڈ بدلتا ہے۔

پہلے یہ مجھے کراچی لے گیا۔ لیکن پھر یہاں آ کر شادمان میں فلیٹ لیا۔ ایک پرائیویٹ فرم میں منیجر کی جاب ملی ہوئی ہے... نت نئی گرل فرینڈ بناتا ہے انہیں گھر لاتا ہے، جبکہ مجھے دروازے سے باہر تک نہیں جھانکنے دیتا۔ میرے سامنے ہی اپنی گرل فرینڈز پہ پیار کی بارش کرتا ہے اور ان کے جانے کے بعد پوچھتا ہے کہ میں جنگلی ہوتا تو اتنی لڑکیاں کیا مجھ پہ مر سکتی تھیں...

اس وقت افضال میرے لیے خواب و خیال ہو چکا ہے... اچھی اور پُرسکون زندگی کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ ایک بچے کے بندھن میں جکڑی گئی ہوں۔ اب تو والدین سے بھی مجھے نہیں ملنے دیتا۔ کیا کروں اس جنگلی اور درندہ صفت انسان کا انتقام ہی پورا نہیں ہو پا رہا... اور رخشانہ جی، چند دن پہلے جو تم سے اچانک ملاقات ہو گئی تھی، وہ بھی میری قسمت ہی تھی... کافی عرصے کے بعد گھر سے نکلی تھی... وہ بھی کڑی نگرانی میں... کسی عورت کو کنی سے میرے ساتھ بھیجا تھا... میرے بچے کی طبیعت بہت خراب تھی اس کے علاج کے لیے بڑی مشکل سے اجازت لی تھی... اور اسی سلسلے میں گھر سے نکلی تھی کہ تم پہ نظر پڑ گئی... یہ بھی شکر ہوا کہ تم سے سرِ راہ ملاقات ہو گئی... تم جو ادب سے گہری دلچسپی رکھتی ہو، میری کہانی کو بہتر سمجھ پاؤ گی اور غور سے پڑھو گی...

اب رخشانہ تم خود ہی اندازہ لگا لو کہ تمہاری دوست کوثر کتنی بدقسمت ہے... قسمت نے کیسا بھیانک مذاق کیا ہے میرے ساتھ کہ ساری زندگی تباہ ہو کر رہ گئی ہے... دشوار راستے ہیں، ان راستوں پہ ہم سفر پایا بھی تو کیسا، کہ جس کے پاس، تپتے سلگتے موسم میں بھی چھاؤں نہیں ہے... سکون نہیں ہے... گداز نہیں ہے... اگر کچھ ہے تو نشتر، طنز اور خار ہیں۔ زخم لگانے والا ہر گھڑی سامنے ہو تو وہ صبر بھی نہیں پا سکتی رخشی... جو نفرت کی آگ میرے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے اس نے میرے نشیمن کے تنکے تنکے کو جلا کر خاکستر کر دیا ہے... میرا تو اسے دیکھنے کو بھی جی نہیں کرتا، لیکن رخشانہ آخر یہ پہاڑ جیسی زندگی بھی تو گزارنی ہے... چاہے مر مر کے... سسک سسک کے ہی گزارنی پڑے...

انمول موتی

۱۔ اپنے دلوں سے دوستی کا حال پوچھو کیونکہ یہ ایسے گواہ ہیں جو کسی سے رشوت نہیں لیتے۔

۲۔ جب تک کوئی بات تیرے منہ میں بند ہے اس وقت تک تو اس کا مالک ہے، جب زبان سے نکال چکے تو وہ تیری مالک ہو گی...

۳۔ لوگوں کو طلبِ علم میں صرف اس وجہ سے بے رغبتی پیدا ہو گئی ہے کہ بہت سے عالم ایسے نظر آتے ہیں جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتے...

۴۔ بدکاروں کی صحبت سے بچا رہ کہ برائی برائی سے جلد مل جاتی ہے...

۵۔ جس شخص کو قرض لینے اور خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں وہ سب سے بڑا مالدار ہے۔

۶۔ زندگی صرف وقت ہے، پس اگر ہم اس کو ضائع کرتے ہیں تو گویا زندگی برباد کرتے ہیں...

(مرسلہ: اختر رضا نیر، ملتان)

ارمان
تحریر۔ خالدہ حمید آزاد کشمیر

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

آداب... سدا سکھی رہیں... اپنی پہلی کاوش... "خزاں میرا مقدر" کی اشاعت پر بے حد شکر گزار ہوں۔ آپ نے اس دکھی بہن کو اپنے جریدے کے شفیق دامن میں پناہ دی ہے تو میں نے بھی اپنی تمام تر امیدیں اس سے وابستہ کر لی ہیں... میری باقی ماندہ زندگی اب اپنے اس پسندیدہ رسالے کے لیے وقف ہو چکی ہے۔ سچ بھیا یہ تو اب میری روح بن چکا ہے، جب تک اسے پڑھ نہ لوں، چین نہیں ملتا۔ اب تو اس بن جینے کا تصور بھی محال ہے۔ حسب وعدہ اپنی دوسری کاوش بھی اسی کی نذر کر رہی ہوں۔

شہزادہ صاحب! میری یہ زیر نظر کاوش... "تڑپتے ارمان"... بھی سچائی پر مبنی داستان ہے... اسے پڑھنے کے بعد باشعور قارئین خود ہی اس کی صداقت کی پہچان کر لیں گے۔ اس لیے خود اس کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ ہاں البتہ جواب عرض کی پالیسی کے عین مطابق میں نے اس میں شامل تمام کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کر دیئے ہیں... بھیا! میں نے مایہ یا کی اس داستان کو حتی المقدور جواب عرض کی زینت بننے کے قابل کوشش کرتے ہوئے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے، مگر چونکہ میں کوئی مستقل قلمکار نہیں اس لیے اس میں بھی قدم قدم پر جھول نظر آئے گی... مگر آپ کے ہوتے ہوئے مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ امید ہے یہ آپ کے معیار پر پوری اترے گی اور آپ کی فنی خامیاں دور کرتے ہوئے اسے بھی جلد ہی جواب عرض کی زینت بنا لیں گے۔ اس مرتبہ بھی حوصلہ افزائی ہوئی تو میں آئندہ بھی جواب عرض کے لیے خوبصورت حقائق تلاش کرنے میں سرگرداں رہوں گی۔ میں نے اپنا فرض پورا کر دیا ہے، اب آگے آپ کی مرضی...

آخر میں جواب عرض کی ترقی کے لیے دعاگو ہوں۔ اور اپنی اس کاوش کے بارے میں بھی اپنے معزز قارئین کی تعریف کم اور تنقیدی زیادہ آرا کی شدت سے منتظر رہوں گی...

آپ کی پُرخلوص...

خالدہ حمید معرفت محمود شاپنگ سینٹر
سپر مارکیٹ۔ مظفر آباد۔ آزاد کشمیر۔

میں جب بھی کوئی دردناک افسانہ پڑھتی ہوں تو میرے ذہن میں ایک دھکی لہر سی اٹھ جاتی ہے.. دل تڑپ تڑپ جاتا ہے... ذہن ساتھ دینا چھوڑ دیتا ہے، میری نگاہوں میں اپنی بکھری بکھری سی ویران اور اداس سی زندگی گھوم جاتی ہے۔ زندگی کی وہ شاہراہ جو کبھی حسین تھی، آج مجھے ناگن بن کر ڈستی ہے، میں جو ہر ایک کے دکھ اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔ خود اتنی ٹوٹ پھوٹ چکی ہوں کہ دو قدم بھی چلنے کی سکت نہیں ہے۔ اپنی ٹوٹی پھوٹی زندگی کے ریزے چنتے چنتے روح تک چھلنی ہو چکی ہے... ہاتھ لہولہان ہو چکے ہیں... وجود چھلنی چھلنی ہو چلا ہے... زیست کے اذیت ناک کانٹوں کو اٹھاتے اٹھاتے ارمانوں کا دامن تار تار ہو چکا ہے... تمام کارواں بچھڑ چکا ہے، صرف میں ہی بدنصیب ہوں، جو صحرا میں بھٹک رہی ہوں... دل ہے نہ بجھتا ہے نہ جلتا ہے کہ اس کی بڑھکتی ہوئی آگ میں جل کر میرا وجود خاکستر ہو جائے اور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پُرسکون ہو جاؤں۔ ہاں شہریار کہ اب ارمانوں کے سلگنے اور تڑپنے کا اور تماشہ دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں رہی۔ ان جلتے ارمانوں میں ہی کاش میرا جسم جھلس جاتے مگر آہ، میری روح کا دامن تو اس آگ سے تار تار ہو چکا ہے.... اور میرا وجود صرف قائم ہے...

تم ہی بتاؤ شہریار...! زخمی زخمی روح کے ساتھ جینے میں بھی کچھ مزا ہے؟ جہاں ہر وقت دل کا ناسور روح میں قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے تو کیسے جینے کی خواہش ہوگی... ہاں شہریار! مجھے بھی انتظار ہے اس گھڑی کا جب ارمانوں کے لاشے کا بوجھ مجھ پر سے اتر جائے گا۔ میں بھی شدت سے منتظر ہوں اس گھڑی کی جب موت کی پُرسکون وادی میں میری زندگی تاریکی میں گم ہو جائے گی۔ جب اس حسین و شفیق وادی کی بانہیں میرے لیے وا ہو جائیں گی اور میں ان کی بیکراں تاریک وسعتوں میں اپنے وجود کے ساتھ پُرسکون ہو جاؤں گی۔ کیونکہ اب زیست کی ان خاردار راہوں پر چلتے چلتے بہت تھک چکی ہوں۔ اور پھر بھلا تڑپتی سسکتی روح زخموں سے چور چور چھلنی وجود کے سوا میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔ چند ارمانوں کے لاشے اور کچھ حسین یادیں میری حیات کا کل حاصل ہیں۔ دعا کرو شہری! کہ میرا وجود بھی جلد ہی ان گم گشتہ فضاؤں میں تحلیل ہو جائے۔ وہاں جہاں لاکھوں انسان کھو گئے... جہاں سے کوئی بھی واپس نہیں آتا...

شہری...! جب بے رحم تقدیر... ظالم سماج، جھوٹی دنیا اور تاریک زندگی نے روشنی کی ایک کرن بھی میرے لیے نہ رکھ چھوڑی۔ مجھے زخموں... آہوں کے سوا کچھ نہ دے سکی۔ خاردار نوکیلے کانٹوں سے واسطہ پڑتا رہا ہو... اس دامن میں سوائے حسرت زدہ پلوں کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ دل کی دھڑکن رک چکی ہو۔ دکھوں کے علاوہ زیست نے دامن میں کچھ بھی نہ ڈالا ہو تو زندگی کی... تمنا کون کرے گا۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ لاکھ سمجھاتی ہوں لیکن یہ مچل اٹھتا ہے اور تڑپ تڑپ کر اس کی ڈوری تھامنے پر مجبور کرتا ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس بکھری بکھری زندگی کو بھلا کون اپنے دامن میں سمیٹے گا۔ میرے دل کے بجھتے چراغوں میں کون اپنی چاہ و محبت کے دیپ جلائے گا... میرے زخموں پر کون مرہم رکھے گا۔ میرے تڑپتے دل کو کون سکون سے ہمکنار کرے گا۔ میری زخمی روح کو کون زندگی کی حقیقی خوشیوں سے روشناس کروائے گا۔ نہ جانے یہ دل کیوں ایسا سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ اس مادی اور مشینی دور میں کب کسی کو اتنی فرصت ہے کہ کوئی مجھ جیسے غریب کے لیے وقت نکالے گا۔ بھلا مصروف ترین زمانہ کیوں میرے لیے اپنا قیمتی وقت برباد کرے گا۔

اپریل ۱۹۸۳ء

مصروفیت سے بھرپور اپنی زندگی سے پیار کی چند گھڑیاں نکال کر کون خلوص سے مجھے جینے کی ہمت دلائے گا کہ یہاں تو ہر ایک کو اپنے اپنے دکھ ہیں۔ کسی کو چاہت کے کسی کو دولت کے اور کسی کو غریب ہونے پر غم ہے تو کوئی دن رات خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں ہے تو ایسے میں کسی کو میری فکر کب ہوگی۔ مگر پھر بھی یہ ننھا سا دل خوشی کا انتظار کرنے پر اکساتا ہے۔

شہریار...! زندگی سے بے حد نفرت ہے مگر پھر بھی جیے جا رہی ہوں... موت کی جتنی آرزو ہے وہ اتنی ہی میری ذات سے دور سے دور تر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بھی مجھ سے ناراض ہے۔ تمہاری طرح... زمانے کی طرح۔ کتنی بری ہوں میں کتنی بری! میری کسی کو ضرورت نہیں۔ کوئی میری زندگی کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ مگر پھر بھی جیتی ہوں اور ابھی نہ جانے کب تک مقدر کی ٹھوکریں کھا کھا کر جینا پڑے گا...

مجھ سے دل پوچھتا ہے کہ میں کیوں زندہ ہوں؟ جانتے ہو کہ اس وقت میری کیا سوچ ہوتی ہے؟ ہاں شہریار یہ دل کو یہ کہہ کر بہلاتی ہوں... کیوں پوچھتے ہو... کیا تم سے کہوں۔ میں کس لیے زندہ ہوں... شاید کہ کبھی مل جاؤ تم کہیں... میں اس لیے زندہ ہوں!

شہری...! میں جانتی ہوں کہ میری جان تم مجھ سے نفرت کرتے ہو مگر اس پگلے دل کو کون سمجھائے گا کہ میں اسے آج تک سمجھا کر بھی تھک چکی ہوں...

شہریار...! کیا میری لرزتی کانپتی زندگی کو بھی کبھی ایسا سہارا مل سکے گا کہ یہ پھر کبھی نہ گر سکے گی...؟ کیا میری بے چین روح کو بھی قرار میسر آ سکے گا..؟ کیا تمہاری خوشیوں بھری دنیا میں صبح کی کرن کی کوئی ادھوری روشنی میرا مقدر بھی بن سکے گی..؟ کیا میرا جیون بھی ارمانوں کے پھول لاشے... ماتم کرنے کی بجائے کھل کر حسین پھول بن سکے گا..؟ میری زندگی بھی کبھی قرار کو ترسنے کی بجائے اس کی لذت سے آشنا ہو سکے گی..؟ کیا میری زیست بھی خاردار جھاڑیوں سے... تپتے صحرا سے نکل کر حسین گلستان اور دلنشین روشنیوں سے ہمکنار ہو سکے گی..؟ تڑپنا سسکنا چھوڑ کر یہ بھی محبت کے رنگین نغمے کی لے پر گنگنا اٹھے گی۔ میری زیست کے تار بھی کبھی بہاروں کی حسین بزم میں جھنجھنا اٹھیں گے... کیا میری آس بھی کبھی ختم ہوگی... کیا میری زندگی

جواب عرض لاہور

کی تاریکی بھی اجالے میں بدلے گی۔ میری خوشیوں کا سورج بھی کبھی طلوع ہوگا؟ میں جانتی ہوں شہریار..! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میری اداس اور ویران... اجڑی اجڑی زندگی کے تار کبھی بھی پیار کی مدھر موسیقی پر تھرتھرا نہ سکیں گے۔ یہ یوں ہی ساکت و جامد رہیں گے۔ اور ان پر زمانے کے ستموں، وقت کی گردشوں... مقدر کی ٹھوکروں اور تمہاری بے رخی کے داغوں کی مہر گرد بن کر ثبت ہو جائے گی۔ میرا چمن سدا پیاسا صحرا رہے گا... کبھی الفت کے بادل اس پر نہ برس سکیں گے... لاکھ گھٹائیں چھائیں گی... لاکھ دلوں کی پیاس بجھے گی مگر میری متلاشی نظریں بارش کے انتظار ہی میں پتھرا جائیں گی... میری آنکھیں ساون کی برساتوں میں ساون سے بھی بڑھ کر برستی ہیں۔ مگر میری پیاس پھر بھی نہیں بجھے گی۔ اور نہ بجھی ہے... میرا من پیاسا تھا.. پیاسا ہے۔ اور سدا رہے گا۔ میں سدا بہاروں کی متلاشی رہوں گی۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کہ زیست کے بقیہ دن چند لمحات بھی دکھ درد کے ان ہی ایوانوں میں بھٹکتے بھٹکتے کھو جائیں گے... سب کچھ جانتے ہوئے بھی ایسا سوچتی ہوں۔ شاید اس لیے کہ اس پر دنیا قائم ہے... یہ فقرہ بار بار سنا ہے نا..؟

دیکھو شہریار..! کتنی پاگل ہوں میں... کیا سوچتی رہتی ہوں۔ بھلا سپنے بھی کبھی حقیقت میں ڈھل سکتے ہیں...

ہاں شہری! اپنی بے بسی اور بدنصیبی پر ترس ضرور آتا ہے۔ مگر نہ شکوہ تم سے ہے کہ تم مجبور تھے نہ تقدیر سے کہ بے جان ہے نہ خدا سے کہ شاید زندگی کے تمام امتحان میرے ہی مقدر میں تھے...

شہریار..! تم سوچو گے بجائے کہانی کے گلے لکھنے بیٹھ گئی... مگر میری جان ناراض مت ہونا کہ آج جی چاہتا ہے تم سے وہ سب کچھ کہہ دوں جو مدت سے طوفان بن کر سینے میں مچل رہا ہے۔

ہاں شہری! آج جب کہ اپنی ہی داستانِ الم لکھنے بیٹھی ہوں تو بے حد اذیت سے دوچار ہوں۔ ماضی ایک تصور بن کر جھلملاتی نگاہوں میں سماتا جا رہا ہے۔ وہ ماضی جس میں تم تھے میں تھی جب زندگی کی تمام شاہراہیں حسین تر لگتی تھیں۔ زیست کی اونچی نیچی راہوں پر تمہارے سنگ چلنے میں لطف محسوس ہوتا تھا۔ زندگی میں پیار ہی پیار تھا ہر طرف بہاروں کا بسیرا تھا۔ مگر آہ... اب تو یہ سب کچھ تصور ہی بن کر رہ گیا ہے۔ نہ تم وہ رہے نہ ہم... آہ! خوشیوں کا وقت کتنا تھوڑا ہوتا ہے نا..؟

آج کی رات بے حد لمبی ہے اتنی طویل کہ میں لمحہ بہ لمحہ سسک سسک کر تھک چکی ہوں۔ مگر یہ ابھی باقی ہے۔ چاند آج بھی اپنی تمام تر رعنائیوں سے جلوہ گر ہے مگر اب میرے لیے یہ اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ہر طرف اداسی چھائی ہے میرے چار سو اندھیرے ہیں۔

شہری..! جب بھی سورج ڈھلنے لگتا ہے۔ تو میں بالکونی میں جا کر اس ڈوبتے سورج کا نظارہ کرتی ہوں تو ایسے میں میری آنکھیں ساون کی طرح برستی ہیں۔ بلکہ یوں ہی میری حسین زندگی کا سورج بھی غروب ہو چکا ہے نا...

شہری! بے وفا مجھے زندگی کے انجانے موڑ پر لا کر خود نہ جانے کس سمت کھو گئے ہو کہ پلٹ کر خبر بھی نہ لی... تمہاری باتیں تمہارے کیے وعدے اور کھوئی قسمیں یاد آتی ہیں تو یہ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

بتاؤ شہری..! اس بکھری داستان کی ابتداء کہاں سے کروں اور انتہا کہاں سے کروں... کہ جس کے مقدر میں ازل سے ہی محرومیاں رسوائیاں لکھی ہوں وہ بھلا منزل کی تمنا کیسے کر سکتا ہے۔ اور خاص کر ایسے حالات میں جب کہ ناخدا ہی اس کی کشتی غرقاب کرنے کے درپے ہو بھلا ایسی کہانیوں کا انجام سوائے ناکامی کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ کہ جس کی ابتداء میں ہی بے رخیوں... بیزاریوں سے پالا پڑا ہو...

شہری..! یاد کرو میں نے کبھی بھی تم سے ملنے کی ضد کی ہے۔ کبھی بھی تم سے بے رخی کا شکوہ کیا ہے؟ میں نے ازل سے تمہاری محبت میں دکھ ہی پائے ہیں.. مگر اُف تک نہ کی... یقین جانو تمہاری چاہ ازل سے ہی مجھے کسی خوشی سے ہمکنار نہ کر سکی۔ مگر میں خاموش رہی۔ نہ تم سے چھپ چھپ کر ملی نہ ہی تمہیں مجبور کیا۔

ہاں یہ الگ بات ہے کہ بعض اوقات تمہاری دید کی

جواب عرض لاہور

خواہش ابھرتی ضرور تھی۔ مگر میں بیدردی سے اس کا گلا گھونٹ دیتی... اس لیے کہ تمہارے تصور ہی کو ذہن میں لگا لیا کرتی تھی۔

شہریار..! تمہاری ایک جھلک دیکھنے کی خاطر میں نہ سردی دیکھتی نہ گرمی... اور اپنے محبوب کے دیدار کی خاطر بالکونی میں کھڑی ہو جاتی تھی۔ بس اپنے دل کی پیاس بجھا لیتی... من کو جھوٹی تسلیاں دے کر بہلا لیتی تھی...

شہریار..! ساون کی برساتیں میری محبت کی حقیقت کی گواہ ہیں۔ یقین نہ ہو تو چاندرات کے اداس ستاروں سے پوچھ لینا وہ بھی تڑپ تڑپ کر تمہیں میری چاہت کی صداقت سے آگاہ کریں گے سردیوں کی ان ٹھنڈی اور یخ بستہ ہواؤں سے پوچھ لینا... سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی ویران راہوں سے پوچھ لینا... وہ بھی میرے پیار کی بربادی پہ تمہیں نوحہ کناں ملیں گی۔ اور اگر ان میں سے کسی پر یقین نہ آئے تو اپنے دل میں جھانک کر دیکھنا۔ شاید تمہیں اندازہ ہو جائے میری بے قراریوں کا... کیونکہ اب تو تیرا بھی دل ہے میری طرح چوٹ کھایا ہوا...

شہریار...! سوچتی ہوں تم سے کیا کیا شکوہ کروں۔ کیا حاصل ہے اس سے... فریاد سے کیا ہوگا... رونے سے نتیجہ کیا..؟ یہ سب بیکار باتیں ہیں ان سے کیا ہوگا؟ کہ یہاں تو بیگانے تو دور اپنوں سے بھی اعتبار اٹھ گیا ہے۔ تمہیں اپنی کس کس زخم کی جھلک دکھاؤں... زمانے کے ہاتھوں سے کھائے ہوئے کس کس چہرے کا زخم بتاؤں... کہاں تک سنو گے کہ یہ داستان تو بہت بڑی ہے کہ تقدیر کے ترکش میں سے ڈھیر سارے تیروں نے روح کو گھائل کر دیا ہے۔ خود سوچو جس کی ماں جیسی شفیق ہستی روٹھ کر ہزاروں میل دور بس گئی ہو... جس کا شفیق باپ روٹھ کر نہ جانے کس دیس جا چکا ہے۔ جو سب کے ہوتے ہوئے تنہا ہو۔ جس کا بھری دنیا میں کوئی پرسان حال نہ ہو۔ جو دوسروں کے رحم و کرم پر ہو تو اس کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے۔ جس نے صدا اندھیرے ہی میں آنکھ کھولی ہو۔ اس کا بھی بھلا کوئی جیون ہے۔ جس کے مقدر میں کاتب تقدیر نے غم ہی غم لکھے ہوں۔ اس کا حال کیا ہوگا...

شہری..! واقعی مجھے روشنی پر کوئی حق نہیں۔ لیکن اتنا بتا دو کہ اس کی خواہش پر تو حق ہے نا؟ مگر آہ...

اس کی خواہش کروں۔ تو دل اور پارہ پارہ ہو جاتا ہے کہ جو چیز مل ہی نہ سکے... اس کی تمنا سے کیا حاصل! ہاں شہری! تمہارا حصول بھی ناممکن ہے۔ اس لیے نجانے کیوں یہ دل تم ہی سے پھر بھی پیار کرنے پہ مجبور کرتا ہے۔

کاش..! اس کی آس ٹوٹ ہی جائے.. شہریار..! کتنے اچھے تھے وہ دن جو تمہارے سنگ سنگ بیت گئے۔ آج تو ان کی یادیں ہی میری کل زیست بن کر رہ گئی ہے۔ میں جو تمہاری محبت پا کر خود کو بھول گئی تھی۔ آسمان کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش کی تھی۔ دوسروں کی طرف سے دیے گئے تمام دکھوں کو تمہاری محبت کے شفاف سمندر میں دھو لینا چاہتا تھا... تمہارے سنگ جینے کے خواب دیکھ بیٹھی تھی۔ نہ جانے کیوں یہ بھول گئی تھی کہ خوشیاں میرا مقدر نہیں۔ میرے ارمان، ارمان ہی رہیں گے... میری آرزوئیں کبھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچیں گی... میرے مقدر کی تاریکی کبھی اجالے میں نہ بدل سکے گی۔ پھر نجانے کیوں ایسا سوچ بیٹھی تھی۔ دور آسمان کی وسعتوں میں تمہارے سنگ کھو جانے کا انوکھا سپنا دیکھ بیٹھی تھی... تھی نا میں پاگل..!

مجھے آج تک بھی کوئی ایسا لمحہ بھولا جو تمہارے سنگ گزرا ہو... میں اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی اپنی اس بکھری بکھری سی داستان کو سمیٹنے کی کوشش میں مصروف ہوں۔

ہاں شہری! آج بھی میری وہی تنہائی ہے۔ وہی اداسی ہے۔ وہی خزاں رسیدہ دن میرے وجود کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہیں۔ میں تمہاری یادوں میں کھوئی خوبصورت وقت کی حسین گھڑیوں کی کڑیوں کو آپس میں ملانے میں مصروف ہوں۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے ہیں۔ دور آسمان کی وسعتوں میں سے چاند کا عکس دکھائی دے رہا ہے۔ سب دنیا خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہے۔ مگر میں جاگ رہی ہوں۔ اور دور ابھرتے ہوئے چاند کے کالے کالے داغ پر نظریں جمائے سوچ رہی ہوں کہ اس کا بھی کسی بے وفا نے دل توڑا ہے۔ جبھی تو یہ بھی اپنی سینے میں کسی کے دیے ہوئے زخم کا داغ لیے چپ چاپ سا ابھرتا ہے۔ یہ چاند جو دوسروں کو

اپریل ۱۹۸۳ء

حجاب عرش لاہور

روشنی بخشتا ہے جبکہ کتنے اندھیرے میں ہے میری طرح۔

شہریار۔۔! تمہیں چاندنی راتوں سے کس قدر پیار تھا کبھی مجھے بھی تھا۔ مگر اب نہیں ہے کیونکہ اب تو اس کی روشنی بھی ماند پڑ گئی ہے۔ تم نے کبھی غور کیا ہے مگر۔۔۔ تمہیں کب اتنی فرصت ملتی ہوگی کہ تم تو دور کہیں زمانے کی حسین فضاؤں میں گم ہو چکے ہو۔۔۔ تمہارا وجود تو میرے لیے اک خواب بن گیا ہے۔ تمہاری صورت دیکھے برسوں بیت گئے ہیں۔ تم تو میرا نام بھی بھول چکے ہوگے مگر آہ۔۔۔ میں تمہیں نہ بھول جا سکی۔

بے وفا شہری۔۔! میں نے دنیا کی لاج نبھاتے ہوئے سدا تمہارے نام کی مالا جپی ہے کہ تم میری زندگی ہو۔۔۔ میری روح ہو۔۔۔ تمہارا تصور میرے لیے تو ایک دیوتا کی مانند ہے۔ اور میں اس دیوتا کی پوجا کرتی چلی آ رہی ہوں۔۔۔ ایک ایسا دیوتا۔۔۔ جس کو خود میں نے اپنے تصوراتی ہاتھوں سے تراشا ہے۔ تم مجھ سے جدا ہو گئے تو کیا ہوا؟ تمہاری یادیں تو میرے قریب ہیں۔ میں ان ہی کو اپنی محبت، عقیدت کے پھولوں سے لبریز کر دیتی ہوں۔ سدا اس راستے پر نگاہیں جما کر تمہارا انتظار کرتی ہوں آج بھی کہ شاید تم پلٹ آؤ۔

شہری۔۔! تم نے خود کو تو چھین لیا۔۔۔ اپنا تصور، اپنی محبت چھین کر دکھاؤ تو مانوں۔؟ یہ تصور جو صرف میری ملکیت ہے۔ اور مجھے اس پر ناز ہے کہ یہ میری تنہائیوں کا ساتھی ہے۔ تمہاری محبت کے بدلے میں کچھ تو ملا کہ یہ دکھ۔۔۔ یہ آہیں۔۔ یہ بھی تو کسی کسی کے حصہ میں آتے ہیں۔ ہر دل اس قابل کہاں کہ یہ خزانے سمیٹ سکے۔ تمہاری محبت کی یہ یادگاریں ہمیشہ اس دل پر نقش رہیں گی۔۔

شہری۔۔! محبت کو پا لینا عظمت نہیں۔ اصل میں تو یہ عظمت ہے کہ پیار کی ان کٹھن راہوں پر چل کر کسی کو کھو دیا جائے۔ وہ ساتھی جس بن جینا محال ہو اس سے بچھڑ کر بھی جینے کا تصور کیا جائے تو محبت کی اصل معراج مقدر بن جاتی ہے۔۔۔ سو میں بھی اس معراج کو پانے کے حصول میں سرگرداں ہوں۔۔ میری کامیابی کے لیے دعا کرنا۔

شہری۔۔! میں کنوئیں کے پاس پہنچ کر بھی سدا پیاسی رہی۔ میرا من اب بھی پیاسا ہے۔ یہ دل کبھی سیراب نہیں ہو سکا۔ یہ کیسی منزل ہے۔ جس کے قریب پہنچ کر بھی میں دور ہوں۔ یہ کیسے بادل ہیں۔ جو تمام جہان کے لیے برستے ہیں مگر میں ان میں سلگ اٹھتی ہوں۔

شہری۔۔! جانتے ہو کہ تمہارے روٹھ جانے کے بعد میری زندگی میں عامر نے داخل ہونا چاہا۔ مگر میں نے بڑی بیدردی سے اسے ٹھکرا دیا۔۔ کہ مجھے چکی کے دو پاٹوں کے درمیان تمہاری طرح پسنے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ کون سا ایسا شکوہ ہے جو عامر نے مجھ سے نہ کیا تھا۔ مگر میں جو کسی کا دل دکھانا گناہ سمجھتی تھی۔ میں نے ایک ایسے پرخلوص انسان کا دل توڑا۔ جس نے مجھے روح کی تمام تر صداقتوں سے چاہا۔ جس نے میرے حصول کی خواہش کے لیے کیا کچھ نہ کیا۔ عامر جو میرا کزن تھا۔ تعلیم یافتہ تھا اور پھر خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی تھا۔ سب سے بڑھ کر میری چاہت کا طلب گار۔۔! میں نے تو اپنے دل کے دروازے صرف اپنے شہری کے لیے کھولے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ اب یہ ہر کسی کے لیے بند ہو چکے ہیں۔۔۔ لیکن اس میں تو صرف تمہیں ہی داخل ہونے کی اجازت تھی۔ جب تم ہی نہ تھے تو کوئی دوسرا کیسے جرأت کرتا تمہاری جگہ لینے کی۔۔۔ شاید عامر میرے زخموں کا مداوا کر سکتا۔ مگر مجھے اس وقت اس سے شدید نفرت ہو گئی جب کہ اس نے تمہاری شان میں گستاخی کی۔ اس نے تمہیں بے وفا گردانا اور تمہیں بھول جانے کو کہا تو میں چیخ پڑی۔ عامر خدارا بس کرو۔ تم مجھے تو سب کچھ کہہ سکتے ہو۔ مگر شہری کے خلاف ایک لفظ بھی نہ نکالنا۔ میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ شدید نفرت کرتی ہوں: اس لیے!!! اس لیے کہ تم نے میرے شہری۔۔۔ میرے پیار کے خلاف زبان درازی کی ہے۔ اس نے جو کیا میرے ساتھ کیا اور پھر اس کا دوش بھی کیا؟ کہ وہ حالات اور دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ جب میں نے شکوہ نہیں کیا تو تم کون ہوتے ہو الزام دینے والے! مت بھولو عامر کہ تم بھی مرد ہو اور شہری بھی ایک مرد تھا۔ اور پھر میرے انکار پر عامر مایوس سا لوٹ گیا۔

شہریار۔۔! اس تڑپتی زندگی کی قسم۔۔۔ مجھے اس پر فخر نہیں کہ عامر نے مجھے چاہا۔ اور میں نے صرف تمہاری خاطر ٹھکرا دیا۔ دکھ تو یہ ہے کہ اس نے یہ جرأت کیسے کی۔ میں ایک بار پھر

ٹوٹ پھوٹ گئی کہ عامر نے میرے سوتے درد جگا دیتے تھے۔
میں جو کسی کا دل توڑنا گناہ سمجھتی تھی عامر کا دل توڑ کر بھی مطمئن رہی۔
اس لیے کہ اس گستاخ نے تمہارے خلاف زبان درازی کی تھی۔ تمہیں بھول جانے کا مشورہ دیا تھا۔ نہ جانے اس نے مجھے کیا تصور کر لیا تھا حالانکہ حقیقت کی نظر سے دیکھتی تو وہ بے گناہ تھا۔ تمہاری اور میری طرح کے خیالات اور دل ہر پہرے تو نہیں بٹھائے جا سکتے نا۔۔؟ مگر شہریار۔۔! اس سے میرا کیا سروکار جو میرے پیار تم کے خلاف غلط الفاظ نکالے جو میرے دنیا کو بدنام کرنا چاہے مجھے ہر اس شخص سے نفرت ہے۔ میں اس کی ذات کو برداشت نہیں کر سکتی۔۔

عامر میں تجھ سے بے تکلف ضرور تھی۔۔ ہم بہت ہی مخلص دوست تھے پر خلوص! مگر تم بھی ایک مرد تھے نا؟ اسی لیے اعتماد کی حسین دیوار کو گرا دیا۔ شاید تم مجھے شہریار کے سامنے حقیر بنا دینا چاہتے تھے۔ میں اعتراف کرتی ہوں تم حسین تھے۔۔۔ پر خلوص تھے۔ میں نے تمہارا دل دکھایا۔ جس کے لیے میں معافی کی خواہش گار ہوں۔۔۔ مگر عامر میں بھی مجبور تھی۔

کاش۔۔! تم دوستی کا نازک بندھن اس غلط نظریے سے توڑ نہ دیتے۔۔۔ تمہاری ذات سے یہ دکھ ملنے کے بعد تو میرا دوستی جیسے پاکیزہ جذبے سے بھی اعتبار اٹھ گیا ہے۔ میں جس نے تمہیں دوست اور ہمدرد ساتھی کے علاوہ سدا بھائی کا درجہ دیا تھا۔ تم نے اس رشتے کا کچھ تو پاس کیا ہوتا۔

مگر آہ۔۔۔۔ اس دنیا میں کس کو کسی کے جذبوں کا پاس ہے۔ در پیر تم بھی تو اسی دنیا کے باسی تھے نا۔۔؟ بھلا پھر کیسے تم فرشتہ سیرت بن جاتے۔۔۔ یہاں سب محبوب بننے پر تو تیار ہیں مگر کاش! کوئی بھائی جیسے مقدس رشتے کو بھی نبھا سکے۔
تم نے جس گھٹیا طریقے سے اس ننھے دل کو چکنا چور کر دیا تو اب یہ تصور بھی محال ہو گیا ہے کہ یہاں سچے اور غرض سے پاک دوست ہیں۔ تم نے یہی تک نہیں کیا عامر بلکہ اپنے پیار کی ناکامی پر شہریار کو میرے خلاف بھڑکا دیا۔
میں نہ کہتی تھی تم بھی ایک مرد ہو۔۔۔ سو تم نے بھی اپنا روپ دکھلا دیا۔۔۔ شہریار اور میں تو پہلے ہی نازک سی ڈوری میں بندھے تھے کہ تم نے اس میں شک و شبہ کی دراڑ بھی ڈال دی۔۔۔ کیا ملا تمہیں ایسا کر کے او بے دردی۔۔؟

عامر آج چیخ چیخ کر ان بدنصیب لڑکیوں کو بتا دینا چاہتی ہوں۔ کہ کبھی کسی کو بھائی نہ بنانا۔۔۔ کبھی دوستی جیسے پر خلوص رشتے پر اعتماد نہ کرنا۔۔۔ کیونکہ یہ سب کچھ فریب ہے اور خواب ہے۔ جب آنکھ کھولو گی تو انسان نما بھیڑیوں کا ایک منظر پاؤ گی۔۔۔ نہ جانے کیسے اور کتنے ہی عامروں سے تمہارا پالا پڑے گا؟

عامر۔۔! آج سوچتی ہوں تمہاری ہی طرح اظہر بھی تو ہے جو آج بھی میرا پرخلوص بھائی بنا ہوا ہے۔ پھر کیسے الزام دوں کہ عامر ہی نہیں اظہر جیسے پرخلوص انسان بھی تو ہیں اور پھر بس ہو جاتی ہوں۔ مگر میں بھی مجبور ہوں کہ تم ہی تو ہو جس نے مجھے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔۔۔ کسے مجرم ٹھہراؤں؟ کسے دوش دوں؟۔۔ کہ میرے بھائی جیسے مقدس رشتے پر سے نہ جانے کس ظالم نے اعتماد توڑ دیا ہے؟

شہریار۔۔! تم بھی عامر کی باتوں میں آ گئے حالانکہ میں نے تو ایسا سوچا بھی نہ تھا۔۔ شہری۔۔! پیار کے رشتے کی بنیادیں اگر شک کی دیواروں سے تعمیر کی جائیں تو یہ کبھی بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتی۔۔۔ تم نے بھی اس صادق جذبے کو کچھ شک اور کچھ پونم کی محبت میں گنوا دیا۔

یاد رکھو شہری۔۔! یہ دنیا تمہیں سب کچھ دے سکتی ہے لیکن یہاں سچا خلوص۔۔۔ صداقت سے بھرپور پیار مہیا کرنے والے لوگ بہت کم ہیں۔۔۔ چاہت سے لبریز دل بہت کم لوگ ہیں۔
جانتے ہو شہری! انکل کو بھی میں نے کبھی تمہارے خلاف نہیں بولنے دیا۔ اور مجھے فخر ہے کہ انہوں نے میری خاطر کبھی تمہیں غلط نام سے نہیں پکارا کہ قصور میرا تھا۔ میں نے انکل کو بتا دیا تھا کہ میں نے ہی زمین کا ذرہ ہو کر آسمان پر اڑنا چاہا تھا یہ نہ چاہتی تو ایسا ہرگز نہ ہوتا۔ اور واقعی قصور میرا ہی ہے۔۔۔

شہری۔۔! میں ابھی سنبھل بھی نہ پائی تھی کہ تقدیر نے اپنے ترکش سے ایک اور تیر پھینکا۔ پونم جسے تم بے حد پیار کرتے تھے۔۔۔ چاہتے تھے نے تمہارے پیار کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس نے میرے پریتم کا دل توڑ دیا تھا۔ میرا جی چاہا اس کا سر توڑ دوں یا خود کو ختم کر لوں۔ مگر آہ۔۔! پونم بھی میری دوست تھی! تم بچھڑے تو میں نے ہر اس شے سے دوستی کر لی تھی جسے تمہارا تعلق ہو حتیٰ کہ پونم سے بھی! اس لیے کہ وہ تمہاری پسند تھی۔ اب جی چاہتا ہے دوستی کے تمام بندھن توڑ ڈالوں جس

جواہر عرض لاہور

نے تمہارا دل دکھایا اس کی ذات سے میرا کیا واسطہ مگر آہ . . . ایسا کیسے کر دوں کہ وہ . مجھے بھی عزیز ہے . اس لیے کہ وہ تمہاری چاہ ہے . . .

شہریار . . . ! ناراض نہ ہونا اگر کوئی لفظ گراں گزرے . ہاں شہریار ! جب میں نے تمہیں پونم کی ناکام محبت پر لٹا لٹا سا دیکھا تو میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا . اور میں قلم اٹھانے پر مجبور ہو گئی . برسوں سے سیتے ہوئے زخموں کے ٹانکے ایک بار پھر ادھڑ گئے . . .

شہری میری جان . . . ! میرا بس چلے تو میں اپنی جان پر کھیل کر بھی تمہیں پونم کا پیار لا دوں زمانے کے تمام خزانوں کی خوشیاں تمہاری نذر کر دوں مگر جس کے دامن تار تار میں خود کچھ نہ ہو وہ تمہیں کیا دے سکتی ہے :

شہری ! میں نے تو خدا سے سدا تمہاری خوشیوں کی بھیک مانگی تھی . تمہاری مسکراہٹوں کے لیے دامن پھیلایا تھا . مگر میری دعائیں عرش معلیٰ کی سنگلاخ دیواروں سے ٹکرا کر ہی واپس پلٹ آئی ہیں . یہ بے اثر ثابت ہوئی ہیں . پھر بھی میں مایوس نہیں ہوں . آج بھی تمہاری محبت کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں کہ خدا کے ہاں دیر ضرور ہے مگر اندھیر نہیں . . .

شہریار . . . ! تم اکثر غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتے ہو مگر اتنا بتا دوں کہ کہیں اس داستان کو بھی غلط نہ سمجھ بیٹھنا . تم یہ نہ سوچنا کہ اس کے پس پردہ میں اپنی محبت کے لیے تمہارے پیار کی بھیک چاہتی ہوں . میرا مقصد تو صرف اور صرف کرچی کرچی دل کے زخموں کو بکھیرنے کا ہے کہ شاید سکون مل جائے ایسے میں ہی . . .

بھلا میں ایسا بھی سوچ سکتی ہوں . مجھے یقین ہے کہ تم غلط نہیں جانو گے . کیونکہ میرا اور تمہارا دکھ مشترک ہے نا ؟ میرا دکھ بھی غم ہجراں ' اور تمہارا بھی فراق یار . . . اب تو تمہیں بھی احساس ہو چکا ہو گا . سپنے ٹوٹنے پہ دل کتنا روتا ہے . دل کیسے ٹوٹتے ہیں . چھالوں سے زخموں کے کھرنڈ جب ادھڑ جائیں تو کیسے انسان بے بس ہو کر اپنی محرومیت پر سسک اٹھتا ہے . بے وفا . . . ! لاکھ دنیا نے کہا " ہم نہ بھولے تجھے " بھول جا . . ! نجانے کیوں تمہارے دکھ نے مجھے ماضی میں لا کر کھڑا کر دیا . جی چاہتا ہے ان بے بسی کی زنجیروں کو توڑ ڈالوں . تقدیر جو اپنی کامیابی پر نازاں کھڑی مسکرا رہی ہے . اس کی مسکراہٹ نوچ لوں . اپنے مقدر پر اشک بہاؤں کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے نا . . ؟

شہری ! تمہاری خوشی پہ میں مٹ جاؤں . میری دنیا یوں ہی برباد رہے . مگر خدا سے التجا ہے کہ تم سدا سکھی رہو . کاتب تقدیر پہ میرا بس چلے تو رو رو کر تمہاری زندگی کے ان تمام دکھوں کو اپنے نام کر لوں . . . مگر کیا کروں میں بھی تو مجبور ہوں نا . !

تقدیر پر کس کا بس چلا ہے . کون کسی کی تقدیر بدل سکا ہے . . . اے انسانوں کی تقدیر میں دکھوں کی آمیزش کرنے والی بے پرواہ ذات ! کیا بدنصیبوں کے مقدر لکھتے وقت تیرا قلم نہیں لرزتا . . ؟ تو نے اپنی بے پرواہی کی انتہا کرتے وقت ہم نصیب جلوں کے بارے میں کچھ بھی نہ سوچا تھا ؟

تو نے تقدیر کو من مانی کی اجازت دیتے وقت کچھ نصیحت نہ کی تھی ؟ وقت کو بے رحم بناتے وقت تمہیں کسی بدنصیب کا پاس نہیں ہوا تھا . . . پر تو تو رحیم ذات ہے ! کاش کہ تیری رحمت کے ساتھ یوں بے پرواہی نہ ہوتی . تقدیر کے ہاتھوں انسان اک کھلونا ہے . . . وہ جب چاہے اسے اٹھا لیتی ہے جب چاہے دور پھینک دیتی ہے . دنیا بنانے والے تیرے من میں کیا سمائی تھی . جو مائی کے پتلے زمین پر ستم ڈھانے کے لیے بھیج دیے . . .

اے انسانوں کی تقدیر بنانے والے کوئی نمی تو تیری آنکھوں میں بھی آئی ہو گی محرومیت بھرا مقدر لکھتے وقت . . ! کاش ایک بار انسان بن کر عرش سے فرش پر آ کر دیکھ تو سہی کہ تیری دنیا کے بدنصیب انسان کن حالات سے دوچار ہیں . تیری بنائی گئی اس بے بس اور کمزور سی زندگی پر کس طرح مظالم برسائے جاتے ہیں . . .

کاش . . ! اب تو یہ امانت مجھ بدنصیب سے واپس لے لے . . . کیونکہ اب تیری دی گئی امانت کو سہارنا میرے لیے بے حد مشکل ہو گیا ہے ؟ پھر تو تو رحیم ذات ہے . اس حقیر سے قلم کی کیا مجال جو تیری شان میں گستاخی کا ایک لفظ بھی استعمال کرے . لیکن اتنا تو بتا دے کہ تجھ سے نہ کہوں تو پھر کس

سے حالِ دل سناؤں کہ تو ہی تو سب دکھی دلوں کا آسرا ہے۔

شہری۔۔! آج بھی وہی رات دن ہیں۔ دنیا کی وہی رونق ہے دل کی وہی ویرانیاں ہیں۔ جو لمحہ بہ لمحہ پھیلاتی رہتی ہیں۔ بہاریں اب بھی آتی ہیں۔۔۔ پھول اب بھی کھلتے ہیں۔ مگر میرے لیے یہ سب کچھ فضول ہے۔۔۔ میری روٹھی مسکراہٹ کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ میرا مقدر تاریکی ہے اور کوئی بھی مجھے میری قسمت خرید کر نہیں دے سکتا۔ کہ اگر ایسا ہو سکتا تو میں سب سے پہلے تمہاری خوشیوں بھری قسمت خریدتی۔۔۔ شکر ہے اس پروردگار کا جس نے مجھے کچھ تو عنایت فرمایا۔

اگر یہ دکھ بھی میرے اپنے نہ ہوتے تو کیا ہوتا کہ خوشیاں تو پرایوں سے منسوب ہیں۔ میری خوشیاں تو خواب بن کر رہ گئی ہیں۔ چاہتوں کے حسین تاج محل کب کا چور چور ہو چکے ہیں۔ زندگی کی رہگزاروں پر وقت کے ظالم بے رحم چرکوں کی گرد جم چکی ہے۔ دل ایک ویران کھنڈرات میں بدل چکا ہے ارمان ہر دم مچلتے تڑپتے ہیں۔۔۔ موت کی خواہش کرتی ہوں تو وہ زندگی کی سزا دے کر دور کہیں بھاگ جاتی ہے۔

شہریار۔۔! میں نے تمہیں روح کی تمام تر صداقتوں دل کی تمام گہرائیوں سے چاہا ہے۔ تم جو یونم کے پیار میں گم ہو میری پہلی اور آخری چاہ ہو! تم جو اپنی بدنصیب ماریا کو بھول چکے ہو۔۔۔ مگر میں تمہیں نہیں بھلا سکی۔

شہری۔۔! میں اعتراف کرتی ہوں کہ میرے لیے تمہیں بھولنا بے حد مشکل ہے۔۔۔ شہری! میں تمہارے دکھ بانٹنا چاہتی ہوں۔۔۔ مگر نہ جانے تم مجھے اس قابل سمجھو۔۔؟

ہاں شہریار۔۔! تمہارے دکھوں کو اپنے دامن میں ڈال لینے کی خواہشمند ہوں۔۔۔ یہ کہانی اگر نظروں سے گزرے تو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔ ماضی کے تمام گم گشتہ اذیت زدہ لمحوں کو بھلا کر تمہارا دامن خوشیوں سے بھرنے کی آرزو رکھتی ہوں۔۔۔ یونم کی جگہ تو میں نہیں لے سکتی۔ لیکن اپنے صادق جذبوں پر اعتماد ہے۔ میں جانتی ہوں۔ یہاں سچے دلوں کی کوئی قدر نہیں کہ یہ دنیا تو شیشہ گروں کی ہے۔ یہاں زمانہ بڑی سادگی سے کہانی کا رخ موڑ دیتا ہے۔ بڑی بیدردی سے پیار بھرے دل ٹھکرا دیے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی نہ جانے جی چاہتا ہے کہ تم سے ایک بار پھر دھوکہ کھاؤں۔۔۔ تمہارا غم میری برداشت سے باہر ہے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو ایک بدنصیب کی اتنی سی التجا ہے کہ اداس نہ رہا کرو۔۔۔ دیکھو کوئی تمہیں سلگتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے تم سے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ کسی تمنا کو پوری کرنے کی ضد نہیں کی۔ مگر آج تم سے کچھ مانگنے کا حق مانگتی ہوں۔ وہ بھی اپنے لیے نہیں اس سنگدل کے لیے جس نے دن میں رات اور رات میں دن کے سپنے دکھلائے۔ خدارا میری آس نہ توڑنا کہ یہ دل ریزہ ریزہ ہو کر فضاؤں کی بیدرد گرد میں گم ہو جائے گا۔۔۔ اور تم ایک بدنصیب کو ایسا نہ ہو کہ تلاشتے پھرو کہ تم اتنے بھی ظالم تو نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی تمہاری محبت کی بے رحم موجوں کے تھپیڑوں سے ساحل سمندر سے پھر ایک بار طوفان کی نذر ہو جائے کہ اس نے مجھے جینے ہی کب دیا ہے۔ مجھ سے تو شاید سکھ سے جینے کا حق بھی چھین لیا گیا ہے۔

دیکھو شہری۔۔! دل توڑنا بہت بڑا گناہ ہے پھر ایک بار اس گناہ کے مرتکب نہ ہونا۔ میرا کیا ہے غم ہے اپنا مقدر تو غم اٹھا کر ہی جی لیں گے۔ ان حسین خوشگوار یادوں کے سہارے زندگی کے بقیہ چند روز بھی گزر ہی جائیں گے۔ اپنے ہونٹ سی ہی لیں گے۔۔۔ تاکہ کوئی یہ سوال نہ کر سکے کہ مجھے زندگی کی ان ویران اور اجاڑ اور سنسان راہوں پہ لانے والا کون ہے؟ غم کی اس کٹھن شاہراہ تک پہنچانے والا کون ہے۔۔؟ اور پھر اب تو غم سے انس ہو گیا ہے۔۔۔ محبت ہو گئی ہے ان سے۔۔! جب تک یہ نہ ملیں چین ہی نہیں آتا۔ اب تو سہتے سہتے دل پتھر بن گیا ہے۔ ان دکھوں سے تو میری دوستی ہو گئی ہے یہ مجھے بے حد عزیز ہیں کہ ان کا اور میرا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔۔۔ میرا خوشیوں سے کیا سروکار۔۔۔ یہ تو عادت سی بن چکے ہیں۔۔۔

او ظالم۔۔۔ پتھر کے صنم! ہو سکے تو میرا پیار مجھے لوٹا دینا تاکہ تمہارا اس دیوانی سے کوئی بھی رشتہ نہ رہے۔۔۔ کہ شاید اس طرح تجھے بھولنے میں کامیاب ہو سکوں۔

شہری۔۔! خدا سے التجا ہے کہ میرے مقدر کی تمام خوشیوں سے وہ تمہیں ہمکنار کرے۔۔۔ میری زندگی کی راحتیں تمہیں میسر ہوں۔ تم سدا مسکراتے رہو۔ میری عمر بھی تمہیں مل

جائے ... تم کبھی تمہاری دہلیز کا راستہ نہ بھولیں ۔ آمین ۔
شہری! بہت ہو گئے ہیں یہ زخم! ہے ایک بار راستہ دیکھ لیں، تو پھر بولتے کیوں نہیں!

خدا سے دعا ہے کہ پریم کر کے پریتم سے کوئی نہ بچھڑے جیسے میں اجڑی ہوں کسی کی زندگی ایسے ویران نہ ہو جیسا کسی کا بنا کھیل بگڑا ہے۔ میرا سکھ چین اور میرا جیون جیسے چھینا ہے۔ ظالم دنیا نے پاپی سے سنسار نے جیسے میرا صنم چھینا ہے۔ کسی کا دل ۔ کسی کی دنیا برباد نہ ہو... جیسے میری راتک آس دن کا سہارا لوٹا... میری خوشیوں کا سورج اور مسکراہٹوں کا ستارہ ڈوبا ہے... کسی کا نہ ڈوبے! آمین ۔

شہری..! تمہارے بن کیسے رتیاں بتاؤں... دل کی آگ کس طرح ٹھنڈی کروں ۔ تمہارے بن کیسے جیئوں..؟ شہری! میرا وعدہ ہے کہ میں جیتے جی کبھی تمہارے پیار کی نگری کو تنہا نہ چھوڑوں گی ۔ میرا سارا جیون تمہارے پیار میں بیت جائے گا.. نینوں سے یوں ہی سدا برسات ہوتی رہے گی یہ آنکھیں تمہاری یاد میں یوں ہی دن رات برستی رہیں گی ۔ یہ آنکھیں مرتے دم تک تمہارا انتظار کریں گی ۔ جب تک دل کی دھڑکنیں قائم ہیں ۔ سانسوں کی ڈوری بندھی رہی گی اور زندگی کی ایک ہلکی سی امید بھی رہی تو اس وقت تک اس نادان بچارن کو اپنا منتظر پاؤ گے... یہ ہونٹ تمہارے ہی نام کی مالا جپیں گے... یہ دل سدا تمہارا متلاشی رہے گا۔

شہری..! قسمت کی بات ہے کسے معلوم ہے کہ یہ شوخ شریر ماسہا کی مسکراہٹ تو غم چھپانے کے لیے ایک پردہ ہے ۔ اندر سے تو یہ ٹوٹ کر بکھر چکی ہے کون جانتا ہے کہ ان مسکراتے چہروں کے پیچھے کتنی کہانیاں، تاریکیاں، ویرانیاں اور اداسیاں پنہاں ہیں ۔ ان اجلے چہروں کی زندگیاں کتنی تاریک اور بکھری ہیں ۔ یہ جو بہاروں کی منتظر نادان سی لڑکی ہے ۔ حقیقت میں بہاریں اس سے روٹھ چکی ہیں ۔ دل کے ارمان تڑپتے ہیں ۔ مگر ان کے مانند ہونے کی کچھ اس دل میں نہیں ہے ۔

شہری..! زندگی گزر جائے گی ۔ مگر ویران بے کیف اور تاریک سی! تمہارا سپنا جیون بھر نگاہوں میں جھلملاتا رہے گا ۔ آنکھوں کے من مندر میں تمہاری تصویر ہی اجاگر رہے گی ۔ حتیٰ کہ شمع کی مانند لمحہ بہ لمحہ پگھلتی ہوئی لرزتی کانپتی زندگی، ان ہی شعلوں میں جان دے دے گی ۔

مگر شہریار..! میری روح سدا تمہارے چار سو بھٹکتی رہے گی... بے قرار زندگی کو تمہارا تصور اجالا بن کر روشنی دکھلاتا رہے گا کہ مجھے اپنے جذبوں کی ... صداقت پر پورا بھروسہ ہے ۔

شہری...! زندگی کے کھیل بھی عجیب ہیں ۔ کبھی وفائیں.. کبھی جفائیں.. کبھی دھوپ کبھی چھاؤں.. کبھی بہار.. تو کبھی خزائیں ہر سو منڈلاتی رہتی ہیں ۔ زندگی کے ان بے کیف دنوں میں حواس پر چھائی تمہاری چاہت ہر لمحہ بے چین کیے رکھتی ہے ۔ تمہاری یادیں تڑپا تڑپا کر ہر احساس کو کچلتی رہتی ہیں ۔ کبھی کبھی بیتے لمحوں کی تلخی یاد کر کے میرا ذہن بھی تلخ ہونے لگتا ہے ۔ ایسے میں میرے دل سے درد کے ہزاروں طوفان نم آنکھوں کی صورت میں بہنے لگتے ہیں...

ہاں شہری..! میں تمہیں نہیں بھول سکتی ۔ تمہیں میری آنکھوں سے پیار کی صداقت آج بھی لرزتی ہوئی محسوس ہوگی... ہاں.. آؤ.. آج ان آنسوؤں کے سمندر میں اتر کر دیکھو جو تمہاری چاہ کے صلہ میں میرا مقدر بنے ہیں... ان آنسوؤں کی گہرائی میں تمہیں اپنا وجود ڈوبتا محسوس ہوگا ۔ پیار کے بیتے لمحے تمہیں آج بھی یاد ہوں گے.. تمہیں صدائیں دے رہے ہیں کہ شاید کسی صدا پر تم پلٹ کر دیکھو...

مگر آہ...! میری بے قرار صدائیں تم تک پہنچ پائیں... اپنی ہی صداؤں کی بازگشت میری سماعت سے ٹکرا کر اسے بہرہ کر دیتی ہے... کتنی اذیت دہ بات ہے... کہ کل تک وہ خوشیوں کا چمن تمہارے پیار کی مہک سے لبریز تھا ۔ آج اس میں خزاؤں کا ڈیرا ہے ۔ وہ وقت اور تقدیر کے بے درد طوفان کی نذر ہو کر رہ گیا ہے... میں لٹ چکی ہوں.. پارہ پارہ ہو چکی ہوں... میں سوچتی ہوں ۔ تمہاری محبت اپنے دل میں بسا کر میں نے جن خار دار راہوں کو چنا ہے ان کی اجڑی منزل لمحہ بہ لمحہ مجھے رلانے لگی ۔ میں تڑپتی رہوں گی ۔ مگر تمہیں میری اذیت کا اندازہ نہیں ہو سکے گا ۔ دھڑکتی ہوئی کیفیت اس وقت بھی خون کے آنسو رلانے پر مجبور کر رہی ہے ۔ تنہائی کے ویران لمحے میری آنکھوں سے گرتے ہوئے

آنسوؤں کا نظارا کرتے ہیں۔

ایک تم ہو۔ جو میرے دکھوں کی اذیت سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں مگن ہو۔ جب کبھی بھی تمہاری محبت کا طوفان میرے سینے میں ہلچل مچانے لگتا ہے تو لگتا ہے۔ ابھی یہ دل باہر ابل پڑے گا۔۔۔ میری بے اختیار چاہت کے بے اختیار جذبے مچل اٹھتے ہیں۔ میرے ضبط کا بندھن ٹوٹنے لگتا ہے۔ میرے سانسوں کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے بکھری بکھری۔۔۔ اکھڑی اکھڑی سانسوں کی لے پر تمہاری ہی محبت کا نام ابھرتا ہے۔۔۔ یہ پلکیں موندوں تو ان کے جھروکوں سے تمہاری چاہت کا ہی عکس جھلکتا ہے۔۔۔ دھڑکتا۔ تڑپتا۔ مچلتا دل تم ہی سے پیار کرنے پہ مجبور کرتا ہے۔ اور ایسے میں صبر کا پیمانہ چھلک پڑتا ہے۔۔۔ میں سسکنے لگتی ہوں۔۔

شہری۔۔۔ اس سے پہلے کہ میری حیات کا چراغ گل ہو جائے۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتی ہوں۔ وہ دن بھر کی قہر آلود دوپہریں۔۔۔ وہ شام کی گہری اور یخ بستہ ٹھٹھرتی سرد راتیں۔۔ وہ شب بھر کی ظلمتیں۔۔۔ دن بھر کی فرقتیں! جب میں ہر چیز سے بے نیاز تمہاری واپسی کی منتظر رہتی تھی۔۔ جب یہ دل امید و یاس [illegible] پہروں کے اذیت زدہ لمحات میں ڈوب جاتا تھا۔ تو میں کیسے ضبط کرتی تھی۔۔۔

شہری۔۔۔ ان حسین لمحوں کی یادیں آج بھی مجھے تڑپا رہی ہیں۔ سب کچھ وہی ہے۔۔۔ دنیا کی وہی رونق ہیں۔۔۔ بہاریں اب بھی آتی ہیں۔۔۔ مگر یہ کیا میرا دل بجھا بجھا سا ہے۔ میری آنکھیں جھلملاتی جا رہی ہیں۔۔۔ منتظر آنکھیں۔۔ بے قرار دل، دھڑکتی صدائیں کیوں؟ وہ کون ہے جس نے میرے دل کو ویران کر دیا۔ میرا سب کچھ چھین لیا۔۔۔ میری راتوں کی پرسکون نیندیں، دن کا چین۔۔۔ سکو سب کچھ غارت ہو گیا ہے۔ کیوں ایسا ہوا؟ لیکن میں کس کو الزام دوں۔۔۔ اپنی بے قراری کا عالم کس کو دکھاؤں کوئی نہیں ہے جسے دل کے درد سونپوں اور مجھے قرار میسر ہو جائے۔ کوئی پرسان حال نہیں۔۔ کوئی میرے درد کا درماں نہیں ہے۔۔۔ درد کے اس سفر میں تنہا رہ گئی ہوں۔ کہ برے وقت میں تو سایہ بھی دور ہو جاتا ہے۔۔۔ میری تنہائیاں چیخ چیخ کر مجھ سے اس بے بس اور دکھوں سے نڈھال زندگی کے بارے میں پوچھتی ہیں۔ مگر میں انہیں کیا جواب دوں کہ میری آنکھیں تو خود سوالی ہیں۔۔۔ بس سوچ کر ہی رہ جاتی

اپریل ۱۹۸۳ء

ہوں کس سے پوچھوں؟ قصوروار کسے ٹھہراؤں۔۔۔ تمہیں کہ جس کی محبت کو میں نے خود سے بڑھ کر جانا۔۔۔ جسے الفت کا سلطان لیا تھا۔ یا اس دل کو جسے میں نے اپنی ذات سے بڑھ کر تمہاری ذات پر اعتماد کرنے کا مشورہ دیا۔۔۔ تمہاری چاہ کی پرستش کی۔ یا پھر اس تقدیر کو جس نے لکھتے وقت محرومیوں کی داستان ہی میرے مقدر میں لکھی؟

شہریار۔۔۔ تم یوں اک ہوا کے جھونکے کی مانند میرے جیون سے نکل جاؤ گے میں نے تو کبھی ایسا سوچا بھی نہ تھا۔ میرے دل کے سونے چمن کو ویران کر کے تم بہاروں کے گلشن میں بڑھ گئے۔۔ میری زخمی زیست کو اور چکنا چور کر کے اپنی چاہت کی روشنی میں کسی اور کی زندگی آباد کر دو گے۔ میری محبت کی ڈوبتی ناؤ کو اپنی جھوٹی وفاؤں کا یقین دلا کر کسی اور کی ناؤ کنارے لگانے کی سوچو گے۔

میرے لیے تو اس کا تصور بھی محال تھا۔ میں اندھیاروں میں بھٹکی ہوئی وہ بے بس لڑکی ہوں۔ جسے روشنی کے خواب دکھا کر پھر تم نے گھٹا ٹوپ اندھیاروں میں دھکیل دیا۔ مجھے اتنا بتا دو کیا میری تاریک اور گھٹن سے لبریز زندگی کا سورج بھی کبھی خوشیوں کے افق پر ابھر سکے گا؟ میرے مقدر کی سیاہی بھی کبھی روشنی میں اجالے کی کرن بن کر ہر سو لہرائے گی۔۔؟ میں بھی زندگی کا حقیقی سکون پا لوں گی؟ میری زندگی یوں ہی ان ہی ویران رہگزاروں میں اور خاردار جھاڑیوں میں سسک سسک کر دم توڑ دے گی۔ خزاں کی نذر ہو جائے گی۔۔۔ سدا پیار کی متلاشی رہے گی۔ اور یوں ہی سسکتے تڑپتے روح جیسے اذیت ناک بندھن کے مضبوط پنجرے کی قید سے آزاد ہو کر دور کہیں اداس فضاؤں میں کھو جائے گی۔

دھیرے دھیرے یہ سرد اور ویران رات گزر رہی ہے اپنی بربادی اور بے بسی کی الم ناک کہانی لکھتے لکھتے قلم بھی تھرتھرا رہا ہے۔۔۔ یہ قصۂ غم جو لکھنے کو بیٹھتی ہوں تو قلم کی روانی میں بھی آنسوؤں کی نمی جلوہ گر نظر آتی ہے۔

اے پیار کرنے والو! میری یہ کہانی پڑھ کر اتنی سی خواہش پوری کر دینا کہ "اے دل والو پیار نہ کرنا اس میں مشکل جینا۔۔۔ مشکل مرنا۔" میری داستان سے سبق حاصل کرنا ورنہ تڑپنا، سسکنا۔ جلنا۔۔۔ سلگنا ہی تمہارا مقدر بن جائے گا۔۔۔

جواب عرض لاہور

تمہاری تصویر لمحہ بہ لمحہ ذہن کے پردوں پہ اجاگر ہو رہی ہے۔ وہی پروقار سی کشش سے بھرپور مسکراتی نگاہیں میرے نینوں کے سامنے جھلملا رہی ہیں۔ وہ پروقار شخصیت کے سامنے میں ڈول سی جاتی تھی۔ وہ معصوم چہرہ جس میں مجھے والہانہ پیار تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا اتنا تاریک بھی ہو سکتا ہے۔ عمر بھر ساتھ دینے کا وعدہ کرنے والے وعدوں سے پھر بھی سکتے ہیں مگر خواب بھی کبھی پورے ہوتے ہیں۔

شہریار! اس دکھوں بھری کہانی میں تمہیں یہ سب افسانوی باتیں لگیں گی۔ لیکن اپنے دل میں جھانک کر دیکھنا تو ہر لفظ سے خون رستا نظر آئے گا۔ وہ زخم جنہیں میں نے بڑی مشکل سے دل کے نہاں خانوں میں دفن کر دیا تھا آج ان کے کھنڈروں سے پھر لہو آنسو بن کر رسنے لگا ہے ...

سوچتی ہوں تم سے اچھے بلکہ انسانوں سے اچھے تو میرے یہ کاغذ ہیں۔ جو میرے تمام دکھوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کے باوجود میری بے بسی پر یہ نہیں کہتے کہ "آمد بوجھ ڈالو" ہرجائی تم نے پلٹ کر خبر ہی نہ لی ... کاش! تم اک بار یہ آ کر دیکھو لو کہ وہ پھول جو کھل کر بھی کھل نہ سکیں ان کی مہکار کیسے اڑ جاتی ہے ... اپنے دیئے گئے تحائف کا انجام تو دیکھ لو ...

شہریار ...! اس زندگی کے بوجھ کو سہنا اب محال ہو گیا ہے۔ اب شاید یہ زندگی وفا نہ کرے۔ بھلا یہ بیچاری بھی کب تک میرے غموں کا بوجھ سہارے ... زمانے کی اذیتوں ... تقدیر کے ستموں کو برداشت کرے۔ یہ زندگی جس کو میں زندگی نہیں سمجھتی ... اتنے دکھوں سے لبریز ہے کہ خوشی نام کی کوئی چیز اس کے قریب سے بھی نہیں پھٹکی ہے۔

میں اسے زندگی نہیں سمجھتی جو تم بن گزرے جس میں دکھ ہی دکھ ہوں۔ اب اس میں مایوسیوں اور تاریکیوں کے بادل اس قدر گہرے ہیں کہ روشنی کی ایک کرن بھی نظر نہیں آتی ... میں مرنا چاہتی ہوں۔ مگر اب تو موت بھی روٹھ چکی ہے۔ اب مجھے موت کا انتظار ہے۔ اور موت ہے کہ آنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

نجانے کب موت اپنے شفیق دامن میں مجھے بھی جگہ دے دے گی۔ خدا کرے اب جلد ہی موت آ جائے۔ اور مجھے سکون مل جائے کہ یہ ہی مجھے سکون دے سکتی ہے مجھے موت کا انتظار ہے صرف موت کا ...

اپریل ۱۹۸۳ء

دعا کرو جلد ہی یہ انتظار کی کٹھن گھڑیاں ختم ہو جائیں۔

شہری! اگر یہ داستان پڑھنے کے بعد کسی بھولی بسری ماریا کا تصور ذہن میں ابھرے تو اتنا کہنا ہے کہ زندگی کی دعا نہ دینا مجھے زندگی کی تمنا نہیں ...

زندگی تو انسان کی محرومیوں کا نام ہے۔ تڑپتے ارمان ... جلتی آرزوئیں اور دکھوں کا جام ہے۔ اور یہ سب کچھ بہت دیکھ لیا ... دیکھ لی دنیا ... اور زندگی کی حقیقتیں ... یہ زخم چھپا چھپا کر جینا اب محال ہو گیا ہے کہ ضبط کا اب یارا نہیں رہا۔ موت مجھ سے روٹھ کر بار بار زندگی کی سزا دے جاتی ہے کہ خدا بھی ہم بدنصیبوں کی نہیں سنتا۔ جب میں زندگی کی بازی ہی ہار چکی ہوں، تو زندہ رہنے سے کیا حاصل ...

مجھے معلوم ہے کہ ماضی کی ان اذیت ناک یادوں کی راکھ کریدنے سے کچھ حاصل نہیں مگر پھر بھی نجانے کیوں جی چاہتا ہے ... ماضی کے ان ہی ویرانوں میں بھٹک کر کھو جاؤں اور کوئی میرا نام بھی نہ پا سکے۔ آج پھر دل میں تمہاری محبت کے دیپ روشن کرنے کی تمنا کرنے پر دل مجبور کرتا ہے تمہارے چرنوں میں خلوص ... وفا اور عقیدت کے پھول نچھاور کرنے کی خواہش مچل اٹھی ہے۔

مگر آہ ... میری یہ انجان سی تمنا ناکام ہو گئی ہے کہ یہ سب کچھ کس امید پر کروں ... لمحے ساکت و جامد ہو گئے ہیں ... دیرینہ ملن کی تمنا ... دھڑکنیں ٹھہر چکی ہیں۔ اور ایسے میں میری اکھڑی سانسیں تمہیں پکارنے لگی ہیں ... دل تمہارے پیار کی لے پہ مچل اٹھا ہے اور لب بے اختیار یہ کہہ اٹھے ہیں۔

یہ کس نے آ کر صدا دی ہے کہ
گلاب سارے مہک گئے ہیں

:: . :: . :: . :: . :: . :: . ::

- ماں کے بغیر گھر قبرستان کی طرح لگتا ہے۔
- اگر مجھ کو ماں سے چھین لیا جائے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔
- دنیا کی حسین ترین شے ماں اور صرف ماں ہے۔

(مرسلہ: محمد رفیق، جدہ)

جواب عرض لاہور

تحریر: نگہت حنا ملتان

محترم شہزادہ عالمگیر صاحب!

سلام خلوص... جواب عرض کی اس محفل میں عرصہ دراز بعد اپنی ایک حسین مگر پہلی کاوش لے کر حاضر ہو رہی ہوں۔ امید ہے یہ آپ کے معیار پر ضرور پوری اترے گی... اس کی سچائی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ سچائی سچائی ہی ہوتی ہے، تاہم میں نے کہانی کے ہر لفظ کو حقیقت کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے اگر میری قلم کہیں بھول کی گئی ہو تو اسے سنوار دے دیجئے گا... مگر دیکھئے خدارا میرا دل نہ توڑ دیجئے گا کہ میں بے حد حساس واقع ہوئی ہوں۔ امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے...

شہزادہ صاحب! میں اپنی اس پہلی کاوش کو اپنی بے حد پیاری دوست فرزانہ تبسم کے نام کرتی ہوں جنہوں نے اس کہانی کو لکھا دینے میں میری مدد کی ہے اور اپنی بہن عزالہ بتول کا شکریہ ادا کرتی ہوں جس نے مجھے یہ کہانی لکھنے کی ترغیب دی... آپ کی حوصلہ افزائی یقیناً ہم سب کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگی۔ میں نے ایک طویل حقیقت کو بڑے اختصار سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے امید ہے قارئین بھی اسے پسند کریں گے۔ تاہم میں نے تمام کرداروں اور مقامات کے نام تبدیل کر دیئے ہیں، ان سے کسی کی مطابقت محض اتفاقیہ ہوگی۔ میری گزارش ہے کہ اسے کسی قریب ترین اشاعت میں جگہ دے کر شکریہ کا موقعہ دیں۔

آخر میں اپنی اس کاوش کے بارے میں قارئین کی آراء جواب عرض کے کالم آئینہ روبرو میں پڑھنا زیادہ پسند کروں گی اس لیے اپنا مکمل ایڈریس نہیں دے رہی... ساتھ ہی ساتھ میری دلی دعا ہے کہ یہ جواب عرض دن رات ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے....

آپ کی خلوص کیش....

نگہت حنا معرفت
جواب عرض ۷۷ نسبت روڈ۔ لاہور

اسلام پورہ میں قاضی واحد کی دولت کی اتنی زیادہ شہرت تھی کہ تمام لوگ جیسے صرف قاضی صاحب کی دولت پر ہی زندہ ہوں۔ وہ بے حد رحم دل اور ملنسار انسان تھے۔ خداوند کریم نے انہیں ہزاروں خوبیوں سے نواز رکھا تھا۔ اور سب سے بڑی عنایت یہ کہ قاضی واحد کی بیوی سنگ مرمر کا نازک سا مجسمہ تھی۔ اتنی خوب صورت کہ کوئی انسان خواہ کتنا ہی اداس اور غمگین ہوتا، اس کی ایک جھلک دیکھ لینے سے اس کے تمام دکھ درد دور ہو جاتے۔ اور تب وہ اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر احساس دلاتا کہ واقعی یہ کوئی عورت ہے یا کہ آسمانی حور... اور واقعی خدا نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی... قاضی واحد اپنی اس خوش نصیبی پر ناز کرتا۔ اپنی دولت اس طرح بیوی پر لٹاتا کہ جیسے اگر اس کی ذرا سی خواہش بھی پوری ہونے سے رہ گئی، تو کانچ کی یہ گڑیا ٹوٹ جائے گی... بس یوں سمجھیں کہ اگر وہ زندہ تھا تو صرف اپنی بیوی کو دیکھ کر...

شادی کے دو سال بعد خدا نے انہیں چاند سے حسین، گلاب کی طرح شگفتہ گول مٹول سی بیٹی عطا فرمائی... بس خمار کیا پیدا ہوئی جیسے روپیہ پیسہ پانی کی طرح تقسیم ہونے لگا... غریبوں میں بے اندازہ خیرات بانٹی جانے لگی اور قاضی صاحب نے خمار کو کمرے میں کچھ اس طرح سے بند کر دیا کہ جیسے اگر کسی نے اسے چھو لیا تو وہ میلی پڑ جائے گی... اس پر داغ پڑ جائیں گے... بے شمار لوگ ان کی بچی کو پیار سے دیکھنے کے لیے آتے مگر دونوں میاں بیوی کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال جاتے...

جس گھر میں دولت کی ریل پیل ہو... خوبصورت بیوی ہو اور پیاری سی بیٹی ہو، اس گھر پر جنت کا سا ماحول و گمان ہوتا ہے... ہر طرف بہاریں، خوشیاں ہی خوشیاں۔ قاضی صاحب اور بیگم ہر سمے اپنی بیٹی کو دیکھتے رہتے اور پھر ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر خوب ہی خوش ہو دیتے... ایسے میں ان کے گھر خوشیوں کے شادیانے گونجنے لگتے...

ایک روز دونوں میاں بیوی بیٹھے اپنی بیٹی عمار سے باتیں کر رہے تھے کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ صاحب جی! کوئی آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے اور وہ رو بھی رہا ہے...

قاضی صاحب رحمدل تو تھے ہی مگر اس آدمی کا یوں آنا انہیں بے تاب کر گیا۔ وہ جلدی سے اٹھے اور ملازم کے ساتھ باہر آ گئے۔ گیٹ پر ایک ۱۲ سالہ نوجوان سر نیچے کیے رو رہا تھا۔ قاضی صاحب اس کے قریب گئے اور سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:

"بیٹے تم کون ہو اور یوں کیوں رو رہے ہو؟"

وہ لڑکا ذرا سی ہمدردی پاتے ہی اور زور زور سے رونے لگا... "ارے بیٹا، مجھے بتاؤ تو سہی بات کیا ہے، شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں"... قاضی واجد مزید نرم لہجے میں بولے

تب بڑی مشکل سے وہ لڑکا بولا۔ "قاضی صاحب میری ماں کو بچا لیں، وہی میرا واحد سہارا ہے اور اب بستر پر پڑی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ میرے پاس تو اب اس کی دوا کے لیے بھی کوئی پیسہ نہیں رہا کہ ان کا علاج کروا سکوں..." یہ کہتے ہوئے وہ سسکیاں بھرنے لگا۔

قاضی واجد نے اپنی جیب سے فوراً کچھ رقم نکال کر پاس کھڑے اپنے ملازم کو دی اور اسے ہدایت کی کہ اس بچے کے ساتھ جاؤ اور ڈاکٹر کو بلا کر بڑی اچھی طرح اس کی والدہ کا علاج کرواؤ..." اس لڑکے نے تشکر بھری نظروں سے قاضی کی طرف دیکھا اور ان کا شکریہ ادا کرنے لگا... "ارے نہیں نہیں بیٹا، تم بھی میرے بیٹے برابر ہو... جاؤ جا کر تسلی سے اپنی ماں کا علاج کراؤ، اگر مزید پیسوں کی ضرورت پڑے تو بلا جھجک آجانا۔"

اور وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے چلا گیا۔ کافی عرصہ گزر گیا مگر وہ لڑکا نہ آیا... ایک صبح قاضی واجد اپنی کوٹھی کے لان میں بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے اور بیگم واجد، عمار کو گود میں لیے پیار کی پیاری باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک پیچھے سے کسی نے آواز دی... قاضی صاحب نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو مسکرا دیے۔ وہ اسی دن والا لڑکا تھا... وہ اب مطمئن نظر آ رہا تھا، اور اس کی آنکھیں عقیدت سے جھکی ہوئی تھیں۔

"ارے بیٹے، خیر تو ہے"... قاضی واجد نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جی صاحب جی... میری ماں بچ گئی ہے اور اب وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہی ہیں..." شدتِ جذبات سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

بیگم واجد نے اسے بڑی ستائشی نظر سے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئیں۔ صحت مند سا لڑکا بڑے تیکھے پرکشش سے نقوش، جو یک لخت انسان کو اپنی طرف متوجہ کر لیں... اس کی بڑی سیاہ آنکھیں بڑی ہی پرکشش لگ رہی تھیں۔ بیگم سوالیہ دیکھنے پا کر قاضی صاحب فوراً بولے:

"یہ وہی لڑکا ہے جس کا ذکر اس دن میں نے تم سے کیا تھا"...

"اوہ اچھا اچھا... جی کیسی ہیں اب تمہاری ماں"۔ بیگم واجد نے براہِ راست اس سے پوچھا۔

"جی شکر ہے اللہ تعالیٰ کا، وہ اب پہلے سے بہت بہتر ہو رہی ہیں"...

"تمہارا نام کیا ہے بیٹے" قاضی صاحب نے پوچھا۔

"جی میرا نام حسن ہے"... وہ نہایت مہذب انداز میں بولا۔

"تم کہاں رہتے ہو"... اس بار بیگم واجد نے اس سے پوچھا...

کہ ہم غریبوں کا کہاں ٹھکانہ... بس ایک جھونپڑی ہے سر چھپانے کو، وہیں رہ رہے ہیں۔ میں لکڑیاں کاٹتا ہوں اور یوں گزر بسر ہو جاتی ہے۔ میرے باپ کو فوت ہوئے کافی عرصہ گزر چکا ہے"...

"تم کچھ لکھنا پڑھنا بھی جانتے ہو"... بیگم واجد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دوبارہ اس سے پوچھا، تو وہ بولا:

"جی میں اسکول میں صرف آٹھ جماعت تک ہی پڑھ سکا ہوں۔ ویسے میرا ہاتھ بہت اچھا ہے"...

"اچھا بھئی میرا بھی کوئی بیٹا نہیں ہے، اگر تم پسند کرو تو جا کر اپنی ماں کو بھی لے آؤ اور یہیں میرے پاس رہو، میں اپنے آفس میں تمہیں کوئی نہ کوئی کام دے دوں گا... انشاء اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو بھی یہاں پر کوئی تکلیف نہیں ہوگی"...

"قاضی صاحب"... وہ حیران ہوتا ہوا بولا

"ہاں حسن بیٹے... تم فکر مت کرو... یہاں تم بیٹوں کی طرح رہو گے۔ اور پھر... انہوں نے اپنا فقرہ ادھورا چھوڑ کر کہا "اچھا جاؤ تم گھبراؤ نہیں"۔

اس کے چلے جانے کے بعد بیگم واجد فوراً بولیں...

واجد آپ نے دیکھا کہ یہ لڑکا کچھ جانا پہچانا سا لگتا ہے"۔

"ہاں بیگم تم نے درست کہا۔ اس کی شکل ذیشان بیٹے سے ملتی ہے، اسی لیے تو یہ لڑکا مجھے اچھا لگا ہے"

وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولے۔

ذیشان، ان کا بھتیجا، قاضی واجد کا بیٹا جو کہ پچھلے سال ہوائی جہاز کریش ہونے کی وجہ سے موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔۔ ذیشان جو کہ نوجوان، خوبرو تھا، کتنے دوست تھے سب لوگ"...

"کیا بات ہے واجد آپ..."؟

"آں... ہاں، کچھ نہیں... بس ذرا ذیشان یاد آ گیا تھا"۔ وہ آنکھوں میں نمی چھپاتے ہوئے بولے اور بیگم واجد بھی اداس ہو گئیں۔

حسن اپنی ماں کو لے کر آیا تو ان کو دو کمرے، ایک کچن اور باتھ روم پر مشتمل ایک چھوٹا سا کوارٹر دے دیا گیا۔۔

حسن کی ماں زرینہ بہت اچھی خاتون تھیں۔ بیگم واجد چاہتی تھیں کتنا ہی روکتیں مگر وہ روزانہ گھر کا کوئی نہ کوئی کام کر دیتیں۔۔ حالانکہ ملازموں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ قاضی واجد حسن کو تو بالکل اپنے بیٹے کی طرح چاہتے۔ ہر وقت اس کی خیریت دریافت کرتے رہتے، اسے جس چیز کی ضرورت ہوتی، فوراً مہیا کر دیتے، حالانکہ انہوں نے حسن کو اپنے آفس میں اچھے خاصے عہدے پر لگا دیا تھا لیکن پھر بھی اس کے انکار کے باوجود کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے...

حسن ایک خوب صورت، تیکھے نقوش، دراز قد، صحت مند جسم اور شرافت و وجاہت کا مکمل نمونہ تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ بیگم واجد حسن پر کچھ زیادہ ہی مہربانیاں کرنے لگی تھیں۔ جب کبھی قاضی واجد شہر سے باہر جاتے تو وہ حسن کو بلا کر اس سے عجیب و غریب باتیں کرتیں، جنہیں سن کر کبھی تو حسن بالکل ہی گھبرا جاتا اور کبھی اسے زبردستی مسکرانا پڑتا... اصل میں بات تھی کہ بیگم واجد نے قاضی واجد کی دولت کے پیش نظر اس سے شادی کی تھی، جبکہ وہ اسے دل سے بالکل پسند نہیں کرتی تھی... حالانکہ وہ قبول صورت تھے۔

یونہی دن رات گزرتے چلے گئے... مہینوں کے سال بنتے چلے گئے۔ اب ثمارا اسکول میں داخل ہو گئی تھی۔ وہ بے حد پیاری سی کسی مصور کا حسین شاہکار دکھائی دیتی تھی... سفید یونیفارم میں تو وہ اور بھی سندر لگتی تھی۔ پورا اسکول اور سارے اساتذہ اس کو پیار کرتے تھے، وہ ذہین بھی بے حد تھی...

ایک صبح حسن کی ماں زرینہ کو دل کا دورہ پڑا اور پھر وہ آنکھیں نہ کھول سکیں۔ حسن کے لیے یہ سانحہ کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ اس کا واحد سہارا چھن چکا تھا، ماں کی لاش سے لپٹ کر اس قدر رویا کہ دیکھنے والوں کی بھی بے اختیار چیخیں نکل گئیں۔ اس دن قاضی صاحب گھر پہ نہ تھے۔ اس وقت بیگم واجد نے آ کر حسن کو اس کی ماں کی لاش سے الگ کیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں لے گئیں...

"بیگم صاحبہ میں لٹ گیا ہوں، میں بے سہارا ہو گیا ہوں"۔ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولا "میں... میں اب زندہ نہیں رہ سکوں گا"۔ وہ جذباتی ہو گیا۔

حسن تمہیں زندہ رہنا ہے... کسی کی خاطر نہیں تو میری خاطر... میں تمہیں سہارا دوں گی۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہ ہوگی! وہ بڑے پیار سے پیاپانہ اس کے ہاتھ پہ رکھ کے بولیں۔

"اوہ بیگم صاحبہ... آپ کتنی اچھی ہیں"۔ اس نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔

"مگر اب آپ مجھے بیگم صاحبہ نہیں، بلکہ میرا نام حسنہ سے پکارا کریں" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا... کیا کہا..."۔ وہ انہیں حیرانی سے تکنے لگا۔

"ہاں حسن... میں تمہیں پسند کرتی ہوں"۔ وہ اپنی حیثیت کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں... "میں تمہیں بے تحاشہ چاہتی ہوں حسن، اور عنقریب ہی تم سے شادی کر لوں گی"۔ اس نے بڑے آرام سے کہہ دیا۔

"جی... جی... جی... جی... بی بی جی"

وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا... یہ آج بیگم صاحبہ کو کیا ہو گیا ہے... اس نے بڑے غور سے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا۔ واقعی وہ بے حد خوب صورت اور چاہے جانے کے قابل تھیں۔ مگر جلد ہی اس نے اپنا ان لغو سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔

"حسن تمہیں میری بات ماننا پڑے گی..."۔ بیگم واجد نے زور دے کر کہا۔

"بیگم صاحبہ... میں..."۔

مگر انہوں نے اس کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا:

"اوں ہوں... بیگم صاحبہ نہیں... صرف حسنہ کہو..."

"حسنہ بی بی آپ... قاضی صاحب... یہ سب کیا ہے..." وہ اپنا فقرہ صحیح طور پر ادا نہ کر سکا۔

"تم چھوڑو، ان باتوں کو، بس جو میں کہوں گی تم وہی کرو گے"... بیگم واجد بولیں۔

...

"مگر مگر کچھ نہیں... بس آگے مت کچھ کہنا ورنہ میں بکھر جاؤں گی"...

"مگر قاضی جی..."

"اس کا بندوبست میں خود کر لوں گی ڈارلنگ، تم چھوڑو ان باتوں کو"...

"خدایا حسنہ بی بی کو کیا..."

"بس اب چپ ہو جاؤ..."

دوسرے دن قاضی واجد آ گئے اور اپنے ساتھ ڈھیروں تحفے لائے تھے۔ آتے ہی انہوں نے عمارہ کو پکارنا شروع کر دیا... عمارہ جو اب چار سال کی تھی، بھاگتی ہوئی آئی اور ان سے لپٹ گئی...

"اوہ میری زندگی... میری جان عمارہ... تم آ گئیں"۔ انہوں نے آنکھوں میں محبت کے ہزاروں دیپ روشن کیے اسے اپنی گود میں اٹھا لیا اور یوں اسے اپنے سینے سے لگا لیا کہ جیسے کل کے نہیں بلکہ سالوں سے بچھڑے ہوں۔

"پاپا جانی... ہمارے لیے کیا لائے ہیں"۔ وہ معصومیت سے پلکیں جھپکتے ہوئے بولی۔

"تمہارا قاضی کہاں ہیں بیٹا..."۔

"وہ... وہ انکل حسن کے ساتھ گئی ہیں... سچ پاپا مجھے تو یہ انکل حسن زہر لگتے ہیں..." وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

قاضی واجد اس کا چہرہ دیکھ کر ہنس دیئے۔ "نہیں بیٹا نہیں... وہ بھی اب ہمارا بیٹا ہے اور بے چارہ ماں کے سہارے ہی تو زندہ ہے"...

"ارے پاپا... آپ کو پتہ نہیں کہ کل آنٹی زرینہ اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں..."۔

"کیا کہا..."؟ وہ حیرت سے اچھل پڑے۔

"جی صاحب جی... کل بی بی زرینہ کا انتقال ہو چکا ہے"۔ قریب ہی صفائی کرتے ہوئے ملازم نے کہا۔

"اوہ مائی گاڈ... افسوس ناک خبر ہے یہ تو... واقعی اب حسن کی تمام تر ذمہ داری ہم پر آن پڑی ہے"۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔

"اچھا پاپا جان میرے تحفے..."

"اوہ.. وہ تو میں بھول ہی گیا"۔ یہ کہتے ہوئے قاضی واجد نے ڈھیروں ریڈی میڈ فراک، بہت سارے کھلونے اور چاکلیٹ کے ڈبے ثمار کے آگے ڈھیر کر دیئے اور ثمار تو خوشی کے مارے کبھی ایک پیکٹ اور کبھی دوسری چیز کو چھونے لگی۔

"پاپا... آپ کتنے سویٹ ہیں"۔ یہ کہتے ہوئے وہ قاضی واجد سے لپٹ گئی اور قاضی واجد نے اس کے پھول ایسے نرم و نازک گالوں پر شفقت پدری کے نشان لگا دیئے۔

ابھی وہ ثمار سے باتیں کر ہی رہے تھے کہ حسن اور بیگم واجد اندر داخل ہوئے۔ قاضی صاحب نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا تو حیرت سے ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ حسن نے قیمتی کپڑے کی پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس لباس میں وہ بہت ہی ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی انجانی خوشی سے چمک رہی تھیں اور بیگم واجد جو کبھی میک اپ نہیں کرتی تھیں، فل میک اپ کیے ہوئے، قیمتی ساڑھی میں ملبوس بڑا غضب ڈھا رہی تھیں۔ ان کے چہرے سے بھی خوشی کے فوارے پھوٹ رہے تھے... قاضی صاحب بے چارے یہ سوچنے لگے کہ شاید حسن کی ماں کی موت کے غم کو دور کرنے کی خاطر ان کی بیگم نے ایسا کیا ہے... یہ سوچتے ہی وہ فوراً شک و شبے کے خول سے باہر نکل آئے... انہیں کیا علم تھا کہ یہ سب ان کے خلاف چکر چلایا جا رہا ہے... ان کے لیے ایک جال بچھایا جا رہا ہے...

"واجد... کیسی لگ رہی ہوں آپ کو میں"۔ بیگم واجد بڑی ادا سے ساڑھی کا پلو درست کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہوئیں۔

"اگر چاند کا خطاب دوں گا تو چاند میں داغ ہوتا ہے... سورج سے تشبیہ دوں گا تو اس میں تپش ہوتی ہے اور... اور اگر پھول سے"۔

"بس بس جانم... اتنی زیادہ تعریف بھی نہ کرو کہ میں شرم کے مارے کملا ہی نہ جاؤں"۔ وہ ہنسی اور پھر ان کے ساتھ ہی وہاں موجود سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے...

اور پھر یوں ہونے لگا کہ قاضی واجد جب بھی کبھی کسی کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جاتے تو حسن اور قاضی واجد کی عیدیں ہو جاتیں... وہ دونوں اب ایک دوسرے سے بہت بے تکلف ہو چکے تھے... ثمار اسکول چلی جاتی اور جب واپس آتی تو بیگم واجد فوراً اسے اس کے کمرے میں آرام کرنے کا مشورہ دیتیں اور یا پھر اسے اس کی دوست شبنم کے گھر جانے کا مشورہ دے دیتیں۔ ثمار بھی اب اکثر اپنے ننھے سے ذہن میں سوچتی رہتی کہ نہ جانے ممی میں یہ کیسی تبدیلی آ گئی ہے کہ پہلے تو کسی کے گھر نہ جانے دیا کرتی تھیں اور اب مجھے گھر میں ٹکنے نہیں دیتیں... سوچ سوچ کر وہ اپنے ذہن کو جھٹک دیتی اور کھیلنے میں لگ جاتی...

یوں وقت اپنی تیز رفتاری سے گزرتا رہا۔ سال پہ سال گزرتے رہے... ثمار بھی اب اسکول سے نکل کر کالج پہنچ چکی تھی...

ایک صبح قاضی صاحب آفس جاتے ہوئے اپنا بریف کیس گھر ہی بھول گئے۔ وہ لینے کے لیے گھر واپس آئے تو حسن اور بیگم واجد ڈرائنگ روم میں بیٹھے کسی بات پر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ قاضی صاحب نے اتنی اونچی ہنسنے کی آواز سنی تو وہ سیدھے ڈرائنگ روم میں ہی چلے آئے... قاضی صاحب کو یوں اچانک گھر میں دیکھ کر وہ یوں گھبرا گئے کہ جیسے ان کی چوری پکڑی گئی ہو... بیگم واجد تو فوراً سنبھل گئیں... مگر حسن پسینے میں شرابور ہو چکا تھا...

"یہ کیا مذاق ہے...؟" قاضی صاحب حسن کی طرف دیکھ کر غصے اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے بولے۔

"اوہ مائی ڈارلنگ... مذاق کیا جانی"۔ بیگم واجد نے دخل اندازی کی "آپ چلے گئے تو میں نے حسن کو بلا لیا، تاکہ بوریت کو دور کیا جا سکے۔ ویسے حسن ہے بڑا مزاحیہ اور زندہ دل انسان"۔ وہ بڑی ہی مکاری سے بولیں...

اپریل ۲۰۰۳ء

قاضی واجد اگرچہ ایک عقل مند اور سمجھ دار انسان تھے۔ بیگم واجد کی ترکیبوں سے پیچھے کا سارا چکر رہ جاتے تھے مگر کسی مصلحت کی بنا پر وہ خاموش ہو گئے۔

"میں اپنا بریف کیس بھول گیا تھا، وہ لینے آ گیا ہوں۔۔۔ شاید آپ کی محفل میں مخل ہوا ہوں۔ وہ طنزیہ مسکراہٹ اپنے لبوں پہ لاتے ہوئے بولے۔

وہ چلے گئے تو بیگم واجد نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے حسن سے کہا۔۔۔"ہونہہ۔۔۔ نہ جانے اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔۔۔ جان اب اس کا بھی کوئی انتظام کرنا ہی پڑے گا، ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔۔۔ مجھے تو اس بات کا ڈر ہے کہ کہیں وہ تمہیں یہاں سے نکلوا ہی نہ دیں۔" وہ پریشان ہو رہی تھیں۔۔

"ہاں میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔۔۔ مگر میرے خیال میں ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا پڑے گا۔ جلد بازی بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔"۔

پھر کافی دیر تک وہ دونوں آپس میں بات چیت کرتے رہے۔۔۔ منصوبے بناتے رہے اور پھر قاضی واجد کے گھر آنے کے وقت پر جدا ہو گئے۔۔۔

رات کو بیگم واجد پریشانی کی وجہ سے کروٹ پر کروٹ بدلتی رہیں۔ ذہن و دماغ ماؤف ہو چکے تھے۔۔۔ وہ بے چین سی ہوتی گئیں۔۔

"کیا بات ہے بیگم۔۔۔ بہت پریشان دکھائی دے رہی ہو"۔۔ قاضی واجد کے لہجے میں بلا کا طنز تھا مگر بیگم واجد اسے محسوس نہ کر سکیں۔

"نہیں۔۔۔ نہیں بھلا میں اور آپ کے ہوتے ہوئے پریشان ہاں۔۔"۔ وہ بڑی ادا سے اپنی حالت کو بدلتے ہوئے بولیں اور بھولے قاضی صاحب ان کی بات سن کر مطمئن ہو گئے۔۔۔ یہ سوچے بغیر نہ ان کی حسین بیوی کی نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔

اُدھر حسن بھی تمام رات اپنے کمرے میں بے چینی کے عالم میں ٹہلتا رہا اور آخر تھک ہار کر سو گیا۔ مگر بیگم واجد اپنے طور پر ایک اہم فیصلہ کر چکی تھیں۔ اور اس کے بعد وہ سکون کی نیند سو گئی تھیں۔۔۔

صبح جب قاضی صاحب آفس چلے گئے تو وہ دونوں بے چینی سے برآمدے میں آ گئے۔۔۔

"پریشان ہو، کیا بات ہے۔۔۔"؟ بیگم واجد یوں مسکرا رہی تھیں، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔۔۔

"میں سنجیدہ ہوں جانی۔۔"۔ وہ جھنجھلا گیا۔

"اگر تم واقعی سنجیدہ ہو تو چلو بیڈ روم میں چل کر گفتگو کرتے ہیں۔۔۔ ہاں چلو نا، میں سب کچھ حل کر چکی ہوں۔" بیگم واجد شوخی سے بولیں۔

مگر حسن کی پریشانی کم نہ ہوئی، کیونکہ وہ بیگم واجد کی محبت میں اس قدر ڈوب چکا تھا کہ خود ہوش سے بیگانہ ہو گیا تھا۔۔۔

"ادھر آؤ حسن جانی، ادھر آ کر بیٹھو۔" اس نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حسن سے کہا۔ "آخر ہوا کیا ہے، جو تم اس قدر پریشان دکھائی دے رہے ہو، مجھے بھی تو پتہ چلے۔"۔ مگر حسن ابھی تک پریشان تھا۔

"جان ذرا غور سے سننا۔ ہم اس طرح کرتے ہیں کہ قاضی صاحب جب کالج سے لوٹے گی تو اسے دودھ میں نیند کی گولیاں ڈال کر دے دیں گے، اس طرح وہ گہری نیند سو جائے گی۔۔۔ اور پھر جب چار بجے قاضی واجد دفتر سے لوٹیں گے اور سیدھے اپنے کمرے میں جائیں گے تو ہم دونوں مل کر اس کا کام تمام کر دیں گے"۔۔

"کیا۔۔۔ کیا۔۔۔"؟ یہ سنتے ہی حسن کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں

"بزدل مت بنو حسن۔۔۔ تم مرد ہو کر اتنی بزدلی دکھا رہے ہو اور میں ایک ناتواں عورت ہوں، اور پھر ہم ملیں گے کیسے"؟ بیگم واجد نے حسن کو بھڑکانے کے لیے فقرہ چست کیا۔

حسن نے ایک نظر بیگم واجد پر ڈالی۔ اس کا خوبصورت جسم شعلہ فشاں بنا ہوا تھا۔ اور پھر حسن صورت سے حال میں آ ہی گیا۔ اور گھبراتے ہوئے بولا۔ "مگر ہم دونوں کیسے اس طرح کر سکیں گے۔۔۔ یہ جو گھر میں درجنوں ملازم موجود ہیں"۔۔

"جانی اس کا بھی بندوبست کر لیتے ہیں نا"۔ اس نے

تسلی دیتے ہوئے ۔۔" میں ابھی تمام ملازموں کو کہہ دیتی ہوں کہ ہم سب لوگ بعد قاضی صاحب کراچی میں شادی پہ جا رہے ہیں، اس لیے تم سب دو دن کی چھٹی پہ چلے جاؤ۔۔۔ کیوں کیسا ہے ؟"

" واہ واہ ۔۔۔ کیا خوب پلان ترتیب دیا ہے، تم تو مکمل چار سو بیس نکلیں" حسن پہلی مرتبہ ہنسا ۔

" چلو ایڈجسٹ ۔۔۔ یہ سب صرف تمہارے لیے ہی تو کر رہی ہوں جان من ۔"۔

عمار کے کالج سے لوٹنے میں ابھی کوئی دو گھنٹے باقی تھے ۔ بیگم واحد نے تمام نوکروں کو مطمئن کر کے چھٹی پر بھیج دیا۔ البتہ اپنے چار خاص جاسوس نوکروں کو نہ جانے دیا۔ تاکہ وہ باہر سے آنے والوں کا پہرہ دے سکیں۔ تمام انتظامات مکمل کر لینے کے بعد اب وہ عمار کا انتظار کر رہے تھے۔۔۔ آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں گاڑی رکی اور عمار آگیا۔ حسن اور ممی دونوں کو لان میں بیٹھے دیکھ کر وہیں آگئی :

" ہیلو ممی ۔۔۔ ہائے انکل ۔۔" وہ بڑی خوش دلی سے مسکراتی ہوئی قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی ۔ بیگم واحد نے ایک نظر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا ۔ وہ سفید شلوار قمیص اور سفید ہی دوپٹے میں تقدس اور پاکیزگی کا شاہکار لگ رہی تھی ۔ سیاہ لمبے بالوں کا بڑا پیارا سا ایک سائیڈ پر جوڑا بنا ہوا بہت ہی جچ رہا تھا ۔ ایسے جیسے کسی مصور نے سنگ مرمر کا نازک سا مجسمہ تیار کیا ہو۔"

" ممی ۔ کہیں آج اپنی بیٹی کو نظر لگانے کا ارادہ تو نہیں ہے"۔۔۔ وہ شوخی سے بولی ۔

" آج تک آپ کی ممی کو کسی کی نظر نہیں لگ سکی تو پھر بھلا آپ کو کیسے لگ سکتی ہے بے بی ۔۔" حسن نے بڑے ہی پیار سے بیگم واحد کی طرف دیکھتے ہوئے عمار سے کہا ۔

" اچھا چلو آرام کرو جان، تم تھک گئی ہو گی ۔ کھانا تمہارے کمرے میں ٹیبل پر رکھا ہوا ہے ۔ اگر ٹھنڈا ہو گیا ہو تو گرم کروا لینا ۔"۔ بیگم واحد نے بڑے پیار سے عمار سے کہا ۔۔

" ہاں ممی واقعی، آج تھک بھی گئی ہوں اور بھوک بھی بڑے زوروں کی لگی ہوئی ہے ۔" ۔ وہ سیدھی اٹھ کر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی ۔۔

تھوڑی دیر بعد بیگم واحد نے دودھ میں نشہ آور گولی ملائی اور ملازم کے ہاتھ عمار کے لیے بھیج دیا۔۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دودھ پی کر بیگم واحد کے پاس ان کے کمرے میں آگئی ۔۔۔

" ارے ممی ! آج دودھ بڑا بدذائقہ تھا شاید اس لیے کہ آج آپ کے پیارے پیارے ہاتھوں سے نہیں پیا نا ں ۔"۔ یہ کہتے ہوئے عمار نے اپنے دونوں ہاتھ تھام لیے اور بیگم واحد کانپ کر رہ گئیں ۔ مگر حسن کا خیال آتے ہی وہ پھر سے پہلے والی بیگم واحد بن گئیں اور اس سے بولیں :

" اچھا جاؤ تم اپنے کمرے میں آرام کرو، میں بھی تھوڑی دیر آرام کر لوں ۔۔۔ ابھی تمہارے ابو آ جائیں گے تو پھر جاگنا پڑے گا ۔۔"۔ اس لیے کہ وہ جلد از جلد عمار کو وہاں سے ہٹانا چاہتی تھیں ۔

کوئی ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد حسن بھی آگیا ۔ اس کے آتے ہی بیگم واحد جلدی سے بولیں :

" لے آئے کیا ۔۔"؟

" ہاں دیکھو ۔۔"۔ اس نے تین چار تیز تیز دھار والے اوزار انہیں دکھائے جنہیں دیکھ کر جھرجھری سی آنے لگی تھی ۔ اب قاضی صاحب کے آنے میں صرف پانچ منٹ رہ گئے تھے اس لیے کہ وہ ٹھیک وقت پر گھر آ جاتے تھے ۔ ایسے لگتا تھا کہ جیسے وقت گزرنے کا نام ہی نہ لے رہا ہو ۔ اور ایسا انتظار تو ہوتا ہی جان لیوا ہے ۔ اور پھر آخر انتظار کی گھڑیاں ختم ہو گئیں ۔ شاید وہ قاضی واحد کی کار کا ہارن ہی تھا ۔ ویسے احتیاطاً حسن ایک مرتبہ عمار کو جا کر دیکھ آیا تھا ۔۔۔ وہ نشہ میں غنودگی کی نیند سو رہی تھی ۔ اور وہ چاروں نوکر جاسوس چھپے بیٹھے تھے تاکہ کسی کو شک نہ گزرے ۔۔۔

قاضی واحد سیدھے اپنے کمرے میں گئے ۔ قدموں کی چاپ پر دونوں ہوشیار ہو گئے ۔ جب قاضی صاحب

جمالہ رحمٰن لاہور

اپنے کمرے کے اندر داخل ہوئے تو سامنے ہی بیگم واجد بیٹھی تھیں۔ قاضی صاحب کے ہاتھ میں ایک سرخ رنگ کا ڈبہ تھا، آتے ہی وہ بولے:

"دیکھو جان آج میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے ڈبہ کھولا تو اس میں ہیروں جڑا بھاری سا سیٹ چمک رہا تھا۔ جسے دیکھ کر آنکھیں چندھیا رہی تھیں ... یہ سیٹ اتنا خوبصورت تھا کہ اگر بیگم واجد کو پردے کے پیچھے چھپا ہوا حسن اشارہ نہ کرتا تو وہ تو اپنا سارا پروگرام بھول چکی تھیں۔

"پسند آیا؟" قاضی صاحب بولے۔

"بہت اچھا ہے میرے پاس الفاظ نہیں کہ اس کی تعریف کی جائے ...؟"

پھر ذرا نظر بچا کر بیگم واجد نے حسن کو اشارہ دیا اور وہ محتاط قدموں سے چلتا ہوا قاضی صاحب کے عین پیچھے آ گیا اور بغیر انتظار کیے تیز تیز چھری ان کی گردن میں گھونپ دی ... چھری ٹھیک نشانے پر لگی اور قاضی صاحب کو اتنی مہلت بھی نہ ملی کہ وہ اپنے آستین کے سانپ کو دیکھ سکیں کیونکہ عین اسی لمحے سامنے بیٹھی بیگم واجد نے ایک اور چھرا سامنے سے ان کے پیٹ میں گھونپ دیا تھا ... اور پھر خون کا فوارہ ان کے جسم سے بہہ نکلا انہوں نے اپنی بیگم کی طرف دیکھا اور بمشکل مسکرائے۔ بس اتنا تھا کہ وہیں پر ڈھیر ہو گئے ...

بیگم واجد نے کمرے کے اندر ہی لگی کال بیل کا بٹن دبایا اور نیچے کھڑے چار آدمیوں میں سے دو موٹے تازے آدمی اوپر آ گئے اور جیسے ہی لمحوں میں قاضی واجد کی لاش کو اٹھا کر جیپ میں جا ڈالا۔ قالین پر خون ہی خون بکھر چکا تھا۔ ان دونوں نے مل کر جلدی جلدی وہ خون کے دھبے صاف کیے، پھر قالین کو واشنگ مشین سے صاف کیا، خشک کیا اور پھر دونوں نیچے گاڑی میں آ کر بیٹھ گئے۔ پھر گاڑی ایک طرف کو روانہ ہو گئی۔ ان کے منصوبے کے مطابق دوسرے دونوں نوکروں نے ایک جگہ پر ڈھیر ساری لکڑیاں جلا رکھی تھیں۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ آتے ہوئے ان دونوں موٹے آدمیوں نے قاضی واجد کی لاش اور آلۂ قتل کو اٹھا کر بے دردی سے اس جلتی ہوئی آگ کے شعلوں کے درمیان پھینک دیا ... اس دوران یہ دونوں کار کے اندر ہی بیٹھے رہے ..

اس سارے کام سے فارغ ہو کر ان چاروں نوکروں کو بیگم صاحبہ نے ڈھیر دن نوٹ دے کر رخصت کر دیا۔ جب یہ دونوں کوٹھی پہ پہنچے تو خمار کا نشہ اتر چکا تھا۔ وہ پہلے اپنی ممی کے بیڈ روم میں گئی۔ وہاں پر انہیں موجود نہ پا کر اس نے ساری کوٹھی چھان ماری ... نوکروں کو آوازیں دیں، مگر پوری کوٹھی میں ایک گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ ہر چیز پہ اداسی چھائی ہوئی تھی ... وہ غصے میں گھری سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی آ رہی تھی کہ آگے سے ممی اور حسن کو اندر آتے دیکھ کر رک گئی ..

"اوہ ممی! آپ کہاں تھیں، میں نے پورا گھر چھان مارا ہے اور نہ ہی کوئی ملازم ہے گھر میں ... نہ جانے سب کہاں مر گئے ہیں ... پاپا بھی شاید ابھی تک سوئے ہوئے ہیں!" وہ بولتی چلی گئی

جبکہ بیگم واجد اور حسن اپنے دل میں سوچ رہے تھے کہ ہاں خمار، تمہارا باپ اب واقعی ابدی نیند سو چکا ہے، اس کے وجود کا تو راکھ تک بھی نہیں بچا ہو گا ... وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ایک پُرمعنی ہنسی ہنسے اور پھر بات کا رخ بدلتے ہوئے جلدی سے بیگم واجد بولیں:

"کھانا کھا لیا تم نے ...؟"

"نہیں ممی ... دراصل آج میرے سر میں درد سا ہے اور طبیعت بوجھل بوجھل سی لگ رہی ہے۔" اس کی آنکھیں واقعی سرخ ہو رہی تھیں ...

"تم آرام کر لو ... یا پھر نادیہ کے ہاں سے جا کر چکر لگا آؤ ... صبح بھی اس کا فون آیا تھا ... مگر تم سو چکی تھیں ..."

"ہاں ممی یہ ٹھیک ہے .. میں ذرا تیار ہو لوں۔"

وہ جلدی سے تیار ہونے چل دی۔

پھر شام تک جو کوئی بھی قاضی صاحب سے ملنے کے لیے آیا۔ حسن نے انہیں یہ بہانہ کرکے ٹال دیا کہ وہ تین چار روز کے لیے کسی کام کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہیں۔۔۔ اسی طرح دونوں بہانے بناتے رہے۔۔ خمار کو بھی یونہی بہانہ بنا کر ٹرخا دیا گیا۔

آخر کب تک یہ بہانے بازیاں چلتیں۔ جھوٹ آخر جھوٹ ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو پورے آٹھ دن ہو گئے تھے۔ ایک صبح خمار اٹھی تو سیدھا اپنی ماں کے کمرے میں چلی آئی۔

"ممی جان۔۔۔ آخر پاپا جانی کب لوٹیں گے۔۔؟ دیکھیں ناں پرسوں میری سالگرہ تھی مگر صرف پاپا جانی کی وجہ سے ملتوی کرنا پڑی۔۔"۔

"آ جائیں گے بیٹی، آخر انہیں کوئی ضروری کام پڑ گیا ہوگا"۔ انہوں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ اور خمار بے دلی کے ساتھ کالج چلی گئی۔

اسی شام قاضی صاحب کے ایک گہرے اور جگری دوست احتشام علی آ گئے۔ باہر لان میں ہی بیگم واجد اور حسن بیٹھے ہوئے تھے اس لیے وہ بھی سیدھے وہیں لان میں ہی چلے آئے۔

"تشریف رکھیے احتشام صاحب"۔ حسن بولا۔

"نہیں حسن میں بیٹھنے کے لیے نہیں آیا۔۔۔ میں دراصل قاضی صاحب کے لیے بے حد پریشان ہوں۔ کیونکہ اس سے پیشتر وہ جب کبھی بھی کہیں شہر سے باہر جاتے تھے تو مجھے فون پر ضرور اطلاع کر دیا کرتے تھے مگر اس مرتبہ نہ جانے ایسا کون سا کام پڑ گیا تھا کہ بتائے بغیر ہی چلے گئے ہیں۔۔۔ آج ان کو گئے ہوئے نواں دن ہے مگر نہ ہی فون آیا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی تحریری پیغام ملا ہے"۔۔ وہ ذرا رک کر بولا۔۔۔ "ویسے میں نے اسلام آباد کے تمام ہوٹلوں میں فون کیا ہے مگر ان کے ٹھہرنے کا کہیں سے کچھ بھی پتہ نہیں چلا"۔۔ یہ کہتے ہوئے احتشام علی واقعی بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

"احتشام صاحب! شاید وہ اسلام آباد میں "صنم" کے ہاں ٹھہر گئے ہوں۔۔"۔ بیگم واجد نے بھی مصنوعی تفکر ظاہر کرتے ہوئے اپنی ایک دور کی رشتہ دار کا نام لیا "ویسے انہیں اتنے دن لگانے نہیں چاہئیں تھے"۔۔

"ہاں جانی صاحبہ یہ بھی آپ نے درست فرمایا"۔۔ پھر اس نے کہا۔۔۔ "خیر کچھ دن اور دیکھ لیتے ہیں ورنہ میں خود یا پھر منیجر کو بھیج دیں گے۔۔"۔ یہ کہہ کر وہ سلام کرتا ہوا چلا گیا۔۔۔

اس کے جانے کے بعد وہ دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنس پڑے۔۔۔ "اب تو بیٹے جی، تم لوگوں کو قاضی کی قبر بھی نہیں ملے گی۔۔"۔ حسن نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"حسن ڈارلنگ۔۔۔ وکیل کو تو ذرا فون کرو۔۔۔ آخر اتنی بڑی جائیداد کا مسئلہ ہے۔ یہ تو مجھے علم ہی ہے کہ اس نے کیا وصیت کر رکھی ہے۔ ظاہر ہے اس کی بیوہ ہی والی وارث ہوگی۔۔"۔ وہ آنکھوں میں دولت کی ہوس لاتے ہوئے بولیں۔

"ہاں میں ابھی پتہ کرتا ہوں۔۔۔ مگر ایک دوسرا مسئلہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اور وہ مسئلہ ہے اپنی تمہاری خمار کا۔۔"۔ حسن بولا۔

"اس کی تم فکر نہیں کرو۔۔ اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔۔۔ پہلے جائیداد والا مسئلہ تو حل ہو جانے دو"۔ بیگم واجد مسکراتے ہوئے بولیں۔

حسن، وکیل کو فون کرنے چلا گیا اور بیگم واجد اپنے کمرے میں آ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد حسن نے آ کر اطلاع دی کہ وکیل نہیں ہے شام کو ملے گا۔۔۔ "خیر کوئی بات نہیں ہے"۔۔۔ وہ بڑی بے باکی سے اس کے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔۔۔

آج کالج میں خمار کو ایک تقریری مقابلے میں اوّل انعام ملا تھا۔ وہ بڑی خوشی خوشی گھر کو دوڑی کہ جا کر جلد وہ ممی کو یہ خبر سنائے۔ ابھی وہ دروازے کو ہاتھ بھی نہ لگا پائی تھی کہ اندر کمرے سے ابو جان کا ذکر سن کر وہیں رک گئی۔ حسن کہہ رہا تھا:

"اب کیوں فکر کرتی ہو میری جان، قاضی کا نام و نشان تک بھی نہ رہا ہوگا۔۔"۔

" ہائے بے چارہ بڑی بے دردی سے مرا ہے "۔۔ یہ آواز بیگم واجدہ کی تھی۔ " جلا کر بھسم ہی تو ہو گیا تھا۔ پل بھر میں سے صرف کوئلے یا پھر ہڈیاں ہی نظر آئی تھیں "۔۔

" اور ہاں حسن کہیں وہ اوزار تو نہیں بھٹی میں پھینک ڈالے "۔ بیگم واجدہ پریشانی سے بولیں۔

" میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں، وہ تو میں نے وہیں زمین میں دفن کر دیئے تھے "۔۔ " شکر ہے کسی نے دیکھا نہیں تھا ورنہ اب تک دونوں جیل کی موٹی موٹی سلاخوں کے پیچھے بند ہوتے "۔ بیگم واجدہ بولیں۔

" بیگم جی، تمہارے حسن نے اتنی بڑی گویا منہ میں کھیل ہو، یہ زمانے بھٹی بھی شہر سے دور تو بہت ویران گوشے میں بنائی تھی جہاں پرندے پر مارے کو بھی پتہ نہ چل سکا ہو گا کہ کبھی یہاں بھٹی بنی تھی ہے یا نہیں "۔۔

" ویسے حسن جانی تم بڑے چھپے ہوا کا ثابت ہوئے تھے۔۔ اگر تم فلموں میں چلے جاتے تو فوراً ہیرو کا چانس تمہیں مل سکتا تھا "۔۔

" بس بس آج اتنی خوشامد ہی کافی ہے "

بیگم واجدہ قہقہہ مار کر بولیں، " چلو جان چھوٹ گئی تمہیں۔۔ صدقہ۔۔ اور ہاں اب وکیل آ جائے تو ہم یہاں سے فوراً نکل چلیں "۔۔ اور ہاں حسن "۔۔

اس سے آگے بیگم واجدہ جانے کیا کیا کہتی رہیں مگر خمار اس سے آگے کچھ نہ سن سکی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا، مزید سننے کی قوت جواب دے گئی۔۔ دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں۔۔۔ دل میں آندھی اور طوفان کے جھکڑ چل رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس کے جسم سے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔۔ چہرے پر زردیاں سی چھا گئیں۔۔۔ آنکھیں صدمے کی وجہ سے پتھرا گئیں۔۔۔ چلنے کی قوت جواب دے گئی۔ سارا جسم شل ہو کر رہ گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔۔ نہ جانے کیسے دیواروں کا سہارا لیتے ہوئے بمشکل گرتی پڑتی اپنے کمرے میں آ گئی۔۔۔ اور آتے ہی اپنے بیڈ پر ایسی گری کہ پھر کوئی ہوش نہ رہا۔۔۔

حسن نے شام کو پھر طارق وکیل کو فون کیا اور اس سے رابطہ قائم ہو گیا۔

" وکیل صاحب! میں قاضی واجد کی کوٹھی سے حسن بول رہا ہوں، ذرا آپ جلدی سے آ جایئے۔ ایک بہت ضروری کام ہے "۔۔

" اوہ کے مسٹر حسن، آپ مطمئن رہیں، میں ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ رہا ہوں "۔۔

فون کیے ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ وکیل صاحب کوٹھی پر آ گئے۔ بیگم واجدہ اور حسن نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد آخر کار بیگم واجدہ ہی بولیں۔

" وکیل صاحب، واجد نے کبھی آپ کو کوئی وصیت کی تھی کیا۔۔۔ "؟ وہ اپنے چہرے پر اس طرح کے تاثر دے رہی تھیں کہ جیسے عام سی بات کی جا رہی ہو۔۔

" کیوں بھئی خدا سلامت رکھے واجد صاحب کو۔۔۔ خیر تو ہے "۔۔ وکیل سنبھل کر بولا۔

" نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں، بس یونہی پوچھ رہی ہیں "۔۔ اس مرتبہ حسن بولا۔

" ہاں بتاتا ہوں "۔۔ طارق نے کہا۔ " آج سے سترہ سال پہلے قاضی واجد نے وصیت لکھ کر مجھے دی تھی، اور کہا تھا کہ طارق صاحب موت کا کسی کو علم نہیں، اس لیے میری محفوظ کر لیں "۔۔

" کیا لکھی تھی انہوں نے وصیت "۔۔ بیگم واجدہ کی پریشانی قابلِ دید تھی۔۔۔

" جب خمار بی بی پیدا ہوئی تھیں تو اس کے دوسرے ہی دن وہ میرے پاس آئے تھے۔ ان کی وصیت کے مطابق یہ کوٹھی اور آدھی جائیداد خمار بیٹی کے نام کر دی تھی، اور دس لاکھ روپے بنک میں آپ کے نام سے موجود ہیں جبکہ بقایا تمام جائیداد غریبوں اور یتیموں میں تقسیم کرنے کے لیے ہے "۔ وکیل صاحب بولے

" اور لاہور والی کوٹھی۔۔۔ "؟ حسن اطمینان سے بولا جبکہ بیگم واجدہ کے چہرے کے تاثرات اسے ہوش سے بھی بیگانہ ظاہر کر رہے تھے۔۔

"وہ کوٹھی حسن صاحب آپ کے نام ہے" وکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بیگم واجد تو شاید بے ہوش ہی ہو جاتیں مگر حسن نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں پُرسکون رہنے کے لیے کہا۔ تب بڑی مشکل سے بیگم واجد اپنے چہرے پر مسکراہٹ لائیں۔

وکیل صاحب! آج شام کا کھانا آپ ہمارے ساتھ ہی کھائیے گا۔" حسن نے کہا۔

"جی بہت بہت شکریہ... میں معذرت خواہ ہوں حسن صاحب... قاضی واجد آجاتیں تو اکٹھے مل کر کھاتے۔ اور ویسے ذرا شطرنج کی بازی وغیرہ بھی چلے گی۔ اس سمے دو ایک ضروری کیس مجھے نپٹانے ہیں اس لیے جلدی میں ہوں" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھا اور سلام کرکے چلا گیا۔

"جان پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے... تم ابھی تک حسن کو جان ہی نہیں سکیں... تمہارے کاغذات پر دستخط کروا لوں گا میں"... وہ مسکراتے ہوئے بولا تو تب جا کر کہیں بیگم واجد کو سکون ملا...

اُدھر شام کو جب عنبر کو ہوش آیا اور اس کی آنکھ کھلی تو اس کا پورا بدن درد سے ٹوٹ رہا تھا۔ جیسے کسی نے اسے بُری طرح پیٹا ہو... آنکھیں شدتِ درد کی وجہ سے کھل نہیں رہی تھیں، گویا پورے جسم کا خون آنکھوں میں جم کر رہ گیا ہو... کچھ دیر تک وہ ساکت پلکوں کمرے کی چھت کو گھورتی رہی اور پھر جب ایک ایک کرکے ساری باتیں یاد آئیں تو پورا کمرہ اس کی چیخوں سے گونج کر رہ گیا...

"اوہ میرے پاپا جانی... میری زندگی... میرے پیارے ابو... کاش یہ جلاد آپ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی جلا دیتے... میری مما... ماں نہیں کوئی جلاد ہے... ظالم ہے... آپ کی قاتل ہے.. اور وہ حسن کا بچہ... بے غیرت... نمک حرام، جس کو آپ نے آج اتنی عزت دی... اپنے مقابل کھڑا کیا... ہر دکھ میں اس کی مدد کی... وہ احسان فراموش، آپ کے سارے احسان بھول گیا... وہ آپ کی دولت لوٹ کر لے جاتا مگر آپ... آپ کو"... اس سے آگے وہ کچھ بھی تو نہ کہہ سکا اور زور زور سے رو دے گی... "ابو میں ان ظالموں سے آپ کا انتقام لوں گی... آپ فکر نہ کریں پاپا جانی... مما... اوہ آپ کتنی ظالم نکلیں مما۔ رشتہ کی بھی لاج رکھ لیتیں... وہ آپ سے مجازی خدا ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی سگی پھوپھی کے بیٹے بھی تھے۔ یہ بھی شکر ہے کہ آج پھوپھی اماں زندہ نہیں ہیں... ورنہ وہ تو اس صدمہ میں جیتے جی ہی مر جاتیں... میں کہاں سے آپ کو تلاش کروں میرے پیارے پیا"... وہ جنونی انداز میں سر کو بُری طرح سے تکیے پر پٹخ رہی تھی... کبھی وہ بالوں کو نوچتی... کبھی منہ کو نوچتی... اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ آخر اس نے اپنے سر کو بیڈ کے کنارے سے اتنے زور سے مارا کہ سر سے خون کا فوارہ اُبل پڑا... مگر درد کا اسے احساس تک نہ ہو سکا... پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں ایک بات آئی۔ وہ فوراً بیڈ سے اُچھل کر نیچے اتری، سیدھی باتھ روم میں گئی، منہ دھویا... آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے... ماتھے سے خون کو صاف کیا، ڈریسنگ کی تھوڑی سی کوشش کے بعد ہی خون رک گیا... اس نے ہاتھوں سے اپنے بال درست کیے، انہی بالوں سے سر کا زخم بھی چھپا لیا اور فوراً اپنی کار میں بیٹھی اور سیدھی وکی کے گھر گئی۔

باہر لان میں ہی وکی اور شبنم بیڈمنٹن کھیل رہے تھے وکی اس کا کلاس فیلو بھی تھا اور شبنم اس کی گہری دوست تھی۔ وکی اور شبنم دونوں ہی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ وکی نے دُور سے عنبر کی کار دیکھی تو بھاگ کر اس کی طرف آ گیا۔ شبنم نے دیکھا تو وہ بھی بھاگی آئی۔ ایسے میں وکی شبنم کو چھیڑنے سے کب رکنے والا تھا "تم تو بڑی جیلس ہو، فوراً ادھر بھاگی آئی ہو۔ ہم نے آخر اُدھر ہی آنا تھا"... جس پر شبنم بے چاری جھینپ سی گئی...

"وکی شرم کرو، کیوں تنگ کرتے ہو شبی کو"... عنبر چہرے پہ زخمی سی مسکراہٹ لیے بولی۔

دونوں نے اس کی پیشانی پر سفید پٹی بندھی دیکھی جہاں سے خون کے دھبے صاف نظر آرہے تھے، جسے دیکھ کر وہ دونوں گھبرا گئے۔ وکی آگے بڑھا۔

"خمار۔ جان یہ کیا ہوا ہے۔۔" وکی بے حد پریشان ہو کر بولا۔

"بس کچھ نہیں... میں تمہیں لینے آئی ہوں... جلدی سے بیٹھو... باقی باتیں کار میں ہوں گی"۔۔ خمار نے کہا۔ دروازہ کھولا اور وکی تیزی سے آگے بیٹھ گیا...

"شبنم بھابی، پریشان مت ہونا، ہم ابھی آ جائیں گے"۔

خمار شبنم کو وہیں حیران و پریشان چھوڑ کر گاڑی کو اڑاتی ہوئی لے گئی... اور پھر راستے میں وہ کچھ نہ بتا سکی۔ وکی نے بہت پوچھا، مگر وہ بار بار آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو صاف کر رہی تھی اور وکی بت بنا اسے دیکھ رہا تھا..

مگر جب گاڑی انسپکٹر فرخ کی کوٹھی کے آگے رکی تو تب وکی یوں چونکا جیسے کسی بچھو نے اسے ڈنک مار دیا ہو... "خمار..." وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ مگر وہ اسے ساتھ لیے اس بات کا جواب دیئے بغیر اندر آ گئی... ملازم نے بتایا کہ وہ لائبریری میں بیٹھے ہیں۔ وہ دونوں تیزی سے لائبریری پہنچے...

انسپکٹر فرخ قاضی واجد کا بے حد گہرا دوست تھا... انسپکٹر کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے وہ خمار کو بے حد چاہتے تھے...

"انکل..." خمار نے دروازے میں ہی پکارا۔

انہوں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو یوں اچھلے جیسے انہیں بجلی کا شاک لگ گیا ہو... "خمار میری بیٹی کیا ہوا... بیٹی... اور تم اتنی زرد کیوں ہو رہی ہو۔ خیریت تو ہے نا"؟ وہ اپنے خدشات کو چھپاتے ہوئے بولے۔

"انکل"... وہ بھاگ کر ان کے سینے سے لپٹ گئی۔ اور اتنا روئی کہ انسپکٹر کا کوٹ بھیگ گیا۔ وکی نے اسے یوں روتے دیکھا تو وہ بھی اپنے آنسو نہ روک سکا۔

"بولو بیٹی بولو... مجھے مزید پریشان مت رکھو"... انسپکٹر فرخ نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا۔

اور پھر جو جو بات اس نے اپنے کانوں سے گھر میں ممی اور حسن کی زبانی سنی تھی، سب ان کے گوش گزار کر دیں۔ یہ باتیں سن کر وکی اور انسپکٹر فرخ کو تو جیسے سکتہ ہو گیا..... وہ سچ ماننے کو تیار نہ تھے جبکہ یہ حقیقت تھی، بڑی تلخ حقیقت... انسپکٹر نے تب انہیں بیٹھنے کو کہا اور خود فون کی طرف بڑھ گئے۔ فوراً کسی بات کا آرڈر دیا اور واپس آ گئے..

"فکر مت کرو۔ پولیس ابھی تمہاری کوٹھی کو گھیرے میں لے لے گی، جبکہ میں خود تمہارے ساتھ چند سپاہی لے کر اس جگہ چلتا ہوں جہاں انہوں نے میٹنگ بنائی تھی"۔ وہ تینوں نیچے پہنچے تو گیٹ پر پہلے ہی سے چند سپاہی تیار کھڑے تھے.. انسپکٹر فرخ، وکی اور خمار گاڑی میں بیٹھ گئے اور جیپ کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ آخر وہ کوٹھی تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے...

کوٹھی کو دیکھ کر خمار گرنے کو تھی اگر وکی اسے بازوؤں میں نہ تھام لیتا۔ پولیس والے کوٹھی کی تلاشی لینے میں لگ گئے۔ اچانک ایک سپاہی نے انسپکٹر کو پکارا۔

"سر! مقتولوں کے دانت برآمد ہو گئے ہیں، جبکہ باقی ماندہ جسم شعلوں میں جل کر راکھ ہو چکا ہے"۔

انسپکٹر نے خاموشی سے دانت سپاہی سے لے کر جیب میں ڈال لیے، کہیں خمار انہیں دیکھ کر اپنا دماغی توازن نہ کھو بیٹھے... اور پھر وہ اور زیادہ مل جلتے ہوئے کے ساتھ ہی زمین میں دفن کیے ہوتے گئے...

ادھر حسن اور بیگم واجد خمار کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ شبنم کے گھر انہوں نے فون کیا تو اس نے کہا کہ وہ یہاں نہیں آئی... ماریہ کو فون کیا مگر اس کا کچھ پتہ نہ چلا... مزید جاننے والوں کے گھر فون کیے گئے مگر ہر طرف سے جواب نفی میں ملا۔

"نہ جانے کہاں غائب ہو گئی ہے"۔۔ بیگم واجد بڑی پریشانی کے عالم میں بولیں۔

"آپ نے مسز یاسمین اور نورین کے گھر سے پتہ کروایا ہے"... حسن بولا...

"ہاں... مگر وہ سوات گئی ہوئی ہیں"۔ بیگم واجد بڑی مایوسی سے بولیں...

"پھر اب کیا کیا جائے..."۔ اس مرتبہ حسن بھی مایوس کن لہجے میں بولا۔

"انتظار...!" بیگم واجد نے یہ کہا اور اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا۔

"بیگم صاحبہ... بیگم صاحبہ... باہر پولیس۔ نے پوری کوٹھی کو گھیرے میں لے رکھا ہے...!"۔ ملازم نے بھاگتے ہوئے آکر اطلاع دی۔

یہ سنتے ہی دونوں حواس باختہ سے ہو گئے...

"نہیں...! بیگم واجد لڑکھڑاتی زبان سے بولیں
"مگر کیسے... یہ کیسے ہو سکتا ہے...!"

ابھی وہ دونوں آپس میں باتیں کر ہی رہے تھے کہ انسپکٹر فرخ، خمار، وکی اور چند پولیس والے سیدھے اندر ہی آ گئے...

"ارے... ارے... زہے نصیب... آپ کیسے فرخ صاحب؟"... حسن نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ مگر بیگم واجد کچھ بھی تو نہ بول سکیں، بلکہ خونخوار نگاہوں سے خمار اور وکی کو دیکھ رہی تھیں اور خمار ان کی گھورتی آنکھوں کو دیکھ کر مسکرا پڑی اور دل ہی دل میں ہنس پڑا۔

"آئیے آئیے... تشریف رکھیے ناں... چائے یا کوک...!" حسن ہی بولا۔

"جی اطلاع تو کچھ نہیں... بلکہ آج آپ ہمارے مہمان ہوں گے... قاضی واجد ہوتے تو محفل کو چار چاند لگ جاتے۔ مگر خیر، بیگم واجد اور حسن بھی آج آپ لوگوں کی ہی خاطر مدارت کر دی جاتی..."۔ انسپکٹر، خمار کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور مخاطب ہوئے... "کیوں بیٹے آپ آئیں گے دونوں کیا...؟"

"کیوں نہیں انکل... اگر ہم نہ آئے تو محفل کی رونق کیسے دیکھیں گے"۔

"کیوں وکی؟"... خمار مسکرائی۔

"حاضر جناب"... وکی بولا۔

اور پھر انسپکٹر نے پولیس کے سپاہیوں کو حسن اور بیگم واجد کو ساتھ لانے کا حکم دیا۔ اسی وقت حسن کو ان کے خلاف توقع ہتھکڑی لگا دی گئی... مگر بیگم واجد کو جیپ میں زبردستی یوں ہی بٹھا دیا گیا۔

"یہ... یہ... کیا مذاق ہے...؟" بیگم واجد غصے سے بولیں۔

"اوہ... نو... نو... غصہ مت کیجیے ورنہ...!"۔ خمار نے فقرہ مکمل نہ کیا۔

اور پھر جیپ تھانے میں جا کر روک دی گئی۔

"حسن صاحب... قاضی واجد کا کچھ پتہ چلا آپ لوگوں کو"۔ انسپکٹر بولا۔

اور حسن انسپکٹر کی طنز پر سب کچھ سمجھ گیا اور پھر انسپکٹر کی تھوڑی سی سختی پر وہ کچھ یہ ہی دونوں نے اعتراف جرم کر لیا...

"یہ دیکھیں کھیتی سے میرے دوست کے صرف دانت ہی مل سکے ہیں...!"۔ انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب سے نکالے، مگر خمار نے انسپکٹر کے ہاتھ سے دانتوں کو جھپٹ کر اپنے ہونٹوں سے لگا کر ایسی چیخ ماری کہ وہاں پر موجود سب لوگ رونے لگ گئے، حتیٰ کہ بیگم واجد کی آنکھیں بھی بھر آئیں... جبکہ حسن شرمندگی کے مارے آنکھیں نیچی کیے زمین میں گڑھا جا رہا تھا... بڑی ہی مشکل سے وکی نے خمار کو سنبھالا...

"خمار بیٹے بتاؤ ان سے کیا سلوک کیا جائے؟"

"انکل، یہ پاپا جانی کی وصیت کے مطابق اپنے دس لاکھ لے لیں۔ آپ انہیں رہا کر دیں، میں انکو معاف کرتی ہوں...!"۔ وہ آنسوؤں کو روکتے ہوئے بولی۔

انسپکٹر فرخ نے ایک لمبی سرد آہ بھری اور حکم دیا کہ "حسن تم اور بیگم واجد کو یہ شہر چھوڑنا پڑے گا"۔ پھر خمار سے بولے "میں مجبور ہوں خمار بیٹے...!"۔

"او۔ کے انکل...!"۔

"بیگم صاحبہ اور حسن صاحب آپ دونوں لاہور والی کوٹھی میں منتقل ہو جائیں اور رقم کی خدمت کریں"۔

خمار نے اسی وقت دس لاکھ کا چیک کاٹ کر انہیں دے دیا... بیگم واجد نے خمار کو دیکھ کر اپنے بازو پھیلا دیئے، مگر خمار ان بازوؤں میں نہیں آئی... بلکہ جاتے جاتے صرف اتنا کہا:

"اپنے ان پھیلے ہوئے بازوؤں کو نیچے کر لیجیے۔ مسز... حسن... میں یہی سمجھوں گی کہ میں نے ایک

جواب عرض ضمیمہ

بھیانک بہت ہی بھیانک خواب دیکھا تھا، جس کی تعبیر بھی بہت ہی تلخ نکلی ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ رو پڑی۔۔ سسک پڑی۔۔۔

مگر وہ آگے بڑھا اور غفار کو تھام لیا۔ غفار کی بیٹی نے شانے پر سر ٹیک کر رو دی۔۔۔ "دل میں بے سہارا ہو گئی ہوں۔۔۔"

"بیٹے، میری بیٹی اب تمہارے حوالے ہے۔۔ اس کی حفاظت کرنا۔" انہوں نے [illegible] آنکھوں میں آنسو لیے ہوئے اور دونوں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔۔۔ اور دونوں چلے گئے۔

اس کے بعد لاہور میں آ کر بیگم [illegible] اور حسن نے باقاعدہ نکاح کر لیا۔ اور دس لاکھ سے کاروبار شروع کر لیا مگر انہیں دلی سکون نہ ملا۔ اس طرح بیس برس گزر گئے۔ پچھلے برس بیگم حسن کا انتقال ہو گیا اور وہ اس اذیت ناک زندگی سے نجات پا گئی۔ البتہ حسن آج بھی زندہ ہے مگر مرے ہوؤں کے برابر۔۔۔ ایک لاش کی طرح سلگتا رہتا ہے۔۔۔ لمحہ لمحہ موت کو ترس رہا ہے مگر موت بھی اس کو قبول نہیں کر رہی۔۔۔

یہ سب کچھ حسن اور حسن کی صورت دیکھ کر یہ تمام باتیں ایک بھیانک خواب لگتی ہیں۔۔۔

***

جواہر پارے

۱۔ سب سے زیادہ پیار کرنے والی ہستی ماں ہے۔

۲۔ سب سے زیادہ طاقت ور ماں کی ممتا ہے۔

۳۔ سب سے بڑی دولت اولاد ہے۔

۴۔ سب سے بڑی اللہ تعالیٰ کی نعمت تندرستی ہے۔

۵۔ سب سے زیادہ احترام استاد کا کرو۔

۶۔ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ ماں باپ کی خدمت کرو۔

(مرسلہ: ایم نذیر احمد فتوپورہ)

اے قوم مسلم!

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں۔ اللہ نے آپ صلعم کو ساری دنیا کی رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی قیادت میں صحابہ کرام کی ایک ایسی جانباز جماعت تیار کی تھی، جو باری تعالیٰ کا پیغام لے کر اٹھی اور ساری دنیا پر چھا گئی۔ چپے چپے سے اللہ ھو کی صدائیں آنے لگیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد اب قیامت تک کوئی بھی نبی نہیں آئے گا۔ اب ساری دنیا کی رہنمائی کی ذمہ داری امت مسلمہ پر عائد ہوتی ہے آئندہ تم ہی وہ افراد ہو گے جنہیں دنیا کی امامت کرنی ہے۔۔۔ برائیاں مٹانی ہیں، بھلائیوں کو فروغ دینا ہے۔ اللہ کے غافل بندوں کو خواب غفلت سے چونکانا ہے صراط مستقیم سے بھٹکے ہوؤں کو سیدھی راہ پر لگانا ہے۔ یہ بہت اونچا منصب ہے، بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ ذرا غور کرو کہ تم اپنے آپ کو اس کے لیے کہاں تک تیار کر رہے ہو! اللہ تمہیں اس کا اہل بنائے (آمین)

(ایک گنہگار)

بکھرے موتی

- علم کے لیے مطالعہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کنول کے لیے پانی۔
- مطالعہ، غم اور اداسی کا بہترین علاج ہے۔
- وہ انسان سب سے غریب ہے جس کا اس دنیا میں کوئی دوست نہیں۔
- سب سے شفیق ہستی ماں ہے۔
- سب سے زیادہ آرام دہ جگہ ماں کی آغوش ہے۔
- سب سے زیادہ نرم ماں کا دل ہے۔

(مرسلہ: حشمت لیلتی، دلال آدھن)

ہائے تیری بے رخی

تحریر۔ محمد سرور شاہد سعودی عرب

مکرمی شہزادہ عالمگیر صاحب!

سلام خلوص... جوابِ عرض کا پرانا قاری ہوں۔ اس کی زخمی اور دکھی کہانیوں کے پیشِ نظر ہی پہلی بار اس میں شریک ہونے کی جسارت کر رہا ہوں... کبھی بعض اوقات زندگی کے ان دیکھے موڑ ایسی اندھیر نگری میں لے جاتے ہیں، جہاں چاہت کے موتی بھی اپنی آب و تاب کھو دیتے ہیں۔ انسان جس کے سہارے جینے کی آرزو کرے وہی اس کے لیے موت کا استعارہ بن جاتا ہے...

شہزادہ صاحب! میری زیرِ نظر کاوش، جو کہ حقیقت پر مبنی ہے، میرے اپنے ہی جیون سے وابستہ ہے۔ جسے میں نے "ہائے تیری بے رخی" کا عنوان دیا ہے۔ اگر میری یہ تحریر آپ کو متاثر کرے اور جوابِ عرض کی پالیسی کے معیار پر پورا اترے تو اسے کسی قسط وار اشاعت میں جگہ دے کر شکریہ کا موقع دیں... آپ کی حوصلہ افزائی مجھے مزید حقائق تحریر کرنے کی ترغیب دے گی... میری اس تحریر میں خامیاں تو بھی نہ یہ ہوں گی مگر میں امید کرتا ہوں کہ میرے مہربان بہن بھائی میری تحریر میں پائی جانے والی خامیوں کی مناسب اصلاح اور نشاندہی ضرور کریں گے۔ ان کی یہ رہنمائی میرے لیے آئندہ کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ آخر میں جوابِ عرض کی اور زیادہ ترقی کے لیے دعا گو ہوں...

آپ کی دعاؤں کا متمنی...

محمد مسعود رشا ہد

پوسٹ بکس نمبر ۶۰۳۷ جدہ۔ سعودی عرب۔

~~~~ ★ ~~~~

... کانٹے یا پھول جو بھی چاہو تھال دو اس میں
میں نے تو زندگی کا دامن بچھا دیا ہے!

میں کہ اس معاشرے کا انتہائی بدنصیب، دکھی، بے بس اور ناکامیوں کے گرداب میں پھنسا ہوا ایک نوجوان ہوں۔ دس سال کی عمر سے لے کر جوانی تک دکھوں اور تجربوں سے کھیلتا چلا آ رہا ہوں۔ انہوں نے قدم قدم پر مجھے اور تازہ زخم دیئے... جبکہ دنیا نے ہر گام پر مجھے ٹھوکروں سے نوازا ہے۔ اور میں انہی حالات میں زندگی کی بائیس ویں سیڑھی پر کھڑا، اپنی ہی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشات کی لاش اپنے ہی کاندھوں پر اٹھائے اس وقت ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ زندگی کی ویران اور طویل راہوں پر اکیلا ہی چلا جا رہا ہوں... کتنی کٹھن راہیں ہیں... یہ تو میں ہی جانتا ہوں... ان راہوں پر کوئی بھی تو ہمسفر نظر نہیں آ رہا۔ کسی منزل کا بھی نام و نشان نہیں ہے...

اس بھری دنیا میں اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ زندگی کی گاڑی کو ہانکتے ہانکتے اس قدر تھک چکا ہوں کہ جی چاہتا ہے ہمیشہ کی نیند سو جاؤں... سوچتا ہوں آپ کو اپنی کتابِ زیست کا کون سا ورق دکھاؤں، جبکہ ہر ہر ورق میرے مقدر کی طرح سیاہ ہے...

آج میں سوچ رہا ہوں کہ اب اپنی بربادیوں کا چرچا کرنے سے کیا حاصل... اپنی ناکام آرزوؤں اور محرومیوں کا شکوہ کرنے سے کیا فائدہ... مگر نہیں یہ شکوہ نہیں، یہ تو پیام ہے اس کے نام، جس نے مجھے اجڑی منزل پہ لا کر تنہا اپنی یادوں کے سہارے جینے پر مجبور کر دیا ہے، جو میرے دل میں شمع کی مانند جگمگایا... مگر چند لمحوں کی روشنی کے بعد لے تاریکی میں مجھے اکیلا بھٹکنے کے لیے چھوڑ گیا۔ آج اپنا ہی وجود اجنبی سا محسوس ہو رہا ہے... اپنا ہی یہ چہرہ انجانا سا لگ رہا ہے...

اپریل ۸۳ء

جوابِ عرض لاہور
~~~~

آج تقدیر مجھے ایک ایسے موڑ پہ لے آئی ہے کہ جہاں تنہائیاں میرا مقدر بن گئی ہیں۔ رات کے سناٹوں میں میرے مقدر کا ستارہ ڈوب کر رہ گیا ہے۔ رات کے اس سناٹے میں دریا کی لہریں ساحل سے ٹکرا ٹکرا کر خوفناک آواز پیدا کر رہی ہیں۔ شاید یہ بھی مچل مچل کر میری محرومیوں کا ماتم کر رہی ہیں۔ دریا کی خوفناک لہروں کے ساتھ ساتھ میری آہیں بھی سسکیاں بن کر ابھر رہی ہیں۔ میں زور زور سے پکارتا ہوں جولی۔ جولی۔ مگر میری صدائیں کوئی بھی نہیں سن رہا۔ بار بار اپنے ہی الفاظ کی بازگشت میرے کانوں سے آ کر ٹکراتی ہے۔

اے سمندر کی لہرو...! مجھے اتنی دور اور اتنی گہرائی میں لے جاؤ جہاں سے دوبارہ ابھرنے کا تصور بھی ناممکن بن کر رہ جائے اور میں پلٹ کر اپنی کھوئی ہوئی منزل کو آواز بھی نہ دے سکوں۔

اے سمندر کے بے جان پتھرو...! تم بھی میرے درد سے پگھل کر موم بن جاؤ۔ اور میرے سنگ سنگ میرے حسرت زدہ لاشے کا ماتم کرو... میری بے بسی پر آنسو بہاؤ...

اے فلک کے چمکتے ستارو...! تم بھی زمین پر اتر آؤ اور مجھے گلے سے لگا کر اتنے آنسو بہاؤ کہ میرا وجود تمہارے ان آنسوؤں کے سیلاب میں ڈوب کر رہ جائے... مگر تم میری صدائیں کیسے سن سکو گے۔ میری صداؤں سے تو عرش الٰہی کو جنبش نہ ہو سکی... تم کیسے حرکت میں آ سکو گے۔ میری آہوں میں کوئی اثر نہیں ہے۔ اگر اثر ہوتا تو وہ پلٹ کر ضرور آتی...

کاش رات کی تاریکی کے بدلے میری مانگ میں زندگی کی روشنیاں بھر جائیں... مگر نہیں روشنیاں مجھے راس نہیں آتیں... میرا ناطہ صرف ویرانوں سے ہے۔ انہی ویرانیوں میں گھٹ گھٹ کر ایک دن سکون کی نیند سو جاؤں گا۔ اس زندگی نے مجھے کیا دیا... مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔ میرے والدین مجھ سے چھین لیے... اور پھر زندگی کا ایک سہارا تلاش کیا تھا وہ بھی آپ کے سامنے ہے بلکہ جو میری زندگی کا سرمایہ تھی... وہ بھی مجھ سے منہ موڑ گئی... جو میری سانسوں کی مہک تھی... میرے دل کی دھڑکن تھی... میرے دل کا قرار تھی۔ وہ بھی مجھ سے روٹھ گئی۔ سب کی ویرانیاں میرا مقدر بن کر میرے سنگ سنگ چپک کر رہ گئی ہیں... میں جیون کی جس رہگذر سے گزرتا ہوں۔ وہ راہیں روک روک کر مجھ سے پوچھتی ہیں۔

"بتا تیرا ہم سفر کہاں ہے...؟"

رات کے لمحے آہستہ آہستہ بیت رہے ہیں۔ باہر ٹھنڈی ہوائیں بڑے زور سے چل رہی ہیں... سرد رات ہے... تاریکی کے سائے ہلکے کرنے کے لیے موم بتی کی زرد روشنی ٹمٹما رہی ہے۔ اور نہ جانے کب کوئی ہوا کا تیز جھونکا اسے بھی گل کر جائے اور میری چشم نم ایک بار پھر بے نور ہو جائے... میری آنکھوں کی روشنی تاریکی میں بدل جائے۔ بالکل میرے جیون کی طرح تاریک... رات کے خاموش لمحے آہستہ آہستہ بیت رہے ہیں۔ ننھی شمع ٹمٹما رہی ہے۔ اب تو اس کا وجود بھی ڈگمگانے لگا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں تاریکی چھا جائے گی۔ اور میرا وجود گھٹا ٹوپ تاریکی میں گم ہو کر رہ جائے گا۔

روشنی کی ان مدھم کرنوں میں جس کے نقوش تلاش کر رہا تھا۔ وہ پھر سے کھو جائیں گے... تنہائی کا احساس پھر سے مجھے ڈسنے لگے گا۔ نہ جانے کب تک انہی اندھیروں میں میری زندگی دب کر رہ جائے گی۔ کیا میرا وجود روشنی کی ہلکی سی کرن کو دیکھنے کے لیے ترستا رہے گا...

میرا وہ کون تھا جس کی اتنی کڑی سزا میں نے پائی ہے۔ جس کی پاداش میں ہر لمحہ درد سے گزر رہا ہے۔ میرے سینے میں چاہت کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ مگر میرے پیار کی گہرائی میں کوئی بھی غوطہ زن نہ ہوا۔

اے محبت تیری آگ نے ہزاروں گھر جلا ڈالے... تو نے کتنی خوشیاں مثبت غبار میں ملا دی ہیں۔ خدا غارت کرے اس جذبۂ محبت کو جس نے ہزاروں مسکراتی زندگیاں تباہ کر دی ہیں۔ ہزاروں دلوں کے سکون لوٹ لیے ہیں... یہی وہ محبت ہے جو زندگی کی ہر خوشی کو عذاب بنا دیتی ہے۔ یہی وہ محبت ہے جو عورت زندگی میں ایک بار کرتی ہے۔ یہ سب کواس ہے.. عورت ذات پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔

انسان محبت کے بے اختیار جذبے سے مجبور ہو کر جسے اپنی محبت کا خدا مان لیتا ہے۔ یہی اس کی وہ خطا ہوتی ہے

حسن کی سزا وہ تا زیست بھگتتا رہتا ہے... محبت وخوشی ہے جو جینا عذاب کر دیتی ہے... تڑپنا.. سسکنا انسان کا مقدر بن جاتا ہے۔ اور یہی خطا مجھ سے سرزد ہو گئی ہے جس کی پاداش میں آج میرا جیون بھی خشک پتوں کی مانند بکھر کر رہ گیا ہے۔

جولی..! میں آج بھی تم سے روز اول کی طرح محبت کرتا ہوں... تمہاری یادیں دل میں بسائے زندگی کی اس آگ میں جل رہا ہوں... تمہارے دیے ہوئے زخم اپنے سینے پہ سجائے سسک رہا ہوں۔ اور نہ جانے کب تک یونہی سسک سسک کر دم توڑ دوں گا... تمہارے درد کو دل میں بسائے اس وقت تک جلتا رہوں گا۔ جب تک میرا وجود راکھ کے ڈھیر میں نہیں بدل جاتا... تمہاری چاہت میں جو دکھ مجھے ملے ہیں۔ میں انہیں کیونکر بھلا سکتا ہوں... اب تمہارے بخشے ہوئے یہ غم ہی میری زندگی کا سرمایہ ہیں میری چاہت کا حاصل ہیں۔

جولی..! تمہاری سلجھی ہوئی زلفوں میں اس وقت میں کھو گیا تھا جب تم پہلی بار ہمارے گھر آئی تھیں۔ اور میں نے تمہاری نگاہوں میں تیرتے ہوئے چاہت کے سائے محسوس کیے تھے... نہ جانے تمہاری گہری سیاہ موٹی آنکھوں میں وہ کون سی کشش تھی۔ جس نے میری سوچوں کا رخ تمہاری جانب موڑ دیا۔ اور تمہارا سراپا حسن وجود میری سوچوں کا مرکز بن گیا... میرے دل میں تمہاری چاہت کا جو جذبہ ابھرا تھا۔ وہ مجھے دن رات کے بھاگتے لمحات کے ساتھ تمہارے بہت قریب لے گیا تھا... تمہیں میں اپنے اتنا قریب محسوس کرنے لگا کہ تمہارے پیار کی خوشبو میری سانسوں میں مہکنے لگی... تمہیں میں اپنی دل کی دھڑکنوں سے بھی قریب محسوس کرنے لگا۔

جولی..! یاد کرو میری دیوانگی کا وہ عالم... جب میں صرف تمہاری ایک جھلک دیکھنے کی خاطر دن بھر کڑی دھوپ میں چھت پر کھڑا رہتا تھا.. تمہیں تو سردیوں کی وہ رات بھی یاد ہو گی۔ جس رات زور سے بارش ہو رہی تھی اور تمہارے ایک ہی خط سے میں اسلام آباد سے واپس تمہارے پاس آ گیا تھا۔ تم کو یاد ہو گا کہ تم نے صرف اتنا لکھا تھا۔ یہ خط جس وقت ملے اسی وقت آ جاؤ۔ حالانکہ تمہیں یہ بھی معلوم تھا کہ سرکاری سروس سے اتنی جلدی چھٹی نہیں ملتی۔ اور پھر میں اسی رات گیارہ بجے واپس اسلام آباد ڈیوٹی پہ چلا گیا تھا۔ یاد کرو..

جولی... مگر تم اتنی کم ظرف نکلیں کہ تم نے میری اس شدید اور پاکیزہ چاہت کو نظرانداز کر دیا۔ اور دل جیسے نرم و نازک شیشے کو یوں بے دردی سے چور چور کر دیا کہ تمہیں ذرا بھی رحم نہ آیا۔ میرے پیار کی باتیں کھلی کی کھلی رہ گئیں... تمہاری اس بے رخی کے باوجود میرے دل سے تمہاری محبت ذرا بھر بھی کم نہ ہوئی... میں تمہیں اسی شدت سے چاہتا رہا... تمہارے پیار ہی کو اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا رہا۔

مگر آج سوچتا ہوں جولی.. تمہاری محبت نے مجھے کیا دیا... سوائے نفرتوں کے... رسوائیوں کے... اور شکستگی۔ بسلتی یادوں کے... ایسی یادیں جن کا زہر میرے رگ رگ میں اتر چکا ہے اور تم میری بے قراریوں سے بے خبر کتنی مطمئن لگ رہی ہو۔ شاید تمہارے سینے میں دل نہیں پتھر تھا...

جولی...! مگر جذبوں کی صداقت تو پتھروں کو بھی پگھلا کر موم کر دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تمہارے دل میں چاہت کا کوئی خانہ ہی نہیں بنا۔ تم اس جذبے سے بالکل عاری نظر آتی... مگر نہیں انسانی دل جذبہ محبت سے خالی نہیں ہوتا... تو تو شاید خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے... شاید میں تمہاری توقعات پر پورا نہیں اتر سکتا تھا۔ آج کل کی محبت جسے تصور کیا جاتا ہے... وہ سب کچھ میرے پاس نہیں ہے...

مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہیں پیار کی مہکار نہیں... سونے چاندی کی چھنکار چاہیے تھی... تمہاری متلاشی نگاہیں دولت کے ڈھیر دیکھنے کی تلاش میں تھیں۔

جولی..! دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی.. خلوص بھی کسی چیز کا نام ہے... کبھی دل میں پیار بسا کے تو دیکھو یہ تو وہ انمول خزانہ ہے جو دنیا جہان کی دولت سے نہیں خریدا جا سکتا.. محبت تو وہ خوشبو ہے جو انسان کی سانسوں میں سے مہک کر روح تک معطر کر دیتی ہے۔ محبت پاک رشتوں

یہ سنگم کا علم ہے۔ محبت اونچ نیچ کے تمام فرق مٹا دیتی ہے۔ مگر تم یہ کیسے جان سکتی ہو۔ تم تو اس جذبے سے ہی نا آشنا ہو تمہیں اس کی قدر کیسے معلوم ہوگی... کاش تم اس جذبے سے آشنا ہوتی... اور محبت کے اس جذبے کی عظمت کو پہچان سکتی...

جولی...! نہ جانے تم اس وقت کسی کام میں لگی ہوگی۔ مگر میرا ذہن اس وقت تمہی یادوں میں الجھا ہوا ہے۔ میری زندگی کا ہر لمحہ تمہاری یاد میں گزر رہا ہے۔ کبھی کبھی شب کی تنہائیوں میں تمہارے نقوش تلاش کرتا ہوں تو ایسے میں تمہیں بہت قریب پاتا ہوں۔ مگر چند ہی لمحوں میں میرا یہ خوش کن تصور ریت کے گھروندوں کی مانند پاش پاش ہو کر بکھر جاتا ہے... احساس اس وقت ہوتا ہے۔ جب کسی کی آہٹ پہ میری سوچوں کا لامتناہی سلسلہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ہے...

جب میری منتظر نگاہیں اٹھتی ہیں تو اندھیرے کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا... رات کے اس سناٹے میں آنکھیں بند کر لیتا ہوں... مگر میری بند آنکھوں میں بھی تمہارا چہرہ گھوم آتا ہے... رات کی اس تنہائی میں کوئی بھی غمگسار نہیں ہے... جس سے اپنے درد کا افسانہ کہہ سکوں...

جولی...! سوچتا ہوں اب درد کا افسانہ کس کو سناؤں۔ جس کو اپنا سمجھا تھا... وہ بھی غیر نکلا۔ میں نے تمہیں اپنی سانسوں سے بھی قریب جانا تھا۔ مگر دوری کے یہ فاصلے اتنے طویل نکلے کہ اب تجھ تک میری آواز بھی نہیں پہنچ پاتی۔ یہ کیسا حادثہ تھا جس نے مجھے تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے... اور ہر طرف غموں کی آگ بھڑک رہی ہے... اس آگ سے دامن کو کیسے بچاؤں۔ میرا وجود کارواں سے بچھڑے ہوئے اس مسافر کی مانند ہے... جس کے مقدر میں تنہائیاں... ویرانیاں لکھی ہوئی ہوں... اور زندہ رہنے کی آرزو دم توڑ دیتی ہے۔

جولی...! کیا میرا جیون اسی طرح محبت کی آگ میں جلتا رہے گا... تم کب تک مجھے اپنی جفاؤں کی سزا دیتی رہوگی... تمہاری بے رخی کا احساس میری روح کو تڑپا دیتا ہے یہ احساس مجھے رلا دیتا ہے۔

جولی...! میں ہر قدم پر اپنی آرزوؤں کا خون کر کے تمہارے جذبات کا احترام کرتا رہا۔ مگر تم نے ہر گام پہ میرے ارمانوں سے کھیلنا چاہا۔ میں نے محبت کے اس گلشن میں اپنی وفا کا پھول کھلانا چاہا... مگر تمہاری نفرتوں کی دھوپ سے وہ پھول بن کھلے مرجھا گیا... اور اپنی بہار دکھلائے بغیر ہی پتی پتی ہو کر بکھر گیا... میں نے تم سے الگ ہو کر جینے کی کوشش کی مگر تمہاری رلا دینے والی یادیں اپنے دامن سے نہ کھرچ سکا... جنہوں نے آج تک ایک پل بھی چین سے نہیں رہنے دیا۔ میں نے تمہیں بھول جانا چاہا... لیکن اس قدر ہی زیادہ یاد آئی...

میں کتنا مجبور تھا کہ باوجود ہزار کوشش کے تم سے ترک تعلق نہ کر سکا... کیوں جولی...؟ تم سے ترک محبت کے تصور سے ہی میری نس نس سے درد کی لہر اٹھنے لگتی تھی۔ تمہارا پیار خوشبو تھا جو میری سانسوں میں مہک رہا ہے اور سانس اگر رک جائیں تو زندگی کا تصور باقی نہیں رہتا۔

جولی...! کبھی کبھی سوچتا ہوں اور خود کو پچھتاوے کی آگ میں جلتا محسوس کرتا ہوں۔ یہ کیسا اندوہناک درد ہے جسے میں اپنے سینے میں پال رہا ہوں... یہ سوچ کر میری آنکھوں سے بے بسی کے آنسو آ جاتے ہیں۔ مگر پھر خیال ابھرتا ہے کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں... میں بے قصور ہوں۔ محبت کا جذبہ تو ہے ہی خودسر۔ محبت کوشش سے نہیں کی جاتی بلکہ یہ خود بخود ہو جاتی ہے۔ انسان کو کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ جانے زندگی کے کس موڑ پر کس سے محبت ہو جائے... نہ جانے کب دل کا انمول خزانہ درد کے ہاتھوں بک جائے۔

جولی...! میرا دل تجھے پہلی نظر دیکھتے ہی تم پہ شیدا ہو گیا تھا اس دل نے تو تمہیں اپنی محبت کا خدا مان لیا تھا... مگر تم کتنی سنگدل نکلی... تم نے میری محبت کو ٹھکرا کر مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے...

جولی بتاؤ...! میرے جیون کو غموں کی نذر کر کے تمہیں کیا ملا ہے۔ میں نے تمہاری محبت کا سہارا چاہا تھا مگر مجھے تیری محبت کا سہارا نہ مل سکا... تمہیں تو جینے کی حد تک چاہا تھا... مگر تم میرا پیار نہ سمجھ سکی۔ میں نے تمہیں صادق جذبوں کے ساتھ تمہیں چاہا تھا... اس سے بڑھ کر میری بدقسمتی اور

ہائے تیری بے رُخی

قدرت کی ستم ظریفی کیا ہوگی... پھر بھی میں تجھے حاصل نہ کر سکا...

جولی..! کسی کی سچائی اور خلوص کو شک کی نگاہ سے دیکھنا کتنی بری بات ہے۔ اس کا اندازہ تو وہی کر سکتا ہے جو خود ایسے حالات سے گزرا ہو۔ محبت تو وہ پاکیزہ جذبہ ہے جس کی قسمیں کھائی جا سکتی ہیں۔ میرے دل میں بھی اس وقت تمہاری محبت نے سر ابھارا تھا...

جب میں نے تمہیں پہلی نظر دیکھا تھا تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے تم وہی ہو جس کا میں برسوں سے متلاشی تھا۔ تمہاری محبت میں اس قدر بے خود ہو گیا تھا کہ میں تم کو ہی اپنی زندگی کا محور تصور کرنے لگا۔ اور تمہارے بن اپنے وجود میں ایک خلا سا محسوس ہونے لگا اور جو صرف تمہاری ذات سے ہی پُر ہو سکتا تھا۔ میں نے تمہاری چاہت کے جو خواب دیکھے تھے... وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میری خاموشی تاریک راتوں کی سیاہی کبھی روشنی میں نہ بدلے گی۔ اور میرے دل کے ویران آنگن میں کبھی پیار کی محفل آباد نہ ہو سکے گی۔ میں نے چاند اور ستاروں کی تمنا کی تھی... مگر میرا دامن شب کی تاریکیوں سے بھر دیا گیا۔ اور میں اپنی پہچان بھی بھول گیا۔ اور میں آج اپنے ہی چہرے پر زمانے بھر کی خراشیں سجائے ہر کسی سے پوچھتا پھر رہا ہوں کہ میں کون ہوں..؟

جولی..! تمہاری محبت سے جو دکھ مجھے ملے ہیں۔ انہوں نے مجھے مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ میرا جرم تو اتنا سنگین نہ تھا جس کی اتنی کڑی سزا پائی ہے۔ اور آج میری یہ معمولی سی خطا میری زندگی کی سب سے بڑی سزا بن کر رہ گئی۔ میں نے تمہیں چاہا... پیار کیا... پرستش کی حد تک پوجا اور مجھے اپنی اس چاہت کے بدلے میں تمہاری نفرت ملی۔ میرے دل کی نگری جو تمہارے دل سے آباد تھی اجڑ کر رہ گئی۔

میں نے تو تمہیں اپنی محبت کا خدا جانا تھا۔ تمہارا دل میری وفا کی تپش سے بھی موم نہ ہو سکا... او ظالم تو کیسا صنم نکلا، جس نے مجھ سے میری خوشیوں کو آہوں میں بدل دیا۔ زندہ رہنے کا حوصلہ مجھ سے چھین لیا۔ اور آج میری آنکھوں کی چمک بھی مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ میرا مسکراتا چہرہ ہمیشہ کے لیے غموں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا ہے۔ میں تڑپ رہا ہوں۔ سسک رہا ہوں... آج درد کی دہلیز پر کھڑا میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی بکھری ہوئی اس شخصیت کا شیرازہ کیسے سمیٹ سکوں گا... میرے لب پیار کی ہلکی سی مسکراہٹ کے لیے ترس گئے ہیں۔ تو زندگی کے قہقہوں کو کیسے اپنا سکوں گا۔ مگر ایک لگن ہے۔

جولی..! میری آنکھوں میں ٹپکتے ہوئے مایوسیوں کے سائے میں بھی تمہارا ہی عکس ابھرتا ہے۔ میں نے کس شدت سے تمہیں چاہا۔ کاش تمہیں اس کا ذرا بھر بھی اندازہ ہو جاتا۔ میں تو تمہاری محبت کو ہی اپنا حاصل زیست سمجھتا رہا۔ کاش تم میری محبت کی گہرائی کا ذرا بھر بھی احساس کر سکتی۔ نہ جانے تمہاری محبت نے سمرنے مجھے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ تمہاری محبت میں کھو کر میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ شادو کو بھی.. جو کہ میرے بڑے بھائی کی سالی تھی۔ شادو جو کہ قدم قدم پر میری راہوں میں اپنی محبت کے پھول نچھاور کرتی رہی۔ میں جن راہوں سے گزرتا وہ ان راہوں پر اپنی نگاہوں کا فرش بچھا دیتی۔ مگر میں اسے وہ پیار نہ دے سکا۔ جس کے لیے وہ مجھ سے متلاشی تھی۔

جولی..! اس دل میں تمہارے سوا کوئی اور نہ سما سکتا تھا اس دل میں تمہیں بسا کر اب اتنی جگہ نہ تھی کہ کوئی دوسرا سما سکے۔ میرے دل میں محبت کا خانہ تمہارے نام سے پر ہو چکا تھا۔ اس دل کی دھڑکنیں تو تمہارے نام وقف ہو چکی تھیں۔ پھر اس دل کی دھڑکنوں کی زینت کوئی اور کس طرح بن سکتا تھا۔

شادو میری محبت کی آگ میں جلتی رہی۔ اور میں تمہاری یادوں میں گنگناتا رہا۔ شادو نے پہلے ہی چپکے میری ذات سے بہت بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ اس کا اظہار مجھے اس وقت ہوا جب اس کے پیار بھرے تاثرات مجھ پر یوں واضح ہونے لگے تھے۔

جان سے پیارے شاہد

سلام محبت!

ہزار کوشش کے باوجود میں اپنے دل پر اختیار نہ رکھ سکی۔ اور آج دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہارے دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہوں۔ امید ہے ناگوار نہ گزرے گی۔

جواب عرض لاہور

اپریل ۱۹۸۳ء

ہائے تیری بے رُخی

شاہد . . ! محبت ہر کوئی کرتا ہے۔ مگر محبت کر کے اپنی منزل کوئی کوئی پاتا ہے۔ . یہ جانتے ہوئے بھی میں آپ سے اظہارِ محبت کر رہی ہوں۔ نہ جانے پھر ہم کیوں اپنا دن رات کا سکھ چین حرام کر کے محبت کی آگ میں کود جاتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ جذبۂ محبت بے اختیار ہے اور ہم سب دل کے سامنے بے بس ہیں۔

شاہد جی ! میں تمہیں بے حد پیار کرتی ہوں۔ اور تمہیں خود سے بڑھ کر چاہتی ہوں۔ کاش تم میری محبت کی شدت کا اندازہ کر سکو۔ دن رات سے گردش کرتے لمحات کے ساتھ میں تمہاری محبت میں اس قدر آگے نکل آئی ہوں کہ اب واپسی کا تصور ہی رلا دیتا ہے . . . جہاں سے واپس لوٹ جانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

شاہد جانی . . ! زندگی کی بعض راہیں بہت زیادہ سنگین ہوتی ہیں۔ مگر جذبۂ محبت انسان کو اس سنگینی سے بے نیاز طلب کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اسی جذبے سے مجبور ہو کر میں تمہاری محبت کی طلب کرتی ہوں۔ یہ جاننے کے باوجود کہ محبت ایک ایسی گم گشتہ راہ ہے جس پر چل کر کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا اور انسان انہی خار دار راہوں پر چل چل کر آبلہ پا ہو جاتا ہے۔ مگر منزل کی جستجو مزید آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیتی ہے۔

شاہد . ! اب سوچتی ہوں کہ تمہارے بنا بھی کیا زندگی۔ اب میری زندگی کی ہر خوشی تم سے وابستہ ہے۔ پھولوں سے خوشبو چرا کر بہاروں کی مہک اڑا کر اور ستاروں کی روشنی لے کر تمہارے سامنے رکھ دوں تو یہ سب کچھ تمہارے آگے ماند پڑ جائیں۔

پیارے شاہد . . ! جو اتنی محبت کرے اور وہ پھر پیار سے محروم رہے۔ اس سے بڑھ کر قدرت کی ستم ظریفی اور خود اس کی بدنصیبی کیا ہو گی۔ میری زندگی کی صرف ایک ہی آرزو ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر تم اور ہم ایک قدم بن کر ساتھ ساتھ چلیں۔ اس لیے کہ تمہارا ساتھ ہی میرے لیے انمول خزانہ ہے . . . میں نہیں جانتی کہ میں اپنی منزل پا بھی لوں گی یا سدا گردشِ سفر رہوں گی . . . پھر بھی تمہاری محبت کی دل و جان سے تمنا رکھتی ہوں۔

فقط تمہاری پجارن شادو

مگر جولی . . ! میں شادو کی محبت کا جواب محبت سے نہ دے سکا۔ اس کی وفاؤں کا احساس ہوتے ہوئے بھی میں اس کی وفا کی قدر نہ کر سکا۔ اس لیے کہ میں مجبور تھا۔ میں تمہارے سوا کسی اور کا تصور کرنا بھی گناہ سمجھتا تھا۔ اور پھر میری طرف سے مسلسل خاموشی نے اسے دوبارہ بولنے پر مجبور کر دیا۔ شادو ایک بار پھر مجھ سے اپنی محبت کی بھیک مانگنے لگی۔ مجھے اس کے لفظوں کی بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

شاہد . . ! تم کب تک میری وفاؤں سے منہ چراؤ گے۔ میرے جذبوں کی صداقت تمہیں میری وفا کے سامنے جھکنے پر مجبور کر دے گی۔

شاہد . . ! تم بھی کیسے دیوانے ہو تم اس کی محبت کی آگ میں جل رہے ہو، جسے تمہاری پرواہ تک نہیں۔ آؤ ان پیار بھری کھلی باہوں میں سما جاؤ۔ . تمہیں میرے پیار کی ٹھنڈی چھاؤں میں وہ سکون ملے گا کہ تمہارے دل سے محرومیوں کے تمام سائے مٹ جائیں گے۔ میں تمہیں وہ پیار دوں گی۔ کہ تم اپنے وجود کو ہی فراموش کر ڈالو گے۔

شاہد . . ! تم ایک بار اپنے دل میں میرا پیار بسا کر تو دیکھو میں اپنے پیار کی روشنی سے تمہاری روح کی تاریکیاں مٹا کر جگمگا دوں گی۔ محبت کی منزل پانے کے لیے ہمسفر کا ہونا لازمی ہے . . . بنا ہمسفر کے یہ سفر اک سزا ہے۔ تم اکیلے ان خار دار اور دشوار گزار راہوں میں کیسے چل سکو گے۔ زندگی کی اونچی نیچی راہوں پر مجھے اپنا ساتھی بنا لو . . . میں ہمیشہ ہم قدم بن کر تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تمہاری راہوں میں بچھے ہوئے کانٹے اپنی پلکوں پہ سجا لوں گی۔ تمہارے درد کو اپنے دل کی دھڑکن بنا لوں گی۔

شاہد . . ! تم اقرارِ وفا کر کے تو دیکھو۔ پھر تمہاری محبت میں کھو کر تپتے ریگزاروں میں بھی میں اپنی جان کا نذرانہ دے دوں گی . . . بشرطیکہ تمہارا پیار مل جائے . . . تمہارا اقرار مل جائے . . . اور تم منزل تک میری رہنمائی کرو۔

یاد رکھو شاہد . . ! اگر تم بہار بن کر میری زندگی میں نہ آئے تو میری ساری زندگی خزاں کی نذر ہو جائے گی . . . اور کسی کا تو تصور کرنا بھی میرے لیے ایک بہت بڑا گناہ ہے۔ جس کو میں نہیں سہہ سکتی۔

تم جہاں کہیں بھی رہو گے۔ میری نظر تمہیں مجھ سے دور نہیں ہونے دے گی۔ اب تم سے دوری کا تصور ہی محال نظر آتا ہے۔ شدت محبت سے مجبور ہو کر میں نے تمہیں ہی اپنا سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ خدا کرے کہ میرا یہ خوش کن تصور خوب صورت سپنا جلد حقیقت کا روپ دھار لے۔

شاید آ جاؤ... میرے دل کا اقرار بن کے آ جاؤ۔ میرا چمن سنگھار بن کے آ جاؤ... میرا من تمہارے بن کتنا سونا سونا ہو کر رہ گیا ہے۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ میرا وجود تمہارے انتظار کی آگ میں جل جل کر راکھ ہو گیا ہے۔ اور اب کہیں راکھ کا ڈھیر تیز ہوا کے جھونکوں پر اڑتا ہوا بکھر نہ جائے۔

تم کسی کی بے رخی کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہو شاید زمانے بھر کی باتوں کا بدلہ مجھ سے کیوں لے رہے ہو۔ آ جاؤ آ جاؤ... میری چشم تمہارے دیدار کی منتظر ہیں... میرے کان آہٹ پہ ہیں۔

دیکھو جولی... میں بھی کتنا بدنصیب ہوں۔ تقدیر نے زندگی کے کس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں سے کوئی راستہ بھی منزل تک جاتا دکھائی نہیں دیتا۔ شاید کہ محبت کا اقرار کر دوں تو اپنے دل کی دنیا اجڑ جاتی ہے اگر اس کے پیار کا جواب پیار سے نہ دوں تو اس کے جذبات میرے اندر ہلچل مچا دیتے ہیں... تقدیر کس قدر بے رحم اور میں کس قدر مجبور ہوں۔ میں تمہاری تمنا کرتا ہوں... مگر تمہارا پیار میسر نہیں آتا۔ اور شاید میری محبت کی آگ میں سلگ رہی ہے۔ اور میں اس کے درد سے بے خبر ہوں شاید اس لیے کہ ؎

اس دنیا میں کسی کو کچھ حسب آرزو نہ ملا

کسی کو ہم نہ ملے اور کسی کو تو نہ ملا

جولی...! یہ محبت کا جذبہ بھی کس قدر عجیب ہے جو ایک بار دل میں بس جائے، وہ دل سے جاتا نہیں اور اگر کسی اور کو دل میں بسانا چاہوں تو وہ سماتا نہیں... جولی... میں نے تم سے عجیب محبت کی تھی۔ حالانکہ تم اتنی حسین بھی تو نہ تھی اور پھر مجھے بھی چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ مگر مجھے تمہاری صورت سے کوئی سروکار نہیں۔ میں نے تو تمہاری روح کی پوجا کی تھی۔

میں ہر پل تمہاری یاد میں بے کل رہتا تھا۔ مگر تمہیں میری بے قراریوں کا ذرا بھی خیال نہ تھا...

جولی۔ جب کبھی تمہاری محبت کا طوفان میرے سینے میں ٹھاٹھیں مارتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ اب تمہارا پیار اس دل سے کبھی نہ جائے گا۔ چاہے تم دعا کرو نہ کرو۔ میں پھر بھی تمہیں اس شدت سے چاہتا رہوں گا۔ یاد رکھنا جولی! یہ دنیا مٹ جائے گی... انسانی وجود ختم ہو جائے گا... گلشن ویران ہو جائیں گے... پھولوں میں خوشبو باقی نہ رہے گی۔ کائنات کا وجود مٹ جائے گا... تم بھی نہ رہو گی... میں بھی نہ رہوں گا... مگر میرا پیار سدا قائم رہے گا۔

میں تمہیں امر کر دینا چاہتا ہوں کہ تمہارا پیار دل میں بسا کر میں زندگی کے نئے رشتے سے آشنا ہوا تھا۔ مگر تمہاری بے رخی کا اذیت ناک تصور پھر میرے حواس پر چھا جاتا ہے... تو میری آنکھوں میں غم کے بادل تیرنے لگتے ہیں موت کے سائے میرا مقدر بن گئے ہیں۔ اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا۔

کیوں جولی...؟ میں زندگی کا ہر لمحہ تمہاری چاہت میں گزار دوں تو بھی میرے دل سے تمہارا پیار کم نہیں ہو گا۔ میری زندگی بہت کم اور تمہارا پیار بہت زیادہ ہے۔ ایک تصور ہے جو میرے ذہن کے پردے پر کبھی کبھی ابھرتا ہے کہ محبت تو اس وقت ہی اپنی تکمیل کو پہنچتی ہے جب چاہت کی آگ دونوں طرف سے ایک جیسی بھڑک رہی ہو۔ اور تم نے میرے پیار کا اقرار کرنے کے باوجود مجھے ایسی راہوں پہ ڈالا ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔

جولی... ذرا سوچو... تمہارے اپنے دیے ہوئے زخم کیا کم تھے... تم نے میری محبت کا مذاق اڑا کر میرے صادق جذبوں کی جو توہین کی ہے اس کے لیے خدا تمہیں معاف نہیں کرے گا۔

جولی...! اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے ترکِ تعلق کا... ترکِ محبت کا... تمہیں بھول جانے کا... اب میں تم کو بھول جاؤں گا تمہارا نام دل سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دوں گا میں وہ پل ہی توڑ دوں گا جس پر چل کر تم میری زندگی میں داخل ہو سکو۔ میں خود انہی راہوں پر پلٹ جاؤں گا۔ جن راہوں پر چل کر میں نے تمہاری زندگی میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی تمہارا نام لے کر اب تمہیں کبھی آواز نہ دوں گا۔

ہائے تیری بے رخی

سوچتا ہوں کہ اب تمہارے نام کو اس قدر عظمت کون دے گا۔ ہادر کھنا جولی۔۔! حسن کے یہ پجاری اس وقت تک تمہارے ارد گرد منڈلاتے رہیں گے جب تک تم میں ذرا بھی کشش باقی ہوگی۔ اور جب حسن کی جگمگاتی شمع ماند پڑ جائے گی۔ اور تمہارے قدم جوانی کی دہلیز عبور کرتے ہوئے بڑھاپے کی جانب بڑھیں گے تو تم بالکل تنہا رہ جاؤ گی۔

تب تم پیچھے مڑ کر دیکھو گی تو سب سہارے منہ موڑ چکے ہوں گے۔۔۔ تم آواز دو گی تو تمہاری صدائیں سننے والا کوئی نہ ہوگا۔ تم اپنی تنہائی کے خوف سے روؤ گی۔ مگر تمہارے آنسو پونچھنے والا کوئی نہ ہوگا۔۔۔ تمہاری راتیں سنسان اور ویران ہو جائیں گی۔۔۔ زندگی کی خوشیاں تم سے منہ موڑ کر کسی اور کے لبوں کی زینت بن جائیں گی۔۔۔ تم اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوگی۔۔۔ مگر کوئی دلاسہ دینے والا نہ ہوگا۔

تمہیں میری وفاؤں کا خیال اس وقت آئے گا جب بہت دیر ہو چکی ہوگی۔۔۔ تم مجھے پکار رہی ہوگی۔۔ مگر تمہاری آواز بھی مجھ تک نہ پہنچ پائے گی۔۔۔ تمہارا روشن وجود تاریکیوں میں ڈوبتا چلا جائے گا۔

جولی۔۔! آج میں تم سے اتنا ضرور پوچھوں گا کہ میری زندگی ویران کر کے تمہیں کیا ملا ہے۔۔۔ اچھا جولی! میرا کیا ہے بہت جی لیا ہے میں نے تمہارا پیار تو مجھے میسر نہ آ سکا۔۔۔ اب تمہارے بخشے ہوئے غم ہی تمہارے پیار کی نشانی سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے رکھوں گا۔۔۔

جولی۔۔! میں تمہیں دعائے بد تو نہیں دوں گا۔۔۔ البتہ تمہاری جفاؤں کے صلے میں دعا ضرور دیتا ہوں۔

خدا کرے جولی۔۔! کہ تمہاری زندگی کی مسکراہٹیں ہر دم تمہارے لبوں سے کھیلتی رہیں۔۔۔ تمہارے چہرے کی یہ شادابی سدا برقرار رہے۔۔۔ زندگی بھر کی وحشتیں میرا مقدر بن جائیں۔۔۔ اور کامیابی و کامرانی کی منزلیں، ہمیشہ کے لیے تمہیں مبارک ہوں۔

رات کے بے سکوں لمحوں میں چپکے چپکے صدا دیتا ہوں
میرے دل کی دنیا اجاڑنے والے تجھے اب بھی دعا دیتا ہوں

داناؤں کے اقوال

۱۔ ماں اور پھول میں مجھے کوئی فرق نظر نہیں آتا۔
(نادر شاہ)

۲۔ حسرتوں کے ہجوم اور خوشیوں کے تلاطم میں ماں کی عظمتوں کو دیکھو۔ (بونا پارٹ)

۳۔ ماں کی زندگی میں محبت اور مہربانی کا عنصر شامل کیا گیا ہے۔ (ایرس)

۴۔ ماں کی محبت حقیقت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔
(مولانا الطاف حسین حالی)

۵۔ ماں کا پیار سب سے خوبصورت اور شیریں ہے۔
(چارلس ڈکنز)

(مرسلہ: محمد رفیق، جدہ السعودیہ)

یادیں

* یادیں انسان کی بہترین ساتھی ہیں جسے دنیا کی کوئی طاقت اس سے جدا نہیں کر سکتی۔
* یادیں ابتداء میں کچے دھاگے کی مانند ہوتی ہیں لیکن بعد میں آہستہ آہستہ لوہے کی تار بن جاتی ہیں۔ جن کے پنجرے میں انسان کی شخصیت محصور ہو کر رہ جاتی ہے۔
* خوبصورت یادیں ماضی کا انمول خزانہ ہیں، جو حال کی تلخیوں پر مرہم کا کام دیتی ہیں۔
* یادیں مایوسی میں امید کا جلتا ہوا روشن چراغ ہیں۔
* خوشگوار یادیں ایک ایسے پھول کی مانند ہوتی ہیں، جن کی خوشبو زندگی کے آخری لمحے تک محسوس کی جاتی ہے۔۔۔
* یادیں اس حنا کی مانند ہوتی ہیں جو سوکھ جانے کے بعد رنگ لاتی ہے۔

(مرسلہ: ایم طارق خیام، سیالکوٹ کینٹ)

ناقابلِ فراموش واقعات

سُلگتے اَرمان

زیرِ نظر واقعہ میرے ایک نہایت ہی عزیز ترین دوست کے ساتھ پیش آیا اور میں اس کو زبانی اپنے قارئین کی نذر کر رہا ہوں...

آج جب بھی میں اپنا کٹا ہوا بازو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنی بدقسمتی کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے۔ چند سال قبل کی بات ہے کہ میرے گھر والوں نے میرے میٹرک کے امتحان کے فوراً بعد میری منگنی لاہور میں میرے ماموں کے ہاں کر دی۔ میں نے اس چھوٹی سی عمر میں شادی کرنے سے انکار کر دیا... مگر والدین نے اپنی خواہشات کا پھر سے اظہار کیا، جس کی وجہ سے مجھے اپنے والدین کی خواہشات کے سامنے سر جھکانا ہی پڑا۔ میری منگیتر آرزو بھی ان دنوں میٹرک کا امتحان پاس کر چکی تھی۔ آرزو مجھے بہت چاہتی تھی اور میں بھی اسے بہت پسند کرتا تھا۔ منگنی کے بعد میں ایک بار ضرور لاہور گیا تھا... آرزو نے نہ جانے اپنی آئندہ زندگی کے لیے کیا کیا منصوبے بنا رکھے تھے، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا

ایک دن جب میں لاہور جانے کے لیے بس پر سوار ہوا تو بس اسی دن سے میری بدقسمتی کا آغاز ہوا۔ بس اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ میں سہ پہر کے وقت بس پر بیٹھا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد شام ہو گئی اور رات نے آہستہ آہستہ اپنی سیاہی بکھیرنا شروع کر دی... راستے میں ایک ہوٹل پر بس رکی، کھانا وغیرہ کھانے کے بعد سبھی سواریوں سمیت بس پھر چل پڑی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہی مجھے نیند آنے لگا اور پھر میں عادت کے مطابق بس سے ایک بازو باہر نکال کر سو گیا... چند ہی لمحوں کے بعد میری چیخیں نکل گئیں... مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری جان ہی نکل گئی ہو اور میں درد کی شدت کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا اس کے بعد مجھے کچھ خبر نہ رہی...

جب میں نے آنکھ کھولی تو سبھی گھر والے میری چارپائی کے گرد اکٹھے اللہ کے حضور شکر کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ اور میری امنگوں کی ترجمان آرزو بھی ایک کونے میں دبکی کھڑی تھی...

میں نے اپنے گھر والوں کو یہ سارا قیامت خیز واقعہ کہہ سنایا... غلطی میری اپنی ہی تھی، جس کا مجھے اتنا بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا... کہ میرے سارے کے سارے ارمان سینے میں سُلگتے رہ گئے...

پھر چند روز بعد ہی پتہ چلا کہ آرزو کے والدین نے میرا بازو کٹ جانے کی وجہ سے مجھے رشتہ دینے سے انکار کر دیا ہے... یہ صدمہ تو میرے لیے قطعاً ناقابل برداشت تھا۔ اور پھر مجھے بے ہوشی کی حالت میں ہی دوبارہ ہسپتال لے جایا گیا۔ لیکن اس مرتبہ میرے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے سوا کوئی میرا حال دریافت کرنے نہ آیا۔

جواب عرض لاہور

آرزو نے پہلے تو کسی اور سے شادی کرنے سے انکار کر دیا، لیکن بعد میں وہ اپنے سخت مزاج والدین کے آگے ہاں کرنے پر مجبور ہو گئی ... شاید اس کی محبت ہی نامکمل تھی ... اس واقعہ کو آج پانچ سال بیت گئے ہیں مگر میرا شادی کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ حقیقت میں میرے ارمانوں کی نگری اجڑ چکی ہے اور جو ارمان باقی ہیں وہ ہمیشہ کے لیے شگفتہ رہیں گے ...

(طاہر محمود تبسم ریلوے روڈ۔ دینہ)

ناکام حسرت

زیر نظر واقعہ کو گزرے تین سال بیت گئے ہیں لیکن مجھے آج بھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کل کا واقعہ ہو۔ اس میں کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جن پر شبہ گزرتا ہے کہ یہ کوئی افسانہ ہے لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے ...

میں اس وقت درجہ دہم کا طالب علم تھا۔ موسم گرما کی تعطیلات کے کچھ روز اپنے ایک دوست، جو کہ حیدر آباد پولیس میں ملازم تھے، کے ہاں گزارنے کا پروگرام بنایا۔ جب میں حیدر آباد پہنچا تو مجھے پولیس لائن کا علم نہ تھا میں نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نکالا اور لب سڑک کھڑے دو نہایت ہی خوب صورت نوجوانوں سے مخاطب ہوا:

"بھائی جان! مجھے اس پتہ پر جانا ہے؟"... یہ کہتے ہوئے جب میں نے ان دونوں نوجوانوں کی طرف غور سے دیکھا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ خدا کی قدرت کا کمال یاد آیا۔ دونوں اس قدر ہم شکل تھے کہ مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا، میں نے بار بار اپنی آنکھیں جھپکیں مگر وہ اٹل حقیقت کی طرح میرے سامنے کھڑے تھے ... پہلے تو وہ مجھے زبانی طور پر سمجھاتے رہے پھر ایک صاحب نے اپنی جیب سے قلم نکالا اور دوسرے صاحب نے کاغذ نکالا ... پھر ایک لڑکے نے لائنوں کے ذریعے نقشہ بنایا، جبکہ دوسرے صاحب نے اس نقشہ پر مشہور مقامات کے نام درج کیے۔ نقشہ تیار ہو جانے پر انہوں نے کمال شفقت سے مجھے سمجھایا۔۔ مگر پوچھیں ناں تو میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ کیونکہ میرا ذہن تو مسلسل ان کی شکل و صورت کی مشابہت میں گم تھا۔ اور ان کی مشترکہ حرکات کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ ان سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے ان کے نام پوچھنے کی جرأت کر ڈالی ...

ان میں سے ایک صاحب بولے۔ میرا نام طاہر ہے۔

جب دوسرے سے پوچھا کہ بھائی جان آپ کا نام ... تو انہوں نے بھی کہا کہ ... طاہر ... اس پر میں نے کہا کہ آپ دونوں کے نام بھی ایک ہیں ...؟

کہنے لگے ... "جی ہاں"۔

ان مہربانوں کے بنائے ہوئے نقشہ سے میں نے اپنے طور پر بڑی کوشش کی کہ خود ہی اس کی مدد سے منزل تک پہنچوں، لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔ کچھ تھوڑا سا سفر طے کیا، مگر منزل ندارد ... تب میں نے دوبارہ کسی سے مدد لینا مناسب خیال کیا۔ لہٰذا ایک ضعیف اور نیک بزرگ مل گئے، جب میں نے ان سے رابطہ قائم کیا تو وہ کہنے لگے ... "بیٹا گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں خود تمہیں پولیس لائن میں چھوڑ کر آؤں گا"... تب میں ان نیک سیرت بزرگ کی مدد سے پولیس لائن پہنچ گیا، اور میرا دوست بھی مجھے مل گیا ... میں نے ان بزرگ کی راہنمائی کا بہت شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد جب ہم دونوں دوست کھانے سے فارغ ہو کر بیٹھے تو میرے دوست نے پوچھا کہ آپ کس طرح یہاں تک پہنچ پائے ہیں۔ کیونکہ میں تو پہلی مرتبہ حیدر آباد گیا تھا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا، کیا پوچھتے ہو آپ کو کیا بتاؤں ...؟ تب میں نے ان دو طاہروں کا سارا قصہ اسے سنا دیا ... میرے دوست کہنے لگے ...

بہت خوب ... تو حیدر آباد میں سب سے پہلے آپ کی ملاقات ایسے دو نوجوانوں سے ہوئی ہے جو کہ اپنی خوبیوں سے بہت مشہور ہیں ...

میں نے کہا ... میں تو اس پہلی ملاقات سے ہی بہت متاثر ہوں اور جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر ان سے

ملوں ...“ میں نے کہا۔

میرا دوست بولا ..." ایسی کوئی بات نہیں، میرے ان سے بہت اچھے مراسم ہیں۔ میں آپ کو ساتھ لے چلوں گا اور ان سے ملواؤں گا ... ان دونوں میں اتنا کچھ مشترک ہے کہ ذہن تسلیم نہیں کرتا ... دل کو یقین نہیں آتا “۔

قارئین! اس واقعہ کا یہی وہ پہلو ہے جس کی صداقت پر شک گزرتا ہے، لیکن شک کی گنجائش یوں نہیں ہے کہ میں خود اس کا شاہد ہوں۔ ہاں تو میرے اس دوست نے ان کی داستان کچھ یوں سنائی:

ان دونوں طاہروں کی تاریخ پیدائش ایک ہے، دن بھی ایک ہی ہے۔ مزید یہ کہ جب ان کے والدین نے انہیں اسکول میں داخل کرایا تو تاریخ داخلہ بھی ایک ہی ہے ... یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ان کے داخلے اسکول الگ الگ تھے۔ مڈل تک یہ اپنے اپنے اسکولوں میں اپنی جماعت میں اوّل پوزیشن حاصل کرتے رہے ... جونہی انہوں نے مڈل پاس کیا تو ان کے والدین کے تبادلے حیدر آباد میں ہو گئے۔

حیدر آباد کے ایک اسکول میں جب ایک طاہر کو داخل کرانے کے بعد باپ بیٹا واپس لوٹے تو کچھ ہی دیر بعد اسی اسکول میں دوسرے طاہر کے جماعت نہم میں داخلے کے لیے باپ بیٹا پہنچے۔ جب وہ اسکول کے داخلہ معاملات کے استاد کے پاس پہنچے تو وہ استاد کہنے لگے۔

” آپ پھر کیوں آ گئے ہیں “؟

اس طاہر کے والد نے جواباً کہا ...” جناب ہم تو ابھی آ رہے ہیں۔ میں نے اپنے بیٹے کو جماعت نہم میں داخل کرانا ہے “...

استاد کہنے لگے ” بھئی آپ کے بیٹے کا نام طاہر ہے ناں، اور ابھی میں نے یہ نام درج کیا ہے “...

اس پر طاہر کے والد سخت حیران ہوئے کہ ان کو میرے بیٹے کا نام کس طرح معلوم ہو گیا۔ خیر اس طاہر کے والد نے کہا ..” جناب وہ کوئی اور ہوں گے .. یہ لیجیے میرے بیٹے طاہر کا سرٹیفکیٹ “..

جب سرٹیفکیٹ پر ان استاد صاحب نے طاہر ولد عبدالقیوم لکھا دیکھا تو وہ اور بھی سر بند ہوئے کہ حالی جناب طاہر ولد عبدالقیوم نام کا لڑکا ابھی درج ہوا ہے “!

حسنِ اتفاق دیکھیے کہ ان دونوں طاہروں کے والد بھی ہم نام تھے۔ اس پر طاہر کے والد اور پریشان ہوئے۔ خیر وہ پڑھے لکھے انسان تھے۔ فوراً ان کے ذہن میں یہ بات آئی۔ انہوں نے استاد صاحب سے کہا:

” طاہر نام کا جو لڑکا پہلے داخل ہوا ہے، اس کا سرٹیفکیٹ نکالیں ذرا .. اور میرے طاہر کا سرٹیفکیٹ بھی سامنے رکھیں “..

جب دونوں اسناد سامنے رکھی گئیں، تو سابقہ اسکول جہاں انہوں نے مڈل تک تعلیم حاصل کی تھی ... الگ الگ ظاہر ہوئے۔ اس طرح بعد میں آنے والے طاہر کا نام بھی درج ہو گیا ...

اب دونوں ایک ہی جماعت میں بیٹھنے لگے۔ اسی اسکول میں انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا ... اور دونوں نے ہی اوّل پوزیشن حاصل کی۔ اس وقت وہ سالِ اوّل کے طالب علم ہیں۔ اور وہ دونوں گہرے دوست بھی ہیں ...

جب میں نے اپنے دوست کی زبانی اتنے سارے حیران کن حالات سنے تو میرا اشتیاق اور بڑھ گیا کہ کب رات گزرے اور صبح ان سے ملوں۔ لیکن عجیب میں دوبارہ ملاقات نہ تھی ... صبح ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم نے ملاقات کا پروگرام بنایا۔ ہم سڑک کے کنارے جا کھڑے ہوئے ... میرے دوست کے مطابق کہ وہ نو بجے موٹر سائیکل پر سوار یہاں سے گزریں گے۔ ہم یہیں ان سے ملاقات کریں گے۔ ورنہ قریب والے ہوٹل میں بیٹھ کر ایک کپ چائے بھی پئیں گے ...

اتنے میں میرے دوست کے ایک واقف کار آ گئے، اور وہ ان سے اپنے محکمہ کی باتوں میں مشغول ہو گئے .. ان دونوں کی پشت سڑک کی جانب تھی، جبکہ میں سڑک کی طرف ہی دیکھ رہا تھا اور کسی وقت سڑک سے نظر ہٹا بھی دیتا تھا ... ایسے میں سڑک پر ایک ٹینک بردار

گاڑی گزرنے لگی ... جس کے آگے راستہ صاف کرانے کے لیے ۲۰ یا ۲۵ گز کے فاصلے پر ایک موٹر سائیکل سوار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس دیو ہیکل گاڑی کے ڈرائیور کو اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے پانچ سات گز کے فاصلے تک کچھ دکھائی نہیں دیتا...

جب یہ ٹینک بردار گاڑی ہم سے تقریباً دس گز کے فاصلہ پر تھی کہ پیچھے سے دو موٹر سائیکل سواروں نے اس گاڑی کو کراس کیا... کراس کرنے کے بعد جونہی وہ اپنی بائیں جانب ہوئے، موٹر سائیکل ایک جھٹکا کھا کر بند ہو گیا۔ اس سمے ٹینک بردار اور اس موٹر سائیکل کے درمیان مشکل سے پانچ گز کا فاصلہ رہ گیا ہو گا.. مجھے اس وقت اس بات کا علم نہیں تھا کہ ایسی ٹینک بردار گاڑی کے ڈرائیور کو اپنی سیٹ پر بیٹھے پانچ سات گز آگے تک سڑک پر کچھ نظر نہیں آتا۔ خیر جب موٹر سائیکل بند ہوا تو اس کے سواروں نے اسے اسٹارٹ کرنے کے لیے ایک کک لگائی... مگر وہ اسٹارٹ نہ ہوا۔ اتنے میں وہ گاڑی ان کے بالکل قریب آ گئی۔ تب میں نے اپنے دوست کو جھنجھوڑا اور شور مچاتے ہوئے گاڑی کے ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا کہ مارے گئے... مارے گئے....

مگر ان کی موت میرے شور سے بھی قریب تھی۔ اور پھر ہماری آنکھوں کے سامنے ہی ایک موٹر سائیکل پر دو نوجوان سوار خون میں لت پت ہو گئے۔ ٹینک سمیت پوری گاڑی ان کے اوپر سے گزر گئی... دو جسموں کی ایک روح پرواز کر گئی۔ ان لاشوں کے قریب سب سے پہلے پہنچنے والے ہم ہی تینوں نوجوان تھے.... اور یہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دونوں لاشوں کے درمیان تقریباً تین گز کا فاصلہ تھا اور یہ تین گز کی زمین جہاں جہاں لاشیں پڑی ہوئی تھیں، ان سے اونچی تھی...

لیکن پھر ہوا کیا... یہ مزید حیران کن بات تھی، کہ ایک خون نے ڈیڑھ گز اونچائی کی طرف فاصلہ طے کیا... اور پھر دوسری طرف سے دوسرے طاہر کے خون نے بھی اونچائی کی طرف فاصلہ طے کیا اور بلند مقام پر آ کر دونوں کے خون ایک ہو گئے... اتنے میں اور لوگ بھی آ گئے۔ یہ اپنی دو دوستوں کی جوڑی تھی، جو ہم شکل بھی تھے اور ہمنام بھی...

یہ سب کچھ دیکھتے ہی میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے... اور مجھے اس حادثے کا اس قدر دکھ ہوا کہ آج تک یہ صدمہ کم نہیں ہو سکا۔

(محمد نعیم ابوصالح، پٹ دار روڈ۔ راولپنڈی)

صلہ

یہ واقعہ خود میرے ساتھ کافی عرصہ قبل لاہور میں پیش آیا، جسے میں آج تک بھلا نہ سکا ہوں.. لیجئے قارئین آپ بھی پڑھیئے:

ان دنوں مغل پورہ لیبر ہورڈ لوکو شاپ میں، میں اور اشفاق نامی ایک لڑکا ایک ہی آفس میں کام کرتے تھے۔ میں ان دنوں رنگیل چوک کے قریب ٹمپل روڈ پر رہائش رکھے ہوئے تھا، جبکہ اشفاق رنگ محل میں اپنے ماموں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے ماموں بھی اسی آفس میں کلرک تھے..

ایک دن اشفاق نے باتوں باتوں میں مجھ سے پوچھا کہ تم جس مکان میں رہ رہے ہو وہ کتنا بڑا ہے۔ میں نے کہا کہ دو گھر بآسانی اس مکان میں رہ سکتے ہیں۔ اس وقت تو بات آئی گئی ہو گئی... مگر چند روز بعد ہی اشفاق نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی بیوی کو کچھ دنوں کے لیے آپ کے گھر رکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں نے اپنی پسند کی شادی کی ہے اور میرے گھر والے میری بیوی کو اپنے ساتھ رکھنے پر ابھی رضامند نہیں ہو رہے۔ میں مکان کی تلاش میں ہوں، جگہ کا بندوبست ہوتے ہی ہم اپنے مکان میں شفٹ ہو جائیں گے....

میں نے انسانی ہمدردی کے جذبہ کے تحت حامی بھر لی۔ اور اشفاق چند روز ہی اپنی بیوی نسیم کو لے کر میرے ہاں آ گیا۔ اور کہنے لگا کہ آپ کے ہاں صرف نسیم ہی رہے گی، جبکہ میں ابھی اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی رہوں گا!!۔ میں نے کہا کہ جیسے تمہاری مرضی...!

نسیم ہمارے ہاں آتے ہی میرے بیوی بچوں سے گھل مل گئی ... ایک دن میری بیوی نے بتایا کہ نسیم چند ماہ بعد بچے کی ماں بننے والی ہے۔ تو میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ تم اس کا خاص خیال رکھا کرو اور اسے کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے دینا ...

دوسرے دن جب میں اشفاق سے دفتر جا کر ملا اور اسے بتایا کہ تم بہت جلد بچے کے باپ بننے والے ہو تو اس نے کہا کہ جیسا آپ ہی ان دونوں نسیم کے وارث ہیں۔ میں نے کسی اعتماد کے تحت ہی نسیم کو آپ لوگوں کے پاس چھوڑا ہے ....

دو ایک ماہ کے اندر ہی نسیم ہمارے گھر کا ایک فرد معلوم ہونے لگی ... ہمیں کہیں بھی جانا ہوتا تو ہم گھر اس کے سپرد کر کے چلے جایا کرتے۔ اشفاق سے تو روز ہی آفس میں میری ملاقات ہوتی اور میں اسے نسیم کا حال احوال بتا دیا کرتا۔ اشفاق بھی کبھی کبھار بیوی سے ملنے کے لیے آ جایا کرتا تھا.. ایک دو بار نسیم اپنے عزیزوں سے ملنے گئی اور واپس آ گئی۔ ایک دن جب میری بیوی نے کسی عزیز کی شادی میں جانے کے لیے جب اپنے زیورات نکالنے چاہے تو تمام زیور غائب تھے اور ان کی جگہ صرف خالی ڈبے پڑے ہوئے تھے۔ بیوی یہ منظر دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی اور جب اسے ہوش آیا تو وہ روتی ہوئی بولی:

"ہائے میرے زیور ... ہائے میں لٹ گئی"!

اب ہماری نگاہ میں سوائے نسیم کے اور کوئی چور نہیں تھا .. میں نے جب اس بات کی خبر اپنے دوست اشفاق کو دی تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ میری بیوی ایسی نہیں ہو سکتی۔ اور بجائے اس کے کہ وہ میرے ساتھ ہمدردی کرتا، الٹا اس نے میرے ساتھ جھگڑنا شروع کر دیا کہ آپ لوگوں نے میری بیوی پر ناجائز الزام لگا کر اچھا نہیں کیا، اور پھر وہ اسی دن آ کر اپنی بیوی کو واپس لے گیا ...

آج جب بھی کبھی زیورات کی بات چھڑتی ہے تو میری بیوی یہ کہتی ہے کہ میرے شوہر ہی کسی سہیلی کو

لائے تھے جو ہمیں لوٹ کر لے گئی۔

اور اس کے میں خاموش رہنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا کہ واقعی یہ میری ہی غلطی تھی جو اس دور میں دوست پر اعتماد کرتے ہوئے مشکل میں اس کا ساتھ دیا اور اس نے مجھے دوستی کا یہ صلہ دیا۔

(محمد سلیم بھٹی، گولی مار۔ نواب شاہ)

کرامتِ ولی

یہ تب کی بات ہے جب ہمارے پاس ایک ڈاٹسن پک اپ تھی۔ جسے ہم کرایہ پر چلاتے تھے۔ ایک جمعہ کے روز رات تقریباً دس بجے گیلان چند کریڑے والا آیا۔ اس وقت میں اور میرا ڈرائیور نادر علی اپنی گاڑی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ خدا کرے کوئی سیہون شریف کی سواری آ جائے۔ کیونکہ سیہون شریف ہمیں گئے ہوئے کافی روز گزر گئے تھے۔ ہمارا دل بہت چاہتا تھا کہ سیہون شریف جایا جائے ...

خیر گیان چند نے جب یہ کہا کہ سیہون شریف چلنا ہے اور وہ بھی صبح، تو یقین جانیئے ہم بہت ہی خوش ہوئے کہ ابھی ہم خدا سے دعا مانگ رہے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اتنی جلد ہماری دعا قبول کر لی ہے ...

اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ ایک کار اور ایک پک اپ اور بھی چاہیئے .. ہم نے پوچھا کہ جانا کس وقت ہے تو اس نے جواب دیا کہ صبح چار بجے .. خیر ہم نے صبح چار بجے کار اسٹینڈ سے ایک ٹیکسی کار لی، اور ساتھ ہی ایک ٹویوٹا پک اپ لے لی۔ کار میں گیان چند اور اس کے بیوی بچے تھے ... ٹویوٹا میں مرد تھے، اور ہماری گاڑی میں عورتیں اور بچے سوار تھے .. صبح تقریباً آٹھ بجے ہم لوگ جیکب آباد سے براستہ لاڑکانہ سیہون شریف کے لیے روانہ ہوئے .. شکارپور پہنچ کر ہم سب لوگوں نے ایک دکان سے سیون اپ وغیرہ پیئے۔ جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے اور ابھی تو ڈیرہ سے دس بارہ میل دور ہی تھے کہ اچانک ایک زبردست

دھماکہ ہوا اور ہماری گاڑی تین چار قلابازیاں کھانے کے بعد پھر سیدھی ہو گئی۔ ہماری گاڑی کا اگلا ٹائر پھٹ گیا تھا اور چونکہ گاڑی سپیڈ میں تھی اس لیے ڈرائیور گاڑی پر قابو نہ رکھ سکا۔ عورتوں اور بچوں کی دلخراش چیخوں نے سب کے دل ہلا کے رکھ دیئے تھے۔ دیکھنے والوں کا یہی خیال تھا کہ مشکل ہی سے کوئی بچ پائے گا... لیکن یہ دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ نہ تو گاڑی کا کوئی نقصان ہوا اور نہ ہی کسی سواری کو خراش تک آئی... یہ دیکھتے ہی میں اور میرا ڈرائیور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

ہم نے سپیئر ٹائر لگا کر سفر کا آغاز کیا۔ لاڑکانہ پہنچ کر ہم نے ۵۶۰ روپے کا نیا ٹائر خریدا اور اسے لگا کر دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔۔ اور سیہون شریف والی سرکار سے دعا کی کہ تو ہی ہماری رکھوالی کرنا... تو قارئین آپ یقین جانیں کہ لاڑکانہ سے کوئی بیس میل دور جا کر ایک مرتبہ پھر اسی طرح زوردار دھماکہ ہوا اور اس مرتبہ گاڑی کا پچھلا ٹائر پھٹ گیا اور گاڑی ایک مرتبہ پھر زوردار تین چار قلابازیاں کھاتی ہوئی دوبارہ سیدھی ہو گئی... مگر کرامتِ ولی سے ایک مرتبہ پھر گاڑی میں موجود تمام سواریاں معمولی سی خراش سے بھی محفوظ رہیں۔ ہم نے فوری طور پر دو رکعت نفل شکرانے کے ادا کیے۔

اس کے بعد ہم نے دوبارہ اسپیئر ٹائر بدلا اور جب اپنے سفر پر روانہ ہونے لگے تو بچوں اور عورتوں نے اس گاڑی میں بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ تب بڑی مشکل سے ہم نے انہیں سمجھایا کہ یہ تو خدا کی مرضی تھی اس میں کسی انسان کا دخل نہیں۔ بڑی مشکل سے وہ دوبارہ سوار ہونے پر رضامند ہوئے۔ اور ہم اپنے سفر پر رواں دواں ہو گئے۔ رات تقریباً تین بجے ہم لوگ سیہون شریف پہنچے۔ فجر کی نماز دربار میں ادا کی۔ تلاوتِ قرآن پاک کی اور اس سیہون شریف والی سرکار کا واسطہ دے کر خدا کا شکر ادا کیا اور واپسی کا سفر بخیر و خوبی گزر جانے کی بھی دعا مانگی...

اپریل ۸۳ء

وہاں سے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے مزار پر گئے اور وہاں بھی دعا مانگی۔ اور پھر واپسی کا سفر اختیار کیا۔ یہاں آ کر ہم نے جس کو بھی یہ واقعہ سنایا اس کو یقین ہی نہیں آتا تھا۔ کہ اتنا بڑا دو دفعہ حادثہ ہوا اور کوئی جانی یا مالی نقصان نہ ہوا ہو.. مگر یہ ایک حقیقت ہے میں آج بھی کرامتِ ولی اللہ سمجھ کر فراموش نہیں کر سکا ہوں...

(شیخ عبدالقادر آرزو جیکب آباد (سندھ))

دو آنسو

ہماری زندگی بلاشبہ حادثات و واقعات کا دلفریب مجموعہ ہے۔ اور بعض واقعات ایسے رونما ہوتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں بھی تو انہیں وقت کے تیز ناخن سے اپنے تحت الشعور سے کھرچ نہیں سکتے...

ایسا ہی ایک واقعہ قارئین کی نذر کر رہی ہوں:

روزانہ ہزاروں لوگ ادھر بسوں میں سفر کرتے ہیں۔ طالب علم اور ملازم پیشہ لوگ روزانہ ہی ان بسوں میں آتے جاتے ہیں... جب میں آٹھویں کلاس میں تھی تو بس کے ذریعے روزانہ چاندنی چوک سے پاسپورٹ آفس کے سٹاپ تک جایا کرتی تھی۔

ایک روز حسب معمول بس میں بہت زیادہ رش تھا۔ لوگ قطار کے اصول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک دوسرے کو روندتے، دھکے لگاتے بس میں سوار ہوئے۔ اس قدر زیادہ رش تھا کہ کنڈیکٹر پچھلی طرف سے چڑھنے کے بجائے خواتین کے گیٹ کی طرف چڑھ آیا۔ لڑکیاں بہت ہی زیادہ تھیں اور پھر کنڈیکٹر بھی اندر گھس آیا... کنڈیکٹر کے قریب جو لڑکی کھڑی تھی وہ کسی کالج کی طالبہ تھی، بہت ہی پیاری سی... گرمی کی وجہ سے اس کے سرخ و سپید چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ وہ کچھ اس قدر حسین اور پرکشش تھی کہ میری نگاہیں اس کا طواف کر رہی تھیں۔

اتنے میں کنڈیکٹر جو کہ بڑا ہی ہوسناک نظروں سے

گھورے جا رہا تھا' ہاتھ بڑھا کر ٹکٹ پوچھنے کے بہانے اس کے سڈول اور نرم بازو پر چٹکی بھر لی... کچھ دیر بعد اس نے پھر ایسا ہی کیا... لڑکی نے کسمسا کر احتجاج کے طور پر اس کی طرف دیکھا تو اس شانیت سے ڈونڈ ند جبڑے نے نہایت بے شرمی اور ڈھٹائی سے اسے آنکھ سے نازیبا اشارہ کر دیا..

میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کی جھیل سی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا سے گئے... ضبط سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا مگر پھر بھی دو آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک ہی آئے اور پھر دو پٹے میں جذب ہو گئے... ایسے میں میرا خون کسی لاوے کی طرح کھولنے لگا۔ جی چاہا کہ اس نگ انسان کی آنکھوں کو نوچ ڈالوں اور مار مار کر اس کا حلیہ بگاڑ دوں۔ مگر اتنے میں میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ اتنی دیر میں بس چاندنی چوک کے موڑ پہ پہنچی اور ایک طرف کچھ ہنگامہ سا پیدا ہو گیا کنڈیکٹر جو نہ جانے کب سے گیٹ میں کھڑا تھا' ایک جھٹکے سے باہر جا گرا اور بس کے پچھلے پہیے اس کی دونوں ٹانگوں پر سے گزر گئے اسے اپنے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ ایک مجبور اور بے بس دل کی آہ عرش معلیٰ سے جا ٹکرائی تھی اور خاموش آنکھوں کے دو آنسوؤں نے اپنا خراج وصول کر لیا تھا... اور میں قدرت کے اس خاموش انصاف پر محوِ حیرت رہ گئی...

(نزہت زمان تمین' راولپنڈی)

گناہ کا بوجھ

میں کوئی ادیبہ یا افسانہ نگار نہیں جو لفظوں میں خوب صورتی یا بناوٹ ڈال لیتی۔ یہ میری ایک دوست کا آنکھوں دیکھا واقعہ معاشرے کا ایک رستا ہوا ناسور ہے جسے میں نے بالکل اسی کے لفظوں میں اسی کی زبانی اپنے پیارے قارئین کی نذر کر دیا ہے...

قارئین! آج میں آپ کو ایک ایسا واقعہ سنانے جا رہی ہوں جو بہت پرانا ہونے کے باوجود اس

دنیا والوں کی نظروں سے پوشیدہ ہے۔ میں زبیدہ کو اچھی طرح سے جانتی تھی اور وہ ہماری دور کی رشتہ دار بھی تھی۔ اور یہ بھی سب کو معلوم تھا کہ وہ افضل سے پیار کرتی ہے۔ مگر اس کے والدین نے اس کی شادی زبردستی ایک دوسرے لڑکے رشید سے کر دی۔ لیکن زبیدہ جب بھی اپنے ماں باپ کے گھر آتی تو افضل سے ضرور ملتی اور اس طرح چار ماہ کا عرصہ گزر گیا...

ایک روز زبیدہ زبردستی رشید سے جھگڑ کر اپنے ماں باپ کے گھر آ گئی اور دوبارہ اپنے سسرال نہ گئی۔ رشید کئی مرتبہ اسے لینے کے لیے بھی آیا مگر زبیدہ نے جانے سے صاف انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے تو اس سے طلاق لینی ہے۔ اب ماں باپ بھی کچھ نہ کر سکے کہ بیٹی نے زبان چلا کر سب کے سامنے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن دوسری طرف رشید' زبیدہ پر جان دیتا تھا اس لیے اس نے طلاق نہ دی اور وقت گزرتا چلا گیا۔

پھر ایک روز افضل نے زبیدہ کو پیغام دے کر رات کے وقت ملنے کو کہا۔ چونکہ زبیدہ خود اس پر جان دیتی تھی اور اعتماد بھی کرتی تھی' وہ رات کو اس سے ملنے کے لیے چلی گئی... مگر شیطان کو موقع ہاتھ آ گیا اور پھر وہی کچھ ہوا جو بے غیرت لڑکیاں ماں باپ کی عزت پر دھبہ لگا کر کرتی ہیں...

گناہ' گناہ ہوتا ہے اور وہ ظاہر ہو کر رہتا ہے...

جب زبیدہ کے ماں باپ کو پتہ چلا کہ ان کی لاڈلی بیٹی گناہ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے تو انہوں نے ایک منصوبہ بنایا کہ کیوں نہ رشید کو دھوکہ دیا جائے کیونکہ زبیدہ کا محبوب افضل تو اپنا مطلب حاصل کرنے کے بعد گاؤں ہی چھوڑ کر چلا گیا تھا' اور اس کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اس ناپاک منصوبے میں زبیدہ بھی برابر کی شریک تھی۔ انہوں نے رشید کو بلا کر کہا کہ تم بچے کے باپ بننے والے ہو اور زبیدہ کو گھر لے جاؤ' ہم نے زبیدہ کو بڑی مشکل سے راضی کیا ہے کہ ایسی خوشیاں ایک بیوی کو اپنے شوہر کے گھر ہی جا کر منانی چاہئیں...

یہ سن کر رشید اس قدر خوش ہوا کہ اس کی آنکھوں

سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ رشید نے جب یہ خوشخبری اپنے گھر جا کر سنائی تو اس کے گھر والے بھی بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے بازار سے جا کر [illegible] دیں۔ اور آخر اس کا گناہ ایک روز بیٹے کی صورت میں اس دنیا میں آیا۔ آج وہ بچہ پورے پانچ سال کا ہے۔ کسی کو اصل حقیقت کا علم نہیں، مگر خدا کی ذات تو سب کچھ جانتی ہے۔ زبیدہ اور اس کے گھر والے سب ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔۔۔۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ زبیدہ کو کیسے سکون حاصل ہے کہ وہ افضال کے بیٹے کو رشید کا بیٹا ظاہر کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ جانے اس پر اپنا کتنا بڑا عذاب نازل فرمائے گا۔ کیونکہ اس نے ایک شریف خاوند کو دھوکہ دیا ہے اور اگر رشید کو اس کے بھید کا پتہ چل گیا تو کیا وہ زندہ رہے گا۔ خدا کرے یہ گناہ چھپا رہے۔

آخر میں اپنی بہنوں سے میں گذارش کرتی ہوں، جو کہ غلط راستے پر چل رہی ہیں، وہ غلط راستوں کو چھوڑ کر سیدھے راستے کو اپنائیں۔ معاشرے میں نیک بہو، نیک بیٹی اور نیک بیوی بن کر زندگی بسر کریں اور میری بھولی بھالی بہنو اپنے ماں باپ کی طرف دیکھو جن کی عزت تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے اس واقعہ کو پڑھ کر بہن زبیدہ کی طرح گناہ نہیں کرے گی اور پھر بعد میں سارا الزام تقدیر کو دیتی ہیں۔ کیا تقدیر کہتی ہے کہ گناہ کرو۔۔۔ کیا تقدیر کہتی ہے کہ والدین کی ناک کٹواؤ۔۔۔ مجھے پورا بھروسہ ہے کہ جو میری بہن غلط راستے پر ہے اور میرا یہ واقعہ پڑھ کر مجھے کوسنے کی بجائے سیدھا راستہ اختیار کریں گی۔

(رضیہ نازش کنول، دینہ ضلع جہلم)

نیکی کا بدلہ

یہ مختصر واقعہ جنوری ۱۹۷۲ء کا ہے۔ میں گجرات کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں رہائش پذیر تھا۔ اور اس وقت ایک ٹیکسٹائل مل میں سروس کرتا تھا۔ میرے چند رشتہ دار راولپنڈی سیکرٹریٹ میں ملازم تھے۔ یکم جنوری کو مجھے کسی کام سے راولپنڈی جانے کا اتفاق ہوا۔ دو دن میں اپنا کام مکمل کر کے اور رشتے داروں سے مل ملا کر ۳ جنوری کو میں نے واپس جہلم کی تیاری کی۔

میں جی ٹی ایس پر سوار ہوا اور بس اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ میں آگے فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا۔ ہماری بس ابھی تھوڑی ہی دور گئی ہو گی کہ راستے کے قریب لب سڑک ایک برقعہ پوش عورت کار کے پاس کھڑی تھی، جس نے بس کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے بس روک لی اور وہ عورت بس کے اندر آ گئی۔ مگر بس میں کوئی سیٹ خالی نہ تھی اس لیے مجبوراً اسے اگلی سیٹوں کے درمیان کھڑا ہونا پڑا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا، جیسے اس نے بسوں میں بہت کم سفر کیا ہو۔ چونکہ وہ میرے بالکل قریب کھڑی تھی۔۔ اس لیے مجھے فوراً احساس ہوا کہ میرے ساتھ بھی ایک معمر بوڑھی سی عورت بیٹھی تھی، کیوں نہ ان خاتون کو یہاں جگہ دے دوں۔۔

میں نے اسے بیٹھنے کی پیشکش کی تو پہلے تو اس نے پس و پیش کیا کہ نہیں بھائی جان آپ بیٹھے رہیں۔ میرے اصرار کرنے پر وہ آخر کار بیٹھ ہی گئی۔ اور میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے بیٹھتے ہوئے نہایت مہذب انداز میں میرا شکریہ ادا کیا۔۔۔

ہماری بس گوجر خان کے نزدیک جا رہی تھی کہ اس نے مجھے پکار کر کہا "بھائی جان آپ نے کہاں اترنا ہے"؟ میں نے نہایت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب میں کہا۔۔ "باجی! مجھے جہلم جانا ہے"۔۔

تب اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔۔ "میں کھاریاں سی ایم ایچ میں لیڈی ڈاکٹر ہوں۔ راولپنڈی سے میں اپنی کار میں آ رہی تھی کہ میری گاڑی راستے کے قریب انجن کی خرابی کی وجہ سے بند ہو گئی۔ جہاں میں کھڑی تھی وہ کار میری ہی تھی۔ میں نے وہاں رکنے کی بجائے بس پر سفر کرنا مناسب خیال کیا۔ اور سوچا کہ صبح کسی ذریعے سے گاڑی منگوا لوں گی۔۔۔ بہرحال آپ کے اس خلوص کی

وجہ سے میں بہت متاثر ہوں۔ آپ میرا یہ کارڈ اپنے پاس رکھ لیں۔۔ شاید زندگی کے کسی موڑ پر میں اس احسان کا بدلہ چکا سکوں"۔۔

"نہیں باجی، یہ تو میرا فرض تھا"۔ میں نے کہا: "بھلا اس میں احسان والی کون سی بات ہے۔۔ ویسے بھی ہمیں عورت ذات کا احترام کرنا چاہیے"۔ تاہم میں نے اس کے اصرار پر کارڈ رکھ لیا۔

تھوڑی دیر میں ہماری بس دوبارہ جاری ہوئی اور پھر آدھ گھنٹے کے مزید سفر کے بعد میں اپنی منزل پہ اتر گیا۔ اترتے ہوئے بعد میں نے چلتے چلتے ایک نظر کارڈ پر ڈالی، جس پہ پانچ ڈگریوں اور کئی فارن مخصوص کورسز کے ساتھ مسز ظل آفتاب لیڈی ڈاکٹر درج تھا۔۔ میں نے گھر جا کر کارڈ اپنے بکس میں رکھ دیا اور اپنی سروس میں لگ گیا۔ یوں دو سال کا عرصہ بیت گیا۔ ایک روز میں اپنے عزیزوں کے ہاں کھیوڑہ گیا، جو کھاریاں چھاؤنی سے بالکل ساتھ ہی ایک گاؤں ہے۔ اور اس گاؤں میں چھاؤنی سے گزر کر جانا پڑتا ہے۔

جب میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ میری ایک دور کے رشتے میں کزن نعیمہ شدید بیمار ہے اور جس کی زندگی انتہائی خطرے میں ہے۔۔ دراصل اس کا ڈلیوری کیس تھا جو کہ بگڑ گیا۔ میرے ایک کزن جو لاہور میں ایک اچھے عہدے پر فائز ہیں اس وقت وہاں موجود تھے، ان کے مشورے سے سی ایم ایچ کا پروگرام بنایا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہاں قانون کے مطابق صرف ملازموں کے کیس ہی لیے جاتے تھے۔ بہرحال میں تھا لویا، کر کے اسے کار میں ڈال کر کینٹ لے گیا۔ وہاں پہنچ کر ہم سوچنے لگ گئے کہ کس طرح سے اندر رابطہ کیا جائے۔ بہرحال میرے کزن عارف نے ہمت کی اور انچارج لیڈی ڈاکٹر تک پہنچ گئے۔ مگر انہوں نے مجبوری ظاہر کی کہ میں مجبور ہوں۔ ہاں البتہ اگر آپ کے خاندان میں کوئی فوجی ملازم ہے تو وہ ہی رابطہ کے ذریعہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ بہرحال میں اپنے طور پر کیس دیکھتی ہوں۔۔۔

ہم مریضہ کو ایک مخصوص کمرے میں لے گئے اور جب وہ ڈاکٹر سامنے آئیں تو مجھے فوراً ڈھائی سال قبل کا وہ چند گھنٹوں کا سفر آنکھوں میں آ گیا۔ اور اس فرشتہ نما عورت کو دیکھنے کہ وہ مجھے دیکھتے ہی ایسے جذبات سے بھائی جان کہہ کر ملی کہ جیسے ماں جائی بہن بھی ملنے میں حجاب محسوس کرتی ہیں۔۔۔ بس پھر کیا تھا اس نے اس کیس کو اس طرح لیا کہ جس کی میں مثال نہیں دے سکتا۔ اس نے ہر طرح سے ہماری مدد کی۔

میرے تمام رشتہ دار اس کا خلوص دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ چھ گھنٹے کی سخت جدوجہد کے بعد اللہ کی مہربانی سے ہماری کزن خطرے سے باہر ہو گئی۔ اس کے بعد وہ اپنی گاڑی میں میری کزن کو اپنی کوٹھی پہ لے گئیں اور ۲ گھنٹے اسے اپنی نگرانی میں رکھا۔ اور جب ہم آنے لگے تو اس نے میری کزن کو اس طرح سے رخصت کیا کہ ہم مزید حیران رہ گئے۔ میں نے بہت انکار کیا مگر وہ بولیں کہ بھائی جان میں تو ابھی بھی مطمئن نہیں ہوں۔

بعد میں اسی ہسپتال کی ایک نرس سے میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ میری کزن کے مکمل علاج پر تقریباً پانچ ہزار روپے خرچ آتے ہیں، جبکہ میری اس بہن نے ہم سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا۔

قارئین! اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیں کہ اس دور میں ایسی ایسی عظیم ہستیاں بھی موجود ہیں۔

(لطیف، جدہ۔ سعودی عرب)

دوسری بیوی

انسان پر کبھی خوشگوار گھڑیاں بھی گزرتی ہیں۔۔ کبھی غم ناک لمحات بھی آتے ہیں۔۔۔ کامرانیاں بھی قدم چومتی ہیں اور ناکامیوں کا دور بھی آتا ہے۔ آرزوئیں جنم لیتی ہیں تو مایوسیوں کے اندھیرے بھی چھا جاتے ہیں۔۔۔ امید کی قندیلیں روشن ہوتی ہیں تو آس کے دیئے بھی بجھتے ہیں۔۔۔ حادثات گزرتے ہیں تو خوشی کے مواقع بھی فراہم ہوتے ہیں۔۔۔

زیرِ نظر واقعہ میرے ایک دوست نے مجھے دعوت جواب عرض میں لکھنے کے لیے سُنایا۔ اسی کو زبانی لفظ بہ لفظ پیشِ قارئین ہے:

ندیم نے ہر حال میں میرا ساتھ دیا ہے وہ صحیح معنوں میں میرا دوست ہے۔ مجھے اس کی دوستی پر فخر ہے۔ اسے میرے ساتھ بچپن سے ہی والہانہ محبت رہی ہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ایک دن ماسٹر صاحب نے مجھے کسی غلطی پر پیٹا۔ مجھے مار پڑتے دیکھ کر ندیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس سے دوسرے دن جماعت میں آتے ہی ماسٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بتاؤ سوالات حل کیے ہیں۔۔۔ میں اس کا نفی میں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ندیم نے جلدی سے اپنی کاپی میرے پاس سرکا دی۔

"جی ہاں کیے ہیں"۔ میں نے کاپی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"شاباش دکھاؤ کاپی"۔ ماسٹر صاحب نے سارے سوالات چیک کیے۔۔۔

"ندیم! تم اپنی کاپی دکھاؤ"۔ ماسٹر صاحب نے گرجدار آواز میں کہا۔

میں سہم گیا اور مجھے بڑی تشویش ہوئی۔ لیکن ندیم نے جلدی سے کہہ دیا۔۔۔ "جی۔۔۔ جی۔۔۔ میں اپنی کاپی گھر بھول آیا ہوں۔۔"۔

استاد صاحب غصہ میں اٹھے اور ندیم پر ڈنڈے برسانے لگے۔ میں آنکھیں جھکائے دبک کر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اُف خدایا، ندیم نے مجھے بچا کر خود مار کھا لی ہے۔ ندیم کی یہ حالت دیکھ کر مجھے بے حد دُکھ ہوا۔۔۔ ندیم کے ہاتھ سرخ ہو رہے تھے، لیکن وہ بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ میرے پاس بیٹھا تھا۔ ہلکی ہلکی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اس کی اس مسکراہٹ میں قربانی کا جذبہ، وفا کی لطافت اور ہمدردی کا جوش غالب نظر آ رہا تھا۔۔۔

اس کے ہر دن کا آغاز ہی شرارت سے ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ اسکول کے تمام لڑکے اس کی شرارتوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ میٹرک کے بعد ہم دونوں نے ایک ساتھ کالج میں داخلہ لیا۔۔۔ کھیل میں دیکھو تو ندیم سب سے آگے۔۔۔ مگر پڑھائی میں ذرا کمزور تھا۔

کالج میں ایک مرتبہ ڈرامہ ہوا، جس کا ایک کردار ندیم نے بھی ادا کیا۔۔۔ اور ایسا ادا کیا کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔۔۔ یہ لڑکی کون سے کالج سے لی ہے۔۔۔؟ ارے یار تم نے نہیں پہچانا۔۔۔ یہ شبنم ہے اور خواتین کالج کی بی اے کے آخری سال میں پڑھتی ہے نہیں یار۔۔۔ شبنم کو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اس کا قد چھوٹا ہے۔۔۔ میرے خیال میں یہ آسیہ ہے جو ڈگری کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ ہے۔۔۔

"ہاں خوب پہچانا تم نے، واقعی یہ آسیہ ہے"!

یہ ندیم کے کردار کی بلندی اور صفائی تھی کہ اس کی اداکاری پر بھی حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ کالج کے پرنسپل صاحب نے خاص طور پر ندیم کی اداکاری سے متاثر ہو کر اپنی جیب سے سو روپے کا نوٹ انعام میں دیا۔ ہم نے ایک ساتھ بی۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ تب ندیم ملازمت کے سلسلہ میں کراچی چلا گیا۔۔۔

اب حالت یہ ہے کہ ندیم سے ملے مجھے دو سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ میں درجنوں خطوط اسے لکھ چکا ہوں کہ آؤ اور مجھے آ کر مل جاؤ۔ مگر وہ ہر خط کا یہی جواب دیتا کہ ایک ہی دفعہ شادی پر آؤں گا۔ میں نے مکرر اس سے دو تین خط اور لکھ دیئے کہ جلدی آؤ میری شادی میں پانچ دن رہ گئے ہیں۔ انتظار کرتے کرتے شادی کا دن بھی آ گیا مگر ندیم نہ آیا۔۔۔ میں نے نہا دھو کر نیا جوڑا پہنا اور سہرا بندی کے لیے مجھے مہمانوں میں لایا گیا۔۔۔ عزیز و اقارب سبھی جمع ہو رہے تھے۔ کہ اچانک میرا چھوٹا بھائی آیا اور بولا:

"بھائی جان یہ آپ کے نام ہے"!۔

یہ مختصر سا خط پڑھنے کے بعد میرا دل چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں۔۔۔ "ندیم! یہ تم نے اچھا نہیں کیا ہے میری دوستی کا مذاق اڑایا ہے"!۔ میں نے اپنے دل ہی دل میں کہا "کاش تم اب بھی آ جاؤ"۔۔۔ میری بارات نے جب ہاشمی کے گھر کا رخ کیا تو میں اپنے گہرے دوست کے نہ آنے پر غم میں ڈوب چکا تھا۔۔۔

جما سیار حق لاہور

مہمانوں نے بڑی گرمجوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور ٹھنڈے مشروب سے ہماری خاطر مدارت کی۔ اور نکاح کا وقت آ پہنچا۔۔۔ "بسم اللہ کیجیے مولوی صاحب"۔۔ میرے سسر صاحب نے اجازت دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھہریے مولوی صاحب! ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں" ایک نسوانی آواز نے سب کو چونکا دیا۔ تمام باراتی آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ ایک عورت سیاہ برقعہ میں ملبوس اپنے ساتھ چار سالہ بچہ لیے ہماری طرف آ رہی تھی۔۔۔ "پہلے میرا فیصلہ کریں۔۔۔ مجھے طلاق دلوائیے اور پھر دوسری شادی کریں۔۔"

مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین نکل رہی ہو۔ تمام مہمانوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ سب سے پہلے میرے ابو بولے:

"انور! یہ میں کیا سن رہا ہوں۔۔"

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ آ۔۔۔ آ۔۔۔ سب غلط۔۔۔ سن رہے ہیں۔۔ میرا اس عورت سے کوئی تعلق نہیں۔۔ میں اسے جانتا تک نہیں" میں پریشان ہو کر بولا۔

"امی! ابو نے چہرے پہ کیا باندھ رکھا ہے"۔۔ اس عورت کے ساتھ والا بچہ بولا۔

"یہ تمہارے لیے دوسری امی بیاہنے لگے ہیں بیٹا" اسی عورت نے جواب دیا۔

"کم بخت بتاؤ۔۔۔ تمہارے بولنے کی گنجائش ہے باقی"۔۔ ابو بپھر گئے۔

"عاشی تمہارے نصیب تو پھوٹ گئے۔ تمہارا انور بے وفا نکلا ہے۔۔۔ وہ تو پہلے سے ہی شادی شدہ ہے۔ اس کا ایک بچہ بھی ہے۔۔۔ وہ کھڑی ہے اس کی پہلی بیوی۔۔۔ دیکھو اپنا حق مانگ رہی ہے، کہہ رہی ہے کہ پہلے مجھے طلاق دو۔۔"۔ عورتوں میں ایک الگ ہنگامہ سا مچ گیا۔ عاشی کو یہ سب کچھ دیکھ کر ایک چکر آیا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔۔۔

"قدرت اللہ! یہ تم نے مجھ سے کس دشمنی کا بدلہ لیا ہے۔۔" میرے سسر بولے۔۔۔ "کاش مجھے یہ منحوس دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا"

اپریل ۸۳ء

جہاں ایک طوفان تھا، ایک ہنگامہ، ایک محشر تھا۔۔ کانوں پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ ایسے میں میرے سسر نے حکم دیتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ واپس چلے جائیں، یہ شادی نہیں ہو سکتی۔۔"

یہ سنتے ہی مجھے اپنی دنیا لٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ تب میں سارے ماحول کو نظر انداز کرتا ہوا اپنی اس نام نہاد بیوی کی طرف جھپٹا اور اس کا نقاب نوچ ڈالا۔ اور۔۔۔ اور پھر میرا سارا غصہ کافور ہو گیا۔۔۔ "اُف ندیم تم۔۔۔ تم یہاں اور اس روپ میں"۔ میں اس سے بغل گیر ہو گیا۔۔۔ لوگ جہاں کھڑے تھے، وہیں ساکت ہو کر رہ گئے۔ پھر میری اس نام نہاد بیوی (ندیم) کی موجودگی میں میرا نکاح پڑھایا گیا اور یہ ہنگامہ قہقہوں اور خوشیوں میں بدل گیا۔۔۔

(ایم مقبول بیگ ستارہ۔ مکوڑ مال میانوالی)

غیبی مدد

میرے شوہر یسین، جو حال ہی میں بحرین سے پاکستان آئے ہیں، ایک روز شوقیہ طور پر اپنے ایک دوست کی گاڑی چلا رہے تھے کہ ایک آدمی نے ان سے لفٹ مانگی، تو انہوں نے گاڑی روک کر اسے گاڑی میں سوار کر لیا۔۔۔ باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس آدمی نے ایک سچا واقعہ میرے شوہر کو سنایا، جو میں اسی آدمی کی زبانی قارئین کی نذر کر رہی ہوں:

میں کسی کام کے سلسلے میں ایک دوسرے شہر گیا ہوا تھا اور وہاں سے کام نپٹا کر سہ پہر کو جانے والی بس میں آ کر بیٹھ گیا۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا اور آسمان پر آگ برساتا ہوا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ بس اسٹاپ پر کچھ لوگ گرمی کی شدت سے بچنے کے لیے درخت کے سائے میں پناہ لیے ہوئے تھے گرمی میں سفر کرنا بھی ایک جان لیوا عذاب ہوتا ہے۔۔ میں بائیں جانب ایک سیٹ پر براجمان ہو گیا اور کھڑکی کا شیشہ ایک سائڈ پر سرکا دیا۔ گرم لو آلود ہوا کے

جاری ہے (جواب عرض لاہور)

مجھ کو سے زرا سکون دیا۔

بس روانہ ہوئی اور میں ارد گرد بیٹھے ہوئے مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔۔۔ اچانک میری نظر بس کے فرنٹ سیٹ پر جا کر رک گئی۔ نہ جانے ان بزرگ کی آنکھوں میں کیا جادو تھا کہ میں ان کی جانب زیادہ دیر نگاہ نہ جما سکا اور میں نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔۔ کچھ ہی دیر بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔۔ "میاں، تم یہ سیٹ مجھے دے دو اور خود میری سیٹ پر آ جاؤ۔۔۔ مجھے یہاں پہ نہ جانے کیوں سخت گھٹن سی محسوس ہو رہی ہے۔۔"

میں نے انکار میں سر ہلایا اور کہا۔۔۔ "باباجی میں خود گرمی کی وجہ سے پریشان ہوں۔" اور پھر کھڑکی کے باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہونے لگا۔

کچھ لمحوں بعد انہوں نے دوبارہ مجھ سے کہا تو میں نے کہا۔۔ "باباجی مجھے تنگ مت کریں۔۔۔ میں وہاں پر نہیں بیٹھ سکتا۔" مگر میرے بار بار انہوں نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا اور سوچا۔۔ کہ بزرگ آدمی ہیں، شاید کسی وجہ سے ہی کہہ رہے ہوں گے۔۔۔ میں اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوا، اور اپنی سیٹ سے اٹھ کر وہاں جا بیٹھا۔۔۔

میرے ان کی سیٹ پر بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد ہی ہماری بس ایک درخت سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ مسافروں کی چیخ و پکار سے دل دہلے جا رہے تھے۔ یہ دلدوز منظر کچھ ایسا تھا کہ کچھ مسافروں کے سر دھڑ سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ اس ہولناک منظر میں۔۔ میں اپنی سیٹ پر صحیح سلامت بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے خراش تک بھی نہ آئی تھی۔ اور میں جس پہلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا وہ بالکل پچک کر رہ گئی تھی۔۔۔ میں خدا کے اس انعام پر حیران رہ گیا۔۔۔

تب میری نگاہیں ان محترم بزرگ کو تلاش کرنے لگیں، جن کی طفیل اس روح فرسا حادثے میں مجھے نئی زندگی ملی تھی۔۔۔ مگر وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے اور میں خدا کے اس نیک فرشتہ کا احسان

کے روپ میں میری حفاظت کر گیا تھا، دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کیا۔ زخمیوں کو فوری طور پر قریبی ہسپتال پہنچایا گیا۔ مگر کئی مسافر وہیں پہ جاں بحق ہو گئے۔

آج بھی جب یہ منظر نگاہوں کے سامنے آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور میرے ہاتھ خدا کی بارگاہ میں دعا کے لیے اٹھ جاتے ہیں کہ تو ہی سب پہ اپنی رحمتوں کی بارش کرنے والا ہے۔

(رضیہ یاسین۔ ٹاہلی موری۔ راولپنڈی)

دکھ ہی دکھ

زیر نظر واقعہ ایک باہمت عورت کی سچی داستان ہے۔ یہ عورت ہماری رشتہ میں دور کی خالہ ہے۔ اس عورت کا نام راجہ ہے۔ تو ان کی داستان انہی کی زبانی قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔۔۔

میں بھارت کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئی۔ بچپن میں والدہ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور میں ماں کی ممتا سے محروم ہو گئی۔ والد صاحب کی طبیعت ویسے ہی بہت سخت تھی اس لیے ان سے بھی پیار نہ مل سکا۔ میں پیار کی بھوکی تھی اس لیے باہر پیار تلاش کیا مگر کہیں سے مجھے پیار نہ ملا۔۔ پھر میری شادی چھوٹی عمر ہی میں ہو گئی۔ میں نے سوچا ہو سکتا ہے مجھے اپنے شوہر کی طرف سے محبت اور پیار مل جائے۔ مگر وہ بھی بہت سخت مزاج کے تھے۔ ان کی پہلے بھی شادی ہو چکی تھی۔ اس بیوی سے بھی اولاد تھی۔ میں نے ان کو ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی اور اپنا سارا پیار ان پر نچھاور کر دیا۔۔۔ میرے اپنے بھی اس وقت تک بچے ہو گئے تھے۔ مگر میں نے دونوں کو ایک جیسا پیار کیا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے سارے بچے مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ مگر میرا شوہر کچھ ہی سال بعد اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اور مجھے اور اپنی اولاد کو اس بھری دنیا میں تنہا اور بے سہارا چھوڑ گئے۔۔۔ میرے وہ دن بہت بے بسی کے تھے۔

میرے اپنے بھی پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں، اور سوتیلے بیٹے بھی پانچ تھے۔ ہمارا مکان اپنا تھا، اس لیے کرایے کی مصیبت نہ تھی۔ ان دنوں میں نے بہت ہی تنگی کے دن گزارے۔ میرا بیٹا لڑکا سجاد تھا، وہ مجھ سے بہت ہی پیار کرتا تھا، وہ مجھ سے اکثر کہتا، ماں! آپ فکر نہ کریں جب میری نوکری لگ جائے گی تو ہمارے دن پھر جائیں گے۔ اور پھر خدا کی مہربانی سے اس کی نوکری بحریہ میں کیپٹن کی حیثیت سے لگ گئی۔ نوکری لگ جانے کے بعد میں نے اس کی شادی کر دی۔۔۔

ایک سال کے بعد اس کے ہاں ایک چاند سا لڑکا پیدا ہوا۔ مجھے بھی اس نے اپنے پاس کراچی بلا لیا۔ وہ دن میری زندگی کے سب سے اچھے دن تھے۔ سجاد مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ اور اگر میں کوئی کام کرتی تو سجاد ناراض ہو جاتا کہ ماں جی یہ دن آپ کے آرام کرنے کے ہیں۔

انہی دنوں میں نے اپنی دو بچیوں کی شادی بھی کر دی۔ خدا کا شکر ہے کہ ان دونوں کے شوہر میرے بہت ہی اچھے داماد ثابت ہوئے۔ ابھی میں کراچی ہی میں تھی کہ ۱۹۷۱ء کی جنگ چھڑ گئی۔ سجاد میرے پاس آیا اور مجھ سے جہاد پر جانے کی اجازت طلب کی۔ کون ماں اپنے لختِ جگر کو موت کے منہ میں دھکیل دینا چاہتی ہے۔ مگر فرض، فرض ہوتا ہے اور وہ تو اپنے ہی ملک کی حفاظت کے لیے جا رہا تھا۔ اس لیے میں نے اسے بخوشی اجازت دے دی۔۔۔

اس دن کے بعد سے سجاد کا کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ زندہ ہے یا مردہ۔۔۔ سمرین (بحری آبدوز) کے صرف ڈھانچے مل سکے مگر میرا بیٹا سجاد نہ ملا۔ ان ہی دنوں اس کے ہاں ایک اور لڑکا پیدا ہو گیا۔ مگر سجاد لوٹ کر نہ آ سکا۔ پھر میں نے کراچی کو خیرباد کہہ دیا۔ اور لاہور میں اپنے دوسرے بیٹے کے پاس آ گئی۔ سجاد کے نوکری لگ جانے سے میری زندگی میں ایک سکون سا آ گیا تھا۔۔۔ مگر اس کے لاپتہ ہو جانے سے میرے دل کے سمندر میں ہلچل سی پیدا ہو گئی۔۔۔ اور میں بے چین سی رہنے لگی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر گھر سے باہر نکل آتی کہ ہو سکتا ہے میرا سجاد آ گیا ہو۔۔۔ مگر وہ نہ آیا۔۔۔

وقت کا مرہم بڑے سے بڑے زخم کو بھر دیتا ہے۔ وقت اپنی ڈگر پر چلتا رہا اور میرا سجاد سے چھوٹا لڑکا ارشد بھی جوان ہو گیا۔ ان دنوں ہمارے مالی حالات بہت ہی خراب تھے۔ ہر طرف سے دکھ ہی دکھ ہمارا مقدر بنے رہتے تھے۔ میرے شوہر نے اپنے مکان کا ایک حصہ کرایہ پر دیا ہوا تھا۔ مگر اس کا کرایہ بھی اتنا کم تھا کہ صرف ارشد کی پڑھائی کا خرچہ بھی پورا نہیں ہوتا تھا۔۔۔ تب ارشد نے فیصلہ کیا کہ میں بھی نوکری کروں گا۔ میں نے اسے سمجھانے کی بڑی کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔

انہی دنوں وہ اس وقت کی ایک سیکیورٹی فورس میں ملازم ہو گیا۔ اور بہت جلد وہ اپنی ذہانت اور قد کاٹھ کی وجہ سے ترقی کرتا ہوا بڑے عہدے تک جا پہنچا اور اپنے افسران کا منظورِ نظر بن گیا۔ میں ایک مرتبہ پھر اپنے سارے غم بھول گئی۔ ارشد اپنی ساری تنخواہ لا کر مجھے ہی دیتا۔ جس پر میں بہت ہی خوش ہوتی۔۔۔ کیونکہ یہ ایک ماں کی بہت بڑی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اولاد اس کی تابع فرمان ہو۔ اسی کی تنخواہ سے میں نے اپنی دوسری دو بچیوں کی شادی بھی کر دی۔ اور میرا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

اور پھر چند دنوں سے میں دیکھنے لگی کہ ارشد میرا بیٹا بہت پریشان رہنے لگا ہے۔ میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی مگر ارشد ٹال گیا۔۔۔ لیکن جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو ارشد گویا ہوا کہ میں نوکری چھوڑنا چاہتا ہوں۔۔۔ میں نے جب اس کی وجہ پوچھی تو ارشد نے بتایا کہ جس جگہ میں کام کر رہا ہوں وہ مجھ سے ناجائز کام کروانا چاہتے ہیں۔۔۔

تب میں نے بھی اس کو مشورہ دیا کہ اس قسم کی نوکری چھوڑ دینا ہی مناسب ہے۔ اور پھر میرے کہنے پر ارشد نے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ مگر اس سیکیورٹی کے صدر نے ارشد کا استعفیٰ نامنظور کر دیا۔ اور ارشد کو واپس بلوانا چاہا، اور ایک

بعد چند لوگ ارشد کو بلا کر لے گئے اور اس سے کہا کہ اگر وہ ان کا ایک کام کر دے تو اس کا استعفیٰ منظور کیا جا سکتا ہے۔ اور پھر ایک دن ارشد رات گئے تک واپس گھر آیا۔ اس دن ارشد کو ہلکا سا بخار بھی تھا اور نکلے دن ہی ارشد کا استعفیٰ منظور ہو گیا۔

تب ہی ماہِ رمضان شروع ہو گیا۔ ایک دن میں باہر گئی ہوئی تھی اور افطار کا وقت تھا اس لیے میں جلدی جلدی اپنے داماد کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار گھر آ رہی تھی تاکہ اپنے بیٹوں کو افطار کا کھانا پکا کر دے سکوں۔ کہ ایک گاڑی میں چند لوگ سوار بہت گھبرائے ہوئے تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ لوگ ہم سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔۔۔ میں نے اپنے داماد سے کہا، لگتا ہے کہ یہ لوگ خون کر کے بھاگ رہے ہیں۔۔ تبھی تو ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا ہے۔

جب ہم گھر کے قریب گئے تو دیکھا کہ میرا جوان سال ۲۲ سالہ بیٹا امجد خون میں لت پت پڑا ہوا ہے۔۔ مجھے فوراً ہی چکر سا آ گیا اور میں نیم بے ہوش سی ہو گئی۔ مگر جلد ہی میں نے اپنی حالت پر قابو پایا اور اپنے بیٹے کو اپنے داماد کی مدد سے اٹھا کر گھر کے اندر لے آئی۔ اس وقت امجد اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا اور پھر کچھ ہی دیر بعد وہ روزے کی حالت میں ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا۔۔۔

امجد کی ایسی موت سے، جو چند دن کی خوشی میری زندگی میں آئی تھی، رخصت ہو گئی۔ بعد میں پتہ چلا کہ ارشد، امجد اور ان کا بڑا بھائی شام سے پہلے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے کہ باہر سے کسی آدمی نے ارشد، ارشد، کی آواز دی۔۔۔ ارشد چونکہ مغرب کی نماز کے لیے وضو کر رہا تھا، اس لیے امجد پتہ کرنے کے لیے باہر چلا گیا۔ امجد، ارشد کا بڑی حد تک ہم شکل تھا۔ اس لیے وہ لوگ ارشد کی بھول میں امجد کو بہانے سے ایک طرف کو لے گئے اور تین آدمیوں نے بیک وقت آگے پیچھے سے چاقو چلا دیئے۔ انہوں نے چاقوؤں کے سترہ وار کیے اور وہ وہیں پر گر گیا۔۔۔

ابھی میرا یہ غم ہرا ہی تھا کہ ارشد کو قتل کے الزام میں قید کر لیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ اس وقت تک میرا جگر اور دل پتھر کا بن چکا تھا اور میں اس صدمے کو بھی برداشت کر گئی۔ بس اللہ کے حضور میں اپنے بیٹوں کے لیے دعا کی کہ یا خدا انہیں جنت عطا فرما۔ ان لوگوں نے میرے چھوٹے لڑکے کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی، اس لیے میں نے اس کو سعودیہ بھیج دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے۔۔۔

(ایم شکیل شاد۔۔۔ ملتان)

دلہن کی لاش

یہ واقعہ خود میری آنکھوں دیکھا ہے۔ جسے میں نے لاکھ بھلانے کی کوشش کی ہے مگر آج تک اسے بھول نہیں پایا، اس لیے آج اسے اپنے دل سے نکال کر قارئین کی نذر کر رہا ہوں، شاید اسی طرح میرے ذہن سے اس کا بوجھ اتر جائے۔۔۔۔ ویسے اللہ تعالیٰ ایسے واقعات کسی کو نہ دکھائے۔

مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ وہ مارچ ۱۹۶۸ء گرمی کے آغاز کے دن تھے۔ میں آٹھویں کا امتحان دے رہا تھا۔ اس دن میں اپنا دینیات کا پرچہ دے کر گھر جانے کے لیے بس اسٹاپ پر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بس گوجرانوالہ کی طرف سے آئی، جس میں برات واپسی کے لیے دینہ جا رہی تھی۔ وہ یہاں لالہ موسیٰ میں پانی پینے کے لیے کچھ دیر کو ٹھہرے۔ میں بھی ان براتیوں کے بیچ میں کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بہت ہی زیادہ خوش تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔۔۔ یار ویسے لڑکی بہت خوبصورت ہے۔۔۔ دوسرے نے پوچھا۔۔۔ اس کا نام کیا ہے۔۔۔؟ اس کا نام۔۔۔ پہلے نے لمبی سانس لے کر کہا "نسرین"

"نام بھی بہت پیارا ہے"۔۔ دوسرے نے کہا۔

"اچھا یار اب چلیں، گھر جا کر کچھ ناشتہ پانی کا بندوبست بھی کرنا ہے"۔۔

ان براتیوں کی بس کو گئے ہوئے بیس منٹ ہو چکے تھے۔ میں نے علی چک جانا تھا۔ میں دوسری بس میں سوار ہو گیا۔ ابھی ہماری بس علی چک سے کچھ دور ہی تھی کہ سامنے سڑک پر بہت بڑا ہجوم دکھائی دیا۔۔ سب سواریاں ایک دوسرے سے کہنے لگیں کہ شاید یہاں پر کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔۔۔ جب ہم نے بس سے نیچے اتر کر دیکھا تو وہی برات والی بس اور راولپنڈی کی سے آنے والے ایک ٹرک کے درمیان زبردست تصادم ہوا تھا جو کہ ایک دوسرے میں دھنسے ہوئے تھے۔

گاؤں بھی سڑک کے قریب ہی تھا۔ بہت سے لوگ دوڑتے چلے آ رہے تھے۔ اور جو وہاں پر موجود تھے وہ زخمیوں کو باہر نکال رہے تھے۔ جن میں کسی کی ٹانگ کٹ گئی تھی، کسی کا بازو کٹا ہوا تھا اور کوئی مر گیا تھا۔ میں نے بھی ان کی مدد کے لیے ایک سریا لیا اور بس کو اکھاڑ اکھاڑ کر زخمیوں کو نکالنے لگا۔۔۔ دو سیٹوں کے درمیان دولہا میاں کی ٹانگ پھنسی ہوئی تھی، میں نے سیٹوں کو توڑا اور ایک دوسرے آدمی کی مدد سے اس آدمی کو باہر لے آیا۔ اور اس کے منہ میں پانی ڈالا۔ وہ درد کی شدت میں بھی ہائے نسرین۔۔۔ ہائے نسرین پکار رہا تھا۔ ادھر کوئی ماں ہائے بیٹا کہہ رہی تھی اور کوئی بیٹا ہائے ماں کی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ میں نے جب دولہا کے منہ نسرین کی پکار سنی تو بھاگ کر دلہن کی طرف گیا، جس کے ارد گرد بہت سے لوگ جمع کھڑے افسوس ملتے ہوئے کہہ رہے تھے، ہائے اللہ کتنی پیاری ہے۔ بس اس کی قسمت جو خدا کو منظور ہو، وہی ہوتا ہے۔۔۔

میں نے جب اس ہجوم میں گھس کر دلہن کی لاش کو دیکھا تو میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اس کے سر سے کھوپڑی اڑ گئی تھی اور بازو بھی کٹ چکا تھا اور وہ اب موت کی میٹھی اور ابدی نیند سو رہی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر چیخیں مارنے کو جی چاہا۔۔۔ مگر ضبط کر کے آنسو بہاتا ہوا گھر آ گیا۔ اس کے آگے مجھ سے کوئی منظر نہ دیکھا گیا۔ گھر آ کر میں اتنا رویا کہ جیسے وہ میری کوئی اپنی عزیز رشتہ دار تھی۔ جیسے میں آج تک فراموش نہیں کر سکا۔

آج بھی جب وہ سین میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو بے ساختہ آنسو نکلنے لگتے ہیں

(ایم آصف شاہین بٹ۔ سعودی عرب)

وقت کی گاڑی

وقت کے پہیے ہر دم چرچراتے رہتے ہیں۔۔۔ اور گاڑی کو گھسیٹتے رہتے ہیں۔۔۔ نہ اس میں کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے اور نہ کوئی رکاوٹ۔۔ وقت کی گاڑی کبھی نہیں رکتی۔۔۔ اسے کسی سے کوئی غرض نہیں۔ اس کی بلا سے، کوئی جیئے یا مرے۔۔۔ کوئی رو دے یا مسکرا دے۔۔۔ لمحات آگے کی طرف ہی سرکتے رہتے ہیں۔۔۔ ماہ و سال کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔۔ وقت دھیرے دھیرے اپنے محور کے گرد گردش کرتا رہتا ہے وقت کے کئی حصے ہیں۔۔۔ دن یا رات ہمیشہ ایک ہی محور پر چلتے ہیں، لیکن کچھ تبدیلیوں کے ساتھ۔۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے پھولے بسرے در پر بھی پھیرا لگا جاتے ہیں۔ خاص کر وقت کا دلفریب حصہ رات اپنے آنگن میں کھلے ہوئے واقعات کے پھولوں کو کچھ عرصے کے بعد آ کر پاکیزہ شبنم سے آبیاری کرتا ہے۔۔۔

یوں تو زندگی کی ہزار ہا راتیں تنہا سفر طے کر چکی ہیں لیکن ایک رات کے نقوش آج بھی میرے ذہن پر سورج کی طرح چمک رہے ہیں۔ ہاں وہ ایک رات ہی تھی جس کے چند حصے بخرے کر دیئے گئے تھے۔ میں اسے ایک ہی رات کہوں گا چاہے وہ کتنے ہی ٹکڑوں میں نمودار ہوئی ہو۔۔۔ ایک رات، ہاں ایک رات جب چاند اپنی تمام تر جلوہ آرائیوں کے ساتھ رونما تھا۔ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ موسم حسین تھا، فضا پرکشش تھی، حالات سازگار تھے اور وقت بھی مہربان تھا۔ وہ کتنی سہانی رات تھی جب میں اور فرحی اپنے مکان کی چھت پر بیٹھے محبت بھرے گیت الاپ رہے تھے۔۔۔ خوشیوں کے جھولے میں جھول رہے تھے۔ الفت

رہے تھے گا رہے تھے۔ ان گیتوں اور نغموں میں ہمارے پیار کا سنگیت اور ہمارے دل کی دھڑکنوں کی موسیقی شامل تھی۔ کتنی مدھر دھنیں تھیں ان گیتوں کی، اور کتنی دلفریب رات تھی… ہم ساتھ رہنے کی قسمیں کھائی جا رہی تھیں… ساتھ نبھانے کے عہد کیے جا رہے تھے۔ عہد و پیمان کے ریشمی ڈورے باندھے جا رہے تھے اور ستارے ہماری نئی دنیا کے دل آباد ہونے پر مسکرا رہے تھے… گھڑی کی سوئیاں گھومتی رہیں۔ دن اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے۔ اور محبتوں کے…

ہاں محبتوں کا وقفہ ہی تو تھا… پھر ایک رات… بالکل وہی رات… چاند اسی طرح روشن، موسم حسین، فضا پُرکشش… لیکن… لیکن حالات ناسازگار تھے… وقت نامہربان تھا۔ آج فرحی نہیں تھی، بلکہ میں اکیلا ہی اس چھت پر لیٹا تاروں کو گن رہا تھا… پیش آنے والے غموں کے لمحات ڈس رہے تھے۔ کسی کل چین نہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ جو خوشیوں بھرے لمحات پہلے جو تارے میرے سامنے آنکھ مچولی کھیلتے تھے، اب میری بے بسی پر آنسو بہا رہے تھے… آسمان قہقہے لگا رہا تھا اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔ دل کٹ کٹ کر لہو کی صورت میں آنکھوں کے راستے بہہ رہا تھا۔

وقت نپے تلے قدم بے پروائی سے اٹھاتا آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ اسے میرے دکھوں کا کچھ احساس نہ تھا اسے تو بہرحال اپنی گاڑی کو کھینچنا تھا۔ سو وہ کھینچتا رہا۔ اب مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ وقت کتنی ظالم اور بے رحم شے ہے… اسے کسی کی نگری برباد کرنے میں کتنی لذت آتا ہے۔ کسی کی دولتِ دل لوٹ کر، کسی کی آس امید کی بستی اجاڑ کر، کسی کے سکون کی پونجی چھین کر اسے کتنا مزہ آتا ہے۔ یہ خوشیوں میں غموں کی آمیزش… اور مسکراہٹوں میں آنسو سمو دیتا ہے۔

حالات قہقہے برساتے رہے… ماضی کے ایام میرا منہ چڑاتے رہے… گزرے ہوئے حسین لمحات میرا مذاق اڑاتے رہے، عہد و پیمان کے جو ریشمی ڈورے باندھے تھے، وہ پھانسی کا پھندا نظر آنے لگے، اور وقت سیکنڈوں اور منٹوں کی صورت میں اپنا سفر طے کرتا رہا۔ اور پھر میرے لیے قیامتِ صغریٰ گزر گئی۔ نیچے مبارک، مبارک کا شور اٹھنے لگا… شہنائی کی گونج نے مل کر قہقہے برساتے جاتے تھے۔ اور فرحی… صرف تین الفاظ کہہ کر ہمیشہ کے لیے کسی اور کی ہو گئی۔ اور میں صرف الفاظ کی قدر و قیمت پر موقع محل کے لحاظ سے غور کرنے لگا… کہ یہی تین الفاظ ایک مرتبہ نہیں سینکڑوں مرتبہ فرحی نے مجھ سے بھی کہے تھے۔ پھر وہ میری کیوں نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ میں اس وقت سر پر سہرا نہیں سجائے ہوئے تھا اس وقت شہنائی کی گونج نہیں تھی اور میں اہمیت کے لبادے میں چھپے وقت کی اس ایک اور چال پر غور کرنے لگا… میری دنیا میرے سامنے لٹ چکی تھی اور میں خاموش تھا۔ بعض اوقات انسان کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔

اور میں تب اس ستمگر اپنے وقت کے دیئے ہوئے گھاؤ کو پُر کرنے کی ناکام کوشش کے ساتھ شکستہ قدموں سے محبت کے مفہوم پر غور کرتے ہوئے فرحی کی ڈولی کو کندھا دینے کے لیے نیچے اترتا چلا گیا…

(توقیر احمد، محلہ فاروقی۔ چیکوال)

اٹوٹ رشتے

اٹوٹ رشتے کے نام سے ایک چھوٹا سا واقعہ میں اپنے قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔ جو کہ میرے ایک دوست نے مجھے سنایا اور اسی کی زبانی تحریر ہے:

مجھے اس لڑکے کو دیکھ کر بار بار غصہ آ رہا تھا جو پندرہ بیس منٹ سے مسلسل ہمارے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا اور میں یہ سوچ کر مسلسل پاگل ہوا جا رہا تھا کہ یہ لڑکا کون ہے میں نے اس سے قبل بھی اسے بارہا دیکھا تھا اور آج بھی اسے ایک کھڑکی سے دیکھا۔ ہاتھ جو دوسری گلی میں کھلتی تھی اور وہ چوک میں کھڑا تھا… ہم نے یہ مکان چند روز ہوئے خریدا تھا… پندرہ منٹ اور گزر جانے کے بعد وہ لڑکا آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک گلی میں گھس…

میں فوراً نیچے آیا اور اسی گلی میں تیزی سے گیا، مگر وہاں اس کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ میں بہت پریشان ہوا.. تاہم میں گھر واپس لوٹ آیا... اور رات کو اسی لڑکے کے بارے میں سوچتے ہوئے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

دوسری صبح میں کافی دیر سے اٹھا، ناشتہ وغیرہ کیا اور پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ مگر اسی لڑکے کی شکل بار بار میری نظروں کے سامنے گھوم جاتی۔ بالآخر مجھے یہ خیال پریشان کیے ہوئے تھا کہ آخر وہ لڑکا ہمارے گھر کو اس طرح سے کیوں گھورتا رہتا ہے۔ معلوم نہیں اس کی کیا مراد ہے.. یہ خیال میرے ذہن پہ کچھ اس بری طرح سے سوار تھا کہ میں زیادہ دیر تک نہ پڑھ سکا۔ اور کتابیں بند کر کے بیٹھ گیا... کمرے میں بہت زیادہ حبس تھا، اس لیے میں نے کھڑکی کھول دی، تو وہی لڑکا وہاں پہ ایک دوسرے لڑکے کے ساتھ کھڑا باتیں کرتا دکھائی دیا۔ اب وہ باتوں باتوں میں ہمارے مکان کی طرف اشارہ بھی کر رہا تھا.. اس کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔ مگر میں اس کا کر ہی کیا سکتا تھا... وہ تو ابھی چوک میں ہی تو کھڑا تھا میں نے کھڑکی بند کر دی۔

تب میں نے کوئی آدھ گھنٹے بعد کھڑکی کھول کر دوبارہ دیکھا تو وہ جا چکا تھا... میں نے سکھ کا سانس لیا.. اور پھر اسی کے متعلق سوچتے سوچتے شام ہو گئی۔ میں نے کھانا کھایا اور سو گیا...

رات کو یہی کوئی بارہ بجے کا عمل ہو گا کہ لاشعوری طور پر میری آنکھ کھل گئی۔ تب ہی بیرونی کھڑکی میں ذرا سی چرچراہٹ ہوئی اور کھڑکی کھل گئی۔ تب تک میں پوری طرح سے بیدار ہو چکا تھا۔ اور تب مجھے اپنی غلطی کا شدت سے احساس ہوا کہ میں کھڑکی بند کیے بغیر سو گیا تھا... کھڑکی میں سے وہی لڑکا اندر کمرے میں داخل ہوا... میں خوف زدہ سا ہو گیا تھا اور حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ کہ جیسے میرا بدن پتھر کا ہو گیا ہو۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ ساتھ والے کمرے میں گیا جو کہ ہم نے ابھی تک صاف نہیں کیا تھا۔ اور وہ بری طرح سے گرد و غبار میں اٹا ہوا تھا۔ اس کے دوسرے کمرے میں جاتے ہی جیسے مجھ میں دوبارہ جان آ گئی ہو۔ میں نہایت پھرتی مگر احتیاط سے اٹھا.. ایک کونے میں پڑی اپنی ہاکی اٹھائی اور کمرے کے دروازے کی آڑ لے کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ لڑکا اس دروازے سے باہر نکلا تو میں نے اپنے ہاتھ بلند کیے۔ ہاکی اس کے سر پر لگی اور وہ گرتے ہی بے ہوش ہو گیا.. میں نے جلدی سے اپنے والدین کو جا کر بیدار کیا اور اس لڑکے سے متعلق پچھلے چند دنوں سے جو کچھ میں دیکھ رہا تھا، انہیں اس سے آگاہ کر دیا.. ابو نے آ کر دیکھا اور ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد ہی کہہ دیا کہ یہ چور نہیں ہے۔ بڑی دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو ہمارے پوچھنے پر اس نے جو کچھ بتایا وہ ہمارے سروں کو ندامت سے جھکا گیا... اس نے کہا:

"اس گھر میں پہلے ہم لوگ رہتے تھے۔ اسی گھر میں میری ماں کا انتقال ہوا... ماں کے انتقال کے بعد میرے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا اور دوسری شادی رچا لی۔ چند دن پہلے مجھے پتہ چلا کہ میرے باپ نے یہ مکان بیچ دیا ہے مگر میری ماں کی ایک تصویر آپ کے گھر میں رہ گئی ہے جو کہ میں لینے آیا ہوں۔ اب یہ آپ لوگ خود فیصلہ کر لیں اگر میں چور ہوں تو جو چاہے مجھے سزا دے دیں"۔

تب ہم نے دیکھا تو واقعی اس کی ماں کی تصویر کمرے میں فرش پر گری پڑی تھی۔ اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ واقعی یہ اٹوٹ رشتے ہیں...

(تنویر کرن، پی او بکس، ۱۰۴۹، العین ابوظہبی)

بلائے ناگہانی

زیرِ نظر واقعہ خود میرے ساتھ پیش آیا... جو بلاشبہ ہے تو مختصر سا، لیکن مجھے امید ہی نہیں، بلکہ یقین ہے کہ یہ قارئین جوابِ عرض کے لیے دلچسپی کا باعث بنے گا... اور میرے بہن بھائی اس سے کوئی نہ کوئی سبق بھی ضرور حاصل کریں گے۔

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب میں دسویں کلاس کی طالبہ تھی۔ جون کا مہینہ تھا اور گرمی اپنے زوروں پر تھی۔ دوپہر کے وقت گھر کے سارے افراد کھانا کھانے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں سوئے ہوتے تھے۔ جبکہ میں باہر برآمدے میں بیٹھی اپنے اسکول کی چھٹیوں کا کام کرنے میں مصروف تھی ... ہمارے علاقوں کی چھتیں لکڑی سے بنی ہوتی ہیں، جن میں کھجور وغیرہ کی لڑیاں ڈالی جاتی ہیں۔ اور ایسی چھتوں میں عموماً چڑیاں اپنے گھونسلے بنا لیتی ہیں ... اب اسے اتفاق ہی کہہ لیجیے کہ اس وقت میری چارپائی کے عین اوپر چڑیا کا گھونسلہ تھا۔ اسکول کا کام کرتے کرتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

اب جانے کتنی دیر میں سوئی ہوں گی کہ اچانک ہی چڑیوں کے بے پناہ شور سے میری آنکھ کھل گئی۔ اور جونہی میری نظر اوپر اٹھی تو خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے ... چڑیا کے گھونسلے میں سے ایک سیاہ رنگ کا سانپ لٹک رہا تھا اور میرے عین اوپر گرنے ہی والا تھا۔ سانپ کو دیکھتے ہی میں تو چیختی ہوئی اندر بھاگی۔ میرے اس طرح شور پر ابو جان ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ میں نے انہیں چیخنے کی وجہ بتائی تو وہ لاٹھی اٹھائے تیزی سے باہر برآمدے میں گئے۔ اتنے میں سانپ گھونسلے میں سے میری چارپائی پر گر چکا تھا۔ ابو جان نے جاتے ہی لاٹھی کے ایک ہی وار سے اسے ڈھیر کر دیا۔

میں سوچتی ہوں کہ اگر میری آنکھ نہ کھلتی تو خدا جانے کیا ہوتا۔ اب جب بھی کوئی سانپ کا نام لیتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے یہ منظر گھوم جاتا ہے جسے میں شاید کبھی نہیں بھول سکتی ...

(عشرت ناز، ہری پور ہزارہ)

یہ دُنیا فانی ہے

زیرِ نظر واقعہ میرے ابو نے مجھے سنایا تھا اور میں انہی کی زبانی اپنے قارئین کی نذر کر رہا ہوں ...

مجھے امید ہے کہ قارئین میرے اس مختصر سے وا
ضرور سبق حاصل کریں گے ...

ہم داؤدخیل کے ریلوے اسٹیشن پر چند
ہوئے تھے کہ اتنے میں ہمارے ساتھ والے
نے اپنی جیب سے کچھ روپے نکال کر انہیں گن
کر رہا۔ پاس بیٹھا ایک تیسرا آدمی اسے تاڑ
اس کے ساتھ ساتھ اس کے نوٹوں کو گنتا ر
اس نے نوٹ گن لیے تو تاڑنے والا شخص وہا
سامنے والے ہوٹل سے چائے پی کر واپس آ
نزدیک ہی کھڑا ریڑھی والے سے کچھ پکوڑے خر
جب اسے جیب سے پیسے نکال کر دینے لگا تو
سے ہاتھ نکال کر شور مچا دیا کہ ہائے میں مر
ہائے میں لٹ گیا ...

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ بھئی کیا ہو
تو اس نے مگرمچھ کے آنسو روتے ہوئے ک
پلیٹ فارم پر کسی نے میرے اتنے روپے نکا
اتنے میں پلیٹ فارم پر موجود ریلوے کی پو
اور انہوں نے باری باری سب کی جیبوں ک
شروع کر دی ... جو آدمی ہمارے پاس بیٹھ
رہا تھا جب اس کی تلاشی لی گئی تو اس سے
پیسے برآمد ہوئے۔ پولیس والوں نے اسی
گرفتار کر لیا اور رقم اس فراڈیے آدمی ک
کر دی ... وہ بے چارہ کہتا ہی رہ گیا کہ یہ
ہے، یہ سب فراڈ ہے، مگر اس کی اس وق
بھی نہ سنی ... اس بے چارے کی رقم بھ
پولیس نے اسے گرفتار بھی کر لیا ...

اب قارئین آپ خود ہی اندازہ لگا لیں
اس دور میں ظالم اور مظلوم کی کیا پہچان رہ گئ
دھوکے باز نے دوسرے کو محض اپنے عیش کی خا
بھی محروم کیا اور اسے سزا بھی دلائی۔ جبکہ یہ
ہے۔ اصل حساب تو آخرت میں ہو گا۔

(ایم رفیق نجمی، ... میانوالی)

*

کسٹمز معلومات

بیرونِ ملک میں مقیم اپنے قارئین کی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کے لیے ہم یہ نیا کالم "کسٹمز معلومات" شروع کر رہے ہیں جو یقیناً آپ کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ (ادارہ)

رفعت علی تیاب ——— اٹریا حق

سوال: میرے بھائی گزشتہ تقریباً دس سال سے سعودی عرب جدہ میں مقیم تھے... ان کا انتقال جدہ میں ہی ایک کار کے حادثے میں ہو گیا ہے۔ اب ان کی بیوہ (بیگم) ان کے تین بچوں کے ہمراہ مستقل طور پر پاکستان آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ مندرجہ ذیل سامان ہے۔

ریفریجریٹر، واشنگ مشین، اوون کُک، ٹی وی (رنگین)، وی سی آر، کیمرہ، مووی کیمرہ، بیڈ (ڈبل بیڈ)، امریکن کار (بڑی)، متعدد گھریلو استعمال شدہ سامان، ایئرکنڈیشنڈ، اور گھر کا فرنیچر اور قالین وغیرہ، یہ سارے کا سارا سامان استعمال شدہ ہے، ہر سامان خاصا پرانا ہے، وی سی آر دو سال پرانا ہے۔ ان سب چیزوں میں کون کون سی چیزیں ڈیوٹی پر اور کون کون سی چیزیں بغیر ڈیوٹی کے آسکتی ہیں... یہ لوگ اس ماہ کے آخر میں اور یا پھر اگلے مہینے کے شروع میں پاکستان آ جائیں گے امید ہے آپ اس کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتے ہیں آپ ذرا جلدی جواب دے دیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا اور بیوہ اور بچے بھی آپ کو دعائیں دیں گے۔ اور اگر کسی قانون کے تحت بیوہ کے لیے کوئی رعایت ہو تو ضرور لکھیے گا... پھر آگاہ کر دوں کہ ان کے ساتھ ان کے تین بچے بھی ہیں...

جواب: ایس آر او نمبر ۸ (ا) ۷۶ کے تحت حکومت نے ایسے افراد کے سامان کو جن کا انتقال بیرونِ ملک ہو جائے، کسٹم ڈیوٹی سے مستثنیٰ قرار دے رکھا ہے اور انہیں وہی مراعات دی جائیں گی جو زندگی میں مسافروں (غیر سیاحوں) کو قانون کے تحت یا تبدیلی رہائش کے قانون کے تحت دی جا سکتی ہے۔ مرحوم کی بیوہ جب ملک میں آئیں تو ایئرپورٹ پر فارم میں سامان کے کوائف مختصر درج کر دیں، بعد میں کارروائی مکمل ہو جائے گی۔

تنویر الدین ——— لاہور

سوال: میرا بھائی عرصہ دس سال سے لندن میں ہے۔ اور اب وہاں کا شہری ہونے کے بعد وہیں سے پاسپورٹ پر پاکستان آنا چاہتا ہے۔ اپنے ساتھ رنگین ٹی وی لا رہا ہے۔ اس پر کتنا کسٹم لگے گا۔ نیز یہ کہ کیا ایجنسی کے ذریعے گفٹ اسکیم کے تحت رنگین ٹی وی بھیج سکتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو اس پر کتنا کسٹم ہوگا یا نہیں۔ یہ بھی بتائیں، کہ کیا بحری اور ہوائی جہاز سے آنے والے سامان پر کسٹم میں کچھ فرق ہے...

جواب: آپ کے بھائی رنگین ٹی وی ساتھ لا سکتے ہیں مگر اس پر ۸۵ فیصد کسٹم ڈیوٹی اور ۵ فیصد سرچارج دینا ہو گا۔ گفٹ اسکیم کے تحت ٹی وی نہیں بھیجا جا سکتا۔ نیز بحری یا ہوائی سفر دونوں صورت میں کسٹم ڈیوٹی کا ایک ہی ریٹ ہے...

وطن سے دور

اس کالم میں ہم وطن سے دور پاکستانی بھائیوں کے مسائل اور شکایات اور ان کی آرا شائع کیا کرتے ہیں۔ بیرونِ ملک میں مقیم پاکستانی افراد کے مسائل اور شکایات شائع کرنے کی کسی قسم کی کوئی فیس نہیں ہوگی۔ البتہ اس بات کا خاص طور پر خیال رہے کہ جس ملک میں آپ کام کرتے ہیں اس ملک کے خلاف کوئی مواد ارسال نہ کریں۔ وہ شائع نہیں ہو سکے گا۔ اپنے مسائل اور شکایات اس پتے پر ارسال کریں :۔ (ادارہ)

نگران : "وطن سے دور" دفتر ماہنامہ "جوابِ عرض" ، نسبت روڈ لاہور

سعودی ریڈیو اور ہم

کچھ دنوں روزنامہ مشرق کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایک خط نظروں سے گزری، جسے پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ جو کہ میرے محترم دوست مرزا محمود الحسن نے ... تحریر کی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر وہ بھی خبر اٹھا دیتے۔

موصوف فرماتے ہیں کہ سعودی عرب میں مقیم پاکستانیوں کے لیے سعودی ریڈیو اردو میں پروگرام نشر کرے گا۔ یہ افواہ گرم ہے۔ تو دوست آپ نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ واقعی قابلِ داد ہیں۔ میں نے تو پہلے بھی کئی دفعہ ہوا گرم کرنے کے لیے لکھا تھا مگر افسوس کہ افواہ ہوا میں تبدیل ہو کر گرم کی بجائے ٹھنڈی آتی رہی۔ اگر ہم مل کر کوشش کریں تو یہ مسئلہ بخوبی حل ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ سب دوستوں کو علم ہے کہ سعودی ٹی۔ وی ہفتہ میں ایک بار ہندی فلم دکھاتا ہے اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے سعودی حکومت ہم پاکستانیوں کے لیے بھی مفید پروگرام نشر کر سکتا ہے

اردو نشریات کی افواہ آج سے چند سال پہلے بھی اڑی تھی، اس وقت بھی ہم سب بہت خوش ہوئے تھے مگر انتظار کرتے کرتے چھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے مگر آج پھر ایک بار آپ کی تحریر نے اپنے قلم ... مجھے لکھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ سوچا اگر ہم سب مل جل کر لکھیں اور کوشش کریں تو کوئی وجہ نہیں جو ہمارے مسئلہ پر توجہ نہ دی جائے۔ اور ہم بہ آسانی اپنے ملک کے حالات سے باخبر رہ سکیں

دوست میں آپ کے پاکستان کے بارے میں جذبات کی دلی طور پر قدر کرتا ہوں۔ آپ جیسے وطن پرست دوست اگر مل کر کوئی بھی قدم اٹھائیں تو ہر مشکل آسان ہو سکتی ہے۔ آج کے بعد میں اور میرے دوست آپ کے ساتھ ہیں، جو بھی قدم اٹھائیں مل کر اٹھائیں گے۔ آپ جو بھی لکھنا چاہیں دل کھول کر لکھیں، ہم برابر اس کی حمایت کریں گے۔ میں اپنے تمام پاکستانی بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ ہم وطن سے دور پاکستانیوں کے لیے سعودی ریڈیو سے اردو کی نشریات بے حد ضروری ہیں۔۔۔ جیسے پاکستان کی عالمی سروس خلیجی ریاستوں کے لیے ان کی اپنی زبانوں میں پروگرام پیش کرتی ہے۔۔۔ اسی طرح سعودی ریڈیو کے حکام کو بھی چاہیئے کہ وہ سعودی عرب میں کثیر تعداد میں مقیم پاکستانیوں کے جذبات کا خیال رکھتے ہوئے اردو پروگرام شروع کرے۔

اسی سلسلے میں ہم اپنی پاکستانی حکومت سے بھی پُرزور اپیل کرتے ہیں کہ وہ حکومتی سطح پر سعودی عرب کی حکومت سے سفارش کرے کہ وہ ہم پاکستانیوں کے لیے اردو میں مفید پروگرام نشر کرے ہمارے اس دیرینہ مطالبہ کو پورا کیا جائے۔ تاکہ ہم آسانی کے ساتھ اپنے ...

جوابِ عرض لاہور۔

ملک سے پیدا گر ہم سُن سکیں۔

(نعمت علی شاہد۔ الریاض۔ سعودی عرب)

کچھ تو خیال کریں

پچھلے سال ہم چند دوست جمعہ کے روز جدہ سے مکہ شریف کے لیے روانہ ہوئے کہ وہاں عمرہ بھی کریں گے اور نماز جمعہ بھی حرم شریف میں ادا کریں گے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے عمرہ کا طواف کیا۔ نماز جمعہ میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ کہ میں نے دیکھا کہ جوان لڑکی چار آدمیوں کے پاس کھڑی ہے۔ یہ چاروں آدمی ضلع دیافوی سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ لڑکی ان کی منت سماجت کرتے ہوئے ان سے کہتی تھی:

"بھائیو! میں پاکستان کے شہر حیدر آباد کی رہنے والی ہوں، مجھے یہاں پر ایک ایجنٹ نے چیک دستی کر لیا تھا۔ وہ مجھے یہاں پر ہسپتال میں نرس کی نوکری دے رہا تھا۔ مگر یہاں پر آکر مجھے دھوکا دے گیا اور میں غلط قسم کے لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ انہوں نے جو سلوک میرے ساتھ کیا وہ میں بیان نہیں کر سکتی۔۔۔ آپ میرے پاکستانی بھائی ہیں میری اتنی مدد کر دیں کہ میں واپس اپنے وطن چلی جاؤں"۔

ان چاروں نے جواب دیا کہ آپ ہماری بہن ہیں ہم آپ کی ضرور مدد کریں گے۔" یوں وہ لڑکی ان کے ساتھ ہو گئی۔ وہ لڑکے چونکہ میرے کچھ کچھ واقف تھے۔ انہوں نے دو ماہ تک اسے اپنے پاس رکھا اور اس کی بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے رہے۔ اور پھر سے واپس وطن بھیج دیا۔ تو میری پاکستانی بھائیوں سے اپیل ہے کہ وہ ایسی نازیبا حرکات سے باز رہیں جس سے اپنے ملک کا وقار مجروح ہوتا ہو۔

(الحاج ملک غلام شبیر حیدری۔ جدہ السعودیہ)

یہ کاغذی کارروائی

میں اپنا ایک مسئلہ جواب عرض کے اس ۔۔۔ کے ذریعے متعلقہ حکام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ امید ہے وہ میرے مسئلہ پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔

میں سعودی عرب کے شہر الریاض سے [illegible] کلومیٹر باہر سروس کر رہا ہوں۔ میں نے یہاں سے لاہور میں اپنے گھر والوں کو دسمبر ۱۹۸۱ء میں ایک رجسٹری کروائی تھی۔ اس رجسٹری میں میرے گھر والوں کی تقریباً ۳۵ عدد رنگین تصویریں تھیں۔ آج ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے مگر وہ رجسٹری میرے گھر والوں کو نہیں ملی۔۔۔ میں نے ریاض، ہیڈ پوسٹ، پر جنرل پوسٹ آفس سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے بتایا کہ یہ رجسٹری تو کب کی یہاں سے روانہ ہو چکی ہے۔

میرے گھر والوں سے خط کے ذریعے پتہ کیا تو انہوں نے بھی کہا کہ ہمیں ایسی رجسٹری نہیں ملی۔ پھر میں نے ایک درخواست یہاں پر پاکستانی سفارت خانے کو دی کہ آپ کراچی سے معلوم کر کے بتائیں کہ یہ رجسٹری کہاں گم ہو گئی ہے۔ تو مدیر صاحب نے کہا کہ آپ جناب یہ درخواست اور رجسٹری کی رسید ڈائریکٹر جنرل اسلام آباد کو بھیج دیں، وہ یہ کوشش کریں گے۔

ان کے کہنے پر میں نے ایسا ہی کیا۔۔۔ بعد میں اسلام آباد سے جواب آیا کہ ہم آپ کو ایک نا جواب دیں گے۔۔۔ اس طرح سے بات صرف کاغذی کارروائی تک ہی محدود رہی۔ [illegible] نتیجہ بھی نہیں نکل سکا۔ میں یہاں پر [illegible] کرتا ہوں کہ جو سرکاری ملازم [illegible] کا ثبوت دیتے ہیں ان کے خلاف [illegible] جائے تاکہ ہم پردیس میں رہنے [illegible] سے نجات مل سکے۔۔۔۔

ہم پردیس میں رہنے والے ایک تو پہلے ہی سے گھر والوں کی جدائی کے باعث پریشان ہوتے ہیں اوپر سے ایسے مسائل ہمارے لیے اور بھی تکلیف کا باعث بن جاتے ہیں۔ کبھی ڈرافٹ روانہ کرو تو وہ کئی کئی ماہ تک گھر والوں کو نہیں ملتا۔ خدا کے لیے اس پر

جواب عرض ہے

ہمارے مسائل کو متعلقہ حکام تک پہنچا دیں۔

(مصدق محمود، الریاض۔ سعودی عرب)

افسوس ہے مسلمان!

میں بڑے افسوس کے ساتھ ان بھائی بہنوں کا ذکر اس کالم میں کر رہا ہوں کہ جو بہن بھائیوں کے ساتھ قلمی دوستی کرتے کرتے بجائے بہن بھائیوں جیسا سلوک کرنے کے ان سے محبت کرنا شروع کر دیتے ہیں اور ایسے ایسے الفاظ لکھتے ہیں کہ جن کی تہذیب اجازت نہیں دیتی۔۔۔ یہ بہت ہی افسوسناک امر ہے۔ ہمارے مذہب اسلام میں عورت سے دوستی کرنا یا عورت کا مردوں سے دوستی کرنا جائز نہیں۔ میں بس اتنی ہی اپیل کروں گا کہ خدا کے لیے مسلمان ہو کر اپنے دوسرے مسلمان بہن بھائیوں کو دھوکہ مت دیں جبکہ اسلام میں کسی کو دھوکہ دینا بہت بڑا گناہ ہے۔

علاوہ ازیں میرے بہت سے مسلمان بھائی غیر ممالک اور سعودی عرب جیسے مقدس ملک میں رہ کر قلمی دوستی جیسے فضول مشغلے پر بہت سا روپیہ خرچ کر رہے ہیں اور لڑکے لڑکیوں کے لیے فضول تحفے تحائف ارسال کرتے رہتے ہیں۔ انہیں اپنی خون پسینے کی کمائی یوں بے جا کاموں پر صرف کرنے سے دریغ کرنا چاہیے۔ ایسے بھائیوں سے التجا ہے کہ بجائے اس جھوٹے پیار پر خرچ کرنے کے کسی غریب یتیم یا کسی دینی درسگاہ میں غریب طالب علموں کی امداد کرنے پر اپنی کمائی صرف کریں جس سے ان کی آخرت سنورے۔ اور خدا کی خوشنودی حاصل ہو۔

(محمد عبداللطیف خان ویلڈر مدینۃ المنورہ السعودیہ)

بجا اور بے جا تنقید

آئے دن غیر ممالک میں ہمارے پاکستانی بھائیوں کا، پی آئی اے کے عملے، بنک ورکرز، اور سفارت خانہ کے اہل کاروں اور ان کی کارکردگی پر تنقید اور ان کی شکایات کرنا ایک معمول سا بن چکا ہے۔ اکثر و بیشتر ان لوگوں کے نامناسب رویے، ناروا سلوک اور بد اخلاقی کے بارے میں تبصرے کیے جاتے ہیں۔۔۔

مگر یہ دیکھنے کی بھی ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں ہمارا اپنا رویہ، ذمہ دار افسران سے اپنے مسائل کے بارے میں بات چیت کرنے کا طور طریقہ اور انداز کیسا ہے۔۔۔۔ ہمیں کسی دوسرے کی ذات پر کیچڑ اچھالنے سے پہلے اپنی خامیوں پر بھی نظر ثانی کرنا چاہیے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ہر کام جائز و ناجائز طریقے سے جلد از جلد نپٹ جائے۔۔۔ دیار غیر میں یقیناً کئی ایک مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور اچھے برے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔۔۔ مگر کسی ایک ایسی کالی بھیڑ کی وجہ سے سارے اسٹاف اور افسران بالا سے لے کر چپڑاسی تک کو بدنام کر دینا سراسر نا انصافی ہو گی۔

یہاں پر میں آپ بھائیوں کی توجہ پاکستانی سفارتخانہ جو کہ الریاض میں قائم ہے کی طرف دلانا چاہوں گا۔ اپنے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں ٹیلی فون پر چند معلومات حاصل کیں، کیونکہ مجھے جگہ کے بارے میں بالکل علم نہیں تھا۔ فون پر جن صاحب سے میری بات چیت ہوئی ان کا نام سلطان خوش بخت تھا۔۔۔ انہوں نے پہلے تو مجھے دفتر کی مکمل طور پر نشاندہی کرائی اور پھر کام کے بارے میں بھی مکمل راہنمائی کی۔ میں جب وہاں پہنچا تو سیدھا موصوف کے پاس گیا جن سے میری بالکل شناسائی یا جان پہچان تک نہ تھی۔ انہوں نے بڑے اخلاق سے مجھے اپنے پاس بٹھایا، نہایت غور سے میری باتوں کو سنا اور پھر تھوڑے سے وقت میں ہی میرا مسئلہ حل کر کے مجھے فارغ کر دیا۔۔۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو کہہ دیتے کہ میاں لائن میں کھڑے ہو جاؤ اور اپنی باری آنے پر بات کرنا، تو

جواب عرض لاہور

وہ پھر بھی حق بجانب تھے۔ اور اگر ان کے اس عمل سے میرے کام میں تاخیر ہو جاتی تو میرا کوئی حق نہیں بنتا کہ انہیں موردِ الزام ٹھہراتا۔

میری تمام بھائیوں سے گذارش ہے کہ خدارا کسی ایک آدمی کی بدولت سب کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کریں اور اگر کام میں ذرا دیر سویر ہو جائے تو بے صبری کا مظاہرہ نہ کریں اور نہ ہی ذمہ دار افراد کے اختیارات میں مداخلت کر کے کسی ناجائز کام کے لیے انہیں مجبور کریں بلکہ مہربانی خوش اخلاقی کے تحت خود بھی خوش اخلاقی کا دامن تھامے رکھیں۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ انہیں کبھی بھی کسی سے شکایت کا موقع میسر نہیں آئے گا۔

(طالب حسین ۱۸۳۵۷ الریاض سعودی عرب)

پردے کا خاص خیال کریں

جناب مدیر! آپ کے اس کالم کی وساطت سے بڑے افسوس کے ساتھ اپنے عزیز ہم وطنوں سے مخاطب ہوں۔ مجھے سعودی عرب میں رہتے ہوئے تقریباً تین سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ یہاں مکہ المکرمہ کی پاک سرزمین پر اکثر پاکستانی بھائیوں کے ہمراہ ان کے بیوی بچے بھی ہیں۔ وہ اکثر خواتین پردے کا دھیان نہیں کرتی ہیں۔ میرا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں کہ ایسے ہی، خواہ مخواہ اپنی بہنوں کی بدنامی کریں۔ یہاں آج تک کسی بھی پاکستانی خاتون کی بدنامی نہیں ہوئی اور انشاء اللہ تعالیٰ کبھی ہو گی بھی نہیں۔۔ لیکن اگر نوجوان عورت اور وہ بھی خوبصورت، ننگے سر گھومتی پھرتی ہو تو سب لوگوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔

یہاں ہمارے جیسے اور بھی کئی ممالک کے باشندے اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مقیم ہیں، ان میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں، وہ ہماری ننگے سر خواتین کو دیکھ کر ہمارے سامنے ہی ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگ جاتے ہیں۔۔۔

اگر ان خواتین کو ٹوکا جائے یا انہیں چادر اوڑھنے یا چار دیواری میں بیٹھنے کی نصیحت کی جائے تو یہ اعلیٰ اقدار کی پرستار خواتین نصیحت کرنے والوں کو تنگ نظر اور دقیانوسی کہتی ہیں۔

ہمارا ملک اسلامی جمہوریہ ہے۔ یہ ملک اسلام کے نام پر بنا ہے، خدارا ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کیا پھر ہمیں ایسی باتیں زیب دیتی ہیں۔ اور ہاں اس کے علاوہ ہماری اکثر پاکستانی خواتین یہاں عمرے کے ویزہ پر آتی ہیں اور یہاں آ کر مقامی لوگوں کے گھروں میں گھر کی صفائی اور برتن وغیرہ دھونے کی نوکری کر لیتی ہیں۔ ایسی ہی کم ظرف اور پیسے کی لالچی پاکستانی عورتیں اپنے ملک کو بدنام کرتی ہیں۔ انہی کی وجہ سے دوسرے لوگوں کا بھی معیار گرتا ہے۔ میری صدرِ پاکستان سے پُرزور اپیل ہے کہ ایسی کم ظرف خواتین کا سختی کے ساتھ نوٹس لیں اور انہیں باہر آنے کی اجازت نہ دیں۔

حرم پاک میں کئی ایسی خواتین طواف کرتی ہوئی نظر آتی ہیں جنہوں نے اپنا جسم درست طریقے سے ڈھانپا نہیں ہوتا۔ بے حد پتلا اور تنگ چست لباس پہنا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسی ہی خواتین حرم پاک میں خوب میک اپ وغیرہ کر کے آتی ہیں۔ ان عورتوں کو خدا کا خوف ہی نہیں آتا کہ یہ کس جگہ پر آئی ہوئی ہیں۔ خدا ہی ان کو نیکی کی ہدایت دے۔

اے میری بہنو! پردہ عورت کا زیور ہے۔ خدا کے لیے اسلام کے بتائے ہوئے اصول اپنائیں اور اپنے پیارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ازواجِ مطہرات کے نقشِ قدم پر خود کو چلانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہیں۔

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں ایک مرتبہ ان کی بھتیجی حضرت حفصہ بنت عبدالرحمٰن باریک سی اوڑھنی اوڑھ کر حاضر ہوئیں تو حضرت عائشہ صدیقہ رضہ نے اس باریک اوڑھنی (دوپٹہ) کو پھاڑ دیا اور موٹی اوڑھنی ان کو اوڑھا دی۔ آج مسلمانوں کے گھروں میں بھی عورتوں کو ٹھیک وہی لباس پہننا چاہیے جس کی بابت

جابر الحق لاہور

اپریل ۸۳ء

میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میرے بھائی اپنی بیویوں کی پردے کے بارے میں خصوصی توجہ دلائیں گے۔ یہ آزادیٔ نسواں عورت کو نئے فیشن کی طرف لیے جا رہی ہے . . . .
(شیخ محمد ثاقب رفیق پی او بکس ۸۷۳ مکہ المکرمہ السعودیہ)

یہ دھاندلی ہے یا ؟

زیر نظر مسئلہ میرے ایک نہایت ہی عزیز ترین دوست کے لیے فکر اور پریشانی کا باعث بنتا جا رہا ہے۔ آپ اسے جواب عرض کو ترجیحی اشاعت میں شامل کرکے میرے دوست کی پریشانی کو کم کر سکتے ہیں، مسئلہ کچھ یوں ہے . . .

میرے ایک دوست نے ۵ فروری ۱۹۸۲ء کو دبئی کی ایک کمپنی انٹرنیشنل ایسوسی ایشن کے ذریعے فریج اور سانیو کی ایک فوڈ فیکٹری لاہور تک کے لیے بک کروائی تھی۔ لاہور ڈرائی پورٹ پر پہنچنے کی مدت انہوں نے تیس دن بتائی تھی۔ جبکہ صرف فریج چھ ماہ بعد پہنچی، وہ بھی ایک طرف سے بری طرح سے پچکی ہوئی تھی۔ اور اپنے اوریجنل رنگ میں بھی نہ تھی . . . مزید یہ کہ فریج دیر سے پہنچنے کی وجہ سے کسٹم کے ساتھ ساتھ جرمانہ بھی ادا کرنا پڑا۔

مگر فوڈ فیکٹری تاحال اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکی ہے۔ اس سلسلے میں انہیں متعدد رجسٹرڈ لیٹر لکھے، جن کا جواب نہیں دیا گیا۔ پھر میرے دوست نے بذریعہ ٹیلکس ان سے رابطہ قائم کیا تو انہوں نے رسی دن انکواری کرکے جواب دینے کا وعدہ کیا مگر جواب نہیں دیا گیا۔ اس کے بعد بھی متعدد بار ٹیلکس سے رابطہ قائم کیا لیکن ہر مرتبہ اگلے دن جواب دینے کا وعدہ کرنے کے باوجود بھی جواب نہیں دیا گیا۔ ان کا لاہور اور سعودیہ میں الریاض کا آفس بھی کوئی تعاون نہیں کر رہا . . .

مذکورہ فوڈ فیکٹری کی قیمت ۱۰۵/- امریکی ڈالر ہے، جس کے واپس ملنے کی کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔ اور اپریل ۸۳ء

پھر اس دوران خط و کتابت اور ٹیلکس کے ذریعے میں میرے دوست کے تقریباً ۵۰۰ سو ریال خرچ ہو چکے ہیں۔ آرڈر کا نمبر جو انٹرنیشنل ایسوسی ایشن نے آلاٹ کیا . . . وہ ۸۲/۵۸۸۶/H ہے جو کہ محمد حسین کے نام سے بک ہے

میں حکومت پاکستان کے ارباب اختیار سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس کمپنی کے لاہور آفس کے خلاف مناسب کارروائی کرکے میرے دوست کا سامان دلوائیں۔
(رستم اقبال صاحب ۶۳۶۳ الریاض سعودی عرب)

حیا کا تقاضہ

مجھے بیرون ملک رہنے والے اپنے ہم وطن بعض بھائیوں سے شکوہ ہے، جو میں جواب عرض کے اس کالم کی وساطت سے کر رہا ہوں :

یہ واقعہ ۱۸ نومبر ۱۹۸۲ء کا ہے میں تھوڑی بہت ضروریات کی چیزیں خریدنے کی غرض سے بازار میں گیا . . . جدہ میں اس بازار کا نام باب مکہ ہے . . یہاں پر پاکستانی دکانیں ہیں۔ اس لیے ہر ان پڑھ پاکستانی کو بھی یہاں سے اس کا ہر قسم کا ضرورت کا سامان آسانی فراہم ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں بھی اس بازار کی طرف ہی نکل گیا . . . .

جب میں ایک دکان کے قریب اپنی مطلوبہ اشیاء خریدنے کی غرض سے گیا، تو ایک پاکستانی جوڑا پہلے سے دکان پر کھڑا شاپنگ میں مصروف تھا . . . . جب کہ دوسرے بہت سے گاہک دکان سے چند قدم پیچھے ہی صرف اس انتظار میں کھڑے تھے کہ یہ میم صاحب فارغ ہوں تو وہ بھی سودا سلف خرید سکیں . . . لیکن یہاں پر مجھے بڑے ہی افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے۔ کہ یہ ڈسکو جوڑا شاپنگ نہیں، بلکہ شاپنگ سے زیادہ اداکاری کرنے میں مصروف تھا . . . جبکہ دوسرے ملکوں کے بہت سے غیر مسلم لوگ وہاں پر جمع ہو کر اس آوارہ عورت کے حسن سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور میرا سارا جسم شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا کہ یہ غیر ملکی کیا سوچتے ہوں گے کہ
جواب عرض لاہور

شاید ہمارے پاکستان کا سارا معاشرہ ہی ایسا ہے۔۔۔ ان دونوں میاں بیوی کا میں عجیب قسم کا مذاق ہو رہا تھا۔ انہیں تیل مطلوب تھا۔۔۔ عورت تو کہہ رہی تھی کہ نسیم کھوپے کا تیل دینا، جبکہ شوہر صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ کھوپے کا نہیں مجھے چربی کا چاہیئے۔ یہ بے حیا اور غیر مہذب مذاق میں کوئی دو منٹ تک دیکھتا رہا اور پھر آخرکار تنگ آ کر میں نے دوسری دوکان کا رُخ کیا۔۔ میں ان ڈسکو صاحب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ بے حیائی کا تقاضہ ہے۔۔ جبکہ حیا تو عورت کا زیور ہے اور نصف ایمان بھی۔

(جاوید اقبال، پی او بکس ۱۵۴۲ جدہ سعودی عرب)

حقیقتِ حال

یہ واقعہ جنوری ۸۲ء کا ہے جو کہ کراچی ایئرپورٹ پر خود میرے ساتھ پیش آیا جس کی وجہ سے میرا سر ندامت سے جھک گیا۔۔۔

ہوا کچھ یوں کہ ہم کراچی سے کویت آ رہے تھے۔ جب تمام کام درست ہو جانے کے بعد ہمیں ہال میں جانے کے لیے کہا گیا اور بھی مسافر جا رہے تھے ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ ہو لیے۔ خیال رہے کہ اس وقت صبح کے ۵ بجے کا عمل تھا۔ میں نے اپنے بیوی بچوں کو ہال کے اندر بٹھا کر خود وہیں پر چہل قدمی شروع کر دی۔۔۔ کہ اچانک میں نہ چاہتے ہوئے بھی لیٹرین کی طرف چلا گیا۔ اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد واپس جا ہی رہا تھا کہ ایک انڈین مسافر اپنے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔۔۔ شومئ قسمت، میں نے اس سے پوچھ لیا کہ بھائی کیا بات ہے آپ پاکستان والوں کو بُرا بھلا کیوں کہہ رہے ہیں۔ ہم بھی پاکستانی ہیں، پھر ہم بھلا یہ کیونکر برداشت کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہی وطن میں کوئی ہمیں بُرا بھلا کہے۔

اس پر وہ انڈین مسافر یوں گویا ہوا۔ کہ بھائی یہ ایئرپورٹ والے جو سو روپیہ فی مسافر لیتے ہیں یہ ٹیکس کس کھاتے میں جاتا ہے۔۔۔ یہ ذرا لیٹرین دیکھیں، اس کے اندر آپ کا جانے کو دل چاہتا ہے"۔۔

میں نے ذرا سا آگے ہو کے دیکھا واقعی لیٹرین میں بے انتہا گندگی تھی۔۔۔ اوپر سے ستم یہ کہ لیٹرین میں پانی دستیاب نہیں تھا، اگر خوش قسمتی سے پانی تھا تو دوسری لیٹرین میں لوٹا ندارد تھا۔ بہرحال وہ انڈین مسافر کسی طرح راضی ہو کر ایک لیٹرین میں داخل ہوا، تو مزید ستم یہ ہو گیا کہ اس لیٹرین کے دروازے کا اندر کی طرف کا ہینڈل غائب تھا۔ جب وہ مسافر رفع حاجت سے فارغ ہو کر دروازے کو کھولنے لگا تو وہ کیونکر اور کیسے کھل جاتا کہ اندر دروازے کا ہینڈل ہی نہیں تھا۔۔۔ جب اس نے اندر سے دروازے پر زور زور سے دستک دے کر شور مچایا تو باہر سے چار پانچ آدمیوں نے دھکے مار مار کر دروازہ کھولا تو پھر کہیں وہ بے چارہ باہر نکلا۔ اور پاکستانی عملے کو خوب صلواتیں سنانے لگا۔۔ میں پاس کھڑا خاموشی سے سُن رہا تھا، اور میرا اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا۔۔۔ کیونکہ جب اپنوں ہی کا قصور ہو تو پھر بھلا دوسروں سے کس طرح بات کی جا سکتی ہے۔ اور بھی کافی تعداد میں پاکستانی وہاں پر موجود تھے، مگر سب کے سب چپ رہے اور وہ ہماری پی آئی اے کی انتظامیہ کو کوستا ہوا چلا گیا۔۔۔

اور پھر میں سنجیدگی کے ساتھ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا بین الاقوامی ایئرلائنز پی آئی اے کا یہی اصول ہے کہ ایسی جگہوں کو، جہاں پر دنیا بھر کے ملکوں کے لوگوں کا آنا جانا رہتا ہے، انہیں اس قدر گندہ رکھا جائے۔۔۔ یا اگر ان کے دروازوں کے ہینڈل خراب ہو جائیں تو انہیں ٹھیک کرنے کے بجائے سرے سے غائب ہی کر دیا جائے۔۔۔

وقت تو تارِ زمین نکل ہی جاتا ہے، لیکن بات یاد رہ جاتی ہے۔ وہی انڈین مسافر اب اپنے ملک میں جا کر ہمارے پاکستان کی خوب پبلسٹی کرے گا۔۔۔۔ اور ہماری بدنامی تمام ہو گی اور تمام پاکستانیوں کا سر ندامت سے جھکا ہی رہے گا۔ کاش کہ دوسرے ملکوں میں بھی ہمارے ملک کی عزت ہو، لیکن اپنے ملک میں تو نقصان ہی کا دور جاب عرض اللہ ہوں۔

جبریل ۸۳ء

دائرہ ہے، مسائل اجتماعی قاعدے کی بجائے انفرادی طور پر سوچتے ہیں۔ ۔ پی آئی اے کی انتظامیہ کو ایسے مسائل کی طرف فوری اور خصوصی توجہ دینی چاہیئے تاکہ ان مسائل کی طرف سے ان جذبات کو ٹھیس نہ لگنے دی جائے ... اگر دوسرے ملکوں میں پاکستان کا نام اور وقار بلند ہوگا تو اس میں اپنی ہی عزت ہے کسی دوسرے کی نہیں ...

(چوہدری شہزادہ سلیم احمد — الرباط ۲۲۷۵ صفحات الکویت)

قابلِ توجہ مسئلہ

ہم تینوں دوست ڈرائیور ہیں اور کوئی عرصہ تین سال سے الریاض میں مقیم ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے ہر دوسرے تیسرے روز ہمیں الریاض کے ہوائی اڈے پر جانے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ جب ہم ایئرپورٹ پر پہنچتے ہیں اور اسلام آباد یا کراچی سے پی آئی اے کی فلائٹ آتی ہے تو ہم خوشی سے پھولے نہیں سماتے کہ ہمارے ۔ ۔ پاکستانی بھائی ریاض آ رہے ہیں ۔ مگر اس خوشی کے ساتھ ساتھ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری پاکستانی خواتین بھی آتی ہیں اور سعودی خواتین کے لباس کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ہماری نظر پاکستانی خواتین پر پڑتی ہے تو ہمارے چہروں کی رنگت منتقل ہو جاتی ہے، رنگ زرد پڑ جاتے ہیں، خون کھولنے لگ جاتا ہے مگر مجبوری اور بے بسی میں آنکھیں پھر برسنے لگ جاتی ہیں کہ ساون بھادوں کا برستا ہوگا۔ اپنی ماؤں اور بہنوں کے لباس دیکھ کر ہمارے سر شرم کے مارے جھک جاتے ہیں ...

ہمیں اپنے ملک کا دفاع کرنے والے اپنے پاکستانی بھائیوں پر بڑا فخر ہے کہ ساری دنیا پر ان کی بہادری کا سکہ جما ہوا ہے مگر جب ہم اپنی بہنوں اور بیٹیوں کا لباس دیکھتے ہیں تو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یا خدا یہ کیا معاملہ ہے کہ ایک طرف تو ان کی یہ بہادری اور دلیری ہے اور دوسری طرف یہ مذہب اسلام سے یہ بیگانگی کیوں؟ ہمارے مذہب کے خلاف تعلق رکھنے والے دوسرے ملکوں کے اکثر جوانوں کی زبان سے یہ سنتے ہیں کہ پاکستان کا نام رکھنے والوں نے کیا سوچ کر یہ نام رکھا ہے۔ لفظ پاک کا مطلب ہے پاک مگر ان کے لباس ان کے اس لفظ کی منفی کرتے ہیں۔ ان کی خواتین کے لباس تو ہمارے یورپین ملکوں کے کلبوں میں کام کرنے والی عورتوں کے لباس سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔

ہماری وہ مائیں جو کہ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں ہوتیں، وہ عموماً حج کے نام پر سعودیہ آتی ہیں۔ مگر یہاں پر آ کر ان کی جو حالت ہوتی ہے اور وہ جو طریقۂ کار اختیار کرتی ہیں وہ ہم بیان کرنے سے قاصر ہیں کہ وہ نہایت نامناسب ہوتا ہے۔ ہماری حکومت پاکستان کو اس بات کا سختی سے نوٹس لینا چاہیئے کہ اوّل تو پاکستانی خواتین کو بیرونِ ملک آنے کی اجازت ہی نہ دی جائے اور اگر ان کا آنا بہت ہی ضروری ہو تو پھر انہیں خاص اسلامی لباس میں باہر آنے کا پابند کیا جائے۔

پچھلے دنوں ہمیں پھر الریاض ایئرپورٹ پر جانے کا اتفاق ہوا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو انتظارگاہ کی لائن میں کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہماری ایک نوجوان بہن آئی جو کہ بے پردہ اور مختصر سا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کی مدد کرتے ہوئے اس کے ساتھ ایک سعودی نوجوان پولیس والا بھی تھا وہ کوئی پانچ منٹ تک وہاں کھڑی رہی مگر اس کو اپنا وارث کہیں نظر نہ آیا اور وہ مایوس ہو کر واپس انتظارگاہ میں چلی گئی۔ اسی طرح اس نے باہر کے تین چار چکر لگائے مگر اس کو اپنا رفیق نہ ملا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے پتہ چل رہا تھا کہ ہماری وہ بہن بہت ہی زیادہ پریشان تھی۔ اب آگے اللہ ہی جانے کہ اس کا اصل مسئلہ کیا تھا۔

انتظارگاہ میں اور بھی بہت سے غیر ملکی اور غیر مذہب کے نوجوان کھڑے ہوئے تھے، جنہوں نے ہماری اس پاکستانی بہن کے متعلق بہت ہی غلط قسم کی باتیں کیں ... جو ہماری برداشت سے باہر تھیں۔ آخر کار ہمیں ان سے جھگڑا کرنا پڑا اور لڑائی کے نتیجے میں ہم تینوں دوستوں کو بہت ہی مشکل کا سامنا کرنا پڑا ... ہم ایک مرتبہ پھر حکومت پاکستان سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ بیرونِ ملک آنے والی خواتین کے

لباس پر اسلامی لباس کی شرط لازمی قرار دی جائے۔

؎ کسی کے ایک آنسو سے ہزاروں دل تڑپتے ہیں
کسی کا عمر بھر رونا یونہی بے کار جاتا ہے

(سید ریاض حسین، راجہ محمد دین، محمد راسب خان
پی او بکس نمبر ۲۷۰۴، الریاض السعودیہ)

بچو، بچو، بچو!

آپ نے یہ کالم شروع کر کے ہم پردیسیوں پر ایک احسانِ عظیم کر رکھا ہے۔ میں بھی پہلی مرتبہ اس کالم میں شرکت کر رہا ہوں۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ امید ہے میرے اس مراسلے کو جواب عرض کی کسی قریب ترین اشاعت میں شامل کر کے بہت سے گھروں کو آئندہ تباہی سے بچا لیں گے...

قارئین! آپ یقین جانیئے کہ یہاں پر بیٹھے ایسے افسوسناک واقعات دیکھنے میں آتے ہیں کہ اگر وہ لکھنے بیٹھوں تو ہماری اپنی ہی گردنیں شرم سے جھک جائیں گی اور کوئی بھی ان پر یقین نہیں کرے گا...

میرے ساتھ ایک مرتبہ ایک صاحب نے دوستی گانٹھی اور چند دنوں میں ہی میرے ساتھ اس قدر بے تکلف ہو گئے کہ کچھ نہ پوچھیں۔ ایک دن وہ مجھ سے فرمانے لگے کہ تم مجھے پانچ سو ریال ماہانہ دے دیا کرو اور جب بھی موڈ ہو میرے گھر آ جایا کرو۔ میں اس کی بات کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے بہت حیران ہوا اور چپ ہو رہا... پھر ان کی اس بات کی تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ انہوں نے میرے علاوہ مزید دس آدمیوں سے اسی طرح کا معاہدہ کر رکھا ہے اور دوسرے تمام آدمی بھی میری طرح غیر شادی شدہ ہیں...

ہم جب بھی ان کے گھر جاتے تو وہ صاحب ہم سے اس طرح ملتے اور دوسروں کو اس طرح ظاہر کرتے کہ جیسے کوئی عزیز رشتہ دار ملنے آتے ہوئے ہوں... مزید چھان بین کرنے پر انکشاف ہوا کہ انہوں نے اسی طرح اپنی آمدنی لاکھوں کی ظاہر کر کے ایک فیشن ایبل عورت سے شادی کی ہوئی ہے۔ اب چونکہ ان کا گزارہ نہیں ہوتا اس لیے انہوں نے اپنی نہایت ہی حسین اور خوب صورت بیوی کو اس دھندے پر لگا دیا ہے۔

بہرحال دیر آید درست آید کے مترادف پہلے میں چونکہ غیر شادی شدہ تھا اور یہ بھول کرتا رہا، مگر آج کل میں اپنی بیوی کے ہمراہ عزت کی زندگی گزار رہا ہوں۔ امید ہے میرے اس تجربے سے دوسرے میرے بھائی سبق حاصل کریں گے۔ یہاں پر اتنی سی گزارش اور بھی ہے کہ میرا پتہ شائع نہ کیا جا سکے کہ اس سے میری ازدواجی زندگی پر اثر پڑ سکتا ہے۔

(بلال ..... جدہ ..... سعودی عرب)

ہوشیار باش

میں کافی عرصے سے جواب عرض کا قاری ہوں۔ آج ایک نہایت ہی اہم بات تمام صنفِ نازک کے لیے واضح کر دینا اپنا اخلاقی فرض خیال کرتا ہوں۔

"یہاں پہ آرزو سیری" کے ذریعے عرب ممالک میں مقیم کئی حضرات جن کی تنخواہ صرف ایک ہزار یا آٹھ سو ریال ہوتی ہے، وہ اس کو فوراً ہی تین سے ضرب دے کر اشتہار دے دیتے ہیں کہ میری تنخواہ ۳۰۰۰/- ہزار روپے ہے، مجھے اس قسم کی دوشیزہ کی تلاش ہے... وغیرہ وغیرہ...

میں یہ ایک بات آپ سب بہنوں کو صاف صاف بتا دوں کہ جس کی بھی تنخواہ ۳۰۰۰/- ہزار سے لے کر دس ہزار روپے تک ہو وہ کسی بھی صورت میں اپنے بیوی بچوں کو سعودی عرب میں نہیں بلا سکتا، ہاں البتہ جس کی تنخواہ کم از کم ساڑھے چار ہزار ریال یا اس سے زیادہ ہو، نیز کمپنی کی طرف سے مفت رہائش کا سرٹیفکیٹ حاصل کر سکے اس کو اپنے بیوی بچے یہاں بلانے کی قانونی اجازت ہے۔

اب آپ خود ذرا یہ سوچیں، جو حضرات یہ کہتے ہیں

کہ میری تنخواہ چار ہزار روپے ہے یعنی تقریباً پندرہ سو ریال بنتی ہے۔ بیوی بچوں کے لیے اوّل تو قانونی طور پر اجازت نہیں ملتی۔ اگر کسی طرح سے یہاں بلا بھی لیا جائے (یہ صورت زیارتی ویزے کی ہے، جس کی مدت تین ماہ کی ہوتی ہے) تو دو کمروں پر مشتمل نہایت ہی بوسیدہ مکان کا صرف کرایہ ہی ایک ہزار سے پندرہ سو ریال ماہانہ دینا ہوتا ہے نیز تمام لین دین روپوں میں نہیں بلکہ ریالوں میں ہوتا ہے اس کے لیے چند ایک مثالیں پیش کرتا ہوں:

پیپسی کولا، ڈیڑھ ریال، مرغی کی تو سی پندرہ ریال فی کیلو۔ گوشت چھوٹا بیس تا پچیس ریال فی کیلو، بڑا گوشت ۱۸ تا ۲۰ ریال فی کیلو۔ یہاں پر یہ عرض کر دوں کہ کولڈ اسٹوریج سے گوشت آٹھ ریال فی کیلو ملتا ہے، مگر وہ کھانے کے قابل نہیں بلکہ ہوٹلوں میں استعمال ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ تمام ضروریات زندگی اسی طرح میسر ہوتی ہیں، ماسوائے چند ایک اشیاء کے جن کو یہاں کی حکومت اعانت کرتی ہے۔ لہٰذا ردیے والے طالب رشتہ حضرات سے لڑکی والے یا بنات خود لڑکی بھی ہوشیار رہیں کہیں بعد میں کف افسوس نہ ملنا پڑے۔

(بلال .... جدہ ... سعودی عرب)

پاکستانی مصنوعات

میں جواب عرض کے اس کالم کی وساطت سے حکومت پاکستان کی توجہ پاکستانی مصنوعات کی نمائش کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ جو ان دنوں جدہ میں لگی ہوئی ہے۔ مصنوعات سے متعارف کرانے کی ذمہ داری سفارت خانہ کی ہوتی ہے کہ وہ وقت کی پابندی اور اس کے لیے مناسب جگہ کا انتظام کریں۔ جہاں تک جگہ کا تعلق ہے انہیں کسی قسم کی دقت نہیں تھی، کیونکہ سعودی حکومت نے نمائش کے لیے جگہ مقرر کر رکھی ہے... نہ جانے ہمارے سفارت خانہ والوں کو نمائش کے لیے مقرر کردہ جگہ کیوں پسند نہیں آئی۔ لہٰذا انتظامیہ نااہل ثابت ہوئی ہے۔ جگہ کی تنگی کی وجہ سے نہ تو سامان ہی مکمل آ سکا اور نہ ہی آتے ہوئے سامان کا ٹھیک طرح سے انتظام ہو سکا۔ اور نمائش دیکھنے کے لیے آنے والے لوگوں کے لیے الگ مسئلے پیدا ہو گئے۔ خاص طور پر خواتین صرف رش کی وجہ سے یہ نمائش دیکھنے کے لیے گھبراتی رہیں۔ کیونکہ خواہ کتنی احتیاط بھی کیوں نہ کی جاتے رش میں ٹکر سے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... رش کی وجہ سے نہ تو بات ہی ہو سکتی ہے اور نہ ہی خرید و فروخت...

دوسرے ہماری بہت سی کمپنیوں نے حصہ نہیں لیا جس کی وجہ سے انتظامیہ نے تاجروں کو جو وقت دیا تھا اس سے ایک ماہ بعد نمائش شروع کی۔ بہت سے تاجر اپنا سامان لے کر واپس چلے گئے۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ سامان کافی مدت پہلے پہنچ چکا تھا اب ایک ماہ بڑھ جانے سے اس کی حفاظت کے علاوہ بندرگاہ پر خراب ہونے کا بھی اندیشہ تھا اور پھر یہ کہ اپنے پروگرام سے زیادہ ایک ماہ تک رکنا بھی ناممکن تھا... لہٰذا تاجروں نے واپسی میں بہتری خیال کی۔

ہماری بعض مصنوعات اس قدر زیادہ اچھی ہیں کہ انہیں نمائش کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ کروڑوں روپے کا مال بیرونی ملکوں میں جاتا ہے ظاہر ہے ان کے رکنے سے تاجروں کو نقصان ہوتا۔ اور خرچہ الگ برداشت کرنا پڑتا۔ سامان واپس لے جانے سے ہماری بہت سی مصنوعات نمائش سے محروم رہ گئیں جس کی بڑی شدت سے کمی محسوس کی گئی۔ یہ ساری ذمہ داری ہماری انتظامیہ کی ہے۔ سفارت خانہ والوں کی لاپرواہی کی وجہ سے جو خسارہ حکومت کو ہوا اس کی تلافی ناممکن ہے۔ اس لیے حکومت پاکستان کو آئندہ سے ان چیزوں کی طرف پہلے سے توجہ دینی چاہیے۔

(افتخار الحق ندیم پاکستان ایمبسی اسکول، پوسٹ بکس نمبر ۶۳۴۲۷ جدہ۔ سعودی عرب)

اپریل ۸۳ء

یہ سراسر ناانصافی ہے!

میں پانچویں کلاس میں تھا اور چھوٹا بھائی تیسری جماعت

جواب عرض لاہور

میں تھا۔ جبکہ بڑی بہن شادی شدہ تھی۔ کہ ایسے میں ہمارے والد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہمارا کوئی بڑا بھائی نہ تھا جو ہمارے تعلیمی اخراجات برداشت کرتا۔ اور نہ ہی کوئی اور ذریعہ آمدن تھا۔ وہ بہت ہی پریشانی کا دور تھا۔ ہم محنت مزدوری کرنے کے بھی قابل نہ تھے۔ ایسے میں ہمارے چچا زاد بھائی محمد شریف جو کہ ہمارا بہنوئی بھی تھا۔۔۔ نے ہماری پرورش کی ذمہ داری لی۔ انہوں نے کہا کہ بھائی تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، میں آپ کو پڑھاؤں گا اور آپ کے سب اخراجات برداشت کروں گا۔۔۔ انہوں نے ہمیں کہیں بھی باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔

میں نے جب میٹرک پاس کیا تو سوچا کہ چونکہ گھر کے اخراجات زیادہ ہیں اس لیے میں بھی کوئی چھوٹی موٹی ملازمت کر لیتا ہوں۔ تاکہ چھوٹے بہن بھائیوں کی پرورش مزید بہتر طریقے سے ہو سکے۔۔۔

اس کے بعد میرے چھوٹے بھائی نے میٹرک کا امتحان سائنس کے ساتھ بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا تو اس کو ایئر فورس میں بھرتی ہونے کی خواہش پیدا ہوئی، کیونکہ ماشاء اللہ وہ بہت قابل اور ذہین بھی تھا۔ اس کا ایئر فورس میں بھرتی ہونے کا شوق جنون کی حد اختیار کر گیا۔ وہ اکثر کہتا کہ میں ایئر فورس میں پائلٹ کے لیے اپلائی کروں گا اور انشاء اللہ تعالیٰ کامیاب بھی ہو جاؤں گا اور اپنے ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

میٹرک کرنے کے بعد اس نے ایئر فورس سے متعلقہ کتابوں کا مطالعہ کرنا شروع کر دیا۔ اور ساتھ ہی اس نے ایئر فورس میں درخواست دے دی۔ ایک روز اس نے بتایا کہ راولپنڈی میں ایئر فورس کے متعلقہ بورڈ میں مجھے ٹیسٹ کے لیے بلایا ہے۔ اور میڈیکل بھی ہو گا۔ جس روز اس نے راولپنڈی جانا تھا میں بھی اس کے ساتھ گیا کیونکہ میں اسے اکیلے کو کہیں بھی نہیں جانے دیتا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو دوسرے دن اس کا ٹیسٹ اور میڈیکل ہوا اور خدا کے فضل سے وہ بڑے اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گیا۔ میں باہر بیٹھا بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔۔۔

جب اس نے آ کر اپنی کامیابی کی خوشخبری سنائی تو میرا خون سیروں خون بڑھ گیا۔ اس کے بعد ہم واپس اپنے گاؤں نالہ آزاد کشمیر چلے آئے۔۔۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد راولپنڈی بورڈ نے ہمیں اطلاع دی کہ شبیر احمد کو کوہاٹ میں فلاں تاریخ کو آئی ایس ایس بی کے لیے جانا ہے۔ اس پر ہمیں مزید خوشی ہوئی۔ اور میرے بھائی نے اپنے اس ٹیسٹ کے لیے بھی دن رات ایک کر کے تیاری شروع کر دی۔ مقررہ تاریخ پر کوہاٹ میں بھی میں اس کے ہمراہ گیا کہ مجھے اس کی کامیابی بہت ہی عزیز تھی۔ میں وہاں ہوٹل میں ٹھہر گیا، کیونکہ آئی ایس ایس بی میں بغیر امیدوار کے کوئی نہ ٹھہر سکتا تھا۔ تاہم میں روزانہ ہی اس کے پاس پتہ کرنے جاتا کہ اس کے پرچے کیسے ہو رہے ہیں۔ جب وہ اپنے امتحان کا آخری پرچہ دے کر آیا تو وہ بہت ہی خوش و خرم تھا۔ اس نے بتایا کہ بھائی میں یہاں پر بھی کامیاب ہو کر آئندہ کے لیے منتخب کر لیا گیا ہوں۔ اب مجھے کراچی میں فلاں تاریخ کو اپنے فائنل میڈیکل کے لیے جانا ہے۔ یعنی سی ایم بی کے لیے۔ ہم خوشی خوشی واپس آ گئے۔

جب وہ کراچی آخری میڈیکل کے لیے جانے لگا، تب بھی میں اس کے ہمراہ تھا۔ گاؤں کے تمام دوست اس سے بہت ہی خوش تھے اور کہہ رہے تھے کہ یار اب تو تم واقعی ایئر فورس کے پائلٹ بن جاؤ گے۔ کراچی جا کر مقررہ تاریخ سے دو دن پہلے اس کا میڈیکل ہوا۔ مگر اسے ریجیکٹ کر کے کہا گیا کہ تم ابھی واپس جاؤ اور ایک ہفتے کے بعد آ کر تمہارا دوبارہ میڈیکل ہو گا۔۔۔ ایک ہفتے کے بعد جب وہ دوبارہ گیا تو میڈیکل کے لحاظ سے وہ بالکل فٹ تھا۔ مگر بورڈ والوں نے میرے بھائی کی جگہ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز آفیسر کے ناکام لڑکے کو منتخب کر لیا، کیونکہ میرے بھائی کی کوئی سفارش نہیں تھی اس لیے وہ منتخب ہو کر بھی ناکام رہ گیا۔

جب وہ واپس گھر آیا تو اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور وہ بہت ہی افسردہ اور غمگین دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ساتھ سراسر ناانصافی کی گئی

معاب، مرجن لاہور۔

ہے۔ اس نے ہوائی اڈے میں اس کے ساتھی اسے تنگ کرنے لگے کہ رئیس تم پائیلٹ بن کر واپس آ گئے ہو۔ کون سا جہاز چلاتے ہو...

ہمیں بھی اس بات کا بہت دکھ ہوا اور سارے گھر والے بہت ہی پریشان ہوتے تھے۔ کراچی جب اد کوشش کے باوجود بھی ہمارے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ اس کے بعد وہ بڑے بڑے ڈاکٹروں اور سپیشلسٹ کے پاس گیا کہ مجھے دیکھو، مجھے چیک اپ کرو، مجھ میں میڈیکل کے لحاظ سے کیا نقص ہے۔ سب ڈاکٹروں نے متفقہ فیصلہ دیا کہ تم طبی لحاظ سے بالکل فٹ ہو۔ یہ سن کر وہ اور بھی غمگین ہو گیا ہے اور ذہنی طور پر بھی مفلوج ہو رہا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میں طبی لحاظ سے بھی بالکل تندرست ہوں میرے ساتھ اس قدر ناانصافی کیوں ہوئی ہے۔ لیکن اب بھی کہتا ہے کہ میں نوکری کروں گا تو صرف ایئر فورس کی کروں گا۔

میں اب سعودی عرب آ گیا ہوں۔ گھر سے آتے ہیں تو ان میں لکھا ہوتا ہے کہ وہ کسی سے بات تک نہیں کرتا۔ بس اپنے ہی خیالوں میں گم رہتا ہے۔ چڑچڑا اور سخت مزاج ہو گیا ہے۔ اس وقت وہ بی اے کا طالب علم ہے مگر اس کا ذہن تعلیم کی طرف بالکل نہیں جاتا، بلکہ ہم اسے زبردستی تعلیم دلا رہے ہیں...

میں متعلقہ محکمے کے اربابِ اختیار سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ ناانصافی کب تک غریبوں اور یتیموں کے ساتھ ہوتی رہے گی۔ خدارا اس کا سدِباب کریں۔

(ایم زبیر بیگ پی او بکس۔۳۸۳۰، الریاض۔ سعودی عرب)

پاکستانی اور پاکستان

آپ نے جواب عرض میں یہ کالم شروع کر کے ایک قابلِ تحسین اقدام کیا ہے۔ میں بھی اس میں حصہ لے رہا ہوں امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے۔

اپنے ملک کی قدر اس کو ہے جو پردیس میں ہو لیکن تب بھی بعض بے ضمیر لوگ ایسے بھی کام کرتے ہیں کہ جس سے ہمارے پیارے اسلامی ملک کا وقار خاک میں مل جاتا ہے۔ یہاں ابوظہبی میں ۳ فروری ۸۳ء کو شیخ حمدان بن محمد النہیان کے بیٹے کی شادی کے موقع پر ہر ملک سے ناچنے کے لیے طائفے لائے گئے تھے۔ مثلاً لبنان، مصر، انڈیا، پاکستان، کویت، بحرین اور شام۔ اس پروگرام میں ہر مکتبِ فکر کے لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا... ان میں غیر ملکی بھی تھے۔ اس کے علاوہ یہاں پر دنیا کے کونے کونے کے لوگ موجود ہیں، سب ہی لوگ آئے تھے۔ تو ناچنے کا پروگرام آیا تو سب ملکوں کا پروگرام بڑے تحمل سے ہوا۔ پاکستان سے بھی تین طائفے مدعو تھے۔ جب انہوں نے اپنا موسیقی کا پروگرام شروع ہوا تو، جو سلوک ان کے ساتھ کیا گیا وہ بیان کرنے کی قلم میں ہمت نہیں ہو رہی۔ اس میں پاکستانی بھی تھے۔ انڈے اور کچھ نہیں تو اپنی نسوار کی ڈبیاں، مالٹے اور سیب پھینکنے لگ گئے۔ اور ان کا سٹیج درہم برہم ہوا، اور سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔

میں یہ کہتا ہوں کہ ان طائفوں کو بھی کسی بے ضمیر پاکستانی نے ہی بھیجا ہو گا۔ عرب لوگوں کے نزدیک پاکستانی کی کیا وقعت ہے یہ صرف یہاں رہنے والے ہی جانتے ہیں۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ کچھ تو اپنے ملک کا بھی خیال کیا کرو...

(ہاشمی، پی او بکس ۳۰۲۳ دبئی یو اے ای)

ہائی کا درجہ دیا جائے

ہمارا گاؤں ضلع راولپنڈی تحصیل گوجر خان کا بہت ہی مشہور و معروف گاؤں ہے۔ یہاں کی آبادی تقریباً تیس ہزار افراد پر مشتمل ہے، جن میں سے ۲۵ فی صد افراد بیرونِ ملک ملازمتیں کر رہے ہیں، جو کہ اچھا خاصا زرِمبادلہ اپنے ملک میں ماہ بہ ماہ بھیج رہے ہیں جس سے حکومتِ پاکستان کو بے حد فائدہ دے رہا ہے... یوں تو صدرِ پاکستان جناب جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت نے ملک کے کونے کونے میں ہر چیز میں نمایاں اصلاحات کر کے بہت زیادہ سہولتیں مہیا کر رکھی ہیں مگر پاکستان

ہیں کچھ ایسے بھی علاقے ہیں، جو ابھی تک حکومت کی نظر سے اوجھل ہیں۔ جن میں ہمارا گاؤں مشہ کسوال بھی شامل ہے۔ ہمارا یہ گاؤں جی ٹی روڈ پر واقع ہے ... ہمارے دوازے سے اس گاؤں میں مڈل اسکول ہے۔ حکومت کے ارباب اختیار اگر اس طرف تھوڑی سی بھی توجہ دیں تو اس گاؤں کی اہمیت کے پیش نظر اس کے مڈل اسکول کو ہائی کا درجہ دے سکتے ہیں۔ جس سے سینکڑوں والدین اپنے بچوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر سکتے ہیں ...
جبکہ فی الوقت اکثر والدین اپنے بچوں کو صرف مڈل تک ہی تعلیم دلوا رہے ہیں، کیونکہ اگر کوئی بچہ مڈل سے آگے پڑھنا چاہے تو اسے گوجر خان جانا پڑتا ہے جو کہ بسوں اور ویگنوں کے آئے دن کے حادثات سے بچے خوف زدہ سے رہتے ہیں ...

چونکہ جواب عرض پاکستان کے گوشے گوشے میں پڑھا جاتا ہے اس لیے شاید میرا یہ مراسلہ خصوصاً راولپنڈی کے اعلیٰ حکام کی نظروں سے گزر جائے اور وہ ہمارے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور فرمانے کی زحمت کریں۔

علاوہ ازیں ہمارے گاؤں میں پچھلے سال ہی بجلی آئی ہے مگر بجلی کے پولوں پر خاردار تار نہ ہونے کی وجہ سے لوگ بہت پریشان ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بچے ان کھمبوں پر چڑھ جاتے ہیں جو کہ بہت ہی خطرناک ہے۔ لہٰذا حکومت سے اس بارے میں بھی پر زور گذارش ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے خطرناک مسائل کو بلا تاخیر حل فرمائے۔ امید ہے کہ متعلقہ حکام فوری توجہ فرمائیں گے۔

(راجہ ظفر اقبال عابد پی او بکس ۱۹ تبوک سعودی عربیہ)

کسی چکر میں نہ پھنس جائیں ... یہ سب کچھ فراڈ ہے ... دھوکہ ہے۔ نہ کوئی آدمی اس دور میں آپ کو حقیقی بھائی کا پیار دے سکتا ہے، اور نہ ہی دیتا ہے۔ صرف اور صرف اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے ان کے پاس اب یہی ایک ڈھونگ رہ گیا ہے، جو اس پاک اور مقدس رشتہ کو بدنام کر رہے ہیں اور ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

علاوہ ازیں جو بہنیں بیرونی ممالک کے ویزوں کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں، ان سے میں عرض کروں گا کہ وہ اپنی چادر اور چار دیواری میں رہ کر ہی باعزت زندگی گزار سکتی ہیں ... باہر آنے کا خیال اپنے دل سے نکال دیں ورنہ باہر آ کر آپ کو حالات دوا قعات جینے نہ دیں گے اور نہ ہی مرنے دیں گے ... یہ حضرات جو آپ کو ویزوں کی آفر کرتے ہیں یہ بھی سب فراڈ ہے۔ آپ کو یہاں ذلیل کرنے کا بہانہ ہے، اپنے کفیل کو خوش کرتے اور ویزے حاصل کرتے کے لیے آپ کی عزت نیلام کرتے ہیں ... ناجائز دھندے شروع کر دیتے ہیں۔ جو کہ ہم مسلمانوں کو زیب نہیں دیتے۔ اس لیے آپ بہنوں کو عزت، اپنے ملک اور اپنے گھر میں ہی عزت کی زندگی مل سکتی ہے۔ بھائی بنانے یا ویزے کے چکر سے گریز کریں باعزت زندگی گزاریں، ذلت کی زندگی سے بچیں۔ حال ہی میں روزنامہ جنگ کراچی میں نسرین صاحبہ کا واقعہ شاید آپ میں سے کئی بہنوں نے پڑھا ہوگا۔ اور جواب عرض فروری ۱۹۸۳ء کی پہلی ہی حقیقی بہن بھائی پر بھی نظر ڈال لیں، تو یہ سب کچھ آپ کو معلوم ہو جائے گا ...

(کیپٹن ۔ دوبئی ۔ یو۔ اے۔ ای)

یہ سب فراڈ ہے!

جواب عرض میں اکثر پڑھنے میں آتا ہے، کچھ حضرات لکھتے ہیں کہ انہیں بہن کی ضرورت ہے، وہ سے حقیقی بھائی کا پیار دیں گے، جبکہ کچھ بہنیں بیرون ملک سروس کرنے کی غرض سے ویزے کی خواہش مند نظر آتی ہیں ...
میں اپنی ایسی پیاری بہنوں کو بتانا چاہتا ہوں، تاکہ وہ اپریل ۱۹۸۳ء

اک نظر ادھر بھی!

میں عرصہ چار سال سے یہاں ایک کمپنی میں کام کر رہا ہوں۔ دو ماہ قبل اس کمپنی میں پاکستان سے کچھ آدمی دو سال کے معاہدے پر آئے۔ جن میں سے تقریباً سات آدمی میڈیکل کے لحاظ سے ان فٹ کر کے اور باقی چند آدمی اپنے کام میں مہارت نہ رکھنے کے سبب واپس بھیج

جواب عرض لاہور

دیئے گئے ... جبکہ آج سے دو تین سال قبل اس کمپنی میں نوے فیصد آدمی پاکستانی تھے۔ اور یہ کمپنی صرف پاکستانیوں کو ہی پسند کرتی تھی۔ اور موجودہ وقت میں یہ پوزیشن ہو گئی ہے کہ اس کمپنی میں پاکستانی برائے نام ہی رہ گئے ہیں۔ اب اس کمپنی نے اپنے سب ورکرز فلپائن اور مورشیئز سے منگوانے شروع کر دیئے ہیں۔ اور ہر ہفتے سینکڑوں کے حساب سے یہ لوگ اس کمپنی میں آ رہے ہیں۔

ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے کہ آخر یہ تبدیلیاں کیونکر رونما ہو رہی ہیں۔ دو ماہ قبل جب پاکستانیوں کا ایک گروپ اس کمپنی میں آیا تو اس کے ساتھ ہی فلپائن اور دوسرے ممالک کے بھی کچھ گروپ آئے ... ان سب آنے والے گروپوں میں شامل لوگوں کے نام کا انٹرویو سرے سے ہوا اور ساتھ ہی میڈیکل بھی ... فلپائن اور دوسرے ملک کے سینکڑوں کی تعداد میں سے ایک بھی آدمی نہ تو انٹرویو میں ناکام ہوا اور نہ کوئی میڈیکل اَن فٹ ہوا۔ اس کے برعکس تقریباً دس پاکستانی میڈیکل اور انٹرویو میں فیل کر کے واپس بھیج دیئے گئے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ جب دوسرے ملکوں کے لوگ آتے ہیں، تو ان کے ملک سے روانگی سے قبل اپنے پیشے کا مکمل انٹرویو اور میڈیکل کر کے انہیں بھیجا جاتا ہے، لیکن پاکستان میں اس امر کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور اس طرح سے پاکستان کی بدنامی کے ساتھ ساتھ ان بیچارے غریبوں کا بیس پچیس ہزار روپیہ بھی خاک میں مل جاتا ہے۔ جو ان کے خون کے مترادف ہے۔

آج سے چار سال قبل اس کمپنی کا پاکستان میں لیبر کنٹریکٹ کراچی کی ایک معروف ریکروٹنگ ایجنسی کشمیر انٹرنیشنل ایکسپریس کے ساتھ تھا، جو کہ ایک انتہائی دیانت دار ادارہ تھا۔ انٹرنیشنل کے بھیجے ہوئے آدمیوں میں سے کبھی کوئی آدمی اَن فٹ ہو کر واپس نہیں گیا۔ لیکن اب یہاں پاکستانی، لاہور کی کسی ریکروٹنگ ایجنسی کی معرفت آ رہے ہیں، جو ان بنیادی چیزوں کو بالکل ہی نظر انداز کر رہی ہے ...

اپریل ۸۳ء

ان واپس جانے والے پاکستانیوں میں گوجرخان سے سعادت حسین نام کے بھی ایک صاحب تھے۔ ان کو بھی کمپنی نے میڈیکل میں اَن فٹ قرار دے دیا تھا۔ ان کا ٹکٹ بھی او۔ کے ہونے میں دو تین دن رہتے تھے تو انہوں نے کمپنی کے حکام بالا سے گزارش کی کہ انہیں واپس جانے سے قبل صرف ایک دن کے لیے پاسپورٹ دیا جائے تاکہ وہ جاتے جاتے خانۂ کعبہ کی زیارت کر جائے۔ کیونکہ اقامہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ صاحب دو ماہ کے عرصہ میں عمرہ اور زیارت نہیں کر سکے تھے، لیکن کمپنی نے انہیں پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ اس کمپنی کو اب پاکستانیوں پر اعتبار بھی نہیں رہا ہے۔۔

یقین جانیے ایک روز میں نے ان صاحب کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ میں واپس تو جا رہا ہوں، لیکن دل میں یہ حسرت لیے جا رہا ہوں کہ سعودی عرب میں آنے کے باوجود میں خانۂ خدا کی زیارت نہ کر سکا ...

اس نے میری بہت منت سماجت کی کہ تم ہی کوئی ایسا حل نکالو کہ میں خانۂ خدا کی زیارت کر جاؤں ...

مجھے خود اس آدمی کی حالت پر بہت افسوس ہو رہا تھا لہٰذا میں نے اپنے ایک دوست شوکت حیات کی وساطت سے جو یہاں واٹر ٹینک ڈرائیور تھے اور مکہ شریف سے پانی لینے جاتے تھے۔ ان کے ہمراہ ان صاحب کو بھیجا اور اس طرح وہ خانۂ کعبہ کی زیارت کرنے کے بعد واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ اور ہزاروں دعائیں دے رہا تھا۔

اب تو سنا ہے کہ اس کمپنی نے پاکستان کے ویزے ہی بند کر دیئے ہیں۔ میں حکومتِ پاکستان سے پُر زور اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلہ کا سختی سے نوٹس لے تاکہ پاکستان کا وقار مجروح نہ ہو اور نہ ہی غریب لوگوں کا ہزاروں روپیہ ضائع ہو۔

(نعیم اختر عباسی فاسٹ کمپنی، پی او بکس، نمبر ۱۰۶ جدہ ... سعودی عرب)

بدبزرگ اور بدنامی!

جواب عرض لاہور

جواب عرض میرا من پسند رسالہ ہے۔ اس کا یہ کالم تو مجھے بہت پسند ہے۔ میں بھی ایک اجتماعی مسئلہ لے کر اس کالم میں شریک ہو رہا ہوں :

میں یہاں ٹھیکیداری کا کام کرتا ہوں۔ میرے پاس مصری، پاکستانی اور سوڈانی کئی قسم کے مزدور ہوتے ہیں۔ یہاں پاکستان سے آنے بزرگ قسم کے لوگ جنہوں نے لمبی لمبی سفید داڑھی رکھی ہوتی ہے، دیکھنے میں بڑے ہی معزز اور شریف نظر آتے ہیں . . . اچانک ہی کہیں سے نمودار ہوتے ہیں اور ایک ہی قسم کی داستان جو کہ پہلے سے من گھڑت ہوتی ہے، سناتے ہیں اور پھر آخر میں مدد مانگتے ہیں . . . دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ بھیک مانگتے ہیں۔ پہلے پہل تو بڑا دکھ ہوا اور دو ایک کی امداد بھی کی، لیکن جب وہ روزانہ بھیس بدلا بدل کر آنا شروع ہو گئے تو ان کی اصلیت کا پتہ چلا . . . وہی بزرگ جو دن کے وقت بھیک مانگتے ہیں، شام کو اتنی لمبی لمبی گاڑیوں میں بیٹھ کر نکلتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ سعودی اور مصری دوست ہمیں شرمندہ کرتے ہیں اور جب کہتے ہیں کہ تم سب پاکستانی ایک جیسے ہی ہو تو شرم سے ہمارے سر اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

میں ان بزرگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ خدا کے لیے اس کام سے باز آ جائیں، اپنا اور اپنے ملک کا نام بدنام نہ کریں اور ہمیں اپنے غیر ملکی دوستوں کی نظروں میں یوں ذلیل و خوار نہ کریں۔

(راجہ اے ڈی ندیم، جدہ۔ سعودی عرب)

آخر یہ ستم کیوں؟

یہ کالم ہم پردیس میں رہنے والوں کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہو رہا ہے کہ ہم اس کے ذریعے اپنی ہر مشکل ہر مسئلہ متعلقہ حکام تک پہنچا سکتے ہیں۔ آپ نے میرا پہلے بھی ایک مراسلہ شائع کیا جس کے لیے آپ کا ممنون ہوں اب اس میرے مراسلے کو بھی جواب عرض میں جگہ دے کر ایک بار پھر ممنون ہونے کا موقع دیں۔

اپریل ۸۳ء

ہمارے گاؤں درکالی سیداں تحصیل گوجر خان ضلع راولپنڈی میں بجلی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ہم نے صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کے نام بھی درخواست دی تھی جس کا انہوں نے جواب بھی دیا تھا کہ میری درخواست منظور کر لی گئی ہے اور ایک کاپی واپڈا والوں کو بھیج دی گئی ہے۔ اور میں واپڈا والوں کی طرف سے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ آخرکار دو ماہ گزرنے کے بعد واپڈا ہاؤس لاہور والوں نے مجھے جواب دیا کہ آپکی درخواست ہمیں مل گئی ہے مگر ہم اس پر عمل نہیں کر سکتے، کیونکہ آپ کا گاؤں لسٹ میں درج نہیں ہے۔

آخر ہم پر یہ ستم کیوں، اور کب تک رہے گا آج تک ہمارے گاؤں کو کوئی ترقی نہیں دی گئی، جو بھی حکومت آئی ہم پیچھے ہی رہے، اب جبکہ ہر گاؤں ترقی کی راہوں پر گامزن ہے، ہمارے گاؤں میں سڑک تک نہیں ہے۔ سڑک کا کچھ حصہ پکا ہوا تھا، لیکن نہ جانے کن وجوہات کی بنا پر آگے سے بند کر دیا گیا ہے اسکول بھی مڈل تک ہے۔ اگر درخواستیں دیں تو بس کہہ دیتے ہیں کہ منظور کر لیا ہے، بہت جلد عمل درآمد ہو گا۔ میں اپنی یہ گزارشات جواب عرض کے ذریعے جناب صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں دوبارہ عرض کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہمارے مسائل پر ہمدردانہ غور فرما کر اپنے احکام صادر فرمائیں گے۔

(سید انتظار حسین نقوی پی او بکس ۱۱۴۲۶ جدہ سعودی عرب)

قارئین! اس کالم "وطن سے دور" کے سلسلے میں ہمیں حاجی سردار عبدالسلام، الریاض۔ محمد عنایت اظہر، الریاض اور شیخ محمد ثاقب، مکہ المکرمہ کے مراسلات موصول ہو چکے ہیں۔ جنہیں آئندہ شمارے میں شائع کیا جائے گا۔ نیز اپنے مراسلات صاف ستھرے اور دوسروں پر بھیجا اچھالنے سے پاک ارسال کیا کریں۔ اور ان پر تاریخ ضرور لکھا کریں، تاکہ آپ کی باری جلدی آ سکے . . . . (ادارہ)

مفت مختصر اشتہارات

اس کالم میں شریک ہونے کی فیس صرف دو روپے کے غیر استعمال شدہ ڈاک ٹکٹ ہے جن کوپن کے ہمراہ ڈاک ٹکٹ نہیں ہوتے وہ شاملِ اشاعت نہیں کیے جاتے۔ نہ ہی اس کالم میں قلمی دوستی اور شادی کے رشتوں کے اشتہار قبول کیے جاتے ہیں۔ اپنے اشتہار کا مضمون صاف و واضح اور اپنے مکمل نام پتہ کے ساتھ ارسال فرمائیں۔ اگر آپ اپنا ایڈریس شائع نہیں کروانا چاہتے تو اس کی نشاندہی کر دیں۔ ورنہ ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔۔۔ (ادارہ)

مجھے حضرت خالد بن ولیدؓ کے حالات زندگی سے متعلق کتاب کا نام اور پتہ درکار ہے ارسال کرنے والے کا شکریہ ادا کروں گا۔
(محمد اعجاز، لاہور ٹیلرز، امین مارکیٹ گگو منڈی ضلع وہاڑی)

اگر کوئی بہن بھائی اس دکھی کو عمرہ کرا دے تو میں زندگی بھر اس کی ممنون رہوں گی۔
(شبانہ ملک ایس ایم ۔۔۔۔ پشاور)

سونے کے خوب صورت نئے نئے ڈیزائنوں میں زیورات بنوانے کے لیے ہمارے ہاں تشریف لائیں۔ بازار سے مناسب ارزاں قیمت پر۔۔۔
(ساجد بشیر زیدی، ایف وی جیولرز مین بازار بہاولپور)

ایس اے کشمیری کے نام:
ایک سال تک رہتے ہوئے بھی اظہارِ عقیدت نہ کر سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔ آپ سے قومیت کا میلاد اور انتہا کو عقیدت ہی میرا درثہ ہیں۔ سہ
شاید ہے ہمارا خون بھی نذرِ گلستاں ہے
یاد ہیں کی بند جب چمن میں سب آتے۔
(نتیاں، ہجرہ۔ آزاد کشمیر)

مس فرزانہ نسیم، ڈسٹرکٹ کے نام!
میں نے آپ کو دو تین خط لکھے مگر جواب ندارد۔ میں آپ کے خط کا شدت سے منتظر ہوں۔
(منور حسین، کیمپ مدینہ المنورہ۔ السعودیہ)

مسرت صاحبہ کے نام!
میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں، تاہم آپ کی اس دفعہ کی بات کا ممنون ہوں۔۔۔ آپ کو تا زندگی یاد رکھوں گا۔
(ایم آر مسرت، عطا ملے پور۔ ملتان)

اے خدا! کیا ساری دنیا کے دکھ میرے ہی نصیب میں لکھ دیتے ہیں۔ یہ دنیا والے مجھے نہ جینے دیتے ہیں اور نہ مرنے دیتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا جو تو مجھے ماں کی ممتا اور بہن کا پیار دے دیتا۔
(ایم ایچ یاسین تاشاہ۔ محمود آباد کراچی)

پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے میں داخلہ لینے کا طریقہ کار کے بارے میں مجھے تفصیلات درکار ہیں۔ ارسال کرنے والے کا شکریہ ادا کروں گا۔
(ایم چوہدری، پی او بکس ۵۲، نزد اردو بیسیا)

مختصر اشتہارات

مڈل ایسٹ میں مقیم بھائیوں کے لیے پراپرٹی خریدنے کیلئے سنہری موقعہ۔ جھنگ صدر محلہ سلطان والہ میں ۱۹۸۰ء میں تعمیر کردہ خوبصورت ڈیزائن منظور شدہ نقشے کے ساتھ دو منزلہ عمارت رقبہ ساڑھے سات مرلے، کمرے بڑا گیراج بڑا کھلا صحن ہر کمرے کے ساتھ فلش باتھ، تمام بیڈز، چپس، بجلی، فیس گلکشن، فون، جس پر فنانس لاگت پانچ لاکھ روپے آتی ہے اشد ضرورت کے تحت فوری فروخت لاگت شدہ قیمت پر نصف ڈھائی لاکھ نقد اور ڈھائی لاکھ قسطوں پر بھی سودا ہو سکتا ہے۔ قبضہ بعد معاہدہ ہی دیا جائے گا۔ رہائش فیکٹری، ہسپتال، سکول دفتر اور ہر کام کیلئے موزوں ترین جگہ ہے۔ فوری رابطہ کے لیے درج ذیل پتہ پر رجوع کریں۔

(چوہدری اقبال فری کریم پارک بلاک ۳/۹ گیا بادی روڈ۔ لاہور نمبر ۲)

جے کے، بانڈی سیڑاں کے نام!

تسکین دل کے واسطے وعدہ تو کیجئے

ہم جانتے ہیں کہ آپ سے آیا نہ جائے گا

(سید ریاض حسین، الریاض، سعودی عرب)

جانتے ہوئے بھی ایک انجان کے نام!

تم بخوبی جانتے ہو کہ میں تمہاری منزل نہیں ہوں۔ تمہیں کبھی نہ مل سکوں گی۔ پھر کیوں میرا انتظار ہے۔

(ایم۔ ڈی۔ اے۔ دوحہ قطر)

چمن صابر کے نام!

اگر میرا یہ اشتہار آپ کی نظروں سے گزرے تو فوری مجھ سے رابطہ کریں۔

(الحاج ایوب خان ص ب ۶۷ م ۱۶ ریاض سعودیہ العربیہ)

بے جی ج کے نام!

میں آپ سے صرف اتنا ہی کہوں گا کہ ہری پور ہزارہ کے نام کی لاج رکھنا۔

(سید ریاض حسین الریاض۔ سعودیہ)

محترمہ خالدہ حمید صاحبہ کے نام!

آپ کی کہانی "عنوان میرا مقدر" جواب عرض میں پڑھی بے حد پسند آئی۔ آئندہ بھی جواب عرض کی بزم کو ایسے ہی حقائق سے سجائیے۔

(لیاقت علی شاکر، پڈعیدن)

کراچی کی بہنوں کے نام!

مجھے آپ بہنوں سے بہت ہی عقیدت ہے کوئی بہن اگر خلوص دل سے مجھے بھائی جان کر خط لکھے گی تو اسے حقیقی بھائی کا پیار دوں گا۔

(ایم جمیل منظر، پی او بکس ۹۵۷۵ جدہ۔ سعودی عرب)

میں بہت ہی دکھی انسان ہوں۔ نہ جانے زمانے بھر کے دکھ میری ہی قسمت میں آ گئے ہیں۔ خدا کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے۔ بس بھائی بہن کے پیار کو تلاش ہے

(نذیر احمد نمبر ۳۷۷۲۸ سگنل پلٹون ہیڈ کوارٹر مڑیں ڈبلیو ایف آر صلالہ ظفار سلطنت آف عمان)

قارئین جواب عرض کے نام!

مجھے چھوٹے چھوٹے بچوں کے فوٹو جمع کرنے کا بے حد شوق ہے۔

(ایم صدیق منہاس پی او بکس ۶۰۱۵ ریاض السعودیہ)

مجھے ایک ایسے انسان کی تلاش ہے جو مجھے زندگی کی شاہراہ پر اچھے برے کی تمیز کرا سکے۔ میں زندگی بھر اس کا تابعدار رہوں گا۔

(ایم وی اشرف پی او بکس ۴۳۰۹ م، دوحہ قطر)

ایم صدیق کے نام!

آپ نے شاید ابھی تک ناراضگی نہیں چھوڑی۔ اب منصہ جاتے بھی دیں نا ں:

(شبانہ شوق۔ حائل۔ سعودیہ العربیہ)

مختصر اشتہارات

میں اپنے تمام قلمی بہن بھائیوں سے درخواست کرتی ہوں کہ میں تین ماہ کی چھٹی پر انڈیا جا رہی ہوں جن کے پاس میرا انڈیا کا پتہ ہے وہ مجھے اسی پتے پر خط لکھ سکتے ہیں۔
(صوفیہ اختر الریاض۔ سعودی عرب)

منیر احمد، مسقط کے نام:
میری کہانی شمع محبت پسند کرنے کا شکریہ۔ واضح رہے کہ یہ میرے ایک دوست کی آپ بیتی ہے۔ آپ کی خواہش کے مطابق اس کالم کے ذریعہ جواب دے رہا ہوں۔
(ایم سعید انور، ملک ٹیلرز۔ وسن پورہ۔ لاہور)

بھدیالہ کے لڑکے جو کرکٹ میں دلچسپی رکھتے ہوں وہ میرے ساتھ رابطہ قائم کریں۔
(امان اللہ جاوید، مسجد النور باب العوالی مدینہ المنورہ۔ سعودی عربیہ)

محترمہ رخسانہ صاحبہ کے نام!
آپ کو خط کے ساتھ ساتھ تصویر بھی ارسال کی تھی مگر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا کیا وجہ ہے۔ آخر میں بھی انسان ہوں۔
(فاروق احمد ساہی میت باتار پنڈی گھیب۔)

شاکرہ خانم متوجہ ہوں!
آپ کا ایڈریس مجھ سے کہیں گم ہو گیا ہے لہٰذا اپنے پتہ سے فوراً نوازیں۔ نوازش ہو گی۔
(محمد اسحاق، ص ب ۹۱۶، الدمام سعودی عرب)

عالمہ صاحبہ کے نام!
آپ جاتے ہوئے مل کر نہیں گئیں، جبکہ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ میں سخت پریشان ہوں۔
(محمد یونس ناز، پیانا نو سیالکوٹ روڈ۔ گکھڑ منڈی)

کلثوم صنم، ٹوبہ کے نام!
دسمبر کے شمارہ میں آپ کا شعر پڑھا جس نے بے حد متاثر کیا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا ہے۔
(ایم ایس ٹیلرز، شاہی بازار۔ بہاولپور)

کمرشل کالج راولپنڈی کے ایک طالب علم کے نام:
سہ دعا نہیں تو کوئی بددعا ہی لکھ دینا
قبول ہے کہ جو خط کے جواب میں آ سکے:
(سید رشید حسن نقوی منٹ اسٹریٹ نمبر ۶۹ ڈی/۹ زرعی کالج رحیم یار خان)

بیرون ملک سروس کی جستجو!
کوئی بہن بھائی مجھے بیرون ملک نوکری دلوا دے میں ان کی پائی پائی ادا کر دوں گا۔
(محمد عارف معرفت جواب عرض نسبت روڈ۔ لاہور)

مجھے جواب عرض ستمبر ۱۹۸۱ء اور فروری ۱۹۸۲ء کے دونوں شمارے درکار ہیں۔ جس بہن بھائی کے پاس ہوں وہ قیمتاً ارسال فرما کر شکریہ کا موقعہ دے۔
(پرویز اختر جاوید چھٹہ، کمرہ نمبر ۵۔ شمس بلڈنگ شاہ جہان روڈ۔ لاہور)

مس فرزانہ صاحبہ کے نام!
آپ کے تینوں خط مل گئے ہیں۔ میں غریب لڑکا ہوں اس لیے آپ سے براہ راست رابطہ نہیں کر سکتا۔ آپ چونکہ جواب عرض پڑھتی ہیں اس لیے مجھے بھول نہ جانا۔
(رانا نثار احمد، پی بلاک۔ بورے والا)

ہے کوئی دل والا جو یہاں پر میرے سنگ سنگ رو سکے اور اسے دنیا والوں کی باتوں کی بھی کوئی پرواہ نہ ہو۔
(ایم ایم نجیب، پی او بکس ۵۱۰۲۳ شارجہ یو اے ای)

مختصر اشتہارات

قارئین کے نام !

چند ماہ پیشتر کوثر پروین نے میری معرفت جواب عرض میں امداد کے لیے اشتہار دیا تھا۔ اب وہ پچھلے ماہ سے کسی اور جگہ منتقل ہو گئی ہے لہذا قاری بہن بھائی اب میری معرفت منی آرڈر ارسال نہ کریں میں ذمہ دار نہ ہوں گا۔

(ایم ایوب شاہ - غازی آباد - لاہور)

ہمارے ہاں جذبۂ خدمتِ خلق کے تحت نادار مریضوں کا فری علاج کیا جاتا ہے۔ نیز خاندانی منصوبہ بندی کے لیے قابل اور تربیت یافتہ لیڈی ہیلتھ ورکر کا انتظام بھی ہے جواب طلب امور کے لیے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

(چوہدری ہسپتال فری کریم پارک بلاک ۳/۲ کچا راوی روڈ لاہور نمبر۲)

میرے پاس آٹھ ہزار فلمی اداکاروں کے رنگین فوٹو، ایڈریس اور فون نمبر موجود ہیں۔ خواہش مند حضرات رابطہ کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔

(ایم اے عباس شاہین پی او بکس ۳۵۵۷، ابوظہبی یو اے ای)

نسیم اختر، ایبٹ آباد کے نام !

ایک عرصہ گزرنے کے باوجود بھی آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ آخر کیا وجہ ہے !

(خطاب گل، پی او بکس نمبر ۷، ابہا سعودی عرب)

کوثر فاروق کے نام :

میں اور زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ کیا کروں ؟ کہاں جاؤں، کم از کم خط ہی لکھ دیں۔

(عبدالفاروق وارڈ نمبر۲ - گوجر خان)

حقیقی بہن کی آرزو !

میری عمر ۲۲ سال ہے، میں بہت دکھی انسان ہوں۔ مجھے ایک حقیقی بہن کی آرزو ہے۔

(ایم شاہد معرفت شمع آرٹس محبوب سینما روڈ۔ اوکاڑہ)

صرف خانیوال کے رہائشیوں کے نام !

آپ بہن بھائی مجھے خط لکھیں، مجھے آپ لوگوں سے چند ضروری معلومات درکار ہیں۔

(اخوندزادہ رضا محمد پی او بکس ۲۳۷۷، ظہران السعودیہ)

عطاء اللہ ناز، گلگت کے نام !

عرصۂ دراز کے بعد بھی آپ کا کوئی نامہ موصول نہیں ہوا۔ کیا کوئی خاص ناراضگی ہے جواب دیں۔

(بشیر احمد شاہد، میٹرولوجیکل اسٹیشن شجاع آباد)

پاک فوج کے بہادر اور جیالے نوجوانوں کو ہماری جانب سے ہزاروں سلام !

(ایم انور ندیم، پی او بکس ۱۷۶، القیم سعودی عرب)

جوابِ عرض کی ہر کہانی بلاشبہ حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔ اور وہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔

(بچپن اللہ صفوتی۔ مجرمین - سوات)

ش - ح - پ کے نام !

آپ کا تحریر کردہ نوازش نامہ ملا۔ مجھ پر اعتماد کرنے کا شکریہ۔ تاہم آپ ہمت نہ ہاریں

(محمد نواز، پی او بکس ۱۷۳۵، الاحساء سعودیہ)

مجھے ایسے بہن بھائیوں کی بڑی چاہ ہے جو اپنی زندگی میں کسی کے دستِ نگر بننا گوارہ نہیں کرتے۔ اور ہر مصیبت میں ثابت قدم رہتے ہیں۔

(انیس احمد، پی او بکس ۴۶۳۴ جدہ سعودی عرب)

میرپور اور مظفر آباد والوں کے نام !

آپ بہن بھائی میرے ساتھ رابطہ کریں، مجھے آپ لوگوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

(خالد محمود، پی او بکس ۳۵۵۸، دوحہ قطر)

مختصر اشتہارات

مجھے کراچی، لاہور، راولپنڈی اور مظفر آباد
شہروں کے کوڈ ٹیلی فون نمبر درکار ہیں۔ اس کے ساتھ
ہی آزاد کشمیر کے خورشید خان محمد سے رابطہ کریں۔
(راجہ ایم شاہد، ص ب ۲۷۰۶۰، الریاض السعودیہ)

مونا جی کے نام :
آپ کا اشتہار پڑھا۔ آپ جمعرات کے روز دوپہر
دو بجے تک ملاقات کر سکتی ہیں۔
(ایم شاہد قریشی - جدہ - سعودی عرب)

میں عرصہ چار سال سے یہاں پر تنہائی کی زندگی
گزار رہا ہوں۔ کوئی مجھے اس کا حل بتا دے کہ میں اب
اس سے بور ہو گیا ہوں۔
(تبسم شبیر بھٹی، ص ب ۸۲۸۲ جدہ سعودی عرب)

ف - ن کے نام !
- تو میرا کچھ نہیں لگتا مگر جانِ حیات
جانے کیوں تیرے لیے دل کو دھڑکتا دیکھوں !
(ساجد گل اعوان، پی او بکس ۱۳۷۶، ابوظہبی)

پیارے چاند کے نام !
بہت عرصہ سے تمہارے جواب کا منتظر ہوں، تمہاری
خاموشی میری جان لے لے گی۔ خدارا ضرور بتائیں۔
(عنقار الحق ندیم، جدہ - سعودی عرب)

سیدہ نورین کے نام !
آسماں سے کیا شکایت جیسی بہترین کہانی لکھنے
پر میری جانب سے مبارک باد قبول ہو۔
(اے کے مقدم، ابوظہبی یو اے ای)

میرے پاس ہر فلمی اداکار کا پتہ اور ٹیلی فون موجود ہے۔
(عبدالمجید، پی او بکس ۳۹۲۳، جدہ سعودی عرب)

روبینہ رشید، ساہیوال کے نام۔
آپ کا خط ملا اور میں نے جواب بھی لکھ دیا تھا۔
مگر پھر آپ کا کوئی خط نہیں آیا۔ آخر کیوں ؟
(ط - ح، مدینۃ المنورہ - سعودی عرب)

مجھے ایک ایسی پُرخلوص ہستی کی آرزو ہے جو
میرے دکھوں اور محرومیوں کا ازالہ کر سکے۔۔۔ میں
ساری عمر احسان مند رہوں گا۔
(جاوید اقبال، پی او بکس نمبر ۱۱۲۵ جدہ - سعودی عرب)

شہزادی حمیدہ پروین موچھ کے نام !
اگر آپ کو واقعی کسی پُرخلوص بھائی کی تلاش ہے
تو مجھ سے فوراً رابطہ کریں۔
(ایاز خان سواتی ص ب ۶۰۱۵، الریاض السعودیہ)

مس شمع نسرین صاحبہ کے نام :
اللہ تعالےٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی والدہ صاحبہ
کی صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔
(ایم بشیر نیازی، پی او بکس ۱۰۲۴۲، شارجہ یو اے ای)

ب سے شروع ہونے والے نام کی لڑکیو !
آپ کو کسی کا دل توڑ کر کیا ملتا ہے۔ ذرا بتائیں
تو یا پھر خدا کے انصاف کا انتظار کریں۔
(ملک خالد محمود اعوان - ابوظہبی)

مجھے ہر طرح کی تصویریں جمع کرنے کا بڑا شوق ہے۔
اچھی تصویر پر انعام بھی دوں گا۔
(سفیر رحمان، پی او بکس نمبر ۱۵ سامطہ السعودیہ)

کراچی کی بہن مس رقیہ کے نام ! بھیا کے فوت ہونے کا
دلی صدمہ ہوا۔ خدا آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)
(محمد اکرم ملک - تبوک - سعودی عرب)

مختصر اشتہارات

[illegible] ین تاثر کے نام!
[illegible] میں آپ کا شعر پڑھا جو بے حد پسند آیا [illegible] سے ہی شعروں سے آئندہ بھی نوازیں۔
([illegible] پی او بکس ۲۷۵ جدہ سعودی عرب)

شمائلہ بیگم، حیدرآباد کے نام!
آپ کے اشتہار برائے انسانی ہمدردی کے تحت آپ کو دو خط لکھے مگر ابھی تک جواب سے محروم ہوں۔
(عبدالحمید [illegible] ص۔ ب ۱۷۶ مکہ المکرمہ سعودی عرب)

لکھی عادل صاحب متوجہ ہوں

آپ کے نام پانچ سو روپے کا انعامی ڈرافٹ ادارہ کی معرفت آیا ہوا ہے۔ آپ فوری طور پر اپنے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی اور مکمل پتے سے ادارہ کو آگاہ کریں یا پھر بذاتِ خود آفس ٹائم میں آکر ادارہ سے وصول کر سکتے ہیں ... (ادارہ)

مجھے ایک بہن کی ضرورت ہے اگر کوئی بہن بیوہ ہو تو میں اس کی ساری عمر بھائی بن کر خدمت کروں گا۔ مگر خدارا دھوکے باز نہ ہو۔
(حاجی محمد شفیع، پی او بکس ۹۲۱۵ جدہ سعودی عرب)

شاہدہ ریاض کے شعر کا جواب حاضر ہے:
مزہ برسات کا لینا ہے تو ان آنکھوں میں آ بیٹھ
وہ برسوں میں کبھی برسے یہ برسوں سے برستی ہیں!
(ایم افضل پی او بکس ۱۶۰۹۱، الریاض سعودی عرب)

شہناز اختر کے نام!
پھولوں سے زیادہ نرم اور خوبصورت باتیں [illegible] اور [illegible] آپ کے لیے ہیں۔
([illegible] خان سواتی، پی او بکس ۶۰۱۵ الریاض)

روبینہ ایاز کے نام!
انسانیت بڑی اچھی چیز ہے۔ مگر کسی کا دل توڑنا نہیں چاہیے۔ ہو سکے تو میرے خط کا جواب دینا۔
(ایم سلیمان پی او بکس ۸۷۳۵ ریاض۔ السعودیہ)

صائمہ کنول متوجہ ہوں!
آپ کے کہنے کے مطابق میں نے آپ کو خالد سعید بٹ [illegible] کی معرفت خط کا جواب فوری دے دیا اور دوبارہ بھی، مگر ابھی تک جواب سے محروم ہوں۔
(غازی الرحمن خٹک ایبٹ آباد ہزارہ)

قاری محمد یحییٰ [illegible] کے نام!
مسجد کا کچھ حصہ شہید ہو جانے کے سبب اس کی دوبارہ تعمیر کا کام جاری ہے۔ اس مسجد کا نام تجویز کریں۔ نیز اس کی تعمیر میں چندہ دینے والے معرفت اسٹیشن ماسٹر نازک آباد کے نام ارسال فرمائیں۔
(ایم رمضان مسافر ریلوے اسٹیشن۔ نازک آباد)

شعر کا جواب شعر میں دیں ؎
اب تو اتنا اداس رہتا ہوں
موت کے آس پاس رہتا ہوں!
(ایم رفیق انجم، چوک بہادر پور۔ رحیم یار خان)

شہزادی حمیدہ پروین کے نام!
آپ نے بھائی کی آرزو کی ہے تو میں آپ کو بہن بنانے کے لیے تیار ہوں۔
(غازی الرحمن خٹک ہیڈ کوارٹر پی ایف ایف سی ایبٹ آباد ہزارہ)

عبدالرشید آزاد، کراچی والے کے نام!
میں نے آپ کو یہاں آکر بہت خط لکھے مگر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
(ملک نذیر احمد دکھی پی او بکس ۲۰۷ مدینہ منورہ السعودیہ)

اے ۔ اے جی کے نام !
میں یہ نام اشتہار دینے کا شکریہ مگر مجھے اسعودیہ کے ایڈریس پر خط لکھیں کہ آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں ۔
(نصیر بٹ صاحب رقم ۲۹۸۵ ، الریاض سعودی عرب)

نائلہ گل کے نام !
میں آپ کو اپنی بہن بنانا چاہتا ہوں اور سگے بھائیوں کا پیار دوں گا ۔
(محمد یونس ص ب ۸۷ ، ابہا ۔ سعودی عرب)

مس انجم کے نام !
آپ کا شعر بہت ہی پسند آیا ۔ لگتا ہے کہ آپ بہت ہی زیادہ دکھی ہیں ۔
(سرفراز احمد پی او بکس ۲۷۱۸ مکہ المکرمہ سعودیہ)

باجی نائلہ گل کے نام !
لگتا ہے آپ بہت دکھی ہیں اگر آپ کو سچے بھائی کی ضرورت ہو تو مجھ سے رابطہ قائم کریں ۔
(خواجہ محمد اشرف پی او بکس ۵۷۶۵ جدہ سعودی عرب)

مسز نعیم الحسن کے نام !
آپ کا خط مل چکا ہے آپ نے جو کچھ لکھا ہے یہ بالکل درست ہے میں کوشش کرونگا کہ آپ مایوس نہ ہوں ۔
(ایچ ایم فرید پی او بکس ۳۸۰ دہران سعودی عرب)

مس حمیرہ کے نام !
میں نے آپ کو دو تین خط لکھے مگر جواب ندارد !
(ایم اعجاز کھوکھر پی او بکس ۳۹۶۱ دوبئی یو اے ای)

مختیار احمد کے نام !
آپ کے تمام ساتھیوں اور محمد اقبال کو سلام قبول ہو ۔
(نور الہٰی تبسم ، پی او بکس ۸۴۴۱ ، الطائف سعودی عرب)

آر ۔ اے بخاری ، لاہور کے نام !
ضروری نہیں کہ ہر آدمی صرف نام شائع کرانے کی خاطر ہی قلمی دوستی کا اشتہار دیتا ہو ۔ آزمائش شرط ہے ۔
(فدا المصطفےٰ رضا بلوچ ، سنٹرل اکاؤنٹس آفس ایریز سیکشن پی اے ایف مسرور ۔ کراچی نمبر ۱۴)

بہن آفریدی کے نام !
آپ کا اشتہار پڑھا اگر آپ کو واقعی بھائی کی طلب ہو تو مجھ سے فوری رابطہ کریں ۔ ساری عمر بھائی بن کر دکھا دوں گا ۔
(علی محمد جادو بیدی پی او بکس ۴۵۷ جدہ ۔ سعودی عرب)

مس صبیحہ بانو کے نام !
آپ کی کہانی "بھروسہ" نے بے حد متاثر کیا ۔ آئندہ بھی ایسی ہی کہانیاں تحریر کریں ۔
(ایم وکیل پی او بکس ۴۸۳ جدہ سعودی عرب)

بہن مینا ناز کے نام !
آپ اس ایڈریس پر مجھ سے رابطہ قائم کریں امید ہے مایوس نہیں کریں گی ۔
(ڈی یو شیخ پی او بکس نمبر ۲۶۷ دہران سعودی عرب)

شائستہ حسن کے نام !
آپ کی کہانی "سکون کی تلاش" نے بے حد متاثر کیا ہے ۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے ۔ آئندہ بھی ایسی ہی کہانیاں تخلیق کریں ۔
(مہدی شریف ، پی او بکس ۱۲۰ ، دہران سعودی عرب)

زندگی کی ہر آسائش میسر ہے اس چیز کی کمی نہیں ۔ مگر ایک خوب صورت دل والے انسان کی کمی ہے ۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ آرزو پوری ہو جائے ۔
(ایم امین خان ، پی او بکس نمبر ۲۰۵۸ ، ابوظہبی یو اے ای)

مختصر اشتہارات

راز ذوالفقار علی مصور کے نام!

آپ کا خوبصورت خط ملا۔ جس کا جواب اسی دن دے دیا مگر دوبارہ ابھی تک آپ کے خط کی انتظار میں ہوں۔ آپ کی خواہش کے مطابق ہی یہ اشتہار دے رہا ہوں۔ آپ بھی جواب دے ہی دیں تو اچھا ہے۔ آپکی دعوت قبول نہ کرنے کی ہم معذرت چاہتے ہیں۔

(ایم سعید نور ملک ٹیلرز، تاج پورہ، نظام آباد لاہور)

نسیم بانو کے نام!

بدقسمت تو اس دنیا میں بہت ہیں اگر ہو سکے تو اسی کالم کے ذریعے میرے ساتھ رابطہ قائم کریں۔

(صغرا اقبال بریدہ القیم۔ سعودی عرب)

قلمی دوستی کرنے والوں کے نام:

میں فی الحال الریاض میں ہی ڈیوٹی کر رہا ہوں اس لیے ابھی اسی پتہ پر خط لکھیں۔

(رانا محمد شفیق اختر پی او بکس نمبر ۳۰، ریاض السعودیہ)

ر۔ حق کے نام!

یہاں سے جانے کے بعد تم نے کوئی خط نہیں لکھا نہ جانے لوگ بے وفائی کیوں کرتے ہیں۔ کاش تم ...

(ایم اسلم ندیم پی او بکس ۳۰۸۸ دوبئی یو اے ای)

بانو صاحبہ کے لیے!

میں ابھی بھی آپ کے لیے بے تاب ہوں۔ چاہے جب بھی مجھے آزما کر دیکھ لو۔

(ایم شفیق: الریاض۔ سعودی عرب)

کوثر ناز، کراچی کے نام!

فروری کے شمارہ میں آپ کے شعر نے بہت ہی متاثر کیا ہے۔ اپنی کوئی کہانی بھی دیں ناں!

(مہربان مہر، ڈیرہ دوبئی۔ یو اے ای)

ساجی کنول کے نام!

کافی عرصے سے آپ کی طرف سے کوئی خیریت نامہ موصول نہیں ہوا۔ آپ کو کئی خط لکھے مگر جواب ندارد۔ اب مجبوراً اس کالم کا سہارا لے رہا ہوں۔

(گل زریں پردیسی ص ب ۷۶۰۱، القیم سعودی عرب)

چندا شیرز کے نام۔

ارے بھائی بہت کنجوس ہو گئے ہو۔ خط تک لکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ہو۔

(ریاض احمد تاج ص ب ۹۳۶، الطائف، سعودیہ)

بانو زخمی کے نام!

آپ کا اشتہار پڑھا۔ بہت دکھ ہوا۔ میں بھی آپ کی طرح دکھی ہوں۔ مجھ سے رابطہ کریں۔

(ایم سرفراز پی او بکس ۹۹۴۷، الریاض السعودیہ)

مس روبی اور رخسانہ نیر کے نام!

آپ کے شعروں نے بے حد متاثر کیا ہے۔ آئندہ بھی ایسے ہی شعر لکھا کریں۔

(مشتاق انجم اسپٹ آباد وی حائل سعودی عرب)

پیارے کانانی جان، منظور گڑھ کے لیے!

آپ کو جیسے ہی کوئی ناراضگی وغیرہ ہوگی تو وہ میرے امو ابو کے ساتھ ہوگی۔ کم از کم مجھے تو آپ اپنی خیریت کا خط لکھ دیا کریں۔

(طیبہ آرزو۔ مدینہ المنورہ۔ سعودی عرب)

ایک بے وفا کے نام!

میں نے جواب عرض میں آپ سے ملنے کے لیے اشتہار بھی دیا تھا۔ آپ نے اسے پڑھا بھی ہے مگر میں جواب سے ابھی تک محروم ہوں ...!

(بدر زمان، پی او بکس نمبر ۲۵۴۲۷ صفات کویت)

مختصر اشتہارات

میرے کان بجتے ہیں اور کچھ بہرہ پن بھی ہے۔ بڑا علاج کروایا بہت تنگ کیا آ فاقہ نہیں ہوا۔ حاملی نزلہ بھی ہے۔ کوئی بہن بھائی کے پاس ان امراض کا آزمودہ نسخہ ہو تو بتا کر ممنون فرمائیں۔ بہت پریشان ہوں۔
(محمد اسمٰعیل معرفت میڈیکل کلاتھ اسٹور، تاندلیانوالہ ضلع فیصل آباد)

تہنیت دی حمیدہ کے لیے:
آپ کا اشتہار پڑھا۔ آپ فوری طور پر مجھ سے رابطہ کریں...
(سید اے رحمن، پی او بکس ۳۰۸۹ دوبئی یو اے ای)

میں دنیا کا ستایا ہوا انسان ہوں۔ زندگی میں بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ اب تو جینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔
(سلیم ملک پی او بکس ۵۷۵۳ الریاض، سعودی عرب)

ایم رفیق مرت جاوید، احمد نزدیک کے نام:
سنا ہے آپ دوبارہ ریاض السعودیہ آئے ہوئے ہیں، مجھ سے فوری طور پر رابطہ کریں۔
(ایم حنیف خان پی او بکس نمبر ۳۰۸ ریاض السعودیہ)

اگر کسی بھائی کو سعودی عرب میں مردانہ سوٹ کے ماہر کاریگر کی ضرورت ہو تو اس پتہ پر لکھیں۔
(ڈاکٹر یوسف شیخ پی او بکس ۷۷۶۲ دہران۔ سعودی عرب)

مجھے جواب عرض کا "لیڈی نمبر" درکار ہے۔
(آسیہ ناز معرفت نظام الیکٹرک اینڈ ریڈیو ورکس سرائے نورنگ۔ ضلع بنوں)

مجھے جنم جنم کا ساتھ دینے والے لوگ بہت ہی پسند ہیں۔ خودغرض نہ ہوں۔
(محمد افضل، سنسواری بازار۔ راولپنڈی)

راجہ خالد مسعود ٹوبہ کے نام:
آپ کے اشعار میں ہر ماہ باقاعدگی سے جواب عرض میں پڑھ رہی ہوں۔ آئندہ بھی ایسے ہی شعر دیں۔
(ثریا ..... جہلم)

قلمی دوستی کے کالم میں مجھے بہت دوستوں کے خط مل رہے ہیں۔ باری باری سب کو جواب دے رہا ہوں۔ جلد کوئی میرا خط نہ ملے وہ ذرا انتظار فرمائیں۔
(محمد اسلم لاہوری پی او بکس ۱۳۲۸۴ ریاض السعودیہ)

ریحانہ ناز صاحبہ کے نام:
میں نے آپ کی خدمت میں کئی خط ارسال کیے مگر جواب ندارد۔ آخر یہ بے رخی کیوں؟
(ظہور احمد ناز، کوٹلہ۔ ضلع گجرات)

بے وفا کے نام:
تیری بے وفائی کا ماتم کروں یا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہاؤں۔ کہاں گئے وہ تیرے وعدے اور قسمیں۔ مجھے برباد کرکے آخر تمہیں کیا ملا؟
(گل اکبر خان۔ ادھوڑی کیمپ۔ راولپنڈی)

میں ان تمام دوستوں کا ممنون ہوں جنہوں نے مجھے اچھے اور معیاری شعر ارسال فرمائے۔ خاص کر نگینہ صاحبہ کا شکریہ جنہوں نے سب سے پہلے خط لکھا۔
(ظفر زیدی پتوکی سٹور ملز پتوکی۔)

کوثر قریشی صاحبہ مجھ سے رابطہ قائم کریں۔
(محمد ریاض پی او بکس ۴۳۲۹۰ الریاض سعودیہ)

ایک منہ بولی بہن کے نام!
آپ نے مجھے غلط کہا ہے۔ اس کا ثبوت حالات دیں گے۔
(ایم ایچ یٰسین ناشاد۔ محمود آباد۔ کراچی)

مختصر اشتہارات

اک بے وفا کے نام !

؎ تو کبھی وقت کے صحرا میں میرے ساتھ تو چل
پھول بن کر تیری راہوں میں بکھر جاؤں گا !

(جاوید، میکڈلیشن عزیب آباد منڈی حاصل پور)

مجھے بی اے انگلش، اردو اور انگریزی کے نوٹس درکار ہیں، جس بہن بھائی کے پاس ہوں، عنایت فرما دیں، کاپی کر کے واپس کر دوں گا۔

(محمد عباس، اے ۲۲ دین محمد پارک شادباغ۔ لاہور)

رنگین اور خوب صورت نایاب چھوٹی مچھلیاں حاصل کرنے کے لیے نہایت ارزاں قیمت پر درج ذیل پتہ پر فوراً رابطہ قائم کریں۔ طلباء و طالبات کیلئے خاص رعایت

(شہزادہ سلیم معرفت جواب عرض ۱۱۰ نسبت روڈ۔ لاہور)

مریم صادق کے نام :

میں نے تو ساری عمر آپ کو بھائی کا پیار دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ آپ کا ایڈریس میرے پاس نہیں اور آپ نے بھی اپنی خیریت سے آگاہ نہیں کیا۔

(خالد ناز، پی او بکس ۵۹ ۱۴ الخبر۔ سعودی عرب)

بہن نائیلہ گل کے نام !

مجھے بھی آپ جیسی ہمدرد بہن کی تلاش ہے آپ براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ میں انشاء اللہ تم کو ساری زندگی آپ کو سگے بھائیوں جیسا پیار دوں گا۔ آزما کر دیکھ لیں۔

(معراج الدین غزنوی ص ب ۲۵۹۔ سعودی عرب)

ایک اچھے سے پیارے سے وفادار غیر ملکی بھائی کی تلاش ہے۔ جو دھوکے باز اور خود غرض نہ ہو۔ میں اسے کوئی دکھ نہ دوں گی۔

(حمیدہ ساحلی)

آفریدی صاحب متوجہ ہوں :

آپ براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کریں ؎
انشاءاللہ ٹوٹنے دوں گا نہ کبھی تا زیست
طے پا جائے گا رشتہ جو ہم دونوں میں !

(ایم ایم ملک معرفت احمد جاوید جنرل اسٹور A-R-۲/۲۸ اوکاڑہ - پاکستان)

اس کے نام ... جو میری کہانیوں پر تنقید کرتی تھی اور اس کی تنقید ہی میرے لیے مشعل راہ ہے - مگر وہ دور چلی گئی جہاں سے لوٹ کے آنا مشکل ہے۔ کاش اس کی جگہ کوئی اور مجھ پر تنقید کر سکے۔

(ذوالحسین نذ ڈیرہ ۴۹ نوحی شوگر ملز ٹنڈو محمد خان)

م۔ ن۔ س۔ طاہرہ کے نام !

لاکھ کوششوں کے باوجود تیری یاد نہ بھول پایا ہوں۔ شاید تیرے جیسی سنگدل نہ مل سکے۔

(اورنگ زیب ۔ جدہ ۔ سعودی عرب)

دکھی انسانوں کے نام !

میں بھی بہت ہی دکھی ہوں۔ کیوں نہ ایسا کریں کہ ہم مل کر اپنی ایک انجمن بنا ڈالیں۔

(ملک محمد دراز شاہد پی او بکس ۳۲۱۹ جدہ السعودیہ)

نسرین غزل اور خان کے نام ؎

مٹی کے تیل سے نہیں جلتے وفا کے دیپ
یہ مانگتے ہیں خونِ جگر کھولتا ہوا !

(ریاض اختر نسیم، پی او بکس ۸۹ ۸۵ صلالہ عمان)

حمیدہ پروین کے نام :

میں آپ کو حقیقی بھائی کا پیار دینے کے لیے تیار ہوں مجھ سے براہ راست رابطہ قائم کریں۔

(شاہ میر خان، پی او بکس ۲۸۴ ظہران ۔ سعودی عرب)

مختصر اشتہارات

محترمہ نازیہ کنول صاحبہ کے لیے !

آپ کا اشتہار پڑھا۔ آپ براہ راست میرے ساتھ رابطہ رکھیں اگر واقعی آپ مخلص ہیں تو۔۔۔

(ریاست علی اعوان پی او بکس ۲۰۰۱۱، دمام سعودی عرب)

سوڈانی کی پڑوسن کے نام !

جاتی دفعہ آپ مل کر بھی نہیں گئیں۔ میں نے کئی مرتبہ فون بھی کیا تھا، لیکن ملاقات نہ ہوسکی۔ اب آپ کب دوبارہ تشریف لا رہی ہیں۔

(نوید اسد ناصر پی او بکس نمبر ۲۰۰۱، الدمام السعودیہ)

حمید پرویز صاحب کے نام !

میں آپ کو حقیقی بھائی کا پیار خلوص دل سے دوں گا کیونکہ میں خود بہت دکھی ہوں۔

(احسن گورنمنٹ ڈگری کالج ننکانہ صاحب ضلع شیخوپورہ)

مسرت اوکاڑہ کے نام

آپ کے بہت سے خطوط مجھے ملے مگر میں جواب نہ دے سکا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے تم مجھے معاف کر دوگی۔

(شگفتہ، شاہدرہ ٹاؤن ۔ لاہور)

مجھے ایک نیک اور اچھی سی بہن کی تلاش ہے ساری زندگی بھائی بہن کا رشتہ نبھاؤں گا۔ خدارا لالچی اور مطلب پرست بہنیں نہ لکھیں۔

(ایم اشتاق اعوان، پی او بکس ۹۸، ہری پور ہزارہ)

قارئین کے نام !

مجھے ملفوظ "محفل" پر اشعار درکار ہیں اگر کسی بھائی کے پاس ہوں تو وہ مجھ ناچیز کی مدد کر کے شکریہ کا موقع دیں۔

(م طارق خیام بلاک نمبر ۱۳، طارق روڈ۔ سیالکوٹ کینٹ)

لڑکیوں کے نام پیغام دینے والوں کے نام

میں صرف یہ کہوں گا کہ اگر آج آپ کسی کی بیٹی یا بہن کے نام ناجائز پیغام شائع کرتے ہیں تو کل کوئی آپ کی بہن یا بیٹی کے نام بھی محبت نامے شائع کرا سکتا ہے۔ اے کاش آپ لوگ ذرا سوچیں، اگر آپ کی بہن یا بیٹی کا نام یوں رسالوں کی زینت بنے تو آپ لوگوں کو کتنا دکھ ہوگا۔۔۔؟

(الحاج فدا الحق راجہ ص ب ۵۲۵۰ جدہ سعودی عرب)

بہنا ایم ناز کے نام !

آپ کا اشتہار پڑھا۔ میں آپ کو بھائی کا پیار دینے کے لیے تیار ہوں۔ آپ میرے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کریں۔

(افتخار الدین علوی، پی او بکس ۵۲۵۰۱، الریاض السعودیہ)

عشرت حسین، کویت کے نام !

آپ کا اشتہار نظروں سے گزرا۔ اگر ابھی تک آپ کا کوئی سلسلہ نہیں بنا تو مجھ سے رابطہ قائم کریں۔

(ایم صداقت طاہر، پی او بکس ۱۳۱۷۷، الریاض سعودی عرب)

بے وفاؤں کے نام !

میں نے دیکھی ہیں ہر ایک پھول کی آنکھیں پرنم
کیسے کہہ دوں کہ گلشن میں بہار آئی ہے!

(زاہدہ بلو رانی قریشی ۔۔۔ کبیر والا)

ہمیں خوب صورت تصویریں جمع کرنے کا بے حد شوق ہے۔ خواہ وہ فلمی ہوں یا غیر فلمی۔ مگر خوبصورت ہوں۔

(سیف الرحمن، پی او بکس نمبر ۱۵، بغداد عراق)

ہمیں "درد" کے موضوع پر شعر درکار ہیں۔ اچھے شعر پر بہترین تحفہ بھی دوں گا۔

(عبدالرحمن مغل پی او بکس ۴۹۶۸ جدہ سعودی عرب بنام افضل مغل)

مختصر اشتہارات

گراچی کے محترم انور حبیب صاحب جو راس الخیمہ لوائی میں سرو یئر تھے ان کا ایڈریس مجھ سے کھو گیا ہے اگر وہ خود پڑھیں تو مجھے خط لکھیں یا اگر کسی صاحب کے علم میں ہو تو مجھے ان کے پتہ سے آگاہ کریں۔
(راجہ ضیاء پی او بکس نمبر ۳۴۳ عجمان (یو اے ای)

مجھے بہت سے خطوط ملے کچھ پُر خلوص بھی تھے اور میں نے جواب بھی دیے مگر اکثر میں صرف ڈرافٹ کی ڈیمانڈ تھی مجھے افسوس ہے کہ میں کسی کی مالی مدد نہیں کر سکتا۔
(شبیر حسین ۔ پی او بکس ۲۷۷۲ الدمام سعودی عرب)

دل والوں کے نام !

؎ کبھی ملا نہ مجھے زندگی گزر رہی ہے میں
وہ اک شخص کہ خوابوں میں بار بار ملے

(شمیم المظفر سرتابی ۔۔۔ مانسہرہ)

مس شمع نسرین کے نام ۔

آپ اپنے والد صاحب کی بیماری کا اچھا سا نسخہ لے کر مجھے ارسال کر دیں میں یہاں سے دوائیں بھیج دوں گا۔
(پرویز اختر آچہ ۔ ۷۰ ہینڈرسن روڈ لندن ای ۷ انگلینڈ)

مس جی کے نام !

تم مجھے دیکھ کر مسکرا دیتی ہو، یہ تمہاری فطرت ہے یا دل میں کوئی چور تو نہیں ۔ اگر نہیں تو پلیز ایسا نہ کیا کریں میں بہت بھڑک جاتا ہوں۔
(ایم صالح بلوچ ممتاز کلاتھ ہاؤس مدینہ مارکیٹ نوابشاہ)

شاہد اقبال، انور یاحق اور مینا ناز کے نام :

پیارے بہن بھائی آپ دونوں کے اشتہار پڑھ کر بڑی ہی خوشی ہوئی۔ خدا اسی طرح سب بہن بھائیوں کے دل صاف کرے ۔۔۔
(سید افضال حیدر پی او بکس نمبر ۱۲۰ الطائف السعودیہ)

تمام دوستوں کے لیے :

ہم نے بذریعہ ڈاک سپورٹس کا سامان وغیرہ منگوانے کے لیے تمام انتظامات کر دیے ہیں آپ جہاں بھی ہوں ہم خدمت کے لیے حاضر ہیں۔
(الفت انٹرپرائزز پی او بکس ۱۹۱۴ سیالکوٹ نمبر ۱)

مرزا ندیم بیگ ۔ لاہور کے نام :

مانا کہ آپ ہواؤں کے دوش پر مسلسل پرواز کر رہے ہیں اور ریڈیو کے کمرشل پروگراموں پر چھائے ہوئے ہیں۔ میں نے گزشتہ مہینے آپ کو خط اور عید کارڈ ارسال کیا مگر جواب ندارد ۔ اب بھی اگر آپ چاہیں تو مجھ سے بذریعہ خط ملاقات کر سکتے ہیں۔
(محمد اختر مغل آفاقی، حریت نیوز شیر ٹیلرز ۔ ڈڈیال ضلع میرپور ۔ آزاد کشمیر)

کے ایس کے نام :

آپ ہم دونوں دوستوں کو بے وقوف بنانا چھوڑ دیں۔ اور کسی ایک کے ساتھ دوستی کریں ورنہ آپ دونوں کے لیے یہ بات اچھی نہ ہوگی ۔۔۔
(دیانت علی شہزاد، بستی مسوڈھا، بہاولنگر)

آپ کسی بھی ذاتی، نفسیاتی، جسمانی، طبی، قانونی یا کاروباری مسئلے سے دوچار ہیں تو ہمیں لکھیں ۔ ہم آپ کی ہر ممکن پیشہ ورانہ مدد کریں گے۔ جوابی لفافہ یا ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ ضرور ارسال کریں۔
(کنسلٹ سنٹر، پی او بکس نمبر ۱۸۱۷ سیالکوٹ)

پی ۔ اے کے نام !

جس دن سے میں السعودیہ آیا ہوں آپ کا کوئی خط نہیں آیا ۔ پلیز اس پردیس میں دل بہلانے کے لیے کاغذ کا ٹکڑا ہی ارسال کر دیں۔
(حاجی تحمل حسین ص ب ۷۰ ساپنج سٹی ۔ سعودی عرب)

مختصر اشتہارات

رفیق بھائی ، السعودیہ کے نام !

آپ سے ملاقات ہوئے ایک عرصہ ہو گیا ہے خدا کے لیے ایک بار آ کر اپنا چہرہ تو دکھا دیں ۔

(ایم یونس ، پی او بکس ۸۰۱ ابہا ۔ سعودی عرب)

عبدالحمید کنور کے نام !

میں ایک بار آپ سے ملنا چاہتا ہوں کسی کی باتوں میں نہ آئیے ، خدارا صرف ایک بار ۔

(خالد میاں ، ص ۔ ب ۹۹ ، المدینۃ المنورہ السعودیہ)

پُرخلوص اور نیک خیالات رکھنے والی بہنوں سے رابطہ کرنا چاہتا ہوں مگر خدارا دکھ دینے والی بہنیں زحمت نہ کریں ۔

(جی ایم خان ، پی او بکس ۲۰۵۸ ، ابوظہبی ، یو اے ای)

میری کوئی بہن نہیں ہے ۔ میں ایک ایسی بہن بنانا چاہتا ہوں جو مجھے سگی بہن کا پیار دے سکے ۔ مگر خدارا مطلب پرست بہنیں نہ لکھیں ۔

(پرویز ملک ، پی او بکس ۸۱۰ ، الخبر سعودی عرب)

صوفیہ اختر ، الریاض کے نام !

آپ فوری طور پر مجھ سے رابطہ قائم کریں ۔

(ایم اقبال ، پی او بکس ۵۰۲۵ کراچی نمبر ۵)

اے بجم کے نام !

میں آپ کا دکھ جاننا چاہتا ہوں ۔ مجھ سے فوری رابطہ قائم کریں ۔

(میاں عبدالغفار ، پی او بکس ۳۸ ، دوحہ قطر)

ایم اے گلشن کے نام !

کم از کم خط کا جواب تو دے دیا کرو ۔ مہربانی ہو گی ۔

(اسرار احمد خان دفتر ایکسین ای ایچ وا پڈا ۔ بورے والا)

حمیدہ پروین کے نام !

آپ کو بھائی کی ضرورت ہے اور مجھے بہن کی ۔ اب آپ فوری مجھ سے براہِ راست رابطہ کریں ۔

(چند ر لعل ، لعل آٹو راشیشن روڈ ۔ سرشید آباد کوٹ)

مس عارفہ نذیر ، متوجہ ہوں !

عارفہ جی ! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں ۔ میرے پتہ پر براہِ راست رابطہ قائم کریں ۔

(ایم اقبال تابر ، چک ایف / ۳۸ پی ، ڈاکخانہ چشتیاں بہاولنگر)

وکیل ظہیر احمد بھٹی ، مظفر گڑھ کے نام !

جناب آپ کا وعدہ وفا نہیں ہوا ۔ آخر یہ رخی کیوں ؟ آخر کیا وجہ ؟

(مظہر جاپانڈیہ ، ص ب ۲۱۶۴ مدینہ المنورہ السعودیہ)

ایک بے وفا دوست کے نام !

؎ تیری جفائے مسلسل میں کیوں فرق آیا
میری وفاؤں میں کچھ کمی تو نہ تھی اے دوست

(اے ۔ آر ۔ صابر ، میگو ریسرچ اسٹیشن شجاع آباد)

سعودی عرب میں مقیم اپنے ابو کے نام !

مہربانی کر کے ہمیں جلدی جلدی خط لکھا کریں ۔ آپ کے خط ہمیں بہت دیر سے ملتے ہیں ۔ عرفان آصف ، یاسمین عظمیٰ سب ٹھیک ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں ۔

(یاسمین کشور سعید ، مغلپورہ لنک روڈ ۔ لاہور)

محبت کرنے والوں کے نام !

میرے دوستو ! اگر محبت کرنی ہے تو ایسی کرو کہ قیس و لیلیٰ ، شیریں فرہاد اور ہیر رانجھا کے قصے تازہ ہو جائیں ۔ اور اگر یہی محبت خدا کے نیک بندوں سے کریں تو کیا ہی مزہ آئے ۔

(راجہ عبدالقیوم زلفی ۔ چکوال)

مختصر اشتہارات

حمیدہ پروین کے نام!
باجو میری کوئی بہن نہیں ہے، مجھے ایک بہن کی اشد ضرورت ہے، مجھ سے فوری رابطہ قائم کریں۔
(عابد لطیف، ص ب ۲۷۲۸ مدینۃ المنورہ۔ سعودی عرب)

رخسانہ کوثر کے نام!
میں نے آپ کے خط کا جواب دے دیا ہے۔
(ایم۔ اے ماجد بلوچ، دوبئی یو اے ای)

اس دنیا میں خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کو کسی ہم رشتہ کا پیار مل جاتا ہے۔۔۔ ایسا پیار جس میں خود غرضی اور مطلب پرستی نہ ہو۔
(خالد بشیر بھٹی، پی او بکس ۷۷۰ مدینۃ المنورہ السعودیہ)

مجھے ایک نیک اور اچھی سی ایسی بہن کی تلاش ہے جس کا کوئی بھائی نہ ہو، کیونکہ میری بھی کوئی بہن نہیں ہے۔ زندگی بھر یہ رشتہ نبھاؤں گا۔
(تاثیر احمد پوسٹ آفس منڈھول، رقبہ کرسل براستہ ہجیرہ، ضلع پونچھ۔ آزاد کشمیر)

مجھے پاکستان کی نامور اداکارہ بابرہ شریف کا خوبصورت سا کارڈ یا فوٹو درکار ہے۔ ارسال کرنے والے کو منہ مانگی قیمت دوں گا۔
(مقصود اختر، پی او بکس نمبر ۱۷۰۱۲، ابوظہبی)

اپنے پیارے دوست کے نام! ؎
طبیعت اپنی جب گھبراتی ہے سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تیری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں!
(ظفر جنرل اسٹور بک سٹال۔ احمد پور سیال)

حمیدہ پروین مجھے بھائی جان کر خط لکھ سکتی ہیں۔
(ثناء اللہ بخاری، پی او بکس ۷۴۲ عجمان یو اے ای)

مجھے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی فوجی وردی میں ملبوس فوٹو درکار ہے۔ سب سے پہلے ارسال کرنے والے کو خوبصورت تحفہ دوں گا۔
(عبدالرؤف معرفت احمد عبدالحکیم، پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳۱ مدینۃ المنورہ۔ سعودی عرب)

حمیدہ پروین صاحبہ کے نام!
میں آپ کو بھائی کا پیار دینے کے لیے تیار ہوں۔ بشرطیکہ آپ بھی اس نازک رشتہ کو نبھائیں۔
(ساجد عبدالقیوم پی او بکس نمبر ۵۹۳۷، یو اے ای شارجہ)

آپ سب بھائی دوسروں کی ہوشیاری اور چالاکی سے بچیں۔ نہ خود دھوکہ دیں نہ دھوکہ کھائیں۔
(ثناء اللہ بخاری پی او بکس ۷۴۲ عجمان یو اے ای)

؎ بہت تلاش کیا پر ملا نہ مجھ کو کہیں
نشہ جو تیری نگاہوں کی اس شراب میں تھا
(ایم جمیل پردیسی، روئی مسقط)

میرا درست ایڈریس درج ذیل ہے۔
(ظفر اقبال نذیر، پی او بکس نمبر ۷۲۴۱۲ جدہ السعودیہ)

جبیں ناز کے نام!
میں آج بھی آنے والی صبح کی طرح تیرا انتظار کرتا ہوں، نہ جانے کہاں کھو گئی ہو۔ ایک بار آکر مل جاؤ، خدارا صرف اور صرف ایک بار۔
(ناصر ناز کیفی، پیر محل)

ایسے دو طالب علم بہنوں کی مسلسل مالی اعانت بغیر کسی لالچ اور چاہ کے کرنا چاہتا ہوں، جنہیں تعلیم حاصل کرنے میں مالی دشواریوں کا سامنا ہو مگر ثبوت کے ساتھ۔
(جاوید یامین، پی او بکس نمبر ۱۶۳۵، الخبر السعودیہ)

ہے کوئی جس کے سینے میں مسرتیں ہی مسرتیں ہوں۔ اور میرے دکھوں اور غموں پر اپنی مسرتوں کا سایہ کر دے۔ مجھے دنیا کی تلخی کا احساس ختم کر دے جس نے میرے جیون کو گیلی لکڑی کی طرح سلگا کر رکھ دیا ہے۔ کاش! مجھے ان بیکراں دکھوں سے نجات مل سکے...

(ملک نامہ تابندہ، پی او بکس ۵۰۷۷ جدہ، سعودیہ)

ڈاکٹر نسیم کے نام!

میں تم کو اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا مگر اب مجھے تم سے نفرت ہے سخت نفرت کیونکہ تم چاہت کے قابل ہی نہیں ہو...

(ایم سلیم دانش، سلیمان آباد نمبر ۱)

ایم ایم شفیع ثاقب کے نام۔

وہ کبھی تم اور ہم بھی تھے آشنا

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

(ملک منصور دار الصلوات، صلالہ آف عمان)

رخشی منزل کے نام!

آپ کے دو خط مل چکے ہیں لیکن آپ کا ایڈریس گم ہو جانے کی وجہ سے جواب نہ دے سکا۔ مجبوراً اس کام کا سہارا لے رہا ہوں۔ مجھ کو اپنے پتہ سے نوازیں۔

(ایم ایم اجمل خان، خیطان۔ کویت)

عابدہ رانی کے نام!

آپ کی نظم پڑھی بہت ہی پسند آئی۔ آئندہ بھی ایسی ہی تحریریں جواب عرض کے لیے دیں۔

(جام اشفاق احمد پرواز، جدہ سعودیہ)

نسرین اور شاہین صاحبہ کے لیے!

آپ دونوں کے شعر بہت ہی پسند آئے۔

(شیخ محمد یونس، دوبئی یو اے ای)

جو بھی زخم دیا اپنوں نے دیا، غیروں سے کیا شکوہ کروں، یہاں تک کہ زندگی نے بھی میرے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ کس سے شکوہ کیا کروں۔ میرا مقدر ہی خراب ہے۔

(حمید انور لتوآل، الطائف۔ سعودی عرب)

مجھے ڈائری سے "اقتباس" درکار ہیں۔ اگر کسی بہن بھائی کے پاس ہو تو بھیج کر شکریہ کا موقع دیں۔ سب سے پہلے خط پر خوب صورت تحفہ دوں گا۔

(خالد پرویز ناز، پی او بکس نمبر ۲۲ سعودی عرب)

بہن نائیلہ گل متوجہ ہوں

آپ کا اشتہار پڑھ کر دل دکھی ہوا۔ آپ کو بھائی کی آرزو ہے تو مجھے بہن کی تمنا ہے۔ ہم سگے بھائی بہن بن کر زندگی گزاریں گے۔

(عبدالصمد سرباز، سگنل نمبر ۴۴۲۴، صلالہ آف عمان)

بہن حمیدہ پروین کے نام!

آپ کا اشتہار پڑھا۔ میں آپ کا بھائی بننے کے لیے تیار ہوں۔ آپ مجھ سے رابطہ کریں۔

(کے این خالد، پی او بکس ۲۲ راس الخفجی سعودی عرب)

بھیا طفیل آرٹس، سیالکوٹ کے نام!

بھیا کبھی کبھی تو خیریت کی اطلاع دے دیا کریں۔ اب تو آپ سے دل بہت ہی اداس رہتا ہے۔ برائے مہربانی ذرا جلدی جواب دیا کریں۔

(ایم یونس صبح نمہ، پی او بکس ۱۸۲۶، صلالہ آف عمان)

شہزادی حمیدہ پروین کے نام!

آپ کا اشتہار پڑھا۔ میں آپ کو خلوص دل سے بہن بنانے کے موڈ میں ہوں۔ اگر آپ نے مجھ سے رابطہ کر لیا تو آپ کو کبھی بھی دکھ نہ دوں گا۔

مختصر اشتہارات

سلمیٰ حبیبی صاحبہ کے نام :

پہلے بھی آپ کا انتظار رہتا اور اب بھی یہ دل بے قرار ہے۔ جلدی ہی رابطہ کریں۔

(ندیم، پی او بکس ۱۸۵ ، شارجہ یو اے ای)

اے دنیا والو !

یہ زندگی چند روزہ ہے۔ اس لیے فانی زندگی کو ابدی زندگی پر ترجیح نہ دو۔ ان قلیل لمحات کو یوں گزارو کہ خدا راضی ہو جائے۔ اور خدا راضی ہو گیا تو آخرت سنور گئی۔

(آر۔ آئی۔ البعث، ص ب ۶۳۶۳، الریاض)

مقبول محمد کے نام !

کیا وجہ ہے کہ آپ کے اب خط نہیں آتے۔ میں بہت ہی زیادہ پریشان ہوں۔ جلد از جلد اپنی خیریت خیریت سے آگاہ کریں۔ میں تربت میں ہوں۔

(عبدالواحد پرنس لالا صاحب اورماڑہ۔ مکران)

گلشن صاحبہ کے لیے !

افسوس کہ آپ اتنی جلدی بھول گئیں۔ نہ کوئی خط اور نہ ہی کوئی پیغام بھیجا۔ کچھ تو خیال کریں۔

(حاجی عبداللہ خاموش)

دوست کے نام :

اچھے لوگ دوسروں کے جذبات کو حقیر نہیں جانتے اچھائیوں کے ساتھ دوسروں کی برائیوں کو بھی دل میں جگہ دیتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے زخم تو سینے ہی پڑتے ہیں . . .

(ظفر جنرل اسٹور، احمد پور سیال ضلع جھنگ)

مجھے خط لکھنے والے بہن بھائیوں کا بہت بہت شکریہ۔

(ایم اسلم، پی او طیف۔ واہ کینٹ)

ہمدرد و مہربان بھائیوں کے نام !

میں بی اے کی فائنل ایئر کی طالبہ ہوں۔ مگر مفلسی میں خاموش گزر رہی ہوں۔ گھر کے مالی حالات ایسے نہیں کہ ٹیوشن رکھ سکوں۔ اگر آپ میں سے کوئی صرف تین چار ماہ کے لیے میری فیس کا بوجھ برداشت کر لے تو میں ساری زندگی احسان مند رہوں گی۔

(حبیبہ اختر . . . . ملتان)

مس عمارہ نذیر کے لیے !

آپ سے صرف قلمی رابطہ کا خواہش مند ہوں۔ اگر اجازت ہو تو اس کالم میں بتائیں۔

(ایم اے شہزاد، اوکاڑہ پاکستان)

صفدر پرویز کے نام !

کیا ہی اچھا ہوتا جو آپ کسی ایک سے خلوص دل کے ساتھ روابط رکھتیں۔ اب بھی وقت ہے آپ سنبھل جائیں . . . ورنہ . . . ؟

(پروین اختر جاوید . . . . لاہور)

عبدالمجید، مدینہ منورہ کے نام !

آپ نے جو کام عید الجبار سے کروایا اس کے لیے کسی اور سے حل لیا ہوتا تو آپ کے استاد مولانا خلیل کو شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

(محمد منیر، پی او بکس ۲۶۳۰ مدینہ منورہ السعودیہ)

> بھلا کسی سے کسی کا حبیب نہ ہو
> یہ وہ داغ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو !

(محمد نواز، الاحسار السعودیہ العربیہ)

رخسانہ صاحبہ ! آپ کے کالم میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ اب کیا کروں !

(ایم ایم حسینی۔ جدہ۔ سعودی عرب)

مختصر اشتہارات

۔ نیا اسلامی کتب ۔۔۔ پے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر مفت حاصل کریں ۔ نیز دینی لٹریچر کی مفت اشاعت میں حصہ لینے کے لیے مخیر حضرات سے تعاون کی اپیل ہے ۔
(امیر تبلیغات مصطفیٰؐ ، بلاک نمبر ۴ ۲ سرگودھا)

مجتبیٰ صاحب کے نام :
ہماری پہلی ملاقات ایک شادی پر ہوئی تھی آپ نے مجھ سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کیا تھا ، میں تب سے لے کر آج تک تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں ۔
(عابد جاوید بٹ بمقام مان ، تحصیل و ضلع گوجرانوالہ)

ایک بے وفا کے نام !
میں نے زمانے بھر کے دکھ اپنائے اور غیروں کی چاہت کو ٹھکرا دیا ۔ ۔۔ت اور حسرت آپ کی خاطر ۔۔س کا آپ نے کیا صلہ دیا ، بتا دیں ذرا ؟
(محمد جمیل راجا ، کوٹ حسا ۔۔۔)

ایک زخمی کی پکار :

نظروں سے چھپ گیا ہے تقدیر کا اندھیرا
گرتا ہے جو بھی آنسو لیتا ہے نام تیرا

(سید اختر عباس زخمی ، پریالو ، خیرپور سندھ)

بہن شگفتہ کنول کے نام :
آپ کا ایڈریس مجھ سے گم ہو گیا ہے اس وجہ سے آپ کے خطوط کا جواب نہیں دے رہا ۔ جلد سے جلد اپنا ایڈریس بھیج دیں ۔ ۔ ۔
(عبدالرشید ، پی او بکس نمبر ۲۷۷۸ مدینہ منورہ السعودیہ)

حلیمہ صاحبہ تم نے مجھے رُسوا کر کے اچھا نہیں کیا خدا کرے تمہیں بھی کوئی بے وفا ہی ملے ۔
(شہزادہ محمد نسیم ، چونڈہ ، سیالکوٹ)

ریحانہ خان کے نام :
چاند سی پیاری بہنا ، آپ کا خط مل گیا تھا لیکن جواب عرض کے ذریعے جواب بہت دیر سے دے رہا ہوں ۔ اس کی معذرت چاہتا ہوں ۔ جو کچھ ممکن ہو لکھ دیں ۔
(محمد خالد علی ، جنرل اسٹور ، فرید مارکیٹ تھا تیوالہ)

روحی ، ہوش زیب کے نام ۔
ہمیشہ کی طرح تم آج بھی اس دل کی راحت ہو محبت زندگی ہے اور تم میری محبت ہو ۔
(مسعود احمد ناگر ، ۔۔ پاکپتن شریف ، تحصیل پاکپتن شریف)

بہن عفرا ناز تبسم کے نام :
آپ کا شعر بہت ہی دل کو بھایا ، آئندہ بھی ایسے ہی شعر جواب عرض کے ذریعے ہمیں پڑھنے کو دیں ۔
(سید نیاز حسین شاہ ، سرکال مانیر ۔ چکوال)

میں زمانے کا ستایا ہوا انسان ہوں ، جس سے وفا کی ہے اسی نے بے وفائی کی ہے ۔ اب دوستو ! تم خود ہی بتاؤ میں کس پر بھروسہ کروں !
(عبدالمجید لاہوری ص ب ۷۶۶ تبوک ۔ سعودی عرب)

اب تو آ جا کہ تیرے غم میں اکثر
خون اشکوں کا بہاتی ہیں ہماری آنکھیں

(ایم ریاض ، پی او بکس ۶۳۷م ، الریاض السعودیہ)

کشمیری بھائیو ! ہم تنظیم آزادی کی بنیاد ڈال رہے ہیں آپ سب بھائی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں ۔
(چند کشمیری ۔ متحدہ عرب امارات)

اپنی کوتاہی سے تقدیر کو بدنام نہ کر
عزم و ہمت سے مقدر بھی بدل جاتے ہیں

(جمیل الرحمٰن ناز ، موڑ ۔۔ کلاں مانسہرہ)

مختصر اشتہارات

بہن فرزانہ نازنہ کے نام!
اگر آپ چاہیں تو مجھ سے رابطہ قائم کریں، میں اس رشتہ کو نبھاؤں گا۔
(ش۔ غ طاہر ص ب ۲۰۴، الخبر سعودی عرب)

بہن فرزانہ جیلانی کے نام!
میں آپ کی اس بات سے پوری طرح سے متفق ہوں کہ ہم ہی سارے مرد اور ہم ہی ساری عورتیں زندگی میں صرف ایک بار محبت کرتے ہیں۔
(سید نیاز حسین شاہ۔ سرکال مائیر، چکوال)

فرزانہ جیلانی اور سید نیاز صاحب کے نام!
میں آپ دونوں کی رائے سے اختلاف کرتا ہوں، کیونکہ خواہ وہ مرد ہو یا عورت، زندگی میں صرف اور صرف ایک بار دل کی گہرائیوں سے کسی کو چاہتے ہیں۔ اس کے بعد تو زندگی گزارنے کا ایک بہانہ ہوتا ہے۔
(سعید احمد ساجد معرفت جواب عرض نسبت روڈ۔ لاہور)

نیچے ملکی اور غیر ملکی قلمی دوستی کے ایڈریس والا رسالہ درکار ہے۔
(ممتاز احمد معرفت حکیم محمد حنیف پی او بکس نمبر ۲۳۱۰ مدینۃ المنورہ۔ سعودی عرب)

★ آپ یہ رسالہ شہزادہ سلیم احمد کے نام ۲۵ روپے کا ڈرافٹ ارسال کر کے منگوا سکتے ہیں۔ (ادارہ)

شعر کا جواب شعر میں درکار ہے ؎
نہ ہے کوئی اپنا، نہ ہے کوئی پرایا
دل چکنا چور ہے اب کوئی نہیں سہارا
(رجام اشفاق احمد پروانہ، جدہ۔ سعودی عرب)

بہن شہناز گل ناز میں آپکو حقیقی بھائی کا پیار دوں گا۔
(ایم ایم اسلم، پی او بکس نمبر ۷۔ ۴، ابوظہبی یو اے ای)

میں ہر اچھے، نیک سیرت اور شریف بہن بھائیوں کی دل سے قدر کرتا ہوں۔
(غلام حیدر ارشاد، صلالہ، اومان)

ذ۔ غ کے نام!
؎ نہ تم سے شکایت ہے صنم نہ دنیا سے کوئی گلہ
ہمیں تو جو بھی ملا ہے وفا ہی ملا
(شنا اللہ ملک ص۔ ب ۸۶۶۵، الریاض السعودیہ)

غ۔ گ، سیالکوٹ کے نام!
آپ کا شعر پڑھا اور دل کی گہرائیوں میں اتر گیا اگر چاہیں تو آئندہ بھی ایسے ہی شعر پڑھنے کو دیں۔
(پردیسی اقبال جاوید۔ الدمام۔ سعودی عرب)

شاہین اعوان کے نام!
؎ ہم بے زباں نہیں تھے مگر بے زباں رہے
آنسو ہی حسرتوں کے سدا ترجماں رہے!
(افتخار الدین علوی، پی او بکس ۱۰۵۲۵، الریاض سعودیہ)

مونا رشید صاحبہ متوجہ ہوں!
آپ مجھ سے براہ راست رابطہ قائم کریں ہو سکتا ہے آپ کو مجھ سے بھائی کا پیار مل جائے!
(ایم ایس اقبال پی او بکس ۱۷۳۲، الریاض السعودیہ)

دوبئی کے بھائیوں کے نام!
آپ سب بھائی اور قلعہ کرچائی کے سب آدمی میرے ساتھ رابطہ قائم کریں۔
(ایم رشید قمر پی او بکس نمبر ۵۶۲ تمثیل گیس کمپنی سعودی عرب)

دسمبر ۸۱ء میں جی ٹی ایس کی بس سے پنڈی جاتے ہوئے ایک انسان سے ملاقات ہوئی وہ اپنے پتہ سے نوازیں۔
(باچا خان، ص ب ۶۰۳۷ جدہ۔ سعودی عرب)

مختصر اشتہارات

قارئین متوجہ ہوں !

میری جانب سے نومبر ۸۲ء کے شمارے میں ایک انڈین اردو گانے کی کیسٹ کا اشتہار چھپا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے بے شمار خطوط ملے اور میرا مسئلہ حل ہو گیا، آئندہ کوئی خط لکھنے کی زحمت نہ کرے۔

(ایم ایم شفیق جاتی، الطائف۔ السعودیہ)

اک بے وفا کے نام !

تیری الفت کی راہوں میں لٹا دی زندگی میں نے

دل و جان لوٹنے والے تو کتنا بے وفا نکلا

(فدا حسین سبط، پی او بکس ۳۴۸، الطائف السعودیہ)

نینا موتا کے نام !

واہ میری بھولی بہنو! آپ کی دنیا میں معصوم اور بے گناہ بڑے اچھے الفاظ ہیں آپ کے؟

(ایم اقبال، جدہ۔ سعودی عرب)

پروین شکیل صاحب کے نام !

آپ اس پتہ پہ رابطہ قائم کریں۔

(ملک ممتاز احمد معرفت محمد حنیف آئل مین، پوسٹ بکس نمبر ۲۳۱ مدینہ منورہ سعودی عرب)

ق، صاحب کے نام !

آپ کے خط کا میں شدت سے انتظار کر رہا ہوں، جس کی مجھے امید ہی نہیں ہے۔ پھر بھی آس لگائے ہوئے ہوں۔

(اعجاز احمد، پی او بکس نمبر ۲۰۵۸، ابوظہبی یو اے ای)

لاہور والی مین کے نام !

آپ نے تو تا زندگی یہ رشتہ نبھانے کا عہد کیا تھا وہ سارے وعدے اور قسمیں کیا ہوئیں۔ میں پریشان ہوں۔

(ایم ناصر، پی او بکس ۳۳۰۷ دوحہ قطر)

بے وفا رخسانہ کے نام !

اس ناکامی کے میرے سینے میں بڑے بڑے ہیں، صرف تو اتنا کہہ دے کہ میری وفا تیرے لیے

(ایم احسان الحق، مستور۔ سعودی عرب

یادوں کا یہ حسین تاج محل، جس کی معمار میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں، تم نے گزرے یادوں کو دل سے نکال دیا یہ تمہارے بس کی کاش! میرے بس میں بھی ایسا ہوتا!

(ملک ناصر تاز، پی او بکس ۷۷۰۵ جدہ۔ سعو

بے وفا حامد اللہ شاہین، لاہور کے نام !

کاش کہ تم مجھے سمجھ سکتے، تمہارے دروازے پر جا کر واپس آ گیا اس لیے کہ ؎

اگر تم کو گوارا نہیں دیکھنی صورت میری

مگر ہم ہیں کہ چھپ دیکھے ہی کرتے ہیں پرستش

(ملک ممتاز احمد، مدینہ منورہ۔ سعودی عر

محترمہ شہناز اور یاسمین کے نام !

آپ دونوں کے شعروں نے بہت متاثر کیا آئندہ بھی ایسے ہی شعر پڑھنے کو دیں۔

(عبدالعزیز، جدہ۔ سعودی عرب)

دسمبر ۸۲ء کے شمارہ میں محترمہ ممتاز صاحبہ مس شہناز کے شعر بہت ہی پسند آئے۔

(ایم ایم شفیق جاتی، الطائف سعودی

کہتے ہیں کہ جہاں تقدیر لکھی ہو وہاں تدبیر انجام پذیر ہوتی ہے۔ اب دیکھئے ہماری کل کھلاتی ہے۔

(عزیز اللہ خان، پوسٹ بکس نمبر ... ازکی سلطنت آف عمان)

مختصر اشتہارات

ظفر حسین ندیم کے نام!
آپ نے کئی دن سے اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دی۔
اگر ناراض ہو تو معاف کر دیں۔
(ذوالفقار علی شاد، ص پ ۹۸۳، الطائف السعودیہ)

ریحانہ گل صاحبہ کے شعر کا جواب حاضر ہے۔
کسی کے دل کی بے چینی کسی کے دل کو بے تابی
وہی محسوس کرتا ہے جو خود بے تاب ہوتا ہے
(فدا ملک ص پ ۵۵۸۷ جدہ۔ سعودی عرب)

بے وفا فرزانہ کے نام!
تیری بے وفائی پر ماتم کروں یا اپنی حسرتوں پر آنسو بہاؤں، میرا ایسا کون سا گناہ تھا جس کی تم مجھے اتنی بڑی سزا دے رہی ہو۔ خدارا لوٹ آؤ۔
(رانا مختار احمد شاکر، مدینۃ المنورہ۔ سعودی عرب)

ہر قسم کے بورڈ اور زنان رنگوں پر لکھوانے کے لیے ہمارے ہاں تشریف لائیں۔ آپ کی من پسند لائن لکھا جائے گا۔
(محمد عارف پاکستانی شارع دیوس الغالیہ، الکویت)

اے جلانے کا خدا تجھ کو جہنم کے شعلوں میں
کر و انصاف اگر جنت میں جانا ہے
(منتظر ایم شمیم اختر ایم پی بی ایس، مچھ کوئٹہ)

بے وفا لڑکیوں کے نام!
تمہیں کون نہ مانے نہیں آزمانا ہے تمہیں کس کی زندگی سے کھیلنے میں مزہ آتا ہے کیا؟
(ایم شمیم اختر ایم پی بی ایس، مچھ۔ کوئٹہ)

اے خدا جانے محبت کا کیا دستور ہوتا ہے
جسے ہم پیار کرتے ہیں وہ ہم سے دور ہوتا ہے
(این ڈی ناز قریشی۔ مچھ، کوئٹہ بلوچستان)

اپریل ۸۳ء

ارم ناز صاحبہ کے نام!
اے کاش میں اتنا ہوں یہ سوچ کے تنہائی میں
میرے چہرے پہ تیرا نام پڑھ نہ لے کوئی!
(شیخ محمد شاقب رفیق، مکہ المکرمہ۔ سعودی عرب)

ملک ظہور احمد قیصر، کراچی کے نام!
بازار و کینٹ کا لاچی
ڈس کے ولاں وچ جا بیٹھا ہیں کراچی
(ملک ظہیر کوتل، ڈوبہ تحصیل۔ ضلع جہلم)

اختر، ولایت خان اور اشرف صاحب کے نام!
آپ تینوں نے میرے دنیا میں جو شیوے ایثار کا دیئے ہیں، خدا ہماری محبت قائم و دائم رکھے!
(ایم خان اختر، پی۔ ایس کی کلاس، ضلع جہلم)

سرگودھا لیڈی کے سائنسی میلے میں جو لڑکی مرکز نقل کے بارے میں بتا رہی تھی، وہ اگر یہ پڑھے تو میرے ساتھ رابطہ قائم کرے۔
(ایم ایل شش ۷۸ نیو سٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا)

مس یاسمین آپ کے شعر نے بہت متاثر کیا۔ کاش سبھی لڑکیاں ایسے ہی شعر ارسال کریں۔
(جاوید اختر، پی او بکس ۵۶۰۸۲، کویت)

بہاولپور کے قاضی منیر رسول طاہر کے نام!
آپ کو خط ارسال کیا مگر ابھی تک جواب نہ دارد!
آخر کیا وجہ ہے؟
(پروین اختر ندیم، اسلامیہ یونیورسٹی عباس ضلع بہاولنگر)

قارئین! بقایا ٹکٹوں کے ہمراہ وصول شدہ اشتہار اگلے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ اپنے اشتہار لغویات سے پاک ارسال کیا کریں... (ادارہ)

اب کیا کروں

اس کالم میں قارئین کے مسائل اور الجھنیں ادارہ کے مختصر جوابات
کے ساتھ شائع کئے جائیں گے۔ اپنے ایسے مسائل اور الجھنیں صاف ستھری
تحریر میں درج ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔ (ادارہ)

انچارج "اب کیا کروں" ۷۷ نسبت روڈ۔ لاہور

میں ایک غریب گھرانے کا واحد سہارا ہوں۔ سوائے
باپ کے میرا کوئی آسرا نہیں۔ ماں بھی فوت ہو چکی ہے۔ نہ بہن
ہے نہ بھائی۔ رشتہ دار بھی بیگانے ہو گئے ہیں۔ ہم گھر کے صرف
دو فرد ہیں۔ میری عمر ۲۱ سال کے قریب ہے، میں نے داڑھی
رکھی ہوئی ہے بڑے سکون کی زندگی گزار رہا ہوں۔ سب
سے پہلے میری منگنی اپنی خالہ کے گھر ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ
کہہ کر منگنی توڑ دی کہ لڑکے نے داڑھی رکھی ہوئی ہے اس
کے بعد چچا، ماموں اور دوسرے رشتہ داروں کے ہاں تین مرتبہ
منگنی طے ہوئی مگر بعد میں یہ کہہ کر منگنی توڑ دی گئی کہ لڑکے
نے داڑھی رکھی ہوئی ہے لیکن میں شادی کے بعد بھی صوفیانہ
زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ اب میں کیا کروں...؟

(صوفی محمد حسین سائیں .... جہلم کینٹ)

○ صوفی صاحب! ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب لڑکی
والے آپ سے اپنی لڑکی کی منگنی کرتے ہیں تو کیا اس
وقت ان کو آپ کے رخِ مبارک پر داڑھی نظر نہیں آتی۔
اور اگر آتی ہے تو پھر بعد میں وہ اس داڑھی پر اعتراض کر
کے رشتہ کیوں توڑ دیتے ہیں۔ لگتا ہے بات کچھ اور ہے
سچ سچ بتائیے ناں، کہیں داڑھی میں تنکا تو نہیں آپ کی؟
ویسے آپ شادی کی خاطر سنتِ نبوی علیہ السلام ترک نہ کریں۔
بلکہ آپ جواب عرض کے کالم "یہی ہے آرزو میری" میں
شادی کا اشتہار دیں۔ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے
وہ ان تمام رشتوں سے کوئی بہتر رشتہ پیدا فرمائے گا۔

میں ایک ایسی مصیبت میں مبتلا ہوں جس نے مجھے
زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں ایک
ایسے شخص سے محبت کرتی ہوں جو خصلت کے لحاظ سے فرشتہ
ہے۔ اس کی شادی میری سگی بہن سے ہوئی مگر ہم ایک ہی
گھر میں رہتے تھے۔ ہم صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی دل
کی پیاس بجھاتے رہتے۔ مگر میری بہن کو کچھ پر شک سا ہو گیا
اور میں دوسرے مکان میں شفٹ ہو گئی۔ مگر اب میرا یہ حال
ہے کہ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو سکون۔ رو رو کر میری
آنکھیں بھی ناسور بن گئی ہیں۔ بھوک نہیں لگتی، نیند نہیں
آتی۔ سر میں ہر وقت درد رہتا ہے۔ تلاوت کرتی ہوں، تو
ہر ورق پہ اسی کا چہرہ نظر آتا ہے۔ نماز پڑھتی ہوں تو وہ
ذہن پر چھا جاتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے زیادتی کرے تب بھی
مجھے اس سے نفرت نہیں ہوتی۔ اگرچہ محبت کا لفظ بہت ہی
چھوٹا ہے مگر یہ سمندر بہت زیادہ گہرا ہے، جی چاہتا
ہے اس میں ڈوب جاؤں، آپ بتائیں اب کیا کروں؟

(کوسی قریشی .... گوجرہ شریف)

○ بی بی! اس طرح محبت کے سمندر میں ڈوبنے کی کیا ضرورت
ہے۔ بہن کا گھر اجاڑنے سے بہتر ہے کہ آپ اپنی محبت
نا خود غرضی کا گلا دبا دیں، اپنی چاہت کی خاطر سگی بہن کا
بیڑہ غرق کرنا کہاں کی محبت ہے؟ آپ خلوصِ دل سے نماز
پنجگانہ ادا کیا کریں کہ نماز ایک ایسی عبادت ہے جس سے
بڑی سے بڑی پریشانی پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے تو اس نئے کالم کے آغاز پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ اور اسے مزید نکھاریں۔

میں ایران میں تھا کہ مجھ سے بڑے دو بھائیوں کی شادیاں گھر والوں نے کر دیں۔ میں دسمبر ۷۹ء میں ایک ماہ کی چھٹی پر پاکستان آیا تو واپس نہ جا سکا۔ کہ ایران کے حالات خراب ہو گئے تھے اور میں اپنے والد صاحب کے ساتھ اپنی دکان پر کام کرنے لگ گیا۔ اس کے بعد ان مجھ سے بڑے بھائی پر فالج کا حملہ ہوا اور ہماری کوششوں کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔ ابھی ہم یہ صدمہ بھول نہ پائے تھے کہ سات ماہ بعد ہی سب سے بڑے بھائی بھی چند روز بیمار رہ کر شہر خموشاں میں اپنے بھائی سے جا ملے۔ اس وقت جو ہم گھر والوں پر گزری وہ صرف ہم ہی جانتے ہیں۔ اب ہم تین بھائی ہیں دوسرے دونوں مجھ سے چھوٹے ہیں۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ میرے والدین مجھے سب سے بڑے بھائی کی بیوہ سے نکاح کرنے پر مجبور کر رہے ہیں، جبکہ میں بچپن ہی سے اپنے ماموں کی لڑکی سے پیار کرتا ہوں، ہم دونوں نے ایک ساتھ جینے مرنے کے وعدے کیے ہوئے ہیں اور اگر ہم ایک دوسرے کو نہ مل سکے تو شاید زندہ نہ رہ سکیں اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟

(ایم جی طاہر، محمد پورہ روڈ جیجہ وطنی ساہیوال)

○ محترم: ہمارا تو مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے دل کو تالا لگائیں، دماغ سے فیصلہ کریں اور اپنے بھائی کی بیوہ سے نکاح کر لیں۔ یہ کوئی برا فعل نہیں ہے بلکہ ہمارے آقا و مولا پیارے نبی حضور علیہ السلام کی سنت بھی ہے کہ انہوں نے بھی اپنی سب سے پہلی شادی ایک بیوہ ہی سے کی تھی۔ اور پھر اس طرح آپ کے خاندان پر گرنے والی بجلیوں کے اثرات میں خاصی کمی ہو سکے گی۔ اپنی محبوبہ کو بھی سمجھائیں! محبت اسی کا نام ہے کہ بندہ قربان ہو جائے۔ یقین کریں کہ آپ اپنے والدین کو انکار کر کے زندگی بھر چین نہ پا سکیں گے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے والدین کے صدموں میں مزید اضافہ ہو۔ اور وہ زندہ درگور ہو جائیں۔ اگر نہیں تو ان کی بات مان لیں اور صدق دل سے اپنی بھابی سے نکاح کر لیں۔ اور محبوبہ کو بے شک عمر بھر کے لیے پیار کرتے رہیں مگر اپنے دل ہی دل میں۔ بیوی کو اس کے جائز حقوق اور محبت سے ہرگز محروم نہ کریں۔ ورنہ آپ کی قربانی رائیگاں جائے گی۔ ویسے بھی یہ مرنے والی باتیں خواب اور کتابوں تک ہی محدود ہوتی ہیں۔ آپ اپنی بھابی سے شادی کر کے دیکھ لیں، سال دو سال بعد آپ کی محبوبہ کسی اور کی بیوی کے روپ میں آپ سے ملے گی اور اس کے بچے آپ کو ماموں ماموں کہہ کر آپ کے کندھوں پر چڑھ چڑھ جائیں گے آپ آزما کر دیکھ لیں ۔ ۔ ۔ ۔

یہ کالم شروع کرنے پر مبارک باد قبول فرمائیے۔ میں بھی اپنا ایک الجھن لے کر اس بزم میں شریک ہو رہا ہوں۔

آج سے تقریباً چار سال قبل میری چھوٹی بہن کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے بعد میں اکثر اپنی بہن کی سسرال جاتا تھا۔ میرے بہنوئی کی ایک بہن تھی جو کہ میری ہم عمر تھی میں جب بھی جاتا تو اس سے مذاق وغیرہ کرتا رہتا۔ اسی مذاق کے دوران مجھے اس سے اور اس کو مجھ سے "وہ" ہو گئی۔ ہم دونوں چوری چھپے گھر سے باہر بھی ایک دوسرے سے ملتے گئے۔ اور پیار کی راہوں پر آگے ہی آگے بڑھتے رہے۔ پھر اچانک وقت نے کروٹ لی اور میرے بہنوئی کو شراب جیسی بری شے کی لت پڑ گئی۔ اور میری بہن کو اس نے طلاق دے دی۔ لیکن ہم پھر بھی گھر سے باہر برابر ملتے رہے۔ مگر وہ اب ہر بار یہی کہتی کہ ہمارے ملنے کا اب کیا فائدہ، جبکہ ہم ایک دوسرے کو پا نہیں سکتے۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ مجھے یہاں سعودیہ میں آئے ایک سال ہو گیا ہے مگر اس کے خط اب بھی برابر آتے ہیں۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں، جو ہو نہیں سکتی۔ بتائیں میں اب کیا کروں؟

(ج۔ ج۔ ک، الصقار سعودی عرب)

○ آپ دونوں بڑے شوق سے چوری چھپے "لو میرج" کر لیں، لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ کل کو کسی بات پر طیش میں آ کر آپ اپنی بیوی کو طلاق یا علیحدگی کی سزا نہیں دیں گے، اپنی بہن کا بدلہ لینے کے لیے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ کیونکہ دو چار بچوں کی پیدائش کے

جواب ہے۔ یہ عشق کا بخار اتر جائے گا اور ہر طرف آپ کو ابھی بیزار کی بجائے "فطرت ہی فطرت" دکھائی دے گی۔
نجم کا فت صاحب! اس وقت آپ کی بیوی لاکھ سر پیٹے مگر آپ اپنے بہنوئی والی حرکت ضرور کریں گے۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ اس فعل سے توبہ کر لیں اور اس بات سے قدرے ہٹا ہیں...

آپ نے یہ کالم شروع کر کے ہم قارئین کی ایک دلی آرزو پوری کر دی ہے۔ میں بھی اس کالم میں اپنی ایک الجھن سے شریک ہو رہا ہوں...
میں اس وقت حبیب شوگر ملز نواب شاہ میں بحیثیت فیلڈ کلرک کام کر رہا ہوں مگر میری یہ ڈیوٹی چوبیس گھنٹے کی ہے جبکہ میں ساتھ ہی ساتھ حبیب انسٹیٹیوٹ نواب شاہ میں کیمیکل سیکنڈ سمسٹر میں تعلیم حاصل کر رہا ہوں مگر اپنی طویل ڈیوٹی کی وجہ سے کالج نہیں جا سکتا جس کی وجہ سے میری تعلیم متاثر ہو رہی ہے۔ نوکری میں نہیں چھوڑ سکتا کہ اس کے علاوہ کوئی ذریعۂ معاش نہیں ہے۔ اب میرے امتحان نزدیک ہیں اور میں بہت پریشان ہوں۔
آپ بتائیں اب میں کیا کروں؟
(سید حسنین ظفر سعید، گوٹھ یار۔ نواب شاہ۔ (سندھ)
○ شاہ جی: امتحان کے دنوں میں ملز سے چند چھٹیاں لے لیں، مگر امتحان ضرور دیں کہ اسی میں آپ کا مستقبل پوشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس آپ کی الجھن کا کوئی حل نہیں ہے اور جب تک کوئی دوسری نوکری نہ ملے موجودہ نوکری ہرگز ہرگز نہ چھوڑیئے گا۔

میں جوابِ عرض کا شیدائی ہوں۔ میری عمر ۱۸ سال ہے۔ چھ ماہ سے یہاں دوحہ قطر میں ملازمت کر رہا ہوں۔ ہماری کمپنی میں ایک انڈیا والا فورمین ہے، جو میرے ساتھ بہت ہی زیادہ محبت کرتا ہے۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلا کر کہا کہ ان کے گھر میں چند ضروری کاغذات ہیں، وہ میں جا کر لے آؤں۔ جب میں نے ان کے مکان پر جا کر بیل دی تو ایک بہت ہی حسین لڑکی دروازے میرے جانکی۔ اور مجھ سے پوچھا کیا کام ہے؟ تو میں نے کہا کہ فورمین صاحب فلاں کاغذات مانگ رہے ہیں۔ وہ اندر جا کر کاغذات لے آئی۔ کاغذات مجھے دیتے ہوئے ہماری آنکھیں چار ہوئیں اور ہم دیکھتے رہ گئے۔ اس کے بعد ہمارا ان کے ہاں آنا جانا ہو گیا اور ہمارے درمیان چار ملاقاتوں کا اضافہ ہوا جسے دنیا والے محبت کہتے ہیں۔ جبکہ وہ لڑکی کرسچین ہے اور میں مسلم، میں نہ تو اس کے ساتھ شادی کر سکتا ہوں اور نہ اسے چھوڑ سکتا ہوں۔ کہ ہمارے درمیان مذہب کا مسئلہ ہے۔ شادی کے متعلق میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ عجیب الجھن میں مبتلا ہوں۔ آپ ہی بتائیں اب میں کیا کروں؟
(ایم اسرائیل صارم، دوحہ قطر)
○ اسرائیل میاں! بہتر یہ ہے کہ اپنے فورمین آفیسر کے ساتھ کسی ذریعے سے کھل کر بات کریں اور اگر ان کو منظور ہو تو شادی کر لیں، کیونکہ اہل کتاب سے شادی کرنا جائز ہے۔ ورنہ اپنی محبت کو اپنے دل میں دفن کر لیں۔ دوسری صورت میں اگر ان صاحب کو آپ کی اس حرکت کا علم ہو گیا تو یقین کرو میاں اسرائیل! وہ لڑکی ان کی ساری تباہی کا بدلہ آپ ہی سے لیں گے، لیجئے کیا خیال ہے آپ کا؟

اگر کوئی انسان اچھا یا بُرا کام کرتا ہے تو کسی دوسرے کو اس سے کیا غرض ہوتی ہے۔ ہم نے جب سے جوابِ عرض پڑھنا شروع کیا ہے ہمارے محلے کے دوست ہمیں بہت ہی تنگ کرتے ہیں، جب کبھی ہمیں قلمی دوستی کے سلسلے میں خطوط ملتے ہیں یا ہمارا کوئی قلمی دوست ہم سے ملنے کے لیے آ جائے تو یہ ہمیں بہت ہی پریشان کرتے ہیں اور ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ لوگ قلمی دوستی کو بہت ہی بُرا اور گناہ کے برابر سمجھتے ہیں، کیا یہ واقعی بُری چیز ہے ہم تو بہت پریشان ہیں۔ اب کیا کریں؟
(ایم سعید انور، ملک ٹیلرز۔ ناظم آباد۔ لاہور)
○ برادرم! محلے کی فضا خراب ہو۔ ان سے قلمی دوستی واقعی بُری شے ہے لیکن اچھے اور با اخلاق لوگوں سے

فلمی ساتھیوں سے رابطہ رکھنا کوئی بُرا مشغلہ نہیں۔ آپ محلے والوں کی پرواہ نہ کریں۔ دوست تو خدا کی نعمت ہوتے ہیں... بشرطیکہ دوست خدا کی رضا کے لیے بنائے جائیں۔ آپ اپنے شغل میں مشغول رہیں...

آپ نے یہ ایک نہایت ہی مفید کالم شروع کیا ہے میرے جیسے آدمی جو اندر ہی اندر سلگتے ہیں مگر اپنی زبان سے اپنا دکھ کسی کو بتا نہیں سکتے اس کالم کے ذریعہ اپنا دکھ بیان کر سکتے ہیں۔ تو میرا دکھ یہ ہے:

چار سال پہلے میں بذریعہ ہوائی جہاز مسقط سے کراچی جا رہا تھا۔ میں ایک لاش سے گزر جا رہا تھا۔ میں نے جہاز کی ایک ہوائی پری سے بات کی تو اس نے ذرا سختی سے جواب دیا۔ میں نے اس کی شکایت متعلقہ پائیلٹ سے کی تو اس نے ان محترمہ کو ڈانٹ پلائی جس کا صلہ مجھے اس ظالم نے اس طرح دیا کہ میرے ساتھ فوراً بے تکلف ہوگئی۔ میرا دھندہ روس کچھ ایسا ہے کہ میں اکثر پاکستان آتا جاتا رہتا ہوں۔ لہٰذا اسی ہوائی پری سے ملاقات ہوتی رہی۔ یہاں تک ہم نے اپنے ماں باپ کی رضامندی کے بغیر ہی کراچی میں شادی کر لی۔ مگر شادی کے دوسرے روز ہی اس نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اور میں اسی تذبذب میں واپس مسقط ڈیوٹی پر آ گیا ہوں۔

اب میں اندر ہی اندر جل رہا ہوں، کبھی سوچتا ہوں کہ خواہ مخواہ والدین کی ناراضگی بھی مول لی اور ملا بھی کچھ نہیں۔ ابھی میں اس کا سامنا کرنے سے کترا رہا ہوں حالانکہ مجھے اس کے درجنوں خط مل چکے ہیں، جن میں وہ مجھے کسی طرح سے شرمندہ کر رہی ہے، کبھی کہتی ہے " دیکھ لیا ڈانٹ کا نتیجہ وغیرہ وغیرہ۔ اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں، طلاق یا.. ؟

(محمد زمرد، روح آف عمان)

○ میاں جی! اسے فوری طلاق دیں اور " لوٹ کے بدھو گھر کو آئے " گاتے ہوئے گھر کو جائیں۔ یہ ہوائی پری " ہوائی شئے " بن کر آپ کو چٹکیوں میں اڑا کر رکھ دے گی... بچیں اس سے... اللہ نے موقع دیا ہے تو فائدہ اٹھائیں۔ اس نے تو محض آپ سے بدلہ لینے کے لیے آپ کو سبز باغ دکھایا تھا اور " ہنی مون " کے وقت بھاگ لی۔ اب بھی وقت ہے بات کو سمجھیں اور " باسٹھ تریسٹھ " تک گنتی یاد کریں۔

میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ امی اور والدین میری شادی کرنے پر اصرار کر رہے ہیں، دراصل میری یہ خواہش ہے کہ پہلے مجھے کوئی ملازمت مل جائے تو پھر شادی کے بارے میں بھی کچھ ہو سکتا ہے، ورنہ زندگی مشکل ہو جائے گی۔ مزید یہ پریشانی کھائے جا رہی ہے کہ میری عمر زیادہ ہوتی جا رہی ہے۔ سوچتا ہوں کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ آپ ہی اب بتائیں...

(محمد رفیق، چوک بہاولپور۔ رحیم یار خان)

○ برادرم! شادی سے پہلے ملازمت بے حد ضروری ہے اگر پہلے شادی ہوگئی تو زندگی بھر ملازمت کے لیے وقت نہیں ملے گا۔ پیدل چل چل کے کمزوری ہی اتنی ہو جائے گی کہ کام نہیں کر سکیں گے اس لیے بہتر ہے پہلے ملازمت تلاش کریں، شادی کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے...

میں رات کو سوتے میں بہت ہی خوفناک اور ڈراؤنے خواب دیکھتا ہوں، خواب میں کالے سانپ، بلائیں اور جن ہوتے ہیں۔ جنہیں دیکھ کر میں چیخیں مارتا ہوں مگر میری آواز نہیں نکل پاتی۔ بتائیے میں کیا کروں۔

(فرح ناز... نواب شاہ)

○ رات کو کھانا پیٹ بھر کر نہ کھایا کریں ورنہ ایسے ہی خواب آئیں گے۔ نماز پنجگانہ ادا کیا کریں۔ رات کو سوتے وقت آیۃ الکرسی پڑھ کر خود پر پھونک مارا کریں۔ اور سوتے وقت ہی اپنی شہادت کی انگلی سے اپنے سینے پر " یا حفیظ " لکھ لیا کریں۔ ان شاء اللہ سب بلائیں دور ہو جائیں گی۔ مگر اس کے لیے استقامت بہت ضروری ہے۔

ایک دوست جس کی عمر ۴۰ سال ہے اس کے والدین نے اس کی شادی ۱۶ سال کی عمر میں ۲۹ سالہ عورت سے کر دی تھی اور ابھی تک اولاد جیسی نعمت سے محروم ہے، جبکہ میرے دوست کے ساتھ ایک ۱۸ سالہ لڑکی پیار کرنے لگی ہے میرے دوست نے اس لڑکی سے شادی کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ وہ لڑکی میرے دوست کے لیے سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہے۔ اس کی پہلی بیوی کو اس کی محبت کی خبر ہو گئی ہے وہ اب کبھی خودکشی کرنے لگ جاتی ہے اور کبھی طلاق مانگتی ہے گھر میں ہر وقت جھگڑا رہتا ہے۔ کیا میرا دوست اولاد کی خاطر اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر اپنی گرل فرینڈ سے شادی کر لے۔ اگر لڑکی کے والدین نے انکار کیا تو لڑکی گھر سے فرار ہونے کو تیار ہے۔ آپ ہی بتائیں میرا دوست اب کیا کرے۔

(ایم مقبول بیگ ساقی ... سکھ دال)

○ پہلی بیوی کو صرف اس لیے طلاق دے دینا کہ اس سے اولاد نہیں ہو رہی، یا وہ زیادہ عمر کی ہے، یہ سراسر ناانصافی اور ظلم ہے۔ آپ کو علم ہونا چاہیے کہ ہمارے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی جب پہلی شادی ہوئی تو آپ کی عمر ۲۵ سال اور آپ کی بیوی کی عمر ۴۰ سال تھی۔ اور پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ دوسری "گرل فرینڈ" سے اولاد ہو ہی جائے گی۔ اگر نقص آپ کے دوست میں ہی نکلا تو...؟ یہ بھی ذہن میں رہے کہ جو مرد کسی شادی شدہ مرد کے ساتھ گھر سے بھاگنے کو تیار ہے شادی کے بعد کسی کنوارے کے ساتھ بھاگ گئی تو پھر؟ پھر آپ کا دوست کیا کرے گا۔ یہ بھی یاد رہے کہ جو انسان کسی دوسرے کی عزت سے کھیلتا ہے اس کی اپنی عزت بھی محفوظ نہیں رہتی۔ اس لیے پہلی بیوی کے ساتھ ہی گزارہ کرنا مناسب ہے!

مجھے زندگی بھر ماں کی ممتا، بہن کی محبت اور باپ کی شفقت نہیں ملی، جو بھی مجھے ملتا ہے ہمدردیاں کر کے لوٹ لیتا ہے۔ اور پھر میں تنہا رہ جاتا ہوں کہ میرا اس بھری دنیا میں کوئی بھی نہیں۔ مجھے کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہیں۔ میں شادی بھی کرنا چاہتا ہوں اور یہ بھی میری

خواہش ہے کہ میں ایک ماں کے بازوؤں میں دم توڑ دوں اب آپ ہی بتائیں کیا کروں۔

(ایم ایچ یاسین ناشاد ... کراچی)

○ آپ کسی بڑی عمر کی عورت سے شادی کر لیں اور اسے ہی اپنا سب کچھ تصور کر لیں تاکہ بوقت ضرورت وہ آپ کو الٹی سیدھی بات پر "جھڑکی" بھی لگا سکے۔ یہ آپ کا نفسیاتی علاج ہے اسے مذاق نہ سمجھیے کا یہی حل ہے آپ کی الجھن کا۔

کبھی میں بھی زندگی کی حسین شاہراہ پر گامزن تھا مگر اب تو ہر سمت سے اندھیرے ہی میرے منتظر ہیں۔ ہر لمحے پریشان رہتا ہوں۔ ایک وہ وقت تھا کہ میں قرآن پاک حفظ کر رہا تھا مگر آج میں اسے پڑھ بھی نہیں سکتا۔ پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے ادا کرتا تھا مگر اب نماز بھی چھوڑ دیتا ہوں۔ میرا سارا خاندان مذہبی ہے۔ مجھے پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ اگر کبھی نماز پڑھنے بھی جاؤں تو میرے دل پر گھبراہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ اور نماز کے دوران عجیب و غریب خیالات آتے ہیں۔ آپ ہی بتائیں میں اب کیا کروں!

(محمد علی کھوکھر شاہد، فرنیچر مارکیٹ گجرات شہر)

○ برادرم! یہ صرف شیطان ہی ہوتا ہے جو انسان کو نماز میں پریشان کرتا ہے۔ آپ خدا کے حضور باقاعدگی سے پانچ وقت حاضری دیتے ہیں۔ شیطان اللہ کے نیک بندوں کو ہی ڈسٹرب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی عبادت کو ضرور شرف قبولیت بخشے گا۔ ویسے ایک بات ہے آپ کو جس ہستی نے برباد کیا ہے اس سے بدلہ لینے کے بجائے اسے خلوص دل سے معاف کر کے اس کا خیال دل سے نکال کر پھر خدا کے حضور سجدہ ریز ہوں تو یقیناً آپ کا دل خدا کی عبادت میں لگے گا۔ اس لیے کہ دل خدا کا گھر ہے اس گھر میں صرف خدا کو ہی بسانا چاہیے!

میں عربی مدرسہ میں زیر تعلیم ہوں۔ عرصہ چار سال سے میرا دماغ درس میں حاضر نہیں رہتا۔ جب بھی درس

جواب۔ حق لاہور

میں بیٹھتا ہوں تو ذہن کہیں اور گھومنے لگتا ہے، جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ آپ ہی کچھ بتائیں کہ میں اب کیا کروں۔ ؟

(ابو عاصم یوسفی برکی کالونی لانڈھی۔ کراچی)

○ آپ نے یہ تو لکھا ہی نہیں کہ آپ کا دماغ گھومنے کے لیے جاتا کہاں ہے؟ جب جگہ کا ہی علم نہیں تو ہم حل کیا بتائیں۔۔۔ "ہر رنگ مسئلے" کا حل بھی ہر رنگ ہوتا ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ آپ قرآن پاک کے یہ الفاظ۔۔۔ "رَبِّ زِدْنِی عِلْمًا"۔۔۔ اٹھتے بیٹھتے کثرت کے ساتھ پڑھا کریں۔۔

میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا تو ایک آدمی سے دوستی ہو گئی۔ چند سال بعد اس کی شادی ہو گئی۔ میں ان کے گھر آتا جاتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد اس کی بیوی میرے بارے میں کچھ اور ہی سوچنے لگی، جس میں اسے میں نے کامیاب نہ ہونے دیا۔ لہٰذا اس نے مجھے گھر آنے سے منع کر دیا کہ اگر تم میرا کہا نہیں مانو گے تو میں تم پر الزام لگا کر تمہارے دوست سے ہی تمہیں قتل کرا دوں گی۔ میں نے ان کے ہاں آنا چھوڑ دیا۔ میرا دوست جب بھی مجھے ملتا ہے تو مجھے گھر چلنے کے لیے اصرار کرتا ہے مگر میں اسے کیا بتاؤں۔ آپ ہی بتائیے میں اب کیا کروں؟

(پرویز ۔۔۔۔۔ آزاد کشمیر)

○ آپ نے غلطی کی کہ دوستی نبھاتے رہے۔ دوست وہ ہوتا ہے جو دوست کی مصیبت میں کام آئے۔ کیا یہ بہتر نہ تھا کہ آپ بھی اس آڑے وقت میں ان کے کام آتے تاکہ دوستی بھی برقرار رہتی۔ ذرا سوچئے کیا آپ حقیقی دوست ہیں۔۔۔؟

میں ایک عجیب پریشانی میں مبتلا ہوں۔ خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یا پھر ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں کوئی نہ ہو۔ مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔ میرے گھر والے جب بات کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ لوگ مجھ پر طنز کر رہے ہیں۔ سکون چاہتی ہوں جو کسی صورت نہیں ملتا۔ نماز بھی پابندی سے پڑھتی ہوں۔ لگتا ہے مجھ سے ہر کوئی نفرت کرتا ہے۔ یہ سب شاید اس لیے محسوس کرتی ہوں کہ میرے ساتھ ایک ٹریجڈی ہو چکی ہے۔ حالانکہ یہ بات اب پرانی ہو چکی ہے۔ جو دکھ تکلیف طعنے سننے تھے وہ سن چکی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ ہر وقت روتی رہوں۔ میں تعلیم کی وجہ سے ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ وہاں بھی گھٹن محسوس ہوتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟

(زینت سولنگی ۔۔۔۔ تھارو شاہ)

○ محترمہ! یہ خواہ مخواہ "مجنوں" بننے والی بات ہے جو آپ نے خود پر یاسیت طاری کر رکھی ہے، غلطی کس سے نہیں ہوتی جو ہو گیا ہے اسے بھول جائیں اور زندگی کو زندہ دلی سے گزاریں۔ یوں ڈھل ڈھل کر جینے سے تو بہتر تھا کہ آپ کی خودکشی کی کوشش ہی کامیاب ہو جاتی۔ بہرحال، اب بھی وقت ہے زندگی کو بھرپور طریقے سے گزاریں۔ یا پھر دوسری مرتبہ کوشش کر دیکھیں مگر اس بار ناکام نہ ہو جائیے گا۔۔۔

میری عمر تیس سال ہے، خدا کے فضل سے صحت مند ہوں۔ مگر میں بیس سال کی عمر سے ہی اپنے آپ کو بوڑھا سا تصور کرتا ہوں۔ نہ لباس کا شوق نہ تفریح کی تمنا۔ نہ کھانے پینے کی کوئی خواہش ہوتی ہے۔ ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی ہے جہاں دس بچوں جیسی تربیت میں رہی بے توجہی کا شکار رہا۔ حسرت رہی کہ کوئی مجھے پیار سے بلا کر میرے دل کا درد سنے۔ ہر معاملے میں مورد الزام ٹھہرایا یا تنقید کا نشانہ بنایا۔ حالانکہ آج تک میری ذات سے میرے والدین یا کسی بہن بھائی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔۔۔ مجھے غیروں سے بہت پیار ملا، بے حد پیار ملا، لیکن میں ترستا رہا ہوں اپنوں کی محبت کے لیے۔ کیا ایک ہی کوکھ سے جنم لینے والے، ایک ہی گود میں پرورش پانے والے بچوں میں فرق بھی ہوتا ہے؟ کیا ماں کا پیار سارے بچوں کے لیے ایک جیسا نہیں ہوتا۔ میں احساس کمتری کا شکار ہو چکا ہوں۔ بتائیں میں اب کیا کروں؟

(ایم ایاس راحی پی او بکس ۸۳۶ مسقط عمان)

○ راحی بھائی! یہ زندگی ایسے ہی نشیب و فراز کا نام ہے۔ ماں کا پیار سب بچوں کے لیے برابر ہوتا ہے۔ اگر آپ کے حصے میں کم آیا ہے تو یہ قسمت کی بات ہے۔ در گزر کیجئے اور یہ سوچیں کہ جو پیار آپ کو سکوں سے نہیں ملا وہ غیروں نے دیا اور وہ بڑے ہی قسمت والے ہوتے ہیں جن کو غیروں کا پیار ملا کرتا ہے آپ نہ تو بد قسمت ہیں اور نہ ہی محروم تھا۔ خوش رہیں اور والدین کی خدمت کرتے رہیں ایک دن آئے گا کہ وہ اپنی کوتاہی کو محسوس کریں گے اور آپ کو سینے سے لگا لیں گے۔ اس دن کے انتظار میں خود کو احساس کمتری کا شکار نہ بنائیں۔ صرف خدا وند تعالیٰ کی رحمت پر بھروسہ رکھیں، اور کوئی خدمت ۔ ۔ ۔ !

آج سے پانچ سال پہلے ایک لڑکی نے مجھے خط لکھا اس وقت میری عمر ۱۸ سال تھی۔ اس لیے میں ایسے ہی اس کی طرف جھکتا چلا گیا اور ہم نے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں۔ پھر میں سعودیہ آ گیا۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ اس لڑکی کے گھر والے اس کی کہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں مگر وہ ٹال مٹول کر رہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میں مر جاؤں گی لیکن کسی اور جگہ شادی نہیں کروں گی۔

ادھر میری پریشانی یہ ہے کہ میرے گھر والے میری شادی اپنے رشتہ داروں میں کہیں کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا ذکر گھر والوں نے مجھ سے کیا ہے۔ مگر اب میری اتنی ہمت نہیں پڑ رہی کہ گھر والوں سے کہہ سکوں کہ میں تو فلاں لڑکی سے پیار کرتا ہوں۔ اسی وجہ سے میں تین سال سے پاکستان نہیں جا سکا۔ کہ لڑکی کو کیا جواب دوں گا اور والدین سے کیا کہوں، آپ بتائیں میں اب کیا کروں؟

(طارق جاوید ۔ ۔ ۔ ۔ سعودی عرب)

○ آپ اپنا نام "معصوم" رکھ لیں۔ جب اس بے چاری کے ساتھ "دھرو" کرنا تھا تو آپ صرف اٹھارہ برس کے معصوم بچے تھے اور اب جب والدین نے دوسری لڑکی منتخب کرنے کا پروگرام بنایا ہے تو آپ کی قوتِ مردانگی ختم ہو گئی ہے اور آپ کی ہمت نہیں پڑتی کہ والدین سے بات کر سکیں۔ خدا کا خوف کریں اور اس بے چاری کی زندگی برباد نہ کریں اور اسی سے شادی کریں، ورنہ کسی بے گناہ کی بد دعائیں سچ مچ آپ کو گولیاں کھانے پر مجبور کر دیں گی۔

میں پنجاب کے شہر لاہور کا رہنے والا ہوں۔ مجھے یہاں پر ایک کرسچین لڑکی سے محبت ہو گئی ہے اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں نے اسے کئی دفعہ کہا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائے تو ہم شادی کر لیں، لیکن وہ اپنا مذہب چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اب میں بہت ہی پریشان ہوں۔ کیونکہ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بتائیں میں اب کیا کروں۔

(سید نذر عباسی اسٹیل ملز ۔ کراچی)

○ سید نذر صاحب! یہ آپ نے کیا چکر چلا رکھا ہے۔ ایک آپ ہیں کہ ایک غیر مسلم لڑکی کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ اور ایک وہ ہے کہ جسے اپنے مذہب کے ساتھ اتنا پیار اور لگاؤ ہے کہ وہ آپ کی محبت کو خاطر میں نہیں لا رہی۔ اس سے عبرت حاصل کریں کہ میاں آپ کے لیے فائدہ مند ہے۔ ایک لڑکی کے لیے مذہب کو لیول ۔ ۔ ۔ ایکسپلائٹ کرنے سے تو یہ بہتر ہے کہ آپ اپنا پیشہ بدل لیں۔ پھر آپ کو کوئی الجھن نہیں رہے گی۔ شادی بھی ہو جائے گی اور روزگار کا مسئلہ بھی مستقل طور پر حل ہو جائے گا۔ اور ہاں شادی سے پہلے ایکس خرید استعمال کرا لیجئے گا اسے، ورنہ "جیج" واپس چلی جائے گی۔

میرا ایک دوست ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ جبکہ لڑکی بھی اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔ ان دونوں نے ایک سنگ جینے مرنے کی قسمیں کھا رکھی تھیں۔ مگر ابھی حال ہی میں لڑکی کے گھر والوں نے اس کی منگنی کسی اور جگہ کر دی ہے۔ جس کی وجہ سے میرا دوست بہت ہی پریشان ہے۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتا۔ آپ ہی بتائیں اب وہ کیا کرے؟

(ایلہ شاہ گیلانی، چک ۴۶ شمالی۔ سرگودھا)

○ انتظار... انتظار... اور صرف انتظار کرنا چاہیے۔ اس وقت کا جب آپ کا دوست ایک گول مٹول چاند سے بچے کا ماموں بنے گا۔ جیسے کھلاتے کھلاتے آپ کا دوست کبھی نہیں تھکے گا۔

میں ایک عرصے سے ایک پریشانی میں مبتلا ہوں۔ ہم میاں بیوی آپس میں ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ مگر اب مجھے اپنی بیوی سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اس بات سے کہ ایک روز میں اپنی بیوی کو اس کے میکے سے لے کر گھر آ رہا تھا۔ ہم گاڑی میں سوار تھے۔ میری بیوی نے اچانک برقعہ اتار کر سیٹ پہ رکھ دیا۔ میں تھوڑی دیر تو اسے حیران ہو کر دیکھتا رہا اور اندر ہی اندر غصے سے لال پیلا ہوتا رہا۔ پھر میں نے برقعہ اٹھا کر اٹیچی میں رکھا اور اسے تالا لگا دیا۔ جب میری بیوی نے میرا غصہ دیکھا تو مجھ سے چابی مانگیں تاکہ برقعہ نکال کر اوڑھ لے۔ مگر میں نے غصے میں آ کر چابیاں چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیں۔ اور دھمکی دی کہ اگر اب اس نے برقعہ مانگا تو وہ اس کو بھی اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دے گا۔ جس پہ میری بیوی بولی کہ میں نے بھی کونسی چوڑیاں پہن رکھی ہیں۔ بس اس کی یہی بات میرے لیے نفرت کا سبب بنی ہے۔ اب آپ بتائیے میں کیا کروں؟

(ایم اے منوری... صادق آباد)

○ منوری صاحب! بیوی نے برقعہ اتار کر ایک غلطی کی اور آپ نے اسے مستقل طور پر بے پردہ کر کے دوسری حماقت فرمائی۔ ایسی چھوٹی موٹی باتوں پر غصہ کرنے کے بجائے پیار سے سمجھا دیا کرتے ہیں۔ اگر غصے میں آ کر وہ کچھ اور کر بیٹھتی تو...؟ عقل کو ہاتھ ماریں بھائی۔ بیوی کو پیار سے سمجھائیے اور یہ نفرت دفرت کو بھول کر پیار و محبت سے نئے سال کے کیلنڈر کا انتظار کریں۔

میں ایک لڑکی سے بے پناہ پیار کرتا ہوں آج سے دو سال پہلے وہ بھی میرے ساتھ بہت محبت کرتی تھی مگر کسی گھریلو مجبوری کی بنا پر ہمارے درمیان ناچاقی پیدا ہو گئی۔ بعد میں اس سے میں نے صلح کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ مانتی ہی نہیں۔ میری زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے۔ اگر وہ خود یہ کالم پڑھے تو میری صداقت کا یقین کر کے میرے ساتھ صلح کرے۔ ورنہ آپ بتائیے میں اب کیا کروں؟

(لیاقت علی شہزاد۔ بستی سوڈھا)

○ میاں شہزاد صاحب! اس نے پیار کی ڈیلر سے آپ کے ساتھ محبت کرنے کے "دو سالہ معاہدے" پہ ہی دستخط کیے تھے۔ اس کے بعد اس نے آپ کے دل کا مکان خالی کر دیا۔ آپ کو تو شکر کرنا چاہیے ورنہ تو آج کل مکان خالی کرانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ اتنے جذباتی ہو کر خودکشی کرنے کی دھمکی دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو گا... رہی صلح کی بات تو آپ کا مسئلہ بڑا الجھا ہوا ہے... اس کے لیے آپ ایل۔ ایل۔ بی سے رجوع فرمائیں۔

میں اور شاہد ایک ساتھ پل بڑھ کر جوان ہوئے میٹرک تک تعلیم بھی ایک ساتھ حاصل کی۔ شاہد میرا کزن ہے۔ شاہد کی والدہ میرا رشتہ لینے ہمارے گھر آئیں تو میرے باپ نے کہا کہ ہم سوچ کر بتائیں گے۔ پھر والد صاحب دوسرے دن شاہد سے ملے اور اس سے تین ہزار روپے قرض لیے، جو شاہد نے کسی دوست سے لے کر دیئے۔ جب وہ دوبارہ رشتہ لینے کے لیے آئے تو والد صاحب نے کہا کہ اتنی رقم حق مہر پر لکھیں تو رشتہ دوں گا۔ جب اس بات کا علم شاہد کو ہوا تو اس نے شادی سے انکار کر دیا۔ آپ ہی بتائیں اب میں کیا کروں؟

(شازیہ کنول، دریا خان۔ ضلع بھکر)

○ بی بی آپ صرف یہ کریں کہ آپ کے پاپا جانی نے شاہد سے جو تین ہزار روپے قرض لیے ہیں ان کی واپسی کا انتظام کریں ورنہ وہ اداکار "شاہد" بننے میں دیر نہیں لگائے گا۔ اور اداکار شاہد کو تو آپ جانتی ہی ہیں کہ کتنا معصوم، بھولا بھالا لڑکیوں سے شرمانے والا اور نیک بچہ ہے... ہے نا؟

پسندیدہ شعر

نگران پسندیدہ شعر، ماہنامہ جواب عرض، ۷ ریٹی گن روڈ۔ لاہور

قارئین! آپ اس کالم میں خوبصورت، معیاری اور مہذب شعر ارسال کر کے حصہ لے سکتے ہیں۔ اپنے شعر کے ساتھ مکمل نام پتہ اور شہر کا نام ضرور درج کریں۔ نیز آپ کے شعر زیادہ سے زیادہ دو عدد ہوں، دو سے زائد شعروں والے خطوط شاملِ اشاعت نہیں کیے جائیں گے۔ (ادارہ)

زیڈ۔ اے ——— سیالکوٹ

یہ درد تم نے دیا ہے تو کوئی بات نہیں

یہی وفا کا صلہ ہے تو کوئی بات نہیں

یہ میرے بس میں کہاں کہ تمہیں میں بھول سکوں

مجھے تو بھول چکا ہے تو کوئی بات نہیں

———

صفیہ تبسم انصاری ——— حیدر آباد

زندگی تجھ سے تو اپنی کوئی قیمت نہ لگی

موت آئے گی تو کر جائے گی مہنگا ہم کو

شاہدہ پروین ——— لیہ کلاں

گل نہ ہوگا تو جشنِ خوشبو کیا ہوگی

جو تو نہ ہوگا جھلی تو عید کیا ہوگی

راجہ ایم شاہد ——— السیاحق

وہی راستوں نے جن پہ کہ منزل تھے ہم دونوں

مجھے روک روک کے پوچھا تیرا ہمسفر کہاں ہے

فیاض دکھی دیوانہ ——— سیالکوٹ

انہوں نے منزل کا پوچھا منزل پہ جا کے

ہمیں چھوڑنے کے لیے کتنے وہ انجانے بن گئے

خالد محمود ——— ددھر

کیا کیا نہ سراب آنکھ میں ہیں

خوشیوں کے جو خواب آنکھ میں ہیں

جس رات میں بچھڑ گئے ہم تم

اس رات کے گلاب آنکھ میں ہیں

———

نسرین خانزادہ ——— ٹھاروشاہ

خود کو محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں

منزلیں چاروں طرف ہیں راستہ کوئی نہیں

کیسے راستوں سے چلے اور کس جگہ پہنچے فراز

یا ہجومِ دوستاں تھا ساتھ یا اب کوئی نہیں

———

سعید ساجد ——— لاہور

جس پر کسی حقدار کا حق ہم سے سوا ہو

ہم ایسی چیز کی حسرت نہیں کرتے

ایم سعید انور ——— لاہور

گو تیری ملاقات کا امکاں بھی نہیں ہے

پھر بھی تیرے ملنے کی ہمیں آس رہے گی!

حبیب احمد زنگیز ——— سردار شہر انڈیا

خوشبوؤں کی منزل ڈھونڈی تو غم کی گرد ملی

چاہت کے نغمے چاہے تو آہیں سرد ملیں

سلیم بیگ ——— منڈی بہاؤالدین

ایسا ٹوٹا ساز کہ گیت ادھورے رہ گئے

ایسا ٹوٹا دل آنسو قطرے قطرے بن کے بہہ گئے

ایم ایم بیگ ساقی ——— ہکڑ وال

بڑے دکھ بڑے ہیں جاناں میری زندگی کے لمحے

اگر ہو سکے تو سننا میری داستاں خدارا

نہ ہی مل سکا ٹھکانا میری بے قراریوں کو

کبھی رو کے رات کاٹی، کبھی رو کے دن گزارا

———

شعر

تنویر جہاں فیض —— محمد نگر

گھٹا سے چاند نکل کر ہمیں جلائے گا
برس برس کے یہ بادل ہمیں رلائے گا
وہ ناز جو نہ رہا مجھ کو روٹھ جانے پہ
کہ منتوں سے میرا ہم سفر منائے گا

ایم اے طاہر —— کراچی

نہیں جو آئے وہ سوچا رقیب جل گئے
بیٹھا جو میں قریب تو گھر میرا ہی راکھ تھا

امام بخش کوثر —— سلیہ

ہائے ویرانیٔ دل ہے سر و سامانیٔ دل
تیرے ارمان بھی پچھتاتے ہیں مہماں ہو کر

رانا محبوب حسین —— سرائے عالمگیر

دل لگی نہ کر اے دوست محبت کے ساتھ
ایسی ہی دل لگی سے بہت چوٹ کھائی ہے

جاوید اقبال شاہد —— اسلام آباد

ہم باوفا تھے اس لیے نظروں سے گر گئے
شاید تجھے تلاش کسی بے وفا کی تھی

شاہد محمود آصف —— سیالکوٹ

میری میت پہ وہ زلفیں کھولے دیوانہ وار آئے
اسے موت کہتے ہیں تو یارب بار بار آئے

سعید اختر —— سیالکوٹ

ٹپک اے شمع آنسو بن کر پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

ایم اسلم کنول —— میلسی

کنول نہیں ہے ان کو وفاؤں کا گرچہ پاس
ہم آج کو وفاؤں کا اک پیکر بتائیں گے

ایم عبدالغفور آفتہ —— الریاض

مجھے اے ہم نشیں! رہنے دے شغل سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا
دکھا دوں گا جہاں کو جو میری آنکھوں نے دیکھا ہے
تجھے بھی صورتِ آئینہ حیراں کر کے چھوڑوں گا

اشرف خان ساقی —— شیخوپورہ

آج غمِ جاناں بہت دلگیر ہوں میں
اک ادھورے خواب کی تعبیر ہوں میں
کل تلک پورے تھے خد و خال میرے
آج بے چہرہ سی اک تصویر ہوں میں

ساجدہ منزل —— راجن پور

قسمت میں جن کو روشنی ملتی نہیں مگر
وہ جاگتے ہیں رات کو تاروں کی آس پر

شیخ ایم عاشق —— بہول

کچھ تم ہی سمجھ لو میرے کرب کا مفہوم
یہ ہنستا ہوا چہرہ زمانے کے لیے ہے

ایم اعظم —— بصیرپور

قاصد پیام شوق کو اتنا نہ کر طویل
فقط ان سے کہنا کہ آنکھیں ترس گئیں

عاصم رشید ساقی —— سیالکوٹ

ہمارے پیشِ نظر منزلیں کچھ اور بھی تھیں
یہ حادثہ ہے کہ ہم تیرے پاس آ پہنچے

شمسہ رانی —— سیالکوٹ

یکتا محبت نہیں، عقیدت ہے
دیارِ دل میں بڑا احترام ہے تیرا

حافظ نصراللہ خاں —— تاجی وال

خون کرتے ہیں ہم اپنا آپ ہاتھ سے
دیکھیے کیا رنگ لاتی ہے جدائی آپ کی

ایم اسلم جاوید —— گوجر بھاٹ

کچھ یاد کر کے آنکھ سے آنسو نکل پڑے
مدت کے بعد جو گزرے اس گلی سے ہم

غلام محمد شاہد —— وادی رکھی

ناحق ہم نے شب کو اپنے دل کے دریچے کھول دیے
زخم ہرے کرنے آتی ہیں یادیں اک ہرجائی کی!
لمحہ بھر کو آنکھ نہ جھپکی اپنے ساتھ ستاروں نے
اور بھی راتیں آہم گزریں، لیکن رات جدائی کی

شعر

قاضی غلام مصطفیٰ ——— لیہ

کچھ رنج تھا مجھے، تھا نہ میں افسردہ ہوا
جب تک غمِ دوراں تیرا سایہ نہ پڑا تھا
کس طرح تغافل کی شکایت رہتی نہ قائم!
وہ چپ تھے اگر میں بھی تو خاموش رہا تھا

تبسم احمد قاصر ——— موسیٰ خیل

محبت نہ کرنا پھولوں سے اے قاصر!
یہ گرم سانسوں سے مرجھا جاتے ہیں

طاہر محمود راہی ——— کوٹ کندہ

آئے تھے مجھ سے ملنے مگر میں نہ جب ملا
وہ میری بے رخی سے ملاقات کر گئے

ایم طارق نوید ——— لاہور

ماضی کی محفلوں کو سجا کر شعور میں
دیتے ہیں زندگی کو سہارا کبھی کبھی

عابد حسین جعفری ——— چشتیاں

میرے دل کی وسعتیں تو بہت تھیں
لوگوں نے ستم ڈھائے تو میں نے سمیٹ لیں

عبدالستار لاشک ——— دندہ شاہ بلاول

اپنے غم کو غم کہتے ہو کیا میرا غم غم نہیں
لے ترازو تول لے اسے تیرے غم سے کبھی کم نہیں

عبدالسلام ساغر ——— مری

جو تم بدلے جہاں بدلا، نظر بدلی زمانے کی
یہ آنسو چار باقی ہیں نشانی ہے دل لگانے کی

ایم سراج عاصی ——— فیصل آباد

نہیں دانستہ محفل میں جو دیکھا ہو تو مجرم ہوں
نظر آخر نظر ہے بے ارادہ اٹھ گئی ہو گی

شاہد اقبال عاصی ——— ساہیوال

ہمیشہ یاد میں ان کی سمائے بیٹھے ہیں
ہم اپنے خود انہیں اپنا بنائے بیٹھے ہیں
ابھی نہ ان سے تکلف نہ کوئی گفت و شنید
نہ جانے کیوں انہیں دل سے لگائے بیٹھے ہیں

ایم ظفر اللہ ضیاء ——— کمالیہ

بھیگ جاتی ہیں جو پلکیں کبھی تنہائی میں!
کانپ اٹھتا ہوں میرا درد کوئی جان نہ لے
یہ بھی ڈرتا ہوں کہ ایسے میں اچانک کوئی
میری آنکھوں میں تجھے دیکھ کے پہچان نہ لے

ایم عبدالغفار رضوی ——— شرقپور شریف

عہدِ وفا میں ہم بہت ناداں تھے
خانۂ دل ایک تھا مہماں بہت تھے!

لیاقت ندیم ——— بہاولپور

اپنا سمجھ کے جس کے لیے ہم ایڑ گئے
کل شام جا رہا تھا وہ اک اجنبی کے ساتھ

سید محسن ندیم ——— مونچھ

تجھ کو پا کے کھو دینا کیا حادثہ ہے
آج اچانک سارے دکھ محسوس ہوئے

ایم اقبال ——— جہلم

ہر خواہش ہی دفن ہو گئی کس سے لگائیں دل
بے شمار زخم سہہ چکا ہے یہ مضطرب دل

خورشید احمد ——— دھوپ کوٹلی

چلتے وقت مسافر کو وطن یاد آیا
کر چکے جب دفن تو یاروں کو کفن یاد آیا

معل دین مجروح ——— پشاور

میرے خوابوں کی شہزادی جہاں تم مسکراتی ہو
بہار کیا خزاؤں میں ہزاروں گل کھلاتی ہو

روبینہ ناز ——— گوجرانوالہ

وہ کیا جان سکیں گے ہمارے دکھ کو
جو خود بھی دکھ سے نا آشنا ہیں روبی

کرامت اللہ شاہد ——— گجرات

اشکوں نے چھین لی، کہیں آہوں نے چھین لی
یوں لٹ گئی ہے قلب کی دولت جگہ جگہ
آنکھوں کا ہے فریب کہ عکسِ جمال ہے!
آتی ہے کیوں نظر تیری صورت جگہ جگہ

شعر

غلام اصغر اعوان ———— ٹیکسلا سیمپد

کوئی لمحہ نہ تیری یاد کا مجھ سے اڑے مجھ کو
اسی خاطر بہت مصروف سا کتابوں میں رہتا ہوں

ثنا حیدر ———— فیصل آباد

اب یہ بھی نہیں کہ نام تو لیتے ہیں
دامن فقط اشکوں سے بھگو لیتے ہیں
اب ہم تیرا نام لے کے روتے بھی نہیں
سنتے ہیں تیرا نام تو رو لیتے ہیں

ایم انور بھٹی ———— ڈسکہ

حسن تیرا اک دن فنا ہو جائے گا
جس پہ تمہیں ناز ہے وہ خاک ہو جائے گا۔

روبی خان ———— ایبٹ آباد

یارب تو چھین لے میری سوچیں میرے خیال
یا مجھ کو زندہ رہنے کی اتنی سزا نہ دے

ایم انور بابر ———— جیدہ

تم غیروں کی بات کرتے ہو ہم نے اپنے بھی آزمائے ہیں
لوگ کانٹوں سے بچ کر چلتے ہیں ہم نے پھولوں سے زخم کھائے ہیں

جمال حنیف ———— لاہور

سوچوں تو جھلس جائے ہر اک یاد کا چہرہ
وحشت میری نس نس میں لہو دھڑک رہی ہے

رضیہ سلطانہ ———— گجرات

بے بس ہیں بے گناہ ہیں مقدر کے سامنے
کھلتی نہیں زباں ستمگر کے سامنے

بشریٰ ذوالفقار بٹ ———— گوجرانوالہ

لوگ برسوں میں جو کرتے نہیں خود ہی سوچ
چند لمحوں میں وہ کر لیتے کا اندازہ کیا ہے

عابد حسین عابد ———— محراب پور

محبت کو کمیں کہتے ہیں!
آسماں کو زمیں کہتے ہیں
کتنے فریبی ہیں زمانے والے
بے حیا کو حسیں کہتے ہیں

ایم نعیم انور ———— راولپنڈی

دل کی دنیا برباد ہوئی
الفت کے سہارے لوٹ گئے
ہم جن کی خاطر جیتے تھے
افسوس کہ وہ ہم سے چھوٹ گئے

امان اللہ جاوید ———— مدینہ منورہ

نہ جانے کیوں بےسبب پردہ رو دیا کوئی
جب اس گلی میں کہانی ہوئی بیاں میری

سید قلب سلیم حسنین ———— شیخوپورہ

کہا تھا رکو کے صحیفے پہ ہاتھ ظالم نے
کبھی نہ ہم میں جدائیوں کا سلسلہ ہو گا

ایم اصغر شاہین ———— ہرنولی

عشق کے دامن کو داغدار نہ کر
نظر سے چوم گلوں کو لبوں سے پیار نہ کر

صفدر عباس قریشی ———— کھوڑ

میں چھپ رہوں کبھی بے وجہ ہنس پڑوں محسن
اسے گنوا کے عجیب حوصلے تلاش کروں

قیصر آفتاب ———— سرائے عالمگیر

میں سادہ مزاج تھا مجھے حسن و عشق کی کیا خبر
تیرے اک تبسم نے میرا ذوق سارا بدل دیا ہے

ایم ایوب شاہ ———— لاہور

منزل کو میرے شوق کا احساس جب ہوا
ہر ذرہ میری راہ میں دیوار بن گیا

مس نازی ———— ہری پور

یارب تیری دنیا میں کوئی بھی اپنا نہیں
جس سے ملتے ہیں کہتا ہے تم کو پہچانا نہیں

شیخ محمد سلیم ———— لاہور

لعل و گہر کے خزانے ہیں یہ سارے آنسو
آپ دامن میں چھپا لیں یہ ہمارے آنسو
دو گھڑی بھی درد نے آنکھوں میں رہنے نہ دیا
ہم تو سمجھے تھے بنیں گے یہ سہارے آنسو

شعر

تنویر الدین ———— لاہور

تو میرا جسم ہے میں ہوں صدا تیری
سپردگی میں بھی قائم رہے انا میری

پلٹ پلٹ کے زمیں نے مجھے قبول کیا
ہوا نے گرد اڑائی ہے بارہا میری

———

اے آر پی تبسم ———— نیو سکرنڈ

ٹوٹ جائے گی گر یہی حال رہا اے آر
روٹھ جاتے ہیں وہی جن کے لیے جیتے ہیں

اسحاق الدین ———— قلعہ شیر

کیا اس لیے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

عبدالعزیز بیتشاد ———— لالہ موسیٰ

ایسا افسانہ جس میں پیار کا پیغام بھی ہو
نام ہو میرا بھی شامل تم پہ الزام بھی ہو

ظفر اقبال ناز ———— لالہ موسیٰ

توبہ اس دنیا میں کیسے لوگ بستے ہیں
آنکھوں میں احترام دل سے نفرت کرتے ہیں

خالدہ ———— لالہ موسیٰ

تجھے زندگی کی دعا نہ دے کہ زندگی کی طلب نہیں
کبھی مجھے جینا عزیز تھا یہ بجا مگر اب نہیں

ایم اے ایم راحت ———— سنجوال

چند لمحے اس سے ہی جو یہاں ٹھہرا ہو گا
اس نے کیا کیا نہ ترے شہر میں کھویا ہو گا

پروین حیات ———— لاہور

جوڑتی ہوں ٹوٹے رابطوں کا فاصلے
مجھ کو لمحوں کے سرابوں نے اکیلا کر دیا

ایم جاوید کوثر ———— لاہور

حسرتیں رہ گئیں دل میں بہاروں کی طرح
ہم ترے شہر سے گزرے بھی تو ویران گزرے

نور جہاں ———— عیسیٰ خیل

سارے ماحول میں خوشبو ہے تیری یادوں کی
ہم نے غم خانے کو پھولوں سے سجا رکھا ہے

نصیر احمد کیانی نانہ ———— کرونڈ

پھر یوں ہوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

ایاز خان سواتی ———— سوات

بیٹھو نہ دور ہم سے دیکھو خفا نہ ہو
قسمت سے مل گئے ہو مل کے جدا نہ ہو

خورشید عالم ———— چک ۴۶

ہم تجھے بھول کے خوش بیٹھے ہیں
ہم سا بے درد کوئی کب ہو گا

ظفر اقبال لودھی ———— سرگودھا

تیری نظریں جھکی پلکوں میں چھپی رہتی ہیں
پھر سے میں دیکھ رہا ہوں یہ کیا کہتی ہیں

طارق جہانگیر ———— سمہ سٹہ

نہ دھکے دے محفل سے نکل جاتا ہوں میں
ٹوٹے ہوئے دل کے ذرا ٹکڑے تو اٹھا لوں

ازہر احمد آزاد ———— کویت

تم تو بجلی بھی شعلہ بھی قیامت بھی سہی
دیکھنے والے کا تم نے کلیجہ دیکھا؟

تیرے بدلے ہوئے تیور نے بنا دی دوپہر
مدت دیکھی ہے کہ تجھے جان تمنا دیکھا؟

شیخ اشفاق احمد ———— لاہور

بجلی نے جلا ڈالا تمناؤں کا حرم
اب راکھ کے ڈھیر پہ چپ چاپ کھڑا ہوں

———

سید اقبال بخاری ———— مٹھن کوٹ

مجھ کو آزادی ملی بھی تو کچھ ایسے ناسک
جیسے کمرے سے کوئی صحن میں پنجرہ رکھ دے

ایم اے منقار رنگی ———— الریاض

میں تو خود اپنے لیے بھی اجنبی سا بن گیا
تو بتا مجھ سے جدا ہو کر تجھے کیسا لگا!

عقیل الرحمٰن ناشاد ———— حسوال

کبھی تو آؤ گی میری تربت پہ فاتحہ پڑھنے
اگر کفن اٹھا کے نہ مارا تو میرا نام نہیں

شعر

ایم الیاس قریشی ——— حیدہ

میں ہوں یادوں کے حسین تاج محل کا باسی
اس سے نکلا تو فضاؤں میں بکھر جاؤں گا
تیری یادوں نے تو بخشا ہے سلیقۂ حیات
بھول جاؤں گا اگر تجھ کو تو مر جاؤں گا

———

ایم اے درد ——— السعودیہ

آج پھر تنہا ہے دردانہ زیست پہ
جسے سمجھا تھا منزل وہ دن کا خواب تھا

ایم اشرف طاہر ——— سکھو شریف

دل تو میرا ایک ہے اس سے کیا کیا کام لوں
تیری پوجا کرلوں اختر یا اپنی بربادی کا ماتم کروں

آصف رضا بخاری ——— جنڈیالہ

عدم اتفاق اور اتنا حسین
ملاقات اور چاندنی رات میں

این ڈی ——— صادق آباد

اے صنم تیری یاد میں کب تک صبر کروں
آنکھیں تو بند کرلوں مگر دل کا کیا کروں

ایم ایم اشرف راہی ——— شادی پل

تابندگی رخ پہ نظر جاتی ہے سب کی
یاں روح کے زخموں کا شناسا کوئی نہیں

رشید انجم ——— بیلہ

خود اپنے انتظار میں بیٹھا ہوں شام سے
انجم کس انجمن میں بلایا گیا ہے مجھے!

خورشیدہ ناز ——— سرگودھا

منزل کی گر طلب ہے نئے عزم سے چلو
کب تک بنے رہو گے یونہی گرد کارواں

ایم شفیق ——— چک ۴۶

پھر مجھے اس سحر و شام کی یاد آتی ہے
عہد رفتہ کے ایام کی یاد آتی ہے

سپاہی اللہ یار ——— تربیلہ ڈیم

آتے ہی صنم نے زندگی کا حال تک نہ پوچھا
تب بھی زندگی میں موسم بہار آ گئی!

عمران افضال ——— لاہور

پہلے ہی میرے دل سے کب فرصت ہم پیہم غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

حریت لبنیٰ ——— وان آدھن

ماتم سرا بھی ہوتے ہیں کیا خود غرض قتیل
اپنے غموں پہ روتے ہیں لے کر کسی کا نام

منیر حسین آرزو ——— چھمبڑ

در رخ مجھے قبول ہے ہمراہ یار کے
جنت میں جا کے ہجر کے صدمے اٹھائے کون؟

عذرا سلطانہ ——— کھاریاں

غم حیات میں عظمت کو کوئی کیا جانے
بہار دے کر فریب گئے ہیں دیوانے

ایم بشیر نوشی ——— گکھڑ

کس شوق سے اٹھائیں اب نگاہ دیدار کو
تو نے خود ہی ظالم کر دیا رسوا پیار کو

سردار سجاد علی ——— سوہدرہ

صنم مت دیکھ حسرت زدہ کی لاش کو
تیرے ہی انتظار میں سویا ہے ابھی ابھی

مسعود احمد ناصر ——— مائیل گنج

یہی مزاج ہے اپنا کسی کا دل نہ دکھے
جدائیوں کو بھی چاہا ہے قربتوں کی طرح

ذوالفقار علی بھٹی ——— رحیم یار خان

کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

زاہد علی عابد ——— فیصل آباد

عابد تو چل پڑا ہے ظالم مگر یہ دیکھنا
چرچا ہو گا تیری گلی میں میری وفاؤں کا

ایم سلیم بھٹی ——— نواب شاہ

تتلیاں آئیں گی کیا اب کانچ کے گلدان پر
پھول جتنے تھے وہ بالوں میں لگا کر لے گیا!

شہزاد فاروق ——— فورٹ عباس

کیا خبر تھی دلیت ایسی بھی یہ دن دکھائے گی
ہم فیل ہوں گے دنیا مسکرائے گی!

شعر

شابٹ ——— لاہور

ہم ہی بے تاب نہیں درد جدائی کی قسم

کروٹیں رات بھر وہ بھی بدلتا ہوگا

ایم اے نثار ——— اوکاڑہ

مجھ کو خبر تھی مگر اک سادہ لوح کو

برباد کر دیا ترے دو دن کے پیار نے

عبدالعلیم شاد ——— لیہ

آ مجھ کو بتاؤں میں جمارت کے کرشمے

بے مثل خدا سے بھی رقابت ہے مجھے شاد

محبوب حسین ——— رنچھپور

عالم میں جن کو دعوئ کمی اس شناسائی پر

دیکھ نے جو کچھ کبھی وہ تبصرے بھی دیکھو!

رفعت تہمینہ ——— لاہور

راس آجائے تیرے در کی فقیری جس کو

کیوں نہ پھر دولت دنیا سے وہ بیگانہ بنے

راؤ ذوالفقار علی منصور ——— منٹگمری

ذرا سی دیر کو آئے تھے خواب آنکھوں میں

پھر اس کے بعد مسلسل عذاب آنکھوں میں!

عبدالرشید قانی ——— الدمام

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے

تم نے اچھا کیا نباہ نہ کیا

شبیر حسین ——— الدمام

مجھے چاہا مگر تیری دہلیز پہ سجدہ نہ کیا

وہ میرا عشق تھا یہ میری خودداری ہے

سیمی یوسف ——— حیدرآباد

زندگی ریشم و کم خواب نہیں اے دوست

مجھ کو جینا ہے تو پتھر کا جگر پیدا کر

ظاہر شاہ ——— مدینہ منورہ

سوچ میں ہے مگر ذہن میں نہیں

پوچھتا ہوں، تصور کسی کا

یاد آتا ہے مگر خیال میں نہیں

ڈھونڈتا ہوں، مگر کسی کا

حاجی ایم بشیر الحق ——— خضدار

ساحلوں کی آرزو میں مجھ کو بھٹکا دیتی

دوستی اپنا رہی ہے صرف طوفانوں کے ساتھ

ریاض احمد راہو ——— الطائف

اے دل تجھے رونا ہے تو جی کھول کے رو لے

دنیا سے نہ بڑھ کر کوئی ویرانہ ملے گا

رانا ایم شفیق انجم ——— الریاض

جب یاد تمہاری آتی ہے ستاتی اکیلی راتوں میں

دل خون کے آنسو روتا ہے ارمان بکھر جاتے راتوں میں

ایم ناصر ناز ——— جدہ

مجھے تو ناز تھا ضبطِ تبسم محبت پر

یہ آنسو آج کیوں بے تاب ہو ہو کر نکلتے ہیں

نعیم ناصر چوہدری ——— الریاض

نظروں سے دور دور نظاروں سے دور دور

ساحل بنا رہا ہوں کناروں سے دور دور

شیخ محمد بخش ——— مدینہ المنورہ

ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں

دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

ایم طفیل صابر ——— قاضی احمد

اگر اللہ سے ملنا ہے تو مسجد میں آکے دیکھ

کیا کچھ ملتا ہے سجدے میں جاکے دیکھ

بدر زمان ——— کویت

شمع جس آگ میں جلتی ہے نمائش کے لیے

ہم اس آگ میں گم نام سے جلتے ہیں۔

ظہیر حسین چانڈیہ ——— مدینہ المنورہ

اک عمر تھی جسے کاٹ چلے پر جانے کیسا جلنا تھا

کچھ اپنوں کی کچھ غیروں کی بس جو ملیں کھا بیت گئی

ریحانہ ناز ——— شورکوٹ

اس زلف کا کیا کہنا جو دوش پہ لہرائی

سمٹی تو بنی ناگن، پھیلی تو گھٹا چھائی

ایاز خان ——— الریاض

خواب دیکھتے تھے کبھی اب تو وہ آنکھیں ہی نہیں

دل وہ دل ہی نہیں اب آگ میں جل جانے کو

جواب عرض لاہور

شعر

نسرین باد —— پشاور

نکالو یہ آتشِ ہجراں میرا تن من جلاتا ہے
بڑھا کر دردِ الفت مجھے دل سے بھلاتا ہے

نصرت حسین نیّر —— شاہ پور

عجب حسن ہے تیری اداس آنکھوں میں
سکوت صبحِ ازل کا خیال آتا ہے!

سید مسعود حسین شاہ —— ٹوبہ

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے!

مجاہد بانو —— حاصل پور

جیت کر اب کوئی پیدا نہیں
بازیاں سارے ہار دیتے ہیں
گلا گھونٹ کر اپنی ہر خوشی کا
وہ کا صدقہ اتار دیتے ہیں

منظور علی یاسر —— بحرین

اب میرے رونے والو! خدارا جواب دو
وہ بار بار پوچھتے ہیں، کون مر گیا؟

رخشندہ —— سکرنڈ

دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کسی پہ کیا گزرتی ہے

عبدالرؤف —— مدینۃ المنورہ

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی وفا یاد
اب کچھ بھی نہیں مجھ کو محبت کے سوا یاد

ایم الیاس —— گجرات

دل کو محسوس ہوتی ہے رات کو آواز کبھی
چونک اٹھتا ہوں کہیں تو نے پکارا نہ ہو

عابدہ رانی —— ڈسکہ

رلو قبول پھول کا نذرانہ جانِ من!
یہ اے آرزو میری، میری بھی قصید ہو

حبیبہ قریشی —— کوٹلی لوہاراں

جب تک جئے بکھرتے رہے ٹوٹتے رہے
ہم سانس سانس قرض کی صورت ادا ہوئے

رمضان حسین ساغر —— رحیم یار خان

کھا کر زخم وفا کے جیا کرتے ہیں
کچھ نہ ملے تو اشک پیا کرتے ہیں
ہم کرتے نہیں گلہ کچھ بھی ہو جائے
اپنے زخم ہم خود ہی سیا کرتے ہیں

لیگر محمد گل —— [illegible]

ٹوٹ جائے دل تو پھر جینا بہت دشوار ہے
آدمی صحرا میں ہو یا وادیٔ کشمیر میں

بشیر احمد شاکر —— صلالہ

پھر اس رُت میں جدائی اور یہ تنہائی
یہی کافی ہے بس شاکر کو رُلانے کے لیے

اشرف پاشا —— کنگن پور

جو تو جاتا ہے بھری محفل میں بُرا کہہ دوں
پھر تیری اداؤں وفاؤں کا خیال آتا ہے

شگفتہ طارق —— سیالکوٹ

وقت گزر جاتا ہے، دل تڑپتا رہتا ہے
کوئی ہے جو کہتیں، اتنی شدت سے چاہتا ہے

راجا حاتم علی شہزاد —— کوئٹہ

کون روتا ہے کسی اور کی خاطر اے شہزاد
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا!

ایم افضل —— گوجرانوالہ

ہر ایک کو خوش رکھنا اپنا کام ہے یہی
خیال اپنا نہیں بلکہ دوسروں کا صرف آتا ہے

تاثیر احمد —— آزاد کشمیر

تڑپ رہی ہیں جو دن رات تیرے ملنے کو
پلک پلک سے وہ بانہیں سلام کہتی ہیں!

ناصر علی عاقل بلوچ —— پسنی مکران

تجھ کو معلوم نہیں تجھ پہ فدا ہے کوئی
بن کے دیوانہ تجھے ڈھونڈ رہا ہے کوئی
ٹھوکریں کھانا ہی لکھا ہے میری قسمت میں
تجھ سے شکوہ نہ شکایت نہ گلہ کوئی

شعر

نازیہ ارشاد محمد ———— جدہ

مٹی سے بنا کے انسان کو پوچھئے
جنت کو آسمان سے زمیں پہ اتار دیجئے
نکتے ہیں قطرے سے ابھی ٹوٹ جائے گا
شیشے کے گھر میں بیٹھ کر پتھر سے مار دیجئے

شاذیہ ———— گوجر خان

بہار ہائے آنسو میں آنسوؤں پہ بھروسہ عذر یہ کیا ہم
ہمیں تو لٹنا تھا لٹ گئے تمہارے اس میں کیا فائدہ

طاہرہ زبیدہ ———— دو چوک

ہم نے گھر پھونک کے دیکھا ہے تماشا
دل میں جب آگ لگی آپ ہوا دی ہم نے

ام صادق انجم ———— گوجرہ

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

حاجی ایم صدیق عاصی ———— کرالی

خلوصِ دل ہی کافی نہیں ہے دوست، دوستی کیلئے
وفا بھی اک شرط ہے رابطہ باہمی کے لیے

ایم نذیر تبسم ———— سیالکوٹ

پچھتا نہ گئے بہت میرے دل کو اجاڑ کے
اس گھر میں اور کون ہے مہماں تم ہی تو ہو

ایم رمضان ———— میانوالی

تنہائیوں میں آج وہ دل سے گزر گئے
آنسو گرے کچھ اتنے کہ دامن نکھر گئے

ایم ایوب خان ———— سلطان خیل

کیا برباد جس نے سکونِ دل میرا وہ جائے جنت میں
ہم تو دنیا میں جنت میں کریں گے گزارہ دوزخ میں

ایم یونس بسمل ———— سیالکوٹ

چلا جو دل سے تو قطرہ گلاب جیسا تھا
پہنچ گیا سرِ مژگاں تو آب جیسا تھا
میرے نصیب کی خوشیاں، میرے نصیب کے غم
لکھے جس پہ نقش وہ چہرہ کتاب جیسا تھا

زیب خانم ———— کھپرو

ہجر کی شب کا کسی اسم سے کٹنا مشکل
چاند پورا ہے تو چہرے کا گھٹنا مشکل
تونے ہم ہے جو اس طرح سنبھالے ہے مجھے
ورنہ بکھروں کسی لمحے تو سمٹنا مشکل

ایم اقبال ———— میانوالی

تھا یہ بہتر کہ اندھیروں میں بھٹکتا رہتا
تو نے لوٹا میری دنیا میں اجالا کر کے!

یاقت علی ———— میاں دنگہ

نہ پوچھو اب میرے آنسو مجھے یونہی ٹوٹ بہنے دو
تم اتنے مہرباں ہوتے تو دل کا خون کیوں ہوتا

رفیق پرواز ———— نیو سکرنڈ

تم نہ بیگانۂ الفت ہو تمہیں کیا معلوم
کتنی رنگین محبت کی فضا ہوتی ہے!

ایس ڈی راہی ———— حاصل

ٹپکتا ہے نگاہوں سے، برستی ہے اداؤں سے
محبت کون کہتا ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

اقبال فرحت یلا ———— جہلم

غزل میری جانِ جاں گر پسند ہی نہیں تو
لبوں پہ اس کو گنگنا کیوں رہے ہو!

ایم یونس محمود ———— جلالپور

زندگی کی ساری رعنائی اسی میں ہے یونس
یار کے وعدوں کی صورت بے وفا ہے زندگی

اے ڈی خان بلوچ ———— جھنگ

تنہائی نے فنا کے بعد بھی رسمِ محبت
غبارِ راہ بن کر ہم تیرا دامن نہ چھوڑیں گے

رانا فرحت محمود ———— چوہڑ کانہ

ہمیں اپنے دل سے بھلا کیوں رہے ہو
مروت کی شمعیں بجھا کیوں رہے ہو
نہ ہو جن کے دل پہ اثر کوئی آتا
انہیں حالِ دل تم سنا کیوں رہے ہو

شعر

جلیل الرحمٰن شاد ——— راجن پور

چمکتی چوڑیوں میں کوئی پیغام ہوتا ہے!
اٹھا کے ہاتھ ہمیں جب سلام ہوتا ہے!
حیا سے ہاتھ کو اپنے لبوں پہ مت رکھو،
کہ مے کشوں کے لیے یہ تو جام ہوتا ہے

مشتاق احمد ——— کوٹ مٹھن

منافقت کے گہرے پردوں میں، الفاظ کے جھوٹے لفظوں میں
سب لوگ محبت کرتے ہیں حالانکہ محبت کچھ بھی نہیں!

عظمت بھٹی ——— کھیالی

تو نے کہا تھا کہ ساتھ دیں گے فنا ہونے تک
یہ کیسی محبت ہے ابھی سے تم بچھڑ گئے ہو،

طارق اقبال طاہر ——— مٹھہ

یا الٰہی دکھا دے مدینہ کیسی بستی ہے!
جہاں دن رات میرے مولا تیری رحمت برستی ہے!

منصور خان ——— میانوالی

ملکِ عدم میں یا رب کیا عید ہو رہی ہے؟
جاتے ہیں مرنے والے کپڑے بدل بدل کر

ایم اسلم پردیسی ——— چیچہ وطنی

یہ اور بات ہے کہ ان کو خدا بننا نہ آیا
ورنہ اس پتھر کی عبادت کی تھی ہم نے

عبدالغفور محمود ——— رحمان آباد

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

الطاف احمد راشد ——— حاصل پور

پھولوں کے تو قابل نہیں شاید میرا دامن
اے صاحبِ گلستاں اسے کانٹوں ہی سے بھر دے

جبار جلالی ——— روہڑی

یوں مسکرا کے چہرہ چھپایا نہ کرو!
دل کسی کا یوں خوشی سے جلایا نہ کرو
کوئی ان سے تو میرا حال جلالی پوچھے
خود تو آتے ہیں مجھے کہتے ہیں آیا نہ کرو،

سعید احمد دانش ——— نیو سکرنڈ

کل بچھڑنا ہے تو پھر عہدِ وفا سوچ کے باندھ
ابھی آغازِ محبت ہے گیا کچھ بھی نہیں!
میں اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے!
تو سمجھتا ہے مجھے تجھ سے گلہ کچھ بھی نہیں!

ام رمضان تبسم ——— نوابشاہ

کاش اس عیدِ سعید کے حسین لمحوں میں
میری ذات تم کو گذشتہ بھی باتیں یاد آئے

ام شفیق ناز ——— سکرنڈ

نصیب جن کو تیرے چہرے کی دید ہوتی ہے
وہ خوش نصیب ہیں خوب ان کی عید ہوتی ہے

رشید احمد مغل ——— دوڑ شہر

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش
خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن

مختار احمد خان ——— لاڑکانہ

مرنے کے بعد میری عیادت کو آ گئے
اس زندگی سے موت ہی اچھی رہی

صفدر حسین پردیسی ——— نور پور

اب تک تیری رحمت عموم ہے
وہ پا گیا جو تیرا سلیم ہے!

شبیر احمد زاہد ——— قدرت عباس

گلشن میں پھول ہے، پھول میں خوشبو
انسان میں دل ہے، دل میں خدا

عشرت حلیم ——— فیصل آباد

کسی سر نگوں سی ٹہنی پہ رکھیں گے چار تنکے
نہ بلند ہو گی شاخ نہ گرے گا آشیانہ

شاہانہ تبسم ——— اوکاڑہ

تیری یادوں سے پیار کرتے ہیں
اور بے اختیار کرتے ہیں!
تم کو تیروں کی فکر ہے اور ہم!
زخم اپنے شمار کرتے ہیں!

شعر

سید ساغر سلطان ———— رکھنی

مغرور اک شہر سے جب کوئی بھٹکتا بادل
میری جلتی ہوئی بستی کی طرف آئے گا
کتنی حسرت سے اسے دیکھیں گی پیاسی آنکھیں
اور وہ وقت کی مانند گزر جائے گا

ایم خالد نوید بھٹی ———— خان گڑھ

تم اپنے جلوؤں کی محفل کا اہتمام کرو
جلے گی شمع تو خود آ رہیں گے پروانے

شاہد محمود شاہد ———— لاہور

کس نے دیا ہے محبت کو پرستش کا مقام
تم یہ انصاف سے سوچو تو نادم ہم کو

تنویر حسین ———— سکھر

دل پہ کب اختیار ہے اپنا
یہ کسی اور کی امانت ہے!

رشید احمد شاد ———— بھٹوٹ

ملیں نہ پھول تو میری قبر پہ آ کے مسکرا دینا
سنا ہے تیرے مسکرانے سے پھول برستے ہیں

ثناء اللہ خان نیازی ———— موچھ

دل میں تمہاری یاد کے جلتے تو ہیں چراغ
مانا کہ ان کی روشنی تم پر عیاں نہیں

ازہر احمد آزاد ———— کوئٹہ

ہر اک زخم جگر روتا ہے آنکھوں سے رواں ہوتا ہے لہو
بس مجھ پہ ظلم ڈھانے کے لیے ساون کا مہینہ آتا ہے
وہ گلستاں میں آ کر جب رُخ سے اٹھاتے ہیں نقاب
کلیوں کی جھک جاتی ہے نظر پھولوں کو پسینہ آتا ہے

ایس ایچ پردیسی ———— نور پور

یہ دل بہت اداس ہے جب سے خبر ملی
تم ملتے ہو ہر آدمی کو خلوص کے ساتھ

امام بخش ———— بیلہ

ستم کشی کا دل نے پیدا کیا حوصلہ
اب ان سے ربط کر دوں جو بہت ستم گر ہو

غلام محمد ———— رکھنی

دنیا نے تڑپ کر مرے شانوں کو جھنجھوڑا
لیکن مرا احساس غم ذات میں گم تھا!
آتی رہیں کانوں میں المناک پکاریں
لیکن میرا دل اپنے ہی حالات میں گم تھا

سلیم خان غزالی ———— رامپورہ

کھول کے زلفیں میری تربت پہ پیٹا کس نے سر
عالم بالا کی سب حوریں پریشاں ہو گئیں

رحمت جبیں ———— سکھر

معصوم خواہشوں کا لہو پی گئی مہک
نادان بلبلوں کو بہاروں نے ڈس لیا

مہر مظہر عباس ———— تونسہ شریف

آرزو ان کی، طلب ان کی، تمنا ان کی
کتنی رونق ہے مری زیست کی ویرانی سے

اعجاز جاوید بھٹہ ———— تونسہ شریف

کتنی حیران ہوا ہے یہ تنہائی
چاندنی بھی کفن پہنے ہوئے ہے!

بشیر احمد ساجد ———— تونسہ شریف

کتنے نادان تھے ہم تیری تمنا کر کے
روشنی اور اندھیروں کو ملانا چاہا

اقبال ثریا ———— چارسدہ

نسبت ہی نہیں کوئی محبت کو خود سے
اے دل کبھی مفہوم محبت نہ سمجھنا!
سر خم ہوا اگر مصلحت وقت کے آگے
اس جبرِ مسلسل کو عبادت نہ سمجھنا!

فضل احمد بھٹی ———— مری

اس دل کے دریدہ دامن میں دیکھو تو سہی سوچو تو سہی
جس جھولی میں سو چھید ہوئے اس جھولی کا پھیلانا کیا

ایم یونس ناز ———— سبی

احساس اب ہوا کہ اخلاق کچھ نہیں
نظر دل سے تری گر گئے ہم قریب تھے!

جواب عرض لاہور

سحر

سعید ساجد ——— لاہور
مدت ہوئی کسی نے پلائی تھی آنکھ سے
ساجد اسی شراب کا اب تک خمار ہے

ایم ایم اشرف ——— شادی پلی
تیرے فراق کی راتیں کبھی نہ بھولیں گی
مزے ملے انہی راتوں میں عمر بھر کے مجھے!

ایم لیسین شاد ——— کوٹ مٹھن
مجھے آج ہی پلا دے نہ ٹال کل پہ ساقی
کہ چھلک نہ جائے کل تک مرا جام زندگانی

مس رشیدہ کنول ——— لاڑکانہ
وہ ہم کھڑوں کا ملنا وہ نشاط غم کے سائے
کبھی رو پڑے تبسم کبھی زخم مسکرائے!

اعجاز ملک ——— لوچھال کلاں
حسن کے کھلتے پھول بیدردوں کے ہاتھ بکے
اور چاہت کے متوالوں کو ویرانوں کی دھول ملی

ذوالفقار علی ——— خانپور
محبت میں جان کی بازی لگانے حسین کا جی چاہے
بھرا ہے زہر کا پیالہ اٹھانے حسین کا جی چاہے

رفعت سلطانہ ——— لاہور
خوشبو تو سانس لینے کو ٹھہری ہے راہ میں
ہم بدگماں ایسے کہ گھر کو پلٹ گئے!

شاہدہ امین ——— لاہور
رات کے اندھیاروں میں جاگے ہوئے لمحو
ڈھونڈو اسے وہ خواب پریشاں کی طرح تھا

ساجدہ امین ——— لاہور
اٹھے گی کس طرح بزم جہاں نہیں معلوم
کہاں پہ جائیں گے کون و مکاں نہیں معلوم
لٹ رہی ہوں میں یہاں برسوں سے!
ختم بھی ہو گی کہیں داستاں نہیں معلوم

وسیم کیانی ——— جہلم
حسرت تعمیر نہ انتہا پوچھو رہا حق
ایک چڑیا مر گئی ہے چونچ میں تنکا لیے

———

نذیر محمد ضیاء ——— ریحان ٹاؤن
دل و جگر سے ٹپکتی ہیں خون کی بوندیں
یہ اور بات ہے ہم مسکرائے جاتے ہیں

عبدالعزیز شاد ——— لالہ موسیٰ
دل کے نازک جذبوں پر نا جانے سونے چاندی کا
یہ دنیا کیا قیمت دے گی سادہ دل انسانوں کو

ساجد ایم تنویر ——— ملتان
وفا تمہاری مجھے ہے پیاری
وفا کی تجھ کو نہیں ضرورت
تو ربط کر بھی عسترین اتنی
کہ یہ الفتی بھی ہے اک غنیمت

———

نسیم احمد ——— ہری پور ہزارہ
تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

شاہد زکریا ——— لاہور
کیونکر حقیقتوں کا پتہ چل سکے کہ لوگ
ملتے ہیں اپنے آپ سے بھی اوڑھ کر نقاب

رفیق تلاشی ——— مہر علی
میرے مارنے کے لیے پھول ہی کافی تھے جاناں
انسانوں کی بستی میں پتھروں کے رواج نہ رکھ

میاں مشتاق احمد ——— خانیوال
جب آگ لگائی ظالم نے کتنا دلکش منظر تھا
لپٹ لپٹ کے رہے تنکے میرے آشیانے کے

شمائلہ مراد ——— لاہور
میری آنکھوں سے چھلکتا ہے میری روح کا درد
میرے چہرے پر میرے گھر کی سی ویرانی ہے!

کنہیا لال ——— گنڈہ کوٹ
کسی کافر کو دل دینے کی
ہمت کر کے دیکھیں گے!
محبت کس کو کہتے ہیں!
محبت کر کے دیکھیں گے!

———

جاوید الرحمن لاہور

بی نجمی ——— کوٹ نیرل

تنہائی کا عالم بھی پُراسرار ہے کتنا
جیسے کوئی چھپ چھپ کے مجھے دیکھ رہا ہے

ایم شریف ——— کراچی

اے خالِ رخِ یار تجھے خوب سمجھا ہے
جا تجھے چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

ایم منیر خٹک ——— پشاور

خود کو یوں محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
منزلیں چاروں طرف ہیں راستہ کوئی نہیں!

غلام دستگیر ——— گوجر خان

یہ تو قفس ہی مجھ کو عزیز ہے
جو تو کہو گا قرار سے
مجھے اب چمن میں نہ لے چلو
میں ڈر رہا ہوں بہار سے

طارق نوید ناز ——— ڈنگہ

یوں مٹا دیں گے تو اور بڑھ جائے گا چاہت کا رواج
تم بھلا ہو جاؤ گے پھر مجھ پہ فدا میرے بعد

شیخ علوی فراز ——— سبیلہ

یاراں تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالہ جرسِ کارواں ہی رہے

منیر احمد جاوید ——— کراچی

فتنے محل نہ جائیں قیامت بپا نہ ہو
آہستہ چل صبا کہ کوئی محوِ خواب ہے

اشتیاق احمد ——— رحیم یار خان

دیکھو کس انداز سے وہ مجھے آزمائے
کبھی خود تڑپے، کبھی مجھے تڑپائے!

ایس ایم اختر ——— مری

اتنا کہنا ہے تجھ سے آشفتہ
غم کی دولت سنبھال رکھا کر
غم نے تیرا خیال رکھا ہے
تو بھی غم کا خیال رکھا کر

قاضی غلام مصطفیٰ ——— بقیہ

ملا نہ پیار بھرا میں نگر نگر یارو
ہوا نہ ختم مرے درد کا سفر یارو
کوئی تو ہو جو مرے فن کو روشنی بخشے
کوئی تو ہو مرے خوابوں کا ہمسفر یارو

رخسانہ کوثر ——— لاہور

ہوتی نہیں دعا قبول ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

سید مظہر عباس بخاری ——— خضر آباد

میں تیرا رازداں بنتا تو ہوں لیکن
سنا ہے رازداروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے

جے پال داس آمر ——— [illegible]

سوچ لو، اس بزم سے اٹھنے سے پہلے سوچ لو
یہ نہ ہو پھر دل کے ہاتھوں لوٹ کے آنا پڑے!

ایم حسن شاہد ——— چشتیاں

ہوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تو نہیں تیرے ساتھ ایک دنیا تھی!

کے پی ——— جاپیوین

رستے ہوئے زخموں کے سوا کچھ نہ دے سکا
قسمت کا دیوتا بھی شاید غریب تھا!

سیدہ شکیلہ گیلانی ——— لاہور

خوش اندیش تھے ہم ترے زندگی کے ہر موڑ پر
منزل ہمارے قریب تھی گر تم خیرباد نہ کہتے!

عمر دراز ——— جھنگ

کسی کے ایک آنسو سے ہزاروں دل تڑپتے ہیں
کسی کا عمر بھر رونا یونہی بیکار جاتا ہے!

شکیل اختر ——— بابر نال

برسوں جو میرے سائے سے بھی بدگماں رہے
اب کس ادا سے پوچھتے ہیں کہاں رہے
میرے لیے یہ رنگِ تغیر نیا نہیں
وہ مہرباں رہے کبھی نامہرباں رہے

عشرت طاہر ——— مجاہد آباد

عشق سے حسن سرگراں کیوں ہے
میری نظروں سے وہ نہاں کیوں ہے
آخر شہ دل میں کیا خرابی ہے !
جب مکاں ہے تو لامکاں کیوں ہے

آفتاب احمد کھیٹی ——— جودھے والی

میرا ذوق تجسس کچھ بھی نہیں
مقصد شوق ہے تیرے دیدار کا

طارق محمود دیٹ ——— دینہ

میرے آنسو میری پلکوں پہ لرزنے نہ دیئے
سطوت ، ہنگام تجر لینے نہیں دیتی دنیا

ابو طارق ——— حائل السعودیہ

ایک لمحے کی جلن اور ہمیشہ کا سکون
بے پروانے کو تکلیف ہی کیا ہوتی ہے

ایم ایم ارشد بزمی ——— ایبٹ آباد

اپنے ہاتھوں میں لیے شمع یقیں آئیں گے
اب پیمبر نہیں آئیں گے ہمیں آئیں گے !

محمد علی تبسم ——— نواب شاہ

رو رو کے آنسوؤں میں کٹی اپنی زندگی
دم بھر نہ اس جہاں میں ہم مسکرا سکے !

مظہر حسین سعیدی ——— مٹھن کوٹ

سب مجھ کو جلا کے سو گئے ہیں
میں ایک چراغ نیم شب ہوں !

مینا تاج ——— سیالکوٹ

آس دل میں نہیں آنکھوں میں بھی پیاس نہیں
تیری یادوں کے سوا کچھ بھی میرے پاس نہیں

شیخ ایم عاشق ——— بیول

کس نے چڑھائے آکے پھول فاتحہ کون پڑھ گیا
اجڑے ہوئے مزار پر کس نے دیا جلا دیا
میں سو رہا تھا اوڑھ کے کفن مزار میں
یہاں بھی ستانے آ گئے کس نے پتا بتا دیا

روبینہ شاہین ——— مجاہد آباد

دل کے زخموں سے تیری راہ چراغاں کیے ہوئے
ہم سر شب نہ لوٹنے کا سبب سوچ رہے ہیں
جیتے ہیں نہ مرتے ہیں بس سسکتے ہیں ہم !
ان کو بھول ہی جائیں ہم یہ اب سوچ رہے ہیں

ایم تنویر الدین ——— لاہور

نگاہیں جھک کر جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر
اسے جانثی کی بے رخی کو دہرانا نہیں آتا

ایم رشاد جاوید ——— الطائف

ایسے لمحات بھی آتے ہیں کبھی انسان پر
آنکھ جب حور سے ملاتے ہوئے گھبراتا ہے

سید اقبال بخاری ——— مٹھن کوٹ

میں نے کہا کہ شراب پہ بندش ہے آج کل
کہنے لگے کہ ہوگی مگر دستیاب ہے !

ریاض خان سواتی ——— الریاض

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے !

ارشد حفیظ ——— لاہور

وہی خوشبو وہی ہونٹ وہی رنگین محبت
مل جائے اگر مجھ کو تو سمجھوں زندگی مل گئی

افتخار احمد سلیم ——— جھنگ

تائب تھے احتساب سے جب سارے بادہ کش
مجھ کو یہ افتخار کہ میں میکدے میں تھا

ایم جمیل راہی ——— گوجرانوالہ

ڈوبے وہی کہ جن کے مقدر میں کچھ نہ تھا
ہم غوطہ زن ہوئے تو سمندر میں کچھ نہ تھا

طارق محمود ملک ——— کسلیاں

میرے دل شکن رفیقو ! میرا حوصلہ بڑھاؤ
یہ نہ کر سکو تو تم بھی میرا ساتھ چھوڑ جاؤ
نہ کرو مجھے خدارا غم دہر کے حوالے
جو بنا سکو تو دل کو ہدف نظر بناؤ

شعر

ایم رفیق انجم ——— ۱۳۵ شمالی

میرے ہونٹوں، میرے ہاتھوں سے خوشبوئیں جاتی نہیں

میں نے نام محمد کو لکھا بہت اور چوما بہت

منیر حسین آرزو ——— حیدر آباد

تم آئے زندگی میں برسات کی طرح

اور چلے دیئے یوں کالی رات کی طرح

نسیم اختر ——— کھرالی

آئینہ ٹوٹ بھی جائے تو کوئی بات نہیں

دل نہ توڑیے کہ یہ بکتا نہیں بازاروں میں

صوفیہ اختر ——— الریاض

دیکھیں ہمیں نصیب سے اب اپنے کیا ملے

اب تک تو جو بھی دوست ملے بے وفا ملے

ایم اسلم تاج ——— جدہ

نہ آپ آئے نہ ہی آپ کا پیغام آیا

پھر بھی میرے لب پہ ہے کیوں تیرا نام آیا

سید شفیق الحسن ——— لاہور

محبت کی تھی جس نے وہ ظالم پیار کیا جانتے

اب تو ماں کی محبت کو بھی دھوکہ سمجھتے ہیں لوگ دلیا تے

ناہید اختر ——— لالہ موسیٰ

پوچھے جو کوئی تم سے باتیں میری چاہت کی

تم میری وفاؤں پہ الزام لگا دینا

ایم شبیر اختر ——— لالہ موسیٰ

ہم نے تجھ کو لاکھ پکارا لیکن تو خاموش رہی

آخر ساری دنیا سے ہم تیرے بہانے روٹھ گئے

شاہدہ پروین ——— گجرات

تیری زلفیں بھی صیاد آنکھیں بھی شکاری ہیں

تماشا دیکھنے کا ہے شبیر میرے دل کے جگر کے کا

شبانہ روحی ——— بوریوالہ

بھولے بسرے ہوئے نغمے مجھے یاد آتے ہیں!

شور جب گونجتا ہے کان میں شہنائی کا

کیا بتاؤں میں تمہیں اپنے اجڑنے کا سبب!

حال دیکھو کبھی آکر میری تنہائی کا

ونیوان علی دیوان ——— بہاؤالدین

اک امید پہ جیتا ہو گا

دل کا یہ زخم بھی سیتا ہو گا

زندگی جسے تم زہر سمجھتے ہو دیوان

تم کو یہ زہر بھی پینا ہو گا

سفینہ ظفر ——— کھرالی

وہ دل ہی کیا جو ملنے کی دعا نہ کرے

میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے

ایم شعیب زخمی ——— کوٹلی

یہ کیا ہوا تیری دنیا کو اے خدائے کریم!

کہ زندہ لوگ ترستے ہیں زندگی کے لیے!

سید شاہد الحسن ——— لاہور

میرے آنسو کا ہر قطرہ تیری محبت کی نشانی ہے

تم سمجھو تو موتی ہیں، لوگ دیکھیں تو پانی ہے

خالدہ پروین ——— لالہ موسیٰ

رات کے سناٹے میں ہم نے دھوکے کھائے ہیں

اپنا ہی جب دل دھڑکا ہم سمجھے وہ آئے ہیں

اعجاز بلوچ ——— دینہ

نم ہیں پلکیں تیری اے موج ہوا رات کے ساتھ

کیا تجھے بھی کوئی یاد آیا ہے برسات کے ساتھ!

آصف رنگ ——— سرگودھا

میری غربت نے اڑایا ہے میرے فن کا مذاق

صنم تیری دولت نے تیرے عیب چھپا رکھے ہیں!

راؤ ذوالفقار علی مصور ——— کوٹ مومن

ہے پھولوں میں بھی رعنائی غضب کی

مگر کانٹے بھی تو جان گلستاں ہیں

زاہدہ منزل ——— سیالکوٹ

گزر گئے ہیں وہ پیار کے دن

اجڑ گیا ہے وہ چمن خوشی کا

یہ چند آنسو، یہ چند آہیں!

یہی ہے اب سہارا زندگی کا

شعر

طارق محمود شاد ———— جلالپور شریف

گلچیں نے جو کوشش کر ڈالی شوخی ہو چمن کی بہر ڈالی
کانٹوں نے مبارک کام کیا، پھولوں کی حفاظت کر بیٹھے
اللہ تو سب کی سنتا ہے جرأت ہے شاد اپنی اپنی
حالیؔ نہ زباں سے اُف نکلی اقبالؔ شکایت کر بیٹھے

———

شمس پرنس ———— کندہ کوٹ

شمع میں طاقت کہاں جو ایک پروانے میں ہے
لطف جلنے میں نہیں، جل جل کے مر جانے میں ہے

خالد پرویز مغل ———— پیر ودھائی

اب کہ جنوں میں شاید کچھ فاصلہ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

رانا ایم حفیظ ———— تترووالہ

محبت کی عظمت کو رسوا نہ کیا میں نے
دھوکے بہت کھائے دھوکہ نہ دیا میں نے

غلام حبیب ———— لاہور کینٹ

میت پہ میری آ کے نہ کیوں پھیر لیا ہے
میری تو اس زباں پہ مرتے دم تیرا ہی نام تھا

کمال اختر ———— گھوٹکی

اب دل کے فسانے کو بیاں کرتے ہیں آنسو
اب ہم سے تیرے غم کی حفاظت نہیں ہوتی

قدرت حسین ———— الطائف

آج تو تیرا تصور بھی ہے گلدستۂ خار
آج تو یاد بھی اک ہُوک سی بن جاتی ہے

ایم ایم اکرم شاہد ———— سجاد آباد

محبت میں مر مر کے جینا پڑے گا
کوئی زہر دے گا تو پینا پڑے گا

ایم حنیف ———— رو ہڑی

منا تنا کر نہیں سکتے محبت خود ہو جاتی ہے
میزان زر میں دل عاشق کو تولا جا نہیں سکتا
نگر اس دور حاضر میں یہ حالت ہے اس جذبے کی
بنا سکے کے درِ دل کو کھولا جا نہیں سکتا

———

عبدالعزیز شاد ———— لالہ موسیٰ

مانا کہ بے وفا ہرگز نہیں عزیز !
اپنی باوفائی پہ بھی شاد کو ناز ہے
اپنے خط پہ تو نے محبت کے کان کھینچے
اصول محبت کا کیا یہی انداز ہے !

———

عبدالمجید ساجد ———— مکڑوال

تبسم نام ہے ان کے لبوں کی ایک جنبش کا
محبت، زندگی بھر کی پریشانی کو کہتے ہیں !

غلام نبی عابد ———— مکران

ہزاروں سے بچھڑ کے تمہیں اپنا بنا لیا
مگر تو نے بہاروں کے ٹھوکر لگا دیا

ظفر اقبال ساجد ———— رکھ راجڑ

دو چار دن ہوئے بچھڑے ہوئے آپ سے
محسوس یہ ہو رہا ہے کہ صدیاں گزر گئیں

عصمت اللہ خان ———— کراچی

جب بے کفن دفن ہوتے لگوں گا میں
تمہیں لوگوں سے خیرات میں کچھ مانگنا پڑے گا

خالد نسیم پروانہ ———— جرمنی

ہم تو چپ ہیں کہ جو ہوا سو ہوا
لوگ اب تم ہی کو برا کہتے ہیں

ایم جہانگیر الدین ———— تل نہر

یہ نہ شبنم ہے نہ ٹمٹماتے ہوئے تاروں کا ہجوم
رات کی لاش پہ ٹپکتے ہیں سحر کے آنسو

ایم شبیر احمد قریشی ———— مکہ مکرمہ

بہاروں میں تو جینے سے نہ ہم کو روک اے دوست
دکھوں نے مجھ کو گھیرا ہے گھٹا چھائی ظلمت کی

ایم ایم حنیف ———— الطائف

لگا کر دل پریشاں ہیں محبت دیکھ لی ہم نے
امیدیں بن گئیں آنسو یہ چاہت دیکھ لی ہم نے
لگی ہیں ٹھوکریں ایسی کہ اب جینا بھی مشکل ہے
کسی سے کیا کریں شکوہ یہ قسمت دیکھ لی ہم نے

———

شعر

محمد اقبال رانا ———— لاہور

یہ لوگ پاؤں کی ٹھوکر بنا رہے ہوں جنہیں
انہی کے سایے میں کل عمر یاں گزار رو گے
بتا رہے کی تمہاری بھی جان پر شب ہجر
یہ رت تم بھی بڑے قہر کی گزار رو گے

————

منظور حسین بیلا ———— ساہی وال

لوٹ کر آیا تو سارا شہر ویراں تھا ندیم
سب وہی چہرے تھے لیکن یار کی صورت نہ تھی

روبی شبنم ———— نامعلوم

کتاب کھول کے بیٹھوں تو آنکھ روتی ہے
ورق ورق پہ آپکا چہرہ دکھائی دیتا ہے

ذوالفقار مرزا سوز ———— منصورہ

کوئی با وفا چہرہ نظر نہیں آتا
لگتا ہے کاٹنی پڑے گی تنہا زندگی سوز

راجہ اے قیوم زنقم ———— موغلہ شریف

اپنا آغاز محبت ہی مجھے یاد نہیں
تو میری روح میں صدیوں سے بسا ہو جیسے

ملک صابر حسین ———— السلانکٹ

اس راہ زندگی میں میرے استاد کو
میری وفا کا یہ تو نے اچھا صلہ دیا

خالد محمود ———— لڈوعیہ

مانا کہ پُر خطر ہیں محبت کی منزلیں
لیکن سکون دل بھی انہی منزلوں میں ہے

ایم افضل بیگ ———— گوجرانوالہ

آہ کرتا ہوں تو آتے ہیں پسینے ان کو
نالہ کرتا ہوں تو وہ راتوں کو ڈر جاتے ہیں

عابد ———— نامعلوم

بجلی نے جلا ڈالا تمناؤں کا خرمن
اب راکھ کے انبار پہ چپ چاپ کھڑا ہوں
معلوم ہے انجام مگر پھر بھی عابد!
اک ریت کی دیوار پہ چپ چاپ کھڑا ہوں

————

عبدالرشید شاکر ———— کھاریاں لہ

میری کم سن مفلسی نے ٹھوکریں کھائیں مگر!
مسکراہٹ کو بھی اب آنسو بنا دیتا ہوں میں
احتیاطاً محبوب سے شاید سزا دی تھی مجھے!
انتقاماً محبوب کو اکثر سزا دیتا ہوں میں

————

خواجہ ممتاز حسین ناز ———— جدہ

روتے ہیں دل کے زخم تو ہنستا نہیں کوئی
اتنا تو فائدہ مجھے تہہ نیوں میں ہے!

زبیر احمد ———— کشمور

اپنے کردار کی عظمت کو رسوا نہ کیا ہم نے
دھوکے تو بہت کھائے دھوکہ نہ دیا ہم نے

ملک مشتاق احمد ———— جہلم

اے قلم رک جا ادب کا مقام ہے
آج تیری نوک پہ اس بے وفا کا نام ہے

احمد خان لدوانی ———— لورالائی

اجازت ہو تو اے ساقی میں بڑھ کر چوم لوں ان کو
تیری آنکھوں کے پیمانے حسین معلوم ہوتے ہیں

سید خیر اللہ شاہ بخاری ———— پشاور

ہو لینے والے تیری خوشی کی قسم
مجھے اب کچھ بھی تیرے غم کے سوا یاد نہیں

ایم طاہر کلیم انجم ———— کراچی

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لیے!

ثمینہ ناز ———— جیکب آباد

اے میری جان تمنا یہ بتا دے مجھ کو
تجھ کو کیا لطف آیا مجھ کو تڑپاتے ہوئے

مس ایس ڈبلیو ———— میانوالی

لو تھرا نہ جائے چراغ حیات کی
اتنا بھی طول دو نہ شب انتظار کو

مس کوثر ———— راولپنڈی

مجھے تلاش کر اپنے دل کی دنیا میں
نظر اٹھا میں تیری وسعت نظر میں ہوں

شعر

قاضی محبوب علی صنم ——— ڈی آئی خان

انتہا ہے ستم ظریفی کی
یہ کرم ہے تو پھر جفا کیا ہے
بے وفائی کی انتہا کر دے
تاکہ معلوم ہو وفا کیا ہے

ظفر اقبال سیفی ——— صادق آباد

مجھ سے اور تغافل کا سبب کیا ہے خدایا
میں یاد نہ آؤں انہیں ممکن ہی نہیں ہے

راجہ ایم ضیاء ——— [illegible]

جنونِ عشق تھا جو اک کسی سے پیار کر بیٹھے
خونِ جگر پیا تو وہ زہر کا مسکرا کر بیٹھے

ڈاکٹر نور احمد ——— نواں کوٹ

احساس مر نہ جائے تو انسان کے لیے
کافی ہے راہ کی ایک ہی ٹھوکر لگی ہوئی

ایم اے ناصر مجیبی ——— پیر محل

یہ بھی اک حادثہ ہے میری زندگی کے ساتھ
میں ہوں کسی کے ساتھ، میرا دل ہے کسی کے ساتھ

طاہرہ مرزا ——— واہ کینٹ

اس قدر قحطِ وفا ہے میری دنیا میں ندیم
جو ذرا ہنس کے ملے اس کو مسیحا سمجھوں

ایم نذر حسین ——— حیدرآباد

زمانے سے بگاڑی تھی تجھے اپنا بنایا تھا
بس اتنی یہ خطا تھی کہ تجھ سے دل لگایا تھا

رفیق حنا ——— کامرہ

اگر اجازت ہو تو یہ شبِ مختصر گزرنے نہ دوں
تیری زلفوں کو بکھرا دوں سحر ہونے نہ دوں

نجمہ کلثوم ——— جھنگ

کشتیِ آرزو کیا کنارے لگے
دل وہ دریا ہے جس کے کنارے نہیں
ہم کسی کے نہیں، تمہارے تو ہیں
لیکن افسوس ہے کہ تم ہمارے نہیں

منور سلطانہ ——— شیخوپورہ

تو ہے محیطِ بیکراں، میں ہوں ذرا سی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر، یا مجھے بے کنار کر
باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے، اب مرا انتظار کر

اے آر جبیں ——— سکرنڈ

بگڑے ہوئے نصیب کا شکوہ کریں گے کیا
جتنا تھا مسکرانا ہم مسکرا چکے!

راجہ نور محمد خان ——— اٹک

بیٹھے بٹھائے ہم نے بھی پالا ہے کیسا روگ
ہم مسکرائے نہ کبھی دل لگی کے بعد

تمنا اختر ——— مردان

کیا خبر تھی کہ خزاں ہوگی مقدر اپنا
میں نے ماحول بنایا تھا بہاروں کے لیے

راحیلہ جاوید اقبال ——— دوبئی

نہ ہی مل سکا ٹھکانہ میری بے قراریوں کو
کبھی رو کے رات کاٹی، کبھی رو کے دن گزارا

منزہ یعقوب وفا ——— خانپور

صرف چلنے کی خوشی تحفۂ منزل ہے ندیم
راستے تو سبھی دشوار ہوا کرتے ہیں

ایم شمس دین ——— سیالکوٹ

جب دل اداس ہوا تیرا نام لے لیا
کتنی عقیدتیں ہیں تیرے نام سے

ایم اسحاق ناز ——— ڈنوال

نہیں مجھے نہ جگاؤ کہ میرے خوابوں میں
تمہارا عکس مجھے اب بھی پیار کرتا ہے!

عبدالقیوم ——— اٹک

خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم،
نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں
میرے تو دل میں اتر گیا وہ

شعر

حریت لبنیٰ ——— پتوکی

مجھ کو برگشتہ مقدر کے سوا کچھ نہ ملا
محبوب کی چاہ میں پتھر کے سوا کچھ نہ ملا
میں نے قدم رکھا تھا لاکھ سنبھل کر لیکن
جادۂ عشق میں ٹھوکر کے سوا کچھ نہ ملا

راحیلہ کلیم رعنا ——— الریاض

دنیا نے ضبطِ غم کے سلیقے سکھا دیئے
حد سے جو بڑھا درد تو ہم مسکرا دیئے

عبدالقادر بلوچ ——— الریاض

دل کی چاہت کو راز غم سے آگاہ کر دوں اسے
خوف آتا ہے مگر جلتی ہوئی بجلی سے مجھے

روبی خان ——— ایبٹ آباد

بے اثر ہوتے نہیں آنسو کسی ناکام کے
تجھ کو بھی رونا پڑے اک دن دل تھام کے

خدیجہ بلی ہمراز ——— سیالکوٹ

ہمراز کس دوزخ کی بات کرتے ہیں یہ واعظ
انتظارِ محبوب کا سماں کسی دوزخ سے کم نہیں

نیاحسن دکھی دیوانہ ——— سیالکوٹ

ہر بار اشکوں سے تر ہو گئیں آنکھیں میری
میری وفا نے جب بھی میری خبری کا ماتم کیا

محمود ——— پنڈ عیدن

آ جا کہ تیرے وعدے پہ موت کو ہم نے
ٹالا ہے آج بڑے اہتمام کے ساتھ

ام شبیر اختر ——— لالہ موسیٰ

تجھے دیکھ کر اچانک میں خوشی سے رو دیا تھا
ناہید میرے آنسوؤں پہ مت جا مجھے کوئی غم نہیں

شبیر حسین ——— الہ مالم

میں گر پڑا تو خوب سنبھالا دیا مجھے
یاروں نے بڑھ کے دیس نکالا دیا مجھے
میں نے کہا زہر سے بھی تیز کوئی چیز ہو
ساقی نے زندگی کا پیالہ دیا مجھے

رخسانہ ناز ——— شورکوٹ

آنکھ نے ایکٹ کیا دل نے کریکٹ کیا
ہزاروں کو مس کر کے سلیکٹ کیا
میرے ایکٹ نے ڈائریکٹ دل پہ فیلٹ کیا
ہم تھے تمہارے، تم نے کسی اور کو کیوں سلیکٹ کیا

مسز بشریٰ گلزار ——— میرپور

چھیڑتے ہو کیوں مجھے کیوں پوچھتے ہو حالِ دل
کیا میرے رنگِ تبسم سے نمایاں کچھ نہیں

ایم یٰسین شبلی ——— اسلام آباد

دل توڑ کے جانیوالے سُن، دعا و دید کے رشتے باقی ہیں
اک سانس کی ڈوری اٹکی ہے اک پریم کا بندھن باقی ہے

شاہد اقبال عاصی ——— راجن پور

ہم نے دیکھا ہے کہ دولت کے حسیں شانوں پہ
لوگ آرام سے غیرت کو سُلا دیتے ہیں

ساجدہ کنول ——— راجن پور

جلا وہ آگ محبت کی میرے سینے میں
خیال منیر کا آئے تو راکھ ہو جاتے !

اعجاز احمد اعجازی ——— کابیکی

لٹ گئے ہیں جب سے سرِ منزل اعجاز
شکستہ دل حسرتوں کا مدفن بنا دیا

وسیم اسلم ساقی ——— میانوالی

کبھی تو میری محبت کا تم یقین کر لو
کہیں عمر گزر نہ جائے آزماتے ہیں

خالد محمود ——— اسلام آباد

کہہ تو رہا ہوں دیر سے میں ان کو اے عدم
کر لو یہیں قیام زمانہ خراب ہے

قاضی غلام مصطفیٰ ——— لپفرا

ہر تبسم میرے ہونٹوں کا فسانہ ہو گیا
آتشِ دل کو بھڑکتے اک زمانہ ہو گیا
میں نے کب چاہا تھا عشق زندگانی کا مزا
غم ملا جو میرے اشکوں کا بہانہ ہو گیا

شعر

ایم صابر حسین ——— الطائف

دیکھنا ہے کہ کہاں تک ہے محبت کی جائے
اب تو بھی یہ ہے کہیں ٹوٹ کے نفرت کی جائے
نگلیاں اُس پہ بھیں حرف ترا شیں سانسیں
اس طرح درسِ تمنا کی ریاضت کی جائے

ایم ٹی ڈی اے ——— دوحہ قطر

بھول جانے کا بھی کیسے تصور کر لوں
میرے ہر خواب کی روشنی ہو تعبیر ہو تم

شاہد سلیم شہزاد ——— احمد پور شرقیہ

تو جو کرتی تھی کچھ گوڑے کی باتیں
کچھ تو یاد کر وہ پرانی ملاقاتیں

ایس اے ناصر ——— ملوٹ اے کے

اس پہ رو تا ہے کہ دل میں جو نہاں تھے اسرار
وہی آنکھوں سے چھلکے آنسو بن کر

رضا الماس ——— چکوال

کوشش کر آزادانہ ہوں جان نذر کرنے کے لیے
آزما سکتا ہے مجھے اک صدا دے کر بھی تو

اکرم خان بابو ——— جدہ

سنو دل سے جو لپٹا غلافِ کعبہ سے
خدا کی قسم اس کی پھر بگڑی نہیں کبھی!

ایم عباس انجم ——— مسقط

مجھے اپنے ضبط پہ ناز تھا سرِ بزم رات یہ کیا ہوا
میری آنکھ کیسے چھلک گئی مجھے رنج ہے یہ بُرا ہوا

ایم شمیم اختر ——— کوئٹہ

صورت اپنی دکھا جاؤ ہم کو خدا کے واسطے
جان جاتی ہے اب آ ؤ خدا کے واسطے

شیخ عابد حسین ——— سعودی عرب

اپنے منفی رویے پر کچھ غور کر
کیا یہی رسمِ دنیا یہی دستور ہے؟
میں تیرے گیت لکھوں قصیدے کہوں
تو جہاں جائے میری برائی کرے!

لیاقت نذیر چوہدری ——— مدینہ المنورہ

تیرے شہر میں کس کو لکھوں عید مبارک
ہے میرا کون کس کو لکھوں عید مبارک
تم عید کے دن آ کے لپٹ جاؤ گلے سے
دل شاد ہو جب تم سے کہوں عید مبارک

ریحانہ کوثر ——— شاہدرہ

ہوا کے رخ پہ نشیمن بنائے بیٹھے ہیں
کبھی تو لائے گی بادِ صبا پیغام تیرا

ایم عبدالغفور راجہ ——— الریاض

نئی بہار کو میں نے زندگی دی ہے
میں فصلِ گل کا پیامی ہوں اعتبار تو کر

کلثوم صنم ——— کراچی

کھولا جو بزم غیر میں میں نے وفا کا راز
کچھ کہہ نہ سکے جب تو وہ جھنجلا کے رہ گئے!

نیلو فر اختر ——— مجید

تڑپ کر سوزِ دل کو جلوۂ ساماں کر لیا میں نے
بہت بے نور تھی دنیا چراغاں کر لیا میں نے

حمید احمد ندیم ——— سیالکوٹ

جس طرح خواب میرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی!

ذوالفقار علی ——— پلانوالہ

مجھے زمیں پہ بھیج دیا خیر مصلحت اس کی
تجھے تو چاند بنایا تھا آسماں کے لیے

مہربان محمد ——— دوبئی

یوں بے قرار سی آنکھوں میں کچھ قرار آیا
میری طوفانی زندگی میں کچھ پیار آیا

ایم اکرم ضیاء ——— ابوظہبی

کون کرتا ہے کسی کو یاد مر جانے کے بعد
قبر پہ آکر نہ جھانکے کوئی مر جانے کے بعد
زندگی تک ہی سارے باتیں بنانے والے
بھول جاتے ہیں سبھی بس خاک میں جانے کے بعد

مختصر اشتہارات

جواب عرض کے تمام قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہم نے ایک نیا کالم "مختصر اشتہارات" متعارف کیا ہے۔ یہ اشتہارات بالکل مختصر شائع کیے جائیں گے۔ آپ صرف دو روپے (۲/-) کے ڈاک ٹکٹ کے ہمراہ نیچے دیئے ہوئے کوپن کو پُر کر کے ہمیں ارسال کر دیں۔ یہ اشتہارات صرف ذاتی نوعیت کے شائع کیے جائیں گے۔ تجارتی مقاصد یا پروفیشن کے لیے اشتہارات قبول نہیں کیے جائیں گے۔۔ نیز جن کوپن کے ہمراہ ڈاک ٹکٹ نہیں ہوں گے وہ ضائع کر دیئے جائیں گے۔ جبکہ غیر ممالک میں مقیم قارئین ڈاک ٹکٹ کے بغیر بھی اپنے اشتہارات ارسال کر سکتے ہیں۔۔۔۔ (ادارہ)

یہ کوپن جوابِ عرض میں مختصر اشتہارات کیلئے استعمال کریں

جوابِ عرض کے اس کالم میں بالکل مختصر اشتہارات شائع کیے جاتے ہیں۔ فون کے ذریعے کوئی اشتہار قبول نہیں کیا جائے گا۔ اشتہار کا مضمون بے حد مختصر، انتہائی واضح اور خوشخط انداز میں ہونا چاہیے۔۔۔۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

اس کوپن کو مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کریں:

انچارج مختصر اشتہارات ماہنامہ جوابِ عرض ،، لنبٹ روڈ۔ لاہور

یہی ہے آرزو میری

اگر آپ کوئی اچھا اور خوبصورت آئیڈیل تلاش کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں لکھ کر بھیجئے۔ شاید آپکی کوئی آرزو پوری ہوجائے اور آپ کا گھر بس جائے۔ پاکستان سے اس کام میں شرکت مہینہ کی فیس صرف دس روپے ہے۔ فیس کے ہمراہ اپنے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی لازمی روانہ کریں۔ آپ دس روپے کا منی آرڈر ماہنامہ جواب عرض،، لسبت روڈ لاہور کے نام ارسال کریں اور منی آرڈر کی رسید شناختی کارڈ کی کاپی کے ہمراہ ہمیں ارسال کردیں۔ آپ دس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھی ارسال کرسکتے ہیں۔ جن خطوط کے ہمراہ منی آرڈر کی رسید شناختی کارڈ کی کاپی یا ڈاک ٹکٹ نہیں ہوں گے، وہ ضائع کردیئے جائیں گے۔ بیرون ممالک میں رہنے والے پاکستانی حضرات بیس (-/۲۰) روپے کا بینک ڈرافٹ شہزادہ عالمگیر کے نام بنواکر ارسال کریں۔ علاوہ ازیں بند لفافے میں کسی قسم کی بھی نقد کرنسی ارسال نہ کریں، کیونکہ یہ طریقہ غیر قانونی ہے ایسے تمام خطوط کسٹم حکام کے حوالے کردیئے جائیں گے۔ (ایڈیٹر)

نگران: یہی ہے آرزو میری۔ دفتر ماہنامہ جواب عرض،، لسبت روڈ لاہور

میں شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ ... گھرانے سے تعلق ہے۔ میری عمر ۲۲ سال ہے، اور میں عرصہ دو سال سے عراق کی ایک پرائیویٹ فرم میں فورمین کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ میری ماہانہ آمدن چھ ہزار روپے پاکستانی ہے۔ مجھے ایک ایسی شریک حیات کی ضرورت ہے جو نیک سیرت اور خوب صورت ہو۔ اگر غریب بھی ہو تو کوئی بات نہیں لیکن شریف خاندان سے ہونی چاہیئے۔ لڑکی کی عمر ۱۶ سال کے لگ بھگ ہو جبکہ تعلیم کم از کم مڈل ہو جہیز کے بارے میں کوئی کسی قسم کی شرط نہیں۔ لڑکی تھوڑی دیہاتی اور خوش اخلاق ہو۔ مزید معلومات کے لیے والدین یا سرپرست براہ راست لکھیں۔

(عبدالستار بیگ مکتب حاجی اسماعیل ایکس ایجوار العزیز خانہ النقدیہ الانبار الرمادی العراق)

میں عرصہ تین سال سے سعودی عرب میں مقیم ہوں میری ماہانہ آمدن آٹھ ہزار روپے پاکستانی ہے۔ جبکہ میری عمر ۲۲ سال ہے۔ مجھے ایک خوب صورت نیک سیرت نیک صورت، صوم و صلوٰۃ کی پابند، عقیدہ اہل سنت والجماعت شریک سفر کی آرزو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کا دیا میرے پاس بہت کچھ ہے اس لیے جہیز جیسی لعنت کا بھی آرزومند نہیں جبکہ ذات پات کا بھی قائل نہیں کہ ساری مخلوق خدا کی پیدا کردہ ہے۔ خواہشمند لڑکی

سے براہ راست رابطہ کریں۔

(الحاج عبداللہ محمد جابتاز، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۳۷، خمیس مشیط۔ سعودی عرب)

سیالکوٹ کی محترمہ آر۔ اے صاحبہ کے نام!

آپ کا خط مجھے مل گیا ہے۔ آپ کی باتیں، خیالات اور جذبات مجھے پسند آئے ہیں۔ مہربانی فرماکر آئندہ مجھے پوری تفصیل سے خط لکھیں اور جب بھی آپ لاہور تشریف لائیں مجھے بذریعہ خط پہلے اطلاع دیں، اور پھر ضرور مجھ سے ملیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گا۔

اس کے علاوہ بھی مجھے چند ایک ایسے خطوط

ملے ہیں جن میں لکھنے والوں نے ہمدردی کا اظہار تو ضرور
فرمایا ہے مگر انہوں نے اپنا نام پتہ درج نہیں کیا۔
میں ایسے تمام دوستوں سے التماس کرتا ہوں کہ اگر
کوئی واقعی میرا گھر بسانے میں میری اخلاقی مدد کرنا چاہتا
ہے تو براہِ کرم اپنے مکمل کوائف سے آگاہ کریں
میں بے حد ممنون رہوں گا . . .
(ایم ایس مغل، پی او بکس نمبر ۱۴۲۸، لاہور پاکستان)

ہمسفر کے روپ میں محبوب کی تلاش :
زندگی کی ۳۰ بہاریں گزارنے کے باوجود میں
تشنۂ آرزو ہوں، شادی شدہ ضرور ہوں . . . مگر
وہ آئیڈیل نہیں ہے اور ناقابلِ برداشت جسمانی نقص
نہ ہوتا تو عقدِ ثانی کا ہرگز ہرگز سوچتا تک نہیں۔ اب
ضرورت پڑ ہی گئی ہے تو کیوں نہ دل کی بات کہہ دوں۔
میرا ستارہ حسن پرست ہے اس لیے میں دولت کا نہیں
بلکہ حسن کا پجاری ہوں۔ رفیقِ حیات کی صورت میں چاہے
جانے کے قابل محبوب کی ضرورت ہے کنواری، بیوہ،
مطلقہ خوبصورت، سمارٹ، شوخ و چنچل، ہنس مکھ
باوقار تعلیم یافتہ، جس کی عمر ۲۵ سال کے لگ
بھگ ہو، کا عمر بھر کے لیے سنگ درکار ہے۔ رسم و
رواج سے مجھے نفرت ہے، جبکہ ذات پات اور جہیز
کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میری ماہانہ معقول آمدن ہے۔
خود مختار لڑکیوں کو ترجیح دی جائے گی۔ اس لیے ہو سکے
تو وہ اپنے مکمل کوائف کے ہمراہ اپنی تصویر بھی ضرور ارسال
کریں، تاکہ نہ آپ کا اور نہ میرا وقت ضائع ہو، تاہم
ساری خط و کتابت صیغۂ راز میں رہے گی۔
(شاہین باغ روڈ۔ ملتان)

میری عمر ۲۸ سال اور تعلیم میٹرک ہے سرکاری ملازم
ہوں۔ حسین و شکیل نوجوان ہوں۔ مگر بہت ہی دکھی
انسان ہوں۔ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ میں
شریف اور خوش اخلاق انسان ہوں۔ میرے والدین
ضعیف العمر نابینا اور معذور ہیں۔ میرا ایک ڈیڑھ
اپریل ۸۳ء
سالہ بچہ بھی ہے۔ مجھے ایک ایسی شریف اور نیک سیرت
لڑکی کا رشتہ درکار ہے جو میرے بچے اور میرے ماں
باپ کی حفاظت کر سکے۔ میں پہلی بیوی کو چھوڑنا چاہتا
ہوں کیونکہ اس نے میرے بوڑھے والدین پر بہت ہی
ظلم و ستم کیے ہیں۔ پھر بھی میں نے بڑے صبر سے کام لیا
ہے اور بڑے پیار سے اسے سمجھایا ہے مگر اس کے
کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ اسی لیے دوسری شادی کرنا
چاہتا ہوں جو میرے دکھ کو اپنا دکھ جانے۔ ذات پات
اور جہیز کی کوئی پابندی یا ضرورت نہیں۔ بس لڑکی کا
شریف اور نیک سیرت ہونا لازمی ہے۔ کنواری بیوہ
یا مطلقہ سب قابلِ قبول ہوں گی۔ سرپرست یا بنات
خود لڑکیاں بھی رجوع کر سکتی ہیں۔
(راجہ محمد صفدر خان معرفت یہی ہے آرزو اپریل ۸۳ء
جواب عرض ۷۷۔ نسبت روڈ۔ لاہور)

آرزو ہے مجھے ایک ایسی ہمسفر کی جو نہایت ہی
سلجھی ہوئی خوبصورت، خوب سیرت اور اس کی
تعلیم کم از کم ایف اے ہو۔ میں نہایت ہی خوش مزاج
ہوں، میری تعلیم بی۔ اے ہے۔ عرصہ چار سال
سے سعودی عربیہ میں سروس کر رہا ہوں۔ اللہ کا دیا
ہوا میرے پاس سب کچھ ہے، مگر مجھے اپنے خوبصورت
آئیڈیل کی تلاش ہے۔ ایسے والدین یا سرپرست بھی
لکھ سکتے ہیں، جو گھر داماد بنا کر رکھنے کے خواہش مند
ہوں۔ مگر خدا کے لیے لالچی اور خود غرض لوگ نہ لکھیں۔
پہلے ہی خط میں مکمل کوائف کے ہمراہ ایک عدد پاسپورٹ
سائز کی تصویر ضرور ارسال کریں۔

(MOHAMMAD SADAAT
TAHIR,
POST BOX NO. 17715
AL-RIYADH
SAUDI ARABIA)

میں جوابِ عرض کے اس کالم کی وساطت سے اپنی
جواب عرض لاہور

زندگی کی شریکِ سفر تلاش کرنا چاہتا ہوں۔ میں عرصہ پندرہ سال سے یہاں پر مقیم ہوں۔ میں اپنا ایڈریس ظاہر کرنا نہیں چاہتا اس لیے خواہش مند جواب عرض کے اسی کالم کی وساطت سے میرے ساتھ رابطہ کر کے مزید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

(ارشاد احمد، ظہران سعودی عرب، معرفت یہی ہے آرزو اپریل ۸۳ء جواب عرض ۷۷۔ نسبت روڈ۔ لاہور)

میری عمر ۲۸ سال ہے۔ مسقط میں میرا اپنا ذاتی کاروبار ہے جس سے ماہانہ آمدنی پندرہ ہزار پاکستانی روپے کے لگ بھگ ہے۔ میری تعلیم ایف اے ہے۔ مجھے ایک ایسی شریکِ حیات کی ضرورت ہے، جو نہایت با شریف اور صوم و صلوٰۃ کی پابند ہو ذات پات کی کوئی قید نہیں، لڑکی صرف مسلم ہو۔۔ نیز جہیز وغیرہ کی بھی مجھے ضرورت نہیں۔ خواہش مند حضرات اور والدین براہِ راست مکمل کوائف کے ہمراہ لڑکی کی تازہ ترین تصویر ضرور ارسال کریں۔ واضح رہے کہ تمام خط و کتابت صیغۂ راز میں رہے گی۔

(خالد محمود، پوسٹ بکس نمبر ۳۷۳ روی سلطنت آف عمان۔)

میری عمر ۳۲ سال ہے اور عرصہ تین سال سے سعودیہ کے شہر الدمام میں سروس کر رہا ہوں۔۔ جس سے ماہانہ آمدن آٹھ ہزار روپے پاکستانی ہے۔ مجھے اپنی زندگی کا ایسا ساتھی درکار ہے جو نیک سیرت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب صورت اور با اخلاق بھی ہو۔ اس کے چہرے پر ہمہ وقت دلکش مسکراہٹ بکھری رہے۔ اس کی تعلیم کم از کم مڈل تک ضرور ہو۔ نماز روزے کی سختی سے پابند ہو اور مجھے بھی اپنی لائن پر لگا لے میں جہیز کا کوئی مطالبہ نہیں کروں گا جبکہ ذات پات کا میں قائل نہیں۔ لیکن اس صورت میں لالچی لوگ زحمت نہ کریں۔ خواہش مند والدین یا سرپرست مکمل کوائف کے ساتھ براہِ راست رابطہ کریں۔ تصویر کی مجھے ضرورت نہیں کہ میں انسان کی زبان پر اعتبار کرنے والا ہوں۔

اپریل ۸۳ء

MOHAMMAD MUNAWAR HUSSAIN
POST BOX NO. 3057
DAMMAM, SAUDI ARABIA.

؎ محفل میں روشنی ہے کچھ لوگ کہہ رہے ہیں
یہ پیار بندگی ہے کچھ لوگ کہہ رہے ہیں۔

محترمہ نگہت صاحبہ کے لیے!

میں عرصہ تین سال سے یہاں بلجیم کی ایک فرم میں کام کر رہا ہوں۔ ماہانہ آمدن دس ہزار روپے پاکستانی ہے۔ خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ میری عمر ۲۹ سال اور تعلیم ایف ایس سی ہے۔ میں نے اپنے خاندان سے باہر شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے۔ پاکستان میں ہمارا اپنا گھر اور زمین ہے۔ جہاں پر خاصی پیداوار ہوتی ہے۔۔۔

مجھے بھی ایسی ہی رفیقِ حیات کی ضرورت ہے جو نماز روزے کی سختی سے پابند ہو۔ شریف اور اعلیٰ اخلاق کی مالک ہو۔ میرا تعلق مغل خاندان سے ہے۔ جہیز وغیرہ کی قطعی ضرورت نہیں۔ پہلے ہی خط میں تصویر ضرور ارسال کریں۔ لڑکی اگر یہاں آ کر ملازمت کرنا چاہے تو اس کی بھی اجازت ہوگی۔ مزید تفصیلات براہِ راست خط لکھ کر حاصل کریں۔

(SAEED KAMAL
ALBRECHT
RODENBACHSTR- 27
2200 BORGERHOUT
BELGIUM)

آرزو کے دل!

خداوند قدوس نے دنیا کو ہر آسائش سے مالا مال کر رکھا ہے۔ صرف زندگی میں ایک مسکراتی ہوئی بہار کی کمی ہے۔ بے کوئی بہاروں کی ملکہ جو میرا
جواب عرض لاہور

زندگی بھر کا ساتھ دے سکے۔

نہ کوئی جہیز کا مطالبہ کروں گا اور نہ ہی حق مہر رکھوں گا۔ ذات پات کی بھی قید نہیں۔ اگر کسی بھی خواہش مند کی آرزو ہو تو وہ براہ راست رابطہ کر کے تفصیلات طے کر سکتا ہے۔

(H.R.H. PRINCE AHMED-
BIN-ABDUL-AZIZ
AL-RIYADH,
SAUDI ARABIA.)

میں عرصہ سات سال سے سعودی عربیہ میں ملازمت کر رہا ہوں۔ جس سے ماہانہ آمدن چھ ہزار روپیہ پاکستانی ہے۔ میری عمر ۳۰ سال ہے۔ مجھے ایک نہایت ہی خوبصورت، شوخ چنچل ماڈرن سی لڑکی کی زندگی بھر کے لیے ساتھ درکار ہے، جس کی عمر بائیس سال تک ہو۔ خواہش مند حضرات اور والدین میری لڑکی کی تصویر اور مکمل کوائف کے براہ راست رابطہ قائم کریں نیز خود مختار لڑکیاں بھی اپنی تصویر کے ہمراہ رابطہ کر سکتی ہیں۔ واضح رہے کہ لڑکی کو شادی کے بعد سعودیہ میں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔ جبکہ جہیز اور ذات پات کی کوئی پابندی نہیں۔

(نذیر احمد، پوسٹ بکس نمبر ۱۵۰۲ اور ۳۱۹۰
مدینۃ المنورہ۔ سعودی عرب)

میں ایک حساس دل، سنجیدہ اور سچائی پسند انسان ہوں۔ عرصہ چار سال سے یہاں پر مقیم ہوں۔ ماہانہ آمدن ساڑھے بارہ ہزار روپے پاکستانی ہے۔ میں آرمی میں ملازم ہوں۔ دراز قد اور سفید رنگ کا ۲۹ سالہ نوجوان ہوں۔ مجھے ایک ایسی ہمسفر کی آرزو ہے جو کہ لیڈی ڈاکٹر، یا ایف ایس سی فیلو، یا ایئر ہوسٹس ہو۔ یا پھر جس کی تعلیم کم از کم ایف اے ہو۔ عمر ۲۰ سے ۲۸ سال کے درمیان ہو۔ گورا رنگ دراز قد اور نیک سیرت ہو۔

ذات پات اور جہیز کی کوئی قید نہیں۔ خواہش مند والدین پہلے ہی خط میں مکمل کوائف براہ راست بھیجیں، جبکہ خود مختار لڑکیاں اگر لکھیں تو اپنے کوائف کے ہمراہ تصویر ضرور ارسال کریں ورنہ جواب نہ دوں گا۔ اور تمام خطوط صیغۂ راز میں رہیں گے۔

(ایم۔ ڈی۔ کیو۔ اعوان، پوسٹ بکس نمبر ۴۲۰۷
ابوظہبی (یو۔ اے۔ ای))

جواب عرض کا یہ کام بہت ہی مفید جا رہا ہے میں بھی اس کام کے ذریعے ایک خوبصورت، نیک سیرت صوم و صلوٰۃ کی پابند شریک حیات کا آرزو مند ہوں۔ جہیز کی ضرورت نہیں۔ لڑکی کی عمر ۱۸ یا ۱۹ سال اور تعلیم مڈل یا میٹرک ہو۔ جو دکھ سکھ میں ایک ساتھ عمر گزار سکے۔

میری عمر ۲۸ سال اور تعلیم میٹرک ہے۔ عرصہ چھ سال سے یہاں پر ایک مقامی کمپنی میں ملازمت کر رہا ہوں۔ جس سے ماہانہ آمدن دس ہزار روپے ہے۔ میں سید خاندان سے ہوں۔ شادی کے بعد لڑکی کو میرے ساتھ جدہ سعودی عرب میں رہنا ہوگا جس کے لیے کوئی عذر قابل قبول نہ ہوگا۔ غریب اور کنواری لڑکیوں کو ترجیح دی جائے گی۔ والدین یا سرپرست پہلے ہی خط میں مکمل کوائف کے ہمراہ تصویر ضرور ارسال کریں مگر خدارا فریبی، دھوکے باز اور لالچی لوگ زحمت نہ کریں ورنہ جواب نہ دوں گا۔۔۔

(سید سکندر علی، پوسٹ بکس ۶۴۷۷
جدہ۔ سعودی العربیہ)

دکھی دل ہمسفر کی آرزو!

میرے کزن کی عمر ۲۸ سال اور تعلیم انڈر میٹرک ہے۔ لاہور میں لیڈیز ہیئر ڈریسر کا کام کرتے ہیں، جس سے ماہانہ آمدن ایک ہزار روپے ہے لیکن ان پیسوں کو سنبھالنے والا کوئی نہیں۔ ہم سکھ فیملی سے ہیں۔ آج سے سات سال پہلے ان کی شادی ہوئی تھی جس سے

جواب عرض لاہور

ایک بچہ بھی ہوا مگر اچانک ان کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ اب وہ زمانے کو ستائی ہوئی کسی غریب سی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں، چاہے لڑکی بیوہ یا مطلقہ ہی کیوں نہ ہو۔ ذات پات کی کوئی قید نہیں اور نہ ہی جہیز کی کوئی پابندی ہے۔ ہاں البتہ لڑکی قرآن پاک پڑھی ہوئی اور صوم و صلوٰۃ کی پابند ہو۔ لالچی حضرات خط لکھنے کی زحمت نہ کریں۔ خواہش مند والدین اور سرپرست پہلے ہی خط میں مکمل کوائف سے آگاہ کریں۔ خود مختار لڑکیاں بھی لکھ سکتی ہیں۔

(محمد اشرف ساقی لائن مین گریڈ سیکنڈ پرانا بجلی گھر واپڈا کالونی کوارٹر نمبرا شیخوپورہ شہر)

میری عمر ۲۷ سال اور تعلیم ایف اے ہے ایک سرکاری ادارے میں بطور اسسٹنٹ ملازمت کر رہا ہوں۔ جس سے ماہانہ آمدن بارہ سو روپے ہے۔ یو۔پی گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ مجھے یو پی گھرانے کی ہی ایک نیک سیرت، قبول صورت، با اخلاق۔۔ خوش مزاج، صوم و صلوٰۃ کی پابند دوشیزہ کا زندگی بھر کے لیے ساتھ درکار ہے۔ جو میرے دکھ کو اپنا دکھ جانے اور خوشیوں میں بھی میرا ساتھ دے۔ لڑکی کی عمر ۲۰ سال کے لگ بھگ ہو اور تعلیم بھی میٹرک تک ہو تو بہتر ہے۔ میں زمانے بھر کی خوشیاں اس کے نام کر دوں گا۔ خواہش مند والدین براہ راست پہلے ہی خط میں مکمل کوائف سے آگاہ کریں۔ بالمشافہ ملنے والے حضرات پہلے خط کے ذریعے آگاہ کریں۔

(منیر رضا مفتی، اسسٹنٹ۔ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن لمیٹڈ۔ نزد چوک چوبرجی۔ لاہور)

دردمند قارئین کے نام!

میرا چھوٹا بھائی جو اس وقت تیس ۳۵ سال کی عمر کے درمیان ہے، جب وہ ابھی پانچ سال کا ہی تھا کہ ٹائیفائیڈ بخار کی وجہ سے یہ اپنی بصارت کھو چکا ہے۔ لیکن تب سے اس نے ہمت نہ ہاری اور لگاتار محنت سے پڑھتا رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے وہ بی اے/بی ٹی ہے اور گورنمنٹ ہائی اسکول میں سینئر انگلش ٹیچر ہے۔۔۔

مجھے اپنے اس بھائی کے لیے رشتہ درکار ہے، ہمیں کسی جہیز وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ بس لڑکی اچھی نیک سیرت اور قبول صورت ہو۔ صوم و صلوٰۃ کی پابند ہو۔ عمر ۲۵ کے لگ بھگ ہو، تعلیم بھی کم از کم مڈل یا میٹرک ہو۔ کوئی بہن یا والدین اس سلسلہ میں ہماری کوئی مدد کرنا چاہیں تو براہ کرم براہ راست لکھیں۔ ہم کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور جہلم شہر کے رہنے والے ہیں، لیکن پاکستان بننے سے پہلے ہی راولپنڈی شہر میں رہ رہے ہیں۔۔۔

(خواجہ محمود الرحیم لون مکان نمبر ۳/۱ بی آریہ محلہ نمبر ۲ گلی نمبر ۷ راولپنڈی)

مکمل خود مختار برسر روزگار صحت مند ملکی ہمزدہ پانچ فٹ سات انچ کا نوجوان ہوں۔ عمر ۲۲ سال اور تعلیم بی اے ہے۔ سرکاری ملازم ہوں، میری ماہانہ تنخواہ گیارہ سو روپے ہے۔ باکردار، خوش گفتار، خوش وضع، قبول صورت، ہنسنے ہنسانے والا نوجوان ہوں۔ زندگی کی کٹھن راہوں پر ایک ہمدرد خوب صورت، نیک سیرت، صوم و صلوٰۃ کی پابند، تعلیم یافتہ ہمسفر کی ضرورت ہے جو زندگی بھر میرا ساتھ نبھا سکے۔ ضرورت مند والدین یا سرپرست براہ راست فوری رابطہ کریں۔ لیکن خط میں لڑکی کی تصویر اور ہو سکے تو اس کے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ کا ہونا ضروری ہے تاکہ غیر سنجیدہ قسم کے لوگ فضول تنگ نہ کر سکیں۔ لالچی اور دھوکے باز زحمت نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔۔۔

(ایم اقبال آفس آف دی ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ چوک منڈا تحصیل کوٹ ادو ضلع مظفر گڑھ)

میں پنجاب کا رہائشی ہوں جو عرصہ پانچ سال سے یہاں پر سروس کے سلسلے میں رہ رہا ہوں۔ پاکستان اسٹیل ملز میں میری ملازمت ہے جس سے ماہانہ آمدنی اٹھارہ سو روپے ہے۔ میری عمر ۲۳ سال اور تعلیم میٹرک ہے۔ مجھے ایک نیک سیرت اور خوب صورت سی دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے۔ جس کی عمر ۲۴ سال کے لگ بھگ اور تعلیم مڈل تک ہو۔ جہیز اور ذات پات کی کوئی پابندی نہیں۔ لڑکی مذہبی اور شریف گھرانے سے ہو۔ خواہش مند والدین اور خود مختار لڑکیاں فوری رابطہ کریں۔ بیوہ لڑکیاں جن کی اولاد نہ ہو، وہ بھی رابطہ قائم کر سکتی ہیں۔ خدارا لالچی اور خود غرض لوگ رجوع نہ کریں۔

(تاج محمد صدیقی معرفت نیو چیکوال کامران بیکری اسٹور، نیو جیر کالونی، لانڈھی کراچی نمبر ۲۲)

میری عمر ۳۰ سال ہے۔ عرصہ سات سال سے سعودیہ میں مقیم ہوں۔ میری ماہانہ آمدنی چھ ہزار روپے ہے۔ مجھے ایک خوب صورت، نیک سیرت، سمارٹ، دراز قد دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے، جس کی عمر ۲۲ سال تک ہو اور تعلیم میٹرک تک ہو۔۔۔ شادی کے بعد لڑکی کو میرے سنگ سعودیہ میں رہنا ہو گا۔ خواہش مند والدین پہلے ہی خط میں مکمل کوائف سے آگاہ کریں۔ جبکہ اگر خود مختار لڑکیاں لکھنا چاہیں تو مکمل کوائف کے ہمراہ اپنی تازہ ترین تصویر ضرور ارسال کریں۔ واضح رہے کہ جہیز کا مجھے لالچ نہیں اور ذات پات کا میں قائل نہیں۔

(نذیر احمد، پوسٹ بکس نمبر ۵۰۲ ، مدینہ المنورہ۔ سعودی عرب)

میری عمر بیس سال ہے۔ میرا اپنا ذاتی کاروبار ہے۔ جس سے ماہانہ اوسط آمدنی دو ہزار روپے ہے اللہ تعالیٰ نے کا دیا میرے پاس سب کچھ ہے۔۔ مجھے اپنے لیے ایک ایسے آئیڈیل کی آرزو ہے

میری عمر تقریباً ۱۸ سال کے لگ بھگ ہو، اور جو اپنے شوہر کو خلوص دل سے چاہنے اور پیار کرنے والی ہو۔ سادگی پسند بھی ہو۔ خواہشمند والدین پہلے ہی خط میں مکمل کوائف کے ہمراہ تصویر ضرور ارسال کریں۔ ہر خط کا جواب ضرور دیا جائے گا۔

(محمد اختر جاوید مغل معرفت سعید خان جوکیدار شیر دستور شارقین گلی نمبر ۳ محلہ مجید کالونی۔ پوسٹ آفس ملا کلس آباد۔ ضلع گوجرانوالہ)

میں بہت ہی دکھی انسان ہوں۔ مجھے اپنی زندگی کے سفر کے لیے ایک ساتھی کی تلاش ہے۔ جو خوبصورت چاہے ہو نہ ہو، نیک سیرت ضرور ہو۔ دراز قد ہو، کنواری ہو، بے شک معمولی پڑھی لکھی ہو مگر ذرا اچھے خاندان سے ہو۔ اعوان خاندان سے ہو۔ مذہبی ہو۔ نماز روزے کی پابند ہو۔ خواہش مند سرپرست یا والدین تصویر کے ہمراہ براہ راست رابطہ قائم کریں۔ اگر کوئی لڑکی بذات خود لکھنا چاہے تو پہلے اپنے گھر والوں سے اجازت لے تاکہ میں بھی اسے بلا روک ٹوک جواب دے سکوں۔ مگر خدارا دھوکے باز زحمت نہ کریں۔۔۔

(ملک خان زمان، یونٹ نمبر ۶ بلڈنگ نمبر ۳ آپریٹر انکوری الیسٹرو ایس پی اے پی او بکس ۱۵ عراق)

میری تعلیم میٹرک ہے۔ رنگ گندمی اور قد پانچ فٹ سات انچ ہے۔ میری یہاں پر اپنی دکان ہے اور ایک ورکشاپ میں حصہ بھی ہے۔ اللہ کا مجھ پر بہت احسان ہے۔ لڑکی میٹرک پاس، خوب صورت اور نیک ہو۔ جبکہ خود مختار لڑکیاں پہلے قلمی دوستی بھی کر سکتی ہیں تاکہ میں اسے اور وہ مجھے سمجھ سکیں۔ لڑکی کی عمر ۲۵ سال تک ہو۔ شادی کے بعد اگر وہ یہاں آنا چاہے گی تو یہ بھی میں کر سکتا ہوں۔ فوری رابطہ کریں۔

(ایم انور خان پی او بکس نمبر ۲۲، المنطقۃ الشمال ضباء السعودیہ)

فوراً ارسال کریں۔ تمام خط و کتابت صیغۂ راز میں رہے گی اور ہر خط کا جواب دوں گا۔

(دلاور خان اعوان، پوسٹ بکس نمبر ۴۳۹۴۱ ابوظہبی (یو اے ای)

میں زندگی کی ۲۲ بہاریں دیکھ چکا ہوں۔ سید خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ عرصہ تین سال سے میں سعودیہ میں سروس کر رہا ہوں۔ جس سے ماہانہ آمدن تقریباً ۹۰۰۰/- ہزار روپے پاکستانی ہے۔۔ مجھے ایک ایسی دوشیزہ کا رشتہ درکار ہے جس کی عمر ۱۸ سال تک ہو۔ خوب صورت اور اسمارٹ ہو اور ساتھ ہی ہنس مکھ اور خوش مزاج بھی ہو۔ کراچی اور پنجاب کے رہنے والوں کو ترجیح دی جائے گی۔

مکمل کوائف کے ہمراہ والدین یا خود مختار لڑکیاں بلا خوف لکھ سکتی ہیں۔ تمام تحریریں راز میں رکھی جائیں گی اور ہر خط کا جواب بھی دوں گا۔

(RAZA SHAH
ROOM NO 443Q
POST BOX NO. 2737
AL-RIYADH,
SAUDI ARABIA)

میری عمر ۲۳ سال ہے اور میں یہاں سعودی عرب میں ایئر کنڈیشنز کا کام کر رہا ہوں۔ میں اعوان علوی خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ ماہانہ آمدن بے حد معقول ہے جسے ظاہر کر کے اہمیت نہیں دینا چاہتا۔ کسی ایسی لڑکی کو شریک حیات بنانا چاہتا ہوں جو پہلے مجھ سے خط و کتابت کرے۔ تاکہ میں اسے اور وہ میرے مزاج کو بخوبی جان سکے۔ کیونکہ یہ پیوند زندگی بھر کا ہوتا ہے۔ ذات پات کی قید نہیں۔

(افتخار الدین علوی، پوسٹ بکس نمبر ۱۰۵۲۵ الریاض۔ سعودی عرب)

میری عمر ۲۲ سال ہے اور تعلیم ایف اے ہے۔ گزشتہ ۸ ماہ سے عراق کی ایک کمپنی میں بطور اسسٹنٹ لیبارٹری کام کر رہا ہوں۔ جہاں سے ماہانہ تنخواہ ۵۰۰۰/- ہزار روپے پاکستانی لے رہا ہوں۔ مجھے ایک ایسی شریک حیات کی آرزو ہے جو خوب صورت اور نیک سیرت ہونے کے ساتھ ساتھ نماز روزے کی بھی پابند ہو۔ لڑکی کی عمر ۱۴ سے ۱۸ سال کے درمیان ہونی چاہیئے۔ اور نہایت ہی شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ خواہشمند والدین یا سرپرست مکمل کوائف کے ساتھ براہ راست رابطہ کریں۔

(KHAWAJA GHULAM MUSTAFA,
ROOM NO. A-13 (SORB)
LAB. ASSISTANT
B/NO. 4490,
POST BOX NO. 11
EXP. WAY NO. 1 D.T.P/G.T.M
HILLA SHUMALY
BUGHDAD IRAQ)

میں عرصہ سات سال سے ابوظہبی میں کام کر رہا ہوں۔ ستمگر زمانے کا ستایا ہوا اور غموں کا مارا ہوا ہوں۔ اس لیے اب چاہتا ہوں کہ جب غم ہی اٹھانے ہیں تو پھر شادی ہی کیوں نہ کر لوں۔ لہٰذا دلی آرزو یہ ہے کہ کوئی ایسی ہی ستم رسیدہ سی، نیک سیرت، خوب صورت، پرخلوص، بااخلاق، پیار کرنے والی، زندہ دل دوشیزہ کا ساتھ مل جائے، جو زندگی کے ہر موڑ پر مجھے اپنی چاہت اور محبت سے سرشار کرتی رہے۔۔۔

میں جہیز وغیرہ کا لالچی نہیں ہوں۔ میری عمر بیس سال اور تعلیم میٹرک ہے۔ اس لیے لڑکی کی عمر ۱۷ سے ۲۰ سال کے درمیان اور تعلیم کم از کم مڈل ضرور ہو۔ ذات پات کی کوئی پابندی نہیں۔ خواہشمند والدین اپنی بچی کے مکمل کوائف پہلے ہی خط میں براہ راست

(K. ARIF
POST BOX NO. 1856
AL-KHOBAR
SAUDI ARABIA)

میری عمر ۳۰ سال ہے، تعلیم مڈل ہے۔ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتا ہوں۔ پاک آرمی میں بطور ریڈار آپریٹر سروس کر رہا ہوں۔ چند سال قبل اپنے خاندان میں شادی ہوئی تھی جو کہ میری مرضی کے خلاف تھی۔ بلکہ یوں کہہ لیں کہ زبردستی کی شادی تھی۔ جو گھریلو ناچاقی کی وجہ سے ناکام ہو گئی۔ اب اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ لڑکی میری ہم مذہب ہو۔ اگر کچھ پڑھی لکھی ہو تو بہت بہتر ہے۔ لڑکی غریب گھرانے سے ہو کیونکہ میں خود بہت غریب ہوں۔ نیک سیرت، شریف اور خوبصورت ہو۔ جہیز وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ لالچی اور دھوکے باز زحمت نہ کریں۔ خواہشمند والدین یا خود مختار لڑکیاں براہ راست رابطہ قائم کر کے بات چیت کو مزید آگے بڑھا سکتے ہیں۔
(غلام حسین جعفری، بیڈ کوارٹر ۱۴، ایم۔ ٹی بٹالین اے ایس سی راولپنڈی)

میں اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس وقت میری عمر ۲۵ سال ہے۔ یہاں کویت میں چار سو دینار کویتی ماہانہ آمدن ہے۔ جو کہ پاکستانی تیس ہزار روپے بنتے ہیں۔ ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میرے پاس ہے۔ شادی کے بعد لڑکی کو عمر بھر کویت میں میرے پاس ہی رہنا ہوگا۔ سعودیہ عمرہ کرنے جاتا ہوں، اپنی بیوی کو حج کرانے کا بھی وعدہ کرتا ہوں۔ پاکستان کے شہر لاہور کا رہنے والا ہوں۔ لڑکی تھوڑا بہت پڑھی لکھی ہو اور عمر بیس سال کے لگ بھگ ہو۔
(ملک نعمت علی، پی او بکس نمبر ۲۱۹۲، الکویت العربیہ)

مس رخشندہ جبیں کے نام!
میں عرصہ چار سال سے سعودی عرب میں ایک معقول پوسٹ پر کام کر رہا ہوں۔ ماہانہ آمدنی بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ میری عمر ۲۵ سال اور تعلیم ایف ایس سی ہے۔ اگر آپ مناسب خیال کریں تو میرے ساتھ براہ راست رابطہ قائم کریں، ہو سکتا ہے یہ میرے لیے یا آپ کے لیے مفید ثابت ہو۔

میں زندگی کے اٹھائیس سال گزار چکا ہوں۔ محبت، خلوص اور پیار کے لیے زندگی کے خوبصورت لمحات منزل کے منتظر بیتے لمحوں میں گم سم رہا ہوں۔ مجھے کم از کم میٹرک پاس، روشن خیال، ہمدرد طبیعت کی مالک کم از کم تیس سال تک کنواری یا بیوہ ہو، کسی مذہب یا ذات سے تعلق ہو اگر ہنس مکھ ہو تو سونے پہ سہاگہ ہے، ورنہ دکھی تو اپنے ہی ہیں۔ میں خود بے غرض ہوں اور لالچ سے پاک انسانوں کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کرنے کو تیار رہتا ہوں۔ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں اور سلجھے ہوئے روشن خیالات رکھتا ہوں۔ پہلی ہی فرصت میں رابطہ قائم کریں۔
(خالد معرفت اکرم مشین شاپ، پونچھ روڈ شہید چوک۔ کوٹلی آزاد کشمیر)

میں اس دنیا کا ستایا ہوا ایک غریب انسان ہوں۔ تھرڈ کلاس انجینئر کا کام کر رہا ہوں۔ مناسب آمدنی ہے۔ مجھے ایک غریب گھرانے کی نیک سیرت خوبصورت اور مڈل پاس لڑکی کا رشتہ درکار ہے۔
(عبدالوحید معرفت ظہیر بک ڈپو، مین بازار۔ عبداللہ پور فیصل آباد)

محترم ظہور احمد صاحب کے نام!
آپ کا اشتہار جواب عرض میں نظروں سے گزرا۔ اور دل کو سکون ہوا۔ مدت میں تو سوچتا تھا کہ شاید میں ہی ایک بے سہارا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی عزیزہ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ آپ براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کریں اللہ بہتر کرے گا۔
(ایم مرزا محمد سلیم بیگ، پوسٹ بکس نمبر ۱۹۲۲ کیمپ نمبر ۲ بلاک نمبر ۸/۱۷ جدہ نمبر ۲۱۴۴۱ سعودی عرب)

دکھ درد ہمارے

پاکستان سے اس کالم میں شرکت کرنیکی فیس مبلغ -/۱۰ روپے ہے۔ فیس کے ہمراہ شناختی کارڈ کی فوٹو سٹیٹ کاپی لازمی ہے۔ دس روپے کا منی آرڈر ماہنامہ "جواب عرض"، نسبت روڈ لاہور کے نام کرائیے اور منی آرڈر کی رسید اپنے شناختی کارڈ کی کاپی کے ہمراہ ہمیں ارسال کر دیں۔ آپ دس روپے کے ڈاک ٹکٹ بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ جن خطوط کے ہمراہ شناختی کارڈ اور منی آرڈر کی رسید یا ڈاک ٹکٹ نہیں ہوں گے وہ ضائع کر دیئے جائیں گے۔ بیرون ملک رہنے والے پاکستانی حضرات بیس (۲۰) روپے کا بنک ڈرافٹ شہزاد عالمگیر کے نام بنوا کر ارسال کریں۔ نیز سر بند لفافے میں کسی قسم کی بھی نقد کرنسی ارسال نہ کریں۔ کیونکہ یہ غیر قانونی طریقہ ہے۔ ایسے تمام خطوط کسٹمز حکام کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ (ایڈیٹر)

نگران: دکھ درد ہمارے۔ دفتر ماہنامہ "جواب عرض"، نسبت روڈ۔ لاہور

ان بھائیوں کے نام اپنی ہم وطن بہنوں کے نام رسالوں میں چھپوا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ انسان کو زندگی میں کبھی نہ کبھی محبت ضرور ہوتی ہے۔ مگر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ جب اس لڑکی کی شادی کسی دوسری جگہ پہ ہو جائے تو اس کا نام دنیا میں پڑھے جانے والے مختلف پرچوں میں چھپوا کر ذلیل و رسوا کر دیا جائے۔ یا کسی لڑکی کی شکل و صورت اچھی ہوتی تو اس کا نام کسی نہ کسی طریقے سے معلوم کر کے رسالوں میں چھپوا دیا۔ خدارا! اپنے آپ کو باہمت اور سچے مسلمان بنایئے اور اپنے ملک کی ماؤں بہنوں کے نام چھپوا کر انہیں بدنام نہ کریں اور دوسروں کی بہنوں کا احترام کریں۔ تاکہ دوسرے بھی آپ کی بہنوں کا احترام کریں۔۔۔

جن کے نام آپ لوگ غلط طریقے سے پرچوں میں چھپواتے ہیں ان کے بھائی بہن، ماں باپ اور شوہر ہیں وہ اپنی بہنوں، بیٹیوں کے نام پڑھتے ہوں گے تو ان کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ یہ اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے اور فساد کو فروغ دیتی ہے۔ جس کی ہمارا مذہب قطعی اجازت نہیں دیتا۔ مجھے امید ہے کہ میرے بھائی میری اس اپیل پر ضرور توجہ فرمائیں گے۔

(چوہدری نذیر احمد الخزام الذھبی اسطالقت الشرقیہ شارع ملکاظ۔ سعودی عرب)

میں اس دنیا میں تن تنہا ہوں۔ نہایت ستم رسیدہ مصیبت زدہ، دکھی اور بے گھر ہوں۔ میں لاہور میں مستقل رہنا چاہتا ہوں۔ کاش! مجھے کوئی اپنے پاس رکھ لے۔ میں ان کا بھائی یا بیٹا بن کر زندگی کے

بقایا دن ان کی خدمت کرکے گزار دوں گا۔

مجھے خصوصاً ایک ایسے گھرانے کی تلاش ہے، جہاں مجھے ماں باپ اور بہن بھائیوں کا پیار مل سکے۔ مجھے خونی رشتوں سے بڑھ کر مخلص پائیں گے۔ یہ خیال رہے کہ میں لالچی اور خود غرض لوگوں کا ستایا ہوا انسان ہوں، میں ایک معزز خاندان کا فرد بھی ہوں مگر تقدیر نے مجھے تنہا اور بے یار و مددگار کر دیا ہے۔ میں تعلیم یافتہ اور ہنر مند بھی ہوں، جبکہ بزرگوں کی خدمت کرنے کا جذبہ دل میں رکھتا ہوں...

(امانت اللہ قریشی ہاشمی معرفت قاضی عبدالغنی درانی کوارٹر نمبر ۳۳/ایف گورنمنٹ سنٹرل کالونی وحدت روڈ - لاہور)

میں اس زمانے کا ستایا ہوا انسان ہوں۔ مگر تنہائی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ کاش کوئی مجھے بھائی یا بیٹا بنا لے۔ میں برسر روزگار ہوں۔ معقول ماہانہ آمدن ہے اگر کوئی مجھے سہارا دے تو میں ساری زندگی ان کے نام کر دینے کو تیار ہوں۔ مگر خدارا مجھے تنہائی کے سانپ سے بچا یا جائے۔ اگر کوئی بہن خط لکھے گی تو اسے اس کی پسند کا تحفہ دوں گا۔ بھائی کے خط پر بہترین گانوں کی کیسٹ روانہ کروں گا۔ مگر خدارا دھوکے باز اور فراڈیئے لوگ زحمت نہ کریں۔ میری عمر ۲۰ سال ہے اور میں ریکارڈنگ کا کام کرتا ہوں۔ کاش کوئی مجھے اپنا لے۔

(ارشد حفیظ ۴۔ میٹروپول بلڈنگ ایبٹ روڈ - لاہور نمبر ۶)

آر۔ ایس کے نام!

زیست کے اس سسکتے ہوئے سفر میں دس سال پہلے ہمارے درمیان ایک ناطہ قائم ہوا تھا مگر آج... میری آنکھوں کے جزیروں کا پانی بھی ختم ہو چکا ہے۔ میں تیری بے وفائی کے ہاتھوں زندہ لاش بن کر رہ گیا ہوں۔ میں ایسے دوراہے پر کھڑا ہوں جہاں ایک طرف خودکشی کی منزل ہے تو دوسری طرف دکھوں کی ایک سلگتی ہوئی اور کبھی نہ ڈھلنے والی وہ دوپہر ہے جس کی تپش سے میرے

وجود کا ہر حصہ جل کر راکھ ہو چکا ہے۔ میرا دل زخمی اور لہولہو ہو چکا ہے۔ میری خواہشوں کا شہر خموشاں کی نجانے کون سی قبر میں دفن ہو چکی ہیں۔ میں شکوہ کروں تو کس سے کروں... اپنی بربادی کا رونا کس کے آگے جا کر روؤں...

تمہیں اپنی خواہشوں کے ہجوم سے فرصت ملے تو مجھے اتنا ضرور بتانا کہ میری زندگی کو برباد کرکے آخر تجھے کیا ملا ہے۔ اگر اپنی بے وفائی کا ثبوت نہ دے سکو تو اپنی مجبوریوں کا ہی ثبوت دو کہ مجھے صائمہ کی اس بات کا یقین آ جائے کہ شادی سے قبل تم میری یادوں کے گلے مل کر بے تحاشا روتی تھیں...

نگاہیں ملا کر بدل جانے والے
مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں

(امجد علی کھوکھر زخمی، فریحہ مارکیٹ - گجرات شہر)

جیل میں بھائی اکرم کے نام!

یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی با وفا نہیں
لیکن پھر بھی ساتھ دیئے جا رہے ہیں!

آپ ... دل اور ... کہ آپ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے زندگی اور موت کی کشمکش میں دن گزار رہے ہیں۔ بزرگوں کا قول ہے کہ "مصیبتیں انسان کو بیدار کرنے کے لیے آتی ہیں نہ کہ پریشان کرنے کے لیے۔" آپ حوصلہ رکھیں، زندگی آپ کا ساتھ دے گی۔ آپ نماز پنجگانہ ادا کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی اور اپنی رہائی کی دعا کیا کریں۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ خزاں کے بعد بہار اور رات کے بعد دن کا اجالا لازمی ہے۔ کسی شاعر نے بھی کیا خوب کہا ہے۔

غم میں ڈوبے ہوئے تسکین میں ڈھل جاتے ہیں
جب کرم ہوتا ہے حالات بدل جاتے ہیں

(لیسین ملک، پی اور شاہدرہ راناٹاؤن۔ لاہور)

پیاری بہن نجمہ بانو کے نام!

جواب عرض میں آپ کا نام نظر سے گزرا... میں

آپ سے بہن بھائی کا رشتہ جوڑنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو منظور ہو تو مجھے اپنی مرضی سے آگاہ کریں۔
(سید وقار عباس شاہ، خیابان آٹو اسٹورز ڈیلرز موٹر پارٹس، ۱۹۔ تاج چیمبرز۔ بادامی باغ۔ لاہور)

خدمتِ خلق کے محسنوں کے نام!

میں غربت اور افلاس کے اندھیروں سے جنم لینے والا فاقہ کش اور غریب انسان ہوں۔ قالینوں کے کاشتکار کا ماہر ہوں، ٹرلیسر ہوں، ڈرافٹسمین کا کام کرتا رہا ہوں۔ پینٹنگ کی دوکان پر سیلزمین رہا۔ بلاک کا رنگ ساز ہوں۔ مگر مجبوریوں کی شورش کے نیچے دبا سسک رہا ہوں۔

میری عمر ۱۲ سال اور تعلیم میٹرک ہے۔ نماز کا پابند ہوں۔ اگر کوئی بھائی مجھے بیرونِ ملک بلا لے تو میں اس کی ایک ایک پائی ادا کر دوں گا۔ اور ساری زندگی اس کا احسان مند بھی رہوں گا...

(اشتیاق احمد معرفت رمضان پمپ ورکس آبادی فتح دین، پیپلز کالونی نمبر۲۔ فیصل آباد)

اپنے مسلمان بھائیوں کے نام!

میں ایک غریب مگر باعزت گھرانے کا فرد ہوں۔ لیکن اپنی غلطیوں کی بنا پر اپنے لیے بے شمار دکھ اور غم پیدا کر لیے ہیں۔ جس کی وجہ سے میں اپنا گھر، اپنے والدین اور بہن بھائیوں کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔ اور پھر اپنا شہر چھوڑ کر یہاں آ بسا۔ آج کل یہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل پر ملازمت کر کے زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں۔ کاش! کوئی بھائی مجھ پر ترس کھا کر مجھے بیرونِ ملک ملازمت دلوا دے۔ یا پھر کچھ رقم قرضِ حسنہ کے طور پر دے دیں جس سے میں اپنا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر سکوں۔ میں ایک پاؤں سے معذور بھی ہوں اور تعلیم میری انڈر میٹرک ہے۔ میں اپنے اس بھائی کا ساری زندگی احسان مند رہوں گا اور اللہ تعالیٰ بھی اسے اجرِ عظیم دے گا۔

اپریل ۸۷ء

(مسلمان رجا، وڈلا۔ محلہ نبی پورہ لال کنواں، متصل سٹریٹ متصل ڈاک خانہ نبی پورہ۔ لاہور)

ش۔ خ صاحبہ کے نام!

جوابِ عرض میں آپ کا اشتہار نظروں سے گزرا۔ اور بہت دکھ ہوا۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اور آپ کو مجبور بہن جان کر ہمیشہ کے لیے رقم معاف کر دوں گا۔ کس پتہ پر رقم ارسال کروں۔

(راجہ نور احمد بیرڈ قیصی، المدینہ کشیدہ کاری منوار بازار۔ جیکب آباد۔ سندھ)

★ راجہ صاحب! آپ ان کی امداد کی رقم ادارہ جوابِ عرض کو ارسال فرما دیں۔ ہم خود آپ کی رقم ان تک پہنچا دیں گے اور آپ کو اطلاع کر دیں گے۔ (ادارہ)

میں ایک غریب اور غمزدہ انسان ہوں اور غموں کے گھیرے میں پھنسا ہوا ہوں۔ بیرونِ ملک بہن بھائیوں سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے کہیں بیرونِ ملک ملازمت دلوا دیں۔ میری تعلیم صرف میٹرک ہے اور عمر اکیس سال ہے۔ اس کے لیے میں ساری زندگی اپنے اس بہن بھائیوں کا احسان مند رہوں گا۔

(صبغت اللہ معرفت میاں مختار احمد صاحب ڈی/۵۳ گورنمنٹ آفیسر کالونی گارڈن روڈ۔ کراچی)

باجی ایم تازہ صاحبہ کے نام!

جوابِ عرض فروری میں آپ کا کالم نظروں سے گزرا۔ میں آپ کو سگی بہن جان کر مخاطب کر رہا ہوں۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گی۔ اور بھائی جان کر مجھے اپنے جواب سے نوازیں گی۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا...

اپنے بارے میں صرف اتنا ہی لکھوں گا، کہ میں پاکستان کے ضلع جہلم کا رہنے والا ہوں اور عرصہ سات سال سے یہاں پر سروس کر رہا ہوں۔ اور میں نے اپنی زندگی میں خوشیاں بہت ہی کم پائی ہیں...

جواب الحق لاہور

اگر آپ نے براہِ راست جواب دینے کی زحمت گوارا کی تو پھر میں اپنے بارے میں تفصیل لکھوں گا۔
(م۔ ن۔ لطف اقبال، پوسٹ بکس نمبر ۶۶۱۲ روی۔ مسقط عمان)

ثمرین ناز صاحبہ کے نام!
جوابِ عرض فروری ۱۹۸۳ء کے شمارہ میں آپ کے شعر نے بہت متاثر کیا۔ آئندہ بھی جوابِ عرض کے ذریعے ایسے ہی خوبصورت شعر پڑھنے کو دیں۔
(محمد انور خان ۔ سعودی عرب)

شاہین ناز مینا کے نام!
آپ کے شعر نے بہت متاثر کیا۔ کاش سب بہنیں ایسے با مقصد جوابِ عرض میں دیا کریں۔
(محمد انور خان ۔ سعودی عرب)

ایک درد ایک اپیل!
معزز قارئین! میں آپ کی توجہ ایک اہم مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ نئی نسل کا رجحان اس طرف ہے، لیکن پہل کوئی نہیں کرتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ چند لوگ جنہوں نے اس دنیا میں صرف دکھ ہی دکھ جھیلے ہیں، بے سہارا ہیں، اس قدر مجبور ہیں کہ کیا بتاؤں۔ لیکن ان میں خودداری ہے۔ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے۔ کتنی لڑکیاں ہیں جن کے بال چاندی ہو چکے ہیں، لیکن مالی کمزوری کی وجہ سے ان کی ڈولی نہیں اٹھ سکتی۔۔ کچھ ایسی ہیں جو خوبصورت نہیں ہیں۔۔۔ اس لیے قابلِ قبول نہیں۔۔۔ کوئی اپاہج ہے۔ ذرا غور کریں کیا ان کا ہماری خوشیوں میں کوئی حق نہیں۔ ہمارا فرض بنتا ہے کہ اگر خدا نے ہمیں نعمتوں سے نوازا ہے تو ان کو بھی اپنی خوشیوں میں شریک کریں۔۔۔
میں ایک انجمن بنانا چاہتا ہوں۔ خاص طور سے بیرونِ ملک مقیم پاکستانی بھائی جن کے دل میں دردِ انسانیت ہو، وہ میرے ساتھ تعاون کریں۔ اور ایسی لڑکیوں کو

اپنائیں جو خوشی کی ایک مسکراہٹ کے لیے ترس رہی ہیں۔
قلمی دوستی کے کالم سے پتہ لے کر مجھے ایک بہن نے خط لکھا، جسے پڑھ کر میں تڑپ اٹھا۔ ایک نوجوان لڑکی جس کا کوئی بھائی نہیں، والد صاحب فوت ہو چکے ہیں۔۔ چھوٹی بہن زیرِ تعلیم ہے اور والدہ کی نظر خراب ہے۔ یہ صحیح معنوں میں ہماری امداد کی مستحق ہیں۔ میں نے اپنی اس بہن کے تمام تعلیمی اخراجات اور والدہ کے علاج کا ذمہ اٹھایا ہے۔ اگر بیرونِ ملک یا اندرونِ ملک صاحبِ ثروت ان کی امداد کرنا چاہیں تو میرے ساتھ رابطہ قائم کریں۔ میں ان کی تشہیر نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں البتہ مجھے خط لکھ کر پتہ لے سکتے ہیں۔ مگر خدارا گھٹیا ذہن کے لوگ دور ہی رہیں۔
(خالد محمود، پی او بکس ۴۴۶۷ ڈیرہ دوبئی یو اے ای)

پیاری باجی ناہید گل کے نام!
آپ کا کالم نظروں سے گزرا۔ اس کے تحت میں آپ سے مخاطب ہوں۔ میں سیفا نمان سے ہوں۔ ہم چار بھائی ہیں۔ والدین حیات ہیں۔ میں یہاں عرصہ چار سال سے ہوں۔ ماہانہ تنخواہ ۹ ہزار روپے ہے۔ میری عمر ۲۴ سال ہے۔ خداوند کریم نے حسن کی دولت سے بھی خوب نوازا ہے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کی ہر نعمت سے نوازا ہے۔ اگر کمی ہے تو صرف ایک باوفا محبت کرنے والی ہمشیرہ کی ہے۔ آپ کا کالم پڑھ کر بے اختیار آپ سے رابطہ کرنے کو جی چاہا ہے۔۔ اگر واقعی آپ نے مجھے ایک حقیقی بہن کا پیار دیا تو میں بھی ان شاء اللہ تعالیٰ تا زندگی اس مقدس رشتہ کو دل و جان سے نبھاؤں گا۔۔۔

اقوالِ زریں

* اگر تم ہنسو گے تو دنیا تمہارے ساتھ ہنسے گی مگر جب تم روؤ گے تو تمہیں اکیلا ہی رونا پڑے گا۔

بہن جی! اگر آپ نے براہ راست مجھے جواب لکھنا ہو تو پتہ حاضر ہے . . .

(سید فدا حسین شہزاد، پوسٹ بکس نمبر ۲۰۱۲، صفات - الکویت)

پیاری بہن نائیلہ گل کے نام!

آپ کا کالم نظروں سے گزرا۔ میں بھی بہت زیادہ دکھی ہوں، مجھے بھی آپ جیسی ہی اچھی سی بہن کی ضرورت ہے۔ میں ساری زندگی بھائی بن کر آپ کے دامن میں زمانے بھر کی خوشیاں بھرتا رہوں گا۔ مگر ایسا نہ ہو۔ آپ بہن کا کردار پورا نہ کر سکیں۔ اگر آپ کو یہ رشتہ منظور ہو تو پھر براہ راست خط لکھ کر اپنے ذاتی ایڈریس سے نوازیں تاکہ بہن بھائی بلاواسطہ خط وکتابت کر سکیں۔ اگر آپ نے جواب نہ دیا تو میں سمجھوں گا کہ اس معاشرے میں ہر رشتہ فراڈ اور دھوکے باز ہے . . .

(کبیر احمد، پوسٹ بکس نمبر ۵۹۴ شارجہ (یو - اے - ای)

بھائی کی آرزو!

میں اس دنیا میں بھائی جیسی نعمت سے محروم ہوں۔ ایک باپ اور دو بہنیں ہیں۔ کاش میرا بھی کوئی بھائی ہوتا۔ جو مجھے اچھے برے کی تمیز کرا سکتا۔ اگر کوئی میری یہ آرزو پوری کر دے تو میں بھی ساری زندگی بھائی بن کر اس کی خدمت کروں گا۔

(جاوید خان گلگتی معرفت عبداللطیف گرین ہوٹل جی۔ٹی۔روڈ بالمقابل نشاط سینما۔ گوجرانوالہ)

بہن نائیلہ گل صاحبہ کے نام!

آپ کا کالم جواب عرض کے اسی کالم میں نظروں سے گزرا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ سے کبھی بھی دھوکہ فریب نہیں کروں گا۔ اور آپ کو سگا بھائی بن کر دکھاؤں گا۔ اور آج ہی سے مجھے اپنا حقیقی بھائی تصور کر لیں۔ اگر آپ کو بھائی کا یہ رشتہ منظور ہو تو پھر براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ تاکہ ایک بھائی بلاواسطہ اپنی بہن سے مل سکے

(معقول حسین . . . . . السعودیہ عربیہ)

بہن ناز صاحبہ کے لیے!

جواب عرض کے اسی کالم میں آپ کا اشتہار نظروں سے گزرا۔ آپ کو بھائی کی آرزو ہے تو مجھے بہن کی۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں آپ کا بھائی بننے کے لیے تیار ہوں۔ اگر آپ کو منظور ہو تو براہ راست اپنے جواب سے نوازیں، پھر میں اپنے اگلے خط میں اپنا مکمل تعارف کراؤں گا . . . آپ مجھے ہر کام پہ بھائی کے روپ میں ثابت قدم پائیں گی۔

(انیس احمد، پوسٹ بکس نمبر ۴۶۲۳ جدہ - سعودی عرب)

مس آفریدی صاحبہ کے نام!

جواب عرض فروری ۸۳ء کے شمارے میں آپ کا اشتہار نظروں سے گزرا۔ اگر آپ کو ایک بھائی کی ضرورت ہے تو مجھے بہن کی آرزو ہے۔ اگر آپ مجھے بھائی سمجھ کر قبول کر لیں تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔ امید ہے آپ میری یہ خواہش ٹھکرائیں گی نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں بھی خلوص دل سے آپ کو بھائی بن کر دکھاؤں گا۔ اگر آپ مناسب خیال کریں تو براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کریں۔

(انیس احمد، پوسٹ بکس نمبر ۴۶۲۳ جدہ - سعودی عرب)

محترمہ مس جمیلہ راہی صاحبہ کے لیے!

جواب عرض کے تازہ شمارہ میں آپ کا اشتہار نظروں سے گزرا۔ جس میں آپ نے بیرون ملک سروس کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ میں ایک بھائی کی حیثیت سے آپ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر

اس کے لیے شرط یہ ہے کہ ویزے پر پاکستان کا خرچہ آپ کو برداشت کرنا ہوگا۔ اگر آپ رضامند ہوں تو براہ راست مجھے خط لکھ کر مزید تفصیلات معلوم کریں یہ بھائی آپ کو دھوکہ نہ دے گا۔

(شمس الدین، پی او بکس نمبر ۶۷ حائل سعودی عرب)

کچھ ماہ قبل میرے بھائی نے قرض حسنہ کے واسطے اپیل شائع کروائی تھی مگر کسی نے بھی میرے بھائی کی مدد نہیں کی۔ اب مجبوراً ایک بہن اپنے بھائی کے لیے مدد کے واسطے ہاتھ پھیلا رہی ہے۔ میں اپنے ملکی اور غیر ملکی بہن بھائیوں سے اپیل کرتی ہوں کہ وہ میرے بھائی کی مدد کریں کیونکہ میری بھابی کے زیورات کسی وجہ سے بنک میں گروی پڑے ہوئے ہیں۔ جو بھائی ان کی مدد کرنا چاہے وہ مجھ سے تفصیلات حاصل کر سکتا ہے۔

(طاہرہ ناز ملکی بلوچ مکان نمبر اے/۳۵۱/ڈبلیو ملکی محلہ نزد ریلوے اسٹیشن، شکارپور (سندھ))

توجہ فرمائیں!

میں جواب عرض کا پرانا شیدائی ہوں اور اس کے لیے میری جان تک بھی حاضر ہے۔ ہر ماہ کسی نہ کسی روپ میں اس میں شریک ہوتا ہوں۔ مگر بعض قارئین کو جواب عرض میں میری شمولیت پسند نہیں۔ نہ جانے کیوں؟ جیسا کہ ڈی آئی خان سے جناب تبریز حسین شاد صاحب فرماتے ہیں:

"آپ جواب عرض کے ہر شمارہ میں ڈیرہ ڈالے ہوتے ہیں یا کچھ تو ہمارا لحاظ کرو۔ ورنہ جس طرح فروری ۸۳ء کے کالم "اب کیا کروں" میں مناہیٹ لاہور فریاد کر رہے ہیں کہیں آپ کو بھی ایسی فریاد نہ کرنی پڑے"۔

میں شاہ صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس طرح کا خط لکھنے سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے جو دھمکی آمیز خط لکھا ہے اس کے لیے آپ کا شکریہ۔ میں اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ اس طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں سے میرے قلم کو روک نہیں سکتے۔ آپ آخر جلتے کیوں ہیں؟ آپ بھی میدان میں آئیں اور قارئین کے لیے کچھ لکھیں ناں؟ مزہ تو تب ہے!

اس طرح قلمکاروں کو دھمکا کر آپ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ امید ہے آپ آئندہ کسی بھی قاری کو ایسا خط نہیں لکھیں گے۔ آخر میں اپنے قلمکار بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس طرح کے خطوط سے خوفزدہ نہ ہوں اور اپنا قلم چلاتے رہیں اس وقت تک، جب تک اپنے پیارے پاکستان میں ایک بھی برائی کرنے والا باقی ہے۔

(امین طاہر، پی او بکس نمبر ۱۲۰۴۶ ریاض، سعودیہ)

میں ایک غریب خاندان کا لڑکا ہوں۔ مگر مالی کمزوری کے سبب انٹر سے آگے پڑھ نہیں سکا۔ کوئی دردمند بھائی مجھے بیرون ملک بلالے۔ باہر آ کر اپنے اس بھائی کی ایک ایک پائی ادا کر دوں گا۔ فی الحال میرے پاس دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے والدین بھی ہمیشہ اس کے بار احسان رہیں گے... میری عمر ۲۰ سال ہے۔

(ANNAR-UL-REHMAN ZAFAR C/O M. JAMAL FISHERIES B/3 FISH HARFOUR, WEST WHARF KARACHI NO. 2)

میں لب دریا کھڑا ہوں؛ دریا پانی کے ایک ایک قطرے کو ترس رہا ہوں۔ خلوص اور وفا کے نام پر بے شمار زخم کھا چکا ہوں۔ مرہم لگانے والوں نے نشتروں سے جسم چھید دیا ہے۔ روح بند پنجرے کے پنچھی کی طرح بہت بے چین ہے۔ میں اسی زمین کا انسان ہوں اور انسانوں کی محبت کا محتاج ہوں۔ اگر کوئی میرے غموں میں ساجھے ڈالے، مجھے سرابوں کے گرداب سے باہر نکالے اور میرے گم گشتہ خوابوں کو تعبیر دے دے، میرے مرجھائے ہوئے چمن امید کو نوید بہار دے دے تو زندگی کے باقی لمحے میں اسی ساتھی کے نام کر دوں گا۔

(خالد محمود معرفت اکرم مشین شاپ پونچھ روڈ شہید چوک۔ کوٹلی۔ آزاد کشمیر)

میں یہ سوچتا ہوں کیوں نہ زندگی کو اُس سمندر کی مانند گزاروں جو سینے میں ہزاروں طوفان لیے بھی خاموش بہتا چلا جاتا ہے۔ خاردستانک میرے پاؤں لہولہان تو کر سکتے ہیں لیکن میری راہ نہیں روک سکتے۔ اگر زندگی میں سمندر کی سی وسعت پیدا ہو جائے تو دکھوں کا احساس کتنا کم ہو جائے لیکن آج جبکہ زندگی تمناؤں کے ٹوٹنے میں تنہائی مایوسیوں کی تاریک راہ میں بھٹک رہی ہے تو مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مجھ جیسے انسان کے لیے اس طرح زندہ رہنا بہت مشکل ہے۔۔ نہ جانے مجھ جیسے کتنے ہی بدنصیب ہیں جو حساس کی وادی میں مقید ہیں۔ جو کسی بھی تلخی سے دامن نہیں بچا سکتے۔

ہائے یہ بدنصیبی جو آنسو بہانے کی بھی اجازت نہیں دیتی ہیں آنسو انگارے بن کر میرے دل جگر کو جلاتے رہتے ہیں۔ اور میں ہونٹوں پر قہقہوں کو کھنک سجائے دیکھنے والوں کی نظروں کو فریب دیتا ہوں۔ اس عالم انسانی میں میرا کون ہے جو میرے دکھ کو سمجھے، جو میرے زخموں پر محبت بھرے لفظوں کا مرہم رکھے۔ میرا کوئی نہیں ہے، آخر میں کسے پکاروں۔۔۔ کاش میرا بھی کوئی اس دنیا میں ہوتا۔۔۔

(ملک ناصر نازؔ، پی او بکس نمبر ۵۰۷۷ جدہ سعودی عرب)

اس کالم میں میری شمولیت کا مقصد آپ کو کوئی کاروباری مشورہ دینا نہیں، بلکہ "جواب عرض" کے تمام قارئین سے ایک درخواست کرنا ہے۔ تو گزارش ہے کہ اگر آپ قلمی دوستی کے کالم میں شرکت کرتے ہیں تو مخلص ہو کر کریں اگر اشعار کے صفحہ پر جگہ پانے کی تمنا رکھتے ہیں تو پھر خوبصورت اشعار اپنے بہن بھائیوں کی نذر کریں۔۔۔ اگر پرچے پر تبصرہ کرنا ہی مقصود ہو تو تعمیری پہلو پیش نظر رکھیں۔ دوسروں پر کیچڑ مت اچھالیں۔ اگر آپ کسی کی زندگی کے چند اوراق سے کر آتے ہیں تو اس میں اپنا خونِ قلب پوری طرح ملا لیں۔ اگر کوئی اپنی آپ بیتی ارسال کرتے ہیں تو اسے اسلامی اقدار کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے پر کھ لیں۔

اس کے علاوہ اس پرچہ میں اگر کوئی خاتون کسی بھی واسطے سے شامل تحریر ہوتی ہے تو اسے اپنے ہی کنبہ کا ایک فرد تصور کریں۔ اگر ذہن میں کوئی شیطانی خیال ابھرے

مجھ تو یہ سوچ لیں کہ جواب عرض کے پرچم تلے جو ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں دکھی لوگ جمع ہوتے ہیں، ان کی غمگساری کرتی ہے تاکہ ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ اگر آپ نے خود ہی اپنے ان بہن بھائیوں کے دل دکھانے شروع کر دیئے تو اس مشن کا کیا بنے گا جس کیلئے ہزاروں لوگ اپنا خونِ جگر پیش کر رہے ہیں۔

امید ہے میری اس اپیل سے تمام قارئین اتفاق کریں گے اور اپنی آراء سے نوازیں گے۔۔۔

(حبیب الرحمٰن پی او بکس نمبر ۴۹۹۴۵ الریاض سعودی عرب)

میرے والد محترم سید سلامت حسین کاظمی المعروف پیر صاحب آف دعا مان سیداں کوہاٹ ۲ دسمبر ۹۹ء کو فالج کا شدید حملہ ہوا تھا جس سے ان کے جسم کا دایاں حصہ بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا۔ فالج ان کی زبان پر بھی پڑا تھا اس وقت ڈاکٹروں نے ان کے بچنے کی کوئی امید نہیں دلائی تھی مگر آج عرصہ تین سال سے والد صاحب زندگی اور موت کی کشمکش میں بستر پر پڑے ہوئے ہیں۔ نہ اٹھ کر بیٹھ سکتے ہیں نہ بات کرتے ہیں۔ ان تین سالوں میں ہم نے ان کے علاج پر پیسہ پانی کی طرح بہایا ہے۔ پاکستان کے کسی بھی نامور ڈاکٹر حکیم کا علاج نہیں چھوڑا۔ بلکہ ان کی رپورٹیں لندن کے ہسپتالوں میں بھیجی ہیں مگر انہوں نے بھی جواب دے دیا ہے۔ سخت پریشانی ہے۔ والد صاحب کی عمر اس وقت ۶۵ سال ہے۔

دنیا بھر کے بہن بھائیوں سے گزارش ہے کہ وہ میرے والد صاحب کی صحت کے لیے دعا کریں۔ اور اگر کسی بہن بھائی کے پاس فالج کا کوئی تیر بہدف نسخہ ہو تو والد صاحب کے ٹھیک ہو جانے پر ان کو منہ مانگا انعام دوں گا۔ مگر خدارا تجرباتی دور سے گزرنے والے ڈاکٹر، حکیم زحمت نہ کریں کہ ہم پہلے ہی سخت پریشان ہیں۔

(سید جمیل کاظمی پروپرائیٹر کاظمی ٹیلیٹ سروس ٹاہلی موہری روڈ ڈھیری حسن آباد۔ راولپنڈی)

محترمہ بہن اے۔ بیگم صاحبہ کے لیے!

دکھ درد ہمارے

بہن میں بھی آپ ہی کی طرح دکھی انسان ہوں۔ بھیر بھی ایک بھائی بن کر آپ کو کسی چیز کی کمی نہ ہونے دوں گا۔ آپ براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کریں۔
(مشتاق احمد خان، پی او بکس ۹۳۶۷ جدہ سعودی عرب)

بہن نا سیلہ گل کے نام!
آپ کا دکھ بھرا اشتہار پڑھا آپ مجھ سے رابطہ کریں آپ کو بھائی کی چاہت اور خلوص ملے گا مگر اپنے شناختی کارڈ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کے ہمراہ کہ آج کل فراڈ بہت زیادہ ہو رہے ہیں
(راجہ عبدالقیوم، پی او بکس ۵۹۳۷، شارجہ یو اے ای)

پیاری بہن گل صاحبہ کے لیے!
آپ کی تحریر پڑھی۔ اور دکھ ہوا۔ آپ پورے اعتماد کے ساتھ مجھ سے رابطہ کریں
(محمد خان گوہر پی او بکس ۳۱۱۴ براستہ دہران سعودی عرب)

محترمہ نا سیلہ گل کے نام!
آپ کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ زمانے نے آپ کو بڑے دکھ دیئے ہیں۔ یہ زمانہ کسی کے زخموں پر مرہم نہیں رکھتا۔ خدارا اپنے بارے میں تفصیل سے لکھیں۔
(ایم صدیق پی او بکس ۹۰۷ بریدہ القصیم سعودی عرب)

بہن نا سیلہ گل صاحبہ متوجہ ہوں!
بہن میں بھی اس بھری دنیا میں اکیلا ہوں اور میں آپ کو اپنی سگی بہن بنانے کے لیے تیار ہوں۔
(حاجی انعام اللہ معرفت مومن اللہ متیق القشامی مدرسہ سیل الصغیر الطائف۔ سعودی عرب)

محترمہ مس نسیم صاحبہ کے نام!
آپ براہ راست مجھ سے رابطہ قائم کریں اور فکر نہ کریں۔
(محمد صدیق پی او بکس نمبر ۹۰۷ بریدہ القصیم سعودی عرب)

قابلِ قدر بہن نا سیلہ گل کے نام!
میں ایک حقیقی بھائی بن کر آپ کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گی۔
(خالد نعیم خالد، پی او بکس نمبر ۲۲ رسا مخفی براستہ دہران السعودیہ)

بہن اے بیگم صاحبہ کے نام!
آپ مجھے اپنے دکھوں میں برابر کا شریک جانیں مجھے براہ راست لکھیں پھر میں تفصیلاً لکھوں گا۔
(اعظیم قیصر، پی او بکس نمبر ۱۱۴۵ حائیل سعودی عرب)

میری عمر ۳۵ سال ہے اور بدقسمتی سے ابھی تک شادی نہیں ہوسکی مجھے ایسی شریک حیات کی تلاش ہے جو میرے غموں کا مداوا کرسکے۔ سعید احمد ساجد نیو دروالا۔ شاہدرہ۔ لاہور

بہن ایم ناز صاحبہ کے نام!
آپ مجھ سے براہ راست رابطہ قائم کریں میں آپ کو ایک سے بھائی کا خلوص دوں گا
(راجہ عبدالقیوم، پی او بکس ۵۹۳۷ شارجہ یو اے ای)

بہن آسیہ صاحبہ کے نام!
اللہ تعالیٰ نے آپ پر بہت کرم کیا ہے کہ آپ نے حج کی سعادت حاصل کرلی۔ اس کی مبارک باد ہو۔ میرے لائق اور کوئی خدمت ہو تو میں حاضر ہوں۔
(محمد خان گوہر آر سکو بکس ۳۱۱۴، الفرح سیل سیکشن براستہ دہران السعودیہ)

بہن ایم ناز صاحبہ کے نام!
آپ کا اشتہار جواب عرض میں پڑھا۔ میں آپ کا بھائی بننے کے لیے تیار ہوں۔ اور انشاءاللہ تعالیٰ اس رشتہ کو تادم مرگ نبھاؤں گا۔ اکثر بہنیں شاید صرف نام ہی چھپواتی ہیں کیونکہ ان کی طرف سے جواب نہیں آتا۔
(NK (RT) MOHD AYOUB 215 SIG CO. C/O F.P.O. NO. 221 PAK ARMY)

ملاقات

ملاقات کے اس کالم میں شرکت کرنے کی فیس مبلغ ۲۵/- روپے ہے۔ صرف خواتین کیلئے شناختی کارڈ کی کاپی لازمی ہو گی۔ کچھ رقم کا منی آرڈر ماہنامہ جواب عرض ، ، نسبت روڈ لاہور کے نام کرائیے اور منی آرڈر کی رسید اپنی تصویر اور مکمل کوائف کے ہمراہ ہمیں ارسال کر دیجئے۔ آپ ۲۵/- روپے، ڈاک ٹکٹ بھی ارسال کر سکتے ہیں۔ جن خطوط کے ساتھ منی آرڈر کی رسید یا ڈاک ٹکٹ نہیں ہونگے انکو اس کالم میں جگہ نہیں دی جائے گی۔ غیر ممالک میں رہنے والے پاکستانی حضرات ۲۵/- روپے کا بنک ڈرافٹ شہزادہ عالمگیر کے نام بنوا کر ارسال کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں بند لفافے میں کسی قسم کی بھی نقد کرنسی ارسال نہ کریں۔ کیونکہ یہ طریقہ غیر قانونی ہے ایسے تمام خطوط کسٹمز حکام کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ (ایڈیٹر)

نگران: ملاقات - دفتر ماہنامہ جواب عرض ، ، نسبت روڈ - لاہور

نام: عبدالوہاب
تعلیم: میٹرک
عمر: بیس سال
مشغلہ: اچھے اور نیک بہن بھائیوں سے پُرخلوص قلمی دوستی کرنا۔ نیز جواب عرض کے علاوہ دیگر اچھے اور معیاری جرائد کا مطالعہ کرنا۔
پتہ: عبدالوہاب، پوسٹ بکس نمبر ۶۸۰ دوحہ، قطر۔ عربین گلف۔

نام: پرویز اصغر راجہ
عمر: ۲۱ سال
مشغلہ: بچوں سے محبت کرنا ٹی وی اور فلمی اداکاروں سے ہمدردی رکھنا۔ شعر و شاعری سے لگاؤ

جی چاہتا ہے شہر خموشاں میں جا بسیں
نہ دنیا ہم کو راس ہے نہ دنیا کو ہم دسکا رہیں

پتہ: پرویز اصغر راجہ معرفت تاج فوٹو اسٹوڈیو پی او سہنہ تحصیل سہنہ ضلع کوٹلی - آزاد کشمیر

نام: عصمت علی عاصی
تعلیم: میٹرک
مشغلہ: پُرخلوص اور نیک لڑکے اور لڑکیوں سے قلمی دوستی کرنا اور پھر اسے نبھانا۔ مگر پہلے ہی خط میں اپنی تصویر ارسال کریں بصورت دیگر جواب نہ دے سکوں گا۔
پتہ: عصمت علی عاصی، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹۱۴ دوبئی - یو اے ای -

نام: قمر حسین منظور کیشیئر
عمر: ۲۲ سال
مشغلہ: بہن بھائیوں سے قلمی دوستی کرنا۔ مگر صرف اچھے لوگوں سے۔ فوٹو کا آنا ضروری ہے، ورنہ جواب نہیں دوں گا۔ لالچی انسان زحمت نہ کریں۔
پتہ: قمر حسین منظور، دی نیشنل کمرشل بینک، پوسٹ بکس نمبر ۱۲، ابہا، سعودی عرب

نام : ایم انور خان
عمر : ۲۶ سال
تعلیم : میٹرک
مشغلہ : سیر و تفریح، جواب عرض پڑھنا، ہر خط کا جواب دینا۔ تصویر کا آنا ضروری ہے کیونکہ میں نے سب تصویریں البم میں لگانی ہیں۔ سب سے پہلے خط پر تحفہ دوں گا۔
پتہ : محمد انور خان معرفت جواب عرض۔ لاہور

نام : ایم رفیق نیئر
عمر : ۲۰ سال
تعلیم : میٹرک
مشغلہ : پرخلوص لوگوں سے بےغرض قلمی دوستی کرنا۔ جواب عرض پڑھنا ہے
آنکھوں سے آنسو جاری اور دل بےقرار رہتا ہے
ہر شب خواب میں تیری دید کا انتظار رہتا ہے
پتہ : محمد رفیق نیئر، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۶
المذنب، القصیم سعودی عرب۔

نام : شہزاد احمد
عمر : ۱۹ سال
مشغلہ : ملکی اور غیر ملکی لڑکے اور لڑکیوں سے قلمی دوستی کرنا جواب عرض پڑھنا۔ ہر خط کا جواب باقاعدگی سے دینا۔ نہ دھوکہ دینا اور نہ ہی دھوکہ کھانا۔
پتہ۔ شہزاد احمد معرفت سپر سٹور نمبر ۶۰
چلتان مارکیٹ۔ کوئٹہ چھاؤنی۔

نام : محمد بشیر نازؔ
عمر : ۲۰ سال
تعلیم : میٹرک
مشغلہ : اچھے اور نیک لوگوں سے بےلوث قلمی دوستی کرنا ہے
آتی ہے یاد تیری لیتا ہوں نام تیرا
اے دُور رہنے والی تجھ کو سلام میرا
پتہ : محمد بشیر نازؔ، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۶
المذنب القصیم۔ سعودی عرب۔

نام : گل زرین
عمر : بیس سال
تعلیم : انڈر میٹرک
مشغلہ : دکھی بہن بھائیوں سے قلمی دوستی کر کے ان کے غم اپنے نام کروانا اس کام کے ذریعے زندگی کے ہمسفر کی تلاش کرنا ہے
کہیں سے ڈھونڈ کے لا دو وفا جو مل جائے
ترس گیا ہوں جہاں رسم دوستی کے لیے
پتہ : گل زرین، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۶
المذنب القصیم۔ سعودی عرب۔

نام : حاجی عبدالصمد خان
عمر : ۲۰ سال
تعلیم : میٹرک
مشغلہ : ہر خط کا جواب بلاتمیز دینا۔ دکھی لوگوں کے دکھ اپنے نام کرانا۔
دل کا درد بتاؤں کس کو کہ ہر دل میں درد بھرا ہے
صمدؔ تیری آرزو دل ہی دل میں رہ جائے گی
پتہ : حاجی عبدالصمد خان، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۶
المذنب القصیم۔ سعودی عرب۔

نام : محمد ریاض احمد تاز
عمر : ۲۵ سال
تعلیم : میٹرک
مشغلہ : دکھی اور غریب لوگوں
سے غم اپنانا اور ان
کی امداد کرنا ہے
وہ وعدہ تو کر لیتے ہیں نبھانا بھول جاتے ہیں
لگا کر آگ سینے میں بجھانا بھول جاتے ہیں
پتہ : محمد ریاض احمد تاز، پی او بکس نمبر ۶۴۲۲
کارسون کمپنی، الریاض ۔ سعودی عرب ۔

نام : ایم انور ندیم
عمر : ۲۰ سال
تعلیم : میٹرک
مشغلہ : دکھی اور غریب لوگوں
کی مالی امداد کرنا،
تصویر ارسال کریں ہے
کہاں سے سیکھ لی تم نے یہ بے رخی کی ادا
کبھی تو ہنس کے ملو ہم سے دوستوں کی طرح !
پتہ : محمد انور ندیم ، پوسٹ بکس نمبر ۱۷۶
المذنب القصیم ۔ سعودی عربیہ ۔

نام : راجہ محمد ایوب
مشغلہ : اچھے اور نیک
لوگوں سے پُرخلوص
اور لالچ سے پاک
قلمی دوستی کرنا ۔ ہر
خط کا جواب باقاعدگی
سے دینا ۔ اور جواب کا انتظار کرنا ۔
پتہ : راجہ محمد ایوب بلواسطہ شبیر شخل محمد حسین
رحتا ۔ سعید المدنی الخیاط الحدیثہ الکندرہ جدید
سوق الصحیفہ املاک ، بابِ مکہ جدہ سعودی عرب ۔

نام : عمر فاروق
عمر : ۲۶ سال
تعلیم : ایف اے پی ٹی سی
مشغلہ : اچھے اچھے لوگوں
سے قلمی دوستی کرنا ۔
ہر خط کا جواب ضرور
دینا ۔ اور ناول وغیرہ پڑھنا ۔
پتہ : عمر فاروق خٹک ، ہیڈ ٹیچر پرائمری اسکول درویزئی
پلوسہ ہنگو ، نزد سمانہ روڈ ہنگو ، تحصیل و ڈاکخانہ
ہنگو ۔ ضلع کوہاٹ ۔

نام : الحاج سعید محمد
اربابی بلوچ
عمر : ۲۸ سال
مشغلہ : اچھے اور بااخلاق
لوگوں سے دوستی کرنا ۔
دکھی بہن بھائیوں سے
قلمی دوستی کرنا اور ان کے دکھ اپنانا ۔ کیونکہ
میں خود بہت دکھی انسان ہوں ۔
پتہ : الحاج سعید محمد اربابی بلوچ اکبر ہوٹل مصادر برلین
نیو کلہوا واڑہ میوہ شاہ روڈ لیاری کوارٹرز کراچی نمبر

نام : عبدالرحمن
مشغلہ : دنیا کا ایک ستایا
ہوا انسان ہوں اس
لیے دکھی اور غمزدہ
بہن بھائیوں سے
پُرخلوص قلمی دوستی
کرنا اور پھر اسے تا زندگی مقدس رشتہ جان
کر نبھانا ۔ جواب ضرور پڑھنا ۔
پتہ : عبدالرحمن ، پوسٹ بکس نمبر ۱۵۲۲
جدہ ۔ سعودی عرب ۔

نام: اورنگ زیب
عمر: ۱۹ سال
تعلیم: میٹرک
مشغلہ: پرخلوص مسلم اور غیر مسلم بہن بھائیوں سے قلمی دوستی کرنا نیز فٹ بال کھیلنا۔ البتہ دھوکے باز لوگوں سے سخت نفرت کرنا۔
پتہ: اورنگزیب اسٹینوٹو اسسٹنٹ کمشنر (پولیٹیکل) کمشنر آفس کوئٹہ ڈویژن کوئٹہ بلوچستان۔

نام: شیخ محمد حلیم دکھی
عمر: ۳۰ سال
مشغلہ: پرخلوص دوستوں کو خلوص دل سے خط لکھنا۔ دکھی بہن بھائیوں کے کام آنا۔ زندگی کے سفر میں ایک اچھے نیک سیرت اور باوفا ساتھی کی تلاش۔
پتہ: شیخ محمد حلیم دکھی، پوسٹ بکس نمبر ۵۲۱۱ جدہ - سعودی عرب۔

نام: ایم اشرف پرویز
مشغلہ: اچھے اور نیک بہن بھائیوں سے قلمی رابطہ کرکے ان کے حالات سے باخبر رہنا۔ اور جو دکھی اور مجبور ہوں ان کے دلوں میں اپنا نام کرلینا۔ جواب عرض باقاعدگی سے پڑھنا۔
پتہ: محمد اشرف، ص ب ۱۵۲۳۰ جدہ - السعودیہ العربیہ۔

نام: جاوید اقبال جاوید
عمر: ۲۷ سال
تعلیم: ایف اے
مشغلہ: قلمی دوستی صرف نیک اور اچھے لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ تہذیب کے دائرے میں رہ کر۔ دھوکے باز اور فراڈیے لوگ زحمت نہ کریں۔
پتہ: جاوید اقبال جاوید، پوسٹ بکس نمبر ۵۲۱۱ جدہ - سعودی عرب۔

نام: صابر حسین صابر
عمر: ۲۵ سال
تعلیم: میٹرک
مشغلہ: خاص کر دکھی بہنوں کے کام آنا۔ تاہم لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ بلاتمیز دوستی کرنا۔ اور ساری عمر اسے نبھانا۔ جواب عرض پڑھنا۔
پتہ: صابر حسین صابر، پوسٹ بکس نمبر ۵۲۱۱ جدہ، سعودی عرب۔

نام: آصف محمود آصف
عمر: ۲۸ سال
تعلیم: میٹرک
مشغلہ: قلمی دوستی کرنا۔ دکھی بہن بھائیوں کے کام آنا۔ اسی کالم کے ذریعے ایک نیک اور پرخلوص بہن کی تلاش۔ جو اس مقدس رشتہ کو نبھا سکتی ہو۔
پتہ: آصف محمود آصف، پوسٹ بکس نمبر ۵۲۱۱ جدہ - سعودی عرب۔

نام : سید تمسیل کاظمی
عمر : ۲۵ سال
مشغلہ : اچھے پُرخلوص اور مخلص لوگوں کے ساتھ بے لوث تعلقات بنانا۔ شعر و شاعری پڑھنا۔

تم میں ہمت ہے تو جیتے ہے جا تو جیو
میں اکیلا تیری دنیا میں کہاں تک جیوں!

پتہ : سید تمسیل کاظمی، کاظمی لمینیٹ سروس ٹاہلی موہری روڈ، ڈھیری حسن آباد۔ راولپنڈی۔

نام : فیاض احمد بھٹہ
عمر : ۱۰ سال
تعلیم : مڈل
مشغلہ : ملکی اور غیر ملکی بہن بھائیوں سے قلمی دوستی کرنا۔ فٹ بال کھیلنا۔ سب سے پہلے خط میں تصویر کا آنا ضروری ہے ورنہ جواب نہ دوں گا۔

پتہ : فیاض احمد بھٹہ۔ مکان نمبر ۱۲۸۴، گلی نمبر ۱۱، قدیر آباد۔ ملتان شہر۔

نام : ملک عرفان اللہ
عمر : ۲۸ سال
تعلیم : ایف۔ اے
مشغلہ : دلپذیر، ڈی، تبادلۂ خیالات، میوزک سننا۔ جو بھائی بہن سب سے پہلے خط لکھے گا اسے قرآن کریم کا نادر نسخہ بطور تحفہ بھیج دیا جائے گا۔

پتہ : ملک عرفان اللہ، پوسٹ بکس نمبر ۲۴-۱۹ خیطان، کویت

نام : سید محمد علی الحسنین کاظمی
عمر : ۲۰ سال
تعلیم : ایف اے
مشغلہ : مصوری کرنا اور قلمی دوستی کے ذریعے وفا والوں کی تلاش کرنا۔

وفائیں کرکے بھی ہمدم کچھ ایسے غم اٹھائے ہیں
لرز جاتا ہوں میں جب کوئی وفا کا نام لیتا ہے

پتہ : سید محمد علی الحسنین کاظمی، کاظمی ویلڈنگ اینڈ آٹو ورکس، بس سٹاپ حسن ابدال، ضلع اٹک۔

نام : نصیر احمد
عمر : ۲۳ سال
تعلیم : میٹرک
مشغلہ : پُرخلوص نیک ہمدرد اور خوبصورت دکھی لوگوں سے دوستی کرنا۔ صرف لڑکوں سے دوستی کرنا، لڑکیاں خط لکھنے کی زحمت نہ کریں۔

پتہ : نصیر احمد، پوسٹ بکس نمبر ۳۴۵ بار دبئی۔ یو اے ای۔

نام : شوکت سہیل بٹ
مشغلہ : اچھے اور پُرخلوص بہن بھائیوں سے دوستی کرنا۔ ان کے دکھ میں برابر شریک رہنا۔ ان کے خطوں کے جواب باقاعدگی سے دینا۔ درود پاک پڑھنا۔۔۔

پتہ : شوکت سہیل بٹ، پی او بکس نمبر ۵۰۰۰۵ بدع زاید، ابوظہبی، یو اے ای۔

نام : الحاج عبداللہ محمد جانباز
مشغلہ: اچھے اچھے لوگوں
سے قلمی دوستی کرنا
جواب عرض پڑھنا۔
ہر خط کا جواب دینا
دھوکے باز لوگوں سے
دور رہنا۔ اس لیے وہ زحمت نہ کریں۔
پتہ : الحاج عبداللہ محمد جانباز، یوسف بلس
نمبر ۱۱۲ خمیس مشیط۔ سعودی عرب۔

نام : سید محمد عباس
عمر : ۱۸ سال
مشغلہ: ملکی اور غیر ملکی
لڑکے لڑکیوں سے
بے لوث قلمی دوستی
کرنا۔ خطوں کے
جواب باقاعدگی سے دینا۔ جواب عرض پڑھنا۔
نیز دکھی لوگوں کی خدمت کرنا۔
پتہ : سید عباس ہول سیل کلاتھ ہاؤس اینڈ ستون ہاؤس
اینڈ جنرل مرچنٹس راجہ بازار سکردو بلتستان
شاپ نمبر ۶۱۳، ۶۱۴، ۸۸۵

نام : عبدالمجید نواب
عمر : ۲۷ سال
تعلیم : ایف اے
مشغلہ: خلوص دل سے قلمی
دوستی کرنا۔ ہر خط کا
جواب دینا اپنا فرض
اولین خیال کرتا ہوں۔ چونکہ خود صاف دل ہوں
اس لیے دھوکہ بازوں کو پسند نہیں کرتا۔
پتہ : عبدالمجید نواب، پی او بکس نمبر ۴۱۳۰۴
الریاض۔ سعودی عرب۔

نام : محمد ارشد مرت بلو
عمر : ۲۲ سال
تعلیم: میٹرک
مشغلہ: زندہ دل اور مخلص
بہت محبتوں سے
قلمی دوستی کرنا۔ ہر
خط کا جواب باقاعدگی
سے دینا۔ میرے پاس اچھے شعر بھی محفوظ ہیں نیز
دکھی دلوں سے ہمدردی کرنا۔
پتہ : محمد ارشد تیل ڈیلر تی سبزی منڈی ریلوے
روڈ سرائے نیہ، ضلع ایبٹ آباد۔

نام : وحید ساقا
عمر : ۲۲ سال
تعلیم : بی۔ اے
مشغلہ: کرکٹ کھیلنا، قلمی
دوستی کے ذریعے
اچھے سے آئیڈیل
کی تلاش۔ اس لیے پہلے ہی خط میں تصویر کا
آنا بے حد ضروری ہے۔
پتہ : وحید ساقا پرو پرائیٹر بسم اللہ سٹیل ہاؤس
ریلوے بازار، عارف والا ضلع ساہیوال

نام : شہزادہ نسیم اختر
عمر : ۲۲ سال
تعلیم: ایف اے
مشغلہ: ہم عمر بہن بھائیوں
سے پرخلوص دوستی
کرنا۔ سیر و تفریح
کرنا۔ گریبان چاک کرلینا بہت آسان ہے لیکن
بڑی اس کی مصیبت ہے جسے سینا نہیں آتا
پتہ : شہزادہ نسیم اختر پی او بکس ۵۹۰۰۴، ریاض السعودیہ۔

نام : محمد طفیل شاہ
عمر : ۲۰ سال
تعلیم : میٹرک
مشغلہ : ہنسی مذاق، قلمی دوستی
سب سے پہلے خط لکھنے والے بہن بھائی کو ایک عدد جاپانی گھڑی تحفہ میں دوں گا۔ ہر ایک بھائی کو دعوت عام ہے۔
پتہ : محمد طفیل شاہ، پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲ ینبع البحر، سعودی عرب۔

نام : ضیاء القمر ناز
مشغلہ : کرکٹ کھیلنا، فشنگ کرنا۔ مجھے درج ذیل شعر کے مصداق ایسے ہی دوستوں کی ضرورت ہے لڑکیاں زحمت نہ کریں۔

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

پتہ : ضیاء القمر ناز، پوسٹ بکس نمبر ۲۰۰۷ دوبئی (یو اے ای)

نام : فضل محمود
عمر : ۲۱ سال
تعلیم : ایف اے
مشغلہ : بہن بھائیوں سے قلمی دوستی کرنا اور ہم وطنوں کو پردیس کی مشکلات سے آگاہ کرنا۔
پتہ : FAZAL MAHMOOD H-1-L
POST BOX NO. 6425
ABU DHABI (U.A.E)

نام : سرور گل
مشغلہ : والی بال کھیلنا صرف غریب لوگوں سے قلمی دوستی کرنا۔ دیکھ بھال کرنے کے بعد مستحق اور نادار بہن بھائیوں کی مدد کروں گا۔ مگر خدارا لالچی لوگ زحمت نہ کریں۔
پتہ : سرور گل، پوسٹ بکس نمبر ۲۰۰۷، دوبئی (یو اے ای)

نام : ایم اکرم لاہوری
مشغلہ : ڈرائیونگ کرنا۔ ہاکی کھیلنا۔ سلجھے ہوئے اور باصلاحیت نوجوان لڑکے رجوع کریں۔ انشاء اللہ مجھے ہر قدم پہ ثابت قدم پائیں گے۔ ایک بار آزما کر تو دیکھیں۔
پتہ : محمد اکرم لاہوری، پوسٹ بکس نمبر ۲۰۰۷ دوبئی، (یو اے ای)

نام : امیر خان سرحدی
مشغلہ : کرکٹ کھیلنا، قلمی دوستی کرنا مگر صرف حقیقت پسند لوگوں سے۔ چھوٹوں سے پیار اور بڑوں کا ادب کرنا۔ ہر خط کا جواب باقاعدگی سے دینا۔ آزمائش شرط ہے۔
پتہ : امیر خان سرحدی، پوسٹ بکس ۲۰۰۷ دوبئی، یو اے ای۔

نام : محمد شفیق
عمر : ۲۳ سال
تعلیم : میٹرک
مشغلہ : ملکی اور غیر ملکی نایاب خوبصورت ڈاک ٹکٹ جمع کرنا۔ پُر خلوص لوگوں سے بے غرض دوستی کرنا۔ جواب عرض پڑھنا اور خطوں کے جواب باقاعدگی سے دینا۔
پتہ : محمد شفیق، پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲، ینبع البحر سعودی عرب

نام : گلزار حسین تبسم
عمر : ۱۷ سال
مشغلہ : تاریخی اور مشہور مقامات کی خوبصورت تصویریں جمع کرنا اور قلمی دوستی کرنا مگر صرف لڑکوں کے ساتھ۔ پہلے ہی خط میں اپنی خوبصورت سی تصویر ضرور ارسال فرمائیں۔
پتہ : گلزار حسین تبسم، ص۔ ب نمبر ۵۵۱۸ جدہ۔ سعودی عرب۔

نام : محمد منشا درّان
عمر : ۲۶ سال
تعلیم : جے۔ وی سی
مشغلہ : کرکٹ میچ پر رواں تبصرہ بڑے شوق سے سننا۔ پنجابی میں خطوں کے جواب دینا۔ جواب عرض پڑھنا۔ لڑکیاں خط لکھنے کی زحمت نہ کریں۔
پتہ : محمد منشا درّان، پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲ ینبع البحر۔ سعودی عرب۔

نام : سردار جہانزیب خان
عمر : ۲۳ سال
تعلیم : بی کام
مشغلہ : پُر خلوص لوگوں سے قلمی دوستی کرنا اور کھیلوں خاص طور پر کرکٹ اور ہاکی کے بارے میں دلچسپ معلومات کا تبادلہ کرنا۔ جواب عرض پڑھنا۔
پتہ : سردار جہانزیب خان، پی او بکس نمبر ۹۱۶، الدمام۔ السعودی العربیہ۔

نام : بشیر احمد
عمر : ۲۵ سال
تعلیم : ایف اے
مشغلہ : فضول بحث میں وقت ضائع کرنا۔ اور کوّے کا سیاہ ہونا نہ ماننا۔ لطیفے سنانا۔ جواب عرض پڑھنا۔ اور خطوں کے جواب باقاعدگی سے دینا۔
پتہ : بشیر احمد، پوسٹ بکس نمبر ۱۲۲ ینبع البحر۔ سعودی عرب۔

نام : محمد یونس تسلیم
عمر : ۲۰ سال
تعلیم : بی۔ اے
مشغلہ : کرکٹ کھیلنا۔ خطوں کے جواب دینا۔ پُر خلوص دوستی کرنا ان کے دکھ اپنانا انہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دینا۔
پتہ : محمد یونس تسلیم معرفت محمد حسین جنرل اسٹور مین بازار البرا لیاقت آباد۔ کوٹ لکھپت۔ لاہور نمبر ۳

نام : طارق محمود خان

عمر : ۱۸ سال

تعلیم : ایف اے (جاری)

مشغلہ : ملکی اور غیر ملکی اچھے پُرخلوص اور نیک لڑکے لڑکیوں سے بے لوث قلمی دوستی کرنا۔ ہر خط کا جواب باقاعدگی سے دینا کرکٹ کھیلنا اور جا بے مرض سے دل لگانا۔

پتہ : طارق محمود خان سیکنڈ ایئر ہاسٹل نمبر ۱، کمرہ نمبر ۱ گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بنوں صوبہ سرحد

نام : ثناء اللہ ملک شر قپوری

عمر : ۱۹ سال

مشغلہ : قلمی دوستی کرنا مگر صرف با اخلاق اور اچھے لوگوں سے۔ کرکٹ کھیلنا اور پرانے فلمی گانے سننا۔ تحفے کا لالچ نہیں دوں گا اس لیے خود غرض اور لالچی بہن بھائی زحمت نہ کریں۔

پتہ : ثناء اللہ ملک شر قپوری، پوسٹ بکس نمبر ۵۰۳۵ جدہ۔ سعودی عرب۔

نام : فدا حسین فدا

عمر : ۲۳ سال

تعلیم : کہانیاں لکھنا اور اپنی کہانی سنانا۔ قلمی دوستی کرنا اچھے با اخلاق لوگوں سے جواب عرض پڑھنا۔ ہر بہن بھائی کے خط کا جواب بلاتمیز باقاعدگی سے دینا۔

پتہ : فدا حسین فدا ۹۴/ڈی، نوجی شوگر ملز ٹنڈو محمد خان۔ (سندھ)

نام : محمد امین شہزادہ

عمر : ۲۵ سال

تعلیم : میٹرک

مشغلہ : آئیڈیل کی تلاش۔ غریب لاچار اور مجبور لوگوں کی امداد کرنا۔ ان کے دکھ اپنانا۔ تہذیب کے دائرے میں لکھے گئے خط پر بہترین تحفہ انعام میں دوں گا۔

پتہ : فورمین محمد امین شہزادہ، پی او بکس نمبر ۱۸۱ راس الخفجی۔ سعودی عرب۔

نام : ارشد جاوید

عمر : ۱۹ سال

تعلیم : ایف اے

مشغلہ : کرکٹ کھیلنا۔ اچھے نیک سیرت اور سلجھے ہوئے بہن بھائیوں سے تہذیب کے دائرے میں رہ کر قلمی دوستی کرنا۔ پہلے ہی خط میں تصویر ارسال کریں۔

پتہ : ارشد جاوید، پوسٹ بکس نمبر ۲۴۹ گوجرانوالہ۔ (پاکستان)

نام : حاجی شبیر حسین شاہ

عمر : ۴۲ سال

تعلیم : بی اے

مشغلہ : بڑے شوق سے فٹ بال کھیلنا۔ تمام لڑکے اور لڑکیوں سے تہذیب کے دائرے میں رہ کر خط و کتابت کرنا مگر پہلے خط میں تصویر کا آنا ضروری ہے۔

پتہ : حاجی شبیر حسین شاہ، ص۔ ب ۵۸۹ ابھا۔ سعودی عرب۔

نام : محمد یوطا جیلی
عمر : ۲۱ سال
تعلیم : میٹرک
مشغلہ : بڑے ہی شوق سے
بال کھیلتے ہیں
لڑکیوں سے قلمی دوستی
کرنا۔ دوسروں کے دکھوں میں شریک ہونا۔
اور ان کی مدد کرنا۔
پتہ : حاجی محمد یوطا ۔ پی۔ او۔ بکس ۵۸۹۱ ابہا
سعودی عرب۔

نام : صغیر اقبال کشمیری
عمر : ۲۱ سال
تعلیم : ایف۔ اے
مشغلہ : شکار کھیلنا، لڑکے
اور لڑکیوں سے قلمی
دوستی کرنا۔ ہر خط کا
جواب باقاعدگی سے دینا۔ مگر خدا کے لیے لائیے
لوگ زحمت نہ کریں۔
پتہ : صغیر اقبال کشمیری پوسٹ بکس نمبر ۱۱۵
بریدہ القصیم۔ سعودی عرب۔

نام : واجد علی
عمر : ۱۸ سال
مشغلہ : ملکی اور غیر ملکی لڑکے
لڑکیوں سے دوستی
کرنا۔ جواب ہر خط
پڑھنا۔ قلمی کاتب سنیا
فوٹو کا کچھ لالچ نہیں ہے۔ پہلے ہی خط پر
خوبصورت تحفہ دوں گا۔
پتہ : واجد علی ایڈ وعمرنت احمد منیف محمد القحطانی شارع
اسامہ ابجوار الحرم مدینہ المنورہ سعودی عرب۔

نام : راجہ جاوید اقبال جاوید
عمر : ۲۲ سال
تعلیم : فرسٹ ایئر
مشغلہ : اچھے اور با اخلاق
لوگوں سے قلمی دوستی اپنا
تصویر کا آنا ضروری ہے
ہر پھولوں کی قسمت میں کہاں ناز عروساں
کچھ پھول تو کھلتے ہیں مزاروں کے لیے
پتہ : راجہ جاوید اقبال جاوید، پوسٹ بکس ۱۱۸۹۳
سطوہ، دوبئی (یو اے ای)

نام : طارق محمود چوہدری
عمر : ۲۵ سال
تعلیم : ایف اے
مشغلہ : قلمی دوستی لڑکے اور
لڑکیوں کے ساتھ۔
لڑکی نما لڑکے زحمت
نہ خط میں ایک لطیفہ بھیجیں۔ بہترین لطیفے پر
خوبصورت تحفہ۔ تصویر ضرور بھیجیں۔
پتہ : طارق محمود چوہدری ص۔ب ۲۲۱۲۳
الریاض۔ سعودی عرب۔
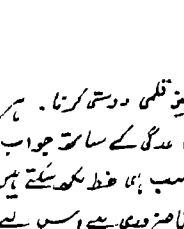
نام : عبدالرحمٰن
عمر : تصویر نہیں ہے۔
مشغلہ : پُرخلوص اور بے غرض قلمی دوستی کرنا۔ ہر
بہن بھائی کے خط کا باقاعدگی کے ساتھ جواب
دینا۔ ملکی اور غیر ملکی سب ہی خط لکھ سکتے ہیں۔
مگر ان کے لیے مخلص ہونا ضروری ہے اس لیے
لالچی اور دھوکے باز زحمت نہ کریں۔ نیز پہلے
ہی خط میں تصویر ضرور ارسال کریں۔
پتہ : عبدالرحمٰن۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۵۲۳
جدہ ۲۱۴۴۱، سعودی عرب۔

نگارشات: آئینہ روبرو ہے۔ دفتر ماہنامہ جواب عرض، نسبت روڈ لاہور

[illegible] نیا شمارہ خوب صورت سرورق سے [illegible] وقت سے پہلے ہی مل گیا۔ اس کی روز افزوں ترقی آپ کی [illegible] محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔ اگر اس کی سچی کہانیوں کی طرف تھوڑی سی توجہ مزید دی جائے تو یہ پرچہ اور بھی نکھر سکتا ہے۔

(شیخ محمد اشتیاق اعظم ملا نصر مارکیٹ لاہور)

میں جوابِ عرض کا پرانا قاری ہوں اور یہ رسالہ میری جان ہے۔ ہر ماہ باقاعدگی سے خریدتا ہوں۔ مگر یہ ہر ماہ [illegible] لیٹ ہو جاتا ہے۔ بہت انتظار کرنا پڑتا ہے۔ لیکن سچ ہی کہتے ہیں کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ فروری کے شمارے میں میرا ناقابلِ فراموش واقعہ "عبرت" شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ اگر اسی طرح حوصلہ افزائی ہوتی رہی تو یقیناً میرے قلم کو نکھار ملے گا۔ اور اس کا سہرا آپ کے سر ہو گا۔ میری دعائیں جوابِ عرض کے ساتھ ہیں۔

(لیاقت علی شہزاد بستی سوکڑھا۔ بہاولنگر)

جوابِ عرض کی بزم میں پہلی مرتبہ شریک ہونے کی جسارت کر رہا ہوں۔ اپنے ایک دوست تنویر اختر کی وساطت سے جوابِ عرض پڑھا۔ اس کے تمام کالم دکھی دلوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ امید ہے آپ ضرور حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

(سجاد بیگ، سیالکوٹ کینٹ)

جوابِ عرض کا پرانا قاری ہوں۔ میں نے تو یہ سوچ رکھا تھا کہ آپ صرف اپنے دوستوں [illegible] ہی شائع کرتے ہیں مگر دسمبر کی اشاعت میں [illegible] دیکھ کر اپنے خیال پر خود ہی پشیمان ہو گیا۔ [illegible] سرنامے آنے والے مہمان کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اس کی ہر کہانی سبق آموز ہوتی ہے۔ سرورق کا تو جواب ہی نہیں ہوتا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے مزید ترقی عطا فرمائے

(ایم۔ آر۔ مسرت، ٹاٹے پید۔ ملتان)

جوابِ عرض کا تازہ شمارہ بڑی چاہت کے ساتھ خریدا۔ مگر خدارا سرورق اور آخری صفحے پہ کبھی تو عورت کی جگہ پھولوں کو سجا دیا کریں یا پھر ایک صنف کو ہی سرورق پر سجا دیں۔ یہ شمارہ شعر شائع نہ کیا کریں کہ ان میں بہت سے غیر معیاری اشعار بھی شامل ہوتے ہیں۔ دیگر سب ہی کہانیوں کو کہانیاں اچھی رہیں۔ دعا ہے کہ یہ مزید ترقی کرنے میں پیش پیش رہے۔۔۔

(طاہرہ مرزا، واہ کینٹ)

جوابِ عرض کا پرانا پرستار ہوں۔ اس کا دکھ درد نمبر میری توقعات سے کہیں زیادہ بڑھ کر نکلا۔ اس کے سرورق نے تو میری جان ہی نکال دی ہے۔

(سید ریاض حسین، الریاض۔ سعودی عرب)

فروری ۱۹۸۳ کا جواب عرض پڑھا۔ اور اس کے طویل حقائق میں "یہی ہے زندگی" پڑھ کر سخت حیرت اور دکھ ہوا۔ کہ یہ کہانی اردو ڈائجسٹ کے ایک پرانے شمارے میں "دکھ کا سمندر" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ صفدرا پردیسی نے ہو بہو نقل کر کے جواب عرض میں چھپوا دی۔ انہیں ایسی حرکت کرنے پر شرم آنی چاہئیے۔ اور جو انہوں نے اپنے خط میں اپنی دوست کا حوالہ دیا ہے وہ محض ایک قارئین کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والی بات ہے۔

(ریحانہ تسلیم پاشا ۔ ۔ ۔ ۔ وزیر شہر)

* آپکی تحقیق کا بہت شکریہ۔ آپ فوری طور پر ہمیں اردو ڈائجسٹ کی کہانی کی فوٹو اسٹیٹ کروا کر ارسال فرمائیں۔ تاکہ ان محترمہ کو بلیک لسٹ کیا جا سکے۔ (ادارہ)

بڑے انتظار کے بعد جنوری کے آخر میں فروری ۸۳ء کا شمارہ ملا۔ اس حسین مجموعے کی کس کس چیز کی تعریف کروں۔ ویسے بھی محبوب کی تعریف کے لیے تو موزوں الفاظ کبھی مل ہی نہیں سکتے۔ میں تو اب یہی کہوں گا کہ جواب عرض ہی میرا اب واحد غمگسار ہے جو غموں کی اس تیز آنچ میں میرا ساتھ دے رہا ہے۔ جب میں دکھوں کی اس بھیڑ میں گھرا جاتا ہوں تو جواب عرض کے دامن میں ہی پناہ لیتا ہوں۔ کیونکہ اس کی ہر تحریر سبق آموز اور میرے دل کی طرح زخمی ہوتی ہے اس کے تازہ شمارے میں مجھے کوئی بھی ایسا پہلو نظر نہیں آیا کہ جس پر تنقید کی جا سکے۔ آخر میں اپنے اس پیارے جریدے کی ترقی کے لیے دعاگو ہوں۔

(امجد علی کھوکھر شاہد، فرنیچر مارکیٹ گجرات)

اس مرتبہ پرچہ وقت سے پہلے ہی مل گیا۔ اس کی سب ہی کہانیاں بہت سبق آموز ہوتی ہیں رفتہ لیں ناقابلِ فراموش اور دیگر سب ہی کالم قابلِ تعریف ہوتے ہیں۔ خدا اسے مزید ترقی دے۔

(عبدالغفار بھٹی [illegible])

جواب عرض کا پرانا قاری ہوں۔ اس کی بزم میں پہلے بھی کئی خطوط ارسال کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار مجھے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ آخر نہ جانے کیوں۔۔؟ جبکہ میں جواب عرض بڑے ہی شوق سے پڑھتا ہوں۔ اگر آپ میری حوصلہ افزائی فرمائیں تو میں اس کے لیے مزید دعائیں کرتا رہوں گا۔

(گوہر عباس زیدی، طلوعِ شپ۔ کراچی)

* چارہ گر حال میرا ان سے زبانی کہنا
خط نہ دینا انہیں کہ وہ میرے دل کو دکھا دیتے ہیں!

عرصہ دراز سے جواب عرض پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ کئی مرتبہ شمارے کے بارے میں رائے دی لیکن اس میں شاملِ اشاعت ہونے سے رہ گیا۔ فروری کا شمارہ بہت دیر سے مارکیٹ میں آیا۔ اس میں شامل محمد ریاض صاحب کی طویل کہانی "نشیب و فراز" اور شفیقہ فرحت تصور کی نظم "پیار کی پیاسی" نے بہت متاثر کیا۔ ان دونوں قلمکاروں کو مبارک باد ہو۔ آئندہ بھی قارئین کو ایسی ہی تحریروں سے نوازیں۔

(ایم اعظم ضیاء، پونچھ آزاد کشمیر)

* برادرم! ہمارے لیے تمام قارئین ایک جیسے ہیں چاہے وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں رہتے ہوں۔ اور پھر کشمیری بھائی تو ہمیں اور بھی عزیز ہیں جس کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں۔ اشتہارات باری آنے پر سب کے شائع کیے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

جواب عرض کا تازہ شمارہ بہت دیر سے ملا۔ لیکن اس کے ملتے ہی سب دکھ درد دور ہو گئے۔ آپ ہر ماہ میری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں اس کے لیے بہت شکریہ۔ اس مرتبہ تمام کہانیاں اور واقعات کے ساتھ ساتھ دیگر سب کالم بھی بہت خوب رہے۔ میری دعا ہے کہ یہ پرچہ مزید ترقی کرتا رہے۔۔۔

(عصمت لبنیٰ ۔ ۔ ۔ ۔ پتوکی ضلع قصور)

عرصہ تین سال سے جواب عرض کا قاری ہوں۔
ہر ماہ اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اس کے
تمام خط بہت ہی مفید اور مزے دار ہوتے ہیں۔ اس
کا دکھ درد نمبر تو بہت ہی پسند آیا۔ اللہ کرے آپ
کا یہ رسالہ بہت ترقی کرے...
(ابو ظاہر زاہد اقبال وائیں، مکہ المکرمہ)

جواب عرض کا پرانا پرستار ہوں۔ لیکن اس کی
بزم میں پہلی بار شریک ہو رہا ہوں۔ امید ہے آپ مجھے
مایوس نہیں کریں گے۔ میں اپنی ایک آپ بیتی اس میں
شائع کروانا چاہتا ہوں...
(محمد عظیم، موہلڑہ ضلع سیالکوٹ)
* آپ اپنے شوق سے کہانی ارسال کریں۔ (ادارہ)

جنوری ۸۳ء کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔
سرورق بے حد خوبصورت ہے۔ کچھ مصروفیت کی
وجہ سے پچھلے ماہ خط نہ لکھ سکی۔ جواب عرض واقعی دکھی
دلوں کا سہارا ہے۔ میں جب کبھی پریشان ہوتی ہوں
تو اسی پرچے کا سہارا لیتی ہوں۔ اور پرانے رسالے نکال
کر ان کی ورق گردانی کرنے لگ جاتی ہوں ؎
مدتوں پہلے تجھ سے جب تعارف بھی نہ تھا
میرے خیالات بناتے تھے تصویر تیری
(مس بشریٰ گلزار، میرپور آزاد کشمیر)

اس کالم کے ذریعے اپنی بہن شگفتہ کنول سے عرض
ہے کہ وہ اپنا ایڈریس ضرور ارسال کریں۔
(اے ارشد، مدینہ منورہ سعودی عرب)

جواب عرض کا تازہ شمارہ ملا۔ جو ہر لحاظ سے
قابل تعریف رہا۔ میری دعا ہے کہ یہ پرچہ دن رات
ترقی کرتا رہے...
(عابد جاوید بٹ، مان، گوجرانوالہ)

میں جواب عرض کو جنون کی حد تک چاہنے والوں
میں سے ایک ہوں۔ میں چونکہ شعر و شاعری سے بھی
دلچسپی رکھتا ہوں۔ میری حوصلہ افزائی فرمائیں۔ میری
دعا ہے کہ یہ پرچہ اور ترقی کرتا رہے۔
(نصرت علی مجروح - اکوڑہ خٹک)

دکھ درد نمبر نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیں۔
آپ اس ہستی کے بارے میں بھی کوئی نمبر نکالیں جس نے
آپ کو دکھ درد میں مبتلا کر دیا ہے۔
(شیراز خان، سہائے نور جگ)
* اس سلسلہ میں عنقریب آپ کو "خوشبو نمبر"
پڑھنے کو دیا جا رہا ہے۔ (ایڈیٹر)

جواب عرض کا پرانا قاری ہوں۔ جنوری ۸۳ء کا
شمارہ ملا۔ پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ مگر اس نے
واقعات میں شامل "فصیل وقت" واقعہ سلام عرض
کے جنوری ۸۳ء ہی کے شمارے میں بھی شائع ہوا ہے۔
اس طرف ذرا توجہ دیں۔ آخر میں میری دعا ہے کہ یہ
پرچہ اور زیادہ ترقی کرتا رہے۔
(ایم اقبال ساہی پروانہ، میانوالی شہر)

جواب عرض میرا من پسند رسالہ ہے۔ اس کے
دکھ درد نمبر نے کافی متاثر کیا۔ اس کے طویل حقائق
میں بلا عنوان، جدائی کا کرب، میرا نصیب ٹھوکر،
احساس گناہ اور اندھی محبت نے بہت متاثر کیا۔ اس
کی مزید ترقی کے لیے دعاگو ہوں۔
(رحمت اللہ خان مزار خیل، موچھ)

نئے سال کا نیا شمارہ ملا۔ میری کہانیاں شائع
کرنے کا بہت شکریہ۔ جب تک میں زندہ ہوں اپنے
جواب عرض کے لیے ضرور لکھتا رہوں گا۔
(ایم مقبول بیگ ساقی۔ مکھڈ مال)

جوابِ عرض کی اس بزم میں دوبارہ شرکت کر رہا ہوں امید ہے کہ اس مرتبہ بھی مایوس نہیں کریں گے اب اس کا معیار پہلے سے بہت بہتر ہو رہا ہے۔ ہاں البتہ انعامی سکیم کو بند کر کے اور کوئی دلچسپ کام شروع کریں۔ امید ہے میری طرح دوسرے قاری بھائی بھی اتفاق کریں گے اور اپنی رائے سے نوازیں گے

(ایم خلیل اعوان چک نمبر ۲۰۴ شمالی سرگودھا)

جوابِ عرض سے میری شناسائی کا آپ اس بات سے اندازہ کر لیجیے کہ میں سعودیہ سے پاکستان چھٹی پہ آیا ہوا ہوں مگر اس مختصر سی چھٹی میں بھی میں یہاں یہ جوابِ عرض کا باقاعدہ مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس مرتبہ اس کی سبھی کہانیاں مزے دار ہیں۔ ہاں البتہ اس کے شعروں اور غزلوں کے معیار کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

(رضا شاہ نقوی۔ ص ب ۵۰۴ تبوک السعودیہ)

★ آپ کا اشتہار باری آنے پر ضرور شائع ہوگا۔ (ادارہ)

آپ لوگ میری کہانی اور ناقابلِ فراموش واقعہ کو فراموش کر چکے ہیں۔ اب مجھے کوچا نے بھی دیجیے نا؟ اسی انتظار میں اپنی دیگر تیار شدہ کہانیاں ابھی نہیں بھیج رہا۔ ہمارے ساتھ تھوڑا ساتھ تو دیں کہ نئے تو قدرا دیکھیں۔ جوابِ عرض کی مزید ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

(سلیم رضا تجمی الیف۔ پی۔ او، اٹک)

★ آپ انتظار کیے بغیر اپنی دیگر کہانیاں ارسال کریں تو آپ کی باری جلدی آ سکے گی۔ (ادارہ)

جوابِ عرض کی پُررونق بزم میں پہلی بار شریک ہو رہا ہوں۔ اسے دنیائے عرض میں ایک اہم اور منفرد مقام حاصل ہے۔ اس کی آپ بیتیاں ذرا توجہ طلب ہوتی ہیں۔ حقائق کی نقاب کشائی کرتے ہوئے آپ اپنا معیار برقرار رکھیں

(ارشد نواز ...)

جنوری ۸۴ء کا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ یہ میرا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس مرتبہ سرورق اور پس ورق نے کچھ زیادہ ہی متاثر کیا۔ اس کی ہر کہانی ہر کالم اور خاص کر وطن سے متعلق کالم خوب سے خوب تر رہے۔ شعر مجھے بے حد بھائے۔ میری دعا ہے کہ یہ پرچہ مزید ترقی کرتا رہے۔۔۔

(نواب گل خان سرحدی۔ نوشہرہ)

ایک عرصہ ہوا آپ کے جوابِ عرض کے لیے ایک کہانی "کیسی محبت کیسا پیار" ارسال کی تھی۔ اس بار ذرا جلدی سے آیئے۔ کہ میں جوابِ عرض کے صفحے پہ اپنی آپ بیتی دیکھنے کا بہت مشتاق ہوں۔ خدا کرے جوابِ عرض دن رات ترقی کرتا رہے۔

(نور رحمٰن تبسم، بنوں)

ایک عرصہ سے جوابِ عرض کا پرستار ہوں۔۔۔ مگر شوقِ انتہا نے مجبور کیا کہ میں بھی اس کی بزم میں شرکت کا شرف حاصل کر لوں۔ دل میں کئی مختلف کہانیاں جنم لے رہی ہیں جو کہ بالکل حقیقت پر مبنی ہیں۔ اگر آپ حوصلہ افزائی فرمائیں تو میں ارسال کروں۔

؎ آئے تھے وہ اور آ کر چلے بھی گئے
اک لمحہ میں دل کو دکھا کر چلے بھی گئے

(نامعلوم پرستار۔۔۔)

★ محترم کم از کم اپنا نام پتہ تو لکھ دیا ہوتا۔ (ادارہ)

میں جوابِ عرض بڑے ہی شوق سے پڑھتی ہوں۔ اس سے دلی لگاؤ کی وجہ صرف اس کی حقائق نگاری ہے۔ اس کالم پسندیدہ شعر میرا من پسند کالم ہے کہ مجھے بھی شعر و شاعری سے دلی لگاؤ ہے۔

؎ تم نے لگائی تھی آگ جلا کے تو میرا دل جلا گئی
جب آس کی راکھ اڑی تو تم یاد آ گئے!

(روبینہ محمد خان۔ چکوال)

احمد، غلام علی پبلشرز، ہسپتال روڈ، لاہور میں چھپا۔

ماہنامہ
جواب عرض
لاہور